

نوائے سروس

مکمل دیوانِ غالب مع شرح



PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081



پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر»
میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریحاً نہ نزلے سر دوش ہے

نوائے سروش

مکمل دیوان غالب مع شرح

از

غلام رسول مہر

شیخ غلام علی اینڈ سٹنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز،

لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

پبلشرز گلبرگ پرائیویٹ، لاہور

شیخ نسیا ز احمد

طابع :

غلام علی پرنٹرز

مطبع :

جامعہ اشرفیہ، اچھرہ، لاہور

مقدم اشاعت :

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پبلشرز

۱۹۹ - سرگرم روڈ، چوک انارکلی، لاہور ۲ / ۴۰۰۰

ISBN - 969 - 31 - 0016 - 6

فہرست

صفحہ	غزلیات	نمبر شمار
۱	مقدمہ: از مولانا غلام رسول مہر	
۱۷	نقش فریادی ہے کس کی شوشی تحریر کا	۱
۲۰	جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار	۲
۲۵	کہتے ہوں دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا	۳
۲۸	دل میرا سوزنہاں سے بے مہا با جل گیا	۴
۳۱	شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا	۵
۳۴	دھکی میں مر گیا جو نایاب نہر و تھا	۶
۳۷	شمار سچم خوب بت مشکل پسند آیا	۷
۴۰	دہر میں نقش وفا وجہ قتل نہ ہوا	۸
۴۴	سائیں گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا	۹
۵۱	نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا	۱۰
۵۲	سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی	۱۱
۵۳	محرم نہیں ہے تو ہی نواٹے راز کا	۱۲
۵۶	بزم شاہنشاہ میں اشاد کا دفتر کھلا	۱۳
۶۱	شب کہ برق سوز دل سے زہرہ ابر آب تھا	۱۴
۶۴	نالہ دل میں شب انداز اثر نایاب تھا	۱۵
۶۷	ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب	۱۶

صفحہ	غزلیات	نمبر شمار
۷۹	بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا	۱۷
۷۵	شبِ خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا	۱۸
۷۸	دوستِ غمِ خواری میں میری کسی قربانیں گے کیا	۱۹
۸۲	یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا	۲۰
۸۸	ہوس کو ہے نشاۃ کار کیا کیا	۲۱
۹۳	درِ غمِ قہر و غضب جب کوئی ہم سانس ہوا	۲۲
۹۹	اسد! ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سرو پا ہیں	۲۳
۹۹	پئے نذرِ کرمِ تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا	۲۴
۱۰۳	گر نہ اندوہِ شبِ فرقتِ بیاں جو بائے گا	۲۵
۱۰۷	درِ و منت کش و دانہ ہوا	۲۶
۱۱۲	گلو ہے شوقِ کو دل میں بھی تنگی جا کا	۲۷
۱۱۸	قطرہ نے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا	۲۸
۱۱۹	جب بتقریب سفر یار نے محلِ باندھا	۲۹
۱۲۱	میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں	۳۰
۱۲۳	گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو دیران ہوتا	۳۱
۱۲۵	نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا	۳۲
۱۲۶	یک ذرہ زمین نہیں بے کار باغ کا	۳۳
۱۳۱	وہ مری چین چین سے غم پہناں سمجھا	۳۴
۱۳۳	پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا	۳۵
۱۳۸	ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا	۳۶
۱۳۳	لب خشک درِ تشنگی مردگان کا	۳۷
۱۴۴	تو دوست کسی کا بھی سنگ نہ ہوا تھا	۳۸

صفحہ	عزلیات	نمبر شمار
۱۴۹	شب کہ وہ مجلس فروز خلوت ناموس تھا	۳۹
۱۵۱	آئینہ دیکھ اپنا سامنے لے کے رہ گئے	۴۰
۱۵۲	عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا	۴۱
۱۵۴	رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف	۴۲
۱۶۰	ذکر اس پری دیش کا اور بھربیاں اپنا	۴۳
۱۶۵	سر مہ مفت نظریوں میری قیمت یہ ہے	۴۴
۱۶۶	خافل بہ ہم ناز خود آ رہے، ورنہ یاں	۴۵
۱۶۸	جو رہے بازار آئے پر بازار آئیں کیا	۴۶
۱۷۳	لطف بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی	۴۷
۱۷۴	عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا	۴۸
ب		
۱۷۹	پھر ہوا دقت کہ ہوا بال کشا موج شراب	۴۹
ت		
۱۸۴	افسوس کہ دیدار کا کیا رزق تنگ نے	۵۰
۱۸۷	رہا کہ کوئی نہ قیامت سلامت	۵۱
۱۸۸	منہ گش کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب	۵۲
۱۸۹	آمد خط سے ہوا ہے سر دجو بازارِ دوست	۵۳
ج		
۱۹۳	گلشن میں بند دہشت برنگ در ہے آج	۵۴

صفحہ	عزلیات	نمبر شمار
۱۹۳	اوسم مرعض عشق کے تیمار دار ہیں	۵۵
	ج	
۱۹۳	نفسِ زانجنِ آرزو سے باہر کھینچ	۵۶
	د	
۱۹۴	حسنِ غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد	۵۷
	ر	
۲۰۲	بلے سے ہیں جو یہ پیشِ نظر دردِ دیوار	۵۸
۲۰۶	گھر جب بنالیا تیرے درد پر کے بغیر	۵۹
۲۱۰	کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر	۶۰
۲۱۶	لڑتا ہے میرا دل، زحمتِ مہر درخشاں پر	۶۱
۲۲۲	ہے بلکہ ہر ایک اُن کے اشارے میں نشان اور	۶۲
۲۲۸	صفائے حیرت آئینہ ہے سامانِ رنگِ آخر	۶۳
۲۳۹	جنوں کی دستگیرِ محسوس سے ہو اگر ہو نہ عریانی	۶۴
۲۳۴	ستمِ کشِ مصلحت سے ہوں کہ خواباں تجھ پہ عاشق ہیں	۶۵
۲۳۴	لازم تھا کہ دیکھو مرا دستہ کوئی دن اور	۶۶
	ز	
۲۳۹	نارِ رخِ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبحِ مہر	۶۷
۲۴۱	حرِ لبِ مطلب مشکل نہیں فتونِ نیاز	۶۸

صفحہ	عزلیات	نمبر شمار
۲۴۳	دستِ سخی کرم دیکھ کہ سرتا سبر خاک	۶۹
۲۴۵	کیونکر اس بت سے دیکھوں جانِ عزیز	۷۰
۲۴۶	نے گلِ لغز ہوں نہ پردہ ساز	۷۱
	س	
۲۴۹	مردہ اے ذوقِ امیری کہ نظر آتا ہے	۷۲
	ش	
۲۵۲	نہ لیوے گریں ہم ہر طرادت سبزہ خط سے	۷۳
	ع	
۲۵۴	جادو رہ خود کو وقتِ شام ہے تارِ شاخ	۷۴
۲۵۵	دُخِ نگار سے ہے کوثرِ جادو دانیِ شمع	۷۵
	ف	
۲۵۷	بیمِ رقیب سے نہیں کرتے دوا بے ہوش	۷۶
	ک	
۲۵۸	زخمِ پے چھڑکیں کہاں، طفلانِ بے پروا نمک	۷۷
۲۶۲	آہ کو چاہیے ایک عمرِ اثر ہونے نمک	۷۸
	گ	

صفحہ	غزلیات	نمبر شمار
۳۷۶	گر تجھ کو ہے یقین اجابت، دعا نہ مانگ	۷۹
	ل	
۳۷۰	ہے کس قدر ہلاک فریبِ وفا نے گل	۸۰
	م	
۳۷۴	غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس	۸۱
۳۷۷	بر نالہ حاصل دل بستگی فراہم کر	۸۲
۳۷۷	نچھ کو دیا بغیر میں مارا، وطن سے دور	۸۳
	ن	
۳۷۸	لوں دام بختِ خفقتہ سے، یک خواب خوش، دے	۸۴
۳۷۹	وہ فراق اور وہ وصال کہاں ؟	۸۵
۳۸۱	کی وفا ہم سے، تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں	۸۶
۳۸۶	آبرو کیا خاک اس گل کہ گلشن میں نہیں	۸۷
۳۹۲	عہدے سے مدح ناز کے، باہر نہ آسکا	۸۸
۳۹۳	مہرباں ہو کے بلا لوجھے، چاہو جس وقت	۸۹
۳۹۵	ہم سے کھل جاؤ بوقت سے پرستی، ایک دن	۹۰
۳۹۷	ہم پر جفا سے، ترک وفا کا گماں نہیں	۹۱
۳۰۳	مانعِ دشتِ نور و می کوئی تدبیر نہیں	۹۲
۳۰۶	مست مردِ ملک دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں	۹۳
۳۰۷	بر شگالِ گریہ عاشق ہے، دیکھا چاہیے	۹۴

صفحہ	عزایات	نمبر شمار
۳۰۸	عشق تاثر سے نوید نہیں	۹۵
۳۱۲	جہاں ترانقش قدم دیکھتے ہیں	۹۶
۳۱۵	ملتی ہے خوشی یاد سے تارہ التہاب میں	۹۷
۳۲۳	کل کے لئے کرا جہ حضرت شراب میں	۹۸
۳۲۶	حیران ہوں، دل کو روڈوں کے پٹوں جگر کو میں	۹۹
۳۳۷	ذکر میرا یہ بدی بھی، اُسے منظور نہیں	۱۰۰
۳۴۲	تالہ جز حسن طلب، اے ستم اسباب انہیں	۱۰۱
۳۴۹	دونوں جہاں دے کے، وہ سمجھے یہ خوش رہا	۱۰۲
۳۵۱	ہو گئی ہے خیر کی شیریں بیانی کارگر	۱۰۳
۳۵۲	قیامت سے کہ سن مل کا دشت قیس میں آتا	۱۰۴
۳۵۳	دل لگا کر اٹھیا ان کو بھی تنہا بیٹھا	۱۰۵
۳۵۴	یہ ہم جو ہجر میں، دیوار و در کو دیکھتے ہیں	۱۰۶
۳۵۶	نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں	۱۰۷
۳۶۰	تیرے تو سن کو صبا باندھتے ہیں	۱۰۸
۳۶۳	زمانہ سخت کم آزار ہے یہ جان اسد	۱۰۹
۳۶۴	واٹیم پڑا ہوا تیرے در پر نہیں ہوں میں	۱۱۰
۳۶۷	سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں	۱۱۱
۳۸۰	دیوانگی سے دوں پہ زنا نہ بھی نہیں	۱۱۲
۳۸۵	نہیں ہے زخم کوئی بچنے کے درخور مرے تن میں	۱۱۳
۳۸۹	مرے جہاں کے اپنی نظر میں خاک نہیں	۱۱۴
۳۹۲	دل ہی تو ہے، نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں	۱۱۵
۳۹۸	غنجہ نا شگفتہ کو، دور سے مت دکھا کہ یوں	۱۱۶

صفحہ	غزلیات	نمبر شمار
	و	
۴۰۱	حد سے دل اگر انس رہے، گرم تماشا ہو	۱۱۷
۴۰۴	کعبے میں جا رہا، تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں	۱۱۸
۴۰۶	دارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو	۱۱۹
۴۱۱	قفص میں ہوں، اگر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو	۱۲۰
۴۱۵	دھوتا ہوں جب میں پیئے کو اس سیم تن کے پانوں	۱۲۱
۴۲۲	داں اس کو ہول دل ہے، تو یاں میں ہوں شہ مسار	۱۲۲
۴۲۳	وال پہنچ کر جو غم آتا ہے ہم بے ہم کو	۱۲۳
۴۲۸	تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم دراہ ہو	۱۲۴
۴۳۲	گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو	۱۲۵
۴۳۶	کسی کو دے کے دل کوئی نواسخ فضاں کیوں ہو	۱۲۶
۴۳۸	دغا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر بچوڑنا محضرا	۱۲۷
۴۴۱	رہیے اب ایسی جگہ چل کر، جہاں کوئی نہ ہو	۱۲۸
	د	
۴۴۴	از مہر تا پہ ذرہ دل و دل سے آئینہ	۱۲۹
۴۴۴	بے سبزہ زار ہر درو دیوار غم کدہ	۱۳۰
	ی	
۴۴۴	حد جلوہ رو ہو سے، جو شرکاں اٹھائیے	۱۳۱
۴۴۶	مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے	۱۳۲
۴۵۱	بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی	۱۳۳

نمبر شمار	غزلیات	صفحہ
۱۳۳	ہے بزمِ تباہ میں سخن آذر وہ لبوں سے	۴۵۷
۱۳۵	تاہم کوشکایت کی بھی باقی نہ رہے جا	۴۵۸
۱۳۶	گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا ؟	۴۶۰
۱۳۷	غم دنیا سے، گر پانی بھی فرصت سہرا اٹھانے کی	۴۶۰
۱۳۸	حاصل سے ہاتھ دسو میٹھے اے آذر و خرامی	۴۶۳
۱۳۹	کیا تنگ ہم ستم زدگان کا جہاں ہے	۴۶۴
۱۴۰	درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ٹائے ٹائے	۴۶۹
۱۴۱	سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے	۴۷۳
۱۴۲	گر خاموشی سے فائدہ اخفائے حال ہے	۴۷۵
۱۴۳	تم اپنے شکوہ کی باتیں نہ کھود کھود کر پوچھو	۴۷۹
۱۴۴	ایک جا حریف و فاکھیا اتحادہ بھی مٹ گیا	۴۸۰
۱۴۵	پیش میں گذرتے ہیں جو کو چہ سے وہ میرے	۴۸۴
۱۴۶	مری ہستی فضا سے ہیرت آباد تمنا ہے	۴۸۴
۱۴۷	رحمِ کر ظالم، کہ کیا بود چراغِ کشتہ ہے	۴۸۷
۱۴۸	چشمِ خواباں خاموشی میں بھی نوا پر داز ہے	۴۸۸
۱۴۹	مشقِ تجھ کو نہیں وحشت ہی سہی	۴۸۹
۱۵۰	ہے آرمیدگی میں نکو پیشِ سباجھے	۴۹۵
۱۵۱	زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غائب	۴۹۷
۱۵۲	اٹھ بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے	۴۹۸
۱۵۳	رفتارِ عمر قطع رہا اضطراب ہے	۵۰۲
۱۵۴	دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پر رشک آجائے ہے	۵۰۶
۱۵۵	گرم فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے	۵۱۱

صفحہ	عزایات	نمبر شمار
۵۱۳	کارگاہ ہستی میں لالہ داغ سماں ہے	۱۵۶
۵۱۵	آگ رہا ہے درود و دیار سے سبزہ غالب	۱۵۷
۵۱۶	سادگی پر اش کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے	۱۵۸
۵۱۹	دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی	۱۵۹
۵۲۳	تسکین کو ہم نہ رو نہیں جو ذوقِ نظر ملے	۱۶۰
۵۲۷	کوئی دن گر زندگانی اور ہے	۱۶۱
۵۳۰	کوئی امید پر نہیں آتی	۱۶۲
۵۳۳	دلِ ناداں تجھے بھوکا ہے	۱۶۳
۵۳۷	کہتے تو جو تم سب کو بتِ غالیہ موٹے	۱۶۴
۵۴۳	بھر کچھ اک دل کو بیقرار دی ہے	۱۶۵
۵۴۶	جنونِ نیت کس تسکین نہ ہو، گر شادمانی کی	۱۶۶
۵۴۸	نکو ہش ہے سزا فریادی بیدار و لبر کی	۱۶۷
۵۵۰	بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے	۱۶۸
۵۵۵	جو نہ نقدِ داغ دل کی، کرے شعلہ پاسبانی	۱۶۹
۵۵۶	ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے	۱۷۰
۵۶۲	آگہ مری جان کو قرار نہیں ہے	۱۷۱
۵۶۵	ہجومِ غم سے یاں تک نہ نگوئی مجھ کو حاصل ہے۔	۱۷۲
۵۶۶	پا بہ دامن ہو رہا ہوں، بس کہ میں صحرا لوزرد	۱۷۳
۵۶۷	جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے	۱۷۴
۵۷۲	حسنِ مدگر چہ بہ ہنگام کمال اچھا ہے۔	۱۷۵
۵۷۹	نہ ہوئی گرمی مرنے سے تسلی نہ سہی	۱۷۶
۵۸۳	عجب نشاط سے جلاؤ کے چلے ہیں ہم آگے	۱۷۷

صفحہ	غزلیات	نمبر شمار
۵۸۷	شکوے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے	۱۷۸
۵۹۰	ہر ایک بات پر کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے	۱۷۹
۵۹۳	میں انہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں	۱۸۰
۵۹۶	غیر میں محفل میں بوسے جام کے	۱۸۱
۵۹۹	پھر اس انداز سے بہا دانی	۱۸۲
۶۰۰	تغافل دوست ہوں میرا دماغ عجز عالی ہے	۱۸۳
۶۰۲	کب وہ سنتا ہے کہانی میری ؟	۱۸۴
۶۰۴	گلشن کو تیری صحبت از بس کہ پسند آئی	۱۸۵
۶۰۷	نقش نازبت طناز بہ آغوش رقیب	۱۸۶
۶۰۸	جس زخم کی ہو سکتی ہو تہ بہر رفو کی	۱۸۷
۶۱۱	سیلاب پشت گری آئینہ دے ہے ہم	۱۸۸
۶۱۱	سے وصل، ہجر عالم تمکین و ضبط میں	۱۸۹
۶۱۲	چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے	۱۹۰
۶۱۵	ہر قدم دوری منزل سے نمایاں، گلجے سے	۱۹۱
۶۲۰	نکتہ چیں سے غم دل اس کو سنائے نہ بتے	۱۹۲
۶۲۵	چاک کی خواہش اگر وحشت بہ عریانی کرے	۱۹۳
۶۲۷	وہ آکے خواب میں تسکین اضطراب تو دے	۱۹۴
۶۳۰	قیس سے میری، وقف کشمکش ہر تار بہتر ہے	۱۹۵
۶۳۲	خطر ہے رشتہ الفت رگ گردن نہ ہو جائے	۱۹۶
۶۳۲	فریاد کی کوئی لے نہیں ہے	۱۹۷
۶۳۶	نہ پوچھئے نسخہ مرہم جراحت دل کا	۱۹۸
۶۳۷	ہم رشتہ کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے	۱۹۹

صفحہ	غزلیات	نمبر شمار
۴۳۸	کرے ہے بادہ ترے لب سے کس رنگِ فروغ	۲۰۰
۴۳۹	کیوں نہ ہو چشمِ بیاں بخود تغافل کیوں نہ ہو ؟	۲۰۱
۴۴۰	دیا ہے دل اگر اس کو، بشر ہے، کیا کیئے	۲۰۲
۴۴۲	دیکھ کر درپردہ گرم دامنِ افشانی تھے	۲۰۳
۴۴۴	یاد ہے شادی میں بھی ہنگامہ تیار نہ تھے	۲۰۴
۴۵۰	حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے	۲۰۵
۴۵۵	کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گرا جائے ہے مجھ سے	۲۰۶
۴۵۹	ذبح کہ مشقِ تماشا جڑوںِ علامت ہے	۲۰۷
۴۶۱	لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جاوے مجھے	۲۰۸
۴۶۲	باز بچہ اطفال ہے دنیا میرے آگے	۲۰۹
۴۶۹	کہوں جو حال تو کہتے ہیں تدما کیئے	۲۱۰
۴۷۳	رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے	۲۱۱
۴۷۷	نشد شاہِ دابِ رنگ و ساز ، مستِ طرب	۲۱۲
۴۷۸	مرضِ نازِ شوخی ونداں برائے خندہ ہے	۲۱۳
۴۸۰	حسن بے پردہ و خیر و متاعِ جلوہ ہے	۲۱۴
۴۸۱	جب تک دھن زخم نہ پیدا کرے کوئی	۲۱۵
۴۸۶	ابنِ مریم ہوا کرے کوئی	۲۱۶
۴۹۰	بہت ہی غم گیتی ، شراب کم کیا ہے	۲۱۷
۴۹۱	بانگ ، پاکر خفقاتی ، یہ ڈراتا ہے مجھے	۲۱۸
۴۹۲	روندی ہوئی ہے کو کتبہ شریار کی	۲۱۹
۴۹۶	ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلتے	۲۲۰
۴۹۸	کوہ کے ہوں بار خاطر گر صدا ہو جائیے	۲۲۱

صفحہ	غزلیات	نمبر شمار
۷۰۰	مستی بہ ذوق غفلت ساقی ہلاک ہے	۲۲۲
۷۰۰	لب میسلی کی جنبش کرتی ہے گنوارہ جنبانی	۲۲۳
۷۰۱	آہ سیلاب طوفانِ صدا ئے آب ہے	۲۲۴
۷۰۲	ہوں میں بھی تماشا ئی نیرنگ تما	۲۲۵
۷۰۲	سیاہی جیسے گر جائے دم تھریر کا غدیر	۲۲۶
۷۰۳	ہجوم نالہ حیرت عاجز عرض یک افشاں ہے	۲۲۷
۷۰۵	خوشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے	۲۲۸
۷۰۶	جس جانشیم شانہ کش زلف یار ہے	۲۲۹
۷۱۱	آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کیس جے	۲۳۰
۷۱۵	شبہم بہ نکل لالہ نہ خالی زاد اسے	۲۳۱
۷۲۰	منظور غمتی یہ شکل، تجلی کو نور کی	۲۳۲
۷۲۴	علم کھاتے ہیں بود اول ناکام بہت ہے	۲۳۳
۷۲۹	مدت ہوئی ہے یار کو ہماں کئے ہوئے	۲۳۴
۷۳۳	نویہ امن سے بے دایہ دوست جاں کے لئے	۲۳۵
قصائد		
۷۳۵	سازیک ذرہ نہیں فیض چمن سے بے کار	۲۳۶
۷۳۷	فیض سے تیرے ہے اسے شمع شبستان ہمار	۲۳۷
۷۵۷	دہر جز جلوۂ یکتا فی معشوق نہیں	۲۳۸
۷۷۰	ہاں مہ نو نہیں ہم اس کا نام	۲۳۹
۷۷۱	تجہ کو کیا ہا یہ روشناسی کا	۲۴۰

صفحہ	عزلیات	نمبر شمار
۷۷۲	زہر غم کر چکاتھ میرا کام	۲۴۱
۷۷۳	رعد کا کر دیا ہے کیا دم بند	۲۴۲
۷۷۴	فن صورت گری میں تیرا گزر	۲۴۳
۷۷۵	صبح دم دروازہ خدا در کھلا	۲۴۴
۷۷۷	تو بک شہ میں وہ خولی ہے کہ جب	۲۴۵
۷۷۸	کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا	۲۴۶
۷۷۸	نچر ہوا مدحت طرازی کا خیال	۲۴۷
۷۹۹	سہرا خوش ہوا سے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا	۲۴۸
۸۰۹	مثنوی ہاں دل دردمند زمزم ساز	۲۴۹
۸۲۱	قطعات اے شہنشاہ فلک منظر دے مثل و نظیر	۲۵۰
۸۲۷	اے شہنشاہ آسماں اور نگ	۲۵۱
۸۲۷	پیر و مرشد! اگرچہ مجھ کو نہیں	۲۵۲
۸۲۸	سری خواہ جو مقرر ہے	۲۵۳
۸۲۸	آج مجھ سامنے زمانے میں	۲۵۴
۸۲۹	آپ کا بندہ اور پھروں نگا	۲۵۵
۸۳۲	اے شاہ جہانگیر جہاں بخش جہاں دار	۲۵۶
۸۳۴	ہے چار شنبہ، آخر ماہ صفر چلو	۲۵۷
۸۳۷	نصرت الملک بہادر! مجھے بتلا کہ مجھے	۲۵۸
۸۴۰	منظور ہے گذارش احوال واقعی	۲۵۹

صفحہ	قطعات	نمبر شمار
۸۴۷	ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ چکنی ٹولی	۲۴۰
۸۵۲	کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشین	۲۴۱
۸۵۳	نہ پوچھ اس کی حقیقت، حضور والا نے	۲۴۲
۸۵۵	گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری	۲۴۳
۸۵۶	سیہ گلیم ہوں، لازم ہے، میرا نام نہ لے	۲۴۴
۸۵۷	افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو	۲۴۵
۸۵۸	سہل تھا سہل، دے یہ سخت مشکل آپڑی	۲۴۶
۸۵۹	گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں	۲۴۷
۸۶۰	خجۃ النجمن طوے میرزا جعفر	۲۴۸
۸۶۱	ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی	۲۴۹
	رباعیات	
۸۶۵	بعد از تمام بزم عید اطفال	۲۵۰
۸۶۶	شب زلفت و ریح عرق نشاں کا غم تھا	۲۵۱
۸۶۷	آتش بازی ہے جیسے شغل اطفال	۲۵۲
۸۶۸	دل تھا کہ جو جانِ درد تمہید سہی	۲۵۳
۸۶۹	ہے خلقِ حسد قماشِ رٹنے کے لئے	۲۵۴
۸۷۰	دل سخت نثر مذہب ہو گیا ہے، گویا	۲۵۵
۸۷۱	دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے، غالب	۲۵۶
۸۷۲	مشکل ہے زبں کلام میرا، اسے دل !	۲۵۷
۸۷۳	جیجی ہے جو مجھ کو شاہِ جسم جاہ نے وال	۲۵۸
۸۷۴	ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلال باہم	۲۵۹
۸۷۵	حق، شہ کی بقا سے خلق کو شاہِ ذکر سے	۲۶۰

نمبر شمار	رباعیات	صفحہ
۲۸۱	اس رشتے میں لاکھ تار ہوں، بلکہ سوا	۸۷۳
۲۸۲	کہتے ہیں کہ ”اب“ وہ مردوم آزار نہیں	۸۷۵
۲۸۳	ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے	۸۷۶
۲۸۴	سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں	۸۷۷
۲۸۵	ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے	۸۷۸
	تھیمہ اول	
۲۸۶	دیکھنے میں ہیں گرچہ درد پر ہیں یہ دونوں یا ایک	۸۸۱
۲۸۷	ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں	۸۸۶
۲۸۸	اپنا احوالِ دل زار کہوں یا نہ کہوں	۸۹۰
۲۸۹	شبِ وصال میں مونس گیا ہے بنِ تکبیر	۸۹۲
۲۹۰	میں ہوں مشاقِ جفا، تجھ پہ جفا اور سہی	۸۹۶
۲۹۱	آپ نے ”مسنی الضمر“ لکھا ہے تو سہی	۸۹۹
۲۹۲	لطفِ نظارۂ قاتل دم بسمل آئے	۹۰۲
۲۹۳	بھولے سے کاش وہ ادھر آئیں تو شام ہو	۹۰۵
۲۹۴	بتائیں ہم تمہارے عارض و کائل کو کیا کجی	۹۰۸
۲۹۵	نسیم صبح جب کھنکھاتی ہے پیر بن لائی	۹۱۰
۲۹۶	وفا جفا کی طلب گار ہوتی آئی ہے۔	۹۱۱
۲۹۷	یونہی انفرائش و حشت کے جو سامان ہوں گے	۹۱۲
۲۹۸	نمائش پر وہ وارِ طرزِ بیدار و تغافل ہے	۹۱۵
۲۹۹	خود جان دے کے روح کو آزاد کیجئے	۹۱۷
۳۰۰	ہم سے خوابانِ جہاں پہلو متی کرتے رہے	۹۱۹
۳۰۱	دردِ ہر دل میں تو دوا کیجئے	۹۲۱

صفحہ	ضمیمہ اول	نمبر شمار
۹۲۳	سکوت و خاموشی اظہار حال بے زبانی ہے	۳۰۲
۹۲۵	کس کی برق شرخی رفتار کا دلدادہ ہے	۳۰۳
۹۲۶	اس جو رد و جفا پر بھی، بد ظن نہیں ہم سمجھ سے	۳۰۴
۹۲۸	نالے دل کھول کے دو چار کروں یا نہ کروں	۳۰۵
۹۲۸	نہ پوچھ حال اس انداز، اس عتاب کے ساتھ	۳۰۶
۹۲۹	سکون دل تو تعلق ہے اضطراب کے ساتھ	۳۰۷
۹۳۰	وضع تیزنگی آفاق نے مارا ہم کو	۳۰۸
۹۳۲	حسن بے پروا گرفتار خود آرائی نہ ہو	۳۰۹
۹۳۵	خرمیزہ وار محبت ہوئی جو اسے چمن	۳۱۰
۹۳۶	کرم ہی کچھ سبب لطف و انکساف نہیں	۳۱۱
۹۳۷	یوں شمع ہم اک سوختہ سامانِ وفا ہیں	۳۱۲
۹۴۰	آفت آہنگ ہے کچھ نالہ رُبل، ورنہ	۳۱۳
۹۴۲	بر تراز ویرانہ ہے فصل خزاں میں عین بارش	۳۱۴
	قصائد	
۹۴۹	کرتا ہے چرخ روز بہ صد گو نہ احترام	۳۱۵
۹۵۶	گئی ہیں سال کے رشتے میں بیس بار گرہ	۳۱۶
۹۶۱	مر جا! سال مر صنی آئیں	۳۱۷
۹۶۸	ملاؤ کشور و لشکر، پناہ مشر و سپاہ	۳۱۸
	قطعات	
۹۷۳	ہند میں اہل سنسن کی ہیں دو سلطنتیں	۳۱۹
۹۷۷	مقامِ شکر ہے اسے ساکنانِ خطہ خاک	۳۲۰
۹۸۰	لبکہ فعال مایہ زید ہے آج	۳۲۱

صفحہ	قطعات	نمبر شمار
۹۸۳	خوشی ہے یہ آنے کی برسات کے	۳۲۲
۹۸۴	اس کتاب طرب نصاب نے جب	۳۲۳
۹۸۵	سلیم خاں کہ وہ ہے نور چشم واصل خاں	۳۲۴
۹۸۷	اٹھا اک دن گولہ سا جو کچھ میں جوش و حشت میں	۳۲۵
۹۸۸	کیا ان دنوں بسر ہو ہماری مزاغ میں	۳۲۶
۹۹۰	جلس شمع بڈاراں میں جو آجاتا ہوں	۳۲۷
۹۹۰	پیری میں بھی کمی نہ ہوئی تاکہ بھانک کی	۳۲۸
۹۹۱	دیکھ وہ برق تبسم، بسکہ دل بیتاب ہے	۳۲۹
۹۹۲	اک آہ گرم کی تو ہزاروں کے گھر جلے	۳۳۰
۹۹۳	گوڑگانوں کی ہے جتنی رعیت وہ یک قلم	۳۳۱
۹۹۳	ہم نہیں تارے ہیں اور چاند شہاب الدین خاں	۳۳۲
۹۹۴	میرج تک دھوم ہے، کس دھوم سے آیا سرا	۳۳۳
۹۹۴	ایک اہل دروئے سنان جو دیکھا قفس	۳۳۴
۹۹۵	جب کہ سید غلام بابا نے	۳۳۵
۹۹۵	ہزار شکوہ کہ سید غلام بابا نے	۳۳۶
۹۹۶	گھٹتے گھٹتے پاؤں میں زنجیر آدمی رہ گئی	۳۳۷
	سلام	
۱۰۰۱	سلام اسے کہ اگر بادشاہ کہیں اس کو	۳۳۸
	مرثیہ	
۱۰۰۴	ٹاں! اے نفسِ بادِ سحر شعلہ خشاں ہو	۳۳۹
	رباعیات	
۱۰۰۸	اے عشقِ خیرہ سر سخن ساز نہ ہو	۳۴۰

صفحہ	رباعیات	نمبر شمار
۱۰۰۹	دق کا جواب کیوں نہ بھیجا تمہنے	۳۴۱
۱۰۰۹	اسے روشنی دیدہ، شہاب الدین خاک	۳۴۲
۱۰۰۹	جن لوگوں کو بے عجزی سے بدادوت گہری	۳۴۳
	مشرق استعار	
۱۰۱۰	جگر میں ٹوٹ کے سوئی ہوئی سناں پیدا	۳۴۴
۱۰۱۱	خوشی جینے کی کیا، مرنے کا علم کیا	۳۴۵
۱۰۱۱	ان دلفریبیوں سے نہ کیوں اس پر پیار آئے	۳۴۶
۱۰۱۱	دور نگیاں یہ زمانے کی جیتے جی تک ہیں	۳۴۷
۱۰۱۲	سات جلدوں کا پارسل پہنچا	۳۴۸
۱۰۱۲	سے دوسرے دل کو قدرت حق سے ہیں دو طالب	۳۴۹
۱۰۱۳	نیا ز عشق فرض سوزہ اسباب ہوں بہتر	۳۵۰
۱۰۱۳	خدا سے میں بھی چاہوں از روہ مہر	۳۵۱
۱۰۱۳	یا دایا، جو وہ کہتا کہ نہیں واہ! غلط	۳۵۲
۱۰۱۳	نہیں عمر کے ستر ہوئے شمار برس	۳۵۳
۱۰۱۳	پیر و مرشد مہمات کیجئے گا۔	۳۵۴
۱۰۱۴	ولی عہدی میں شاہی ہو مبارک	۳۵۵
۱۰۱۵	درم و دام اپنے پاس کہاں	۳۵۶
۱۰۱۵	میکش کو نہ سمجھ بے حاصل	۳۵۷
۱۰۱۵	تم سلامت رہو قیامت تک	۳۵۸
۱۰۱۶	نہیں بھولا میں کچھ کو اسے میری جاں	۳۵۹
۱۰۱۶	امیر روتا ہے کہ بزم طرب آمادہ کر دو	۳۶۰
۱۰۱۷	دیکھتے ہوں اسے حتیٰ جس کی تمنا کچھ کو	۳۶۱

صفحہ	متفرق اشعار	نمبر شمار
۱۰۱۴	ہنستے ہیں دیکھو دیکھو کے سب ناتواں بچے	۳۹۲
۱۰۱۴	ماہِ نو ہوں کہ فلکِ عجز سکھاتا ہے بچے	۳۹۳
۱۰۱۴	صبا! لگا دو طہا پتھر طرف سے بیل کی	۳۹۴
۱۰۱۴	زخمِ دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانتا ہے	۳۹۵
۱۰۱۸	ہم کی کہیں، کسی سے، اپنا طریق کیا ہے	۳۹۶
۱۰۱۸	گلشنِ دہر بھی ہے کوئی سرائے ماتم	۳۹۷
۱۰۱۸	پھر مرتبہ بڑھایا مرا نفی غیر نے	۳۹۸
۱۰۱۹	آج مجھ سانسین بدنام زمانے میں کوئی	۳۹۹
۱۰۱۹	زرد قنار مانگ ہے اور سبز اس پرہاک دوشِ لالہ ہے	۴۰۰
۱۰۱۹	بتو! توبہ کرو، تم کیا ہو، جب دوبار آتا ہے	۴۰۱
۱۰۱۹	بجائے شہر میں، اگر چھوڑ دوئی جج کو چلی	۴۰۲
۱۰۱۹	روڈ اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے	۴۰۳
۱۰۲۰	مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنالیا ہے	۴۰۴
۱۰۲۰	ہو کر شہیدِ عشق میں پائے ہزار جسم	۴۰۵
۱۰۲۰	دہم واپسیں برسرِ راہ ہے	۴۰۶
	منمنو کی	
۱۰۲۱	ایک دن مثلِ پتنگ کا غدی	۴۰۷
	ضمیمہ دوم	
۱۰۲۵	اسد! ہر جانسن نے طیرِ باغِ تازہ ڈالی ہے	۴۰۸
۱۰۲۵	تنگی رشتہ رہ سکتی، عدم یا وجود تھا	۴۰۹
۱۰۲۶	ہے کہاں تمنا کا، دوسرا قدم، یارب	۴۱۰
۱۰۲۷	جس قدر جگر خوں ہو، کوچہ وادِ دل ہے	۴۱۱

صفحہ	ضمیمہ دوم	نمبر شمار
۱۰۲۸	کچھ کھٹکتا تھا میرے سینے میں، لیکن آخر	۳۷۲
۱۰۲۹	ناتوانی ہے تماشا ثانی عمر رفتہ	۳۷۳
۱۰۳۱	زبیں آتش نے فصل رنگ میں رنگ دگر پایا	۳۷۴
۱۰۳۱	ہم نے وحشت کردہ یزید جہاں میں، جوں شیخ	۳۷۵
۱۰۳۱	نہ پائی وسعت جولاں یک جنوں ہم نے	۳۷۶
۱۰۳۲	شرر فرصت نگہ، سامان یک عالم چراغاں ہے	۳۷۷
۱۰۳۲	بہ صورت تکلف، بہ معنی تاسف	۳۷۸
۱۰۳۳	ضعیف جنوں کو وقت تپش در بھی دُور تھا	۳۷۹
۱۰۳۳	یو قت سرنگونی ہے تصور انتظارستان	۳۸۰
۱۰۳۴	برگام آہے سے ہے، دل، در تہ قدم	۳۸۱
۱۰۳۵	خود پرستی سے رہے باہد گر نا آشنا	۳۸۲
۱۰۳۶	دو دو میرا نسبتان کی کرے ہے ہمیری	۳۸۳
۱۰۳۶	ہوں قطرہ زن بہ دلدی حسرت شبانہ روز	۳۸۴
۱۰۳۷	بہ ہوس در دسراہل سلامت، تا چند	۳۸۵
۱۰۳۷	دکھا غفلت نے دُور افتادہ ذوق فنا ورنہ	۳۸۶
۱۰۳۷	پریشانی سے مغرور ہو اے بے باک	۳۸۷
۱۰۳۸	یہ رہن شرم ہے، باوصف شوخی اہتمام اس کا	۳۸۸
۱۰۳۹	عشق میں ہم نے ہی ابرام سے پرہیز کیا	۳۸۹
۱۰۳۹	دُود کو آج اس کے ماتم میں یہ پوشی ہوئی	۳۹۰
۱۰۴۰	اے آبلہ کرم کر، یاں رنج یک قدم کر	۳۹۱
۱۰۴۰	اے خوش ذوق تنائے شہادت کو اند	۳۹۲
۱۰۴۱	پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے	۳۹۳

صفحہ	صفحہ دوم	نمبر شمار
۱۰۴۱	اسد! اربابِ فطرتِ قدر دانِ لفظ و معنی ہیں	۳۹۴
۱۰۴۲	عیب کا دریافت کرنا ہے ہنری مندی، اسد!	۳۹۵
۱۰۴۲	سر منزلِ ہستی سے ہے صحرا سے طلبِ دور	۳۹۶
۱۰۴۲	بہ ہر نام و جو بوسہ گلِ پیام رہا۔	۳۹۷
۱۰۴۲	اسد! مایوسِ موت ہو اگر چہ رونے میں اثر کم ہے	۳۹۸
۱۰۴۳	عمر میری ہو گئی صرف بہارِ حسنِ یاد	۳۹۹
۱۰۴۳	جاتا ہوں بدھِ سب کی اسٹے ہے ادھر انگشت	۴۰۰
۱۰۴۴	ہے سوانیز سے پہاڑی کے قامتِ تو نیز سے	۴۰۱
۱۰۴۷	دو عالم کی ہستی پہ خط و خاکِ پرخ	۴۰۲
۱۰۴۸	آہنگِ اسد میں نہیں جزِ نغمہٗ بیدل	۴۰۳
۱۰۴۸	مختی نگہ میری ہنسا سخاۃٴ دل کی نقاب	۴۰۴
۱۰۴۹	لاٹھ آیا زخمِ تیغِ یار سا پہلو نشیں	۴۰۵
۱۰۵۰	بزم، داغِ طرب و باغِ اکشادِ پیرونگ	۴۰۶
۱۰۵۱	کمالِ بندگی گل ہے رہنِ آزادی	۴۰۷
۱۰۵۲	نظم کرنا گدا سے عاشق پر	۴۰۸
۱۰۵۳	ہر گردِ بادِ حلقہٴ منتر اک بے خودی	۴۰۹
۱۰۵۳	فریبِ صنعتِ ایجاد کا تماشا دیکھ	۴۱۰
۱۰۵۴	صدِ سخیل کدہ ہے صرف جہیں عزت	۴۱۱
۱۰۵۵	کون آیا؟ جو چین بے تابِ استقبال ہے	۴۱۲
۱۰۵۶	بھی میرے ہی جلانے کو اسے آہِ شعلہٴ ریزا	۴۱۳
۱۰۵۷	تا قیامت شبِ فرقت میں گزر جائے گی عمر	۴۱۴
۱۰۵۷	آئے ہیں پارہ ہائے جگر درمیانِ اٹک	۴۱۵

صفحہ	ضمیمہ دوم	نمبر شمار
۱۰۵۷	اے آرزو شہیدِ وفا! خون بہا نہ مانگ	۴۱۶
۱۰۵۸	مڑگاں تلک رسائی لعلتِ جگر کہاں	۴۱۷
۱۰۵۸	بدر ہے آئینہ طاقِ بلال	۴۱۸
۱۰۵۹	ہو جو بلبلِ پیرو فکرِ اسد	۴۱۹
۱۰۵۹	ہر عضو غم سے ہے شکنجہ آسائستہ دل	۴۲۰
۱۰۵۹	ہم غلط سمجھے تھے، لیکن زخمِ دل پر رحم کر	۴۲۱
۱۰۶۰	گر کرے انجام کو آغاز ہی میں یاد، گل	۴۲۲
۱۰۶۰	شوق بے پروا کے ہاتھوں مثل سازِ نادرس	۴۲۳
۱۰۶۱	ہر قدرِ حوصلہ عشقِ جلوہ ریزی ہے	۴۲۴
۱۰۶۱	فرطِ بے خوابی سے ہیں شہبازے، بھر یار ہیں	۴۲۵
۱۰۶۲	نفس ہونہ معزول شعلہ دروؤں	۴۲۶
۱۰۶۳	میراوریہ ادا کہ دل آدے اسیرِ چاک	۴۲۷
۱۰۶۳	وہ التماسِ لذتِ بیداد ہوں کہ میں	۴۲۸
۱۰۶۴	فلک شعلہ بے محابا ہے	۴۲۹
۱۰۶۴	آئینہ کھوں، کہ آہ! سوار ہوا کہوں	۴۳۰
۱۰۶۵	میر کے شر کا احوال کہوں کیا غالب	۴۳۱
۱۰۶۵	کسی کو نہ خود رستہ کم دیکھتے ہیں	۴۳۲
۱۰۶۵	ناگوارا ہے ہمیں احسانِ صاحبِ دولتوں	۴۳۳
۱۰۶۵	ہے نزاکتِ بیکہ فضلِ گل میں معمارِ چین	۴۳۴
۱۰۶۶	دقت ہے گر بلبلِ مسکین زلفِ نانی کرے	۴۳۵
۱۰۶۶	کس دل پر ہے عزمِ صفتِ مڑگاں خود آرا	۴۳۶
۱۰۶۷	کی متصل سنارہ شناسی میں عمر صرف	۴۳۷

صفحہ	ضمیمہ دوم	تقریر شمار
۱۰۶۹	نہ انشا، معنی مضمون، نہ اظہار، صورت موزوں	۴۳۸
۱۰۶۹	اے تو اس از تماشا! سر کجفت جلتا ہوں میں	۴۳۹
۱۰۷۰	طلسم مستی دل آل سوئے ہجوم سرشک	۴۴۰
۱۰۷۱	ہوئی ہیں آب شرم کوشش بے جا سے تدبیریں	۴۴۱
۱۰۷۲	کس کو دہل یارب! حساب سوز نہ کیا تھے دل	۴۴۲
۱۰۷۲	ہو سکے کب کلفتِ دل، مانع سیلان اشک	۴۴۳
۱۰۷۲	ہے وطن سے باہر اہل دل کی قدر و منزلت	۴۴۴
۱۰۷۳	بہ یادِ قامت اگر ہو بلند آتشِ غم	۴۴۵
۱۰۷۴	بے درد سر بہ سجدہ الفت مژدہ ہو	۴۴۶
۱۰۷۴	بہر حال بد و بدون یعقوب بالِ خاک سے	۴۴۷
۱۰۷۵	کتا تھا کل وہ نامہ رسالہ سے یہ سوزِ دل	۴۴۸
۱۰۷۵	خلق ہے صفحہٴ عبرت سے سبق ناخواندہ	۴۴۹
۱۰۷۶	واسطے فکر مضامینِ مثنیٰ کے، غالب	۴۵۰
۱۰۷۷	تا تخلص جامہٴ مشکِ فی اوزانی اسد	۴۵۱
۱۰۷۷	شکوہ و شکوہ کو ثمرِ بیم و امید کا کچھ	۴۵۲
۱۰۷۸	گو تم کو رخصتا جوئی اختیار ہے، لیکن	۴۵۳
۱۰۷۸	مجھے معلوم ہے جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے	۴۵۴
۱۰۷۹	کرتے ہو شکوہ کس کا؟ تم اور بے وفائی	۴۵۵
۱۰۷۹	مگر مصیبت سخی تو غربت میں اٹھائے اسد	۴۵۶
۱۰۷۹	کیا غم ہے اس کو جس کا علی سا امام ہو	۴۵۷
۱۰۸۰	امامِ ظاہر و باطن، امیرِ صورت و معنی	۴۵۸
۱۰۸۰	بے چشمِ دل نہ کر ہو میں سیرِ لالہ زار	۴۵۹

صفحہ	ضمیمہ دوم	نمبر شمار
۱۰۸۰	تا چند پست فطرتی طبع آرزو	۴۶۰
۱۰۸۱	بہایاں ننگ ہے اشکوں میں غبارِ کلفتِ خاطر	۴۶۱
۱۰۸۱	ہم مشتقِ فکر و صل و علم ہجر سے، اشد!	۴۶۲
۱۰۸۱	پیدا کریں دماغِ تماشا نے سر و دگل	۴۶۳
۱۰۸۲	وقت اس افتادہ کا خوش ہو قناعت سے اشد	۴۶۴
۱۰۸۲	اسے سر شوریدہ! ذوقِ عشق و پاس آبد	۴۶۵
۱۰۸۲	ترے نوکر، ترے در پر، اشد کو ذبح کرتے ہیں	۴۶۶
۱۰۸۳	وا کیا ہرگز نہ میرا عقدہ تارِ نفس	۴۶۷
۱۰۸۳	تمثالِ جلوہ عرض کر اسے حسنِ اکب تک	۴۶۸
۱۰۸۴	یادِ اب! ہمیں تو خواب میں بھی مت دکھائیو	۴۶۹
۱۰۸۴	مدعا در پردہ، یعنی جو کہوں باطلی سمجھ	۴۷۰
۱۰۸۵	کیا ہے ترکِ دنیا کا بلی ہے	۴۷۱
۱۰۸۶	خواباتِ جنوں میں ہے اشد! وقتِ مدحِ نوشی	۴۷۲
۱۰۸۶	رنگ ہے آسائشِ اربابِ غفلت پر، اشد!	۴۷۳
۱۰۸۶	ہم نشینیِ رقیباں گرچہ ہے سامانِ رنگ	۴۷۴
۱۰۸۷	کیا کروں، غم مائے پنہاں لے گئے صبر و قرار	۴۷۵
۱۰۸۷	نے حسرتِ تلی، نے ذوقِ بے قراری	۴۷۶
۱۰۸۷	آب ہو جلتے ہیں ننگِ ہمتِ باطل سے مرو	۴۷۷
۱۰۸۸	اسد نے کثرتِ دہائے خلق سے جانا	۴۷۸
۱۰۸۸	رخسارِ یاد کی جو ہوئی جلوہ گسری	۴۷۹
۱۰۸۹	اسد! دارِ سنگاہِ بادِ صفتِ ساماں بے تعلق ہیں	۴۸۰
۱۰۸۹	خبر ننگہ کو، ننگہ چشم کو مدد جانے	۴۸۱

صفحہ	ضمیمہ دوم	نمبر شمار
۱۰۹۰	بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو غائب! تو پھر	۴۸۲
۱۰۹۰	صبح سے معلوم آثارِ ظہورِ شام ہے	۴۸۳
۱۰۹۱	توڑ بیٹھے جب کہ ہم جامِ دیبا، پھر ہم کو کیا	۴۸۴
۱۰۹۱	فناں کہ بہرِ شفا نے حصولِ ناشدنی	۴۸۵
۱۰۹۱	اے اسدا آباد ہے مجھ سے جہاں شاعری	۴۸۶
۱۰۹۲	کچھ نہیں حاصلِ تعلیق ہیں بغیر از کشمکش	۴۸۷
۱۰۹۲	اسدِ باد صفتِ عشق بے تکلف خاک گردِ دیدن	۴۸۸
۱۰۹۲	تا چند نازِ مسجدِ وثق قائم کیسے	۴۸۹
۱۰۹۳	نہ حیرت چشمِ ساقی کی، نہ محبتِ دورِ سانو کی	۴۹۰
۱۰۹۵	سنگِ آمد و سختِ آمدِ دورِ دیبا خود داری	۴۹۱
۱۰۹۵	جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد	۴۹۲



مقدمہ

از

غلام رسول مہر

مختصر

۱۔ اصل و نسب - اسد اللہ بیگ خاں نام، استاد اور غالب تخلص، اقوام ترک
۲۔ وجب سال ۱۲۱۲ھ (۱۸۰۶ء) بمبر ۱۹۹۷ء کی شب میں طلوع سحر سے چار گھنٹہ پہلے بمقام گڑ
پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنے آپ کو سلجوقی و افراسیابی و چنگی کہا ہے، لیکن ہے، ان دعاؤں
کی تصدیق و توثیق کے لیے مستند تاریخی دستاویزیں پیش نہ کی جاسکیں، اس لیے کہ تاریخ کے
نزدیک تو سلجوقیوں اور افراسیاب و چنگ کا باہمی تعلق بھی محلی نظر ہے، لیکن اس حقیقت
میں کوئی شبہ نہیں کہ دادا، میرزا قرقان بیگ خاں سمرقند سے ہندوستان آئے تھے
اور وہ سلاطین ایک ترک تھے۔ نیز میرزا غالب کی خانہ دانی روایات وہی تھیں، جو انھوں نے
وقتاً وقتاً نظم و نثر میں جا بجا بیان کیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ان روایات کے ایک ایک حرف
کی توثیق غالب کی عظمت میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتی اور عدم توثیق سے اس عظمت میں کوئی کمی نہیں ہو
سکتی، اس لیے کہ غالب نے جس دائرے میں وہ جگہ کمال حاصل کیا، وہ افراسیاب و چنگ کی داستان آماجیوں
اور سلجوقیوں کی کشور کشائیوں سے بالکل الگ ہے۔

حیدر احمد میرزا اوقیان بیگم خاں کے ترک وطن کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ کسی بات پر اپنے والد ماجد سے ناراض ہو گئے تھے۔ نظر یہ ظاہر وہ تھا نہ آئے ہوں گے بلکہ نہ دیکھیں یا بڑی جہیت ساتھ لائے ہوں گے۔ اگرچہ غلوں کی عظمت و شوکت کا درخشاں دور گزر چکا تھا اور سلطنت شکست و انحراہ کی آخری منزل میں پہنچی ہوئی تھی، تاہم بہادروں اور جانبازوں کی طلب اس زمانے میں بھی باقی تھی چنانچہ میرزا اوقیان بیگم خاں لاہور پہنچے تو ہمیں الملک علی

میرزا نائم خجابت نے انھیں اپنے پاس رکھ لیا۔ یہ اٹھارہویں صدی کے وسط کا واقعہ ہے، لیکن
 حسین الملک کی وفات کے بعد میرزا قوقان بیگ خاں کے کم و بیش بیس برس کے حالات پر تاریکی
 کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہ کہاں کہاں رہے؟ کیا کیا خدمات انجام دیں؟ یہ ظاہر ہے کہ
 کے سرا انھیں کسی مشغلے سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ جب شاہ عالم ثانی الوداع سے واپس مٹی گئے۔

اور ذوالفقار الدولہ بخت خاں کی فطری کا دور شروع ہوا تو پھر میرزا قوقان بیگ خاں کا ذکر آگیا
 تو یہ کہ خیریت نہ ہے کہ کیسے تعلق بلند شہر میں پاس کا تعلق ذات اور سالے کے تعلق کے لیے تعلق آ گیا،
 تاہم اس زمانے میں میرزا قوقان بیگ خاں نے شادی کی اور میرزا غالب کے والد عبد اللہ بیگ خاں کے بیٹے بن گئے۔

بخت خاں نے اپنی بہت و شجاعت اور تدبیر و تدبیر سے سلطنت کے بگڑے ہوئے نظام
 کی درستگی کا بندوبست شروع کر دیا تھا۔ سلطنت میں اس کی وفات پر پھر انتشار و بد نظمی کا پہلا
 دور نمودار آیا اور میرے اندازے کے مطابق سلطنت میں میرزا قوقان بیگ خاں بہت سے
 دوسرے ترکوں کے ساتھ سلطنت واپس سے قطع تعلق کر کے ریاست جے پور میں ملازم ہو گئے۔
 غالباً اسی لیے دہلی کی سکونت چھوڑ کر آگرہ میں مقیم ہوئے اور وہیں وفات پائی۔ ان کے بیٹے بھی
 تھے اور بیٹیاں بھی۔ یہیں صرف دو بیٹوں کا کسی قدر حال معلوم ہے، ایک غالب کے والد
 میرزا علی بیگ خاں، دوسرے ان کے چھوٹے بھائی نصر اللہ بیگ خاں۔

والد اور چچا: عبداللہ بیگ خاں کی شادی آگرہ کے رئیس غلام حسین خاں کسیدان کی
 صاحبزادی عزت النساء بیگم سے ہوئی۔ اس سے اندازہ جڑا ہے کہ خود میرزا قوقان بیگ خاں
 بھی آگرہ کے رؤسا میں شمار ہوتے تھے۔ عبداللہ بیگ خاں پہلے کھننویں آصف الدولہ کے
 پاس، پھر حیدر آباد وکن میں نظام علی خاں کے پاس ملازم رہے۔ آخری ملازمت جانی رہی تو
 آگرہ چلے آئے۔ پھر تلاش معاش کے لیے اور کا قصد کیا۔ ایک سرکش زمیندار کی تادیب کا
 حکم ملا۔ اس قضیے میں گولی کھا کر جاں بحق ہوئے اور راج گڑھ میں انھیں دفن کیا گیا۔ پشاور
 کا واقعہ ہے۔ تین بچے چھوٹے، ایک بیٹی اور دو بیٹے۔ بیٹی سب بیٹوں سے بڑی تھی۔ بیٹوں
 میں اسد اللہ بیگ خاں غالب کی عمر پانچ برس کی تھی اور ان سے چھوٹے یوسف خاں
 صرف تین برس کے تھے۔ قیاس کتاب ہے کہ وفات کے وقت عبداللہ صاحب بیگ خاں کی عمر

تیس سے اوپر نہیں لیجے ہی ہوگی۔

نصرت اللہ بیگ خاں نے مرحوم بھائی کے قیمتی پتھروں کی پرورش اپنے ڈسٹے لے لی۔ مرہٹوں کی طرف سے انھیں آگرہ میں صوبیداری کا منصب حاصل تھا۔ جب آگرہ مستعمر ہو گیا تو فتح کر لیا تو نصرت اللہ بیگ خاں کو چار سو سوار کا رسالدار بنا دیا اور ایک ہزار سات سو روپے ماہانہ مشاہرہ مقرر کیا۔ پھر نصرت اللہ بیگ نے ضلع متھرا کے دو پرگنوں (سونک اور سونام مرہٹوں سے) پر زور چھین لیا۔ لاٹ ڈیک نے یہ پرگنے بھی تاحیات انھیں کے حوالے کر دیئے ان کی آمدنی لاکھ ٹریڈ لاکھ بتائی جاتی تھی۔ اس طرح چند سال بعد اہلیان گزر گئے۔

قیام دہلی اور وفات : یہ حالات تھے، جن میں غالب نے مرہٹوں کی آنکھ کھولی۔ تاہم بہت بڑے رئیس اور جاگیردار تھے، چچا بھی بہت بڑے تنخواہ دار اور رئیس تھے۔ باپ اور دادا کا پایہ بھی بہت بلند تھا اور یہ امر متنازع تصدیق نہیں کہ انیسویں صدی کے اوائل میں اس قسم کے خوشگوار خاندانی حالات بہت کم لوگوں کو میسر تھے۔ اچانک مستعمر میں نصرت اللہ بیگ خاں بھی غالباً میدان جنگ ہی میں مذراہل ہوئے۔ ساتھ ہی رسالہ ٹوٹ گیا، تنخواہ ختم ہو گئی، جاگیر واپس لے لی گئی اور موتی کے متعلقین کے لیے پہلے دس ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر ہوا۔ ایک ماہ بعد اس وظیفے کو گٹھا کر پانچ ہزار کر دیا گیا۔ پھر اس رقم میں سے دو ہزار ایک ایسے شخص کے لیے تجویز ہوئے، جسے نصرت اللہ بیگ خاں کے خاندان سے کوئی ایسا تعلق نہ تھا کہ وظیفے میں انہوں نے استحقاق حقدار بن سکتا۔ گویا مرحوم کے اصل متعلقین کے لیے صرف تین ہزار روپے سالانہ رہ گئے۔ ان میں سے ٹریڈ ہزار بہ حقدار صاوی عبداللہ بیگ خاں کے دو بیٹوں کے لیے تھے، ساتھ سے سات سو میرزا غالب کے اور اتنے ہی میرزا یوسف کے لیے۔

نصرت اللہ بیگ خاں کی شادی نواب احمد بخش خاں والی خیر ونہر دھرم کا ولودار کی بہن سے ہوئی تھی اور بعض ادباء علم و نظر کا خیال ہے کہ دونوں خاندانوں میں پہلے ہی اس قسم کے روابط موجود تھے۔ اس بنا پر میرزا غالب کی شادی ۲۰ رجب ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) میں کو نواب احمد بخش کے چھوٹے بھائی نواب الہی بخش خاں معروف کی صاحبزادی امرائیکم سے

ہوئی۔ سرلستہ برس کی عمر میں غالب آگرہ کی سکونت چھوڑ کر مستقل طور پر دہلی میں مقیم ہو گئے۔ وہیں قریباً ساٹھ سال گزار کر ۲۱ ذی قعدہ ۱۲۷۵ھ (فروری ۱۸۵۹ء) کو دنیا پا کر تینتر سال اور کچھ دن کم چار ماہ عمر ہوئی۔ نظام الدین میں چوتھوں نے کتب و مقبرہ عزیز کو کشتہ کے پاس نواب الہی بخش خان معروف کے احاطے میں انھیں دفن کیا گیا۔ اب وہاں سنگ مر مر کا شاییت خوبصورت مقبرہ بنا دیا گیا ہے۔

غالب نے اردو اور فارسی نظم و نثر میں جو کچھ لکھا، اُسے الگ الگ کتابوں کی شکل میں گینا جاتے تو تعداد تیس کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ فارسی نظم و نثر میں وہ ان تمام اساتذہ کے ہمسر نظر آتے ہیں، جن پر اس زبان کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ لیکن پاک و ہند میں ان کی عظمت کا حقیقی پیمانہ اردو کا مختصر سا دیوان اور اس کے بعد اردو مکاتیب ہیں۔

تعلیم: میرزا غالب نے آگرہ کے مشہور معلم غنی محمد معتمد سے تعلیم پائی، عربی جیسا کہ وہ کہتے ہیں، شرح آثار عالم تک پڑھی۔ فارسی سے طبیعت کو خاص مناسبت بھی تھی اور اس پر توجہ دینا بھی کوئی دقیقہ سہی اٹھا نہ رکھا۔ ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) میں ایک نو مسلم ایرانی فاضل ملا عبد القدوس طریق سیاحت ہندوستان آئے اور دو برس آگرہ اور دہلی میں غالب کے پاس مقیم رہے، ان کی صحبت سے میرزا نے بہت فائدہ اٹھایا۔ تعجب ہے کہ اس امتنا کا وجود بھی اب تک بعض ارباب علم و فضل میں موضوع بحث بنا ہوا ہے اور اس بارے میں شک و شبہ کی ابتداء غالباً خواجہ حالی مرحوم کے اس بیان سے ہوئی۔

”و کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ مجھ کو مبداء فیاض کے

سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے اور عبد القدوس محض ایک فرضی نام ہے چونکہ مجھ کو

لوگ بے استادا کہتے تھے، ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد لکڑ

پایا ہے“ (ڈیوکار غالب، ص ۱۱)

خواجہ حالی نے یقیناً وہی لکھا، جو کچھ سنا۔ ممکن ہے میرزا غالب نے عالم سرخوش میں

ایک سے زیادہ مرتبہ اس قسم کی بات کہہ دی ہو، لیکن اس میں جس استاد کی فنی کی گئی ہے

صاف ظاہر ہے، کہ اس کا تعلق تعلیم و تعلم سے نہیں، بلکہ صرف شاعری سے ہے یعنی میرزا

تھے اس عہد کے عام دستور کے خلاف شاعری میں کسی کے سامنے نہ آئے تھے نہ کیا اور عہدِ صفوی کو بھی مستثنیٰ نہیں کیا جاسکتا۔ میرزا کا اسلوب اگر و نظر نہ کسی ہاں تھا تو اس کا مختلف ہو سکتا تھا اور یہ کسی کے لئے نہ تھے انہیں کوئی فائدہ پہنچ سکتا تھا، بلکہ نقصان بھی پہنچتا، اس لیے کہ خدا داد صلاحیتوں کے طبعی نشو و نما میں کم یا زیادہ رکاوٹ پیدا ہوتی اور مختلف منزلیں طے کرتے ہوئے انہیں جس مقام پہنچنا تھا، یا تو بالکل بندھ چکتیں یا اتنی دیر میں پہنچتیں کہ زندگی کی جہالت ہی تمام ہو جاتی۔

بہر حال خواجہ صاحب کی پیش کردہ روایت سے اس کا موقع اور محل ہم سے مخفی ہے تعلیم و تعلم کی نفی نہیں ہوتی۔ بلاشبہ میرزا نے شاعری میں جو کچھ حاصل کیا، مبدیہً قیاس سے حاصل کیا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہیں عام طریق تعلیم پر کاربندی کے بغیر ہی سب کچھ آگیا۔ یعنی پڑھنے لکھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی اور جب خلیفہ محمد معظم سے تعلیم پامستلم ہے تو پھر ملا عہدِ صفوی سے فارسی زبان کے تقاضے سیکھنے کو محلی نظر قرار دینا باعث تعجب ہے، اس بارے میں دقیقہ سنجیاں، بلکہ مشککیاں اس درجہ دوزخاں ہیں کہ اہل علم کی طرف سے ان میں سبوتاہ وقت و نظر سراسر حیرت افزا ہے۔

عجیب بات ہے کہ خواجہ صاحب کی اس روایت کو بنیاد بنا کر بحث و استدلال کی بڑی بڑی جہازیں اٹھانے والے بزرگ یہ خیال نہیں فرماتے کہ وہ قدم آگے چل کر یا دگرا رہی ہیں یہ روایت بھی درج ہے:

”نواب مصطفیٰ خان مرحوم کہتے تھے کہ ملا محمد احمد کے ایک خط میں جو اس نے میرزا کو لکھی، دوسرے خاک سے بیجا تھا، یہ فقرہ بھی لکھا تھا: اسے عزیز ہے کسی کہ ہمیں ہمسازاوی گاہ گاہ یہ خاطر گزری۔ (میرزا دگرا رہے)“

میرزا غالب کی داستانِ زمی اور صداقت شاعری کا فیصلہ قصوری دیر کے لیے ملتی ہے فرمائیے، کیا نواب مصطفیٰ خان شیعہ کا شہید یعنی معاذ اللہ وہی تھا جو میرزا غالب کا مانا جاتا؟ معاملہ صرف اتنا ہے کہ میرزا غالب نے فارسی زبان کے متعلق جو بنیادی حقائق پیش کیے راجد جن کی کوئی مثال اس عہد یا پیشتر کے عہد میں نہیں ملتی، وہ یا تو کسی سے سیکھے یا خود وسیع مطالعہ سے پیدا کیے۔ فریق قیاس یہی ہے کہ کہیں نہ کہیں سے رہنمائی کی روشنی حاصل

کی رہبر و وسعت مطالعہ، وقت نظر اور حسن ذوق کی بنا پر ان کے متعلق غالب ہیں اور غالب ہی کا ہو گیا۔ اب اگر یہ روشنی تو محمد العتق سے ہی، جیسا کہ میرزا غالب نے کہا اور شہادت کے بیان سے اس کی تائید مزید ہوئی، تو اس باب میں رد و تکذ کی صفیں بچھانے اور لیٹھنے سے دنیائے علم کے کون سے بچے آ کر گشتے میں آ کر دکانی کا بندوبست ہو سکتا ہے؟

شعر گوئی:

میرزا ابتداء سے تیز ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ اس بارے میں ان کے مختلف بیانات موجود ہیں جن میں آغاز نو شاعری دس پندرہ کے دوران سائز نظر آتا ہے۔ میرزا خیال ہے کہ سلسلہ دس گیارہ برس ہی کی عمر میں شروع ہو گیا تھا، مگر جن اشعار کو کلام کی حیثیت میں محفوظ رکھنے لگے۔ وہ پندرہ برس یا اس کے آس پاس ہی کی عمر کے ہوں گے۔

شعر گوئی کی ابتدا اردو زبان میں ہوئی، جو میرزا کی مادری زبان تھی، مگر ظہور سے کبھی کبھی، وہ فارسی بھی کہتے ہوں گے۔ ان کے ابتدائی دور کے اردو اشعار دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ وہ فارسی زبان میں ترقی کی خاصی منزلیں طے کر چکے تھے۔ لیکن مطالعہ کے آغاز میں انھوں نے ان فارسی اشعار کا کلام بڑے ذوق و شوق سے دیکھا تھا، جنھیں خیال بند مانا جاتا ہے۔ مثلاً جلال امیر شوکت بخاری، بیدل عظیم آبادی، غلام بیگلہ سے وہ اس درجہ متاثر ہوئے کہ اردو میں بھی انہی کا انداز اختیار کر لیا، حالانکہ اردو اپنی سادگی میں خیال بندی کے دقائق کی تحمل نہیں دے سکتی تھی۔ لہذا غالب کو میرزا فارسی کا سہارا لینا پڑا۔ یوں ان کے ابتدائی اشعار علم اردو شعروں کے مقابلے میں بہت مغلق اور پیچیدہ ہو گئے۔ جب وہیں دنگر نے درجہ بلور حاصل کیا اور نیک و بد کی تمیز پیدا ہوئی تو بیشتر اشعار تو علم زدہ کو بیچے اور انہیں مستند کلام کے درجے سے خارج ہی کر دینا مناسب تھا۔ ۱۹۲۱ء میں نسخہ حمید علیہ کے نام سے مجموعہ شائع ہوا، اس سے غالب کے شاعرانہ کمالات میں ہرگز کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا تھا، البتہ فکر غالب کے ارتقائی مدارج معلوم کرنے کے لیے اسے حدود حیرت انگیز قدیم و جدید مانا جاسکتا ہے۔

اندازہ ہے سب کچھ بے ہوشی اور بے فکرانہ انداز یا وہ ترانہ دہی میں شعر کہتے ہیں۔
 پھر زاری کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس وقت سے زیادہ تر فارسی نظم و نثر ہی لکھتے ہیں۔ اگرچہ
 اس دور میں بھی وقتاً فوقتاً سنجیدہ کتب لکھتے رہے۔ مثلاً اکسٹوریانہ کے شاعروں کے لیے غزلیں لیکن
 وہ اصلاً فارسی ہی کے شاعر تھے۔ اسی دور کے شعلق و عرونی کیا تھا۔

فارسی میں اب مرثیہ نقشہ لے رنگت لگ بگزنار و محو و مدح و سیر و گلاب میں امت
 مشاعرہ میں قلم سے لازمات کا تعلق پیدا ہوا تو پھر سنجیدہ گوئی کی طرف زیادہ توجہ
 ہو گئی۔ ان کا ہنرمندانہ اور دکھلاؤ سہی دور کا ہے۔ بعض غزلیں ایسی ہیں کہ فارسی زبان کے
 پیش برسانہ نہیں ہیں۔ جیسے جہاں ہر پاسے شاعر ہی مل سکیں۔

ایک افسانہ اردو شاعری کے سلسلے میں بھی ایک انشانہ مشہور ہے۔ یعنی یہ کہ غالب
 مستم الدین حیدر خاں نے غالب کا ابتدائی کلام لکھنؤ میں میر تقی کو دکھایا تو میر صاحب نے کہا
 کہ اس طرح کے کلام کو کامل نہ سمجھتے۔ مگر ڈال دیا تو لا جواب شاعر ہی جانے لگا۔ اور نہ
 مہمل لکھنے لگے گا لیکن یہ بیان قطعاً قابل قبول نہیں، اس لیے کہ:-

۱۔ تیسرے قادیکی وفات ۲۰ شعبان ۱۲۲۵ھ ۲۰ ستمبر ۱۸۱۰ء کو ہوئی گو یا اس
 وقت میرزا غالب صرف تیسرہ برس ایک۔ چھپنے اور چند دن کے تھے اور اس عمر کے بچے کا
 کلام آنکھ سے لے جا کر لکھنؤ میں میر تقی جیسے کہ نہ مشق استاد کو دکھانے کا خیال بھی کسی کو
 نہیں ہو سکتا تھا۔

۲۔ مستم الدین حیدر خاں دہلی میں رہتے تھے۔ خاندان لودا رو سے تھوڑا اور میرزا غالب
 کے عمر غالب الہی بخش خاں معروف سے خصوصاً ان کے بڑے گھرے تعلقات تھے۔ اسی لیے
 سے غالب کے ساتھ خاص مراسم پیدا ہو گئے، لیکن انہیں یہ کیوں کہ معلوم ہو سکتا تھا کہ غالب
 کہہ سکتی ہیں جیسا کہ شعر کہتے ہیں اور انہیں لکھنؤ لے جا کر میر تقی کو دکھانا چاہیے۔ جبکہ غالب
 کی مستقل سکونت آگرہ میں تھی اور عمر بارہ تیسرہ برس سے زائد۔ یہ تھی۔

۳۔ ۱۸۱۰ء جب ۱۲۲۵ھ ۲۰ اگست ۱۸۱۰ء کو میرزا غالب کی شادی ہوئی۔ اگر

سمجھا جائے کہ اس وقت دہلی میں آمد و رفت شروع ہوئی اور مستم الدین حیدر خاں کو بھی غالب

کے شعر سنے کا موقع ملا تو یہ تعدادت مہینے ڈیڑھ مہینے کی تکمیل سی قنات میں اس پہیلے پرکھوں کر سنی سکتا تھا کہ حسام الدین حمید رنایا میرزا کے اشعار لکھتو لے جا کر میر تقی کو دکھاتے اور ان کے متعلق تیرے صاحب کی رائے آتے ؟

۳۔ اس قول میں ایک سے زیادہ پہلو ایسے ہیں کہ تیرے جیسے معزز شاعر شعر کی زبان پر وہ آہی نہ سکتے تھے ۔

۲۔ ہر حال تیرے بیان کردہ پیش گوئی کو بھی انہیں دانتوں میں شاماکرنا چاہیے جو غالب پسند لوگ غیر معمولی دل و دماغ کے آدمیوں کے متعلق وضع کر دیا کرتے ہیں اور شاید سچی کوئی جڑ آدھی گندا ہو جس کے گرد و پیش ایسی داستانوں کے بدلے قیارت کر دیئے گئے ہوں ، میرزا غالب یقیناً سراجوب شاعر بن گئے مگر سیدھے راستے پر سوہیلے کسی ایسے کسی استاد کی رہنمائی کے مشورے نہ سمجھتے :

شعر غالب نمود و جی و نہ گوئی مجھے
تو دیناں توں گفت کر لیا ہے بہت
اردو دیوان کی کہانی غالب کے اردو دیوان کی ترتیب و انتخاب کے متعلق بھی ایک انسان وضع کر دیا گیا جسے مولانا محمد حسین آزاد مرحوم نے ”آب حیات“ میں شامل کر کے حقیقت کے دوسرے پہلو پر پہنچا دیا ، یعنی مولانا فضل بن خیر آبادی اور میرزا خاں کو تو ان کے دوست ہونے کی حیثیت میں غالب کو سمجھا یا کرتا رہا اسے اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئیں گے ۔ غالب نے کہا :

”محب آتا کچھ کہہ چکا ، تمارک کیا ہو سکتا ہے ، انھوں (مولانا اور میرزا خاں) نے کہا
خیر ہوا ، سو ہوا ، انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو ۔ میرزا نے دیوان حوالے کر دیا
دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا “ (آب حیات ص ۵۱)

اس اقتباس کا بے سرو پا ہونا کسی تفصیل کا محتاج نہیں ۔ غور فرمائیے کہ :

۱۔ اگر شعر کے حسن و خوبی کا تہنہ ہی معیار ہوتا کہ وہ عام لوگوں کی سمجھ میں آجائے تو سنی نظیری وغیرہ کے مقابلے میں ہلالی کا مرتبہ بدتر تھا بلکہ قمر مہتا ۔

۲۔ پھر یہ کیا قول ہے کہ ”اتنا کچھ کہہ چکا ، تمارک کیا ہو سکتا ہے“ اگر میرزا غالب اشعار

کی کم حیثیتی کے قائل ہونے کے لئے نوروہ فرماتے کہ ایسے اشعار قلم انداز کردیجئے جائیں گے مثلاً جو کچھ کتاب ہے، کیا اسے چھاپنا اور شائع کرنا قدرت کی طرف سے لازم ہو جاتا ہے؟

۳۔ مرزا خان کو قوال کے باب میں کچھ معلوم نہیں، مگر نا فضل حتی نقیہ بہت بڑے عالم تھے، ایک کہ یہ بزرگ اشعار کی اچھائی یا برائی کو میرزا غالب سے بہتر سمجھتے تھے جنہیں قدرت نے شعر گوئی ہی کے لیے پیدا کیا تھا اور جن کے متعلق نواب مصطفیٰ خاں ضیققتہ نے ”گلشن بے غار“ میں لکھا تھا کہ:

”مضامین شعری را کما ہر حقیقت فہم و بہ جمیع نکات و لطائف پہلے سے برد و اس کیفیت است کہ مخصوص بعض اہل سخن است۔ اگر طبع سخی شناس حاوی، ہا میں کھتے رہی۔ چہ خوش فکر اگر کیا ب است، اما خوش فہم کیا ب تر خوشا حال شخصے کہ از مرد و شر بے یافتہ و حنہ و بودہ۔ بالجلد نہیں نکلتے سخی نغز گفتار کم تر مرئی شد“ (گلشن بے غار، ۱۳۹)

غرض یہ بیان بھی سراسر افسانہ ہے حقیقت یہ ہے کہ میرزا غالب نے تیز فیک وید ہونے کے بعد خود ہی شعروں کا انتخاب کیا۔ پھر وہ کلکتہ گئے تو وہاں اُنکی رعنا کے نام سے اپنے کلام کا ایک انتخاب تیار کیا۔ اس میں عرشی صاحب کے بیان کے مطابق اردو کے کُل ۳۵۳ شعروں کے تھے۔ پھر ان میں مزید غزلیں شامل ہوئیں اور دیوان کی بقیہ سرگزشت خلاصہ یہ ہے:

۱۔ اردو دیوان پہلی مرتبہ شعبان ۱۲۵۶ھ (اکتوبر ۱۸۴۱ء) میں سید محمد خاں بزاز مرید سوم کے مطبع ”سید المطابع“ میں چھپا۔ یہ ایک سو آٹھ صفحات پر مشتمل تھا اور اس میں کل ایک ہزار پانچ نوے شعر تھے۔

۲۔ پھر ثوابی الاولیٰ ۱۲۶۳ھ (جولائی ۱۸۴۸ء) میں مطبع دارالاسلام واقع حوض قاضی نے نواب ابن احمد کھنڈوی کے زیر اہتمام دیوان دوسری مرتبہ چھاپا۔ اس میں کُل ایک ہزار ایک سو گیارہ شعر تھے، یعنی طبعِ اول سے صرف سولہ شعر زیادہ۔ چر وہ شعر اس غزل کے تھے جو مردہ اردو دیوان کی آخری غزل ہے، یعنی ”جاں کے لیے“ آسمان کے لیے وہ شعر جس کی

والے قطعے کے تھے۔ گریہ ۱۸۳۱ء سے ۱۸۳۳ء تک اردو زبان میں ان کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر ۱۸۳۶ء تک طبع دیوان کی فہرست نہ آئی۔

۱۸۳۶ء سے ۱۸۳۸ء تک جو کچھ کاغذ اور یا وہ ترشہ و غزلیں اسی دور میں کہی گئی تھیں، وہ سب قلمی نسخوں میں مرقوم ہوئے اور ۱۸۳۸ء کے جنگلہ میں تلف ہو گئے اور آغا بہنگامہ سے کچھ دستہ پیشتر غالب نے اپنے اردو دیوان کا ایک نسخہ خوش نویس سے لکھوا کر نواب دوست علی خاں والی رام پور کے پاس بھیج دیا تھا۔ ۱۸۳۸ء میں رام پور گئے تو اس نسخے کی نقل لے آئے۔ اسے پہلے میرٹھ میں چھپنے کے لیے دیا۔ پھر فشی شیونرائٹ آرام کے پاس آگرا بھیج دیا۔ وہاں طباعت میں تاخیر ہوئی تو مرزا غالب نے دیوان کا ایک اور نسخہ دہلی میں مولوی محمد حسین خاں تحسین کے حوالے کر دیا۔ چنانچہ دیوان تیسری مرتبہ مطبع احمدی واقع شاہدہ دہلی میں باہتمام امردان طبع ہو کر ۲۰۔ محرم الحرام ۱۲۵۷ھ (۲۸ جولائی ۱۸۵۷ء) کو شائع ہوا۔ اس میں کل ایک جزو صلت سو چھیانوے اشعار تھے۔

۴۔ اس دیوان کا خط بھی اچھا نہ تھا نیز غالب کی روش کے خلاف بہت سے الفاظ ملا کر لکھے گئے تھے۔ اور عطیایاں بہت رہ گئی تھیں، اس لیے کہ کاتب نے قصص کا پورا خیال نہیں کیا تھا۔ مرزا غالب نے مطبوعہ دیوان کی خود تصحیح کی اور اس میں چھ شعر بڑھا دیئے، جو غالباً مطبع احمدی والے نسخے کی طباعت کے بعد کسے گئے تھے۔ یہ نسخہ مولوی محمد حسین خاں تحسین کے بیٹے سے چھاپے کے لیے مطبع نظامی واقع کالن پور میں بھیج دیا جس کے ملک محمد عبدالرحمن خاں بن حاجی محمد روشن خاں تھے۔ یہ دیوان ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ میں یعنی مطبع احمدی والے نسخے کے قریباً وہاں بعد چھپا۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ اس کے کل اشعار ایک ہزار آٹھ سو دو تھے۔ (۱۷۹۶ + ۶)

۵۔ اس دیوان میں فشی شیونرائٹ آرام نے بھی طباعت شروع کر دی تھی اور ان کے مطبع میں دیوان ۱۲۷۷ھ میں مکمل ہوا۔ یہ دیوان نسخہ رام پور کے مطابق تھا۔

۶۔ لالہ جے نرائٹ تاجر کتب دہلی نے سید ظہیر دہلوی سے کہہ کر غالب، ذوق اور دکن کے دیوانوں کا انتخاب مرتب کرایا تھا، جس کا نام ”نگارستانِ سخن“ رکھا تھا۔ یہ کتاب بیسٹ

سلفہ کالج دہلی کے طبع العلوم میں چھپتی شروع ہوئی تھی، مگر کچھ عیادت طبع احمدی میں ہوئی۔ اس میں غالب کی غزلیات کے صرف پینتیس اشعار چھوڑے گئے تھے۔ باقی سب انتخاب میں لے لیے گئے۔ "نگارستان سخن" ۲۷۔ صفر ۱۲۷۹ھ (۱۳ اگست ۱۸۶۳ء) کو شائع ہوئی۔

دوسرا پہلی مرتبہ اسی مجموعے میں شامل کیا گیا تھا، بعد ازاں دیوان میں شامل ہوا۔
 میں، غالب کی زندگی میں اردو دیوان اتنی ہی مرتبہ چھپا، البتہ ان کی وفات کے بعد چھ ایڈیشن چھپے، ان کا شمار ممکن نہیں۔ ان میں عام ایڈیشن بھی شامل ہیں اور غزلیات پر تنقید، دیدہ زیب معرود ایڈیشن بھی۔ اردو و نظم کے کسی مجموعے کو شاید ہی وہ ہر معرزیٰ حاصل ہوئی ہو جو دیوانی غالب کے حصے میں آئی اور اس پر جو مشرعیں لکھی گئیں، ان کا شمار بھی آسانی نہیں۔ موجودہ دیوان میں مدت سے غالب کے دیوان کا ایک ایسا ایڈیشن مرتب کر دینے کا اندازہ تھا، جو مختلف خصوصیات کا جامع ہو، مثلاً:
 ۱۔ صحت کا دیوان اہتمام کیا جائے۔

۲۔ بیشتر اشعار صرف اس وجہ سے صحیحہ اور مشکل بن گئے تھے کہ ان میں علامات اوقاف صحیح مقامات پر لگانے کا خیال نہیں رکھا گیا تھا، میرا خیال تھا، اگر اوقاف ٹھیک لگا دیئے جائیں تو اغلب ہے اکثر اشعار کا مطلب بالکل واضح ہو جائے جنہیں عام طور پر مشکل سمجھا جاتا ہے اور بعض شاعرین داغ سوزیوں کے باوجود ان کی صحیح شرح نہیں کر سکے، بلکہ مقصود و شاعر سے دور دور پڑتے پڑتے انھوں نے شعروں کو چیتا بنا دیا۔

۳۔ اشعار میں ایسے الفاظ بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں، جن کے معنی تو اکثر صحابہ سمجھتے ہیں، لیکن ان کے تلفظ میں غلطی کر جاتے ہیں۔ ایسے تمام الفاظ پر اعراب لگا دیئے جائیں تاکہ تلفظ میں غلطی سرزد نہ ہو اور یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ الفاظ غلط پڑھے جائیں تو شعر کی حقیقی حیثیت ہی ناک ہو جاتی ہے۔

۴۔ جتنے اشعار دیوان سے باہر رہے تھے اور وہ مختلف مقامات پر چھپ چکے تھے، انہیں اکٹھا کر کے بطور ضمیر شامل دیوان کر دیا جائے تاکہ ارباب ذوق کو ان کی بے انتہا محبت، عزیمت و جذبہ، نام صاحب ایم اے کی تحقیقات پہنچیں۔

تلاش میں دوسرے آخذ کی طرف رجوع کی ضرورت نہ رہے۔

۵۔ آخر میں نسخہ جمیدیت سے ویسے اشعار منتخب کر لیے جائیں جو کسی قدر سہل ہوں اور ان میں فکر و بیان کی کوئی خوبی پائی جائے۔

۶۔ اس میں مختلف غزلیات و قصائد کی تاریخیں مستند آخذ کی بنا پر متعین کر دی جائیں۔
 میں اپنے تجویز دیوان کی ترتیب مکمل نہیں کر سکا تھا کہ ایک نام صاحب نے ایک دیوان شائع کر دیا، جس میں تاریخوں کے تفصیلی اہتمام کے سوا، وہ خصوصیات کم و بیش موجود تھیں جو میرے پیش نظر تھیں، خوب غور و فکر کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ نئے دیوان کی ترتیب بہر حال ضروری ہے، چنانچہ میں نے دیوان مرتب کر کے مطبع کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد فاضل جلیل و صاحب محترم مولانا قیاد علی خاں صاحب عرفی کامرتب دیوان شائع ہو گیا، جس کا دائرہ میرے تجویز دیوان کے دائرے سے زیادہ وسیع ہے اور اسے دیوان غالب کے بجائے کلیات غالب قرار دینا چاہیے، اس لیے کہ اس میں ”نسخہ جمیدیت“ سے آخرا تک وہ سب کچھ جمع کر دیا گیا، جس نے اردو میں غالب کے نام سے اقتساب پایا۔ پھر تاریخوں کا بھی اہتمام ہے اور اوقات و صحت کا بھی۔ میں نے اپنے مرتبہ دیوان کی کتابت روک کر اس نسخہ بہتیرے سے بھی بقدر صلاحیت استفادہ کیا۔

میرے پیش نظر جامعیت کے بجائے یہ امر تھا کہ ان اشعار کو با اہتمام خاص مرتب کر دیا جائے، جس سے اردو خوان اصحاب زیادہ سے زیادہ تعلو میں استفادہ کر سکیں۔

یہ بھی عرض کر دوں کہ میں نے بعض الفاظ اسی طرح رکھے ہیں جس طرح میرزا غالب کے زمانے میں استعمال ہوتے تھے مثلاً ”آئے“ ”کو“ ”آئے“ اور فرما دیں گے ”کو“ فرمایں گے“ نہیں بنایا۔ اتفاق کو ملا کر لکھنے سے احتراز کیا ہے، لیکن بعض مقامات پر رفع اشتباہ کی غرض سے اس کے خلاف بھی کتا پڑا مثلاً ”سخت جانی ہئے“ ”کو“ سخت جانیہائے“ ”ہی لکھا۔ پہلی صورت میں میرے اندازے کے مطابق غلطی کا امکان بڑھ جاتا تھا۔ البتہ نامائے ناز ”کو“ ”ہائے ناز“ لکھا۔ اس بارے میں کوئی ایک قاعدہ بنایا جا سکتا ہے تو یہی بنایا جا سکتا ہے کہ خواندگان کرام کو غلط فہمی یا اشتباہ سے حتی الامکان محفوظ رکھا جائے۔

کلام کی تاریخوں کا مسئلہ کلام کی تاریخوں کا مسئلہ بے حد اہم تھا۔ اس مسئلے میں دو مرتبہ کہنے کے واضح قرینے موجود تھے مثلاً:

۱۔ "نورِ عقیدہ" میں جو کلام ہے، وہ فی الجملہ پچیس برس کی عمر تک کا ہے، یعنی اس کی آخری تاریخ سن ۱۸۳۲ء تک ہی چاہیے۔

۲۔ "تذکرہ گلشنِ بے غار" سن ۱۸۳۳ء میں مرتب ہوا تھا، اس میں جو منتخب شعرا آ گئے ہیں، ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ان اشعار کی غزلیں سن ۱۸۳۳ء سے پیشتر کی ہیں۔

۳۔ سن ۱۸۳۹ء میں اردو دیوانِ پہلی مرتبہ چھپا، اس میں جو غزلیں ہیں، وہ بہر حال سن ۱۸۳۱ء تک کی ہیں۔

۴۔ سن ۱۸۳۶ء کے دیوان میں صرف سولہ شعرا تذکرے اور ان کی تصریح پہلے کی جا چکی ہے۔

۵۔ سن ۱۸۹۱ء میں تیسری مرتبہ دیوان چھپا، اس سے سن ۱۸۳۶ء اور سن ۱۸۳۱ء کی درمیانی مدت کے کلام کا پتہ چل سکتا ہے۔

۶۔ ان کی جو کچھ ہے، بعد کا ہے۔

ان اعداد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میں نے پہلے دو بڑی تقسیمیں کیں، یعنی سن ۱۸۳۱ء تک کا کلام اور سن ۱۸۳۱ء تک کا کلام، پہلی تقسیم میں جا بجا "گلشنِ بے غار" کے سولے ہی دسے دیئے تاکہ معلوم ہو جائے، وہ کلام تذکرہ مذکورہ کی تکمیل سے پیشتر کا ہے، ان بڑی تقسیموں کے بعد جن غزلوں کی معین تاریخیں معلوم ہوئیں، ان کے متعلق سواشیہ میں مع ماخذ تصدیقات کیں اور ان کی تعداد خاصی ہے، جیسا کہ دیوانِ ملاحظہ فرمائیے سے واضح ہو گا۔ کاش تحقیق کا قدم آگے بڑھانے کے لیے کوئی نیا سہارا مل جائے تاکہ باقی کلام یا اس میں سے بیشتر حصے کی تاریخیں معین طور پر معلوم ہو جائیں، جس چاہتا تھا کہ ہر روایت کی غزلیات تاریخیں ترتیب کے لحاظ سے مرتب کر دیں لیکن کلام کا خاصا بڑا حصہ چونکہ ایسا ہے جس کی معین تاریخ حال معلوم نہیں ہو سکی، لہذا ایک حصے کے متعلق معلومات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے خدا ولی ترتیب میں تدویر مناسب نظر نہ آیا۔

بعض غزلیات باطلعات و قصائد وغیرہ کے اوقات داخل یا خارجی شہادوں کی بنا پر
 معینی کہ بیت کے قریب موجود تھے۔ میں نے ان قروں سے فائدہ اٹھانے میں بھی کوئی ہی نہیں
 کی۔ غرض اس دیوان کو ہر لحاظ سے مفید اور نفع بخش بنانے میں کوئی دقیقہ رسمی اٹھانے
 رکھا۔ امید ہے، یہ ناچیز سعی کلام غالب کے مطالعہ و محاسن سے استفادے کے دائرہ
 کو وسیع تر کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔

آخر میں چند اظہارِ دلوان کی شرح کے متعلق یہی عرض کر دینے چاہئیں۔ اردو دیوان
 کی اتنی شرحیں ہو چکی تھیں کہ مجھے خیال بھی نہیں تھا، کوئی نئی شرح ضروری ہوگی اور ہر کام
 بھی مجھے انجام دینا پڑے گا۔ ہر ناخدا اور ہر پیمانے کی شرحیں مرقعہ چلی آتی تھیں۔ ایسی ہی
 تھیں، جن میں صرف مشکل اشعار کی سرسری تشریح کی گئی تھی اور ایسی بھی، جن میں شعریہ
 شعر مفصل شرح کی گئی تھی، لیکن میرے عزیز دوست شیخ نیاز احمد صاحب، مالک شیخ
 غلام علی (یٹہ منڑ) کی رائے ابتدا سے یہ تھی کہ نئی شرح جونی چاہیے۔ وہی اس پر بے سلسلے
 کی اشاعت کے ذمہ دار ہیں، وہی میری تمام تحریرات شائع فرماتے رہتے ہیں سالہا سال کے
 خاص تعلق سے ان کی رائے میرے نزدیک زیادہ توجہ کی مستحق رہی۔ میرے عزیز دوست
 دلاوری صاحب نے بھی شیخ صاحب ہی کی تائید کی، اس لیے میں نے شرح کا بیڑا اٹھایا۔
 کام شروع ہوا تو یقین ہو گیا کہ بیسیوں شرحیں چھپ جانے کے باوجود غالب کے مختصر سے
 اردو دیوان کی توضیح و تشریح کا حق ادا نہیں ہوا اور اغلب ہے، اس کے بعد بھی اہل فکر
 نظر کا احساس ہی رہے۔

میں نے ذہنی میں شرح کا جو پیمانہ تجویز کیا تھا، وہ نہ زیادہ مختصر تھا اور نہ زیادہ مفصل۔
 آئندہ یہ تھی کہ میرزا کے شعرا جیسے انداز میں پیش کئے جائیں، جس سے ان کی معنوی اہمیت و
 عظمت بخوبی واضح ہو جائے اور خواندگان کو کام آوازہ فرمائیں کہ میرزا کو اردو شعروادب
 میں یکاگلی کا جو درجہ ملا اس کی بنیاد و اساس کیا ہے۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ ہر شعر
 کی شرح خواہش دہلیہان کے مطابق کر سکا ہوں، لیکن اسے ملاحظہ فرمائیے کہ بعد یہ یقین
 ضرور ہو جائے گا کہ میں نے شاعریں کی قابل قدر نکات و اثرات سے استفادے کے ساتھ جاکجا

تکرار نظر کے لئے پہلو ہی پیش کیے ہیں اور کوشش برابر یہ رہی کہ میرزا کی شعر گوئی میں زیادہ حقیقت کے جن کمالات کی جلد آرائیں بکثرت نمایاں ہیں، ان تک ایسا کی زیادہ سے زیادہ سہل ہو جائے، میں اس شعروں پر نقد و تبصرہ کا رشتہ سنبھال نہیں سکتا، اتنا عرض کر دیتا ہوں کہ پوری صفت میں خواجہ آغا مرحوم اور مولانا طباطباتی مرحوم ہی کے ارشادات زیادہ حراکم و استوار نظر آئے، جیسا کہ خود کتاب کے علاوے سے یہ حقیقت آشکارا ہو جائے گی۔

علاوہ بریں اس شرح کی چند اور خصوصیات بھی ہیں، جن کی طرف اجمالاً اشارہ کر دینا غالباً غیر مناسب نہ سمجھا جائے۔

۱۔ امید ہے کہ اسے دیکھنے لینے کے بعد میرزا کے اشعار کی بلند حیثیت کا بہتر اندازہ جو سکے گا۔

۲۔ میں نے محض الفاظ و تراکیب ہی کی تشریح پر معاملہ نہیں چھوڑا، بلکہ اشعار کے مختلف پہلو بھی واضح کیے اور حتی الامکان کوئی ضروری نکتہ نظر انداز نہ کیا۔

۳۔ اس امر کا خاص خیال رکھا کہ میرزا کے اشعار کو نثری تخلیق طرازی نہ سمجھا جائے، بلکہ حقائق حیات سے ان کا رابطہ و تعلق واضح کیا جائے۔

۴۔ چند اصحاب نے میرزا کے بعض اشعار کو کسی نہ کسی فارسی شعر سے ماخوذ قرار دیا میرے علم میں ایسے جتنے اشعار آئے، ان کا موازنہ میرزا کے اشعار سے کر کے معنویت کا فرق دکھایا یا بتایا کہ بعض شعروں میں اگر گوشت و اشتراک کے باوجود سابقین میں مضمون جس طرح پیش کیا گیا تھا، وہ یا تو ناقص تھا یا غیر طبعی۔ میرزا نے اسے صحیح انداز میں پیش کیا۔ اس وجہ سے اگر وہ مضمون جزو کسی سابق شعر ہی آ بھی چکا تھا تو میرزا نے اس کی حقیقی حیثیت کا اندازہ کہتے ہوئے اسے مکمل کر دیا اور طبعی بنا دیا۔

۵۔ میں نے اس امر کا بھی خیال رکھا کہ میرزا نے اردو میں بعض ایسے اشعار بھی کہے، جن کا مضمون وہ پیشتر فارسی میں اتنا دھچکے تھے، میں نے وہ اشعار جا بجا نقل کر دیئے۔ تاکہ خواندگان کو کام اندازہ فراہم کیوں آئے اصل مضمون اردو میں بہتر طریق پر ہوا یا فارسی میں۔

۶۔ اس شرح میں اشعار غالب کے مطالعے کا ذوق پیدا کرنا یہ طور خاص مد نظر رہا۔

۷۔ اصل دیوان کے علاوہ تنبیہوں کے اشعار کی شرح بھی کر دی گئی تاکہ خواندگان کرام ان اشعار سے بھی بہتر طریق پر بصیرت اندوز ہو سکیں۔

ان چند خصوصیات کا سرسری ذکر کر دینے کے بعد یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں، دیوانِ غالب کی شرح کا اصل مقاصد یہی نہیں کہ ایک جلیل القند شاعر کا کلام بخوبی سمجھ لیا جائے۔ غالبؔ اصل اردو شاعری کو جدید اسلوب پر لانے کا ذمہ دار تھا۔ اسے قدیم و جدید کے درمیان ایک نئی کی حیثیت حاصل ہے۔ اس نے ندرت افزہ فکر و بیان سے اردو زبان کو ایسا پیمانہ دے دیا جس سے اس میں حسن و اسالیب کے علاوہ دقیق حکیمانہ، فلسفیانہ اور دوسرے نکات و مطالب بے تکلف پیش کرنے کی صلاحیت نمایاں ہو گئی۔ اس کا مطالعہ ہماری قومی زبان کے ممکنہ ارتقا سے استفادے کا ایک اہم جزو ہے جسے میں بہترین ذریعہ سمجھتا ہوں۔ خواندگان کرام یہ کلمہ ملحوظ رکھیں گے تو توقع ہے کہ اس کی گزارشات رائیگاں نہ جائیں گی اور جن خوشگوار امیدوں کی بنیاد پر ناچیز علم و فہم کے مطابق یہ کام انجام دیا گیا ہے، وہ گلدستہ و طاقِ نسیاں نہ بنیں گی۔

۱۔ لغات - نقش : نکستا نقش نگار کرتا، پیل برٹے بنانا، نشان، توفیق، تصویر یہاں آخری معنی میں استعمال ہوا ہے۔

کافذی پیرہن : کافذی پیرہن : کافذی لباس، جو زمانہ قدیم کے ایران میں دادخواہ پہن لیتے تھے۔ مرزا غالب نے لکھا ہے : ایران میں دم ہے کہ دادخواہ کافذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے، بیسے مشعل دن کو جلاتا یا خون آلودہ کپڑا ہاتھ پر لٹکا کر لے جاتا، شرانے ایران کے کام سے اس دم کی تصدیق ہوتی ہے۔

شرح : خود مرزا اس شرک شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں : ”شاہ خیال کرتا ہے نقش کسی کی شوخی تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت تصویر ہے اس کا پیرہن کافذی

عشق فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا کافذی ہے پیرہن ہر سپیکر تصویر کا کاؤ کا دست جابینائے تنہائی نہ پوچھے صبح کرنا شام کا، لاتا ہے جوئے شیر کا جذبہ اختیار شوق دیکھا چاہیے سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھانے دماغ عطا ہے اپنے عالم تقصیر کا بلکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

ہے۔ یعنی بستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار بعض ہر دم موجب رنج و ملال و آزار ہے۔“

مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی وجود حقیقی یعنی خدا سے علیحدگی اور جہان کا باعث ہوئی۔ جہان سے پیشتر معرفت کی جو دولت و لذت حاصل تھی، وہ باقی نہ رہی۔ دوسری پیدا کی گئی تھیں اور ان سے پوچھا گیا تھا : الست ہر تبکھ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں؟ تو سب کی فطرت سے ایک صدا بلند ہوئی یعنی بیٹی بیشک تو ہی ہمارا پروردگار ہے۔ دنیا کے کبھیڑوں سے سابقہ نہ ہو جو حقیقی سے قرب کی یہ کیفیت بھی حلقی رہی اور بندگی کے اقرار کا حق بھی ادا نہ ہو سکا۔ اسی حالت میں دو دو غم نے ہستی کو فریاد پر مجبور کر دیا۔ دو دو غم کے دو سبب جمع ہوئے : اول وجود حقیقی سے جہان، دوم اس کے حکموں کی تعمیل میں کوتاہی۔ شاہد تھا کہ ہر

نقش کسی کی شوقی تھوڑی زیادہ ہے، جس کے باعث ہر تصویر نے کاغذی بجلی پہن کیا ہے؟ ہستی کو تصویر اس لیے کہا کہ اس کا وجود حقیقی نہیں، غیر حقیقی اور اعتباری ہے، مگر اعتباری اور عارضی ہونے کے باوجود وہ اتنے رنج و ملال کا باعث ہوئی کہ ہر ہستی سراپا فریاد بن گئی۔

۲۔ لغات - کاو کاو : فارسی مصدر کا ویدن سے ہے، جس کے معنی ہیں کھودنا، کاوش، غلش، سخت محنت، رنج۔

سخت جانی : حدودِ جہنم کی سختیاں برداشت کرنا۔
جھوٹے شیر : عام روایت کے مطابق وہ نر، جو فراوانے بے ستون پہاڑ کاٹ کر بنائی جاتی تاکہ شیریں کے بارگ ملک پانی پہنچ جائے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ حقیقتہً دودھ کی نر مٹی۔ پہاڑوں پر سے جتنی ندیاں نچنے اُترتی ہیں، ان کے پانی کا رنگ قد سے عمر، سفید نظر آتا ہے، کیونکہ پانی پتھروں سے ٹکراتا، ہوا آتا ہے اور اس میں جھاگ اٹھتے ہیں۔ لہذا وہ بہ لحاظِ منظر جوئے شیر مشہور ہو گئی۔

شرح : جہان کی حالت میں جن جن کاوشوں، کاہشوں اور شقتوں کا میں تجھ مشق بنا ہوا ہوں، ان کا حال کچھ نہ پوچھو۔ نہ میں بیان کر سکتا ہوں، نہ سخت جانی کے باعث دم رکھتا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ رات گزارنا اور شام کا صبح کرنا اتنا ہی دشوار ہے، جتنا فراوانے کے لیے بے ستون کو کاٹ کر جوئے شیر لانا دشوار تھا۔

اس شعر میں شاعر نے بہ حالتِ جہان اپنی سخت جانی کو پہاڑ سے اور شام کے صبح کرنے کو جوئے شیر سے تشبیہ دی ہے۔

۳۔ لغات - شوق : یہاں اس سے مراد ہے شوقِ قتل۔

دُم : سانس، دم شیر سے مراد تلوار کی دھار ہے۔

شرح : میرے شوقِ قتل کا جذبہ، جو اعتبار سے باہر ہے، دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی کا یہ کرشمہ ہے کہ تلوار کا دم یعنی اس کی دھار کھینچ کر پیٹنے سے باہر نکل آتی ہے۔ چونکہ تلوار میں ایک گونہ جھکاؤ ہوتا ہے، اس لیے شاعر نے کہا کہ اس کی دھار (دُم،

کھج کر سینے سے باہر نکل آتی ہے۔ اس میں لطافت یہ ہے کہ لفظ دُوم کے دونوں معنی شاعر کے پیش نظر رہے۔ عام سانس سینے کے اندر ہوتے ہیں، لیکن شوقِ قتل کا جذبہ تلوار کی دھار دُوم، کھینچ کر سینے سے باہر لے آیا۔

۴۔ لغات۔ آگہی یعنی آگاہی : شعور، عقل، علم، واقفیت، باخبری۔
 عنقا : ایک فرمئی اور خیالی پرندہ۔ کہتے ہیں، اس کی گردن لمبی ہونے کے باعث یہ نام رکھا گیا ہے۔ نام موجود ہے، پرندہ ناپید ہے اس سے مراد ہے ناپید اور گم۔
 شرح : آگہی یعنی عقل و علم ہمارا مقصد بچانے کے لیے سماعت کے کتنے ہی جال بچیلے دیں، مگر وہ ہمارے مفہوم و مطالب کو بچاؤ نہیں سکتے۔ یعنی ہم جو کچھ کہتے ہیں اس کا مفہوم و مطلب بلند ہے۔ اُسے عنقا کی طرح ناپید کرنا بھی نامناسب نہ ہوگا۔
 شاعر کا یہ مطلب نہیں کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں، اس کا مطلب کچھ نہیں۔ مقصود یہ ہے کہ ہمارا مطلب اتنا دقیق اور نازک ہوتا ہے کہ اس تک عام علم و عقل کی رسائی نہیں ہو سکتی۔

مرزا نے فارسی میں بھی اس مضمون کا ایک شعر کہا ہے۔

ما ہنکائے گرم پروازیم، فیضِ ازما مجو
 سایہ بچوں دوو بالائی رودارہ بالی ما

یعنی ہم تیز اڑنے والے ہیں اور ہماری پرواز میں اس قدر گرمی ہے کہ سایہ بھی زمین پر نہیں پڑتا، بلکہ دھواں بن کر اوپر نکل جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص ہم سے فیض حاصل کرنا چاہے، اُسے بلندی پر آنا چاہیے۔ اپنی جگہ بیٹھ کر ہمارے چنے اُڑنے کا انتظار نہ کرنا چاہیے۔

۵۔ لغات۔ بسکہ : چوہنک۔

آتشِ زیر پا : لفظی معنی، جس کے پاؤں کے نیچے آگ ہو، محاورہ، مضطرب و بے قرار۔

مٹوئے آتشِ دیدہ : ہاں، جسے آگ نے چھوا ہو۔ ایسا بالِ بُلک کہا کرتے

منطقے کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔

مشریح : اسے غائب ! میں قید میں بھی بے قرار ہوں اور جو زنجیر میرے پاؤں
 میں ڈالی گئی ہے اس کی ہر کڑی میرے آتش زبیر پا ہونے کے باعث اُس بال
 کی سی ہو گئی ہے جسے آگ چھو گئی ہو یعنی بالکل کمزور ہے اور میری بے قراری
 کو روک نہیں سکتی ۔

شاعر کی مراد یہ ہے کہ اگرچہ دنیا سے تعلق کی زنجیر میرے پاؤں میں پڑی ہوئی
 ہے لیکن میرا عشق ربانی اس قدر ٹھنڈا ہے کہ وہ زنجیر مجھے حقیقی راستے سے روک
 نہیں سکتی ۔



جُز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار ۔ صحرا مگر بے تنگی چشم حُود تھا
 آشفتگی نے نقش سُویدا کیا درست ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا
 تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سُود تھا
 لیتا ہوں کتب غم دل میں سبق ہمنوز لیکن یہی کہ ”رفت“ گیا اور ”بود“ تھا
 ڈھانپا کفن نے داغِ عیوب برہنگی میں ورنہ ہر لباس میں ننگ و جُود تھا
 تیشے بنیر مر نہ سکا ، کو کمن اُسدا ! سرگشتہ خمار رسوم و قیود تھا

۱۔ لغات ۔ قیس : مشہور عاشق مجنوں کا اصل نام ، جو نجد کے قبیلہ عامر
 سے تھا اور یثرب کے ساتھ محبت کے باعث مالگیر شہرت پائی ۔ عام روایات کے
 مطابق اس کی ساری عمر یثرب کی خاک چھانٹنے میں بسر ہوئی ۔
 ہمدے کے کار آنا : نمایاں ہونا ۔ ہر سر کار آنا ۔

خُصُو : (ج پر ذبر، سین پر پیش) نہایت حسد کرنے والا۔ زیرِ غر شعر میں یہی صفت استعمال ہوا ہے۔

خُصُو : (ج پر پیش، سین پر پیش) اول مصدر بمعنی حسد کرنا، دوم حاسد کہج شرح : عمریں گز رنگیں، تئیں کے سوا کسی دوسرے آدمی نے جنوں عشق میں نمایاں حیثیت حاصل نہ کی اور اس کی طرح صحرا گروسی میں عمر نہ گزاری۔ اس سے معلوم ہوا کہ صحرا بھی وسعت کے باوجود بہت حسد کرنے والے شخص کی آنکھ کی طرح تنگ تھا۔

چشمِ حاسد کی تنگی اس لیے مشہور ہوئی کہ وہ اپنے سوا ہر شخص کی نعمت کا زوال چاہتا ہے، کسی کو چھوٹا پھلتا دیکھتا اسے گوارا نہیں ہوتا۔ شاعر کہتا ہے کہ صحرا دیکھنے میں کتنا ہی وسیع اور کشادہ کیوں نہ ہو، لیکن جب ہم یہ حقیقت پیش نظر رکھتے ہیں کہ قیس کے سوا کوئی اور فرد جو جن عشق کی سرگشتگی میں صحرا کے اندر نہ پہنچ سکا تو معلوم ہوا کہ صحرا چشمِ حاسد کی طرح تنگ ہے۔ یعنی وہاں کسی دوسرے کو قدم رکھنے کے لیے جگہ نہ مل سکی۔

۲۔ لغات۔ آشفنگی : پریشانی۔

شُوید : دل کا سیاہ نقطہ۔ آسوز کی تانیٹ ہے۔ شاعر نے پریشانی اور آشفنگی کو دھوئیں سے، دل کے سیاہ نقطے کو داغ سے تشبیہ دی ہے۔

شرح : عشق کی پریشانی کے باعث دل سے آہ و فغاں کا دھواں اٹھتا رہتا تھا۔ اسی دھوئیں سے دل کے سیاہ نقطے کی صورت قائم ہو گئی، معلوم ہے جس مقام پر دھواں مسلسل لگتا رہے، وہاں سیاہی پیدا ہو جاتی ہے۔ شاعر کے نزدیک دل کے نقطے یعنی سودیا کی سیاہی آہ و فغاں کے اسی دھوئیں کا کرشمہ تھی، جو عشق کی پریشانی و آشفنگی میں مسلسل اٹھتا رہتا ہے۔ اسی صورت حال پر شاعر نے اپنا عام مشاہدہ چیلن کر دیا یعنی یہ کہ داغ کا اصل سرمایہ اور اس المال صرف دھواں ہوتا ہے کیونکہ صحرا جگہ دھواں مسلسل لگتا رہے وہ سیاہ ہو جاتی ہے۔

مسترح : اسے محبوب ! عالم بیداری میں تو تیرے ساتھ عشقِ حبیب کے معاملے کی کوئی صورت نہیں ، البتہ تو خواب میں آجاتا ہے تو خیالِ تجھ سے معاملے کی باتیں کرتا رہتا ہے ۔ مثلاً کبھی اپنے شوق کی فراوانی پیش کر دی ۔ کبھی عرض کر دیا کہ سچے مانناؤں سے بے تعلق نہ رہنا چاہیے ۔ کبھی شوقِ وصل کا اظہار کر دیا ۔ محبوبِ عالم خواب میں ایسی کبھی گزشتہ پر متوجہ نہیں ہوتا ۔ پھر آنکھ کھل جاتی ہے اور خواب کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے تو شاعر پروا منج ہوتا ہے کہ نفع اور نقصان یا سود و زیاں کی جو بات چیت جو رہی تھی ، وہ تو خواب و خیال کی حیثیت رکھتی تھی ۔ عالم بیداری میں تو کوئی معاملہ ہی پیش نہ آیا ، لہذا سود و زیاں کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۔

ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محبوب کے ساتھ جو معاملے پیش آئے اور عیش و راحت ، بارہنج و طلال کے جن واقعات سے سابقہ پڑا ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ عالم خواب میں خیال کے کرشمے تھے ۔ جب آنکھ کھل گئی تو عیش و راحت اور منج و طلال یعنی سود و زیاں میں سے کچھ بھی نہ رہا ۔ کیونکہ خواب کی تمام باتوں کا اثر آنکھ کھلتے ہی زائل ہو جاتا ہے ۔

۴۔ **شمرح :** میں غمِ دل یعنی عشق کے کتب میں ابھی پڑھنے لگا ہوں اور میرا سبق بالکل ابتدائی حالت میں ہے یعنی ابھی تک رقت (گیا) اور ہود (تھا) یاد کر رہا ہوں ۔

مطلب یہ ہے کہ عشق کی درس گاہ میں ابھی مبتدی اور نوآموز ہوں ۔ قدم آگے بڑھے گا اور تعلیم کے ابتدائی درجوں سے ترقی کرتا ہوا اوپر کے درجوں میں پہنچوں گا تو خدا جانے کیا کیفیت رونما ہوگی ۔

عشق کی ابتدائی حالت کے متعلق عرفی نے بھی ایک نہایت عمدہ شعر کہا ہے :

عشق می خوانم و می گریم زار
طفل نادانم و اول سبق زار

یعنی میں عشق کا درس لے رہا ہوں اور زار زار زار زار رہا ہوں ۔ گویا میں مبتلا سمجھتا

ہوں اور یہ میرا پہلا سبق ہے۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ چھوٹے بچوں کو آزاد اور پھرتے پھرتے کتب میں بٹھا دیا جائے اور وہ پابند ہو جائیں تو پڑھتے پڑھتے دونا شروع کر دیتے ہیں۔
غائب اور عرفی دونوں نے عشق کی ابتدائی کیفیت پیش کرنے کے لئے درگاہ سے مثالیں لیں۔ لیکن اس کے سوا دونوں شعروں میں کوئی کیسا فی نہیں۔ عرفی کے شعر سے واضح ہوتا ہے کہ اس نے جو پہلا سبق پڑھا وہ عشق کا تھا۔ غائب اپنے عشق کی صورت ابتدائی کیفیت پیش کر رہا ہے۔

۵۔ لغات - ننگ وجود : ہستی کے لیے ننگ و عار کا باعث۔

شرح : مجھ سے برہنہ ہونے کے جتنے عیب تھے ان سب کا داغ کفن نے ڈھانپ لیا اور میری حالت یہ تھی کہ کوئی بھی لباس پہن لیتا ہستی اور انسانیت کے لیے شرم اور ننگ و عار کا باعث تھا۔

برہنگی کا مطلب ہے اخلاقی محاسن اور انسانی شرف کے اوصاف سے خالی ہونا۔ لباس اس لیے پہنا جاتا ہے کہ انسان برہنہ نظر نہ آئے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں اہل اوصاف سے عاری ہونے کے باعث اپنے وجود یعنی ہستی اور انسانیت کے لیے باعث شرم ہو گیا۔ کوئی بھی لباس اختیار کرتا برہنہ ہونے کے عیب چھپ نہ سکتے۔ زندگی اسی حالت میں گزر گئی۔ آخر موت آئی اور مجھے کفن پہنا یا گیا تو اس سے وہ عیب قطعاً نہیں چھپ سکتے تھے۔ جو زندگی میں شرف انسانیت سے محرومی کے باعث مجھ پر لگے البتہ موت برہنہ ہونے کا داغ کفن نے ڈھانپ لیا۔

اس شعر سے خیال قرآن مجید کی اس آیت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، جس میں فرمایا گیا ہے : "اے اولادِ آدم ! ہم نے تمہارے لیے ایسا لباس دیا جو جسم کی ستر پوشی کرتا ہے اور ایسی چیزیں بھی دے دیں جو زیب و زینت کا ذریعہ ہیں۔ نیز پوشیز گاری کی راہ دکھا دی کہ تمام لباسوں سے بہتر لباس ہے (سورہ اعراف) گویا خدا نے انسان کے لیے جسمانی لباس کے علاوہ ایک باطنی پوشاک بھی دے دی جو اخلاق و سیرت کے عیبوں کو ڈھانک سکتی ہے۔ یہ تقویٰ اور پرہیزگاری کا

پوشاک ہے جس کے بغیر انسان ہر دائرے میں زندگی اور انسانیت کے لیے باعث
ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جب میں پرہیزگاری کا لباس اختیار نہ کر سکا تو میری
جستی باعث تنگ سری اور میں انسانی شرف کا اہل نہ رہا۔ یہ حالت میری موت
پر ختم ہوئی۔

۶۔ لغات۔ کوہکن : لغوی معنی، پہاڑ کا ٹٹے والا۔ مرزا کا لقب جس
نے پہاڑ کاٹ کر ہنز شیریں کے باغ تک پہنچائی تھی۔ قصہ مشہور ہے کہ مرزا کو شیریں
سے دور رکھنے کے لیے کہا گیا تھا کہ پہاڑ کاٹ کر ہنزے آؤ گے تو شیریں تمہیں
مل جائے گی۔ خیال یہ تھا کہ نہ پہاڑ کاٹے گا اور نہ شرط پوری کرنے کی ذہانت آئے گی۔
مرزا نے ہنز نکال لی تو اس کے پاس ایک بڑھیا کو یہ پیغام دے کر بھیجا گیا کہ شیریں
مر گئی۔ مرزا نے یہ سنا تو تیشہ ہاتھ میں تھا وہی سر پر مارا اور مر گیا۔ مرزا غالب
نے دوسری جگہ کہا ہے :

دی سادگی سے جان، پاؤں کوہکن کے پاؤں
بیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں
سرگشتہ : لغوی معنی، جس کا سر پھیر گیا ہو، یعنی حیران و پریشان
خمار : نشے کے آثار کی کیفیت۔ اس میں نشہ پیٹنے والے پر بے لطفی اور
اعصاب شکنی سی طاری ہو جاتی ہے۔

رسم و قیود : رسم اور قید کی جمع، یعنی رسمیں اور پابندیاں۔
شرح : اے استاد! مرزا تیشے کے بغیر جان نہ دے سکا۔ اس سے
ظاہر ہے کہ وہ دنیوی رسم و رواج کی پابندیوں کے خمار میں حیران و پریشان تھا۔
شعر کا مطلب یہ ہے کہ عشق صادق و کامل ہو تو عاشق کے لیے مرنے کے
اسباب تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، جیسے مرزا نے خود کشی کے لیے تیشہ استعمال
کما۔ یہ رسم کی پابندی تھی حالانکہ ایسی پابندی عشق کامل کی آزادی سے کوئی مناسبت نہیں
رکھتی۔ تیشہ مار کر ہر شخص مر سکتا ہے، اس میں مرزا دے کے عشق نے کیا کمال دکھا ہے؟

کمال یہ تھا کہ وہ ایسی کسی چیز کا رد اور نہ ہوتا، مثلاً ایک آہ سرد کھینچ اور جان دے دیتا۔ افسوس کہ اس نے انتظار کیا، ایک بڑھیا خیریں کی موت کی جھوٹی خبر لائے۔ وہ مجھے پھر تیشہ مار کر اپنے آپ کو ہلاک کرے۔

○

۱۔ شرح : اے محبوب! تم کہتے ہو کہ تیرا دل کہیں پڑا پائیں گے تو واپس نہ دیں گے، لیکن ہمارے پاس دل ہے ہی کہاں کہ گم ہو۔ وہ تو ہم پہلے ہی دے چکے ہیں، البتہ آپ کی اس بات کا مطلب ہم سمجھ گئے، یعنی یہ کہ ہمارا دل تمہارے پاس ہے اور ہمارا دماغ بھی یہی ہے کہ تمہارے ہی پاس رہے۔

دوسرے تکلف دوستوں میں سے کسی کی چیز گم ہو جائے اور دوسرے کے ہاتھ آجائے تو وہ اسے چھپائے رکھتا ہے اور ملک سے کہتا ہے کہ اگر وہ چیز ہمیں مل گئی تو ہرگز واپس نہ دیں گے۔ اسی عام معمول سے غالب نے ایک پر تکلف مصنون پیدا کر لیا۔

ہم نے دماغ پایا تاکہ دو مطلب ہیں اول یہ کہ ہم نے تمہارا مطلب سمجھ لیا یعنی دل تمہارے پاس ہے دوم یہ کہ دل کا تمہارے پاس رہنا ہمارا اصل مطلب

کہتے ہو نہ دیکھے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیسے ہم نے دماغ پایا
حشق سے طبیعت نے زیت کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا
دوستدار دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالہ نار سا پایا
سادگی و پرکاری بخودی و ہشیاری
حسن کو تنافل میں جرات آزما پایا
غٹھ چھپر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
غموں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا
حال دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بار بار ڈھونڈھا تم نے بار بار پایا
شورِ نپدناح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

وہ مقصد ہم نے پایا۔

۲۔ **شرح :** زندگی بے کیفیت اور بے لطف ہی نہیں، طرح طرح کی تکلیفوں اور دکھوں سے بھری ہوئی تھی۔ عشق آیا اور اس نے زندگی میں خاص لذت و کیفیت پیدا کر دی جس مقام درد اور دکھ مٹ گئے، کیونکہ عشق ان کے لیے دوا بن گیا، لیکن خود عشق ایسا درد ہے جس کی کوئی دوا نہیں۔

زندگی کے بے کیفیت اور بے مزہ ہونے کا سبب بظاہر یہ ہے کہ کسی شے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ شتم پشتہ دن گزر رہے تھے۔ عشق نے خاص دلچسپی پیدا کر کے زندگی کو پر مزہ بنا دیا۔

یہ حقیقت محتاج تشریح نہیں کہ زندگی گونا گوں آرزوؤں سے لبریز ہوئی ہے کوئی آرزو ایسی نہیں جسے پورا کرنے کے لیے محنت و مشقت سے کام نہ لینا پڑے۔ محنت و مشقت کے بعد بھی بعض آرزوئیں پوری ہوتی ہیں، بعض نہیں ہوتیں گویا ان آرزوؤں کے باعث زندگی دکھ درد کا مرقع بن جاتی ہے۔ عشق آیا تو تمام دکھ مٹا دیئے۔ ہر حال عشق ہی زندگی میں لطف اور کیفیت پیدا کرتا ہے اور تمام دکھوں کا وہی علاج ہے لیکن خود اس کی دوا نہیں۔

بعض اصحاب نے یہ شعر ظہوری کے اس مطلع سے دابتہ کر دیا ہے :

شد طبیب ما محبت شتش بر جان ما

محنت ما راحت ما درد ما درمان ما

یعنی محبت نے ہمارے لیے طبیب کا کام دیا۔ ہماری جان پر اس کا احسان ہے۔ ہمارا غم خوشی میں بدل گیا اور ہمارے دکھ کا علاج باقتہ آگیا۔ سرسری نظر سے بھی واضح ہو سکتا ہے کہ غالب اور ظہوری کے شعروں کا مفہوم ایک نہیں۔ اسلوب بیان اور منوئیت کے اعتبار سے مرزا غالب کا شعر زیادہ بلند ہے۔

۳۔ **شرح :** جس سے ہم محبت کرتے ہیں، وہ ہماری جان کا دشمن نہیں ہے

اور دل بھی سہارا ساتھ چھوڑ کر اسی کا دوست بن گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اب دل پر کیا بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ دشمن سے دل کی دوستی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے جتنی آپس کیں، وہ کوئی اثر پیدا نہ کر سکیں اور جتنے نامے کھینچے، وہ مقصد پر نہ پہنچ سکے۔

اس شعر میں مرزا نے نہایت پر لطف طریق پر اپنے عشق کی کیفیت بیان کر دی۔ عشق کا مرکز دل ہوتا ہے۔ وہ محبوب کے ساتھ ہے۔ مرزا اپنے آپ کو ایک الگ شخص فرض کر کے آہ و فغاں کی بے اثری کا یہ سبب بتاتے ہیں کہ جب دل ہی ساتھ نہیں تو میرے رونے و صونے سے کیا حاصل ہو سکتا ہے

۴۔ لغات - پرکاری : ہوشیاری -

ہتخودی : اپنے آپ میں نہ رہنا، یعنی ہوش میں نہ رہنا۔ بے خبری -
زیر نظر شعر میں اس سے مراد تجاہل یعنی جان بوجھ کر امتحان ہوتا ہے۔
جبرأت آزما : حوصلے اور ہمت کا امتحان لینے والا۔

شرح : جبین بظاہر بڑے سادہ اور مبہولے جہالے نظر آتے ہیں، لیکن اصل میں بہت ہوشیار اور چالاک ہیں۔ وہ کبھی کبھی جان بوجھ کر امتحان بن جاتے ہیں اور بے پروائی سی اختیار کر لیتے ہیں، مگر اس حالت میں بھی ہوشیاری اور خبرداری ترک نہیں کرتے۔ مبہولے بن جانے سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دیکھیں، جو لوگ عشق کے دہقے ہیں، ان کے حوصلے اور ہمت کا کیا حال ہے۔ صبر و استقلال کی کیا کیفیت ہے۔ آیا وہ ہماری سادگی سے فائدہ اٹھا کر کسی گستاخی پر تو نہیں اُتر آتے؟ گویا ان کی سادگی اور تجاہل سے مقصود عشاق کی آزمائش ہوتی ہے۔

۵۔ شرح - بہار آگئی اور کلیاں کھلنے لگیں۔ یہ کیفیت دیکھتے ہی ہمیں اپنا دل یاد آ گیا، جو اسی طرح خون ہڑا تھا جس طرح کلی کھل کر سرفی کے باعث سراپا خون نظر آتی ہے۔ نیز ہم نے اپنا دل پایا، جو کھو گیا تھا۔

۶۔ شرح : ہمیں دل کا حال کچھ معلوم نہیں، صرف اتنا جانتے ہیں کہ ہم اسے برابر ڈھونڈتے رہے اور کبھی نہ پایا۔ تم نے اسے محبوب ڈھونڈے بغیر

اسے ہمیشہ پایا۔

مطلب یہ کہ بہارِ اولِ حبیب سے آپ کے قبضے میں آیا، ہمیں کہیں نہ ملا اور آپ اس پر برابر قابض رہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ دل کو محبوب کے پاس رہنے کا انتہائی شوق ہے، جب اسے ٹھونڈا ہوائے، وہ مشتاق ہی کو ملتا ہے۔ عاشق کو نہیں ملتا۔

۷۔ شرح : ناصح نے ترکِ عشق کی نصیحت کر کے ہمارے زعم پر نیک چھڑک دیا۔ یعنی ہمیں حدودِ مجرّمہ دکھ پہنچایا، کیونکہ ہم سے ترکِ عشق ہو ہی نہیں سکتا۔ اس سے پوچھنا چاہیے کہ ایسی نصیحت کر کے تمہیں کیا مزہ ملا ؟ شور اور نیک کی مناسبت کہی تشریح کی غناج نہیں، اگرچہ شعر میں شور سے مراد یہ ہے کہ ناصح نے نصیحت بڑے زور شور سے اور ہنگامہ آرائی کے انداز میں کی۔

①

۱۔ لغات۔ بے محابا، بے تحاشہ، دل مر سوز نہاں سے بے محابا جل گیا بے غوث، بے دھڑک۔

آتشِ خاموش کی مانند گویا بجل گیا آتشِ خاموش : دہی ہوئی آگ جو بظاہر بھی جڑی معلوم ہو، لیکن اندر اندر جل رہی ہو۔

شرح : میرا دل اُس سوز سے جل گیا، جو اندر ہی اندر اپنا کام کر رہا ہے۔ سمجھنا چاہیے کہ وہ اُس آگ کی طرح جل گیا، جو بظاہر اکھ معلوم ہوتی ہے، لیکن اندر اندر برابر جلتی رہتی ہے۔ "خاموش" اور "گویا" کی مناسبت غلط ہے۔

دل مر سوز نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا بجل گیا
دل میں ذوقِ وصل دیا دیا تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو جھٹکا جل گیا
میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافلِ بار
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا بجل گیا
عرض کیجئے جو بہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا دشت کا کہ صحرائیں گھیا

حسن نہیں سمجھ کر دکھا تا ورنہ داغوں کی بہار
 عشق کی آگ کا سین طریقہ ہے کچھ عاشق
 اس چرخاں کا کروں کیا کار فرما بھل گیا
 صبر و ضبط سے کام لیتا ہے اور آگ
 میں ہوں اور افسروگی کی آرزو و غائب کدل
 ۲۔ شرح : دل میں وصل کا شوق
 دیکھ کر طرزِ چاک اہل دنیا بھل گیا
 اور محبوب کی یاد تک باقی نہ رہی یہی
 اس کی سب سے بڑھ کر قسمی اور عزیز
 متاعِ مثنیٰ۔ گویا اس گھر میں ایسی آگ لگی کہ جو کچھ بھی اس میں تھا، سارے کا سارا بھل
 کر بھسم ہو گیا۔

کہا جاسکتا ہے کہ وہ عشق کیا ہوا، جس میں محبوب کی یاد اور وصل کا شوق بھی
 سلامت نہ بچا۔ معلوم ہے کہ یہ دونوں چیزیں عشق کا مرکز اور نصب العین ہیں۔ اس
 سلسلے میں شعر کی دو تاویلیں ہو سکتی ہیں : اول نفسِ عشق کی فدا دانی نے دل میں اتنا
 غلبہ حاصل کر لیا کہ محبوب کی یاد اور وصل کے شوق کے لیے گنہگار ہی باقی نہ رہی
 گویا دل سراسر باعشق بن گیا۔ دوسرا پہلو یہ ہو سکتا ہے کہ محبوب کی مسلسل بے اعتنائی
 اور تنگ دلی سے عاشق کی مایوسی و نا اُمیدی آخری حد تک پہنچ گئی، جس کے بیان
 کے لیے عاشق کو زیادہ مؤثر صورت یہی نظر آئی کہ جو چیزیں عشق کی جان تھیں انہیں
 بھی مروجہ قرار دے لے۔ وہ کہنا یہ چاہتا ہے کہ مایوسی ایسی صورت اختیار کر چکی
 ہے، جس کے پیشِ نظر فوقِ وصل اور یادِ یار کا وجود ہی مقل نظر نہ گیا ہے۔

۳۔ شرح : میں عدم سے بھی آگے نکل گیا، یعنی اس درجہ معدوم ہو گیا کہ
 عدم بھی میرے مقام کے تعلق میں وجود کی حیثیت رکھتا ہے، ورنہ جب تک عدم
 یمنِ عالمِ فنا میں تھا تو ہلاکِ ایسا ہوا کہ میرے دل میں آگ برسانے والی چراغِ اٹھتے
 مثنیٰ، اس سے عناق کے پر بھل جاتے تھے۔

کہا گیا ہے کہ غالب کے اس شعر کا مضمون بیدار کے مندرجہ ذیل فقرے
 بیان کرتا ہے :

بھو عنقا بے نیاز عرض ایسا دیم ما

یعنی آں سوے عدم یک عالم آبادیما

اس کا ترجمہ یہ ہے : ہم عنقا کی طرح اپنی ایجاد یعنی وجود پذیری کو پیش کرنے سے بے پروا ہیں۔ ہم عدم سے آگے رہتے ہیں اور سہانے خود ایک آباد دنیا ہیں ظاہر ہے کہ دونوں شعروں میں اس کے سوا اشتراک کا کوئی پہلو نہیں کہ غالب کی طرح بتیل کے شعر میں بھی عنقا اور عدم کے لفظ آئے ہیں۔

۴۔ لغات۔ جوہر اندیشہ : سوچ بچار اور غور و فکر کا جوہر۔ جوہر اس

چیز کو کہتے ہیں جو قائم بالذات ہو۔ اس سے مراد مادے کا وہ ذرہ ہوتے ہیں، جس کا تجزیہ نہ ہو سکے، اسی لیے اسے جزو لا تجزئی کہتے تھے، لیکن معلوم ہے کہ یہ نظریہ قوت ہوئی غلط ثابت ہو چکا ہے اور اب جوہر یعنی ایٹم کا تجزیہ کر کے ایسی قوت دریافت کر لی گئی ہے جسے بے پناہ مانا جاتا ہے۔ عجیب امر یہ ہے کہ غالب نے اس شعر میں جوہر کا یہی پہلو پیش نظر رکھا ہے۔

تشریح : میں سوچ بچار اور غور و فکر کے جوہر کی گری کہاں ظاہر کروں ؟ کس مقام پر دکھاؤں ؟ کیونکہ معرین بیان میں لاؤں ؟ صوبت حال یہ ہے کہ وحشت کا خیال آتے ہی صواب جمل کو خاک ہو گیا۔ وحشت میں صواب گروی ہی پیش نظر تھی، مگر صواب جوہر اندیشہ کی گری کا تصور بھی برداشت نہ کر سکا۔

آج جوہر یعنی ایٹم کی قوت مرزا کے اس بیان کی تصدیق کر رہی ہے یعنی وہ اتنی ہوناک ہے کہ کوئی شے اس کا تصور بھی دماغ میں لے آئے تو جمل کو خاکستر ہو جائے۔

۵۔ لغات۔ چراغاں : بہت سے چراغ، لیکن اس لفظ کو چراغ کی جمع

نہ سمجھنا چاہیے۔

کارفرما : حاکم، دوسروں سے کام لینے والا۔

تشریح : میرے پاس دل ہی نہیں رہا، ورنہ تعین دکھاتا کہ بیٹنے کے داغوں

کی بہار کا کیا رنگ ہے۔ میں کیا کروں، داغوں کے ان بے شمار چراغوں کا انتظام

کرنے والا اور ان سے کام لینے والا ہی باقی نہیں رہا۔

شعر میں سینے کے داغوں کو چراغاں سے تشبیہ دی ہے اور دل کو اس چراغاں کا منظم و کارفرما بنایا ہے۔

۶۔ لغات - افسردگی : پژمردگی ، دل بجھ جانا۔

تپاک - محبت کی گرم جوشی۔ اضطراب - بے قراری۔ ہیاں : طرز تپاک سے مراد اہل دنیا کی منافقت اور دیریاکاری ہے جس کی وجہ سے دل بجھ گیا۔

شرح : اہل دنیا کاریا کارانہ برتاؤ دیکھ کر دل اس طرح جل بجھا ہے کہ اسے غائب اتمام آرزوئیں اور تمنائیں ختم ہو گئی ہیں۔ صرف افسردگی و پژمردگی کی آہ و باقی رہ گئی ہے۔

افسردگی اور تپاک کی مناسبت محتاج بیان نہیں۔



شوق پیر رنگ رقیب سرو ساماں نکلا

۱۔ لغات - شوق : عشق۔

پیر رنگ : ہر حال اور ہر صحت

میں۔ بہر طور۔

رقیب : دشمن۔ مخالفت۔

شرح : اس شعر کی شرح خود

مرزا غالب نے اپنے شاگرد عبد اکران

شاگرد کمال گوکہ پور کو یوں لکھی تھی :

"لقب یعنی مخالفت میں شوق سرو ساماں

کا دشمن ہے۔ لہذا یہ ہے کہ قیس جو زندگی میں نکلا

قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

زخم نے داد نہ دی تنگی دل کی ، یارب

تیر بھی سینہ بیل سے پر افشاں نکلا

بوسے گل ، نالہ دل ، دودھ چراغ محفل

جو نثری حرم سے نکلا سو پریشاں نکلا

دل حسرت زدہ بٹھا مائتہ لذت درد
یہ تھا نصیب کے پرے میں بھی نگہ بیدار۔ لطف
کھم یا نگوں کا، بقدر لب و دندان نکلا
یہ سچ کہ جنوں کی تصویر باتیں مریا

اب اس کی تصویر بناتے ہیں تو اس میں بھی اس دیو نے کو برہنہ ہی پیش کرتے ہیں۔
دلگ، تصویر، پردے اور عریاں کی مناسبت واضح ہے،

۲۔ لغات - داد نہ دینا : زائل نہ کرنا۔

پُر افشاں : پُر جھاڑا ہوا۔ تیر کی نوک یعنی پیکان کے دونوں جانب پرے
لگے ہوتے تھے تاکہ تیر کمان سے نکلنے ہی سیدھا نشانے پر جا بیٹھے۔

شرح : اس شعر کی شرح کرتے ہوئے غائب شاہ کو کہتے ہیں :
"یہ ایک بات دل نے اپنی طبیعت سے نکالی ہے، جیسے کہ اس شعر میں :

نہیں ذمہ زراحت جراحات پیکان

وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دگشا کیے

یعنی زخم تیر کی تو ہیں بہ سبب ایک دغہ ہونے کے اور عوار کے زخم کی
تحسین بہ سبب ایک طاق سا کھل جانے کے۔ " زخم نے داد نہ دینی تھی دل
کی " یعنی زائل نہ کیا تنگی کو۔ پر افشاں، بہ معنی بیاب اور یہ لفظ تیر کے
مناسب حال ہے۔ معنی یہ کہ تیر تنگی دل کی داد کیا دیتا، وہ تو خود
ضیق مقام سے گھبرا کر پر افشاں لودہ سہرا میر نکل گیا۔

تیز کا زخم آنا معمول تھا کہ اس سے دل کی تنگی زائل نہ ہو سکی اور اس میں کوڑ
خراش و کشادگی پیدا نہ ہوئی۔ اس کے برعکس مشاہدہ بتاتا ہے کہ تیر دل کی تنگی کے
بہت سے پہلوں کو ہٹا باہر نکل گیا اور جاتے جاتے اس کے پر ہی حشر۔

۳۔ شرح :- پھول کی خوشبو، دل کی آہ و فغاں اور چراغ کا دھواں، ان

جہان سے جو بھی چیز تری بزم سے نکلی، آشفہ و پریشاں ہی نکلی۔

شاعر نے عشاق کی پریشانی کا سر کرنے کے لیے تین چیزیں ہیں جو اصلاً مختلف تھیں، لیکن ان میں ایک خاصیت یعنی پریشانی مشترک پائی گئی اور تینوں کو محبوب کی بزم سے خاص تعلق تھا۔ اول بھولوں کی خوشبو جس کا خاصہ ہی پریشاں ہونا ہے، دوم عشاق کے دل کا نالہ، سوم چرخ کا دھواں۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب کی بزم سے جو بھی چیز نکلتی ہے، یعنی محبوب سے جدا ہوتی ہے، وہ پریشاں ہی پائی جاتی ہے۔

بیشک ان تین چیزوں کی خاصیت ہی پریشانی ہے۔ قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ مرزا نے شعر میں بزمِ محبوب سے نکلنے کو ان کی پریشانی کا موجب قرار دیا۔

۴۔ لغات - مائندہ : دسترخوان

شرح :- میرا دل حسرت کا مارا ہوا تھا اس کے دسترخوان پر لذتِ درد کے کھانے چُٹنے ہوئے تھے۔ دوستوں نے اپنے دانتوں اور لبوں کی حیثیت، یعنی اپنی استعداد اور استطاعت کے مطابق ان کھانوں سے قاندہ اٹھایا۔ میرے پاس لذتِ درد کے سامان کی کمی نہ تھی۔ اس میں سے دوستوں نے اپنی اپنی قابلیت کے مطابق استفادہ کیا۔

شاعر یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ میرے اشعار میں غم و درد کے سرمائے کی کوئی کمی نہیں، لیکن ہر مزدِ لہو یا سرمایہ نہیں سمیٹ سکتا۔ جس شخص میں جتنی ہمت، تاباوت اور ذوق ہوتا ہے۔ اسی کے مطابق میرے دسترخوانِ درد سے وہ حصہ پاتا ہے۔ فیض کا درد ازہ کسی کے لیے جہد نہیں، مگر فیض ہر شخص کو اس کے ظرف کے مطابق ملتا ہے :

دیتے ہیں بادہِ ظرفِ قمعِ خوار و کبیر

طرف ہے ۔

شرح :- میری بہت مشکل کاموں کو بہت پسند کرتی تھی ۔ اگرچہ اس نے فنا کا سبق دینا یا پڑھنا شروع کیا تھا ، لیکن مصیبت ، یہ پیش آئی کہ مبتدی اور نوآموز ہونے کے باوجود اسے یہ کام بھی بہت آسان معلوم ہوا ۔

مطلب یہ ہے کہ شاعر نے اپنے لیے فنا کا کام اختیار کیا تھا ، جو اس کے نزدیک اس لیے پسندیدہ تھا کہ اس کی بہت مشکل کاموں ہی کو دلی رغبت سے اختیار کرتی تھی ، لیکن یہ حد درجہ کٹھن کام بھی اس کی بہت کو آسان نظر آیا اور نوآموزی کے باوجود وہ فنا کی منزل طے کر گئی ۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ میری بہت کے لیے ، جو فنا کو معمولی سا کام سمجھتی ہے ، کوئی ایسا مشغلہ چاہیے ، جو فنا سے بھی بدرجہا زیادہ کٹھن ہو ۔

اس شعر کے بعض نسخوں میں تھی " کہ جگہ " اے " اور " ہے " ہے جس سے مضمون پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ تھی " رکھا جانے یا " اے " یا " ہے " شاعر جس اور العزمی کا داعی ہے وہ تینوں صورتوں میں درست و واضح رہتی ہے ۔

۶۔ شرح :- اے غالب ! میں نے گریہ مضبوط کر رکھا تھا اور سمجھتا تھا کہ اس کی حیثیت قطرے جتنی بھی نہیں ، لیکن اب از سیر نو گریے میں جوش و خروش رونما ہوا تو واضح ہو گیا کہ جسے میں قطرے سے بھی کم سمجھتا تھا وہ تو یکسر طوفان ہے ۔



دھمکی میں مر گیا ، جو نہ باب نبرد تھا	عشق نبرد پیشہ طلسم کار مرد تھا
تھا فندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا	اڑنے سے پیشتر بھی مرارنگ و دھوا
تالیف نسخہ ملے و فاکر رہا تھا نہیں	مجموعہ خیال ابھی فسرد فسرد تھا

دل تاجگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب اس دہ گز میں بلوۂ گل آگئے گود تھا

جاتی ہے کوئی ہکشمکش اندر و عشق کی دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

احباب چارہ سازی و حشر نہ کر سکے زنداں میں بھی خیال، بیابان نورد تھا

یہ لاش بے کفن اسدی خستہ جاں کی ہے حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

۱۔ لغات - باب نبرد : جنگ کے لائق، مقابلے کی صلاحیت رکھنے والا۔
بناؤد - جو اُغز۔

نبرد پیشہ : جنگجو، جس کا پیشہ جنگ ہو۔

شرح : جو شخص بہادر اور مرد میدان نہ تھا، وہ عشق کی سختیوں اور مصیبتوں کے یس کا صوف خطرہ دیکھ کر دم توڑ بیٹھا۔ عشق کا پیشہ ہی جنگ و پیکار ہے۔ اس کی مصیبتیں اور آفتیں وہی سہہ سکتا ہے، جو مرد کا رہا ہو، یعنی جس میں زیادہ سے زیادہ ہمت، مردانگی اور مصیبتوں کے مقابلے میں استقلال سے قدم جمائے رکھنے کا جو ہر موجود ہو۔ تحفظ دے آدمیوں کے لیے سزاوار نہیں کہ وہ میدان عشق میں قدم رکھیں۔

عراقی کا ایک مطلع ہے جس میں بھی یہی حقیقت پیش کی گئی ہے، اگرچہ انداز مختلف ہے :

عشق اگر مرد است، مردے تاپ دیدار آورد

وہ نہ چوں موسیٰ بے آورد بسیار آورد

۲۔ شرح :- مجھ پر زندگی بھروسہ کا خوف طاری رہا اور خوف کے باعث انسان کا رنگ اصل حالت پر نہیں رہتا، اس میں زردی آجاتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ مرنے کے ساتھ چہرے پر جو زردی اور مردنی چھایا جاتی ہے، اس سے پہلے بھی میرا

طرف ہے ۔

شرح :- میری بہت مشکل کاموں کو بہت پسند کرتی تھی ۔ اگرچہ اس نے فنا کا سبق دیا تھا پڑھنا شروع کیا تھا ، لیکن مصیبت یہ پیش آئی کہ ہندی اور نو آموز ہونے کے باوجود اسے یہ کام بھی بہت آسان معلوم ہوا ۔

مطلب یہ ہے کہ شاعر نے اپنے لیے فنا کا کام اختیار کیا تھا ، جو اس کے نزدیک اس لیے پسندیدہ تھا کہ اس کی بہت مشکل کاموں ہی کو دلی رغبت سے اختیار کرتی تھی ، لیکن یہ حدود پر کھٹن کام بھی اس کی بہت کو آسان نظر آیا اور نو آموزی کے باوجود وہ فنا کی منزل طے کر گئی ۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ میری بہت کے لیے ، جو فنا کو معمولی سا کام سمجھتی ہے ، کوئی ایسا مشغلہ چاہیے ، جو فنا سے بھی بد بھلا زیادہ کھٹن ہو ۔

اس شعر کے بعض نسخوں میں تھی " کہ جگہ " اے " اور " ہے " ہے جس سے مسنون پر کوئی اثر نہیں پڑتا " تھی " دکھا جائے " یا " اے " یا " ہے " شاعر جس اور العزمی کا داعی ہے ، وہ تینوں صورتوں میں بدستور واضح رہتی ہے ۔

۶۔ **شرح :-** اے غالب ! میں نے گریہ ضبط کر رکھا تھا اور سمجھتا تھا کہ اس کی حیثیت قطر سے جتنی بھی نہیں ، لیکن اب از سر نو گریہ میں جوش و خروش رونما ہوا تو واضح ہو گیا کہ جسے میں قطر سے بھی کم سمجھتا تھا ، وہ تو یکسر طوفان ہے ۔



دھمکی میں مر گیا ، جونہ باب نبرد تھا	عشق نبرد پیشہ طلب گارِ مرد تھا
تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا	اڑنے سے پیشتر بھی مرانگ درد تھا
تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں	مخوئے خیال ابھی فرد فرد تھا

دل تاجگر کہ سائل دیاٹے ٹٹوں ہے لب اس رہ گز میں جلوہ گل آگئے گود تھا
 جاتی ہے کوئی پشیمانش اندوہ عشق کی دل بھی لگ گیا، تو وہی دل کا درد تھا
 احباب چارہ سازی وحشت ذکر کے زنداں ہیں بھی خیال، سیابان نور و تھا
 یہ لاش بے کفن اسید خستہ ماں کی ہے حق مغفرت کرے عجیب آزاد مرد تھا
 ۱۔ لغات - باب نبرد : جنگ کے لائق، مقابلے کی صلاحیت رکھنے والا
 بہادر - جوانمرد۔

نبرد پیشہ : جنگجو، جس کا پیشہ جنگ ہو۔

شرح : جو شخص بہادر اور مرد میدان نہ تھا، وہ عشق کی سختیوں اور
 مصیبتوں کے سبب کا صدمہ خطرہ دیکھ کر دم توڑ بیٹھا۔ عشق کا پیشہ ہی جنگ و پیکار
 ہے۔ اس کی مصیبتیں اور آفتیں وہی سہہ سکتا ہے، جو مرد کار ہو، یعنی جس میں
 زیادہ سے زیادہ ہمت، مردانگی اور مصیبتوں کے مقابلے میں استقلال سے قدم
 جمانے رکھنے کا جوہر موجود ہو۔ تھکڑے آدمیوں کے لیے سزاوار نہیں کہ وہ
 میدان عشق میں قدم رکھیں۔

عربی کا ایک مطلع ہے جس میں بھی یہی حقیقت پیش کی گئی ہے، اگرچہ انداز
 مختلف ہے :

عشق اگر مرد است، مردے تاپ دیدار آورد
 درد چوں موسیٰ ہے آورد بسیار آورد

۲۔ شرح :- مجھ پر زندگی بھروسہ کا خوف طاری رہا اور خوف کے باعث
 انسان کا رنگ اصل حالت پر نہیں رہتا، اس میں زندگی آجاتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ
 مرنے کے ساتھ چہرے پر جو زندگی اور مژدہ چھا جاتی ہے، اس سے پہلے بھی میرا

؟ مسدود ہی تھا، جو موت کے خوف سے پیدا ہوا تھا۔ خوف یہ کہ زندگی جیسی گزرنی چاہیے تھی، نہ گزری۔ خدا جانے مرنے کے بعد کیا حالت پیش آئے اور کبھی گزرے۔
شعر میں جو لفظی منابہیں ہیں، وہ کسی تشریح کی محتاج نہیں۔

۳۔ لغات - تالیف : جمع کرنا - ترتیب دینا -

شرح :- جب میرے خیالات کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا اور افکار کے اوراق منتشر تھے۔ یعنی میں طفل کے عالم میں تھا۔ معلوم ہے کہ طفلی کی حالت میں انسان کے خیالات و افکار اکٹھے نہیں ہوتے، جیسے پھنگلی کی منزل پر پہنچ جانے کے ساتھ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ میں اس زمانے میں بھی دنیا کی کتاہیں مرتب کر رہا تھا۔ گویا دو طفل میں بھی بچے عشق ہی سے دلچسپی تھی اور اس زمانے میں بھی پختہ کار ماسٹروں کی سی حیثیت حاصل تھی۔

۴۔ لغات - گرد تھا : بے حقیقت تھا - بیچ تھا -

شرح :- اب دل سے جگر تک خون کے دریا کا کنارہ بنا ہوا ہے۔ اس راستے میں پہلے پھولوں کا جلوہ بھی بے حقیقت اور بے حیثیت معلوم ہوتا تھا یا یہ کہ سہراستے میں گرد و غبار ہوتا ہے۔ اس راستے میں پہلے پھولوں کے جلوے کو گرد و غبار کی حیثیت حاصل تھی۔

دریائے خون کے بجائے ساحل دریائے خوں لانے سے بظاہر یہ مقصود ہے گردل اور بگردلوں خون ہوئے اور اس خون نے ایک دریا کی حیثیت حاصل کر لی۔ خون بہ چکا، اب صرف ساحل باقی رہ گیا ہے۔ اس سے اس مقام کی بے دریغی اور ویرانی نمایاں ہوتی ہے۔

شعر کا مضمون یہ ہے کہ جہاں اب جانکاہی اور جاگرازی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، وہاں پیشتر عیش و نشاط کی بہترین بار چھائی ہوئی تھی۔

۵۔ شرح - عاشق کو غم عشق کی کشمکش سے کبھی نجات نہیں ملتی اگر دل پہلو سے نکل بھی گیا ہو تو اس کا نکل جانا ہی دل کا دردن جاتا ہے۔ یعنی جب تک

دل پہلو میں تھا، وہی غم و اندوہ کا مرکز تھا۔ دل بھا گیا تو اس کے جانے کا غم شروع ہو گیا ہے غرض کسی بھی صورت میں غم کی کھینچا تانی سے غلصہ نہیں ملتی۔

۶۔ لغات۔ چارہ سازی : علاج۔ دوا۔

بیابان نورد : صحرائیں آوارہ پھرنے والا۔

شرح :- دوست اور مہر و میری وحشت کی حالت میں علاج کی کوئی تدبیر نہ کر سکے۔ ان کے بس میں صرف یہ تھا کہ مجھے قید کر دیتے تاکہ بہ حالت دیوانگی باہر نکل کر بیابان میں نہ پہنچ جاتا، اس طرح انہوں نے میرا جسم تو قید میں ڈال دیا، لیکن میرا خیال برابر بیابان نوردی میں مصروف رہا۔

ظاہر ہے کہ وحشت و دیوانگی کا علاج عین جسم کو قید خانے میں ڈالنے سے نہیں ہو سکتا۔ ضروری ہے کہ خیالات سے بھی وحشت دور کی جائے۔ مرزا یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایک تدبیر تو دوستوں نے کرنی، مگر دوسری کا کوئی انتظام نہ کر سکے۔

۷۔ شرح :- یہ فعلش، جسے کفن نصیب نہیں ہوا، اسد کی ہے پریشان حال تھا، اور جس کی جان زخموں سے چور تھی۔ اسد تعالیٰ اسے بخشے، وہ بڑا آزاد انسان تھا۔



۱۔ لغات۔ مُبْتَحَہ : تیج۔ ۱۰

شمارِ پنجہ، مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا

مرغوب : جس کی طرف رغبت ہو پسندیدہ

تماشا مے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا

شرح :- ہمارے محبوب کو، جسے

پنہیں بے دلی، تو میدی جاوید آساں ہے

مشکل کام پسند ہیں تیج پھرنے سے بھی

کشائش کو ہمارا عقدہ مشکل پسند آیا

رغبت ہے۔ اس طرح اسے سول ایک

ہی مرتبہ منشی میں لے لینے کا تاثر اپنا
معلوم ہوتا ہے۔ گویا اس کی تسبیح خوانی
درد و غم کے لیے نہیں، بلکہ وہ
سودا دل ایک ہی مرتبہ قبضے میں لے
لینے کی مشق کرتا ہے۔
تسبیح کے سودا نے ہوتے ہیں۔

محبوب کے ہاتھ میں تسبیح دیکھ کر دل باختہ شاعر کو یہ خیال ہوا کہ محبوب غم و سودا
منشی میں لے رہا ہے۔

بعض اصحاب نے لکھا ہے کہ مرزا کا یہ شعر غم کی کاشمیری کے شعر ذیل سے
ماخوذ ہے۔

ہر گوشم این صد از مقرب تسبیح می آید
کہ سودا دل مضرب گرد و چوبک دل یا ہوا می

یعنی امام تسبیح نے یہ آواز میرے کان میں آ رہی ہے کہ سودا دل پریشانی کا تختہ مشق
بنتے ہیں تو ایک دل کو آرام نصیب ہوتا ہے۔

غم کی پیش نظر حقیقت ہے کہ تسبیح خوانی میں امام شامل نہیں ہوتا۔ سوداؤں
پر ہاتھ پھرتا جاتا ہے اور امام انگ رہتا ہے۔ اس سے یہ مفہون پیدا کر لیا کہ سودا
دلوں کے پریشان ہونے کے بعد ایک دل آرام پاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ دونوں شعروں میں ”سودا دل“ اور ”تسبیح“ کے لفظوں کے سوا
کوئی دگر اشتراک نہیں۔

۲۔ لغات - بیدل : عاشقی، افسردگی، مایوسی

شرح - بیدل کی برکت سے غم اتنے بے نیاز ہو چکے ہیں کہ ہمارے لیے
ہمیشہ کی مایوسی و ناامیدی بھی سہل ہو گئی ہے اور اس کا برداشت کر لینا سہل ہو گیا
نہیں۔ کشائش یعنی عقدے سلجھانے کی صلاحیت کو سبباً مشکل عقدہ پسند آ گیا ہے۔

اور وہ نہیں چاہتی کہ یہ عقده کھلے۔ وہ جس حالت میں ہے، ہمیشہ اسی حالت میں رہے گا، کشود کار کی نوبت نہ آئے گی۔

۲۔ لغات - ہوا : آرزو - خواہش

بہ خون غلطیدن : خون میں لوٹنا، تڑپنا، است پت ہونا۔

شرح :- ہمارے قافل (محبوب) نے پھولوں کی سیر کے لیے خواہش کی ہے تویر نہ سمجھنا چاہیے کہ اس کا مقصد تفریح ہے، بلکہ اسے خون میں مہلوں کے لوٹنے اور تڑپنے کا سماں پسند ہے۔ یہ خواہش اس کی بیدردی اور سنگدلی کا نقشہ پیش کر رہی ہے۔

پھولوں کے تختے میں نسیم پھرتی ہے تو سرخ سرخ پھول بنے لگتے ہیں۔ شاعر نے یہ منظر دیکھا تو اسے یاد آگیا کہ مہمل بھی خون میں اسی طرح لوٹا اور تڑپا کرتے ہیں چنانچہ اس نے سمجھ لیا کہ محبوب کے پیش نظر پھولوں کی سیر نہیں، بلکہ مہلوں کے تڑپنے اور لوٹنے کا نظارہ ہے، جو اسے بہت پسند ہے اور یہی اس کی بے ہری کا ثبوت ہے۔

۳۔ لغات - جراحت : زخم

ارمغاں : تحفہ

شرح :- اے امد! مبارک ہو کہ تیری دکھی جان کے لیے عشق ایسے تحفے لایا ہے، جو اس کی غم خواری کریں گے۔ مثلاً زخم، الماس، جس سے زخم بڑھتے ہیں، جگر کے داغ۔

یہ تمام چیزیں تکلیف و اذیت کا باعث ہیں اور دودمند جان کے لیے یہی موزوں تحفے ہو سکتے تھے، اس لیے شاعر نے اپنے آپ کو مبارک باد دی۔ یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ شعر بطور طنز کہا گیا ہے۔

دہر میں نقش وفا و جبر قسلی نہ ہوا ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا
 سبزہ خط سے ترا کا کھل سرکش خدا ہوا یہ زُمر و بھی حریف دم ارضی نہ ہوا
 میں نے چاہا تھا کہ اندر وہ وفا سے چھوڑا وہ تنگ مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
 دل گزر گا وہ خیال سے و سا غریب ہی ہوا گرنفس جادۂ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا
 ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کبھی گوشِ منت کش گلابِ ننگِ قسلی نہ ہوا
 بس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجئے ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں، سو وہ بھی ہوا
 مر گیا صدر نہ یک جنبش لب سے غائب نا تو انی سے حریف دم عیسیٰ نہ ہوا
 ا۔ لغات۔ نقش : تحریر۔ نام و نشان۔ تویذ۔ تصویر۔ یہاں بظاہر مراد
 نام و نشان ہے۔

شرمندہ معنی ہونا : معنی کی شرمندگی اٹھانا یعنی ہامعنی ہونا۔
 شرح : زمانے میں وفا کا نقش دل کے لیے قسلی اور اطمینان کا باعث
 نہ ہوا۔ یہ تو ایسا لفظ معلوم ہوتا ہے، جس کے کوئی معنی نہیں، بلکہ سراسر مغل ہے۔
 لفظ ”وفا“ کا تذکرہ زبانوں پر تو بہت ہے، مگر تین حرفوں کے اس مجبوسے
 سے کسی کو اس وقت تک کیا تسکین ہو سکتی ہے، جب تک اس کی حقیقت اور
 معنویت پر عمل نہ ہو، یعنی لوگ وفا کا عملی مظاہرہ نہ کریں۔ اگر یہ ممکن نہیں تو یہ لفظ
 کوئی معنی نہیں رکھتا اور بے وجہ زبانوں پر جاری رہتا ہے۔

شاعر کا مقصود یہ ہے کہ آج زمانے میں وفا کی عملی تصویر کہیں نظر نہیں آتی،
 لوگ صرف ریاکاری سے یہ لفظ استعمال کرتے رہتے ہیں۔ غالب نے حسنِ بابر،
 سے اس مضمون میں ایک خاص نشان پیدا کر دی۔ سعدی نے یہی مضمون دوسرے
 انداز میں پیش کیا ہے۔

یا دقا خود نمود در عالم
یا کسے اندر میں زمانہ نکر دو

یعنی یا تو یہ سمجھنا چاہیے کہ دنیا میں دقا کا وجود ہی نہ تھا یا ہمارے زمانے میں کسی نے اس پر عمل نہیں کیا۔ سعدیؒ نے دو صورتیں پیش نظر رکھیں، یعنی یا تو دقا تھی ہی نہیں یا ہمارے زمانے میں غائب ہو گئی۔ غالب کا بیان یہ ہے کہ دقا کا لفظ تو موجود ہے، مگر اس کی حقیقت گم ہے اور یہی حقیقت ہے۔

۲۔ لغات۔ کا کل : سر کے وہ بال جو دونوں جانب آگے کی طرف لٹکے ہوتے ہیں۔ اس کی صفت سرکش قابل توجہ ہے۔

زمرود : ازہم اور رتینوں پر پیش اور پر تشدید، بیش قیمت پتھروں میں سے ایک، جس کا رنگ سبز ہوتا ہے۔ اسی لیے شعری اسے سبزہ خط سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بعض اساتذہ نے رک کو مفتوح بھی بانڈھا ہے۔

حرفیت : متقابل۔ دشمن۔

افعی : کالا سانپ، جو بہت زہر مالا اور موذی ہوتا ہے۔ اسے کا کل سے تشبیہ دی گئی ہے۔

شرح : اسے محبوب ! تیرا سبزہ خط کا کل کر دبا نہ سکا، یعنی اس پر کچھ اثر نہ ڈال سکا اور اسے پیچھے نہ بٹھا سکا۔ اگرچہ اس کی حیثیت زمرود کی تھی، مگر یہ زمرود کالے اور موذی سانپ کی پھینکار کا قدر مقابل نہ ہوا۔

شعر کا مضمون فارسی اور اردو ادب کی اس مشہور عام روایت پر مبنی ہے کہ زمرود کو دیکھ کر افعی سانپ اندھا ہو جاتا ہے۔ خود مرزا غالب صاحب عالم مارہروی کو کف الخضیب کے سلسلے میں قبول دعا کے مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ :

”مبغلوہ مضامین شعر ہے، جیسے کن کا پر تو باہ میں پھٹ جاتا اور

زمرود سے افعی کا اندھا ہو جاتا۔ آصف الدولہ نے افعی تلاش کر کے

ملگوایا اور قطعات زمرود اس کے منافی چشم رکھتے۔ اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔

ایران و روم و مزنگ سے انواع انواع کے کپڑے منگوائے، پانڈنی میں پھیلائے، کوئی مسکا بھی نہیں۔“

شاعر کا مطلب یہ ہے کہ محبوب کے چہرے پر خطِ بکھل آنے سے کامل کی دلکشی و دلآویزی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

۳۔ شرح :- میں نے چاہا تھا کہ مرباؤں اور اس طرح دنیا کے غم و درد اور مصیبتوں سے سہات حاصل کروں اور وفاداری کے تقاضوں کو پورا کرنا نہایت پریشانی اور کوفت کا باعث ہے۔ خصوصاً اس حالت میں کہ محبوب کا پیشہ ہی علم و حکم اور جہود و جفا ہو، لیکن ظالم محبوب میرے مرنے پر بھی راضی نہ ہوا اور مجھے دنیا کے رنج و غم سے غلطی نہ مل سکی۔

شعر کا یہ پہلو خاص تو توجہ کا محتاج ہے کہ عاشق اپنے محبوب کے جہود و جفا کے باوجود وفا کے تقاضے پورے کر رہا ہے۔ جب وہ سمجھتا ہے کہ تقاضے پورے کرنا ناقابلِ برداشت مصیبتوں کا سامان ہے اور ان سے رہائی پانا چاہتا ہے تو اس حالت میں بھی اپنی خواہش پر محبوب کی رضا کو ترجیح دیتا ہے۔ یہی سچے عاشق کا خاصہ ہے۔ محبوب عاشق کے مرنے پر غالباً اس لیے راضی نہ ہوا کہ یہ امر اس کی بدنامی کا باعث تھا۔

۴۔ لغات - حواہ : راستہ - پگڈنڈی۔

تقویٰ : جسے شاعر نے ایرانیوں کے طریقے کے مطابق تقویٰ باعدیہ ہے (مثلاً جیسی، ایسی، ییل، کیل) پرہیزگاری۔

شرح :- میرا دل شراب اور پالے کے خیالات کی گزرگاہ ہی نہیں اگر میرا سانس پرہیزگاری کی منزل کے لیے پگڈنڈی نہ بن سکا تو کچھ مضائقہ نہیں۔

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ اگر مجھے پرہیزگاری نصیب نہیں تو رندی اور شے نشی ہی ہونہو ہوں میں سے ایک حالت کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ یہ مناسب نہیں کہ نہ رندی ہو، نہ لہوکاری۔

۵۔ لغات - منت کش : احسان اٹھانے والا۔ ممنون

گلابنگ : قلندروں اور شاطروں کی آواز۔ بیل کی آواز۔ اچھی آواز اور خوشخبری۔ وہ شورا جو خوشی کے موقع پر لوگوں میں اٹھتا ہے۔ مطلق آواز کے معنی میں مستقل ہے۔

شرح : اے محبوب اٹھنے کے لئے کا وعدہ کیا۔ میں اس پر سبب راضی ہوں، کیونکہ میرے کان نے تسلی کی اس اچھی آواز کا احسان نہ اٹھایا۔

مطلب یہ ہے کہ تُو وعدہ کر ہی لیتا تو اس کے پورا ہونے کی کوئی امید نہ تھی کیونکہ تیرا شیوہ یہی ہے کہ وعدے پورے نہ کیے جائیں۔ وعدہ نہ کرنے سے اتنا تو فائدہ ہوا کہ کان مہنت کے احسان سے محفوظ رہے۔ محبوب کا وعدہ کر لینا عمل دیا ہی تھا، جیسا وعدہ نہ کرنا۔

۶۔ شرح :۔ میں خوش نصیبی سے اس درجہ محروم ہوں کہ اس دنیا میں جس خواہش کے لیے شاید ہی کوئی تدارک ہو، یعنی مرجانا، میں اس کے لیے بھی تیار تھا، لیکن یہ خواہش بھی پوری نہ ہوئی، یعنی مرنا بھی قیصر نہ آسکا۔ یہ محرومی دنیا کی انتہا ہے، مگر شکایت کس سے کی جائے؟ فریادے کر کس کے پاس جائیں؟

۷۔ لغات - جنبش لب : لب ہلانا۔
دم عیسیٰ : حضرت عیسیٰ کا دم یعنی تم باذن اللہ (اللہ کے حکم سے اُٹھ) کہنا جس سے مُردے زندہ ہو جاتے تھے۔

شرح :۔ غالب اس قدر ناتوان، ضعیف اور کمزور تھا کہ حضرت عیسیٰ نے معجزہ تم باذن اللہ سے کام لینا چاہا۔ آپ کے لب ہلے تو اسی حد سے غریب غالب کی جان نکل گئی۔

ناتوانی اور ضعف کی انتہا ہے کہ زندگی بخشنے والا اعجاز ہی موت کا باعث بن گیا۔

۱۔ لغات ۔ ستائش گر :

تعریف کرنے والا ۔ مآخ ۔

بارغ رضواں : داروغہ

بہشت کا بارغ یعنی بہشت ۔

طاقِ نسیاں : وہ طاق ،

جس میں انسان کچھ رکھ کر بھول

جاتے ۔

شرح : ۔ زاہد جس

بہشت کی اس قدر تعریف کر رہا

ہے ، ہم بخودوں کے نزدیک

اس کی حیثیت صرف اتنی ہے ،

جیسے ایک گلدستہ ہوا در سے

طاق پر رکھ کر بھول جاتیں ۔

مولانا مآلی فرماتے ہیں کہ

بہشت کو بخودوں کے گلدستہ

طاقِ نسیاں سے تشبیہ دینا بالکل

ایک زالی تشبیہ ہے ۔ جو کہیں

نہیں دیکھی گئی ۔ فارسی میں بھی

مرزا غالب نے جنت کو نقشِ نگار

طاقِ نساں کہا ہے :

رنگِ ہاچوں شد فراہم صرحتِ دیگر نداشت

نقدِ نقشِ رنگار طاقِ نسیاں کردہ ایم

غالب نے بہشت کو گلدستہ

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس بارغ رضواں کا

وہ اک گلدستہ ہے ہم بخودوں کے طاقِ نسیاں کا

بیاں کیا کیجیے بیداد کا دوش ہائے مڑھاں کا

کہ ہر اک قطرہٴ خوں دانہ ہے تیجِ مرجاں کا

ذاتی سطوتِ قاتل بھی مانعِ میرے نالوں کو

لیا دانتوں میں جو تنکا ، جو اریشہٴ غیساں کا

دکھاؤں گا تماشا ، وی اگر فرصت زمانے نے

مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سر و چراغاں کا

کیا آئینہٴ فانی کا وہ نقشہٴ تیرے جلوے نے

کرے جو پر تو خود شیدائے عالمِ شبنمستاں کا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صُوتِ خرابی کی

بیٹولی برقِ خرس کا ہے ، خونِ گرم دہقاں کا

اگا ہے گھر میں ہر سوسنہ ، ویرانیِ تماشا کر

مدارِ اب کھوونے پر گھاس کے ہے میرے بیدیاں کا

خوشی میں مہناں خونِ گشتہٴ لاکھوں آرزوئیں ہیں

چرخِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ خیاباں کا

ہنوز اک پر تو نقشِ خیالِ یار باقی ہے !
 دلِ افسردہ گویا مجھ ہے یوسف کے زناں کا
 بغل میں غیر کی آپ آج سوئے ہیں گمیں ورنہ
 سبب کیا بخواب میں اگر تبسم ہائے نہاں کا
 نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی بڑا ہوگا
 قیامت ہے سرشک آلودہ ہوتا تیری شرک کا
 نظریں ہے ہمارے جادو راہِ فنا غالب
 کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا
 طاقِ نیل کہ کہہ کر محض تشبیہ اور حسنِ بیان
 ہی کے کمالات نہیں دکھائے بلکہ
 اجزائے اعمال کے متعلق اپنا فلسفہ
 بھی پیش کر دیا ہے۔ وہ یہ حقیقت
 واضح کرنا چاہتا ہے کہ ہم بخود اور
 خداست اپنے اعمال کی جزا کے لیے
 بہشت کے خواہاں نہیں، ہم تو بہشت
 کی یاد ہی دل سے نکال چکے ہیں اور
 اسے گلدستہ طاقِ نیل بن چکے ہیں
 ہمارے پیش نظر ہر خدا کی رضا اور
 اس کے حکموں کی تعمیل ہے چنانچہ
 وہ دوسری جگہ کہتے ہیں۔

طاہریت میں تار ہے نہ سے داغیں کی داغ

دورخ میں ڈال دو کوئی سے کر بہشت کو

۲۔ لغات - مرجان : مونگا۔ سمندر میں خاص قسم کے کیڑے صاب بن
 سے اپنے لیے گھر بناتے ہیں جو سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ گھر وسیع
 چٹانوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو شاخ و در شاخ دور دور تک پھیل جاتی ہیں۔
 پرانے زمانے کے لوگ مونگے کو جہادات و نباتات میں ایک اقصائی کڑی سمجھتے تھے
 یعنی مونگے میں جہادات نے پہلے پہل نباتات کی شکل اختیار کی، چنانچہ وہ جہادات
 سے بھی بنتا ہے، کیونکہ پتھر ہوتا ہے اور اس میں نباتات کی بھی خاصیت ہے، کیونکہ
 بڑھتا اور پھیلتا ہے۔

شرح :- محبوب کی پیکوں نے سوئی بن کر دل میں کاوشوں کا ایک ایسا ہنگامہ
 بپا کر یا کہ ہر قطرہ خون کو چھید ڈالا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے جسم کا ایک ایک قطرہ خون

موتگی کی تسبیح کا دامن بن گیا۔ چھیدنے کے لیے جادو جسم و کار نہ ہے۔ لیکن مژگاں بیلید کی کاوش کا کمال یہ ہے کہ اس نے سیال قطروں میں سوراخ کر دیے۔ کاوش کا ایسا نقشہ اور کہیں نظر نہیں آ سکتا۔

۲۔ لغات۔ سطوت : رعب۔ ویدہ

دانتوں میں تنکا لینا : زناٹہ ماضی میں عجز کا اظہار کرنے کے لیے دانتوں میں تنکا لیا جاتا تھا، فارسی میں اسے "خس ہو، نداں گرفتن" کہتے ہیں۔
نمیستاں : سرکٹھے، بانس اور نرکل کا جنگل۔ بانس اور نرکل سے بانسری اور نئے بنتی ہیں، جن سے فنے اور تالے نکلتے ہیں۔

شرح : قاتل کا رعب اور ویدہ مجھے آہ و فغاں سے روک نہ سکا۔ میں نے اظہار عجز کے لیے جو تنکا اٹھا کر دانتوں میں دبایا، وہ بانس اور نرکل کے جنگل کا ریشہ بن گیا۔ یعنی اس سے نمیستاں پیدا ہوا، نمیستاں سے نئے بنی۔ گویا اظہار عجز ہی کی تدبیر میرے لیے آہ و فغاں کا سامان بن گئی۔

قاتل میں محبوب چاہتا تھا کہ مجھے نالوں کی کثرت کا ذریعہ بن گئی۔
اعتقاد کرنی چاہی۔ وہی عاجزی نالوں کی کثرت کا ذریعہ بن گئی۔

۴۔ لغات۔ سرو چراغاں : پھل چراغ۔ وہ محافل جس میں بہت سے چراغ جلنے ہوں۔ پاک و ہند میں کڑی یا دعائے سرو جیسی ایک چیز بنا لیتے تھے جس میں بے شمار چراغ جلانے کا انتظام کرتے تھے۔

شرح :- اگر مجھے زمانے نے مہلت دے دی تو میں ایسا تماشا دکھاؤں گا جو ہمیشہ یادگار رہے، کیونکہ میرے دل کا ہر داغ سرو چراغاں کا ایک بیج ہے۔

بے شمار داغوں سے بے شمار سرو چراغاں پیدا ہو جائیں گے اور ان سب پر بہ کثرت چراغ جلنے لگیں گے تو واقعی ایک نادر منظر سامنے آجائے گا۔

شعر کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں جنونِ عشق کی افزائش کا اظہار کیا ہے، کیونکہ ہر داغ دل میں سرو چراغاں کی نو ثابت کی ہے۔

۵۔ لغات۔ آئینہ خانہ : شیش صل۔ وہ گھر جس میں سہ طرف رنگارنگ آئینے لگے ہوئے ہوں۔

شبستان : وہ مقام جہاں سبزے اور پودوں پر بہ کثرت شبنم پڑی ہوئی ہو۔

شرح :۔ اسے محبوب ! تیرے جلوۂ حسن نے آئینہ خانے میں وہی شان اور وہی کیفیت پیدا کر دی ہے جو سورج کی شاعروں کے نور سے شبستان پرطاری ہو جاتی ہے۔

اس شعر کی حقیقی حیثیت کا اندازہ مشاہدے سے تعلق رکھتا ہے۔ صبح کو اُٹھے اور کسی ایسے مقام پر پہنچ جائیے جہاں سبزے کا فرش ہو۔ جا بجا پھولوں کی کیریاں ہوں اور ان پر خوب شبنم پڑی ہوئی ہو۔ جیسا کہ سرمایں پڑتی ہے۔ پھر سورج نکلے اس کی شا میں شبنم کے قطروں پر پڑیں تو ہر قطرہ ایک چھوٹا سا قطرہ نظر آئے گا۔ جس میں چراغ کی سی روشنی ہوگی۔ آپ مختلف زاویوں سے دیکھیں گے تو ہر قطرے میں نور کے مختلف رنگوں کا جلوہ دکھائی دے گا۔ آپ دیکھتے جائیں ایسی بہار آپ کے سامنے ہوگی جس کا نقشہ لفظوں میں نہیں کھینچا جاسکتا۔

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب ! یہی کیفیت آئینہ خانے میں تیرے جلوے نے پیدا کر دی۔

واضح رہے کہ شعر میں غائب نے ہی مشاہدہ پیش کیا ہے۔ اسے سورج کے نکلنے پر شبنم کے اڑ جانے یا آئینے کا پانی خشک ہو جانے سے کوئی تعلق نہیں۔

۶۔ لغات۔ مضمحل : چھپا ہوا۔ پرشیدہ۔

میوئی : بہرادی چیز کی اصل مادی جسموں کی صورت حال ہے اور میوئی اس کا اصل ہے۔

شرح :۔ میری آبادی اور بناوٹ ہی میں خرابی اور بربادی کی ایک صورت موجود ہے۔ کہان کا خون محنت و مشقت میں گرم ہوتا ہے۔ وہی گرمی ایک مادہ ہے

موتے کی قبیح کا دامن بن گیا۔ چھیدنے کے لیے ہمارے جسم درکار ہے۔ لیکن مڑا ہوا
کی کاوش کا کمال یہ ہے کہ اس نے سیال قطروں میں سودا خ کر دیے۔ کاوش کا ایسا
نقشہ اور کہیں نظر نہیں آ سکتا۔

۳۔ لغات۔ سطوت : رعب۔ وجہ

دانتوں میں تنگ لینا : زمانہ ماضی میں عجز کا اظہار کرنے کے لیے دانتوں
میں تنگ کیا جاتا تھا، فارسی میں اسے "خس بر دنداں گرفت" کہتے ہیں۔
نمیستان : سرکنڈے، ہنس اور نرکل کا جنگل۔ ہنس اور نرکل سے ہانسی
اور نئے بنتی ہیں، جن سے فتنے اور تائے نکلتے ہیں۔

شرح : قاتل کا رعب اور وجہ مجھے آہ و فغاں سے روک نہ سکا۔ میں
نے اظہار عجز کے لیے جو تنکا اٹھا کر دانتوں میں دبایا، وہ ہنس اور نرکل کے جنگل کا ریشہ
بن گیا۔ یعنی اس سے نمیستان پیدا ہوا، نمیستان سے نئے بنی۔ گویا اظہار عجز ہی کی
تدبیر میرے لیے آہ و فغاں کا سامان بن گئی۔

قاتل میں محبوب چاہتا تھا کہ مجھے نالوں سے روکے۔ میں نے خود بھی عاجزی
اختیار کرنی چاہی۔ وہی عاجزی نالوں کی کثرت کا ذریعہ بن گئی۔

۴۔ لغات۔ سرو چراغاں : چل چراغ۔ وہ جھانڈ جس میں بہت سے
چراغ جلتے ہوں۔ پاک و ہند میں کڑی یا دھات سے سرو جیسی ایک چیز بنائیتے تھے
جس میں بے شمار چراغ جلانے کا انتظام کیے جاتے تھے۔

شرح :۔ اگر بچے زمانے نے بہت دے دی تو میں ایسا تماشا دکھاؤں گا
جو ہمیشہ یادگار رہے، کیونکہ میرے دل کا ہر داغ سرو چراغاں کا ایک بیج ہے۔

بے شمار دانتوں سے بے شمار سرو چراغاں پیدا ہو جائیں گے اور ان سب پر
ہر کثرت چراغ جلنے لگیں گے تو واقعی ایک تادر منظر سامنے آ جائے گا۔

شعر کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں جنونِ عشق کی افزائش کا اظہار کیا ہے، کیونکہ
ہر داغ دل میں سرو چراغاں کی نو ثابت کی ہے۔

۵۔ لغات۔ آئینہ خانہ : شیش محل۔ وہ گھر جس میں سہ سڑت رنگ رنگ آئینے لگے ہوتے ہوں۔

شبنستان : وہ مقام جہاں سبزے اور پودوں پر بہ کثرت شبنم پڑی ہوئی ہو۔

شرح :- اے محبوب ! تیرے جلوۂ حسن نے آئینہ خانے میں وہی شان اور وہی کیفیت پیدا کر دی ہے، جو سورج کی شاعروں کے نور سے شبنستان پر طاری ہو باقی ہے۔

اس شعر کی حقیقی حیثیت کا اندازہ مشاہدے سے تعلق رکھتا ہے۔ صبح کو آئینے اور کسی ایسے مقام پر پہنچ جائیے، جہاں سبزے کا فرش ہو۔ جا بجا پھولوں کی کھیلوں ہوں اور ان پر خوب شبنم پڑی ہوئی ہو۔ جیسا کہ سرمایں پڑتی ہے۔ پھر سورج نکلے اس کی شا میں شبنم کے قطروں پر پڑیں تو ہر قطرہ ایک چھوٹا سا قطرہ نظر آئے گا۔ جس میں چراغ کی سی روشنی ہوگی۔ آپ مختلف زاویوں سے دیکھیں گے تو ہر قطرے میں نور کے مختلف رنگوں کا جلوہ دکھائی دے گا۔ آپ دیکھتے جائیں ایسی بار بار آپ کے سامنے ہوگی، جس کا نقشہ لفظوں میں نہیں کھینچا جاسکتا۔

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب ! یہی کیفیت آئینہ خانے میں تیرے جلوے نے پیدا کر دی۔

دانش رجے کہ شعر میں غالب نے یہی مشاہدہ پیش کیا ہے۔ اسے سورج کے نکلنے پر شبنم کے اڑ جانے یا آئینے کا پانی خشک ہو جانے سے کوئی تعلق نہیں۔

۶۔ لغات۔ مضمحل : چھپا ہوا۔ پوشیدہ۔

میوئی : ہر مادی چیز کی اصل مادی جسموں کی صورتِ حال ہے اور میوئی اس کا اصل ہے۔

شرح :- میری آبادی اور بناوٹ ہی میں خرابی اور بربادی کی ایک صورت موجود ہے۔ لیکن کا خون محنت و مشقت میں گرم ہوتا ہے۔ وہی گرمی ایک مادہ ہے

جس سے میرے حاصل کے لیے بھل جنتی ہے ۔

مرزا غالب نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ دہقان کو فصل کے لیے جوتے ہونے اور پانی دینے میں مشقت اٹھانی پڑتی ہے اور ریاست میں اس کا لہو گرم ہو جاتا ہے ۔ یہی گرمی حواس کو جلانے کے لیے بھل کی شکل اختیار کر لیتی ہے ۔
گویا میں آبادی کے لیے جو کوشش کرتا ہوں ، وہی میری بربادی کا باعث بن جاتی ہے ۔

مولانا طباطبائی نے فرمایا ہے : ”یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ حرارت غریزی جو باعث حیات ہے ، خود وہی بہ وقت تحلیل و فنا بھی کر رہی ہے ۔“
اس شعر میں جو مسئلہ طب مصنف نے نظم کیا ہے ، اسے آگے بھی کئی جگہ باندھا ہے
مثلاً : : برقی خرمن راحت خون گرم دہقان ہے ۔

۷۔ لغات ۔ مدار : لغوی معنی دورہ کرنے اور گھومنے کی جگہ ۔ مہاراجا جس پر کسی بات کا غمراہ اور انحصار ہو ۔

شرح : گھر میں ہر طرف گھاس لگ آئی ہے ، جو بھائے خود اس امر کی دلیل ہے کہ گھر ویران و بے آباد ہے ، کیونکہ وہاں ہر طرف گھاس اسی وقت اگتی ہے ، جب کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہ ہو اور نہ کوئی آتے جائے ۔ دربان اس لیے مقرر کیے جاتے ہیں کہ گھر کے دروازے پر پہرا دیں اور اندر آنے والے ان کی اجازت کے بغیر نہ آسکیں ، لیکن میرے گھر میں تو دیرانی کے باعث کسی کی آمد و رفت کا امکان ہی نہیں اور دربان کا کام دروازے پر پہرا دینے کے بجائے گھاس کھڑا رہ گیا ہے ۔

۸۔ لغات ۔ خوں گشتہ : چھ خون ہو چکی ہیں ، یعنی ان کے پورا ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی

چراغ مژدہ : بجھا ہوا چراغ ، جسے چراغ خاموش بھی کہتے ہیں ۔
گورِ غریباں : اجنبیوں کے وطنوں اور مسافروں کی قبریں ۔

شرح :- میری خاموشی میں لاکھوں ایسی آرزوئیں اور تمنائیں چھپی ہوئی ہیں، جن کا خون ہو چکا ہے اور ان کے پورا ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ میری شان اس بجے ہوئے دیشے کی ہے، جو کسی غریب، بے وطن اور مسافر کی قبر پر بھلایا گیا تھا۔ اور اس کی نوبت ختم ہو چکی۔

عام دستور ہے کہ لوگ عزیزوں کی قبروں پر چراغ روشن کر دیتے ہیں، اس طرح قبرستان کی خاموشی اور اداسی میں بھی آبادی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہیں، لیکن جو لوگ باہر سے آئے اور مرکز سرزمینِ خیر میں بن ہو گئے، ان کا کوئی عزیز اور شہ دار موجود نہیں ہوتا۔ لہذا ان کی قبروں پر یا تو دیے بجائے ہی نہیں جاتے یا کسی نے ایک آدھ مرتبہ بجلا بھی دیا اور وہ بچھ گیا تو کوئی اس کی پروا نہیں کرتا۔

مرد کہتے ہیں کہ میرے دل میں بے شمار تمنائیں تھیں، جو خون ہو چکیں اور میں چنپ بیٹھا ہوں۔ گویا وہ دیا ہوں، جو کسی مسافر کی قبر پر بھلایا گیا تھا، سمجھا تو پھر کسی نے خبر نہ لی۔

شعری لفظی مناسبتیں، کمالِ تشبیہ اور تاثر بیان ایک روشن کرامت ہے۔
۹۔ شرح :- میرا دل سمجھ چکا ہے اور اس میں کوئی اُمید باقی نہیں، لیکن خیالِ محبوب کے نقش کی روشنی تا مالِ قائم ہے گویا دلِ افسردگی کے باعث ایک جگر ہے، جس کے متعلق عام تصور تنگی و تاریکی کا ہوتا ہے، لیکن خیالِ یار کے پرتو کی برکت سے یہ جگر حضرت یوسف کے قید خانے کا جگر بن گیا یعنی وہ کوٹھڑی جس میں یوسف بند تھے۔

دلِ افسردہ کو نقشِ یار کے پرتو سے زندانِ یوسف کا جگر قرار دینا ایک نادر تشبیہ ہے، جس کی مثالیں شعروادب میں بہت کم مل سکتی ہیں۔
۱۰۔ لغات :- تبسم ہانٹے پنہاں : زیر لب مسکراہٹیں۔

شرح :- معلوم ہوتا ہے کہ آج آپ رقیب کی بغل میں ماسوسے میں اور نہ خواب میں اگر زیر لب مسکراہٹ کا اندک کیا موقع ہو سکتا تھا۔

مطلب یہ ہوتا ہے کہ محبوب عاشق کے خواب میں آیا اور ایسی حالت میں کہ زیر لب مسکرا رہا تھا۔ عاشق کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ ہر معمولی سے معمولی بات پر اس کے دل میں بدگمانی پیدا ہو۔ محبوب کی زیر لب مسکراہٹ دیکھ کر عاشق کو فوراً خیال پیدا ہوا کہ ہونہ ہو محبوب غیر کی آغوش میں پہنچ گیا ہے۔

۱۱۔ لغات - لہو پانی ہونا : رنج و تکلیف میں مبتلا ہونا۔ جان ہلکانا
 شرح :- خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ تیری پلکوں پر آنسو آ جانے سے کس کس کا لہو پانی ہوا ہو گا۔ کون کون انتہائی رنج و غم کا تختہ مشق بنا ہو گا۔
 سچ ہے، محبوب کا بدکا سالال بھی عاشقوں کے لیے قیامت سے کم نہیں ہوتا۔

۱۲۔ لغات - شیرازہ : وہ بندش جس سے کتاب کے اوراق ترتیب کے ساتھ یکجا کیے جاتے ہیں۔

شرح :- اے غائب! ہم راہ فنا کی پگڈنڈی سے غافل نہیں اور اس کی حقیقت خوب پہچانتے ہیں۔ یہی وہ بندش ہے جس کے دریچے سے کائنات کے کبھرے ہوئے اجزاء کتاب کے ورقوں کی طرح اکٹھے کیے جاتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ زندگی نے اس دنیا میں بے شمار ٹکٹیں اختیار کیں۔ وہ ایک دوسری سے اتنی مختلف ہیں کہ ان میں جوڑ میل پیدا کرنا ممکن نہیں، لیکن ان تمام کبھری ہوئی شکلوں اور صورتوں کے لیے لازم ہے کہ فنا کی پگڈنڈی اختیار کریں۔ وہی پگڈنڈی دھاگے کی طرح ان تمام کبھرے ہوئے اجزاء کو باہم ہی دے گی۔ گویا موت کے بعد یہ سب چیزیں یک جا ہو جائیں گی، جو آج کبھری ہوئی نظر آتی ہیں، اسی لیے ہم بھی راہ فنا کی پگڈنڈی کو بھولے نہیں، ہر وقت اسی پر نظر ہے۔

دھوگایک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا لغات :- یک بیاباں ماندگی :
 حساب موجب رفتار ہے نقش قدم میرا حدود و تکان - اتنی تکان جو پورے
 محبت تھی جن سے ، لیکن اب یہ بے مانگی ہے بیابان کی خاک چھاننے سے پیدا ہو
 کہ موج بٹوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا ذوق :- اس سے مراد ہے -
 جاؤں ، لیکن صحر اگر دی کا ذوق و شوق ہرگز کم نہ ہوگا۔ بیاباں گردی کا ذوق -
 کی لہروں پر بیلے بنے ہوتے ہیں - شرح :- میں کتنا ہی شک

شاعر نے اپنے چلنے کو موج سے اور نقش قدم کو حساب سے تشبیہ دی۔ کمال
 یہ کیا کہ نقش قدم کو جس کا خاکا ہی افتادگی اور واما ندگی ہے ، یعنی جو زمین پر جم کر
 بالکل بے حرکت ہو جاتا ہے۔ شاعر نے اسے اپنے ذوق رفتار کی برکت سے متحرک
 کر کے موج رفتار کا بلبل بنا دیا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کا نقش قدم رفتار کی لہر کا
 بلبل ہوگا ، اس کی صحرانوردی کے شوق میں کمی کا کیا امکان ہو سکتا ہے اور تھکاوٹ
 اس پر کیا اثر ڈال سکتی ہے ؟

۲ - لغات - بے دماغی : پریشانی ، ناخوشی ، زور و زنجی ، جڑ جڑاؤ ،
 بد مزاجی - بیزاری -

ناک میں دم آنا ، نہایت تنگ اور بیزار ہونا -
 شرح :- ایک زمانے میں مجھے بارغ اور اس کے اندر میری تفریح سے
 محبت تھی ، لیکن اب بیزاری و ناک مزاجی سے یہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے کہ چول
 کی خوشبو سے بھی میں سخت تنگ اور رنجیدہ ہو جاتا ہوں
 آخری مصرع میں خوبی یہ ہے کہ چول ناک کے سامنے رکھ کر دم اندر کھینچا جائے
 تو خوشبو کا عکس پہنچتی ہے۔ یہاں چول کی خوشبو سے ناک میں دم آنے کی مناسبت
 واضح ہے ، اگرچہ یہاں ناک میں دم آنا بطور محارہ استعمال کیا گیا ہے۔ شاعر کا

معلوم ہے کہ میں بھی ایک زمانے میں شادمانی کے اسباب سے اسی طرح فائدہ اٹھاتا اور لذت اخذ نہ ہوتا تھا، جس طرح عام لوگوں کا شیوہ ہے، مگر اب یاس و اندوہ کی نے یہ حالت پیدا کر دی ہے کہ پھول کی خوشبو سے بھی جو نہایت لطیف و فرحت بخش ہوتی ہے، میں بیزار ہوں اور اس درجہ بیزار ہوں، گویا اس سے تاک میں دم آتا ہے۔

دکن میں مناظر سے رغبت و محبت کے بجائے انتہائی نفرت و بیزار ہی یہ بتاتی ہے کہ حالت میں کس درجہ عبرت انگیز انقلاب آگیا۔



اسلغات - رہن : گرد
ناگزیر : مجبور، ناچار
جس سے گریز ممکن نہ ہو۔

شرح :- میں سرے
پاؤں تک عشق کے پاس گرد ہوں جو تو دریائے مے ہے، تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا
یعنی عشق میں مبتلا ہوں۔ ساتھ ہی زندگی کی الفت سے بھی دامن بچا، میرے لیے ممکن نہیں، یعنی جان کو بھی عزیز رکھتا ہوں۔ گویا میری حالت اُس شخص کی سی ہے، جو بھلی کو معبود بنائے بیٹھے ہو، رات دن اس کی بندگی کرتا ہو، یہ ایں ہرے سے یہ انوس ہو کہ حاصل برباد ہو گیا، سرمایہ جل بھجا، حالانکہ بھلی کا خاصہ یہی یہ ہے کہ حاصل کو جلا ڈالے۔

مرزا اب حقیقت واضح کرنا چاہتے ہیں کہ جب انسان عشق کی نذر ہو جائے تو زندگی سے کوئی وابستگی باقی نہ رہنی چاہیے۔ اگر عشق کے ساتھ جان سلامت بھنا منظور ہو تو یہ خواہش سرا سر خیر طبعی ہوگی، کیونکہ بھلی کو پوچھ کر آپ کو بچائے رکھنے کی آرزو بالکل عبث ہے۔ عشق کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے لیے زندگی کی ہر

شے سے الفت کا رشتہ کٹ جائے۔

۲۔ لغات - ظرف : حوصلہ - گنجائش - سائ -

تشنہ کامی : پیاس - اشتیاق ، خصوصاً اشتیاق ہے۔

خمیازہ : انگڑائی۔

شرح :- اے ساقی ! شراب کی پیاس اور طلب کی بے کیفی حوصلے کے

مطابق ہوتی ہے۔ اگر تو لطف و کرم سے شراب کا دریا ہے تو میں اس دریا کے

سامل کی انگڑائی ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ ساقی میں لطف و کرم کا جتنا حوصلہ ہو پینے والے کی پیاس

بھی اتنی ہی بڑھ جاتی ہے۔ فرض کیجیے کہ ساقی شراب کا دریا بن گیا تو پینے والے

نے اس کے سامل کی شکل اختیار کر لی۔ معلوم ہے کہ دریا کا جوش و خروش کتنا ہی

بڑھ جائے، سامل اس جوش و خروش کو اپنے اندر سمائے رکھتا ہے۔ بالکل یہی

کیفیت شراب نوش کی ہے، اس کی طلب ساقی کے لطف و کرم کے ساتھ ساتھ

زیادہ ہوتی جاتی ہے۔



یاں درنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یہ وقت ہے گفتگو گلمائے ناز کا

میں، اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

طعم ہوں ایک ہی نفس جاں گداز کا

ہر گوشہ بساط ہے، سریشہ باز کا

ناخن پتھر، اس گرو نیم باز کا

سینہ، کہ تھا دینہ گہرائے راز کا

معم نہیں ہے نرہ نوا ہائے راز کا

نگہ شکستہ صبح بہارِ نظارہ ہے

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز

صرف ہے ضبطِ آہ میں میرا، وگرنہ میں

ہیں بس کہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل چکے

کلوش کا دل کرے ہے تقاسم کہ ہے ہند

تہا راج کاوشِ غم، جہاں ہوا اسد

۱۔ لغات۔ فراہائے راز : راز کے نئے۔ راز سے مراد حقیقت کے بھائی۔
 شرح :- خواہجہ مائی نے اس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے : راز
 کے لغتوں سے تو خود ہی نا آشنا ہے۔ ورنہ دنیا میں بظاہر جو حجاب نظر آتے ہیں وہ
 بھی پردہ ساز کی طرح بول رہے، سچ رہے اور اسرار الہی ظاہر کر رہے ہیں۔
 شاعر کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی ہر شے میں حقیقت جلوہ گر ہے۔ ہر چیز قابلِ مطلق
 کے بھید ظاہر کر رہی ہے اور معرفت کے نئے سار ہی ہے، مگر مصیبت یہ ہے کہ
 انسان ان لغتوں کا محرم نہیں، وہ ہر شے کو حقیقت کا حجاب یعنی چھپا لینے والے
 پردے سمجھتا ہے۔ وہ تو ساز کے پردے ہیں، جن سے نئے نکلتے ہیں، لیکن ان لغتوں
 کو سننے کے لیے ایسے کان چاہئیں، جو ٹھیک ٹھیک سننے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔
 عرفی کا مشہور شعر ہے :

ہر کس بد شناسندہ راز است دگر نہ

اینا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

یعنی ہر شخص کو راز پہچان لینے کا فکر حاصل نہیں، ورنہ جو کچھ عام لوگ جانتے
 ہیں، وہ بھی دراصل سارے کا سارا راز ہے۔

عرفی نے عوام کی معلومات کو راز بتایا، لیکن غالب اُن چیزوں کو حقیقت
 کے تراژوں کا مصدر قرار دیتا ہے، جنہیں سب لوگ حجاب یعنی حقیقت چھپا لینے والے
 پردے قرار دیتے ہیں۔

۲۔ لغات۔ رنگ شکستہ : اڑا ہوا رنگ، مراد ہے عاشق کا اڑا
 ہوا رنگ۔

شرح :- محبوب کو دیکھتے ہی عاشق کا رنگ اڑ گیا۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ
 اڑا ہوا رنگ بہارِ نظارہ کی صبح ہے۔ صبح کے وقت پھول کھلتے ہیں اور جو صبح
 عاشق کے رنگِ شکستہ سے پیدا ہوتی، اس میں محبوب کے ناز و نخرے کے پھول
 کھلتے چاہئیں۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ محبوب کو دیکھ کر عاشق کا رنگ اڑ جاتا ہے اور محبوب اس اڑے ہوئے رنگ کو مسج قرار دے کر اپنے ناز مخزے کے پھول کھلانے میں اور سرگرم ہو جاتا ہے۔

۳۔ شرح :- ٹوغیر کو غصے کی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ مجھے تری لمبی پکلوں کی اس تکلیف سے دکھ پہنچ رہا ہے۔

غیر کا دل پتھر کا ہے۔ اُسے چھیدنے میں تری پکلوں کو جو زحمت ہو رہی ہے وہ میرے لیے باعثِ اذیت ہے۔ تیری نگاہیں اس کے پتھر جیسے دل کے لیے شیش بگڑ میرے زخم، ملامت اور نیاز مند دل کے لیے دقت رہی ہیں۔

ایک مہموم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محبوب غیر کو تیز نظروں سے دیکھ رہا ہے اور عاشق کو رشک کے مارے دکھ پہنچ رہا ہے۔ وہ برداشت نہیں کر سکتا کہ محبوب کے خطاب یا توجہ کا رخ اس کے سوا کسی دوسری طرف پھرے۔

۴۔ لغات - صرف : نائدہ، کفایت شعاری - خرچ - ظلمہ : لقمہ - زار

شرح :- آہ کے ضبط کرنے میں میرا ہی نائدہ ہے، ورنہ میں ناقوانی اور لغات کے باعث جان کو گھٹلا دینے والے ایک ہی سانس کا رزق بن جاؤں گا یعنی معمولی سی آہ بھی مجھے گھٹلا دینے کے لیے بالکل کافی ہوگی۔

۵۔ لغات - گوشہ لبساط : فرش کا کوٹا یا حصہ۔

شیشہ باز : عام معنی شعبہ باز کے ہیں، یہاں اشارہ فنِ رقص کے ان اہلوں کی طرف ہے۔ جو شیشہ و صراحی گلاب سے بھر کر سر پر رکھتے ہیں۔ حرکات کے باوجود کوئی چیز سر سے نہیں گرتی۔ اگر شیشہ یا صراحی ہل جائے تو اسے اصول کے مطابق حرکت کرتے ہوئے بازو پر سنبھال لیتے ہیں، پھر پہلی جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ پرانے زمانے میں ایک دستور یہ بھی تھا کہ میخانے میں خوبصورت لڑکے ساغر شراب سے بھر کر قفس کرے جو سے میخانہ کے پاس پہنچتے ہی اچھانل دیتے تھے، پھر خود ہی سنبھال کر میخانہ

کے سامنے رکھ دیتے تھے۔ اس رسم کی بعض چیزیں اب تک بھی شراب نوشوں کی محفل میں رائج ہیں۔ یورپ کے اندر طعام گاہوں یا شراب خانوں میں ایسی رسمیں کسی نہ کسی شکل میں پائی جاتی ہیں۔ انہیں بھی شیشہ باز ہی کہتے تھے۔

شرح :- موسم بہار آگیا اور شراب کے جوش سے بوتلیں اور صراحیاں اس طرح اچھل رہی ہیں کہ شراب نوشی کی بزم میں فرش کا ہر گوشہ شیشہ باز کے سر کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔

۶۔ لغات۔ گرہ نیم باز : آدھ کھلی گرہ، یعنی جو پوری نہ کھلی ہو، بلکہ اس کے بیچ کا کچھ حصہ باقی ہو۔

شرح :- دل ابھی تک کاوش کا تقاضا کر رہا ہے، کیونکہ ناخن پر اس آدھ کھلی گرہ کا قرض واجب الادا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ میرا دل ابھی تک افسردہ و گرفتہ ہے۔ اس گرہ کو کھولنے کی کوشش کی گئی، مگر پوری نہ کھلی اور ناخن پر یہ قرض باقی رہ گیا، لہذا کاوش کا تقاضا جاری ہے اور وہ ختم نہیں ہو سکتا، جب تک دل کی گرہ پوری طرح کھل نہ جائے۔

۷۔ شرح :- اے استاد! میرا سینہ ایسا تھا کہ اس میں راز کے گوہر دفن کیے ہوئے تھے، یعنی اس میں گوناگوں راز چھپے ہوئے تھے۔ لیکن محبوب کی بیداری کے غم نے اس خزانے کو بڑی طرح تاراج و برباد کر ڈالا۔



۱۔ شرح :- شہنشاہ کی محفل میں شعروں کا دفتر کھل گیا، یعنی مشاعرے شروع ہو گیا۔ الٹی لگوہروں کے اس خزانے کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھو، شکر کا اور ہر امر معروضہ کا یہ ہے مطلب

بزم شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا رکھو یا رب! یہ دیو گنبدینہ گوہر کھلا شب ہوئی پھر انجم رخسندہ کا منظر کھلا اس تکلف سے کہ گویا تکدبے کا دروازہ

یہ ہے کہ فیض کا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔

۲۔ لغات۔ انجم :

انجم کی جمع۔ ستارے۔
رخشنده : چمکنے والے
روشن۔ تاباں۔

شرح : رات ہو گئی،
پھر روشن و تاباں ستاروں
کا ایک سماں آنکھوں کے
سامنے آشکارا ہو گیا اور اس
منظر کے کھٹنے میں اہتمام اور
آرائش و زیبائش کا یہ عالم
ہے۔ گویا بتجانے کا دروازہ
کھل گیا۔

اہتمام اور آرائش میں
بتجانے کے دروازے کا
خیال شاعر کو یا تو اس وجہ
سے آیا کہ بتجانے خاص
اوقات میں عبارت کے لیے
کھٹتے ہیں، بہر وقت کھٹتے نہیں
رہتے، نیز ان میں جنوں کو
سبا کر رکھا جاتا ہے یا اس
وجہ سے کہ خود ستاروں کی

گرچہ جنوں دیوانہ، پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
استین میں دشنہ نہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا
گو نہ سمجھوں اس کی باتیں، گو نہ پاؤں اسکا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری سپر کھلا
ہے خیالِ حُسن میں، حُسنِ عمل کا سا خیال
غُلہ کا اگ در ہے، میری گور کے اندر کھلا
مُنہ نہ کھٹنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے مُنہ پر کھلا
دور پر رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا اپٹا ہوا بستر کھلا
کیوں اندھیری ہے شبِ غم؟ ہے بلاؤں کا نزول
آج ادھر ہی کور ہے گا دیدۂ اختہ کھلا
کیا رہوں غرمت میں خوش جب ہو جو لوٹ کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بُرا کثر کھلا
اس کی اُمت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کا اُبد
واسطے جس شر کے غالب گنبد بے در کھلا

پرستش کو تنہا نے سے خاص نسبت و تعلق ہے۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ چمکتے ہوئے ستاروں کا منظر سامنے آتے ہی یہ خیال آ جاتا ہے کہ بت خانوں میں ان کی پرستش ہوتی تھی۔ ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شام کے وقت تنہاؤں میں پرستش شروع ہوتے ہی بہت سے چراغ روشن کر دیئے جاتے تھے، جنہیں ستاروں کے منظر سے اک گونہ مناسبت ہے۔

۳۔ لغات۔ دشمن : ایک قسم کا خنجر، کٹاری۔

شرح :- اگرچہ میں دیوانہ ہوں، لیکن دوست کا فریب نہیں کھا سکتا۔ اس نے ہاتھ میں تو کھلا ہوا نثر تمام رکھا ہے، جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ میرا غم خوار ہے اور قصد لینے کا ارادہ رکھتا ہے تاکہ زائد خون نکل جائے اور میری دیوانگی باقی رہے، لیکن اس نے آستین میں کٹاری چھپا رکھی ہے۔ تاکہ موقع پاتے ہی میرا کام تمام کر دے۔

مطلب یہ کہ آج کل کے دوست بظاہر غمخواری کا دم بھرتے ہیں، مگر ارادہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دوستوں کا ظاہر باطن ایک نہیں، میں ان کے نفاق سے خوب واقف ہوں۔ شعر میں دوست سے مراد بظاہر محبوب نہیں، بلکہ وہ شخص ہے جو دکھاوے کی غرض سے دوستی کا دم بھرتا ہے۔

۴۔ لغات۔ کھلا : یہاں اس سے مراد بے حجاب ہوا، بے تکلف ہو گیا۔

شرح :- بیشک میں محبوب کی باتوں کا مطلب نہیں سمجھتا یہ بھی نہیں جانتا کہ مجھ سے بے تکلف ہو جانے کا راز کیا ہے۔ میرے لیے تو یہی سب سے بڑی نعمت ہے کہ اس پری پیکر کا حجاب ڈور ہو گیا اور اس نے مجھ سے بے تکلفی اختیار کر لی۔

اس میں ایک پہلو تو یہ ہے کہ عاشق کے لیے محبوب کا خفیت سا لغات

بھی بھانے خود انتہائی مسرت کا باعث ہوتا ہے، اگرچہ وہ کہتے ہی رنج و غم کا پیش خمیہ ہو۔ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ محبوب کے لغات میں عاشق کے لیے

کر دیکھ کی کوئی ضرورت نہیں اور کر بد مناسبت بھی نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ انسانی درجہ و غم
اٹھانے کے بعد محبوب نے بے تکلفی اختیار کر لی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ اور کھل جائیگا
اور عاشق کی تمام مرادیں پوری ہو جائیں گی۔

۵۔ شرح :- میں سخن یعنی چہرہ محبوب کے تصور کو نیک عمل اور نیکو کاری
سمجھتا ہوں۔ اسی تصور کی بدولت میری قبر کے اندر بہشت کا دریا بچھل گیا۔

بہشت اُن لوگوں کو ملتی ہے، جن کے پاس نیک عملوں کا سرمایہ ہو۔ میں نے
محبوب کے حسین چہرے کے خیال میں عمر گزار دی اور وہی تصور میرا سرمایہ عمل تھا
جو سرمایہ کی شمار ہوتا اور اس کی برکت سے میری قبر کی تلخی ہی میں بہشت کی فضا میرے
لیے بن گیا ہو گئی۔

۶۔ لغات :- منہ پر کھلنا : مراد ہے کسی چیز کا چہرے پر زیب و خوش نما
معلوم ہونا۔

شرح :- محبوب کا چہرہ نہ کھلنے پر بھی حسن و دلفریبی کا وہ عالم ہے کہ آواز
نیک کہیں دیکھنے ہی میں نہیں آیا۔ پہلے زلفیں اس کے چہرے پر پڑی رہتی تھیں اور
نہایت دلآویز معلوم ہوتی تھیں۔ اب اس نے نقاب اوڑھ لی ہے اور نقاب نے
زلفوں سے بھی بڑھ کر اس کے چہرے پر زیبائی اور خوش نما پیدا کر دی ہے۔ گویا
نقاب کا حسن زلفوں سے باڑی لے گیا ہے۔

۷۔ شرح :- میں نے درخواست کی کہ حضور! اور دانے پر پڑا رہنے کی
اجازت دے دیجیے۔ اجازت مل گئی اور میں نے اپنا لیٹا ہوا بستر کھولنا شروع
کیا۔ اس اثناء میں محبوب قول سے پھر گیا اور مجھے بہ صد حسرت و یاس اپنا کھٹکا ہوا
بستر پھر لیٹنا پڑا۔

اس شعر میں محبوب کی شوخی، نقون اور عاشق آزاری کا نقشہ نہایت دلکش
انوار میں کھینچا گیا ہے۔

۸۔ شرح :- میری غم بھری رات اتنی اندھیری کیوں ہے کہ اس میں ستاروں

کے نشانے دیے بھی نظر نہیں آتے؛ پھر شاعر خود ہی اس سوال کا جواب دیتا ہوا سبب یہ بیان کرتا ہے۔ کہ عالم بالا سے روئے زمین پر بلائیں نازل ہو رہی ہیں اور ستارے دنیا کے آسمان کی طرف سے آنکھیں پھیر کر عالم بالا کو تک رہے ہیں۔ جو صحرے بلائیں اترتی ہیں۔ ستاروں کی آنکھیں اس منظر کی طرف سے ہٹ نہیں سکتیں۔ اور ان سے جو بھی روشنی حاصل ہو سکتی ہے، زمین کی طرف نہیں آسکتی لہذا میری غم بھری رات سراسر اندھیری ہو گئی۔

شب غم کی کامل تاریکی کا یہ سبب بالکل نیا اور اچھوتا معنوں ہے۔ لطف یہ کہ یہ سبب بلاؤں کے نزول سے پیدا ہوا اور شب غم کی تاریکی میں درد انگیزی کا اضافہ ہو گیا۔

۹۔ لغات و غربت : مسازنی۔ بے وطنی۔ پردیس۔

حوادث : حادثہ کی جمع یعنی آفتیں اور مصیبتیں۔

شرح : میرے لیے پردیس میں خوش رہنے کی کون سی صورت ہے جب آفتوں اور مصیبتوں کا یہ عالم ہے کہ قاصد وطن سے جو خط لاتا ہے، وہ اکثر کھلا ہوا ہوتا ہے؟

دوسرے مصرع کا معنوں اس رسم پر مبنی ہے کہ جن خطوں میں کسی کی موت کی خبر ہوتی تھی وہ اکثر کھلے بھیجے جاتے تھے یا ان کا کوئی گوشہ چاک کر دیتے تھے تاکہ مکتوب الیہ دیکھتے ہی سمجھ جائے، خط میں کوئی بُری خبر درج ہے۔ آج بھی یہ دستور ہے جس شخص کے پاس وطن سے اکثر خط کھلے ہوئے آئیں، اس کا مسلسل رنج و غم میں مبتلا رہنا کسی تصریح کا محتاج نہیں۔ پردیس میں وطن سے خطوں کا آنا ہر مسافر کے لیے خوشی کا باعث ہوتا ہے، لیکن جس شخص کو زیادہ تر خبر مرگ لانے والے خطوط ملیں، وہ کیونکر خوش رہ سکتا ہے۔ پردیس کے غم پر عزیزوں اور دوستوں کے مرنے کا غم اس کے لیے مزید قلق کا باعث بنا رہے گا۔

۱۰۔ لغات۔ گنبد بے در : ایسا گنبد جس میں کوئی دروازہ نہ ہو،

مراد ہے آسمان ۔

شرح : - اے غالب ! میں تو کوئین کے بادشاہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں ہوں ، جس کے لیے صراج کی رات آسمان کے بند دروازے کھل گئے پھر میرے کام کیونکر بند رہ سکتے ہیں ؟ جیسے کار بر آری میں کیونکر رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے ؟ جس مقدس ذات کے لیے یہ بے دروازہ گنبد رکاوٹ نہ بن سکا اس کے لطف و نوازش سے میری تو کوئی بھی غرض رکی نہیں رہ سکتی ۔



۱۔ لغات ۔ زہرہ : پتہ ۔
شعلہ : جوالہ : جوالان کرتا یا پکڑ
کھاتا ہوا شعلہ : طریقہ یہ ہے کہ
ایک کڑی (جسے نہیں کہتے ہیں)
کے دونوں سروں پر یا تو مشلیں
باندھ لیتے ہیں یا گیند سی بانڈھ
کر اور آگ لگا کر گھماتے ہیں ۔
اس طرح آگ کا ایک گول پکڑ
پیدا ہو جاتا ہے ۔ آتش بازی میں
ایک چمخی سے یہی کام کیا جاتا ہے ۔

شرح : رات غم ، بھریں
میرے دل کی جلن سے جو بجلیاں
نکل رہی تھیں ، انہوں نے بادل
کا پتہ پانی پانی کر دیا ۔ نتیجہ یہ ہوا
کہ ایک سیلاب آگیا جس میں جا بجا
جھنڈ پیدا ہو گئے ۔ پانی کی یہ کثرت ،

شب کو برقی سوزنوں سے زہرہ ابر آب تھا
شعلہ : جوالہ ، سہراک : شعلہ گرداب تھا
واں کرم کو عذرا بارش تھا عناں گیرِ خرام
گریہ سے یاں پسینہ بالمش کتب سیلاب تھا
واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں هجومِ اشک میں تارنگہ نایاب تھا
جلوہ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبِ جو
یاں ، رواں : مرگاہ : چشم تر سے خونِ ناب تھا
یاں سرِ پر شور بے خوابی سے تھا دیوارِ جو
واں ، وہ مرقی ناز محو بالمش کم خواب تھا

میرے سونے والوں پر کوئی اثر ڈال
سکی، بلکہ میرے سونے والے پانی پر لڑتا
گہرا اثر ڈالا کہ بھنور کا ہر حلقہ شعلہ
جوالہ بن گیا۔

یاں نفس کرتا تھا روشن شمع بزم بے خودی
جلوہ گل داں بابل صحبت احباب تھا
فرش سے تاعرش، واں طوفاں تھامچ رنگ
یاں زمیں سے آسماں تک سونق کا باب تھا

گر وہاں اور شعلہ جوالہ میں
تشبیہ گواہی پر موقوف ہے۔ جس
سونے دل نے پانی کو آگ کی شکل
میں تبدیل کر دیا، حالانکہ پانی آگ
بھجاتا ہے اس کی تیزی اور تندی
کسی تشریح کی محتاج نہیں۔

ایسے انداز بیان کو عموماً مبالغہ آمیز قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ شاعر
کے گہرے تاثرات کا ایسا اظہار ہوتا ہے، جس کے بغیر وہ اپنے حقیقی محسوسات سنسنی لے
تک پہنچا نہیں سکتا۔

۲۔ لغات۔ عنان گیر : باگ تھا منے یعنی روکنے والا۔

پنبہ بالاش : ٹیکے کی روٹی۔

کعبہ سیلاب : سیلاب کا جھاگ

تشریح :- محبوب مجھ پر مہمانی کا ارادہ کیجے بیٹھا تھا، مگر لیک ایک بارش
شروع ہو گئی اور اسے روانگی سے رک جانے کا سہانہ مل گیا۔ یہاں یعنی عاشق کے ہاں
روتے روتے ایک تیز و تند سیلاب آگیا اور اس کے ٹیکے کی روٹی اس سیلاب کا
جھاگ بن گئی۔

روٹی اور جھاگ کی مناسبت واضح ہے۔

۳۔ لغات۔ خود آرائی : بناؤ سنگار کرنا۔ بنا۔ ٹھننا۔

تشریح :- محبوب کو بناؤ سنگار کرنے اور بننے ٹھننے کے سلسلے میں یہ خیال

تھا کہ بال بال میں موتی پر دئے جایش۔ غریب عاشق کی آنکھوں سے آنسوؤں کا طغیان اس انداز میں بہ رہا تھا کہ نگاہ کا تار بھی گم ہو گیا تھا۔

پیشتر اور بعد کے اشعار کی طرح اس شعر میں بھی شاعر نے محبوب اور عاشق کے ہاں کی متضاد کیفیتیں پیش کی ہیں اور کمال یہ ہے کہ ہر شعر میں دونوں کیفیتیں ہمیشگیت مجموعی ملتی جلتی ہیں، اگرچہ دونوں مختلف حالتیں پیش کر رہی ہیں۔

۴۔ **تشریح** :- محبوب نے ہنر کے کندے بزم عیش و نشاط آراستہ کر رکھے ہیں ہر طرف تختہ ڈائے گل نظر آ رہے ہیں۔ پھولوں کا عکس ہنر کے پانی میں پڑتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پانی کے اندر چراغ جگمگا رہے ہیں۔ اس کے برعکس عاشق کے ہاں یہ نقشہ تھا کہ اس کی روتی ہوئی آنکھ کی پکوں سے خالص خون بہ رہا تھا۔ چراغاں اور خونِ ناب کی مناسبت محتاج تشریح نہیں۔

۵۔ **لغات** :- فرقِ ناز : محبوب کا سر جس نے ناز و نعمت اور لاڈ پیار کے سوا کچھ نہ دیکھا۔

ذیبِ بالَش : بچے کے لیے باعثِ ذہنیت۔

کُتَاب : لغت نگار اسے کُتَاب بھی لکھتے ہیں اور کُتَاب بھی۔ ایک تہیتی رمیشی کپڑا جو زوی کے تارِ شال کر کے بنایا جاتا ہے۔

تشریح : عاشق کی کیفیت یہ تھی کہ اسے نیند نہیں آتی تھی اور اس کا وحشت بھرا سر دیوار کی تلاش میں تھا تاکہ اس سے ٹکرا کر مر جائے۔ محبوب کے ہاں اس کے برعکس دوسرا ہی نقشہ تھا، یعنی وہ اپنا سر.... جس نے ناز و نعمت اور عیش و نشاط کے سوا کبھی کچھ نہ دیکھا تھا.... کتاب کے نیچے پر رکھتے ہوئے مزے سے سو رہا تھا۔

اس شعر کا ایک نسخہ ”محورِ بالَش“ کی جگہ ”ذیبِ بالَش“ بھی ہے۔ اس میں بھی عاشق و مجنون کی متضاد کیفیتیں قائم رہیں، مگر صرف یہ ہوا کہ پہلے شعروں میں محبوب کا ذکر مقدم تھا اور عاشق کا مؤخر۔ اس میں یہ ترتیب بدل گئی۔

۶۔ **تشریح** :- عاشق کی بزمِ جہوئی میں اس کے سامنے نے شمع جلا رکھی تھی

محبوب کی بزمِ کفرش چھوڑوں سے بھرا ہوا تھا اور وہ دوستوں سے عیش و نشاط میں مشغول تھا۔

عاشق کے دل سے جو سوز اٹھتا تھا اس نے سانس کو بھی سراپا آگ بنا دیا تھا اس لیے سانس عاشق کی مجلسِ بخودی میں شمع بن گیا۔ محبوب کی بزمِ میچوں کی کثرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا فرش جلوہ گل کا نقشہ پیش کرنے لگا۔

۷۔ **تشریح** - محبوب کے ہاں فرش سے عرش تک رنگ کی لہروں کا طوفان تھا، یعنی عیش و نشاط اور رنگینی و شادمانی کی بہتات تھی۔ اس کے برعکس عاشق کے ہاں زمین سے آسمان تک ہر چیز جل جانے اور جل جانے کے قابل تھی، یعنی محرومی اور انتہائی غمگینی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس شعر میں پھر محبوب اور عاشق کی کیفیت بیان کرنے کی ترتیب بدل گئی۔

۸۔ **لغات** - خونتاہ : خالص خون، یہاں مراد ہے خون کے آنسو۔

تشریح - سیرِ اول ناخنِ غم کی کاوش سے لذت پائے ہوئے تھا۔ یہ متضاد حالت دیکھ کر یکایک جوش میں آیا اور آنکھوں سے خون کے آنسو ٹپکانے لگا۔

۱۔ **لغات** - سپند :

جرم کا کالا دانہ، جو نظر میں پہننے کے لیے آگ پڑاتے ہیں اور وہ چمکتا ہے۔

تشریح : راتِ دل سے جو

نالہ اٹھتا رہا، اس میں تاثیرِ بالکل غائب تھی۔ جب میرا محبوب غیر کی بزمِ وصل کو آراستہ کیے ہوئے تھا تو نالہ اس گرج جوشانہ میل جول

نالہ دل میں شب، اندازِ اثرِ نایاب تھا
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیرِ گو بے تاب تھا
مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاطِ آہنگ ہے

خانہ عاشقِ مگر سازِ صدائے آب تھا
تازشِ آیامِ خاکسترِ نشینی، کس کیوں
پہلوئے اندیشہ، وقفِ بسترِ سنجاب تھا

کچھ تنگی، اپنے جنوں نارسانے، دردِ نایاں
 فترہ فترہ، روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا
 آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
 کل تلک تیرا بھی دل ہرودنا کا باب تھا
 یاد کروہ دن، کہ ہر اک حلقہ تیرے دم کا
 انتظارِ صید میں اک دیدِ بے خواب تھا
 میں نے رو کا رات غالب کو دگر نہ دیکھتے
 اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

کو نظر بد سے بچانے کے لیے
 سینہ کا کام دیتا رہا۔ یعنی میرے
 حق میں اثر پیدا کرنے کے بجائے
 میرے خلاف مصروفِ عمل رہا۔
 اگرچہ ساتھ ساتھ جتیاب و بقیار
 بھی تھا۔
 شاعر نے نامے سے تین فصل
 منسوب کیے، اول اس کا بے اثر
 رہنا، دوم غیر کی بزمِ وصل کے
 لیے پسندِ خبا، سوم بے قرار ہونا۔
 شاعر کہتا ہے کہ اول تو نامے
 میں کوئی اثر ہی نہیں تھا۔ اس نے

کچھ کیا تو میرے خلاف کیا۔ اگر اس میں حقیقی تاثرِ حوق تو خیر کو محبوب سے بزمِ وصل
 آراستہ کرنے ہی کی ذہنت نہ آتی۔

۲۔ لغات۔ مقدم : آنا۔

آہنگ : آواز، نغمہ، طرز، روش، قاعدہ، قانون۔

سازِ صداٹھے آب : جلتِ رنگ۔ ایک ساز ہے جو سات پایوں میں پانی
 کی مختلف مقدار بھر کر سات سروں کے موافق بنا لیتے ہیں۔ پایوں کو کسی چیز سے
 بھاتے ہیں تو ان میں سے مختلف سُر نکلتے ہیں۔ ان کی ترتیب سے مختلف نغمے پیدا
 کیے جاتے ہیں۔

شرح۔ سیلاب کی آمد سے دل نے شادمانی کے گوناگوں نغمے گانے
 شروع کر دیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عاشق کا گھر جلتِ رنگ تھا۔ یعنی جس طرح پایوں
 میں پانی بھر کر مختلف سُر پیدا کیے جاتے ہیں، اسی طرح عاشق کا گھر سیلاب کی آمد

پر بستر نگ کی طرح بجھنے لگا۔

۳۔ لغات : نازش : فخر ناز۔

خاکستر نشینی : خاک نشینی، فخر، وردیشی، قناعت۔

سنجاب : برفستان کا ایک جانور جس کا رنگ خاک کی مائل بہ سیاہ ہوتا ہے

اس کی کھال بیش قیمت ہوتی ہے، جس سے پوستیں اور بعض دوسری چیزیں بناتے ہیں۔ کھال کو بھی سنباب ہی کہتے ہیں۔

شرح :- میں خاک نشینی اور وردیشی کے زلمے کا حال کیا سناؤں۔

قناعت نے میرے لیے فخر و ناز کے سامان فزاہم کر رکھے ہیں۔ کسی کا احسان لینا گوارہ نہ تھا اور میرا خیال سنباب کے بستر پر لیٹا ہوا سڑے اڑا رہا تھا، یعنی جسم ہی نہیں، دل و دماغ پر بھی انتہائی راحت و ثنادرمانی طاری تھی اور تشویش کوئی نہ تھی۔

۴۔ لغات - حزون نارسا : ناقام اور بے تاثیر عشق۔

نوکش : مقابل، حریف، مُتہ پھیر دینے والا۔ شرمندہ کرنے والا۔ بڑھکر۔

شرح :- ہماری ہی ناقام عشق سے کچھ بن نہ آیا اور وہ خدا کی دی ہوئی

صلاحیتوں سے فائدہ نہ اٹھا سکا اور نہ عشق کی یہ برکت ہے کہ وہ جہاں پہنچا اس نے فترے فترے کو اس وجہ و درخشاں بنا دیا کہ پوری کائنات کو روشن کرنے والا سودج بھی شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ اس کی آب و تاب ان فتروں کے آگے ماند پڑ گئی جنہیں عشق نے دوشنی بخشنی تھی۔

۵۔ شرح :- کچھ معلوم نہیں کہ آج تو ان لوگوں سے کیوں بے پروا ہو گیا

ہے جو تیرے عشق کے جال میں ہیں۔ کل تک تو یہ صورت نہ تھی اور تجھے بھی محبت و وفاداری کا سزاوار مانا جاتا تھا۔ یعنی تو محبت و وفاداری پر قائم تھا اور عاشقوں سے بے نیازی تیرا شیوہ نہ تھا۔

۶۔ شرح :- وہ دن یاد کرو، جب تیرے جال کا ایک ایک حلقہ شکار کے

انتظار میں اُس آنکھ کی طرح کھلا تھا جو غنیمت سے غلام ہو۔

پتے شرکِ طریق اس میں بھی سابقہ و موجودہ حالت کا مقابلہ کیا گیا ہے۔

۷۔ شرح : ہر رات میں نے غائب کو سمجھا سمجھا کر اشکباری سے مدد دیا، وہ اتنا روتا، اتنا روتا اور رو کر ایسا سیلاب برپا کر دیتا کہ یہ آسمان بھی اُس پہ جھاگ بن کر رہ جاتا۔



ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ میگر، ودیعتِ مژگانِ یار تھا
اب میں ہوں اور ماتم یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثالِ دار تھا
گیلوں میں میری نفس کو کھینچے پھر دو کہیں
جاں دادہ ہوئے مسرہ گزار تھا
موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
بہرِ فداہ مثل جو ہر تیغِ آبِ دار تھا
کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پر غمِ روزگار تھا

۱۔ لغات - ودیعت : امانت

شرح : خواجہ جامی اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں : آنکھوں سے اس قدر خون جاری رہتا ہے، گویا جسم میں جتنا خون تھا، وہ مژگانِ یار کی امانت تھا، اس لیے اس کے ایک ایک قطرے کا حساب دینا پڑے گا جس طرح امانت کا حساب دینا پڑتا ہے۔

بظاہر شعر کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عاشق روتا ضبط نہ کر سکا اور اتنے آنسو بہائے کہ جگر کا سدا خون ختم ہو گیا۔ اب وہ اس غم و رنج میں مبتلا ہے کہ جگر کا خون تو محبوب کی پگھلوں کی امانت تھا اور امانت میں خیانت ہونی ہی نہ چاہیے تھی۔ اب ایک ایک قطرے کا مجھ سے حساب لیا جا رہا ہے اور مجبور ہوں کہ حساب دوں۔ گویا عاشق ضبط میں ناکام رہا اور مصیبت یہ پیش آئی کہ اس کے ضبطی میں عجب

کی پکیوں کی امانت بھی انکھوں کے راستے نکل گئی۔

۲۔ لغات - ایک شہر آرزو : آرزوں کا ایک شہر، مراد ہے آرزوں کی کثرت۔

تمثال دار : جس میں تصویر ہو۔

شرح : عاشق کا دل ایک ایسا آئینہ تھا، جس میں محبوب کی تصویر محفوظ تھی۔ محبوب نے وہ آئینہ توڑ دیا اور اس کے بے شمار ٹکڑے ہو گئے۔ ثابث آئینے میں صرف ایک عکس نظر آتا ہے، آئینہ ٹوٹا تو اس کے ہر ٹکڑے میں وہی عکس نظر آنے لگا۔ گویا سیکڑوں تصویریں عاشق کے سامنے آ گئیں اور ہر تصویر ایک آرزو کے خون کا باعث ہوئی۔ گویا محبوب نے عاشق کا آئینہ بول توڑ کر اسے سیکڑوں ہزاروں آرزوؤں کے ماتم میں بتلا کر دیا۔

۳۔ لغات - جاندارہ : جان دے دینے والا۔ جان قربان کر دینے والا۔
ہوا : آرزو۔ خواہش۔ محبت۔

شرح :- میں محبوب کی آمد و رفت کے راستے کی محبت و آرزو پر جان قربان کیے ہوئے تھا۔ اسی حالت میں اور اسی سبب سے میری موت واقع ہوئی۔ اب مناسب یہ ہے کہ میری نعش کو گلیوں میں کھینچنے پھرتا کہ مرنے کے بعد بھی ان راستوں پر پھرنے کی سعادت حاصل ہو جائے، جن پر محبوب کی آمد و رفت تھی۔ اسی طرح محبوب اتفاقیہ مجھے دیکھ لے اور اس پر آشکارا ہو جائے کہ میں نے کس سبب سے اور کس شوق میں جان دی۔

۴۔ لغات - سراب : گرامیں صحرا کی ریت پر سورج کی تیز کرنیں پڑتی ہیں تو دیکھنے والے کو دُور سے پانی لہریں لیتا نظر آتا ہے۔ اصل میں یہ نگاہ کا دھوکا ہوتا ہے۔ بعض اوقات چاند کی روشنی میں بھی صحرا کے اندر یہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ پانی کے اس بے بنیاد جلوے کو سراب کہتے ہیں۔

شرح :- دُعا کے صحرا میں سراب کی جہ لہریں نظر آتی ہیں، ان کی کیفیت

کچھ نہ پڑھو۔ بس یہ سمجھ لو کہ جس بیت پر سورج کی روشنی پڑنے سے سراب پیدا ہو رہا تھا۔ اس کا ذرہ ذرہ تیز دھار والی تلوار کے چوہر کی مانند تھا۔
مراد یہ ہے کہ عشق میں دنیا کے تقاضے پورے کرنا بہت مشکل ہے۔ جس نے اس صحرا میں قدم رکھا، اس کے لیے پھن گن ہی نہیں، کیونکہ سراب پیدا ہونے والی ریت کا ایک ایک ذرہ اس کے لیے تیز دھار والی تلوار سے کم نہیں ہوتا۔
۵۔ اس شعر کے دو مطلب ہو سکتے ہیں :

۱۔ جب تک ہم نا تجربہ کار تھے، یہی سمجھتے تھے کہ عشق کا غم معمولی چیز ہے۔ ایسا نہیں کہ برداشت نہ ہو سکے۔ اب تجربے کے بعد معلوم ہوا کہ اسے کم بھی مان لیا جائے تو یہ دنیا بھر کے غموں کے برابر ہے۔

۲۔ ہم بھی ایک زمانے میں غم عشق کو زیادہ بڑی چیز نہیں سمجھتے تھے۔ اب تجربہ کیا تو معلوم ہوا کہ غم عشق کم ہو جائے تو دنیا کے دوسرے غم اس کی جگہ لے لیتے ہیں اس آخری شرح کی تائید مرزا غالب کے ایک اور شعر سے ہوتی ہے :

غم اگرچہ جاگلے ہے پچھیں کہاں کہ دل ہے

غم عشق اگر نہ ہوتا ، غم روزگار ہوتا

مرزا نے اس میں ایک بہت بڑی حقیقت بیان کی ہے۔ عشق ایک لگن اور ایک دھن ہے۔ جب تک انسان اس دھن میں لگن رہے، اسے کسی دوسری چیز کا خیال نہیں آتا، گویا وہ تمام تشویشوں سے بالکل محض رہتا ہے۔ اگر اسے کسی خاص کام کی دھن اور لگن نہ ہو تو دنیا کی چھوٹی چھوٹی حقیر باتیں اس کے لیے پریشانی کا باعث بنتی رہیں گی۔



۱۔ شرح : خواجہ حالی
مرحوم اس شعر کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں : بادی النظر
بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدی کو بھی تیسر نہیں انسان ہونا

گریہ پا ہے ہے خرابی میرے کٹانے کی
 درد دیوار سے ٹپکے ہے بیا بیاں ہونا
 دائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو
 آپ ہانا اُٹھرا اور آپ ہی حیراں ہونا
 جلوہ از میں کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
 جو ہر آنند بھی چاہنے ہے مرگلاں ہونا
 عشرت قتل گہ اہل تنہا مت پوچھ
 عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا
 لے گئے خاک ہیں ہم داغِ تمنائے نشاط
 تو ہوا اور آپ ہمدنگ گلستاں ہونا
 عشرت پارہ دل، زخمِ تمنا کھانا
 لذتِ ریش جگر، غرقِ نمک داں ہونا
 کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
 ہائے اس زودِ پشیمان کا پشیمان ہونا
 حیف اس چارگرہ کپڑے کی قیمت غالب
 جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

میں یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی
 ہے، مگر خود سے دیکھا ہائے زبانی
 اچھوتا خیال ہے، دعویٰ یہ ہے کہ
 دنیا میں آسان سے آسان کام بھی
 دشوار ہے اور دلیل یہ ہے کہ آدمی
 جو میں انسان ہے، اس کا بھی انسان
 بنتا مشکل ہے۔ یہ منطقی استدلال
 نہیں، بلکہ شاعرانہ استدلال ہے،
 جس سے بہتر ایک شاعر استدلال
 نہیں کر سکتا: (یادگار غالبؒ)
 معلوم نہیں خواجہ مرجم نے
 اس کے شاعرانہ استدلال ہونے
 پر کیوں زور دیا، کیونکہ استدلال
 ہر لحاظ سے معقول و محکم ہے یعنی
 ہر آدمی فوج کے اعتبار سے یقیناً
 انسان ہے اور حضرت آدمؑ کی
 اولاد میں سے ہے، لیکن انسانیت
 کی حقیقی صفات ہر آدمی میں نظر
 نہیں آتیں۔ ہر آدمی کمال انسانیت
 کے درجے پر نہیں پہنچتا اور اخلاق و
 فضائل کے اعتبار سے اشرف المخلوقات
 نہیں بنتا، لہذا یہ کہنا کہ ہر آدمی
 انسان ہونا جیسر نہیں، تباہی سی

ہے کہ اس کے لیے کوئی دلیل لانے کی ضرورت نہیں۔ دعویٰ یہ نہیں کہ دنیا میں آسان سے آسان کام بھی دشوار ہے، دعویٰ یہ ہے کہ ہر آدمی انسان نہیں بنتا، لہذا نتیجہ یہ نکلا کہ جن کاموں کو بظاہر ہبت آسان سمجھا جاتا ہے، وہ بھی سخت مشکل اور دشوار ہیں۔

اس سلسلے میں ایک شعر کا ذکر کیا گیا ہے، جسے عالمگیر اعظم نے اپنے رقصات میں ایک یا دو جگہ نقل کیا۔ بظاہر یہ خود عالمگیر کا شعر ہے۔

آنچہ پُرستیم کم دیدارم و درکار است و نیست
نیت جز آدم دریں عالم کہ بسیدار است و نیست

یہ نصف ایک حقیقت کا اظہار ہے۔ دنیا میں انسان بہت ڈھونڈے، مگر کم ملے۔ یہ جنس ہے تو بہت زیادہ، لیکن حقیقتاً ناپید ہی ہے۔ مرزا غالب نے یہ حقیقت نہایت بدیہ انداز میں پیش کی اور اس کی بنا پر ایک مستقل اصول وضع کیا۔ دونوں شعروں میں کوئی مناسبت نہیں۔ مرزا کا شعر واقعی شعر ہے، لیکن رقصات عالمگیری کا شعر وزن، قافیے اور ردیف کے باوجود شعر نہیں۔

۲۔ شرح :- گرے یعنی رونے دھونے کی یہ کیفیت ہے کہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ میرا گھر برباد کرنے کے دھپے ہے اور درود دیوار سے صاف نمایاں ہوتا ہے کہ یہ سیل گریہ میں ہے کہ ناپید ہو جائیں گے اور دیرانہ گھر کی جگہ بے لے گا۔

انگریز اور ٹپکے ہے، خرابی اور بیابان کی مناسبت واضح ہے۔

صل :- اپنے مجنون عشق پر اظہارِ تاسف کے بجائے اور کیا کر سکتا ہوں۔ پھر ہر وقت اور ہر سانس لینے میں مجھے مجبور کر کے محبوب کی طرف لے جاتا ہے۔ میں جاگتا ہوں اور سراپا حیرت بن جاتا ہوں۔

اسے مجاز کے نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جنور، عشق۔

کے باعث عاشق کے دل میں ایک ہی جذبہ رہ جاتا ہے، یعنی یہ کہ ہر لحظہ محبوب
فارغ کرے اور اس سے نہ مل سکنے کے باعث حیرانی کا تختہ مشق بن رہے،
حقیقت کے نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ہر لحظہ اس ذات کا
رنج کرتا ہوں، جو وجود اور زندگی کا سرچشمہ ہے لیکن غایبوں اور نارسائیوں کے
باعث اس تک پہنچ نہیں سکتا اور حیران ہوتا ہوں۔ غالباً یہی حیرانی ہے، جسے
صوفیہ کی اصطلاح میں مقام حیرت قرار دیا جاتا ہے۔

۴۔ لغات - آئینہ : یہاں اس سے مراد آئینہ قلبی نہیں، بلکہ آئینہ فولاد ہے۔
جو ہر : فولادی آئینے کو صیقل کیا جاتا ہے تو اس میں خط سے پڑھ جاتے
ہیں۔ جنہیں جوہر آئینہ کہتے ہیں۔ ایک ایک خط بال سے مشابہ ہوتا ہے، لہذا انہیں
مژگاں سے تشبیہ دی۔

مشرح :- محبوب کا جلوہ حسن حکما کہ رہا ہے کہ مجھے دیکھو، کیونکہ میں اور
صرف میں ہی دیدار کے لائق ہوں۔ یہ سن کر فولادی آئینے کے جوہروں پر بھی ایسی
کیفیت طاری ہو گئی کہ وہ آئینے کی آنکھ پر مژگاں بن جانا چاہتے ہیں تاکہ حسن کی
دید سے لذت پاسکیں اور اس کا تقاضا تھے دید پورا کر سکیں۔

واضح رہے کہ یہ حسن کی طرف سے سوال نہیں، تقاضا ہے اور مطلب یہ ہے
کہ واقعی اس کے سوا کوئی شے قابل دید نہیں، اسی لیے بے جان آئینے میں بھی
وہ خصوصیتیں پیدا ہو گئی ہیں، جو آلہ دید بننے کے لیے ضروری ہیں۔

۵۔ لغات - اہل تمنا : اہل عشق جنہیں محبوب پر قربان ہو جانے کی
انتہائی آرزو ہوتی ہے۔

عبید نظامہ : قوت دید، یعنی نگاہ کی عبید یا انتہائی شادمانی اور خوشی۔

شرح ۱۔ قتل گاہ میں پہنچ کر اہل عشق کو ہر خوشی اور شادمانی جو رہی ہے، اس
کی کیفیت کچھ نہ پوچھیے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ جب نمودار میان سے نکلتی ہے اور قہقہے
کے لیے اسے بند کیا جاتا ہے تو نگاہ کے لیے وہی منظر پیدا ہو جاتا ہے جو عاقل لوگوں

میں عید کے دن ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عشاق کے لیے محبوب کے ہاتھوں قتل ہونے سے بڑھ کر خوشی کا کوئی موقع نہیں۔

اس شعر کو قتل، شمشیر وغیرہ کے الفاظ کے پیش نظر بعض غزل کا عام شعر نہ سمجھا جائے اس کی ایک اصولی حیثیت بھی ہے۔ یعنی اہل حق کے لیے اپنے مقاصد عزائم کے سلسلے میں قتل گاہ کے اندر پہنچنا اور قتل کے لیے شمشیر کا بلند ہونا ایسا ہی ہے، جیسے عید کا دن آجائے، کیونکہ وہ اپنے مقاصد کے لیے کوشش میں یہ سزا پاتے ہیں اور یہ سزا ان کے لیے سرخروئی کا پرواز ہوتی ہے۔ نیز ایسی سزائیں اصل مقصد کی اہمیت واضح کرتی ہیں اور دوسرے لوگوں میں یہی دلولہ پیدا ہوتا ہے۔

۶۔ شرح :- اسے محبوب ! ہم تو مراد حاصل کیے بغیر قبر میں باسوئے اور وصل سے جو شادمانی حاصل ہو سکتی تھی، اس کی آرزو کا داغ سینے میں لے گئے۔ اب تو جس طرح چاہے، باغ باغ ہو اور شاد و خرم رہ۔

۷۔ لغات - ریش : زخم۔

شرح :- دل کے ٹکڑے کی خوشی یہ ہے کہ اس پر آرزو کے زخم گتے ہیں اور جگر کے زخم پر زیادہ سے زیادہ نمک چھڑک دیا جائے تو اسے لذت حاصل ہوتی ہے۔

زخم ہر شخص کے لیے دکھ اور درد کا موجب ہوتا ہے۔ اس پر نمک چھڑکا جائے تو تکلیف بہت بڑھ جاتی ہے، لیکن اہل عشق کو انھیں چیزوں میں مزہ آتا ہے اور وہ ایسی ہی باتوں میں خوش رہتے ہیں کہ نہ محض زخم لگائے جائیں، بلکہ ان پر زیادہ سے زیادہ نمک بھی چھڑکا جائے، یہاں تک کہ ایک ایک زخم کے لیے پورے لکڑی دان وقف کر دیا جائے۔

۸۔ لغات - زود پشمال : جلد بچتا نہ والا۔

شرح :- محبوب نے مجھے قتل کرنے کے بعد جو روح جفا سے توبہ کرنی اور

ارادہ کر لیا کہ آئندہ کسی کو قتل نہ کرے گا۔ ہٹے! اس جلد بچپانے والے کو کس موقع پر بچپانے کی سوجھی۔

شعر کے مطلب دو ہیں، اول محبوب کے جلد بچپانے پر اس لیے افسوس ہے کہ قتل کے بعد اس بچپانے سے مقتول کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا، دوم یہ کہ مجھے تو قتل کرو یا اور میں نے ثابت قدمی سے وفا کا ثبوت بہم پہنچا دیا۔ اب رقیوں کی باری آئی تو محبوب نے جو رجحان سے توبہ کر لی۔ اس طرح ان کی آزمائش بھی نہ ہو سکی اور وہ محبوب کے لطف و کرم سے بے تکلف فائدہ بھی اٹھاتے رہے۔ بعض احباب نے اس شعر کے سلسلے میں خواہ مخواہ مبالغہ کا یہ شعر پیش کیا ہے!

آفریں بردلی زم تو کہ از بہر ثواب

کششہ غمزہ خود را بہ نماز آید

تیری زم دل پر آفرین ہے کہ جسے تیرے غمزے نے قتل کیا، اس کی نماز جہان ادا کرنے کے لیے چلا آیا ہے تاکہ ثواب حاصل کرے۔

ظاہر ہے کہ دو دوں شعروں کا مضمون ایک نہیں، پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حافظ نے اپنے مضمون کی بنیاد محبوب کے دل زم اور شوقِ ثواب پر رکھی ہے اور غالب کے شعر میں زود و پشیاں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، تیر نیکش کی طرح ”زود و پشیاں“ کا بھی کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔

۹۔ شرح : اے غالب! اس چار گزہ کپڑے کی قیمت پر بتنا بھی افسوس کیا ہلے کم ہے جب تک تقدیر میں عاشق کا گریباں بننا ہو، کیونکہ وہ ہمیشہ چاک ہوتا ہے گا۔ اود اس کی دھمیاں اڑاتی رہیں گی۔

”آپ حیات“ میں ہے کہ مرزا غالب کو ایک آفت ناگہانی کے سبب سے اسی طرح جیل میں رہنا پڑا۔ جس طرح حضرت یوسف کو مصر کے قید خانے میں رہنا پڑا۔ پڑتے میلے ہو گئے، جونیں پڑ گئیں۔ ایک دن ٹیچے جویش چن رہے تھے کہ ایک

نہیں مزاج پڑی کے لیے گئے۔ پوچھا : کیا حال ہے ؟ مرزا نے یہ شعر پڑھا :

ہم غمزدہ جس دن سے گرفتار ہوئے !

کیڑوں میں جو نہیں بخیوں کے ٹانگوں سے

جس دن جیل سے نکلنے لگے اور لباس تبدیل کرنے کا موقع آیا تو وہاں کا کرتا

وہیں پھاڑ کر پھینک دیا اور یہ شعر پڑھا : ہائے اس الخ

یہ واقعہ صحیح نہیں، کیونکہ قید میں مرزا غالب صرف نظر بند تھے اور مشقت

روپے دے کر معاف کر دی گئی تھی۔ انھیں کھانا گھر سے پہنچتا تھا اور نواب مصطفیٰ

خاں شفیقہ قیسرے روز ملاقات کے لیے جایا کرتے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد

برحوم نے یہ قصہ نقل کرتے وقت اتنا بھی خیال نہ رکھا کہ اگر مرزا غالب کو عام

قیدیوں کا سا لباس ملتا تو انھیں یہ لباس پھاڑ پھینکنے کی اجازت کیونکر ہوئی ؟ ہمارے

زمانے تک یہی دستور رہا کہ قیدی میعاد قید گزارنے کے بعد جیل کا لباس اتار دیتے

تھے، پھاڑ کر نہیں پھینک سکتے تھے، البتہ ایسی قید میں کسی قیدی کے لباس کا پھٹ

جانا ممکن تھا۔ بہر حال جوڑوں والا شعر غالب کا نہیں بھی تو اس کا موقع اور محل ان

کی قید نہیں، بالکل یہی کیفیت دوسرے شعر کی ہے۔



۱۔ لغات۔ رستخیز اندازہ :

جو اندازے میں قیامت کے برابر ہو۔

قیامت جیسا۔ قیامت جتن۔

محیط : ہر چیز کو گھیرے میں

یعنے والا۔ ہر چیز پر حاوی۔

شرح : رات ساتی کے شرق میں

خمار یعنی شے کے اتار کی کیفیت ایسی

شب خمار شوق ساتی رستخیز اندازہ تھا

تا محیط بادہ صورت خانہ خمیازہ تھا

یک قدم وحشت سے درس دفتر امکان کھلا

عبادہ اجڑائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

ہو گئی تھی، گو یا قیامت آگئی۔ شراب
 خمال جہاں اور جس جس نظر میں تھی،
 انگڑائی کا تصویر خانہ بن گئی تھی یعنی ساقی
 مہرزد خانہ میکشوں کا مجمع نشے کے
 آثار کی بے مزگی اور بے لطفی کا ہامش
 سر اسٹیل پریشانی کی ایسی حالت میں تھا
 جیسی قیامت کو روغا ہوگی۔ تمام میکش
 ہی لمبی انگڑائیاں لے رہے تھے۔ ایسا
 معلوم ہو رہا تھا کہ ہر شراب خانہ اور ان
 کا سرگزشت شراب... ساغر، مینا، سیو، شمع، موحن وغیرہ سراپا انگڑائیوں کا تحفہ مشق بنا ہوا ہے
 میاٹوں کو انگڑائیاں اس وقت آتی ہیں جب نشہ اُتر رہا ہو اور شراب کی
 طلب، خلیں پریشانی کرے۔ شراب صرف ساقی پاسکتا ہے جس کا انتظار ہو رہا
 ہے۔ اسی لیے ہر شراب خانہ اور اس کی ہر شے خمیازے کی صورت اختیار کر گئی۔
 شاعر نے شعر میں صرف یہ بتایا ہے کہ پیئے وائے خمار میں مبتلا ہیں، ساقی موجود نہیں
 اس کا انتظار ہو رہا ہے۔

۲۔ شرح :- ہم نے وحشت کی پگھلندی پر ایک ہی قدم اٹھایا تھا، یعنی
 ہم پو وحشت کی بالکل ابتدائی حالت طاری ہوئی تھی۔ ساتھ ہی اس کائنات کی
 کتاب کا درس ہم پڑا بھی ہو گیا۔ یعنی ہم نے سمجھ دیا کہ اس کتاب میں کیا کچھ لکھا ہے اور
 جو کچھ سمجھا اس کی حقیقت یہ ہے کہ وحشت یعنی شوق و فیض کی انتہائی حالت دونوں
 جہانوں کے اجزاء کا شیرازہ ہے۔

مطلب یہ کہ اگر دونوں جہانوں کے اجزاء کو کتاب کے اوراق فرض کیا جائے
 تو ان اوراق کا ہندسہ اور انھیں اکٹھا رکھنے والا رشتہ وہ پگھلندی وہ رشتہ ہے۔
 پو وحشت یعنی شوق و فیض کی انتہائی حالت دونوں جہانوں کے اجزاء کا شیرازہ ہے۔

حقیقت ہے اور اسی کے ذریعے سے سب اجزا یکجا ہوتے ہیں۔

۳۔ لغات - وحشت خرامی : بیابانوں میں پکڑ لگانا۔

صحرا گرد : بیابان میں پھرنے والا۔

شرح : معلوم نہیں، بیلی کو بیابان کا جکڑ لگانے سے کون سی چیز روک رہی تھی؟ غریب مجنوں کا گھر تو پورا بیابان تھا۔ وہ جنون کی حالت میں ہر جگہ دوڑا پھرتا تھا۔ اس کے گھر کا تو کوئی حدود ازہ نہ تھا، جو بیلی کے لیے روک بن سکتا۔

۴۔ لغات - استغنا : بے نیازی۔ بے پروائی۔ سیر حش۔

مرہون : گرد۔

شرح : برحسب بے نیازی اور بے پروائی کا دم بھرتا ہے، لیکن دیکھیں یہ بے پروائی کس طرح رسوا ہوئی؟ حُسن کے ہاتھ مندی سے رنگے ہوئے ہیں چہرے پر خازہ لگا ہوا ہے۔

مطلب یہ کہ جب ہاتھ مندی کے احسان مند ہیں اور اس کے بغیر سرخ نہا سکتے۔ اسی طرح رخسار لگلوگنے یا کریم اور پوڈر کے بغیر آب و تاب پیدا نہیں کر سکتے تو حُسن کی بے نیازی کے لیے کون سی گنجائش باقی رہ گئی؟

مرزا اکٹایہ چاہتے ہیں کہ حقیقی حُسن کو بناؤ سنگار کی کوئی حاجت نہیں۔ اسے نہ ہاتھوں میں مندی لگانی پڑتی ہے نہ چہرے پر اُٹھانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بناؤ سنگار وہیں کیا جاتا ہے، جہاں قدرتی حُسن کی کمی محسوس ہو، حالانکہ مندی اور خازے سے کام لے کر نہا اور ستور تا حُسن کی بے نیازی کے لیے رسوائی کا باعث ہے۔ یورپ میں رسوائی عام ہے اور دوسرے مقامات پر بھی رسوائی میں کوئی کمی نہیں رہی۔

۵۔ لغات - لختِ دل : دل کے ٹکڑے

بباد وادن : اڑانا۔ ہوا کے حوالے کر دینا۔ پریشان و برباد کر ڈالنا۔

شرح : دل سے جو نالے اٹھتے رہے، انہوں نے دل کے ٹکڑے نکال دیے۔

بھینٹے رہیں ٹکڑے میرے شہر تھے۔ میرا دیوان ان ہاتھوں ہی کی یادگار ہے۔ مگر اس کا شیرازہ کوئی نہیں اور ورق ورق ٹگ ٹگ ہے۔



دوست غنزاری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تک ناخن نہ بڑھائیں گے کیا
بے نیازی مدد سے گزری، بندہ پرور کب تک
ہم کہیں گے حالِ دل، اور آپ فرمائیں گے کیا
حضرت ناصح گرائیں، دیدہ و دل فرس راہ
کوئی مجھ کو تو یہ سمجھائے کہ سمجھائیں گے کیا
آج والے تیغ و کفن باندھے ہوئے جانا ہوں ہیں
عند میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا: یوں ہی
یہ جنوںِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا
خانہ زادِ زلف میں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبرائیں گے کیا
ہے اب اس معورہ میں قوطِ غمِ اُلفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھانچے گے کیا

۱۔ شرح: ہر دوست اور
مجدد و بہر اعظم کھانے کے سطلے
ہیں کیا کر سکتے ہیں؟ ان کے بس
میں زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ
میرے ناخن کٹوا دیں تاکہ میں اپنے
زخم نہ چھیل سکوں، لیکن یہ تو سوچے
کہ جب تک میرے زخم بھرنے
لگیں گے، اس وقت تک ناخن
نہ بڑھ جائیں گے اور میں زخموں
کے سڈل ہونے سے پہلے پہلے
انہیں دوبارہ نہ چھیل ڈالوں گا؟
مطلب یہ ہے کہ جنوںِ عشق
میں علاج کی کوئی بھی تدبیر کی جلتے
اسے قطعی نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس
میں ایک پہلو اچھا ہی لگا ہے تو وہ
حارصی ہے، جو قصورِ دی دیر میں ختم
ہو جائے گا، پھر پہلی حالت عود
کر آئے گی۔

۲۔ شرح: (محبوب سے
خطاب ہے،

آپ بھی بے نیاز، درجے پر، ذاتی حد سے گزر گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔ میں بڑے شوق سے دل کا حال مٹانے کے لیے حاضر ہوتا ہوں۔ کچھ کہتا ہوں تو آپ تغافل سے کام لیتے ہوئے فرمادیتے ہیں کیا کہا؟

شکر کا جو پہلو بطور خاص قابلِ توجہ ہے، یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی کو درجہ و نشان مٹانے لگے اور منہ والاکڑ دے کہ کیا کہا تو دروہ مند کے بیان میں، تاثر اور گہرائی ہی باقی نہیں رہتی، جو اس داستان کے لیے ضروری ہے۔ غالب تھے آپ فرمائیں گے کیا، میں اسی نکتے پر زور دیا ہے۔

۴۔ لغات - ویدہ و دل فرزش راہ : آنکھیں اور دل ان کے راستے میں بچھا دوں یعنی وہ سر آنکھوں پر تشریف لائیں۔

شرح : اگر حضرت ناصح دعوہ و نصیحت کے لیے تشریف لانا چاہتے ہیں تو شوق سے تشریف لائیں۔ ان کا آنا سر آنکھوں پر، میری طرف سے خیر مقدم میں کوتاہی نہ ہوگی، بلکہ آنکھیں اور دل ان کے راستے میں بچھا دوں گا، مگر کوئی صاحبِ یہ تو سمجھا دیں کہ وہ مجھے کیا سمجھائیں گے؟ یعنی مجھ پر ان کی نصیحت کا اثر کیا ہو سکتا ہے؟ ناصح کے دمی خیر مقدم میں سرگزشتاں نہیں۔ یقیناً نصیحت بہتری اور بہبودی کے لیے کی جاتی ہے، مگر اصل سوال اثر اور نتیجہ کا ہے۔ جب معلوم ہے کہ سمجھانے کا اثر کچھ نہ ہوگا تو ناصح کی عزت اور مرتبے کا احترام کرتے ہوئے یہ حقیقت واضح کر دی گئی کہ ان کی تکلیف دہائی، قطعاً بے نتیجہ ہوگی۔

۵۔ شرح : - آج میں تلوار اور کفن لے کر محبوب کے پاس جا رہا ہوں۔ اس کے بعد ان کے لیے میرے قتل میں کون سا عذر باقی رہ جائے گا؟

بظاہر وہی مذر ہو سکتے تھے : اول یہ کہ تلوار نہیں، دوم یہ کہ قتل کے بعد کفن کا کیا انتظام ہوگا۔ یہی دونوں مذر سامنے رکھ کر تیغ و کفن کا انتظام ضروری سمجھا۔

۵۔ شرح : - ناصح نے ہمارے جنونِ عشق کو ختم کرنے کے لیے بھی قید میں ڈال دیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا قید جنونِ عشق کے انداز ہم سے چھڑا سکتی ہے؟

مطلب یہ ہے کہ جنوں عشق ہماری فطرت میں سراسیمت کر چکا ہے جس طرح فطرت کو تبدیل کرنا ممکن نہیں، اسی طرح جنوں عشق بھی ہم سے چھڑایا نہیں جاسکتا بیشک نصیحت کرنے اور راہ خیر خواہی تدبیر کے لیے انتہائی قدم اٹھایا یعنی ہمیں قید میں ڈال دیا، لیکن جنوں عشق صحرانوردی پر موقوف نہیں، ہم سے اسیری میں بھی برابر اس کے مظاہرے سرزد ہوتے رہیں گے۔

بظاہر ناصح کا لفظ یہاں عمل نظر معلوم ہوتا ہے، اس کی جگہ کو فی ایسا آدمی ہونا چاہیئے، جو حکومت کی طرف سے غیر مناسب افعال کے انسداد پر مامور ہو، مثلاً محاسب، لیکن مرزا نے یہاں "ناصح" والے لفظ استعمال کیا، ان کا مقصود وہ مزد ہے، جو اندراہ خیر خواہی پر تدبیریں اختیار کر رہا ہے، لہذا یہاں ناصح ہی جنوں ہے۔ خود قید کرتا اس کا کام نہ ہو، مگر وہ قید کر سکتا ہے۔

اس شعر کا ایک معنوم اور بھی ہے۔ یعنی جو لوگ حق و صداقت سے سچا عشق رکھتے ہیں، ان کے راستے میں جتنی ہی تکلیفیں اور مشقتیں آجائیں، وہ روگرداں نہیں ہوتے۔ ہر معیبت صبر و سکون سے جھیل لیتے ہیں اور اپنے مقصد کے لیے ہر ممکن سعی پر دستور قائم رکھتے ہیں۔ گو یا مرزا کا مطلب یہ ہے: ہمیں کسی بھی سلوک سے سابقہ پڑے، کتنی ہی تکلیفیں پیش آئیں، ہم حق و صداقت سے منہ نہیں موڑ سکتے۔

۶۔ لغات۔ خانہ زاد: جو کسی کے گھر میں پیدا ہوا ہو اور وہیں پلا ہو۔ بظاہر اس کا مطلب ہے وہ شخص، جو کسی گھر سے خصوصی نسبت رکھتا ہو لیکن جاگیر داری کے دور میں اس کا اطلاق غلاموں یا ان کی اولاد پر ہوتا رہا۔

تشریح :- ہم ذلعت کے خانہ زاد ہیں، یعنی ہمیں ذلعت سے ایسی خصوصی نسبت ہے، جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتی، اس لیے ہم زنجیر سے کیونکر دور بھاگ سکتے ہیں؟ اس مصرع میں زنجیر اور ذلعت کی مناسبت ظاہر ہے، نیز ذلعت کے بیچ کو خانہ قرار دے کر وابستگی کی بنا پر اپنا خانہ زاد ہونا ثابت کیا۔ خانہ زاد کے لفظ سے مرزا کا مقصود یہ ہے کہ جس طرح خانہ زاد اس گھر کو اپنا گھر سمجھتا ہے،

۱۔ میں وہ پیدا ہوا اور پرورش پائی اور اس گھر سے قطع تعلق کا تصور بھی نہیں کر سکتا،
 اور مکان کو اپنا مانسمجھ سکتا ہے، یہی کیفیت ذلت کے تعلق میں ہماری ہے۔
 پھر ہم وفا کے پابند اور اپنے عہد پر قائم و استوار ہیں۔ کون سی وجہ ہے کہ ہم قید خانے
 سے گھبرا اٹھیں گے؟

شاعر کہتا یہ چاہتا ہے کہ ذلت محبوب سے گہری اور ناقابل شکست وابستگی
 ہمارا شیوہ ہے۔ اس بنا پر ہمیں زنجیریں پہنا دی جائیں تو کچھ پروا نہیں۔ اسی طرح
 ہم وفا کے راستے پر قدم بجائے کھڑے ہیں اور قید سے ہمیں کوئی باک نہیں۔
 اگر ذلت کو کسی اعلیٰ مقصد کی لطیف تعبیر قرار دے لیا ہے تو پورا شرف و جلال
 بن جاتا ہے۔ یعنی اعلیٰ مقاصد سے سچا عشق رکھنے والوں کا شیوہ یہ نہیں کہ قید و بند
 سے ڈر جائیں یا گھبرا اٹھیں۔

۲۔ لغات - معمرہ : بستی۔ شہر آباد مقام یا زمین۔

شرح :- اے استاد! میں تو غم عشق کا قحط پڑ گیا ہے، یعنی جس طرح
 قحط کے زمانے میں کھانے پینے کی جنسیں محدود رہ کر کیاب ہو جاتی ہیں، اسی طرح
 یہاں عشق کی جنس کیاب ہو چکی ہے۔ ہمیں غم عشق کا ایسا مزہ پڑ گیا ہے کہ اس
 کے سوا ہمارا گزارا ہو ہی نہیں سکتا۔ اب اس بستی میں ٹھہرے رہیں تو سوال یہ ہے
 کہ ہم کھائیں گے کیا اور زندہ کیونکر رہ سکیں گے؟

غم العنت یعنی غم عشق سے مراد کسی خاص محبوب کا عشق نہیں۔ یعنی یہ غم خاص
 نہیں بلکہ عام ہے، خواہ وہ اعلیٰ مقاصد کا عشق ہو، محبوب کا عشق ہو، بھجنوں کی
 باہم غمخواری، اخلاص اور ہمدردی ہو، مخرج ہر چیز اس غم العنت میں شامل ہے۔ ظاہر
 ہے کہ جس بستی میں یہ جنس ناپید ہو، جو انسانیت کا ذریعہ اور آدمیت کا جوہر ہے،
 وہاں رہ کر ہمارا گزارہ کس طرح ہو گا؟

یہ نہ تھی ہماری قیمت کہ وصال ملید ہوتا
 اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
 ترے وعدے پر جتنے ہم، تو یہ جان بھرت
 کہ خوشی سے مر نہ جانے اگر اعتبار ہوتا
 تری ناز کی سے جاننا، کہ بندھا تھا عہد بوا
 کبھی ٹوٹ نہ توڑ سکتا۔ اگر استوار ہوتا
 کوئی میرے دل سے پوچھے تیرا نیم کش کو
 یہ غلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
 یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
 کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا
 رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ قہمت
 جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
 غم اگر چہ جاں گسل ہے یہ کہاں بچیں کڈل ہے
 غم حشر گرنہ ہوتا، غم روزگار ہوتا
 کون کس سے نہیں کہ کیا ہے شب غم بڑا بلا ہے
 مجھے کیا بڑا تھا مرنا اگر ایک چار ہوتا

۱۔ شرح : ہماری قیمت
 میں محبوب کا وصال تھا ہی نہیں،
 اچھا بڑا کہ ہم مر گئے۔ اگر کچھ عرصہ
 اور جیتے رہتے تو وہ بھی اسی انتظار
 میں گزر جاتا۔

شعر سادگی اور حسن بیان کے
 اعتبار سے نہایت اچھا ہے۔ اس
 میں سے ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے
 کہ اگر وصال یا مقتدرہ ہو تو زندگی
 سے موت ہی بہتر ہے، مشورہ شل
 ہے۔ انتظارِ اشد من الموت
 یعنی انتظارِ موت سے بھی زیادہ
 سخت اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔
 انتظار اور وصلِ محبوب کا انتظار
 عاشقِ برواشت نہیں کر سکتا کیونکہ:

تیغِ رومی و خنجرِ ہندی
 نہ کند آنچہ انتظار کند

پھر جب مقتدرہ میں بھی نہیں تو
 لا حاصلِ انتظار کی نہ جیتیں اٹھانے
 سے کیا نائدہ ؟

۲۔ شرح : اگر بہتری
 طرف سے وصل کا وعدہ سن کر بھی
 عہدہ رہے تو یقیناً جان لے کہ ہم

جوئے سڑک کے ہم جوڑ سوا ہوئے کیوں نہ غرق ہیا
 نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
 اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگا نہ ہے وہ یکتا
 جو دُور کی بُو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا
 یہ مسائل تصوف! یہ تراسیاں غالب!
 تجھے ہم دلی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا
 جس طرح لوگ رنجِ عالم کی فراوانی برداشت نہ کر سکے اور مر گئے اسی طرح ایسی
 مثالیں بھی ملتی ہیں کہ لوگوں کو اپانک انتہائی خوشی کی خبر پہنچی اور وہ خوشی میں آپے
 سے باہر ہو کر یا تو مر گئے یا داغ میں خنجر آ گیا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ محبوب کے وعدہ
 وصل پر اعتبار ہوتا تو سمجھ لینا چاہیے کہ ہمیں اس پیمانے پر خوشی حاصل ہوتی جو ہماری
 ضبط و تحمل سے باہر ہوتی اور اس کا نتیجہ موت ہی ہو سکتا۔ چونکہ اصل وعدے کو چھوٹ
 سمجھا اس لیے خوشی نہ ہوتی اور زندہ رہے۔

کہا گیا ہے کہ میلِ ہر دی نے اسی مضمون کا ایک شعر کہا ہے :

بیم از دنیا دار و بدہ وعدہ کر من

از ذوقِ وعدہ تو بہ فرودا نمی رسم

یعنی تو میرے ساتھ وصل کا وعدہ کرے اور اسے پورا کرنے کا خوف دل سے
 نکال ڈال، کیونکہ تیرے وعدے سے جو خوشی ہوگی، وہ مجھے زندہ نہ رہنے دے گی۔
 بلاشبہ ہر دی نے وعدہ وصل کو انتہائی خوشی کا موجب قرار دیا ہے، جس
 سے عاشق مر سکتا ہے، لیکن شعر کی عام صورت غیر طبعی ہے۔ یعنی محبوب سے یہ
 کہنا کہ تو وعدہ کرے، میں اس خوشی میں مر جاؤں گا اور تجھے وعدہ پورا کرنے کی مزاحمت

درپڑے گی۔ فطری حالات سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتا۔ اُس وعدے سے شادی مرگ کیونکر ہو سکتی ہے جس کے متعلق یقین ہو کہ اس کے پورا کرنے کی فوج نہ آئے گی اور عاشق اس سے محفوظ ہوگا۔ غالب نے اس معنوں کو طبعی صورت دے دی کہ محبوب نے وعدہ کیا اور عاشق نے یقیناً سمجھ لیا کہ یہ وعدہ پورا نہ ہوگا، لہذا وہ خوشی ہی نہ ہوتی، جس کی فراوانی عاشق کو مار سکتی تھی۔ پھر کہاں یہ ہے کہ حقیقت بھی بطور اصول پیش نہیں کی، بلکہ متعجب ہو کر محبوب سے سوال کرتے ہیں کہ وعدے کا یقین ہوتا تو خود سوچ کر ہم زندہ رہ سکتے تھے؟ خوشی میں ختم نہ کر دیتی؟

۳۔ شرح : محبوب سے خطاب ہے کہ تو سراپا نزاکت ہے، تیرا جسم نازک، تیرا مزاج نازک، اس حالت میں جو پیمانہ باندھا جاتا، وہ بہر حال نازک اور کمزور ہی ہو سکتا تھا۔ اگر وہ پیمانہ مضبوط اور محکم ہوتا تو تجھ ایسا پکیر نزاکت اسے ہرگز توڑ نہ سکتا۔

۴۔ لغات - تیر نکیش : وہ تیرا جو کمان کو پورا نہیں، بلکہ آدھا کھینچ کر چھوڑا جائے۔ نشانہ جتنی دُور ہوتا، اسی لحاظ سے کمان کھینچ کر تیر پھینکتے۔ اگر نشانہ بہت قریب ہوتا تو کمان کھینچنے پر پورا زور صرف نہ کیا جاتا۔
خلش : کشک۔ چھین۔

شرح : اے محبوب! تو نے کمان آدھی کھینچ کر تیر پھینکا۔ وہ جگہ میں چوت ہو گیا۔ چونکہ اس پر زور کم صرف ہوا تھا۔ اس لیے جگہ کو چھید کر باہر نہ نکل سکا، بیچ ہی میں الٹا رہ گیا۔ اس کی خلش نے دل کو ایسا مزہ دیا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ اگر پورے زور سے تیر پھینکا جاتا اور وہ جگہ کو چھیدتا ہوا باہر نکل جاتا تو زخم ضرور ہو جاتا، مگر مسلسل کشک نہ ہوتی۔ عاشق کے لیے مزہ اس کشک ہی میں ہے۔ کوئی میرے دل سے بوجھے، کا جلد لذتِ خلش کی ایسی کیفیت واضح کر رہا ہے جس کا کوئی اندازہ پیش نہیں کیا جاسکتا۔

۵۔ شرح : دوستی کا یہ کون سا طریقہ ہے کہ تمام دوست نصیحت گریں گئے

ہیں۔ مجھے وہ منظر سناتے رہتے ہیں کہ تمہیں یہ نہ کرنا چاہیے، وہ نہ کرنا چاہیے۔ نصیحت گری سے دوستی کا حق کیونکر ادا ہو سکتا ہے؟ حقیقی دوستی کا تقاضا یہ تھا کہ کوئی مجھے آرام پہنچانے کی تدبیریں اختیار کرتا۔ میرے دل کے زخموں پر مرہم رکھتا۔ محبوب سے ملنے کا کوئی طریقہ سوچتا اور میرا غم مٹا کرتا۔ تعجب یہ کہ دوستی کے یہ واضح طور طریقے چھوڑ کر اجنبی سے میرے ساتھ دوستوں کی ہمدردی ظاہر ہوتی، انہوں نے نصیحتیں شروع کر دی ہیں، جو مجھے ناگوار گزرتی ہیں اور ان سے فائدہ بھی کچھ نہیں۔

۶۔ **تشریح** :- غم ایسی جانگداز اور ہلاکت خیز چیز ہے کہ اگر یہ سچنگاری بن کر پتھر کی رنگوں میں داخل ہو جاتا تو اس سے یوں سو بننے لگتا کہ پھر روکے نہ لگتا۔ ظاہر ہے کہ جو چیز بے حس پتھر کی رنگوں سے بھی لہو شپکا سکتی ہے، اس سے انسانی قلب پر کیا کچھ گزرتی ہوگی، جو سراپا احساس ہے۔

۷۔ **لغات** - جانگسل : جان کو ہلاک کر دینے والا، گھٹا دینے والا۔
تشریح :- غم یقیناً جان کو گھٹا دینے والا، تباہ کر دینے والا اور ہلاکت کے گھاٹ اتار دینے والا ہے، لیکن کیا کریں کہ معاملہ دل سے آ پڑا ہے، اس لیے ہم غم سے بچ نہیں سکتے۔ فرض کر لیجیے کہ ہم نے عشق کا غم نہ لگایا۔ مگر دل کی فطرت و طبیعت ہی یہ ہے کہ کسی نہ کسی غم سے وابستگی کا رشتہ قائم رکھے۔ غم عشق نہ ہو گا تو وہ زمانے کے دوسرے غموں میں الجھ جائے گا۔ بہر حال دل غموں سے خالی نہیں رہ سکتا۔

شعر کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں صنفاً غم عشق کو برتر و بالا قرار دے کر اس کی طرف یہ کہہ کر دیا گیا ہے کہ اگر یہ غم تبدیل نہ کرو گے، تو دنیا کے دوسرے غموں میں مبتلا ہو جاؤ گے، مثلاً جان و مال کا غم، اہل و عیال کا غم، فراغتِ بال کا غم وغیرہ۔

۸۔ **تشریح** - میں شبِ غم کی کیفیت کون تو کس سے کہوں؟ کوئی اہل ہی نظر نہیں آتا۔ اگر نظر بھی آئے اور اس سے کہوں تو کیا کہوں؟ اسے ٹھیک ٹھیک

بیان کرنے کا انداز کہاں سے لاؤں ؟ میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ نہایت بُری بلا ہے۔ میں یہ سمجھ لیجیے کہ ایک ایک لمحہ جاگنی میں گزر رہا تھا۔ ہر سانس میں موت کی کیفیت مجھ پر گزرتی تھی۔ مرنے سے میں نہیں ڈرتا تھا، بشرطیکہ ایک ہی بار موت آتی اور میں ختم ہو جاتا، لیکن میرا ایک لمحہ موت کے مُقَدِّم میں گزرتا رہا۔ نہ مخلصی کی کوئی صورت تھی، نہ موت کی تکلیفوں میں کوئی کمی نظر آتی تھی۔ ایک بار مر جانا بُرا نہ تھا، مگر شبِ غم نے تو مجھے ایسی حالت میں مبتلا کر رکھا تھا، گویا ہر آن موت کی تمام تکلیفیں مجھ پر طاری ہو رہی تھیں، لیکن جان نہیں نکلتی تھی۔ جان نکل جاتی تو یہ لمحہ یہ لمحہ مرنے کی تکلیفیں سہنے سے رہا ہی پاجاتا۔

دیکھیے، شاعر کا کمال کہ شبِ غم کے متعلق حقیقت کچھ نہیں کہا، مگر جو کچھ کہا ہا سکتا تھا، وہ کہ گیا۔ لفظوں میں ایسی تصویر کینچ دی کہ کوئی بھی پہلو چھپا نہ رہا، پھر یہ کہ ایک بار موت آجاتی تو مجھے اس کے لیے تیار ہونے میں کیا مضائقہ تھا۔ اس میں شبِ غم کی پوری کیفیت سامنے آگئی۔

۹۔ شرح :- مرنے کے بعد ہماری جو رسوائی ہوئی، اس سے کہیں بہتر تھا کہ دریا یا سمندر میں ڈوب جاتے تاکہ نہ جنازہ اٹھانے کی نوبت آتی اور نہ کہیں دفن ہوتے۔

ظاہر ہے کہ رسوائی کا نقشہ شاعر نے دوسرے مصرعے میں پیش کیا ہے، یعنی جنازہ اٹھا تو کوئی متاثر نہ تھا اور بیکسی کے ہوا کسی کی رفاقت حاصل نہ تھی۔ تربت بنی تو اس پر کوئی جھلکانے والا یا اس کی دیکھ بھال کرنے والا نہ تھا۔ اس رسوائی سے محفوظ رہنے کا صرف ایک پہلو شاعر کو نظر آیا اور وہ یہ کہ ڈوب کر مر جانا۔

مرزا نے مرنے کے بعد بیکسی کی ایک تصویر اور بھی کھینچی، جو اس سے کم حسرت ناک نہیں اور اس تصویر کی طرح وہ بھی خیالی و تباہی نہیں، بلکہ حینِ حقیقت رہتی ہے، یعنی :

مارا دیا بغیر میں مجھ کو وطن سے دور رکھ لی مرے خزانے مری بیکسی کی شرم

جس طرح دریا یا سمندر میں ڈوب مرنے سے بے کسی کا ہر پہلو چھپا رہ سکتا تھا اسی طرح وطن سے باہر کسی اجنبی ملک میں مرجانے سے بھی یہ مقصد پورا ہو سکتا تھا کیونکہ مسافر کے وطن یا اس کی حیثیت یا اس کے عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں کی حیثیت سے کوئی آگاہ نہیں ہوتا۔

۱۰۔ لغات - یگانہ : واحد۔ اکیلا۔ ایک

یکتا : بے مثل، بے نظیر۔

دوئی : وحدت کی ضد، دو ہونا (ایک کے، بھائے) کسی کا خدا کے ساتھ

شریک ہونا۔

دو چار ہونا : دکھائی دینا، نظر آنا۔

شرح :- خدا کو کون دیکھ سکتا ہے، کیونکہ وہ تو اپنی ذات میں اکیلا اور

بے مثل ہے۔ اُس جیسا دوسرا وجود کوئی نہیں۔ اگر اس میں دوئی کا خلیفہ سا شائبہ بھی ہوتا تو ضرور کہیں نہ کہیں نظر آ جاتا، لیکن اُس کی ذات تو غیرت اور دوئی سے بہت بالا ہے۔ پھر اسے نیا ہری آنکھوں سے کون دیکھ سکتا ہے ؟

۱۱۔ شرح :- اسے غالب ! تو تصوف اور روحانیت کے مسئلے پیش کرتا

ہے۔ پھر تیرا انداز بیان اتنا دلکش و دلآویز ہے کہ جو کچھ تو کہتا ہے، وہ دل میں اتر جاتا ہے۔ یہ تو دلیوں کی سی باتیں ہیں۔ اگر تو شراب نوش نہ ہوتا تو ہم تجھے بھی ولی سمجھ لیتے۔

مرزا نے پہلے مصرعے میں اپنی جو خصوصیتیں بیان کی ہیں، انہیں خود سستائی

یا سخن طرازی نہ سمجھنا چاہیے۔ یہ وصف ان کے کلام میں جبرجہاً اعلیٰ موجود تھے جنہیں تصوف کے مسائل ہی نہیں، بلکہ حکمت و فلسفہ اور عام معاملات بحبت بھی وہ ایسے نادر انداز میں پیش کرتے تھے، جس کی کوئی مثال مشکل سے ملے گی اور یہ جو ہر ان میں فی الواقع موجود تھا۔

خواجہ حالی فرماتے ہیں : ”بیان کیا جاتا ہے، ابو ظفر بہادر شاہ ثانی نے

مرزا کی اس غزل کا مقطع سنا تو کہا : بھئی ہم تو جب بھی ایسا نہ سمجھتے ، یعنی ہم شہرب نوش نہ ہوتے اور ایسے ہی مسائل اسی انداز میں بیان کرتے ، جب بھی تمہیں دل نہ آتے ۔ مرزا نے سنا کہا : حضور تو اب بھی مجھے دلی ہی سمجھتے ہیں گریس ایسے ارشاد ہو کر میں اپنی ولایت پر معذور نہ ہو جاؤں ۔



ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا ؟	نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا ؟
تجرباں پیشگی سے مدعا کیا ؟	کہاں تک ، اے سراپا ناز کیا کیا
نوازش ہانے بے جا دیکھتا ہوں	شکایت ہائے رنگیں کا ، گلا کیا ؟
نگاہ بے محابا چاہتا ہوں	تغافل ہائے تمکین آزما کیا
فردغ شعلہ خن یک نفس ہے	ہوس کو پاس ناموسِ وفا کیا
نفس موجِ محیط بے خودی ہے	تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا
دماغِ عطر پیرا من نہیں ہے	غمِ آوارگی ہائے صبا ، کیا
دل ہر قطرہ ہے ، سازا تا بحر	ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
محبا کیا ہے ، میں نہا من ادھر دیکھ	شہیدانِ نگہ کا خون بہا کیا ؟
سُن اے غایتِ گریہ نفسِ وفا سُن !	شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا ؟
کیا کس نے جگر واری کا دھوئے	شکيب خاطر عاشق بھدا کیا

یہ قاتل، وعدہ صبر آزما کیوں یہ کافر، فتنہ طاقت ربا کیا ؟
 بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات عبادت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

۱۔ لغات - نشاط کار : کام کرنے کی اُتک، سعی و جہد کا جذبہ -

شرح :- خواجہ حاتم اس شعر کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”جہاں تک معلوم ہوا ہے، یہ ایک نیا خیال ہے اور نرا خیال ہی نہیں
 بلکہ فیکٹ ہے، کیونکہ دنیا میں جو کچھ چل چل رہا ہے، وہ صرف اس یقین کی
 بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے۔ یہ انسان کی طبعی
 خصلت معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر فرصت فلیل ہو، اسی قدر زیادہ سرگرمی
 سے کام کو سرا انجام کرتا ہے اور جس قدر زیادہ مہلت ملتی ہے، اسی قدر
 کام میں تاخیر اور سہل انگاری زیادہ کرتا ہے ؟“

مطلب یہ ہوا کہ کام کرنے کا جوش اور دلولہ صرف اس وجہ سے ہے کہ موت سر
 پر کھڑی ہے، معلوم نہیں کب آہٹے، اس لیے انسان کی ہوس چاہتی ہے، تمام کام
 جلد سے جلد پورے کرے، گویا دنیا میں جو چل چل رہا ہے، وہ انسان کی ہوس کا نتیجہ ہے
 اور ہوس کی تمام سرگرمیاں اس پر موقوف ہیں کہ زندگی کے دن تھوڑے ہیں۔ اس سے
 ثابت ہوا کہ زندگی کی پوری رونق اور لطف و لذت صرف موت کا نتیجہ ہیں۔ مرنا نہ ہوتا
 تو جینے میں کچھ مزہ نہ رہتا، کیونکہ ساری چل چل پھل ختم ہو جاتی، جوش و سرگرمی کا ہنگامہ
 ٹھنڈا پڑ جاتا۔

انسان کے جوش و دلولہ کو ہوس سے تعبیر کرنے کا مقصد غالباً یہ ہے کہ یہاں جو
 کچھ ہو رہا ہے، وہ انسان کی خام آرزوؤں اور امیدوں کا کرشمہ ہے۔

۲۔ لغات - تنجائیل پیشگی : جان بوجھ کر انجان بننے کی عادت۔

شرح :- اے محبوب! تم واقعی سراپا ناز ہو۔ تمہاری ہر بات ایک ادا
 اور کرشمہ ہے، لیکن یہ تو بتاؤ کہ جان بوجھ کر انجان بننے کی عادت سے تمہارا

مقصد یہ ہے ؟ میں جب کبھی اپنا دلکہ درد بیان کرتا ہوں اور دل کا حال سناتا ہوں تو کہہ دیتے ہو : کیا کہا تھ اور کوئی بھی بات تو تجھ سے نہیں سنئے ۔ اس سے آخر تمہارا دم کیا ہے ، تغافل کی کوئی وجہ اور سبب تو بتاؤ ؟

۳۔ شرح :- اے محبوب ! میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میرے رفیقوں اور حریفوں پر ایسی نوازشیں اور ایسی مہربانیاں کر رہے ہو ، جن کے وہ ہرگز مستحق نہیں ۔ ایسی عنایتیں تو صرف مجھ پر ہونی چاہیے تھیں ، جو سچا عاشق ہے ۔ میں وہ بے توقع اور بے محل مہربانیاں دیکھ کر محبت بھرے انداز میں شکایت کرتا ہوں تو تم گلہ شکوہ شروع کر دیتے ہو ، جب تمہیں بیجا نوازشوں کا کچھ خیال نہیں تو میری محبت پر شکایت دگلا کیوں کرتے ہو ؟

شاعر نے محبت بھری شکایتوں کو شکایت ہائے رنگیں قرار دیا ، کیونکہ عاشق کا ہارن ۔ سہ ہر شکایت محبت ہی کا کرشمہ ہوتی ہے ۔ یہ مقصد نہیں ہوتا کہ محبوب سے تعلق ٹوڑ دیا جائے ۔ ایسی بات سچے عاشق کے خیال میں کبھی نہیں آسکتی ۔

۴۔ لذات ۔ بے محابا : بے تکلف ، بے محاب ، بے خوف ۔
تغافل ہائے تمکین آزما : جان بوجھ کر ایسی بے پروائی اختیار کرنا ، جس کا دمایہ ہو کہ عاشق کے صبر و خشک کا امتحان لیا جائے ۔

شرح :- اے محبوب ! تمہارا شیوہ یہ ہو گیا ہے کہ مجھ سے تغافل برتو ۔ مجھ پر توجہ نہ کرو اور بے پروائی سے کام لیتے رہو ۔ اس طرح تم چاہتے ہو کہ میرے صبر و استقلال کو آزما دیا جائے ۔ امتحان لیا جائے کہ میں کتنے پانی میں ہوں ۔ یہ کیوں سمجھتے ہو کہ اس طرح میرے استقلال کا پیمانہ چھلک جائے گا اور میں اپنی قوت برداشت کھو بیٹوں گا ۔ اگر تم مجھے تڑپانا اور لوٹانا ہی چاہتے ہو تو تغافل چھوڑ دو اور ایک بھر لو پے بالک نگاہ مجھ پر ڈالو ۔

۵۔ لغات : فروغ : حرارت ، گرمی ، روشنی
شعلہ نعل : وہ شعلہ جو تنکا جلنے سے اٹھتا ہے ، معلوم ہے کہ تنکا ایک

لمے میں جل بجھتا ہے اور شعلہ بھی بلرے جلد ختم ہو جاتا ہے۔
موس : یہاں مراد رقیب سے ہے۔

شرح : جو شعلہ تنگے کے جلنے سے اٹھتا ہے، اس کی حرارت اور روشنی کی مدت ایک سانس سے زیادہ نہیں۔ یہی حالت ان رقیبوں کے دھوئے عشق کی ہے جنہیں محبت سے کوئی علاوہ نہیں، البتہ موس سے ان کے بیٹے بھرے ہوئے ہیں۔ اے محبوب ! ایسے لوگوں سے آپ کیونکر اتید رکھ سکتے ہیں کہ وہ وفاداری کی عزت کا پاس کریں گے۔ عشق میں وفاداری اور ثابت قدمی تو سچے عاشقوں کا کام ہے۔ رقیبوں سے ایسی توقع کیونکر کر سکتی ہے ؟

۴۔ **شرح :** اگر ساقی نے ہم سے بے پروائی اور بے نیازی اختیار کر رکھی ہے اور شراب نہیں دیتا تو ہم شکایت کیوں کریں، جب ہمارا سانس مستی و بے ہوشی کے سمندر کی لہر بنا جاتا ہے ؟ یعنی ہم جو عشق ہی کی مستی میں گم ہیں، ہمیں ساقی کی بے پروائی کا کیا گلہ ہو سکتا ہے ؟

۵۔ **لغات :** دماغ نہ ہونا : برداشت نہ ہونا۔ گوارا نہ ہونا۔

شرح : ہمیں پیراہن کی خوشبو سونگھنا گوارا ہی نہیں، اس لیے اگر مباحث خوشبو کو ادھر ادھر اٹائے پھرتی ہے، تو ہمیں اس کا کیا غم ہو سکتا ہے اور ہمارے لیے شکایت کی کون سی وجہ ہے ؟

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں کس کے پیراہن کی بو کا ذکر ہے ؟ اگر پیراہن محبوب مراد دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم محبوب کے طلب گار ہیں، پیراہن محبوب کی خوشبو کے نہیں۔ یہ خوشبو ہمارے لیے ہرگز وجہ تسکین نہیں ہو سکتی۔ صابنیک اسے ہر طرف اڑائے لیے پھرے، ہمیں اس سے کیا، یہاں عرفی کا ایک ایسا ہی شعر یاد آگیا، کہتا ہے :

قاخ ہوے دوست نہ گردید فوقی ما
 این جنس را بہ مفلس کنعان فرو ختمیم

یعنی ہم دوست کی خوشبو پر قنا عنت نہیں کر سکتے۔ یہ جنس ہم نے حضرت یعقوب کے حوالے کر دی جو پیراہن دوست کی خوشبو پر خوش ہوئے تھے۔ غالب کے اس شعر کا مدعا بھی یہی ہو سکتا ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ محبوب کا پیراہن جس عطر میں بسایا گیا ہے، وہ رقیب کا عطر ہے۔ گویا محبوب رقیب کے گھر گیا اور وہاں اس کے پیراہن کو عطر لگا دیا گیا، ظاہر ہے کہ عاشق کو یہ عطر اور یہ خوشبو کبھی پسند نہیں آ سکتی۔ صبا کا خاصہ ہی یہ ہے کہ خوشبو اپنے دامن میں سیٹ کر جا بجا بکھیرتی رہتی ہے۔ شاعر نے اس کے دُور و سیر کو آوارگی سے تعبیر کیا، جو بظاہر اک گونہ حقارت آمیز تعبیر ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ محبوب کے لباس کو جو عطر لگایا گیا، وہ عاشق کے لیے انتہائی ناپسندیدگی کا باعث تھا۔

۸۔ لغات - انا البحر : میں سمندر ہوں۔

شرح :- ہر قطرے کا دل انا البحر کا سا بنا ہوا ہے، یعنی ہر قطرے کے اندر سے صدا اٹھ رہی ہے کہ میں سمندر ہوں مجھے حقیر چیز نہ سمجھنا چاہئے۔ اسی طرح ہماری انفرادی ہستی کو بھی سمیٹ دے جانے، ہماری عظمت کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ جزو ہونے کے باوجود ہم جس کُل سے تعلق رکھتے ہیں، اس کی عظمت پوری کائنات پر چھانی ہوئی ہے۔ گویا قطرے کو جو نسبت سمندر سے ہے، وہی نسبت ہر وجود کو اس کے مبداء سے ہے۔

۹۔ لغات - محابا : خوف۔

خوشہا : خون کی قیمت۔ زمانہ قدیم میں دستور تھا کہ قاتل مقتول کے وارثوں کو خون کی رقم ادا کر دیتا تھا۔ اسے ندیہ بھی کہتے ہیں۔

شرح :- اے محبوب! تجھے خوف کس بات کا ہے؟ آنکھ اٹھا کر میری جھٹکا کہہ۔ میں ذمہ دار ہوں کہ تجھ سے کوئی باز پرس نہ ہوگی۔ بھلا یہ تو سوچ صحت و صحت کے شہیدوں کا بھی کوئی خوشہا ہوتا ہے؟

کسی کو قاتل ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس نے مقتول پر ضرب کا کوئی آلہ استعمال کیا ہو، تلوار یا خنجر یا کوئی اور چیز لگا ہوا ایسی چیز نہیں، جو آلہ ضرب سمجھی جاسکے، لہذا شاعر نے بے تکلف کہا کہ اے محبوب! اگر تیرے ایک نظر دیکھ لینے سے میں یا کوئی دوسرا شہید ہو جائے تو تجھے پر خون کی قیمت ادا کرنے کی کوئی ذمہ داری نہ ہوگی۔

ادھر دیکھ میں ایک پہلو صرف تنبیہ کا ہے، دوسرا پہلو یہ ہے کہ میری طرف دیکھ، گویا عاشق محبوب سے نگاہ التفات کا طلب گار ہے اگر اس وجہ سے شہید بھی ہو جائے تو وہ خود ذمہ دار ہو کر محبوب کو یقین دلاتا ہے کہ اطمینان رکھ، اس کے لیے کوئی فدیہ طلب کیا ہی نہیں جاسکتا۔

۱۰۔ لغات - شکستِ قیمت : فارس میں اس کا مطلب یہ ہے، بہانہ ہو جانا، قیمت گھٹ جانا۔

شرح :- اے وفا کی جنس کو لوٹ لے جانے والے محبوب! سن اور توجہ سے سن کہ میرے دل کی قیمت تو اسی جنس کی جدومت تھی، یہ جنس عمارت ہوئی تو دل کی کوئی قیمت ہی نہ رہی۔ اب تجھے کس بات کا خوف ہے؟ یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر چیز کے ٹوٹنے سے کوئی نہ کوئی آواز نکلتی ہے، لیکن قیمتِ دل کی شکست کی کوئی آواز نہیں۔

بعض نسخوں میں "قیمتِ دل" کی جگہ "شیشہٴ دل" درج ہے اور اس کا مطلب یہ سمجھا گیا ہے کہ محبوب کو شیشہٴ دل توڑنا یعنی دل شکنی کرنا پسند ہے، اس لیے اسے دعوت دی گئی ہے کہ شیشہٴ دل توڑنا مارہ۔ لیکن صحیح "شیشہٴ دل" نہیں بلکہ "قیمتِ دل" ہی ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ عاشق کے دل کی سب سے بڑی متاع محبوب کے ہاتھوں اور عشق میں ثابت قدمی کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔

۱۱۔ لغات - جگر داری : حوصلہ، استقلال، بہت۔

شکيب : صبر ۔

شرح : اے محبوب ! تو میرے حوصلے اور استقلال کی آزمائش کر رہا ہے ۔ ذرا یہ تو سوچ ، میں نے ہمت اور ثابت قدمی کا دعویٰ کب کیا ؟ اگر میں ایسا دعویٰ کرتا تو واقعی امتحان لینا بالکل بجا ہوتا ۔ بھلا عاشق کے دل کو صبر و سکون سے کیا واسطہ ؟

اس مقام میں شیخ سعدی کا شعر نہایت دلاویز ہے ،
دے کہ عاشق دما بر بود ، مگر سنگ است
ز عشق تا بہ صبری ہزار فرسنگ است

یعنی جس دل میں عشق ہو اور وہ صبر سے کام لینے کا بھی دعوئے کرے تو سمجھ لینا پائیے کہ وہ دل نہیں ، پتھر کا ٹکڑا ہے ۔ عشق اور صبر کے درمیان ہزاروں میل کی مسافت ہے ، یعنی وہ ایک دوسرے سے اتنے دور ہیں کہ اکٹھے ہو ہی نہیں سکتے ۔
۱۲۔ شرح : اے قاتل ! یعنی محبوب ! تو ایسا وعدہ کیوں کرتا ہے ، جو صبر کو آزمائش میں ڈال دیتا ہے ۔ یعنی قدم قدم پر صبر کا امتحان ہوتا ہے ۔ اے کافرا ! یعنی محبوب ! وہ فتنہ کیوں برپا کرتا ہے ، جو ہماری قوت و طاقت ہی چھین کے جانے والا ہے ۔

۱۳۔ شرح : اے غائب ! محبوب کی ہر بات میرے لیے بلائے ہوا ہے ، یعنی سخت اضطراب و پریشانی کا باعث ہے ، گویا جان لیوا ہے ۔ خواہ اس کی باتیں (تحریری یا ذہنی) ہوں یا اشارے کنایے ہوں یا ادائیں ہوں ۔



۱۔ لغات ۔ درخورد : درخورد و غصب جب کوئی ہم ساز نہ ہو
لائق ۔ قابل ۔ شایاں ۔
شرح ۔ جب محبوب کے پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

عجب اور ستم کے لائق ہم ہیں
اور کوئی نہیں تو ہمارا یہ کتنا کیونکر
غلط قرار دیا جاسکتا ہے کہ ہمارا
بسر کوئی پیدا ہی نہیں ہوا؟

شکر کی یہ تشریح عشق مجازی
کے مطابق ہے، حقیقت کے

نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو اس
میں انسان کو، مشرف الخلق ثابت
کیا گیا ہے۔ شاعر کتنا ہے کہ پوری
کائنات میں صرف ہم بسنے انسان
ہیں، جن سے اعمال کی پوچھ گچھ
ہوگی اور گنہگار عذاب کے سزاوار
ہوں گے۔ پھر مبارکے اس سے
کو کون غلط ثابت کر سکتا ہے کہ ہم
خدا کی مخلوق میں سب سے افضل
ہیں اور ہم جیسا دوسرا کوئی نہیں؟

۲۔ لغات - بندگی:

عبودیت۔ فرمانبرداری۔ عبادت
خود ہیں: صرف اپنے آپ
پر نظر رکھنے والا۔ اس کے معنی
مغرور و خود پسند بھی ہیں، لیکن
یہاں مراد ہے۔ خود دار، اپنی عزت
کا پاس کرنے والا جہنیا و قادر قائم

بندگی میں بھی وہ آزاد و خود ہیں ہیں، کہ ہم
اُسے پھر آئے در کعبہ اگر روانہ ہوا
سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
نہ ہو کوئی بہت آئندہ سیمانہ ہوا
کم نہیں، نازش ہم نامی چشم خواباں
تیرا بیبا، بُرا کیا ہے، اگر اچھا نہ ہوا
میں نے کا داغ ہے وہ نالہ، کہ لب تک گیا
خاک کا ذوق ہے وہ قطرہ جو دریا نہ ہوا
نام کا میرے ہے وہ دُکھ، کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا
ہر بُن ہو سدم ذکر نہ چپکے خوں ناب
حمزہ کا نقشہ ہوا، عشق کا چرچا نہ ہوا
قطرے میں، دجلہ دکھائی نہ دے اور جزیر گل
کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدہ بینا نہ ہوا
قتی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پُر زے
دیکھتے ہم بھی گئے تھے، اپ تماشا نہ ہوا

دیکھنے والا۔

شرح : عبادت اور مرزا بنوداری میں بھی ہماری آزادہ روی اور خودداری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ حالت یہ ہے کہ ہم کعبے کی زیارت کے لیے جاتیں اور دروازہ بند پائیں تو وہیں سے لوٹ آئیں گے۔ یہ گوارا نہ ہوگا کہ کسی سے دروازہ کھول دینے کی استدعا کریں۔

جو شخص دین اور عبادت میں بھی اتنا آزاد و خوددار ہے کہ کعبے کا دروازہ کھلنے کا انتظار گوارا نہیں کرتا اور نہ کسی سے درخواست گزار ہوتا ہے کہ دروازہ کھول دیا جائے، ظاہر ہے کہ دنیوی کاموں میں بھی وہ کتبہ باوقار اور عزت نفس کا پاسدار ہوگا۔ شعر کی دو خوبیاں خاص توجہ کی محتاج ہیں۔ اول یہ کہ ثناء کعبہ کا دروازہ عموماً بند رہتا ہے اس کے کھلنے کے خاص حالات مقرر ہیں۔ دوم یہ کہ اس آزادی اور خودداری کے باوجود مرزا بنوداری کی شان قائم رکھی کہ کعبے سے لوٹ آئے، مگر کسی دوسرے گھریا عبادت خانے کا رنج نہ کیا۔

ایسے ہی نامور استاد مرزا غالب کی عظمت کے روشن نشان ہیں، خودداری کے سلسلے میں فارسی کا ایک شعر بھی قابل ذکر ہے، مرزا کہتے ہیں :

تشنب بر سائل دریا ز غیرت ہاں دہم
گر بہ موج افتد گمان چہ پیشانی مرا

یعنی اگر دریا کی لہریں دیکھ کر میرے دل میں یہ شبہ بھی گزر جائے کہ دریا نے مجھے دیکھ کر پیشانی پر پل ڈال لیے ہیں تو میری غیرت کا یہ عالم ہے کہ پیاسا ساحل پر جان دے دوں گا، مگر حلق تر نہ کروں گا۔

۲۔ لغات۔ آئینہ سیمایہ : آئینے جیسی روشن پیشانی والا۔

شرح : حسن میں تیرے بے مثال دیکھتا ہونے کا دھوئے سب تسلیم کیے بیٹھے ہیں۔ اور اس سے کسی کو اختلاف کی جرأت نہیں۔ یہی سبب ہے کہ آئینے جیسی پیشانی والا کوئی محبوب تیرے مقابل آنے کی جرأت نہیں کر سکا۔

شعر کی خوبی یہ ہے کہ آئینے جیسی روشن پیشانی والا کوئی محبوب سامنے آجاتو اس میں محبوب حقیقی کے حسن کا عکس نمایاں ہو جاتا اور اس طرح اس کی کیناٹی اور بے مثالی قائم نہ رہتی۔ ایسے محبوبوں کا مقابل آنے کی جرأت نہ کر سکتا شاہد حقیقی کی کیناٹی کی روشن دلیل ہے۔

۴۔ لغات - نازش : فخر - شرف۔

ہمنامی چشم خواباں : محبوبوں کی آنکھ کا ہمنام ہونا، یعنی بیمار ہونا۔ چشم محبوب کی ایک صفت بیمار بھی ہے۔ چشم بیمار یعنی نشیلی اور بیمار آلود آنکھ۔
اچھا نہ ہوا : تندرست نہ ہوا۔

شرح :- تیرا بیمار تندرست نہ ہو سکا اور صحت نہ پاسکا تو اس میں کیا برائی ہے ؟ کیا یہ شرف اور یہ فخر کم ہے کہ اسے محبوبوں کی آنکھ کی ہمنامی کا مرتبہ مل گیا ؟ یعنی ان کی آنکھ کو چشم بیمار کہتے ہیں تو میں بھی بیمار ہوں۔
۵۔ شرح :- جو نالہ دل سے اٹھ کر لب تک نہ پہنچا، وہ سینے کا داغ ہے یعنی سینے کے لیے باعث تنگ ہے۔ جو قطرہ دریا نہ بنا، وہ خاک میں مل کر جذب ہو جانے کا۔

مطلب یہ ہے کہ جو شے اپنے مقصد تک نہ پہنچ سکے، وہ حقیقت کھو بیٹھتی ہے اور مٹ کر رہ جاتی ہے۔ نالے کا مقصد یہ ہے کہ وہ لب تک پہنچے، یعنی بلند ہو۔ قطرے کی غرض دفایت یہ ہے کہ وہ دریا میں شامل ہو کر دریا بن جائے۔ اگر نالہ گھٹ کر سینے کے اندر رہ جائے تو وہ اپنی حقیقت کھو کر سینے کا داغ بن جائے گا۔ اسی طرح جو قطرہ دریا میں شامل نہ ہو کر اپنی حقیقت سے محروم ہو جائیگا، اسے مٹی اپنے اندر جذب کر لے گی۔

۶۔ شرح :- جو دکھ درد اور رنج و غم کسی کو نہ ملا، وہ میرے لیے مقدم ہے اور جو نقد آج تک کہیں برپا نہ ہوا، وہ میرے کاروبار کے لیے وقف کر دیا گیا۔ یعنی دنیا بھر کے لوگ مجھے ملے اور دنیا بھر کے لوگ مجھے تھکے تھکے میرے پیچھے

لکھ دیے گئے۔

۷۔ لغات - ہر بن مو : ہر بال کی جڑ۔

حمزہ کا قصبہ : ایک قصبہ ہے جسے داستان امیر حمزہ کہتے ہیں، لیکن امیر حمزہ سے اسے کوئی تعلق نہیں، اس میں حمزہ، عمرو عیار اور لقادغیرہ مشہور کردار ہیں۔ لوگ عموماً دلچسپی اور تفریح کے لیے یہ داستان سنا کرتے ہیں۔ مجلس میں ایک شخص پڑھتا رہتا ہے اور باقی سب مہربان گوش بنے رہتے ہیں۔

مشرح : کہیں یہ ممکن ہے کہ عشق کی کیفیت بیان کرنے پر ہر بال کی جڑ سے خالص خون نہ ٹپکنے لگے ؟ اگر ایسا ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ عشق کی داستان نہیں بلکہ حمزہ کا قصبہ ہے، جسے لوگ تفریحاً سنتے اور ایک ایک واقعہ پر مسرور ہوتے ہیں۔

۸۔ لغات - دجلہ : عراق کا مشہور دریا، جو بغداد کے درمیان سے گزرتا ہے اور شہر اس کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔

ویدہ دینا : دیکھنے والی آنکھ، حقیقت پہچان لینے والی آنکھ۔

مشرح : حقیقت پہچان لینے والی آنکھ کا وصف یہ ہے کہ وہ قطرے میں دریائے دجلہ اور جزو میں کل کا اندازہ کر لیتی ہے اگر ایسا نہ ہو تو اسے عادت کی حقیقت رس آنکھ نہیں، بلکہ بچوں کا کھیل سمجھنا چاہیے۔

دجلہ یا کوئی دریا حقیقت میں کیا ہے ؟ محض قطروں کا مجموعہ ہے جو اکٹھے ہو کر بہتے ہیں تو دریا کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، البتہ یہ حقیقت صرف عارفوں کی چشمِ بیدار دیکھ سکتی ہے اور اسی کو جزو میں کل نظر آ سکتا ہے۔

۹۔ مشرح : یہ خبر زور شور سے پھیل ہوئی تھی کہ آج غالب کے پرنے اڑانے جائیں گے، یعنی اسے سخت سزا دی جائے گی۔ ہم بھی یہ تناظر دیکھنے کے لیے پہنچے، مگر انہوں نے اس کی نوبت نہ آئی۔

اسد! ہم وہ جنوں جولاں گداٹے بے سرو پا ہیں لغات :

کہ ہے سترنجہ مرثگان آہو، پشتِ خار اپنا جنوں جولاں :
دیوانگی کی حالت میں

چکر لگانے والا۔ وہ شخص جو دیوانہ ہو اور ادھر ادھر بھاگتا پھرے۔

گداٹے بے سرو پا : وہ درویش، جس کے پاس کوئی سرسaman نہ ہو

سترنجہ : پنچہ کا مزید علیہ۔ نارسائی میں ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ کسی لفظ پر

کوئی دوسرا لفظ بڑھا دیتے ہیں اس سے معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا، مثلاً منزل
کا مزید علیہ سر منزل۔

پشتِ خار : پیٹھ کھانے کا آکر۔ سوے یا پتیل یا پاندی کی ایک چیز
تھیل کی شکل کی ہوتی ہے۔ اس میں ایک لٹنڈی لگائیے ہیں۔ اس سے امیر یا
غریب ضرورت کے وقت پیٹھ کھائیے ہیں۔

شرح : اسے اسد! ہم بے سرو سامان فقیر ہیں اور دیوانگی کی حالت میں
دشتِ دیباہ کے چکر لگا رہے ہیں، بے سامانی کا یہ عالم ہے کہ ہمارے پاس
پیٹھ کھانے کا آلہ بھی نہیں۔ ہمیں ہرن کی مرثگان کا پنچہ ضرورت کے وقت بہ
کام دے دیتا ہے۔

شعر مرزا غالب کے ابتدائی دور کا ہے، جب وہ زیادہ تر خیالی مضامین
باندھا کرتے تھے۔ اس میں ایک خوبی یہ ہے کہ جنوں کی حالت میں دشتِ نوردی
کرتے ہوئے اتنے تیز چلے جا رہے ہیں کہ ہرن بھی، جو چوڑیاں بھرنے میں مشہور
ہیں، پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی مرثگان پشتِ خار کا کام دیتی ہیں۔

پے نذر کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا ۱۔ لغات۔ کرم : بیاں
بخون غلطیہ صدرنگ دعویٰ پارسائی کا اس سے مراد کرم ہے، یعنی سب
کرم و بخشش، خدا۔

شرم نارسائی : خدا کے قرب میں نہ پہنچ سکے کی شرم، یعنی خدا نے جو حکم دیا ہے، اسے نہیں پوری طرح بجا نہ لانے کی مذمت۔

بخون غلطیدہ صد رنگ : سو طرح خون میں تھرا ہوا، یعنی سیکڑوں گناہوں کے باعث خون میں لت پت۔

شرح :- میں رحیم و کریم خدا کی بارگاہ میں ایک تحفہ لایا ہوں۔ وہ تحفہ کیا ہے ؟ شرم اور مذمت کا تحفہ ہے، کیونکہ جو حکم خدا نے دے رکھے تھے، وہ سب پورے نہ ہو سکے۔ ضروری کام پورے نہ ہونے کا نتیجہ شرم و مذمت کے سوا کیا ہو سکتا ہے ؟ اس کی مثال یوں سمجھنی چاہیے کہ میں پارسائی کا دعویٰ کر رہا ہوں لیکن وہ دعویٰ سو سو طرح خون میں لت پت ہے اور اس خون کے ذمہ دار میرے گناہ ہیں۔ یہی گناہ

دہر حسن تماشا دوست رسوا بے دفائی کا بہتر صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا زکاتِ حسن دے، اے جلوہ بینش کہ ہر آسا چراغِ خانہ درویش ہو، کاسہ گدائی کا نہ ماراجان کر بے جرم، قاتل تیری گردن پر رہا مانند خون بے گنہ حق آشنائی کا تمنائے مذاہن محو سپاس بے زبانی ہے شاہ جس سے تقاضا شکوہ بے دست پائی ہے وہی اک بات ہے جو بیاں نفس وال نہایت گل چمن کا جلوہ باعث ہے سری رنگیں نوائی کا وہاں ہر تبت پیغامہ جو، زنجیر رسوائی دم دم بے وفا چرچا ہے تیری بے دفائی کا ندوے نامے کو اتنا طویل غالب مختصر لکھ دے کہ حسرتِ سنج ہوں، عرضِ ستم ہائے عبدائی کا

۱۔ کوہِ زندگی مٹی جس نے مجھے خدا کی بارگاہ میں پہنچنے نہ دیا، اس لیے شرم و مذمت کے بلند اس اُمید پر حاضر ہوا ہوں کہ وہ صاحبِ کرم و بخشش مجھے اپنی رحمت سے

معائنہ کر دے گا۔

۲۔ لغات - تماشا دوست : جسے نمود و نمائش پسند ہو جو اس امر کا مشتاق ہو کہ دنیا اسے دیکھے۔

شرح :- اس شعر کے مطلب دو ہو سکتے ہیں :

۱۔ حسن حقیقی کا جلوہ ہر شے میں موجود ہے اور وہ اس امر کا مشتاق ہے کہ دنیا اسے دیکھے۔ ہر ایک کی نگاہ اس پر بھی ہوئی ہے، لیکن اس پر بے وفائی کا لازم عامل نہیں ہو سکتا، بلکہ دیکھنے والوں میں سے ہر ایک کی نظر اس کی پاکیزگی اور پارسائی کے لیے ایک ٹھہری دستاویز ہے۔ جس حسن کی پاکیزگی کے لیے بے شمار ٹھہری دستاویزیں موجود ہوں، اس کے لیے نمود و نمائش کی پسند کے باوجود کوئی بے وفائی کا خیال دل میں لا سکتا ہے۔

۲۔ اگر شعر کو مجازی معنی میں لیا جائے تو اس کی حیثیت طنز کی ہے، یعنی جو حسن خود اس امر کا طلبگار ہے کہ اسے دیکھا جائے۔ جو ہر وقت تاک جھانک کا مرکز ہے اور اس پر سیکڑوں نگاہوں کی ٹھہری لگی ہوئی ہیں۔ بے ایمان ہمدردی کی رسوائی سے بچنا چاہیے اور پارسائی کا مدعی ہو تو اس کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے، ان لینا چاہیے کہ وہ بے وفا نہیں اور اپنی پارسائی کے لیے سیکڑوں نظروں کی ہر پیش کر رہا ہے، جو بجائے خود پارسائی کو بے حقیقت ثابت کر رہی ہیں۔

۳۔ لغات - جلوۂ بنیش : بینائی اور نظر کا لوز، یعنی محبوب۔

تہر آسا : سودج کی طرح۔

شرح :- اے میری بینائی کے لوز! اے میرے محبوب! مجھے بھی اپنے

عالمِ فردوس حسن کی ذکاوت سے سرفراز کرنا کہ میرا جھیک کا کاسہ میرے گھر کا چراغ کی طرح اسی طرح روشن کر دے، جس طرح سودج کی جلوہ ریزی سے پوری کائنات روشن ہو جاتی ہے۔

کاسٹ گڈائی کو اس اعتبار سے آنکھ کا استعارہ سمجھا جاسکتا ہے کہ حسن سے استعارے کا اولین ذریعہ آنکھ ہے اور کاسر یہ لحاظ وضع آنکھ سے مشابہ ہوتا ہے۔

۴۔ **شرح** :- خواجہ حال اس شعر کے معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "تو نے ایک مشتاق قتل کو بے جرم سمجھ کر اس لیے قتل نہیں کیا کہ خون بے گناہ اپنی گردن پر نہ لے، مگر اب تیری گردن پر بجائے خون بے گناہ کے حق آشنائی کا رہے گا۔ اسے قاتل! ٹوٹنے مجھے اس وجہ سے قتل کرنا گوارا نہ کیا کہ میرا کوئی جرم اور کوئی قصور نہ تھا اور بے جرم وہ بے گناہ کو مارنے کا خون گردن پر سوار رہتا ہے، لیکن میں تیرے ہاتھوں شہادت پانے کا آرزو مند تھا اور دوستی کا حق یہی تھا کہ تو میری یہ آرزو پوری کر دیتا۔ تیرا خیال میری بے گناہی کی طرف گیا، مگر بے گناہ کے خون سے بچنے کے اضطراب میں دوستی کا حق تیری گردن پر رہ گیا۔"

۵۔ **شرح** :- بے دست و پائی اور بیچارگی تعاضد کر رہی تھی کہ اس حالت کی شکایت ضرور کرنی چاہیے۔ میں بے زبان تھا۔ شکایت کی غرض سے یہ آرزو پیدا ہوئی کہ مجھے بے زبان مل جائے۔ اس اثنا میں محبوب کو میری بیچارگی و بے زبانی پر رحم آگیا اور شکایت کی نہ محض ضرورت نہ رہی، بلکہ جس حالت کی شکایت کرنی تھی وہی میں میری مراد بن گئی۔ اس لیے زبان کی آرزو میری بے زبانی کے شکریے میں سرگرم ہے کہ کچھ کسانا چڑا اور اس کے بغیر ہی محبوب کا انتقام حاصل ہو گیا۔

۶۔ **شرح** :- چمن کے جلوے سے مراد فصل بہار کی آمد ہے، کیونکہ اسی سے چمن میں شادابی اور رونق پیدا ہوتی ہے۔ پھول کھلتے ہیں اور خوشبو ہر طرف بکھرنے لگتی ہے۔ بہار ہی کا موسم شاعر کے دل میں خاص جوش اور ولولہ پیدا کرتا ہے اور اس کے بیان میں رنگینی و شگفتگی آجاتی ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ وہی بہار ہے، جس نے چمن میں رونق تازہ کر دی اور میرے دل سے رنگین و دلآویز نقشے اٹھنے لگے۔ گویا ایک ہی سبب ہے، یعنی بہار جس نے چمن میں پھول کی خوشبو کا ملک اختیار کیا اور میرے لیے دلکش نعروں کا سامان دیتا کر دیا۔

۷۔ **سہلغات** - پیغامہ تجو : طعنے نکال کر دینے والا، طعنے دینے والا۔

شرح :- دھونڈ دھونڈ کر طعنے دینے والے ہر حسین کا وہن ایک حلقہ ہے اور بے شمار حلقے مل کر بدنامی کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا ہے۔ چونکہ حسینوں کے وہن کو تنگ کرتے کرتے شاعر ناپید اور معدوم کر چکے ہیں، اس لیے کہا کہ اسے بے وفا ! تیری بے وفائی کا چرچا عدم تک جا پہنچا اور حسینوں کے وہن مل کر رسوائی کی زنجیر بن گئے۔

یہ شعر بھی اسی قبیل کا ہے، جس میں ہم نے پشت خاں دالے شر کو شمار کیا۔
۸۔ **لغات** - حسرت سنج : حسرت رکھنے والا، ارمان رکھنے والا۔

شرح :- اسے غائب الخط کو زیادہ طول دینے اور پھیلانے کی کیا ضرورت ہے ؟ بس اتنا ہی لکھ دینا کافی ہے کہ فراق میں مجھ پر جو ظلم و ستم ہوئے، انہیں بیان کرنے کی حسرت دل میں بے میثا ہوں۔

گر نہ اندوہ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا
۱۔ **شرح** : فراق کی رات ہے، عاشق چاند کو دیکھتا ہے۔
بے تکلف داغِ مہرِ دہاں ہو جائے گا
چاندنی رات میں محبوب سے کجائی کا دوار بہت پر جوش ہے۔ ساتھ ہی فراق اسے مایوس کر دیتا ہے۔
زہرہ گرا یا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آبِ پر تو یہ کتابِ سیلِ خانماں ہو جائے گا
معاذِ خیال آتا ہے کہ محبوب سے ملنے کی تو کوئی صورت نہیں، اہفت کا راز اور فرقت کا درد چھپا یا نہیں جا سکتا۔ اگر میں نے چھپانے کی کوشش کی تو دیوارِ بربادوں گا اور کسی کو بھی معلوم نہ ہو گا کہ میرے جہنم اور میری

لے تو لوں سوتے میں اُسکے پاؤں کا بوسہ مگر ایسی باتوں سے وہ کا فر بدگماں ہو جائیگا
دل کو ہم صرٹِ وفا سمجھتے تھے کیا معلوم تھا
یعنی یہ چلے ہی نذرِ امتحان ہو جائے گا

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہو
 مجھ پہ گویا ک زمانہ مہربان ہو جائے گا
 گزنگاہ گرم فرماتی رہی - تسلیم ضبط
 شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا
 باغ میں مجھ کو نہ لے جا، ورنہ میرے حال پر
 ہر گل ترا ایک چشم خوں نشاں ہو جائے گا
 دانے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
 اب تلک تو یہ توقع ہے کہ داں ہو جائیگا
 فائدہ کیا ہوسچ، آخر تو بھی دانہ ہے اسد
 دوستی ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہو جائیگا
 ادا فرزدی کے باوجود ایک داغ نظر آنا چاہیے۔

خالت نے لکھ نارسم، غولہ جی کما ہے۔

از مر ضیا و تاب امید نظر منیت

ایں تشہ پر از آتش سوزاں پر سرمدیز

یعنی جہان کو روشن کر دینے والے سورج سے مجھے کسی ضیا افروز نظر کی امید
 نہیں۔ جب صورت حال یہ ہے تو اسے سورج نہ سمجھنا چاہیے جس سے ہر شے
 بھی ارتقا و بالیدگی ہے، بلکہ یہ انگاروں سے بھرا ہوا ایک تشہ ہے۔ ہمارے
 میرے سر پر اٹ دینا چاہیئے۔

دیو لگی کا اصل سبب کیا ہے۔
 میرے غدیوں، غلگادوں بکد
 محبوب تک کو بھی خبر نہ ہوگی۔
 گویا چاند جس کی روشنی بہ حالت
 خرق میرے دل میں جوں دیو لگی
 کا تو علم پیدا کر رہی ہے، سراپا
 ایک داغ بن کر میرے منہ پر
 مٹر کی طرح لگ جائیگا۔

بہ ظاہر داغ مر سے دہ
 داغ مراد نہیں، جو چاند میں نظر
 آتا ہے۔ پورے چاند کا داغ
 بن کر مٹر کی طرح منہ پر لگ
 جانا مراد ہے۔ اور پورے چاند
 کا داغ بن جانا اس لیے کہا کہ
 فراق کی حالت میں چاند بھی روشنی

غرض جب کوئی شے اپنا حقیقی ذلیقہ چھو چھو ہے تو اسے اصل شے نہ سمجھنا چاہیے۔ اسی طرح فراق میں پورا چاند وارخ نظر آنے لگا۔

۲۔ لغات۔ زہرہ : پتہ۔

تشریح :- اگر محبوب سے دوری کی شام ہو جانے پر ہر چیز کا پتہ اسی طرح پانی پانی ہوتا ہے تو چاند کی روشنی پر بھی یقیناً اس کا یہی اثر پڑے گا اور وہ روشنی پانی کا ٹیل بن کر میرے گھر کو تباہ کر ڈالے گی۔ یعنی جو شے راحت و خوشگوار ی کا باعث ہوتی ہے وہ بھی انتہائی مصیبت کا سامان بن جائے گی۔

۳۔ تشریح :- محبوب سورتا ہے، جی چاہتا ہے کہ فرط محبت سے اس کا پاؤں چوم لوں، لیکن یہ اندیشہ دامن گیر ہے کہ اس کے دل میں کوئی بُرا لگان نہ بیٹھ جائے۔ یہ نہ بچھے کہ مجھے غافل پاکر یہ صدمہ بڑھنے لگا یا اس نے پاک محبت کے جوہر کو کیسے غصے، وہ سب جھوٹے بن گئے۔

۴۔ تشریح :- ہم یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ ہمارا دل خالصہ و ناکہ کے تقاضے پورے کرنے کے لیے وقف ہے۔ وہ و ناہی کے راستے میں مٹ جائے گا، لیکن میں یہ کب معلوم تھا کہ محبوب کی طرف سے امتحان و آزمائش کی منزل پیش آئے گی تو سب سے پہلے وہ اسی آزمائش کی نذر ہو جائے گا اور و نا کے سلسلے میں جو کچھ ہم پر واجب ہے اسے بجالانے کا دل کو موقع ہی نہ ملے گا۔

۵۔ تشریح :- بظاہر اس میں خطاب اللہ تعالیٰ سے ہے۔ یعنی اے ذات پاک! بہرول میں تیری جگہ ہے۔ بہر فز و تیری محبت کے لیے وقف ہے۔ اگر تو اپنے عاجز و گنہگار بندے سے راضی ہو جائے تو سارا زمانہ مجھ پر مہربانی ہو جائیگا کیونکہ سب تیری رضا اور تیری چشم کرم کے منتظر ہیں۔

۶۔ لغات۔ نگاہ گرم : غصے اور عتاب کی نگاہ۔

تشریح :- اگر تیرے عتاب اور غصے کی نگاہ محبت کی آگ کو مٹا دے رکھنے اور دل کو سنبھالے رہنے کے آداب سکھاتی رہی تو گھاس کے بھسے ہوئے بچہ رہے

اسی طرح پوشیدہ ہو جائے گی، جس طرح سورگوں میں پوشیدہ ہوتا ہے۔

سورگوں میں دوڑتا رہتا ہے، لیکن کسی کو نظر نہیں آتا۔ اگر گھاس کا تنکا، پکڑے تو ایک لمحے میں جل بجھتا ہے۔ ضبط کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اپنی حالت پر قابو پایا جائے اور حقیقت کسی پر ظاہر نہ ہونے دی جائے۔ گو یا شعلہ خس میں نمایاں نہ رہے، بلکہ اندر چھپ جائے۔ صبر و ضبط کے آداب محبوب نے عتاب اور خفگی کی نگاہ ڈال کر سکھائے۔ یعنی جب دیکھا کہ عاشق بیتاب ہو رہا ہے اور ضبط کے بند ٹوٹنے والے ہیں تو غصے سے بھری ہوئی نگاہ اس پر ڈال دی۔ وہ پیارہ منسل گیا اور سنبھلنے کے لیے جان لڑا دی۔

نگاہ گرم، اشعلہ خس، خون اور رگ کی مناسبتیں تشریح کی محتاج نہیں۔

۷۔ شرح۔ اے ہمد! مجھے باغ میں نہ لے جا، کیونکہ خشکی و اندوہ سے

میری حالت اس درجہ تباہ ہے کہ ہر تروتازہ پھول مجھے دیکھتے ہی لہو رونے والی آنکھ بن جائے گا۔ یعنی میری حالت اتنی خراب ہے کہ جس مقام پر لوگ سیر و تفریح کے لیے جاتے ہیں، وہاں ماتم کی مجلس پایا ہو جائے گی اور ماتم بھی ایسا کہ آنسوؤں کی جگہ لہو رو دیا جائے گا۔

گل تر کو سرخی و تازگی کے باعث چشم خوں نشان سے تشبیہ دی گئی ہے۔

۸۔ شرح۔ میں تو اب تک یہی امید لگائے بیٹھا تھا کہ قیامت کے دن

میرا تیرا انصاف ہو جائے گا۔ اور منصف حقیقی دونوں کے درمیان فیصلہ کر دیگا۔ لیکن وہاں بھی انصاف نہ ہوا تو حسرت و افسوس کے سوا میرے لیے کیا باقی رہ جائے گا؟

۹۔ شرح۔ رفیق و غمخوار کہتا ہے کہ اے اسد! تو غما عقلتے اور سمجھ

سوچ والا بھڑی ہے، لیکن خدا سوچ کہ تو ایک کس محبوب سے دوستی کا رشتہ استوار کر رہا ہے، جسے اونچ نیچ کی خبر نہیں اور وہ اچھائی پرانی سوچ نہیں سکتا۔ نتیجہ اس کے تو کیا ہو گا کہ تجھے جان کا نقصان اٹھانا پڑے گا۔

آخری مصرع میں مرزا نے مشورہ منہ سے کام لیا ہے، یعنی نادان کی دوستی بھی
 کا ناپاں، نیز اردو اور فارسی کے شعراء محبوب کی کم سنی پر زور دیتے دیتے یہاں
 تک آگے بڑھ گئے کہ اسے عقل و فکر سے عاری مان لیا۔

①

دردِ منت کش ہو نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا
 جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟ اک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا
 ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں؟ تو ہی جب خنجر آزمانا ہوا
 کتنے شیریں ہیں تیرے لبِ اکِریب گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
 ہے خبر گرم اُن کے آنے کی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
 کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟ بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
 جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
 زخمِ گدب گیا، لہو نہ تھا کام گر رک گیا روا نہ ہوا
 رہزنی ہے، کہ دل ستا نی ہے؟ بے کے دل، دل ستا روا نہ ہوا
 کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں آج غالب غزل سرا نہ ہوا
 ا۔ لغات - منت کش : احسان اٹھانے والا احسان مند منون
 شرح :- خدا کا شکر ہے کہ میرے درد نے احسان نہ اٹھایا اور میں
 جیسا بھی بیمار و دور رسیدہ تھا، ویسا ہی رہا۔ یہ حقیقت پیش نظر رکھی جائے
 تو میرے تندرست نہ ہونے میں بھی کوئی برائی نہیں، کیونکہ اگر وہ اکھاتا اور وہ کارگر

ہوتی تو دیکھ ضرور زائل ہو جاتا، بیماری ضرور رفع ہو جاتی، لیکن مجھ پر دوا کا احسان نہ جاتا جسے میری خود داری اصل بیماری سے زیادہ مصیبت خیز سمجھتی تھی۔

۲۔ شرح :- قاعدہ ہے کہ جب کسی معاملے کے متعلق فیصلے کی ضرورت پیش آجائے تو بیچ بچاؤ اور صلاح مشورے کے لیے چند آدمی بلا لیے جاتے ہیں تاکہ ان کی وجہ سے اول فریقین کا جھگڑا کوئی ناؤک صورت اختیار نہ کرنے پاؤں، دوم سمجھانے بجھانے سے فیصلے کی کوئی صورت نکل آئے۔ اب مرزا غالب شکایتیں لے کر محبوب کی بارگاہ میں پہنچے اور گلے شکوے کی داستان شروع کر دی۔ محبوب نے یہ کیفیت نہانے کے لیے چند آدمی بلا لینے مناسب سمجھے، مگر ستم ظریفی یہ کہ غالب کے رقیبوں کو بلوایا، جو پہلے ہی اس غریب کے خلاف اُدھار کھاتے بیٹھے تھے۔ اُن سے یہی امید ہو سکتی تھی کہ اول ہر معاملے میں غالب کی مخالفت اور محبوب کی پاس داری کریں گے، دوم گلے شکوے کے مسئلے میں سنجیدگی سے بات سننے اور حقیقت تک پہنچنے کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن رقیبوں سے یہی امید ہو سکتی تھی کہ غالب کی مخالفت میں ایک سنجیدہ معاملے کو تماشے کی صورت دے دیں گے۔ وہ بیچارہ پریشان ہو کر کہتا ہے میں تو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ آپ نے میری وفاداری کے جواب میں کتنا بڑا سلوک کیا۔ آپ نے رقیبوں کو بلوایا۔ بھلا سوچئے کہ ان کی کیا ضرورت ہے؟ کیا آپ میرے گلے شکوے کو تماشہ بنا جانتے ہیں؟

لطفت کی بات یہ ہے کہ محبوب نے رقیبوں کو صرف بلوایا ہے، وہ پہنچے نہیں اور مرزا غالب احتجاج کر رہے ہیں کہ انھیں کیوں بلارہے ہو؟

۳۔ شرح :- ہماری قسمت کا فیصلہ تو تیرے منہ پر موقوف تھا۔ تو نے اس سے کام ہی نہ لیا، یعنی ہم پر اسے آزمایا ہی نہیں۔ اب تو ہی بتا کہ ہم قسمت آزمائی کے لیے کہاں جائیں؟

۴۔ لغات :- بے مزہ : بے لطفت، بد نوائف، رنجیدہ، کبیرہ، ناخوش۔

شرح :- اسے محبوب! تیرے بھوں میں کتنی مٹاس ہے کہ رقیب کو توڑنے
برا بربگایاں دیں، مگر انہیں کھانے کے بھی وہ بے لطف، رنجیدہ اور ناخوش نہ ہوا۔
یہ اس حقیقت کی روشنی میں ہے کہ تیرے ہونٹوں کی شیرینی نے گایوں میں بھی
اتنی مٹاس پیدا کر دی، ان میں قدا بھی تلخی باقی نہ رہی۔

شعر کا یہ پہلو بہ طور خاص قابلِ توجہ ہے کہ لبِ محبوب کی شیرینی کے باعث
گایاں رقیب کے لیے میٹھی بن گئیں، حالانکہ شاعروں کے مسلمات کے مطابق
رقیب سچا عاشق نہیں ہوتا۔ جو ہونٹ جھوٹے عاشقوں کے نزدیک اتنے شیریں
ہیں، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ کچھ عاشقوں کے لیے کیا ہوں گے۔

۵۔ شرح :- مشہور ہے کہ محبوب میرے گھر آ رہا ہے، لیکن میری بے سمانی
کا یہ عالم ہے کہ بوند یا نمک پاس نہیں، جسے بھپکا کر اسے بٹھا سکتا اور بے سمانی
کی یہ کیفیت اسی روز ہوئی، جب محبوب کے آنے کی خبر گرم تھی۔

۶۔ لغات - نمرود : زمانہ قدیم کا ایک بادشاہ، جس نے خدائی کا
دعوئی کیا تھا۔

بندگی : عبودیت - بندہ ہونا۔

شرح :- خواجہ حالی اس شعر کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں : کہتا ہے
میر کی بندگی کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھ کو سوا نقصان کے کچھ فائدہ نہ
پہنچا، یہاں بندگی سے مراد عبادت نہیں، بلکہ عبودیت ہے۔ بندگی پر نمرود کی
خدائی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات ہے۔

اس شعر کی تفسیر یہ کہی ہو سکتی ہے، مثلاً :

۱۔ خواجہ حالی کی تشریح کے مطابق ”وہ“ کا اشارہ بندگی کی طرف ہے، یعنی
کیا میری بندگی نمرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھے کوئی فائدہ نہ پہنچا، صرف نقصان
ہوا ؟

۲۔ وہ کا اشارہ خدائی کی طرف سمجھا جائے، یعنی میں جس خدائی میں بندگی کرتا

راہ لکھا وہ نمرود کی خدائی تھی، رب العالمین کی خدائی نہ تھی کہ اس میں مجھے نقصان
کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا ؟

۲۔ پہلے مصرع کے آخر میں استغفار کے بجائے استغباب کی علامت کبھی جائے
اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ مجھے تو زندگی کا حق ادا کرتے رہنے سے بھی کوئی
فائدہ نہ پہنچا، لیکن نمرود کی طرف دیکھیے کہ اس نے خدائی کا دعویٰ کیا اور بڑے
رعب داب اور شان و شوکت کے ساتھ سلطنت کرتا رہا۔

۷۔ لغات - پہلے حق "کے معنی میں سچی بات، سچ، دوسرے "حق"
کے معنی ہیں۔ واجب، فرض اور ذمہ۔

شرح :- میں نے جان راہ حق میں دے دی، لیکن اس میں میری کیا
خوبی ہے ؟ جان میری نہ تھی، خدا نے مجھے عطا کی تھی۔ اس کا عطیہ اسے لوٹا دیا تو
کمال کیا ہوا ؟ سچی بات یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو کچھ ہم پر واجب تھا، جو کچھ
ہمارے ذمے عائد تھا، وہ تو پورا نہ ہو سکا، ہم اپنی کوئی چیز اس کی راہ میں قربان
کرتے تو ایک بات تھی۔ اس صورت میں کہہ سکتے تھے کہ ہم نے فرض ادا کر دیا۔ اب
ایسا دعویٰ کیونکر کیا ہے ؟

مطعن یہ کہ انسان کی انتہائی قربانی جان دے دینا ہے۔ مرزا اسے بھی
اوائے حق قرار نہیں دیتے۔ سوچئے راہ خدا میں قربانی کا تصور اور حق ادا کرنے
کا مقام کتنا بلند ہے۔

۸۔ شرح :- عام قاعدے کے مطابق زخم دبا دیا جائے تو اسو مخم جاتا
ہے اور رواں رہتا، لیکن غالب کو اعلیٰ صورت پیش آئی۔ زخم بانہہ دیا گیا
اور اسو پھر بھی جاری رہا۔ اس کے برعکس میرے کام میں رکاوٹ پیدا ہوئی تو وہ
جاری نہ رہ سکا اور وہیں ٹپک گیا۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ جو بات میرے لیے فائدہ مند ہوتی ہے، وہ چلیں نہیں
آتی جس میں نقصان کا پہلو ہو، وہی پیش آتی ہے۔ زخم بندھ جائے ہے اور ٹپک

جانا چاہتی تھ اور نہ رکھا۔ کام میں کوئی اٹکاؤ پیدا ہوا تھا تو اُسے دور جوہاں پانچے
تھا، مگر نہ ہوا۔

شعریں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بد نصیبی اور سیاہ بختی کسی قاعدے کی پابند نہیں کر جو
طریقہ اس نے ہو کے معاملے میں اختیار کیا، وہی کام کے معاملے میں بھی اختیار کرتی اس کا
امور یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طریقے میں تکلیف و اذیت زیادہ ہو، وہی اختیار کر لے خون
کے معاملے میں ایک اور کام کے معاملے میں بالکل دوسرا طریقہ اختیار کیا۔

۹۔ شرح :- یہ دل لینا ہے یا ڈاکہ مارتا۔ نہ قاز و انداز دکھائے، نہ عاشق کو
دیوار سے جی بھر کر لطف اندوز ہونے کا موقع دیا۔ پس آئے، دل پر ہاتھ مارا اور پھل دیے۔
دل لینے کا یہ طریقہ تو بالکل لوٹکا ہے۔

۱۰۔ شرح :- اے غائب! کچھ تو پڑھیے، کیونکہ لوگ کہتے ہیں، آج غائب نے
کوئی غزل نہ سنائی۔

اس غزل کے سلسلے میں ایک امثالہ نیا کر دیا گیا ہے کہ غزل میں کسی شعر اوسے کے
مکان پر مشاعرہ ہوا تھا، مرزا نے طرح میں غزل نہیں کہی تھی، امراہم تو حیرت پر غزل
پڑھ دی۔ مقطع پہلے سے اس مضمون کا کڑہا تھا، جیسا کہ خود واضح کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ہا پڑا امثالہ ہے، شاعر مقطع میں روایت و قافیہ کی مناسبت سے
عموماً ایسے مضمون ہاندھتے رہتے ہیں، جنہیں واقعات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ غزل بھی
مع مقطع اسی قبیل سے ہے۔ مرزا نے اکتوبر ۱۹۵۵ء میں حاتم علی بیگ، جہر کو ایک خط
میں لکھا: کئی دن ہونے کو ایک فقیر کہ خوش آواز بھی ہے اور نرم مز پر داز بھی، ایک
غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اس نے جو وہ کاغذ مجھ کو دکھلایا، یقین سمجھا کہ دونا آیا۔
غزل تم کو بھیجتا ہوں اور مصلے میں خط کا جواب چاہتا ہوں۔

غزل کے دس شعر ہیں، مرزا نے خط میں صرف آٹھ شعر کہے، باقی دوا تو یاد آئے
یا بعد میں شال کر لیے گئے۔

۱۔ لغات:

شوق: عشق

شرح: عشق کو

دل پیسیدہ مقام میں ہوں

محب کے تنگ ہونے کی شکایت

ہے۔ یعنی عشق دل میں اپنی

شوریدگی کا نشانہ کھل کر نہیں

دکھا سکتا، حالانکہ دل کی صفت

میں پوری کائنات سما جاتی ہے

دوسری طرف، سمندر کے منظر آ

اور جوش و خروش پر نظر ڈالنی

چاہیے کہ وہ موتی جیسی چھوٹی

سی چیز میں سما گیا اور اسے کون

بل گیا۔

شاعر کا مطلب یہ ہے

کہ سمندر کا اضطراب اور جوش

خروش اضطراب عشق کے سامنے

بالکل بے حقیقت ہے، بیشک

سمندر میں آنکھوں پر توجہ و تامل

برپا ہوتا ہے۔ طوفان آتے

ہیں اور کائنات کی کوئی دوسری

چیز اس مسلسل ہنگامہ آرائی کی

مثال پیش نہیں کر سکتی، لیکن

گلا ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا

گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

یہ جانتا ہوں، کہ تُو اور پا: سیخ مکتوب

گر: ستم زدہ ہوں، ذوقِ خامہ مرزا کا

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی

دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیشِ دنیا کا

غمِ مزاق میں تکلیفِ سیرِ گلِ مست دو

مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے، سبھا کا

ہنوز حسرتِ حسن کو ترستا ہوں

کرے ہے ہر بے مٹو کام چشمِ بنیا کا

دل اس کو پہلے ہی ناز و اداسے دے بیٹھے

ہمیں دماغ کہاں، حسن کے تقاضا کا

نہ کہہ کہ گریہ بہ مقدارِ حسرتِ دل ہے

مری نگاہ میں ہے جمع و خسرِ دریا کا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یادِ لعل

جفا میں اس کی ہے اندازِ کارِ مرزا کا

دیکھیے۔ یہ پوری ہنگامہ آرائی مرقی کے اندر گم ہو گئی۔ معلوم ہے کہ مرقی کی پرورش مندر کی اسی ہنگامہ آرائی کا نتیجہ ہوتی ہے گویا مرقی اس ہنگامہ آرائی کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے لیکن اضطراب عشق دل جیسے ہرگز یہ مقام میں بھی جگہ کی تشکی کا گدگد کر رہا ہے۔ مرقی یا گوہر کی مرقی کو ساکن قرار دینا شعر کا عام معنوں ہے۔ مثلاً :

ہیں رہا ہیں زنجبش ہر خس نے کسند

دردیا دلاں چو مرق گہر آرمیدہ اند

خواجہ میر درد نے وجود حقیقی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا :

ارمن دسا کہاں تیری وسعت کو پا کے

میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما کے

مگر مرزا غالب کے نزدیک میر درد کا دعویٰ سچ نہیں۔ دل وجود حقیقی کے عشق کا ہرگز مشتمل نہیں ہو سکتا اور وہ جگہ اس عشق کے جوش و خروش کی فائش کے لیے قطعاً ناکافی ہے۔ بعض اصحاب نے لکھا ہے کہ غالب کا یہ شعر بیدل کے مندر بڑا ذیل شعر سے ماخوذ ہے

دل آسودہ ما شور اسکاں در قفس دارو

گہر و زویدہ است این جاعان مرق دیا را

یعنی ہمارا دل آسودہ یا قفس مطمئنہ عالم اسکاں کا شور و خفا اپنے جگرے میں بند کیے

ہوئے ہے۔ پھر مثال دیتے ہوئے لکھا کہ یہاں مرقی تو بچ دریا کی باگ چرا کر لے آیا ہے۔

یعنی اس سند کے سارے جوش و خروش کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔

معمولی تاقی سے بھی واضح ہو سکتا ہے کہ دونوں شعروں کے معنوں الگ الگ

ہیں۔ بیدل کے نزدیک شور اسکاں دل میں سا گیا۔ مرزا غالب کہتے ہیں کہ سند کا جوش

خروش یقیناً مرقی میں سما سکتا ہے۔ لیکن اضطراب عشق کے لیے دل جیسے ناپید اکند جگہ

میں ہی ساقی کا کوئی اسکان نہیں۔

۲۔ لغات : پاسخ : جواب

فوقی خامہ فرسا : ایسا ذوق مجھے صرف تحریر و نگارش کی دھن ملی ہو۔

شرح : ہر بلیک میں جانتا ہوں کہ تو میرے خط کا جواب کبھی نہ لکھے گا۔ ایسی امتیازی امت تک ملکی نہیں، لیکن میں کیا کروں۔ قدرت نے میری نظرت میں ایسا ذوق جموایا ہے۔ جو مسلسل تحریر و نگارش کی دھن میں لگا رہتا ہے۔ یہ ذوق مجھے چین نہیں لینے دیتا۔ سارا ستم اسی نے ڈھکا۔ کہا ہے۔ اس کے ہاتھوں معلوم بھی ہوں اور مجبور بھی جواب خط نہ کہنے کا یقین ہی سہی، مگر لکھنے سے باز نہیں رہ سکتا۔

بعض اصحاب نے فرمایا کہ یہ مضمون میر حسن نے بھی خوب بانداھا ہے :

گرچہ دل کو ہے یقین یا خط نہیں پڑھے گا وہ

پر تقاضا شوق کا کھینے سے کب رکھتا ہے باز

یعنی یہ تو یقین ہے کہ محبوب میرا خط ہرگز نہیں پڑھے گا، لیکن عشق کا تقاضا مجھے لکھنے سے باز نہیں رکھ سکتا۔

میر حسن اردو کے مشہور استاد ہیں، مگر اس شعر میں انہوں نے ایسی بات کہہ دی ہے جسے نظرت انسانی سے کوئی مناسبت نہیں۔ محبوب عاشق سے راضی ہو یا ناراض، لیکن جو کچھ لکھا ہو اس کے سامنے آجائے گا، اسے وہ محذور پڑھے گا۔ نہ پڑھنا خلاف تقاضائے نظرت ہے۔ مرزا نے یہ نہیں کہا کہ محبوب خط نہیں پڑھے گا، صرف یہ کہا ہے کہ جواب نہیں دے گا۔ یہی محبوب کی عادت کا بیج خاک ہے، اس لیے مرزا کا شعر میر حسن کے شعر سے بدرجہا بہتر ہے۔ مزید برآں مضمون کے محض جزوی اشتراک کو پورے شعر کا اشتراک قرار دے لینا ذوق کا کوئی امتیاز ثبوت نہیں۔

مبادا کسی کو خیال ہو کہ غائب نے بھی ایک جگہ ایسا مضمون بانداھا ہے، جو میر حسن کے مضمون سے قریب تر ہے۔ یعنی :

کھلے گا کس طرح مضمون مرے مکتوب کا یا رب

قسم کھاتی ہے اس کا فزنی کا تھکے مبلانے کی

ظاہر ہے کہ اس میں بھی مرزا نے کوئی بات طبعی حالات کے خلاف نہیں کہی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عاشق ذوقِ عام فرمائی میں غلط پر خط کھت تھا یہاں تک کہ محبوب تنگ

آگیا۔ ہر خط میں وہی باتیں جوتیں جو سہزادوں مرتبہ بلیں ہو چکی تھیں، لہذا محبوب نے فیصلہ کر دیا کہ اب عاشق کی طرف سے جو بھی خط آئے، اسے بے توقفت چلا دیا جائے، کیونکہ اس میں نئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔

اسی معنوں اور میسر حسن کے معنوں کا فرق تشریح کا محتاج نہیں:

۳۔ لغات : کلفت خاطر : دل کے لیے باعث رنج و کدورت

شرح : شاعر کہتا ہے کہ ازل بہار کا وجود ہی نہیں۔ بفرغ محال وجود تسلیم کر دیا جائے تو اس کی حیثیت ایسی ہے، جیسے خزاں کے پاؤں کو مندی لگا دی جائے۔ خزاں کے پاؤں کو مندی لگا دینے سے شاعر نے کئی پہلو پیدا کر لیے، مثلاً :
۱۔ مندی میں رنگین ہوتی ہے اور بہار کی بھی سب سے نمایاں خصوصیت رنگینی اور تازگی ہی ہے۔

۲۔ جب کسی کے پاؤں کو مندی لگا دی جاتی ہے تو وہ چل پھر نہیں سکتا۔ شاعر کا تصور یہ ہے کہ خزاں کے رخصت ہونے کا وقت آیا تو بہار آکر خزاں کے پاؤں کی مندی بن گئی۔ گو یا خزاں کے لیے رخصت ہونا ممکن ہی نہ رہا اور وہ بدستور موجود ہی۔
۲۔ مندی کا رنگ چند ہی روز میں اڑ جاتا ہے۔ اس سے شاعر نے بہار کی بے ثباتی اور بے حقیقی اور خزاں کا ثبات و دوام واضح کیا۔

۴۔ پاؤں کو مندی لگا لی جائے تو چلنے پھرنے سے عاری ہو جانے کے باعث انسان کو کلفت ہوتی ہے۔

شعر کا دوسرا مصرع اس آخری پہلو پر مبنی ہے، یعنی دنیا کا عیش بالکل عارضی ہوتا ہے اور بہر حال تکلیف، مصیبت اور کدورت کا باعث بنتا ہے۔

مرزا نے مستقل خزاں کی خوبی کے مختلف پہلو پیدا کر لیے اور ایک جگہ اسے ایسی بہار قرار دے دیا، جو خزاں کے عفت سے بالکل آزاد ہو۔ فارسی میں کہتے ہیں :

زینہار از نقب آتش یاوید مترس

خوش بہار میت کزد ہم خزاں برخیزد

یعنی اگر دائمی دوزخ کی تپش مقدّر ہے تو اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں، تو
سمجھ لے کہ تجھے ایسی بہار ملی رہی ہے، جیسے خزاں آہی نہیں سکتی۔

۴۔ لغات : غنڈہ ہاتھے بیجا : بے موقع، بے محل اور بے سبب ہنسا۔
شرح : میں محبوب سے جدائی کے غم کا مارا ہوا ہوں۔ اس حالت میں مجھے
بارغ کی سیر کے لیے مجبور نہ کرو۔ وہاں کیا ہوگا؟ پھول ہوں گے، جو بے محل ہنستے
ہیں، میں ایسی ہنسی برداشت نہیں کر سکتا۔

پھولوں کے کھلنے کو بے محل اور بے سبب ہنسی اس لیے کہا۔ کہ وہ نہ تو ہنسی
کا مناسب موقع دیکھ کر ہنستے ہیں اور نہ ان کے ہنسنے کا کوئی معقول سبب ہوتا ہے۔
صبح کو نسیم چلتی ہے اور وہ کھل جاتے ہیں یہی ان کی ہنسی ہے۔

غائب نے اس شعر میں ایک اہم حقیقت بیان کی ہے۔ انسان خود رنج و الم
میں مبتلا ہو تو سیر و تفریح اور دلکش مناظر اس پر اثر ڈالتے ہیں۔ اس کا دل بہتا
نہیں، بلکہ زیادہ کر دھتا ہے۔ پھولوں کا کھلنا ہر مسلم الطبع انسان کے لیے یقیناً باعث
فرحت ہے۔ ان کے رنگ اور تازگی و شادابی سے آنکھیں لطف اٹاتی ہیں، خوشبو
سے دماغ معطر ہوتا ہے، لیکن غمزدہ انسان کو ایسے فرحت انگیز منظر میں بھی خوشی
نہیں ہوتی، بلکہ اضطردگی و پریشانی ترقی کرتی ہے اور وہ اپنے دل سے رنج کے پہلو
پیدا کر لیتا ہے، جیسے اس شعر میں پھولوں کی شگفتگی کو بے محل اور بے سبب ہنسی
قرار دے دیا، جو کسی کے بھی نزدیک پسندیدہ نہیں ہو سکتی۔

۵۔ شرح : اگرچہ میرے جسم کا ہر ذرہ گناہیسی آنکھ بن گیا ہے جو ہر چیز کی
حقیقت کا ٹیک ٹیک اندازہ کر سکتی ہے، مگر اس ہر حسن کا محرم بن جانے کی سزا
مجھے نصیب نہ ہوئی اور اس کے لیے ترس رہا ہوں۔

شعر میں عمری پر خاص زور ہے، جس کا مطلب ہے، حسن کو بے پردہ دیکھ کر اس
کی حقیقت پامیاد اور کمزور تک پہنچ جانا۔ حسن سے اشارہ حسن حقیقی کی طرف ہے۔
شاعر کہتا ہے۔ یہ حسن کائنات کی ہر شے میں نمایاں ہے، تاہم انسان کے جسم کا رتھان

رقاں بھی حقیقت میں آنکھ بن جائے تو اس حسن کی محرمی نصیب نہیں ہو سکتی۔

بعض اصحاب نے اس شعر کے مقابلے میں فیضی کا مندرجہ ذیل شعر پیش کیا ہے:

دہر تین ٹوکری ہنسی گوشش

نو آراء فیضی دوست در ہوش

یعنی تو کسی بھی دو ٹوٹے پر کان دھرے، وہاں حسن حقیقی کے فیض کا فوآرہ جوشاں

ہوگا۔

ظاہر ہے کہ ہر تین ٹوکری کے سوا دونوں شعروں میں کوئی بھی چیز مشترک نہیں فیضی ہر شے میں حسن حقیقی کا فیض ثابت کر رہا ہے۔ غالب اس لیے تڑپ رہا ہے کہ دو ٹوٹے کو چشم بینا بنا لینے کے باوجود حسن کا بے حجاب نظارہ نصیب نہ ہوا۔

۶۔ **شرح :** ہم نے حسن کو دیکھتے ہی دل اس کی نذر کر دیا اور ہرگز انظار نہ کیا کہ وہ (حسن) ناز و ادا سے کام لے کر سہاد دل موہ لینے کی کوشش کرے۔ گویا شاعر کے نزدیک ناز و ادا ناز و دل چسپن لینے کے حصے ہیں، جن سے حسن کام لیتا ہے اور ان کے ذریعے سے دلبری کا تقاضا کیا جاتا ہے۔ ہم ایسا تقاضا گوارا نہیں کر سکتے اور اس کے بغیر ہی حسن پر مرٹے ہیں۔ غالب نے یہ مضمون ایک فارسی غزل میں بھی باندھا ہے :

مکن ناز و ادا چندیں اولے بہتان دہانے ہم

دماغ نازک ما بر نمی تابد تقاضا را

یعنی اے محبوب! تجھے ناز و ادا دکھانے میں اہتمام کی کیا ضرورت ہے ؟

یہ لے، دل بھی حاصر ہے اور جان بھی۔ ہمارا دماغ اتنا نازک ہے کہ تقاضا برداشت ہی نہیں کر سکتا۔

۷۔ **شرح :** اے ہدم ایہ دکھ کہ میرا دماغ کی حسرت کے ہیں

مطابق ہے۔ رونے کے مقابلے میں حسرت تو بہت بڑھی ہوئی ہے۔ تو کہنا ہے

کہ کیا دماغ کو دیا بہادری کا ؟ میں دیا کا مجمع و شرح جانتا ہوں۔ مجھے علم ہے، اس

میں کہتا پانی آتا ہے اور کتنا سمندر میں جاتا ہے۔ اگر میں دل کی حسرت کے مطابق رونا شروع کروں تو ایک دریا کیا، خدا ہانے کہتے دریا بہ نکلیں اور کیا قیامت آجائے۔
۸۔ لغات : کار فرما : کام لینے والا۔ جاگم

شعر کے پہلے مصرع میں "اس سے محبوب مراد ہے اور دوسرے مصرع کے "اس سے ننگ۔"

شرح :۔ میں آسمان کے جو درجہ کو دیکھتا ہوں تو اسے استاد ! بے اختیار محبوب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، کیونکہ آسمان کے جو درجہ میں محبوب ہی کے انداز ستم کی جھلک نمایاں ہے۔ گویا سمجھنا چاہیے، وہی آسمان سے کام لے کر بسب کچھ کر رہا ہے۔



۱۔ لغات : نفی پڑھا
لفظی معنی نفی پانے والا مراد ہے بہت اور جما ہوا۔
قطرہ ہے، میں کہ حیرت سے نفی پڑھا
خط جام ہے سرا سر رشتہ گوہر ہوا
خط جام ہے : جام
میں شراب کی پیمائش کے لیے
اعتبار عشق کی خانہ خسرابی دیکھنا
خط کہنے ہوتے تھے اور اٹھیں
غیر نے کی آہ، لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا
خط جام "یعنی" خط جام ہے "کہتے تھے۔"

شرح :۔ بخود مرزا غالب نے اس شعر کے متعلق تاحی عبد الباقیل جنون بریلوی کو لکھا تھا : اس مطلع میں نمایاں ہے دقیق، مگر کوہ کندن و کاہ بر آوردن یعنی لطف زیادہ نہیں۔ قطرہ ٹپکنے میں بے اختیار ہے۔ بہ قدر یک مشرہ بر ہم زدن ثبات و تکرار ہے۔ حیرت ازالہ حرکت کرتی ہے۔ قطرہ سے انزاع حیرت سے ٹپکنا بھولی گیا۔ برابر بونہی، جو ختم کردہ گئیں تو پیالے کا خط بہ صورت اس تا گئے کے بن گیا، جس میں موتی پڑنے ہوں۔

سادہ الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ ساق کے بلوے نے شراب کے ہر قطرے کو حیرت میں مبتلا کر دیا چنانچہ قطرے ٹپکتا بھول گئے اور حیرت کے باعث خطو حام پر برابر برابر جمع ہوتے گئے۔ گویا خط نے دھاگے کی صورت اختیار کر لی اور جیسے جیسے قطرے اس دھاگے کے لیے مرقی بن گئے۔

۲۔ شرح : محبوب کو غالب کے عشق صادق پر کامل اعتماد ہے، جو اس دے پر پہنچا ہوا ہے کہ غیر کے مٹنے سے بھی آہ نکلے تو سمجھ لیتا ہے کہ یہ آہ یقیناً طور پر غالب نے کی، لہذا اس پر خفا ہوتا ہے۔ گویا غالب کے لیے سچا عشق اور اس چھوٹے محبوب کا اعتماد بھی خانہ خرابی اور مصیبت کا باعث بن گیا۔

اس میں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ بعض صورتوں میں سچے عشق کا اثر بھی اٹا ہوتا ہے۔



۱۔ لغات : تقریب : ذریعہ
سبب۔ اجتماع کا موقع، مشاوری
بایہ یا حبش۔
محفل : کجلوہ۔ چار پائی سے ملحق
جلتی دو چیزیں رسوں کے ذریعے سے
باندھ کر اونٹ پر اس طرح رکھتے تھے
کہ دونوں حصے دونوں پہلوؤں پر
لٹک جاتے تھے۔ ان میں سواریاں
بالقابل بیٹھتی تھیں۔

شرح : جب محبوب نے سفر کی
تیار کی اور سواری کے لیے کہا کہ اس
یا تو عاشق کی گرمی شوق کا یہ عالم تھا
کہ راستے کی خاک کے ایک ایک ذرے پر دل باندھ دیا تاکہ مہربان سواری کا قدم نہ لگے

جب بہ تقریب سفر یار نے محل باندھا
تپش شوق نے ہر ذرے پر اک دل باندھا
اہل بنش نے بہ حیرت کدہ شوخی ناز
جو سہراٹم کو طوطی بسمل باندھا
یاس و امید نے ایک عربہ میداں مانگا
عجز و ہمت نے طلسم دل سائل باندھا
نہ بندھے تشنگی ذوق کے مضمون غائب
گر چہ دل کھول کے دریا کو بھی سائل باندھا
کہ راستے کی خاک کے ایک ایک ذرے پر دل باندھ دیا تاکہ مہربان سواری کا قدم نہ لگے

پڑے۔ عاشق کے محبت بھرے دل پر پڑے۔

بظاہر مطلب یہ نہیں کہ واقعی ہر ذرے پر ایک ایک دل باندھا گیا۔ مطلب یہ ہے شوق کی بے قرار سی اور بے تابی ایسی صورت اختیار کر گئی تھی کہ خاک کا ذرہ ذرہ عاشق کا دل معلوم ہوتا تھا تاکہ سواری کا پاؤں اسی پر پڑے۔

بقول طہطائی ذوق کی جھلکا سبٹ اور پیشی دل میں وجہ شیعہ ظاہر ہے۔

۲۔ لغات : اہل بیضی : اہل نظر۔ حقیقت میں۔

شعر میں آئینے سے مراد فولادی آئینہ ہے، اسی میں جوہر ہوتے ہیں جو رنگ رنگ مانتے سے سہری مائل ہو جاتے ہیں۔ رنگ ہی کی بدولت انھیں طوطی سے تشبیہ دی گئی ہے۔

شرح :- محبوب کے پیش نظر آئینہ تھا اور وہ تازہ و انداز کی شوخیاں دکھا رہا تھا جن کی وجہ سے پورا منظر حیرت خانے میں تبدیل ہو گیا اور آئینے کے جوہر اہل نظر کے نزدیک بیناب ہو کر طوطی بسل کی طرح لڑپا لٹھے، گویا آئینے کے جوہروں کو طوطی بسل قرار دے دیا ہے۔

۳۔ لغات - عربیہ میداں : میدان جنگ۔

عجز بہت : بہت کی پستی۔

شرح : امید اور ناامیدی میں کشمکش شروع ہوئی اور اس نے میدان جنگ کا سا رنگ مہر بیا کر دیا۔ پست بہت ہی سوال کرنے والے کے دل کو اپنے غلم میں جکڑ لیا۔

جب کوئی شخص سوالی بن کر کسی کے سامنے جاتا ہے تو اس کے دل میں امید ناامیدی کے درمیان کینچن مان شروع ہو جاتی ہے۔ امید یہ کہ کچھ مل جائے گا اور ناامیدی یہ کہ شاید سوال ٹکرا دیا جائے اور کچھ نہ ملے۔ یہ کشمکش اور یہ سبکدوشی انسان کی پست بہت کا تقاضا ہے۔ پست بہت ہی اسے سائل جانتی ہے اور سوال پر آمادہ کرتی ہے۔ اگر اس وقت ہو تو قوتِ بازو سے کام لے کر ہر مشکل کو دور کرے اور ہر کٹھن کام کو سمجھا

ہٹائے۔ اس حالت میں اسے اتید و تا اتیدی کے چکر میں پڑنے کی نوبت نہ آئے گی۔
مرزا غالب تو خود ناری اور عزیمیت پر اس درجہ مٹے ہوئے ہیں کہ کسی سے
عبرت حاصل کرنے کے بھی روادار نہیں، چنانچہ کہتے ہیں۔

ہنگامہ زبونی بہت ہے افعال

حاصل نہ کیجے دہرے، جبریت ہی کیوں نہ ہو

۴۔ شرح :- اسے غالب ! اگرچہ ہم دل کھول کر اور انتہائی سنی و کوشش
سے کام لے کر عشق کی پیاس کے معنوں تکھتے رہے، یہاں تک کہ دیا کو بھی ساحل
قرار دے دیا، لیکن حق یہ ہے کہ ہم اُن معنوں کی قریب و تحریر کا حق ادا نہ کر سکے
اور عشق کی تڑپ کے معنوں ہمارے ہاندھے نہ بندھ سکے۔

دیا کو ساحل ہاندھنے کا مطلب یہ ہے کہ ساحل ہر لحظہ دیا پر رہتا ہے، مگر اس
کی خشکی زائل نہیں ہوتی، گویا اس کی پیاس بدستور قائم رہتی ہے۔ دیا کو ساحل ہاندھنے
کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پورا دیا بھی ساحل ہی جائے، یہاں تک کہ ایک قطرہ
بھی باقی نہ رہے، تو اس کی یعنی ساحل کی تشنہ بھی اور پیاس میں کوئی فرق نہ کہئے گا،
وہ بدستور خشک کا خشک رہے گا۔

نہیں اور بزم سے یوں تشنہ کام آؤں
گرنے کی تھی تو بہ، ساقی کو کیا ہوا تھا
ہے ایک نیر جہیں دونوں چہرے پڑے ہیں
وہ دن گئے، کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا
درد ماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گر تھا ناخن گرہ کشا تھا

۱۔ شرح : سید محمد امجد بخاری
مودانی نے اس شعر کی شرح میں
بڑی تفصیل سے کام لیا ہے،
میں اسی کا خلاصہ اپنے لفظوں میں
پیش کر دیتا ہوں، کیونکہ اس شرح
میں شعر کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں
ہوا۔

۲۔ فرماتے ہیں : اس شعر میں کئی

ٹکڑے معنی خیز ہیں، مثلاً :

۱۔ "میں اور" اس سے بھری آتا ہے کہ میکش بہت پیٹنے والا ہے۔ ساقی اور رندوں کا پورا اگروہ اس کے رندانہ فضائل سے واقف ہے۔ شراب نہ پینے سے اسے اتنی تکلیف ہوئی، جتنی کسی دوسرے رند کو نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر اسے رندوں میں اپنی بے آبروئی کا بھی دکھ تھا۔

۲۔ "بزم سے" اس ٹکڑے سے واضح ہوتا ہے کہ اگر تنہائی میں ساقی نے یہی رتا ڈکھیا ہوتا تو ناگوار ضرور گزارتا، مگر ذاتاً، جتنا رندوں کی بھری محفل میں۔ وہ کہتا ہے۔ میں نے تو شراب اس لیے نہ مانگی کہ توبہ کر چکا تھا، لیکن ساقی نے ضیافت کیوں نہ کی؟ اس ہنسنے کیوں نہ خیال کیا کہ رندوں کی توبہ ہی کیا ہوتی ہے؟ اور اگر مجھے کافور نہ ہوتا تو رندوں کے جھگڑے میں آتا ہی کیوں؟ اس کا مقصد یہ تھا کہ توبہ کی لاج بھی رہ جانے اور شراب بھی پی لے، مگر ساقی نے جھوٹوں بھی نہ پوچھا۔

۳۔ "یوں سے سننے والے کی نظر میں رندنا کام کی تصویر پھر جاتی ہے۔ اسے اپنی ناکامی پر مدد درجہ حلال ہی نہیں، غصہ بھی ہے اور خمار کی تکلیف الگ جان لیے لیتی ہے۔ انگڑائی پر انگڑائی آرہی ہے۔

۴۔ "تشہ کام" سے خلق و زبان کے کانٹوں کا تصور ہونے لگتا ہے، جو شدت تشنگی کا ترجمان ہے۔

۵۔ "آؤں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پُر امید دل لے کر بزم سے میں گیا، مگر تشہ اور مایوس ٹوٹا۔

۶۔ "ساقی کو کیا ہوا تھا؟" اس کے بہت سے معنوم ہو سکتے ہیں، صرف لہجہ بولنے کی مراد نہ ہے۔ مثلاً

۱۔ کیا اس نے بھی توبہ کر لی تھی؟ (ب) کیا وہ ہوش میں نہ تھا؟ (ج) کیا حریفوں نے در اندازی کی؟ (د) اس کے لیے میکش کا احترام واجب تھا۔ (ه) صفے بیدردی اور سنگ دلی سے کام لیا۔ (و) رندوں کی حالت کا اندازہ کرنے

میں غلطی ہوئی (ح) شاید اس نے مجھے دیکھا نہیں (ج) کیا وہ میرے توبہ کرنے پر
سمت تھا ہو گیا ؟ (ط) کیا وہ کسی اور خیال میں تھا ؟ غرض ایسے بہت سے سبب
ذہن میں آ سکتے ہیں اور ساقی کو کیا ہوا تھا ۔ کہہ کر ان سب کا ذکر کر دیا گیا ۔
بعض اصحاب نے کہا ہے کہ یہ مضمون بیگم دختر امیر علی جلاڑ نے بھی بڑی خوبی
سے بھی پاندھا ہے :

من اگر توبہ نہ کر دہ ام اے سرد سہی !
تو خود این توبہ نہ کر دی کہ مرا می خدہی

یعنی اے سرد سہی ! اگر میں نے شراب سے توبہ کر لی ہے تو نے تو یہ توبہ نہیں
کی کہ مجھے شراب نہ دے گا ۔

اسی طرح حزی کا یہ شعر پیش کیا گیا ہے :

چہ شد از توبہ اگر دامن خشکے دارم
پیش ابر کرم پیر مغاں این بہ نسبت

یعنی اگر توبہ کی وجہ سے میرا دامن خشک ہے تو کچھ بدوا نہیں ۔ پیر مغاں کا ابر کرم
اسے لگا تو میری توبہ اور میرا دامن خشک سب بیچ وہ جایش گئے ۔

حزین کے شعر کو مرزا کے شعر سے کوئی مناسبت نہیں ۔ بیگم کا مضمون یقیناً
مرزا کے مضمون سے ملتا جلتا ہے ، لیکن اسے مطلع بنانے کے سلسلے میں ساقی یا
محبوب کو سرد سہی کہنا سراسر تکلف ہے ۔ نیز مرزا نے یہ مضمون پیش کرتے وقت
اس میں جتنی خوبیاں پیدا کر لی ہیں ان سے بیگم کا شعر خالی ہے ۔

۲ - **شرح** : اب وہ زمانہ نہیں رہا جب دل اور ہجر ایک دوسرے

سے الگ الگ تھے ۔ اب تو دونوں کو ایک ہی تیر نظر نے چھید رکھا ہے ۔ اور
دونوں کی حالت یکساں ہے ۔

دل کے چھیدنے کا نتیجہ ہوا کہ بے تابی کمال پر پہنچ گئی ۔ مگر چھید تو مہر داستان
کی قوت شل ہو کر رہ گئی ۔

۳۔ شرح : اسے غالب اب درمانہ گی اور بے چارگی کی حالت ظہری ہے۔ کچھ سجدہ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ جب میرے ناخن میں مشکلات کی گرہیں کھولنے کی قوت تھی تو میرے رشتہ تقدیر میں کوئی گرہ موجود ہی نہ تھی۔ اب ناخن عقدہ کشائی کی قوت سے محروم ہو گیا تو مصیبتوں کا طوفان امنڈ آیا۔ یوں بیمار کی اور عاجزی کی حالت پیدا ہو گئی۔

خواہہ حال فرماتے ہیں :

”دوسرے مصرع میں یہ معنوں ادا کیا گیا ہے کہ جب مشکلات نے نہیں گھیرا تھا، اس وقت ان کے دفع کرنے کی طاقت تھی۔“

۱۔ شرح : ہمدے ۔
 گھر کی دیرانی تو بہر حال میں عقدہ تھی، اس میں ہمدے رونے کا کوئی دخل نہیں اب تو سمجھا جاتا ہے کہ ہمدے رونے سے نیل آگیا اور گھر تباہ ہو گیا، لیکن اگر ہم ضبطِ گری سے کام لیتے تو گھر پھر بھی دیران ہو جاتا۔ اس کی مثال یوں سمجھنی چاہیے کہ سندھ سندھ ہوتا اور اس کا پانی بالکل خشک ہو جاتا تو اس کی جگہ بیابان نکل آتا، جہاں خاک اڑتی۔ پانی کی فراوانی بھی بربادی کا باعث ہے اور پانی کے ناپید ہو جانے کا نتیجہ بھی بربادی کے سوا کچھ نہیں۔

۲۔ شرح : ہم دل کی تنگی کا گلہ کیا کریں ؟ اس کم بخت کی حالت ایسی ہے کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشان ہوتا۔ تنگی اور پریشانی متضاد کیفیتیں ہیں۔ اگر ایک تھا

نہ ہوتی تو اس کی جگہ دوسری بے یقینی تفسیر دونوں کا ایک ہے یعنی رنج و ملال ۔

۳۔ لغات - درج : پرہیزگاری

رضوان : بہشت کا دربان -

شرح : غالب اکثر اپنے شعروں میں بعض باتیں مقصد چھوڑ جاتے ہیں، جو بیک نظر واضح ہو جاتی ہیں۔ اس شعر میں بھی ایک حصہ مقدر ہے، یعنی ہم نے محبوب کے دربان کی ہزاروں منتیں کیں۔ اس سے مسلسل التجائیں کرتے رہے۔ محبوب سے دلی عقیدت و پرستاری کا واسطہ دیتے رہے، مگر اس نے کوئی بات نہ سنی اور ہمیں بار بار کا موقع ہی نہ دیا۔ کاش، رضوان محبوب کے گھر کا دربان ہوتا، کیونکہ وہ تو تقویٰ اور پرہیزگاری میں ایک عمر گزار دینے کے بعد بہشت کے اندر داخلے کی اجازت دے دیتا ہے۔ اگر اسے محبوب کے گھر کی درباری کا منصب حاصل ہوتا تو یقیناً ہم سے وہ سلوک نہ کرتا، جو محبوب کے دربان نے کیا۔



۱۔ شرح :- خواجہ حالی اس شعر کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

” بالکل نئے طریق سے نہایت کوہستی پر ترجیح دی ہے اور ایک عجیب و غریب پر معصوم محض ہونے کی تمنا کی ہے۔ پہلے مصرع کے معنی تو ظاہر ہیں۔ دوسرے مصرع سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبلویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر نہ گنا
نہ ہوتا اگر جدا تین سے، تو زانو پر دھرا ہوتا۔

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے

وہ سہراک بابت پر کہنا، کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

اگر میں نہ ہوتا تو کیا برائی ہوتی، مگر قائل کا مقصود یہ ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو دیکھنا چاہیے کہ میں کیا چیز ہوتا، مطلب یہ کہ خدا ہوتا، کیونکہ پہلے مصرع میں بیان ہو چکا ہے کہ اگر۔

کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا۔

مقصود یہ ہے کہ وجود حقیقی ایک ہے اور وہ خدا ہے۔ اسی مبدائے فیض سے ہر وجود پیدا ہوا، جس کی بستی عارضی ہے۔ اگر یہ وجود پیدائے ہوتے تو مبدائے حقیقی میں شامل ہوتے اور اس کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ کیونکہ جب کچھ نہیں تھا تو خدا تھا اور کچھ نہ ہوتا تو اس حالت میں بھی خدا ہوتا۔

۲۔ شرح :- جب غم کی فراوانی نے سر کو بے حس بنا دیا اور احساس کی صلاحیت ہی اس میں نہ رہی تو اس کے کٹ جانے کا کیا غم ہو سکتا ہے، کیونکہ اگر یہ تن سے عباد نہ ہوتا تو بے حس و حرکت ہونے کے باعث ذالو پر دھرا رہتا۔
اس میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ جب کوئی چیز بے حس اور سُنی ہو جائے تو اس کے کٹنے کا بھی کوئی احساس نہیں ہوتا۔

۳۔ شرح :- مدت ہوئی کہ غالب کا انتقال ہو چکا ہے، لیکن وہ اس لیے بار بار یاد آتا ہے کہ ہر بات پر کہا کرتا تھا: "یوں ہوتا تو کیا ہو جاتا"
"یوں ہوتا تو کیا ہو جاتا" سے مختلف پہلو نکالے جا سکتے ہیں، مثلاً کسی کو کوئی صدمہ پیش آ گیا اور اس نے غالب سے ذکر کرتے ہوئے کہا کہ بھائی! میں تو مصیبت کا شکار ہو گیا۔ غالب نے اس کی توجہ اصلی واقعے کی طرف سے منحط کرتے ہوئے کہا کہ اگر یوں نہ ہوتا اور یوں ہوتا تو کیا ہو جاتا؟

دوسرا پہلو یہ ہے کہ کڑید غالب کی ایک فطری خصوصیت تھی۔ اسی بنا پر وہ ہر واقعے کے متعلق کہا کرتا تھا کہ اگر یوں ہوتا تو کیا ہوتا۔ کڑید کے علاوہ اس میں تمنتا و ارمان کا پہلو بھی نکلتا ہے۔



۱۔ شرح :- عباد آگئی ہے

باغ کی زمین کا کوئی بھی ذرہ بیکار اور

جوشِ نو سے خالی نہیں رہا۔ بلکہ جگہ کثرت

یک ذرہ زمین نہیں بے کار باغ کا

یاں جادہ بھی، فقید ہے لے کے باغ کا

بے غے کسے ہے طاقب آشوب آگہی
 کھینچا ہے عجز حوصلہ نے خط ایام کا
 بلبل کے کاروبار پر ہیں، خندہ ہائے گل
 کہتے ہیں جس کو عشق، غل ہے دماغ کا
 تازہ نہیں ہے، نقشہ فکر سخن مجھے
 تریاکی قدیم ہوں دو چرخ سراغ کا
 سو بار بند عشق سے آزاد ہم ہوئے
 پر کیا کریں، کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا
 بے خون دل ہے چشم میں عروج نگہ غبار
 یہ بے کدہ خراب ہے، بے کے سراغ کا
 باغِ گفستہ تیرا، بناطِ نشاطِ دل
 ابر بہار، خم کدہ کس کے دماغ کا

سبزہ ابد بھول موجود ہیں۔ نوکی
 فراوانی سے روشنی کی یہ حالت
 ہو گئی کہ پاؤں دھرنے کو جگہ نہیں
 ملتی اور غالی جگہیں اس درجہ محدود
 ہو گئی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ
 روشیں نہیں، بلکہ دماغ کا رے
 چراغوں کے بیسے قدرت نے تہوں
 کا انتظام کر دیا ہے۔

ندیش بالکل تنگ ہو تو چراغ
 کی ہن سے اس کی تشبیہ نہایت موزوں
 اور بالکل اچھوتی ہے۔ صاف ظاہر
 ہوتا ہے کہ اس تنگ اور محدود جگہ
 میں بھی جوشِ خرو پا یا جاتا ہے جس
 طرح بجی شعلے کی بدولت روشنی کا
 سرو سامان کرتی ہے۔

شعر آبر بہار، پھولوں کی
 کثرت، رنگ و بو کی فراوانی اور
 نوکی بہشت کی ایک عمدہ تصویر ہے

۲۔ لغات : آشوب : فتنہ، ہنگامہ، طوفان، جوش و خروش۔

آگہی : شعور، واقفیت، ہوشیاری، علم

ایام : شراب کا پایال، خط سے مراد وہ خطوط ہیں، جو شراب کی مقدار جانچنے

کے لیے پیالے میں لگا دیئے جاتے تھے اور آج کل بھی یہ پیمانہ میکروں اور واخانوں
 میں استعمال ہوتا ہے۔

کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا۔

مفہم یہ ہے کہ وجود حقیقی ایک ہے اور وہ خدا ہے۔ اسی مبدائے فیض سے ہر وجود پیدا ہوا، جس کی بستی عارضی ہے۔ اگر یہ وجود پیدائہ ہوتے تو مبدائے حقیقی میں شامل ہوتے اور اس کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ کیونکہ جب کچھ نہیں تھا تو خدا تھا اور کچھ نہ ہوتا تو اس حالت میں بھی خدا ہوتا۔

۲۔ **شرح :-** جب غم کی فراوانی نے سر کو بے حس بنا دیا اور احساس کی صلاحیت ہی اس میں نہ رہی تو اس کے کٹ جانے کا کیا غم ہو سکتا ہے، کیونکہ اگر یہ تن سے مبدائہ ہوتا تو بے حس و حرکت ہونے کے باعث ذالو پر دھرا رہتا۔
اس میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ جب کوئی چیز بے حس اور شن ہو جائے تو اس کے کہنے کا بھی کوئی احساس نہیں ہوتا۔

۳۔ **شرح :-** مدت ہوئی کہ غالب کا انتقال ہو چکا ہے، لیکن وہ اس لیے بار بار یاد آتا ہے کہ ہر بات پر کہا کرتا تھا: "یوں ہوتا تو کیا ہو جاتا"۔
"یوں ہوتا تو کیا ہو جاتا" سے مختلف پہلو نکالے جا سکتے ہیں، مثلاً کسی کو کوئی صدور پیش آ گیا اور اس نے غالب سے ذکر کرتے ہوئے کہا کہ بھائی! میں تو مصیبت کا شکار ہو گیا۔ غالب نے اس کی توجہ اصل واقعے کی طرف سے منطفہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر یوں نہ ہوتا اور یوں ہوتا تو کیا ہو جاتا؟

دوسرا پہلو یہ ہے کہ کڑید غالب کی ایک فطری خصوصیت تھی۔ اسی بنا پر وہ ہر واقعے کے متعلق کہا کرتا تھا کہ اگر یوں ہوتا تو کیا ہوتا۔ کڑید کے علاوہ اس میں تہنوار و ارمان کا پہلو بھی نکلتا ہے۔



۱۔ **شرح :-** مہار آگئی ہے
ایک ذرہ زمین نہیں بے کار باغ کا
باغ کی زمین کا کوئی بھی ذرہ بیکار اور
یاں مہار بھی، فقید ہے لائے کے باغ کا
جوشِ نود سے خالی نہیں رہا۔ بلکہ جگہ بہ جگہ

بے غم کسے ہے طاقت آشوب آگہی
 کھینچا ہے عجز حوصلہ نے خط ایان کا
 بیل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
 کہتے ہیں جس کو عشق غفل ہے دماغ کا
 تازہ نہیں ہے نشہ فکر سخن مجھے
 تریاکی قدیم ہوں دو دھپ سراغ کا
 سو بار بند عشق سے آزاد ہم ہوئے
 پر کیا کریں کہ دل ہی عدد ہے فراغ کا
 بے خون دل ہے چشم میں عروج نگہ غبار
 یسے کدہ خراب ہے سنہ کے سراغ کا
 بارِ شگفتہ تیرا، بناط کشا طِ دل
 ابر بہار، خمدہ کس کے دماغ کا

سبزہ اور پھول موجود ہیں۔ نوکی
 فراوانی سے روشنی کی یہ حالت
 ہو گئی کہ پاؤں دھرنے کو جگہ نہیں
 ملتی اور خالی جگہیں اس درجہ محدود
 ہو گئی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ
 روشنی نہیں، بلکہ دماغ کا لہ کے
 چرخوں کے لیے قدرت نے قیوں
 کا انتظام کر دیا ہے۔

نورِش بالکل تنگ ہو تو چراغ
 کی بتی سے اس کی تشبیہ نہایت موزوں
 اور بالکل اچھوتی ہے۔ صاف ظاہر
 ہوتا ہے کہ اس تنگ اور محدود جگہ
 میں بھی جوشِ نور پا یا جاتا ہے جس
 طرح جتنی شکل کی جدت روشنی کا
 سرو سامن کرتی ہے۔

شعر آبر بہار، پھولوں کی
 کثرت، رنگ و بو کی فراوانی اور
 نوکی بہتات کی ایک عمدہ تصویر ہے

۲۔ لغات : آشوب : فتنہ، ہنگامہ، طوفان، جوش و خروش۔

آگہی : شعور، واقفیت، ہوشیاری، علم

ایان : شراب کا پیالہ، خط سے مراد وہ خطوط ہیں جو شراب کی مقدار یا پختے
 کے لیے پیالے میں لگا دیئے جاتے تھے اور آج کل بھی یہ پیمانہ میکروں اور دواخانوں
 میں استعمال ہوتا ہے۔

مختصر شرح : شراب سے پرست ہونے بغیر حقائق کا ثابت کے متعلق مشور اور علم کا فتنہ و بگاڑ کس کا دل برداشت کر سکتا ہے ؟ لیکن مصیبت یہ ہے کہ شراب پالنے والے بے حوصلگی و کم ظرفی سے کام لیتے ہیں۔ وہ تپ تول و مشقتوں کے خط و کھدے کر شراب پلاتے ہیں، جس سے وہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی کہ آشوب علم و آگاہی کا دکھ درد و دب ہائے۔ مثلاً یہ دکھ کہ یہاں کی زندگی عارضی ہے اور انسان کو جلد رخت سفر باندھ کر دوسری دنیا کی طرف روانہ ہونا ہے یا یہ دکھ کہ جن عزیزوں اور دوستوں سے ہمیں محبت ہے وہ بھی ہماری طرح آگے پیچھے یہاں سے رخصت ہو جائیں گے اور ہمیں ان کے فراق کا داغ برداشت کرنا پڑے گا۔ یہ دکھ کہ دنیا میں حقیقی دوستی اور وفاداری بالکل ناپید نظر آتی ہے یہ اور اس قسم کی تمام چیزیں انسان کے لیے دکھ۔ پریشانی اور اذیت کا باعث ہوتی ہیں۔ شراب ہوش و حواس سے عاری کر دینے کا ایک ذریعہ ہے اور اس نہ پر سے کام لے بغیر حقیقتوں کا تحمل ممکن ہی نہیں۔ مرزا نے ایک اور شعر میں بھی اسی قسم کا خیال ظاہر کیا ہے۔ اگرچہ اس میں مراعات علم و آگاہی کا ذکر نہیں آیا :

مے سے غرض نشاط ہے کس رو بہ کو

اک گوند بخوردی بجھے دن رات چاہیے

صرف وہ شے اچھے اک گوند بخوردی قرار دیا گیا ہے، علم و آگاہی کے فتنہ و آشوب کو قابل برداشت بنا سکتی ہے۔

۲۔ لغات : کاروبار : مشغولیتیں، حرکتیں، پیشہ

شرح : ۱۔ بیل بھولوں کے ساتھ عشق کے باعث دیوانی ہو رہی ہے۔

اور بے اختیار آہ و فغاں کر رہی ہے، لیکن بھول اس کی ان حرکتوں اور مشغولیتوں کی ہنسی اٹا رہے ہیں۔ نہ بیل کو اس حالت کا کوئی احساس ہے اور نہ بھول ہنسی منہ کر لینے پر آمادہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے، جس شے کو عشق کہتے ہیں، وہ دلچسپی کی خواہش اور فتنہ کے سوا کچھ نہیں۔ خصوصیت سے اس لیے کہ عموماً دیوانوں ہی کی ہنسی

باقی ہے۔

۴۔ لغات۔ تریاکی : یہ لفظ تریاک سے بنا ہے، جسے ”ک“ اور ”ق“ دونوں سے لکھتے ہیں۔ بہارِ نجم کا بیان ہے کہ تریاک کو انیون کے معنی میں استعمال کرنا بعد کا واقعہ ہے، پہلے بعض زہر مٹھو کے معنی تھے، لہذا یہاں تریاکی بہ معنی انیون ہے۔
بقول طباطبائی دو معنی دھواں استعارہ ہے فکرِ سخن کا اور چراغ استعارہ ہے کلام روشن کا۔

شرح :- میں نے حال میں شعر کہنا شروع نہیں کیا، فکرِ سخن کا نشہ تو بہت پرانا ہے، یعنی میں رت سے انیون پیدا آتا ہوں اور روشن کلام کے لیے ابتدا سے فکر کا عادی ہوں۔

ایک تعبیر یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تریاک سے چندو مراد لیا جائے۔ چندو انیون کو پانی میں پکا کر بناتے ہیں اور بائس کی ایک نالی سے، جس کے ایک طرف چلم سی۔ سی ہوتی ہے۔ حقہ کی طرح پھینے ہیں۔ چراغ کی نو سے چندو کو آگ دی جاتی ہے چندو سال پیشتر تک جنوبی ہند کے مختلف حصوں اور چین میں اس کا دستور عام تھا۔ چندو پیچنے والا چند کش لے کر بالکل بیہوش سا ہو جاتا تھا اور بعض اوقات چندو چلانے والے اس کا مال و متاع بھی ہتھیالیتے تھے۔

اگر انیون کی جگہ بیاں چندو سمجھا جائے تو اس صورت میں شعر کی مناسبتیں زیادہ واضح ہو جاتی ہیں۔ معنی دونوں صورتوں میں وہی ہیں، جو اوپر بیان کیے گئے ہیں۔

۵۔ لغات۔ فراغ : آزادی۔ بے فکری۔ فراغت۔

شرح :- سو مرتبہ ہم عشق کی بندشوں سے آزاد ہوئے، لیکن کیا کریں، ہمارے دل کو آزادی اور بے فکری سے اتنی دشمنی ہے کہ وہ پھر کوئی شکوئی آفت اور الجھن پیدا کر لیتا ہے۔

بیاں بندِ عشق سے مراد عشقِ حقیقی نہیں، بلکہ معاملاتِ دنیا کا عشق ہے۔ یعنی کئی مرتبہ ہم نے دنیا کی الجھنوں سے دامن چھڑایا، لیکن دل پھر اسی جال میں جا

پتا ہے :-

۶۔ **شرح :** مولانا حسرت موہانی اس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں ،
 شاعر : دل میں خون کے نہ ہونے کا شاک ہے ، یعنی چاہتا ہے ، آنکھ
 میں اشکوں کی راہ خونِ دل آئے ، مگر نہیں آتا ۔ پس آنکھ میں موجِ نگاہ
 غبار بن گئی ، یعنی خونِ دل کے بغیر کچھ نظر نہیں آتا ۔ پھر خونِ دل کو
 مکرر یہ طورِ تشبیہ باذہما ہے اور کہتا ہے کہ یہ میکہ (آنکھ) سے (خونِ دل)
 کے تختس ہی میں خراب ہے ۔ شہد لے تو آباد ہو اور خونِ دل
 آئے تو غبارِ دُور ہو ، کیونکہ تری سے غبار دور ہو جاتا ہے ۔ بہت
 پہلو دار اور نہایت نازک و پلغ مضمون ہے ۔

مطلب یہ ہے کہ جس آنکھ سے خونِ دل نہیں پتا ، وہ اس لیے اندھی ہو جاتی
 ہے کہ اس میں نگاہ کی لہریں غبار بن جاتی ہیں اور قوتِ بینائی ختم ہو جاتی ہے ۔ آئندہ
 یہ ہے کہ یہ شرابِ خانہ (آنکھ) پھر شراب (خونِ دل) سے آباد ہو ، اس کی خرابی
 اور دیرانی کی حالت ختم ہو جائے ۔ نگاہِ غبار کی لہر نہ رہے ، بلکہ واقعی نگاہ بن جائے
 جس کا جوہر کمالِ بینائی ہے ۔

۷۔ **شرح :** تیرے حسن کا سرسبز و شاداب اور شگفتہ باغ میرے دل کی
 خوشی اور راحت کا سر و سامان ہے ۔ باقی رہا موسمِ بہار کا بادل تو کون کہہ سکتا ہے
 کہ یہ کس کے ذوق کا شرابِ خانہ ہے ، مجھے تو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ، کیونکہ میری
 تو بہرِ راحت تیرے ہی باغِ حسن سے وابستہ ہے ۔

الفاظ کی مناسبت ظاہر ہے اور مرزا غالب کا شاید ہی کوئی شعر ہو جو اس
 مناسبت سے خالی نظر آئے ۔ یہاں محکمہ یعنی شرابِ خانہ ابرِ بہار کی مناسبت سے
 لانے میں اور باغ سے نشے کی مناسبت بھی مزاحِ تشریح نہیں ۔

وہ مری پیمیں جبیں سے، غم پنہاں سمجھا
 رازِ مکتوب بہ بے ربطی عنوان سمجھا
 یک الف بیش نہیں، بصیقل آئینہ ہمنوز
 چاک کرتا ہوں میں، جب سے کہ گریباں سمجھا
 شرح اسباب گرفتارِ محی خاطر، مت پوچھ
 اس قدر تنگ ہوا دل، کہ میں زنداں سمجھا
 بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرم خرام
 روح پہ ہر قطرہ عرق، ویدہ حیراں سمجھا
 مجھ سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہو گا
 نبضِ خس سے تپشِ شعلہ سوزاں سمجھا
 سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
 ہر قدم سائے کو میں اپنے شیتان سمجھا
 تھا گریزاں مژدہ یار سے دل تادم مرگ
 دفعِ پیکانِ قضا، اس قدر آساں سمجھا
 دل دیا جان کے کیوں اس کو دنا دار اسد
 غلطی کی کہ جو کافر کو مشکاں سمجھا

۱۔ شرح :- محبوب نے
 میری پیشانی پر شکلیں پڑی ہوئی
 دیکھیں تو سمجھ گیا کہ مجھے غم نے
 بری طرح تار کھا ہے۔ حالانکہ
 میں نے غم کو ضبط کرنے اور
 چھپائے رکھنے میں کوئی دقیقہ
 فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ یہ ایسی
 ہی بات ہوئی، جیسے کسی خط کا
 سرنا مہر بے ربط سا ہو اور دیکھیں
 اندازہ کیسے کہ خط کا مستنون
 کیا ہو گا۔

مطلب یہ ہے کہ عاشق نے
 تو ضبط میں کوئی کوتاہی نہ کی اور
 اس کی کوشش یہی تھی کہ غم
 کا راز محبوب پر ظاہر نہ ہو بلکہ
 پیشانی کی شکلوں نے یہ راز فاش
 کر دیا۔ شعر میں پیشانی کی شکلوں
 کو سرنا سے کی ربطی ہے اور غم
 پنہاں کو رازِ مکتوب سے تشبیہ
 دی گئی ہے۔

۲۔ شرح :- خود مرزا
 غالب اس کی شرح کرتے ہوئے
 لکھتے ہیں :

پہلے یہ سمجھنا چاہئے کہ آئینہ عبادت فولاد کے آئینے سے ہے اور نہ جلی
آئینوں میں جو ہر کہاں اور لاکھ کو صیقل کون کرتا ہے۔ فولاد کی جن چیزوں
کو صیقل کرو گے، بے شبہ پہلے ایک لکیر پڑے گی۔ اسے الف صیقل
کہتے ہیں، جب یہ مقدار معلوم ہو تو اب اس مفہوم کو سمجھیے۔

چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا
یعنی ابتداء سے حق تہیز سے مشق جنون ہے۔ اب تک کمالِ فن حاصل
نہیں ہوا۔ آئینہ عام صاف نہیں ہو گیا۔ بس وہی ایک لکیر صیقل
کی موجود ہے۔ چاک کی صورت الف کی سی ہوتی ہے اور چاک جیب
آئینہ جنوں میں سے ہے۔

مطلب یہ ہے کہ تمیز اور شعور پیدا ہوتے ہی حیرت، گریباں چاک کرنے میں شروع
ہو گیا اور آئینے کو جلا دینے اور رنگ صاف کر دینے میں لگ گیا، لیکن اب تک
صرف اتنا ہی ہو سکا کہ آئینے میں صفائی کی صورت ایک لکیر پڑی ہے، جسے صیقل
الف صیقل کہتے ہیں۔

مولانا طباطبائی شعر کا مطلب یوں فرماتے ہیں، جب سے مجھے اتنا شعور پیدا
ہوا کہ دنیا کے تعلقات قائم رکھتے ہوئے صفائے نفس حاصل نہیں ہو سکتی، میں نے
دنیا کو چھوڑ دیا اور دل کے آئینے کی صفائی میں مصروف ہو گیا، لیکن اب تک یہ آئینہ
پوری طرح صاف نہیں ہوا، البتہ اس میں صفائی کی ابتدائی علامت پیدا ہو گئی ہے۔
مصنوع کا اصل نود اس نکتے پر ہے کہ شعور و تمیز پیدا ہوتے ہی یہ کام شروع
کر دیا۔

۳۔ شرح :- میرے دل کے رنج و غم اور گرفتگی کے اسباب نہ پوچھیے
دل اتنا تنگ ہو گیا ہے کہ میں نے سمجھ لیا، یہ دل نہیں قید خانہ ہے۔

چونکہ قید خانے میں قیدی تنگ رہتے ہیں اور اس میں بجائے خود جہنم شوق کا
پہلو نمایاں ہے، اس لیے اسے دل تنگی کی موزوں تشبیہ مان لیا گیا۔

۴۔ شرح : میری یعنی عاشق کی بدگمانی کا یہ عالم ہے کہ گوارا نہیں، محبوب باہر نکل کر خرام تاز میں مصروف ہو۔ کیونکہ وہ چھل قدمی شروع کرے گا تو نزاکت کے باعث روئے انور پر پسینے کے قطرے آ جائیں گے اور مجھ یہ گمان ہو گا کہ یہ پسینے کے قطرے نہیں، بلکہ دیکھنے والوں کی آنکھیں ہیں، جو محبوب کا حسن دیکھ کر حیرت سے کھل کی کھل رہ گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ شعر مرزا غالب کے قول کے مطابق کوہ کندن دکاہ بر آوردن کا مصداق ہے۔

۵۔ شرح : میں نے اپنی عاجزی سے جان لیا کہ محبوب تند خو اور شد مزاج ہو گا۔ مثال یوں سمجھئے کہ تنکے کی بنف دیکھ کر جلتے ہوئے شعلے کی حرارت، گرمی اور تپش کا اندازہ کر لیا جائے۔

بیاں اپنے عجز کو خس سے اور محبوب کی برخوئی کو شعلہ سوزاں کی تپش سے تشبیہ دی۔

۶۔ لغات - شبستان : خواب گاہ۔ رات کو آرام کرنے کی جگہ۔

شرح : عشق کی منزل میں سفر کرتے کرتے منعف سے میرا یہ حال ہو گیا کہ ہر قدم پر اپنے ہی سایے کو خواب گاہ سمجھتا رہا۔

ظاہر ہے کہ عشق کا سفر دشت و بیاں ہی میں ہو سکتا تھا، جہاں دور و در تک مکان یا درخت کا نشان تک نہ تھا۔ اور منعف کو ایک قدم بھی اٹھانا گوارا نہ تھا۔ اس بیکی اور بے سامانی کے عالم میں اپنا ہی سایہ آرام گاہ معلوم ہونے لگا۔ شعر میں منعف اور بے سامانی کا نقشہ عجیب انداز میں کھینچا گیا ہے۔ نیز اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سفر عشق کس قدر لمبا، قوت و طاقت کھینچ لینے والا اور مصیبت خیز ہوتا ہے۔

۷۔ شرح : دل محبوب کی پلکوں کے تیر سے بچنے کی کوشش براہر کرتا رہا۔ لیکن تک کہ موت آ گئی، لیکن یہ تیر تو قضا کا تیر تھا، جس سے بچنا ممکن ہی نہ تھا، مگر دل نے نامہی سے بچنا آسان سمجھ لیا۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ زندگی میں کوئی دل لگن کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لگن ہی زندگی کا جو ہر ادا اس کی خوبی ہے۔ کوئی چاہے بھی تو اس سے محفوظ رہتا ممکن نہیں، البتہ موت آجائے تو لگن کا سوال ہی باقی نہیں رہے گا۔

۸۔ شرح : اے استاد! تو نے کیوں محبوب کو وفادار سمجھ کر دل دے دیا ہے تو ایسی غلطی تھی، جیسے کسی کا دُر کو مسلمان سمجھ لیا جائے، یعنی محبوب سے وفا کی امید کبھی نہ رکھنی چاہیے، جس طرح کافر سے اسلام و ایمان کی امید نہیں رکھی جاسکتی۔ لطف یہ کہ جب تک محبوب بے وفا ہے، عشق کی گرجو شنی اور ہنگامہ خیزی قائم ہے۔ محبوب وفا پر آمادہ ہو جائے تو عشق کی آگ خود بخود خاموش ہو کر رہ جائے گی۔



دل جگر تشنہ فریاد آیا	پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا	دم لیا تھا نہ قیامت نے ہمنواز
پھر وہ نیزنگِ نظر یاد آیا	سادگی ہائے تنہا یعنی
نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا	غذروا ماندگی اے حسرتِ دل
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا	زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
گھر تو اخلاص میں گریا دیا	کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا	آہ وہ جراتِ فریاد کہاں
دل گم گشتہ مگر یاد آیا	پھر ترے کو چے کو جاتا ہے خیال
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا	کوئی دیرانی سی دیرانی ہے!

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد سنگ اٹھایا تھا کہ سر یا آبا
۱۔ لغات : جگر تشنہ : تشنہ جگر جس کا جگر پایسا ہو یعنی پیاس
کی آخری حد۔

شرح : میرے دل میں فزاید کی انتہائی پیاس اور تڑپ پیدا ہوئی۔
ساتھ ہی رونے والی آنکھ یاو آگئی اور میں نے سمجھ لیا کہ دل کی اس پیاس اور
تڑپ کو مرث آنکھ ہی کی اشکباری بجھا اور مٹا سکتی ہے۔

۲۔ شرح :۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں :
"دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گزری تھی اور جو اس کے
چلنے جانے کے بعد وہ رو کر یاد آتی ہے۔ اس میں جو کبھی کبھی کچھ وقف ہو جاتا ہے اسے
قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا۔ ایسے بیخ شعر اور دوزبان میں کم دیکھے گئے ہیں جو
حالات فی الواقع ایسے موقع پر گزرتی ہے، ان دوسروں میں اس کی تصویر کھینچ دی
ہے جس سے بہتر کسی اسلوب بیان میں یہ مضمون ادا نہیں ہو سکتا :

تیرے رخصت ہونے پر میرے لیے قیامت آگئی۔ ابھی وہ قیامت ٹھہری اور
رک نہ تھی کہ پھر تیرے رخصت ہونے کا وقت ذہن میں تازہ ہو گیا اور قیامت از
سر نو برپا ہو گئی۔

۲۔ لغات - نیرنگ : جادو، طلسم، فریب، حیلہ، حجاب و غرائب
نائب نے شعر میں نیرنگ، نظر کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اسے نیرنگ نظر پر لانا
یعنی پڑھا جا سکتا ہے، تاہم وہ محبوب، جس کی نظر سرا پا طلسم اور سرا پا فریب ہے
نیرنگ نظر (بہ امتیاز) بھی پڑھ سکتے ہیں، یعنی وہ محبوب، جو نظر کے لیے سرا پا
طلسم اور سرا پا فریب ہے۔

شرح :۔ میری تنہا کی سادگی اور خواہش و آرزو کے جھوپن کو دیکھیے کہ پھر
وہی محبوب یاد آگیا، جس کی نظر سرا پا طلسم اور سرا پا فریب ہے۔
تنہا کی سادگی یہ ہے کہ جو اپنی خصوصیات کے اعتبار سے کوئی آرزو پوری نہیں

کر سکتا اور اس کے لئے کوئی امید رہ نہیں آ سکتی، اسی کی تمنا کی جا رہی ہے اور اسی سے لطف و نوازش کی امید رکھتی جا رہی ہے۔

۴۔ لغات : واما ندگی : بچا دگی، بے بسی، مجبوری۔

شرح :- اسے دل کی حسرت ! میری بچا دگی اور مجبوری کا عند قبول کرے میں آہ و فغاں کے لیے تیار تھا مگر جگر کا خیال آ گیا کہ وہ تو ایک ہی آہ میں پھٹ جائے گا۔

واما ندگی کا نقشہ چند ہی لفظوں میں کس درجہ ناد و طریقے پر کھینچ دیا کہ ایک طرف دل کی حسرت آہ و فغاں کا تقاضا کر رہی ہے اور اس کے بغیر وہ پوری نہیں ہو سکتی، دوسری طرف جگر کا معاملہ سامنے ہے کہ وہ آہ و فغاں برداشت نہیں کر سکتا۔

۵۔ شرح : زندگی تیری گزر گاہ کی یاد کے بغیر بھی بسر ہو ہی جاتی، لیکن اس یاد نے مجھے انتہائی رنج و الم کا تھنہ مشق بنا دیا۔ سوچتا ہوں کہ یہ یاد میرے دل میں کیوں تازہ ہوتی ؟

شرح میں گزر جانے کا مفہوم "مر جانا" نہیں، جیسا کہ بعض شارحین نے سمجھا "بسر ہو جانا" ہے۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ گزر گاہ محبوب کی یاد کیوں تکلیف داذیت کا باعث بنی ہے حسرت کے نزدیک وہ گزر یاد آنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عاشق گھر چھوڑ کر دیدار کے شوق میں گزر گاہ پر جا بیٹھا کہ گھر میں بھی بہر حال انتظار ہی انتظار ہے یہی انتظار گزر گاہ پر کرے گا۔ مولوی عبد العلی وادہ کا خیال ہے کہ عاشق کی زندگی کے کچھ دن محبوب کی گزر گاہ پر بسر ہوئے تھے اور وہ دور یاد آ گیا، جس کی وجہ سے زندگی کا گزر نا دشتوار ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ گزر گاہ محبوب کی یاد تازہ ہونا اس وجہ سے ناقابل برداشت ہو گیا کہ وہ گزر گاہ رقیب کے گھر کو جاتی تھی۔ یا رقیب کا گھر اس گزر گاہ پر تھا۔ عاشق سب کچھ برداشت کر سکتا ہے، مگر رقیب پر محبوب کا خفیہ سا بھی التفات برداشت نہیں کر سکتا، گزر گاہ یاد آنے کے خلاف فریاد کا اصل سبب یہی معلوم ہوتا ہے۔

۶۔ شرح :- فرماتے ہیں 'اے محبوب! تیرے گھر کی بہار، رونق اور دلکیزی بہشت میں کہاں ہوگی؟ میں وہاں بیچوں گا اور تیرے گھر کی یاد تازہ ہوگی تو بہشت کے دربان سے لادنا میری لڑائی شروع ہو جائے گی اور نہایت ہنگامہ خیز لڑائی ہوگی۔ لڑائی کے سبب دو ہو سکتے ہیں "اول میں کموں گا، محبوب کا گھر بہشت سے بدتر یا بہتر ہے۔ رمضان کے گا، تم غلط کہتے ہو، بہشت جیسی چیز کہیں موجود نہیں۔ دوسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ میں بہشت سے نکلنا چاہوں گا تاکہ تیرے گھر پہنچ جاؤں اور رمضان روکے گا، مجھے نکلنے نہ دے گا، اس طرح اپنا پانی سے لڑائی کی نوبت ہو جائے گی۔

۷۔ شرح :- جب میرے پہلو میں جگر سیج سالم موجود تھا تو اس کے بل بوتے پر جس طرح چاہتا تھا، فریاد کر دیتا تھا۔ اب قوت ہوئی، جگر خون ہو کر رہ گیا، صرف دل میرے پاس رہ گیا۔ اس میں اتنی طاقت ہی نہیں کہ فریاد کی بنیاد بن سکے۔ نیز وہ اس لیے ساتھ نہیں دیتا کہ میں آہ و فریاد کروں گا تو محبوب کی رسوائی ہوگی۔ اس سے سخت تنگ آگیا ہوں اور مجھے جگر یاد آ رہا ہے۔

۸۔ شرح :- میرا خیال پھر تیرے کوپے کی طرف جارہا ہے۔ شاید اسے گرم شدہ دل یاد آگیا اور اس لیے اُدھر جارہا ہے کہ دل دلوں مل جائے گا۔ کیونکہ اس کے گم ہونے کی اور کوئی جگہ تو ہو ہی نہیں سکتی۔

۹۔ شرح :- خواہر عالی فرماتے ہیں :

"اس شعر سے جو معنی فوراً متبادر ہوتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ جس وحشت میں ہم ہیں، وہ اس قدر دیران ہے کہ اسے دیکھ کر گھر یاد آتا ہے، یعنی خون معلوم ہوتا ہے۔ مگر فوراً خود کرنے کے بعد اس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے، ایسی دیرانی کہیں نہ ہوگی، مگر وحشت میں اس قدر دیران ہے کہ اسے دیکھ کر گھر کی دیرانی یاد آتی ہے۔"

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں : "وحشت کی دیرانی میں مبالغہ اس لیے کیا کہ گھر کی دیرانی میں زیادتی لازم آئے، یعنی وحشت میں ایسی دیرانی ہے، جیسی بینہ میرے گھر

میں تھی، گویا یہ تشبیہ معکوس ہے۔"

۱۰۔ **تشریح :** لڑکوں کا عام دستور یہی ہے کہ وہ دیرانوں کو اینٹ پتھر اترتے ہیں۔ اسے استاد میں نے بھی لڑکپن میں عام دستور کے مطابق مجنوں کو اسنے کئیے پتھر اٹھایا، ساتھ ہی مجھے اپنا سراپا یاد آ گیا۔ یعنی یا تو وہ پتھر اپنے ہی سر پر مار دیا، جس سے واضح ہوتا ہے کہ لڑکپن ہی میں مجھے مجنوں شروع ہو گیا تھا یا یہ خیال آ گیا کہ جب مجھ پر اسی قسم کی کیفیت طاری ہوگی تو لڑکے مجھ جیسی طرح اینٹ پتھر ماریں گے۔

مولوی عبدالعلی وآلہ فرماتے ہیں : "اپنے سر کی چوٹ یاد آ گئی، اس لیے طفل میں مجنوں کے سر پر سنگ اندوزی نہ کی۔ گویا قائل نے لڑکپن سے اپنے آپ کو شدیدہ سر فرزن کیا ہے، جس کے سبب سے سبب لفظوں کا مزہ کچھ چکا ہے۔"



۱۔ **لغات :** عنان گیر:

باگ تمام لینے والا۔ روک دینے والا
مانع۔

تشریح : خطاب محبوب سے

ہے۔ فرماتے ہیں : آپ کے آنے میں

دیر ہو گئی، مگر اس دیر کا کوئی نہ کوئی

سبب تو ہونا چاہیے۔ آپ کی سواہی

یقیناً مناسب موقع پر تیار ہو گئی تھی۔

اور آپ حسب وعدہ وقت پر آ سکتے

تھے، لیکن کہیں نے باگ تمام لی اور

آپ کے آنے میں رکاوٹ کا باعث

بنا، اس کشمکش میں دیر ہو گئی۔

شعر میں "کوئی" سے مراد جابر ہے

ہوئی تاخیر، تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا

آپ آتے تھے، مگر کوئی عنان گیر بھی تھا

تم سے بجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ

اس میں کچھ شائبہ خوبی تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں

بکھی فتراک میں تیرے کوئی نہ خیر بھی تھا

قیدیں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد

ہاں کچھ اک رنج گراں باری زنجیر بھی تھا

غیر اور رقیب ہے۔

۲۔ لغات : شائبہ :

آمیزش، عداوت، شک، خشم

تشریح : میلک میں تباہ ہو

گیا۔ لیکن اس کا ہلکا شکوہ تم سے کٹا

تو یہ بالکل بجا اور بے محل ہو گا

کیونکہ اسے محبوب ! تم میری تباہی

کا باعث نہ تھے۔ بلکہ اس میں میری

قنوت کی خوبی بھی کار فرما تھی

گویا یہ تباہی میری تقدیر میں لکھی

ہوئی تھی چہ تو تم سے شکایت کا کون

ساموق ہے۔

بظاہر تقدیر کی خوبی سیار ملنا

استعمال ہوئی اور شعر سے ظاہر ہوتا

ہے کہ غالب کی تباہی کے دو

سبب ہوئے، ایک محبوب دوسرا

تقدیر، لیکن شاعر کی توجہ دونوں

میں سے خوبی تقدیر کی طرف زیادہ ہے

۳۔ لغات : فتراک :

شکار بند گھوڑے کی زین سے

لگے ہوئے چرٹے کے تھے، جن

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا

بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر بھی تھا

یوسف اس کو کہوں، اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی

گر بڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا

دیکھ کر غیر کو ہو گیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا

نالہ کرتا تھا وے طالب تاثیر بھی تھا

پیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام

ہم ہی آشفۂ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی

آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے ہلکتے پر ناحق

آوی کوئی ہمارا دم تحسیر بھی تھا

ریختے کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالب

کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی تیر بھی تھا

میں شکاری شکار باندھ کر لے آتے تھے۔

نچنچیر : شکار

شرح : ممکن نہیں کہ تو مجھے فراموش کر دے۔ اگر فراموش کر گیا ہو تو میں بتا
 جاتا ہوں کہ تیرے شکار بند ہیں کبھی ایک شکار چندھا ہوا تھا۔ میں وہی ہوں۔
 شہر میں دو نکتے خصوصیت سے قابلِ غور ہیں۔ اول پتا بتانے کے سلسلے میں واضح
 کر دیا کہ پہلے بھی محبوب کی طرف سے ظلم و ستم میں کوئی کمی نہ تھی، یہاں تک کہ مجھے شکار
 کے فتر تک میں باز نہ کر دیا۔ دوسرا نکتہ یہ کہ ظلم و ستم سہ لینے کے باوجود محبوب نے مجھے
 فراموش کر دیا تو یہ بھی ظلم ہی ہوگا۔

۴۔ لغات - گراخیاری : جاری ہوتا۔

شرح : تیری محبت کے دیوانے کو زنجیریں پہنا کر قید میں ڈال دیا گیا۔ لیکن
 اس حالت میں بھی زلفِ گرہ گیر کی یاد دستور تازہ رہی۔ البتہ ساتھ ساتھ زنجیر کے بھاری
 ہونے کی بھی قصویٰ سی کیفیت تھی۔

قید، وحشی، زلف اور زنجیر کی مناسبت تشریح کی مناج نہیں۔ جو بات دیوانگی
 کا باعث تھی اور اس لیے قید ہونا پڑا، اس میں کوئی فرق نہ آیا۔ اگر کوئی نئی چیز مومن
 تو صرف یہ کہ زنجیر کا اوجھ مستزاد ہوا۔

۵۔ شرح : خواجہ حاکمی فرماتے ہیں :

”یہاں اس مطلب کو کہ مشرق نے آن کی آن اپنی صورت دکھا دی تو
 اس سے کیا تسلی ہو سکتی ہے، اس طرح ادا کیا ہے، بجیل تک کو نہ گئی
 آنکھوں کے آگے تو کیا۔“

محبوب نے اپنے جمال کی سبب اس طرح دکھائی، جیسے بجیل یکایک آنکھوں کے
 آگے کو نہ جاتی ہے۔ فرماتے ہیں، جدا اس سے میرا دل کیونکر مطمئن ہو سکتا ہے؟ میں
 تو آپ کی باتیں سننے کا بھی پیاسا تھا۔ آپ آئے تھے تو میرے شوق کے مطابق جلوہ
 دکھاتے اور دو چار باتیں کرتے تو کسی قدر تسکین ہوتی۔

خواجہ حاکمی نے غائب کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی ہے کہ آپ نے استعارہ و کنایہ
 و تمثیل کو، جو ادبیت کی مہان اور شاعری کا ایمان ہے، ریختہ میں اپنے فارسی کلام سے

نہایت کم استعمال نہیں کیا۔ روایت گوشتراء نے اس کی طرف کم توجہ کی ہے۔ استاد کے طرف
محدودیت اردو میں بلاشبہ استعمال ہوئے ہیں، لیکن استفادے کے قصد سے نہیں، بلکہ
محدودہ ہندی کے شوق میں استفادے بلا قصد ان کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔
غالب نے ایسے کنیے استعمال کیے جو پوری عبارت اور پورے جملے کی شکل
میں ہوں۔ اردو شاعری میں ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی۔ ایسی ایک روشن مثال یہ شعر
بھی ہے۔

۶۔ لغات : تعزیر : سزا

شرح :- میں نے محبوب کو کہاں حسن کی بنا پر یوسف کو دیا اور اس پہلو کا
خیال نہ کیا کہ حضرت یوسف مصر پہنچے تھے تو عزیز مصر نے انہیں غلام کی حیثیت میں
خرید لیا تھا۔ خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ انہوں نے ہراند مانا اور خیر گزاری۔ اگر وہ ناراض
ہو جاتے اور بگڑ بیٹھتے تو یقیناً میں سزا پانے کے قابل تھا۔
شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ میرا محبوب حسن میں یوسف سے بڑھا ہوا ہے۔
اگر وہ کمتر سے تشبیہ دینے پر بگڑ جاتا تو میں سزا کا مستحق تھا۔

۷۔ شرح : غیر کو دیکھ کر میرا کلیجہ کیوں ٹھنڈا نہ ہو ؟ وہ میری طرح آہ و فغاں
کرنے لگا۔ لیکن اس میں تاثیر کوئی نہ تھی، کیونکہ وہ بچے عشق سے بے بہرہ تھا اور صرف
ہوس اس کے تمام کاموں میں گنزا تھی۔ اس کی آہ و فغاں کو بے اثر دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا
اور میں نے سمجھ لیا کہ وہ بچے عاشق کے طور طریقوں کی پیروی کر کے اس کا درجہ نہیں پا
سکتا، لہذا اس سے پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں اور یہی امر کلیجے کی ٹھنڈک، نیز دل
کے اطمینان کا باعث بن گیا۔

۸۔ لغات : نام رکھنا : عیب لگانا۔ الزام لگانا۔

آشفۃ سر : عاشق دیوانہ

جوانمیر : جوان مرگ۔ جوانی میں مر جانے والا۔

شرح : اگر فراد نے تیشہ چلانا اپنا پیشہ بنالیا تو اس میں عیب کی کون سی

بات ہے ؟ اسے الزام کی بنیاد کیوں بناتے ہو ؟ اس کی شان مردانگی پر نظر ڈالو کہ جراتی ہی کے عالم میں انتہائی بے پروائی سے محبوب پر جان قربان کر دی۔ غرض وہ جو انرگ بھی ہمارے ہی دمرے میں شامل تھا، جنہوں نے عشق کو دیوانگی کی مدد تک پہنچا دیا ہے۔

۹۔ لغات : ترکش : تیردان، تیردکھنے کا قول۔

شرح : ہم تو مرنے کے لیے تیار کھڑے تھے اور جان دے دینے میں ہمیں قطعاً دریغ نہ تھا، لیکن محبوب نے ہمارے پاس آنا گوارا نہ کیا اور اس کی تلوار ہماری زندگی کا منیضہ اسی صدمت میں کر سکتی تھی کہ وہ ہمارے قریب ہوتا۔ لیکن اگر اسے کسی وجہ سے ہمارے قریب آنا منظور نہ تھا تو کوئی معنایہ نہ تھا، وہ دور سے ہمیں تیر کا نشانہ بنا سکتا تھا یہ بھی نہ بڑا۔ پھر کیا ہم یہ سمجھیں کہ اس کے ترکش میں کوئی تیر بھی نہ تھا۔

۱۰۔ لغات :- فرشتوں سے مراد وہ فرشتے ہیں جنہیں کراما کا تین کہا جاتا ہے۔ وہ ہر انسان کے دائیں بائیں مقدر ہیں اور اس کی نیکیاں یا بدیاں لکھتے جاتے ہیں۔
 شرح :- خواجہ عالی اس شعر کے سلسلے میں فرماتے ہیں :
 ہمارے جرم کے ثبوت کے لیے کسی کی شہادت ہونی ضرور ہے، امرت فرشتوں کا لکھنا کافی نہیں :-

خدا کے مقدر کیے ہوئے فرشتوں کے متعلق خیال بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ کوئی چیز غلات واقفہ لکھیں گے، لیکن غالب نے شوخی سے کام لے کر اس پورے معاملے کو عام انسانی حدائق کے دستور پر ڈھال دیا۔ یہاں کوئی بیان اُس وقت تک ثبوت کے درجے کو نہیں پہنچتا، جب تک اس کے لیے ایسے گواہ موجود نہ ہوں، جن کی گواہی جھٹلائی نہ جاسکے۔ چنانچہ غالب کہتے ہیں کہ کراما کا تین کے لکھے ہوئے اعمال ناموں پر خواہ مخواہ ہمیں پکڑا اور مجرم ٹھہرایا جاتا ہے، حالانکہ جو کچھ وہ لکھتے ہیں، اس کے ثبوت کے لیے ہمارا بھی کوئی آدمی پاس ہوتا ہے، جس کے دستخط

تصدیق کے طور پر لے لیے جاتے ہوں ؟ اگر ایسا نہیں ہوتا تو فرشتوں کی مکھی ہوئی
تقریر یک طرفہ ہوگی اور اسے مسلم الثبوت نہیں مانا جاسکتا۔

۱۱۔ لغات : ریختہ : اردو کے اشعار۔ اردو کو ریختہ اس لیے کہنے

لگے کہ یہ مختلف زبانوں کی آمیزش سے بنی۔ جیسے دیوار اینٹ، مٹی، پھونے، سفیدی
سے پختہ کرتے ہیں، اردو بھی ہندی، فارسی، ترکی، عربی وغیرہ زبانوں کے الفاظ سے
مکمل ہے۔

شرح : منقطع غریب کہا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اسے غائب! قصیں اردو شاعری

کے استاد نہیں ہو۔ جو زمانہ گزر چکا اس میں اس شاعری کا ایک استاد میر تقی میر بھی تھا۔
بے شک اس میں میر کے کمال سخن کا اعتراف کیا، لیکن غائب کی نکتہ نوازی
ملاحظہ ہو کہ اسے لوگوں کا قول قرار دیا۔ ”کہتے ہیں“ کا صاف مطلب یہی ہے۔

۱۔ لغات : درد شکی مردگان :

لب خشک، درد شکی مردگان کا

وہ لوگ جو پیاسے مر گئے۔ جنہوں نے

زیارت کدہ ہوں، دل آزد و گان کا

پوری مر عشق کی سختیاں سہتے سہتے گزار

ہمہ نا امید ہی ہمہ بد گمانی

دی اور ان کی کوئی بھی آمد و اس زندگی

میں پوری نہ ہوئی۔

میں دل ہوں، قریب وفا خوردگان کا

دل آزد و گان : جن کے دل دکھے

ہوئے ہوں۔ تباہ حال عشاق۔

شرح :- میں ان لوگوں کا خشک لب ہوں، جو پیاسے مر گئے۔ جنہوں نے

عشق و محبت میں سب کچھ شاد دیا اور ان کی کوئی آمد و پوری نہ ہوئی۔ میں ان کی اس کامی

وادیوں کی کھلی ہوئی اور روشن شہادت ہوں، کیونکہ پیاس سے مرے ہوئے لوگوں کی

موت کا سبب اس لب سے ظاہر ہو سکتا ہے، جس پر تڑی کا کوئی نشان نہ ہو۔ اسی

لیے میں ان عاشقوں کی زیارت گاہ بن گیا ہوں، جن کے دل دکھے ہوئے ہیں اور ستر

ثابت قدمی سے گزار دینے کے باوجود ان کی کوئی آرزو بر نہ آئی۔

۲۔ لغات : فرب ونا خوردگاں : دنا کا فرب کھانے ہوئے لوگ
یعنی وہ لوگ جنہیں ابتدا میں یقین ہو گیا تھا کہ محبوب محبت میں دنا داری کا ثبوت
دے گا، مگر اصل میں یہ یقین بے بنیاد تھا۔ وہ لوگ دھوکا کھا گئے اور فرب میں
آ گئے۔

شرح :- میں ان لوگوں کا دل ہوں، جو دنا کا فرب کھا چکے ہیں۔ ایسے
دل میں صرف دو چیزیں باقی رہ سکتی ہیں، اول سراسر نا اُمیدی، دوم سراسر ہنگامی۔
نا اُمیدی اس لیے کہ شروع میں دنا کا یقین پیدا ہوا تھا تو جتنی امیدیں دل
میں تھیں، وہ ایک ایک کر کے خون ہو گئیں۔ ایسا دل پھر کسی امید کا دوا دار نہیں ہو
سکتا اور وہ واقعی سراپا نا اُمیدی بن جاتا ہے۔ ہنگامی اس لیے کہ جب دنا کا یقین
ہوا تھا تو صرف نیک گمان تھا، لیکن جب واضح ہو گیا کہ یہ سراسر دھوکا اور فرب
تھا تو ہنگامی نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ کسی بھی چیز پر نیک گمان پیدا ہونے کی
گنجائش ہی نہ رہی۔

نفسیات کا بڑے سے بڑا ماہر دنا کا فرب کھانے ہوئے لوگوں کی طلب کی
کیفیات کا تجزیہ اس سے بہتر نہیں کر سکتا۔



تو دوست کسی کا بھی ستم گر نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا
چھوڑا میرے خشب کی طرح دستِ قضا نے
خود شہید مہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

۱۔ شرح : اے سنگر !
تو نے کسی سے بھی دوستی کا حق ادا نہ
کیا۔ جو ظلم مجھ پر نہ ہوا، وہ دوسروں
پر کیا گیا۔ آخری مصرع کی مختلف تعبیر
ہو سکتی ہے، مثلاً :

۱۔ جو ظلم مجھ پر نہ کیے، ان کا نشانہ
دوسروں یعنی میرے رفیقوں کو بنایا یہ

اس لیے ستم ہے کہ عاشق کو محبوب
کا ظلم بھی دوسروں پر گوارا نہیں
کیونکہ ظلم و ستم بھی بہر حال
رابطہ و تعلق ہی کی ایک شکل ہے
جس کا اندازہ مرزا نے ایک سے
زیادہ مقامات پر کیا ہے، مثلاً:
لاگ ہواں کو تو ہم سمجھیں لگاؤ

یا

قلع کیجئے نہ تعلق ہم سے
۲۔ مجھ پر تو نے جو ظلم کیے
وہ دوسروں پر نہ ہوئے۔ یعنی
تو نے ظلم تو سب پر کیے اور
تیری ستم گری یقیناً ستم ہے،
اگرچہ مجھے بہت ظلم بننے میں دوسروں
پر امتیاز حاصل ہے۔

توفیق باندازہ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدر یار کا عالم
میں مقتدرِ فتنہ عشر نہ ہوا تھا
میں سادہ دل، آزر دگی یا سے خوش ہوں
یعنی سبقِ شوق مکر نہ ہوا تھا
دریا شے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا
جاری تھی اس دریاغِ جگر سے مرے تھیل
آتش کدہ، جاگیرِ سمن نہ ہوا تھا

۲۔ لغات۔ نخب: ترکستان کا ایک شہر جسے ایرانی نخب اور عربی
نعت کہتے تھے۔ آج کل اس کا نام قرشی ہے۔ یہیں ابن المقفع کا مرکز تھا، جسے
خواساں کا نقاب پوش مدعیِ نبوت قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے یہاں کئی کرشمے دکھا کر
لوگوں کو اپنا معتقد بنالیا تھا۔ ان میں سے ایک چیز کنوئیں سے باہر نکلتی تھی اور لوگ
اسے چاند سمجھتے تھے۔ کیونکہ اس کی شکل چاند سے ملتی جلتی تھی اور اس کی روشنی بھی
معتوڑی دودھ کی ہوتی تھی۔ یہی چاند فارسی اور اردو ادبیات میں مر نخب کہلایا اور
ایرانی ابن المقفع کو سازندہ ماہ یعنی چاند بنانے والا کہنے لگے۔ یہ چاند معتوڑی ہی نبوت
کے بعد پھٹ کر برباد ہو گیا۔

شعر میں سورج کو اس لیے ماؤ خشب سے تشبیہ دی کہ غائب کے نزدیک وہ بھی ابن مقفع کے پانڈ کی طرح ناقص الفہمت ہے۔

شرح : سورج ابھی تک حسن و جمال میں میرے محبوب کے برابر نہیں پہنچا تھا کہ خشب کے پانڈ کی طرح فضا کے ہاتھ نے اسے ناقص بن چھوڑ دیا تاکہ وہ درجہ کمال کو پہنچے، نہ میرے محبوب کے برابر آئے، نہ میرے محبوب کی یکتائی پر کوئی اثر پڑے۔

۳۔ **شرح :** خواجہ حالی مرحوم فرماتے ہیں :

ہاں کل نیا، اچھوتا اور باریک خیال ہے اور نہایت صفائی و عمدگی سے اسے ادا کیا ہے۔ دعوئی ہے کہ جس قدر ہمت عالی ہوتی ہے، اسی کے موافق اس کی تائید خیب سے ہوتی ہے اور محبت یہ ہے کہ نظر کا جیسے آنکھوں میں جگہ ملے ہے۔ اگر اس کی ہمت جب کہ وہ دریا میں تھا، مورتی بننے پر تانی ہو جاتی تو اس کو، جیسا کہ ظاہر ہے، یہ درجہ یعنی آنکھوں میں جگہ ملنے کا حاصل نہ ہوتا۔

شعر کا بنیادی مضمون خواجہ حالی کے ارشاد کے مطابق یہی ہے کہ فطرت ازل سے ہر وجود کی تائید و حمایت اس کی ہمت کے مطابق کرتی ہے۔ انسانوں میں مراتب عمل کا جو فرق ہے، وہ بھی ہمت ہی کی کمی بیشی کا نتیجہ ہے۔ اس کے لیے دلیل ایسی پیش کی جو ہر شخص کی نگاہوں کے سامنے ہے اور اس کے قبول میں کسی کو بھی متعلق نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اگر قطرہ دریا میں رہ کر اور آغوش صدف کی تربیت پا کر مورتی بن جاتا تو اس کے لیے بھی بلند ہی حاصل کرنے کے کوئی موقع تھے، جیسے ہمارے جگہ پا کر حسیںوں کے گلے تک پہنچ جاتا، زبور کی آرائش بن کر کالوں تک رسائی حاصل کر لیتا۔ بادشہوں کے تاج میں شامل ہو کر سر پر پہنچ جاتا، لیکن اس نے ایسی کوئی رخصت قبول نہ کی، کیونکہ اس کی ہمت بہت بلند تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے آسمان بن کر آنکھ میں جگہ پائی اور اس سے بلند تر وہ کوئی نہیں ہو سکتا۔

۴۔ شرح :- قامت محبوب کو عموماً قیامت سے تشبیہ دیتے ہیں، کیونکہ اس کائنات کی کوئی دوسری اشیانِ قامتِ محبوب کے مقابلے پر نہیں آ سکتی۔ اسی لحاظ سے محبوب کے خرامِ ناز کو فتنۂ قیامت یا فتنۂ محشر کہتے ہیں اور خود قیامت کو فتنے ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ قیامت کے فتنے کی باتیں تو بار بار سنی تھیں، لیکن دل کو یقین نہیں آتا تھا، جب قامتِ محبوب کا رنگ ڈھنگ دیکھا تو یقین ہو گیا کہ واقعی فتنۂ محشر کے متعلق جو کچھ کہا جاتا تھا، وہ بالکل درست ہے۔

ظاہر ہے کہ کسی نادیدہ چیز کا یقین پیدا کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی مثبت شہادت سامنے ہونی چاہیے۔ تبو یار کے عالم نے شاعر کو فتنے کا مستند بنا دیا۔

۵۔ شرح :- میں سادہ دل اور سادہ لوح سا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ محبوب کے آئندہ ورنجیدہ ہو جانے پر خوش ہوتا ہوں، کیونکہ اس طرح معاملاتِ عشق کا سبق دہرانے کا موقع مل جائے گا۔

شاعر کا مدعا یہ ہے کہ محبوب ورنجیدہ ہو گا تو مجھے موقع ملے گا کہ اس کے سامنے حاضر ہو کر اپنے عشق و محبت کی کیفیت بیان کروں۔ بتاؤں کہ میں آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس سلسلے میں گلے شکوے بھی ہوں گے۔ یہ تمام باتیں پہلے مرحلے پر دلی خوشی کا باعث بنی تھیں، کیونکہ ورنجیدگی کے بعد محبوب سے صلح ہو گئی تھی۔ عاشق چاہتا ہے کہ وہ سدا اقدس نئے سرے سے دہرایا جائے۔ لہذا اپنی سادہ دلی سے محبوب کو رنجیدہ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ محبت کا رشتہ نئے سرے سے استوار ہو گا تو اس میں زیادہ استحکام پیدا ہو جائے گا، جس طرح سبق دہرایا جائے تو خوب یاد ہو جاتا ہے۔ اس پوری آئندہ کو سادہ دلی اس لیے کہا کہ عاشق یہ اذادہ نہ کر سکا۔ ایک مرتبہ تعلقات درست ہو جانے کے بعد ضروری نہیں کہ دوبارہ دہرایا ہی رابطہ قائم ہو جائے۔

۶۔ لغات۔ معاصی : معصیت کی جج۔ گناہ

شک آملی : پانی کی کمی ۔

دوسرے معرعہ میں " دامن تر نہ ہوا غل میں ایک لطف یہ بھی ہے کہ محاورے میں " دامن تر " گنہگار کے لیے استعمال کرتے ہیں ۔

شرح :- خواجہ حالی اس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :
 " گناہ کرنے میں ہمارا حوصلہ اس قدر فراخ ہے کہ باوجودیکہ دریائے سماں خشک ہو گیا ، مگر ابھی ہمارے دامن کا پتہ تک نہیں بجیگا "۔

گنہ گروں کے دریا میں شاید پانی تھوڑا سا کہ وہ بالکل خشک ہو گیا ، حالانکہ ہم ابھی تک اپنے دامن کا ایک کونہ بھی جھگو نہیں سکے تھے ۔ شعر میں دو نکتے بطور خاص قابلِ غور ہیں ، اول یہ کہ گنہ گروں کے دریا میں حقیقتہً پانی کم نہ تھا ، لیکن گنہگار کے دامن کا گوشہ اتنا پانی اپنے اندر جذب کر گیا کہ احساس ہوا ، شاید اس میں پانی ہی کم تھا ۔ اگر حقیقتہً پانی کم ہوتا تو اس کے لیے " دریا " کا لفظ استعمال کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی مطلب یہ کہ دریا میں پانی کی کمی نہ تھی ، مگر گنہگار کی باحوصلگی نے اسے مزدا یہ بنا دیا ۔
 دوسرا نکتہ یہ ہے کہ یہ دریا دامن کا گوشہ یا کنارہ بھی تر نہ کر سکا ۔

۷۔ لغات : تحصیل : حاصل کرنا ، استفادہ

تسمندر : بڑے چوہے کے برابر ایک جانور جس کے متعلق فارسی اور اردو ادب میں یہ افسانہ مشہور ہے کہ وہ آگ میں پھنسا ہوتا ہے اور وہیں رہتا ہے ، جیسے مچھلیاں اور دوسرے آبی جانور پانی میں رہتے ہیں اور آگ سے باہر نکالیں تو مر جاتا ہے ۔ بمعنی اسے پرداد جانور قرار دیتے ہیں ۔ اور اسی کا دوسرا نام سرخ آتش خواہ ہے ۔ " سام " اور اندر سے مرکب ہے ۔ سام ، آگ اور اندر حرفِ ظرت ۔ ایسا کوئی جانور یا پرندہ اب تک دریافت نہیں ہوا ۔

انگریزی کا لفظ سالامندر SALAMANDER لاطینی دیونا ئی لفظ سالامندرا سے مشتق ہے ۔ یہ گرگٹ جیسا ایک جانور ہوتا ہے ، جس کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ آگ میں بھی زندہ رہتا ہے اگر یہ درست ہے تو ظاہر ہے کہ تسمندر سالامندر سے بنا ہوا

کو سام اور اندر سے ۔

شرح :- اسے استاد میرے جگر کا داغ اُسی وقت سے آگ کا سرچشمہ بنا ہوا ہے اور میں اس سے آگ حاصل کر رہا ہوں، جب آتش کدے میں سفید نام جانور پیدا بھی نہیں ہوا تھا اور آتش کدے کو اپنا خاص مرکز و مقام بنالینے کا معاملہ تو پیدائش کے بعد کا ہو سکتا ہے۔

مطلب یہ کہ میں اس وقت سے آتشِ عشق میں خلیج بن رہا ہوں، جب اس طرح جلنے بجھنے والے معرّف وجود ہی میں نہیں آتے تھے۔ گویا ازل سے میرا شیوہ یہی ہے۔



۱۔ لغات : خلوت : تنہائی
میلیدگی : وہ مقام، جہاں کوئی دوسرا
نہ ہو۔

ناموس : عزت، آبرو
شرم : حیا۔

رشتہ شمع : موم جی کے اندر
کا دعا گا۔

کسوت : لباس، کسوتِ نازوں
اس باریک پہلے کو کہتے ہیں، جو
نازوں پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ اور
آج کل بعض اوقات اسے بھلی
کے بیوں پر بھی چڑھا لیتے ہیں۔

شب کہ وہ مجلسِ فردِ خلوتِ ناموس تھا

رشتہ ہر شمع، غبارِ کسوتِ نازوں تھا

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جگہ اگتی ہے فنا

کس قدر یارب! ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

حاصلِ کلفت نہ دیکھا جُڑ شکستِ آرزو

دل بہ دل چویستہ، گویا اک لپٹِ فوس تھا

کیا کون بیمارِ غم کی فراغت کا بیان

جو کہ کھایا غولِ دل بے منتِ کیوس تھا

شرح : مات میرا محبوب عزت و حرمت اور شرم و حیا کی تمنائی میں بٹھا ہوا

تھا اور پوری خلوت حسن و جمال کے جلوؤں سے جگمگا رہی تھی، ہر طرف شمعیں روشن تھیں۔

اور محبوب کی جلوہ آرائیاں دیکھ کر ندامت سے پانی پانی ہو رہی تھیں۔ ان کے اندر جو دھماکے تھے، وہ فائوس کے لباس میں کانٹوں کی طرح کھٹک رہے تھے۔
 مراد یہ ہے، محبوب کی بزمِ خلوت میں مشرم و حیا کا یہ عالم تھا کہ شمعیں گچلی جا رہی تھیں اور فائوس کی بیقراری کا یہ عالم تھا، جیسے ان کے لباس میں کانٹے غلش کا سامان بن گئے۔

۲۔ لغات۔ مشرد : مقام شدت۔

پابلوس۔ قدم چومنا۔ پاؤں کو بوسہ دینا۔

شرح :- جس مقام پر عاشق نے شہادت پائی، وہاں ارد گرد کو سوں تک ہندی آگ رہی ہے۔ اس سے واضح ہو سکتا ہے، عاشق کے دل میں محبوب کے قدم چومنے کی حسرت کس قدر بھری ہوئی تھی کہ وہ جان یوں ثابت ہوئی۔

مندی کے اُگنے سے شاعر نے یہ مضمون پیدا کر لیا کہ یہ عاشق کے خون سے تیار ہوئی۔ اس کی آرزو یہ ہے کہ کٹے پے اور محبوب کے پاؤں میں لگائی جائے۔ اس طرح پاؤں چومنے کی حسرت کی تلخی ہو جائے۔

۳۔ لغات۔ شکست آرزو : آرزو کا ٹوٹنا۔ صنی خون ہونا۔

شرح : محبت و الفت کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ دیکھا کہ آرزوؤں کا خون ہوتا ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ جب محب و محبوب کے دل باہم جلتے ہیں تو وہ ایسے لہروں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، جن سے لفظ امنوس نکلتا۔

شعر میں بظاہر خوبی کا ایک پہلو یہ ہے کہ لفظ "امنوس" بولا جائے تو دونوں لب ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ یہاں "امنوس" کا لفظ لانے کا مقصد یہی ہے کہ دو دل پیوستہ ہو کر دو لب بنتے ہیں۔ مگر "امنوس" کہتے ہی جدا ہو جاتے ہیں۔ گویا محبت و محبوب کے دل ملنا ہی تفرقے اور جدائی کا سبب بن جاتا ہے۔

۴۔ لغات۔ کیبوس : معدے میں غذا کی تحلیل کے دو مرحلے ہیں، اول کیبوس، یعنی غذا معدے میں پہنچتی ہے۔ تو حرارت اسے پکا کر حرق نکال لیتی ہے۔

دوسرا سر ملے کیوس کا ہے۔ یہ عرق جگر میں پہنچتا ہے تو وہ اسے خون بنا دیتا ہے۔
اسے ہنم جگری بھی کہتے ہیں۔ کیوس اور کیوس دونوں لفظ اصل میں یونانی ہیں۔
تشریح :- غم عشق کی بیماری سے جو فراغت نصیب ہوئی، اس کا کیا
بیان کروں۔ بس یہ سمجھ لیتا چاہئے کہ میں نے جو خون کھایا، اس میں کیوس کا اسانی
نہ اٹھایا۔

انسان بیمار ہو جائے تو اس کے ہنم پر بھی کم و بیش اثر پڑتا ہے، خصوصاً خاص
بیماریوں میں کیوس یعنی ہنم جگری خراب ہو جاتا ہے، لیکن غم عشق کی بیماری ایسی
مضی کہ اس نے کیوس کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ اس کے بغیر ہی خون بن بن کر کھانے
کو لٹا گیا۔



۱۔ تشریح :- محبوب کو بڑا ادھولی
تھا کہ میں کسی کو دل نہیں دے سکتا
ساتھ ہی حیرت بھی تھی کہ ہر شخص
اس کا شیدائی کیوں بن جاتا ہے اور
کیوں کہا جاتا ہے کہ دل مجھ دے
بیٹھے۔ جب آئینے میں اپنا عکس دیکھا
تو اسے ایک نیا حسین سمجھ کر محبوب
اپنا سامنے کر رہ گیا، یعنی جھپٹ کر رہ گیا، کیونکہ اسے دل دیے اور اس کا
شیدائی ہو کے بغیر چارہ نہ رہا۔

اب سوچیں کہ حسن و جمال کے جس عکس پر محبوب ذر لیتے ہوئے بغیر نہیں رہ
سکتا، اس پر دوسرے دل و جان بچھا کر دے کے بیٹے تیار ہوں تو تعجب کا کون
ساقام ہے؟

۲۔ تشریح :- عاشق نے خط دے کر تاحد کو محبوب کے پاس بھیجا محبوب

کو اتنا غصہ آیا کہ اپنے ہاتھ سے قاصد کی گردن اڑانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اب عاشق پریشان ہو کر کہہ رہا ہے کہ اسے کیوں قتل کرتے ہیں، اس کی تو کوئی خطا نہیں، تصور دار تو میں ہوں۔ جو سزا دینی چاہتے ہیں، مجھے دیجیے۔

۱۰ اپنے ہاتھ سے گردن مار دینے کے دو پہلو ہیں، اول شک کا پہلو یعنی یہ کہ محبوب کے ہاتھ سے قاصد کا قتل ہونا منظور نہیں اور عاشق چاہتا ہے کہ اس کے ہاتھ سے مارا جائے، اور دوسرا یہ کہ اس کا ہاتھ دھڑلے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر محبوب نے اپنے ہاتھ سے قاصد کو قتل کیا تو مجرم وہ ٹھہرے گا۔



۱۔ شرح :- میں عشق کی نیازمندی کے ذیلیف ادا کرنے کے لائق نہیں رہا اور جس دل کے بل پر یہ تمام ذیلیف ادا کرنے کا مجھے فخر تھا، وہ دل ہی اصل صلاحیت کو ہمیشہ ہے۔

عشق کی نیازمندی کے فرائض کیا ہیں ؟ عاجزی، حیرانی، پریشانی، خاندان ویرانی، بے وفائی کے رنج، فراق کی مصیبتیں، تغافل کے سدے، محبوب کی طرف سے ہر قسم کی سختیاں ہونے کے باوجود صبر سے کام لینا بلکہ غیروں پر انتقام کی جاگزاںیاں بھی برداشت کر لینا۔ یہ تمام صلاحیتیں باقی رہیں، کیونکہ دل کی پہلی حالت

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا جاتا ہوں دلِ غمِ حسرتِ ہستی بیٹھے ہوئے ہوں شمع کُشتہ، درخورِ محفل نہیں رہا مرنے کی اسے دل اور ہی تدبیر کر کہیں شایانِ دست و بازو نہ قائل نہیں رہا بروئے شش چہت در آئینہ باز ہے یاں اقیانوسِ ناقص و کامل نہیں رہا واکر ویٹھے ہیں شوق نے بند نقابِ سن غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

گو میں رہا رہیں ستم ہائے روزگار
 ہی باقی نہ رہی، جس پر مجھے
 عزیز ناز تھا۔
 ۲۔ لغات - شمع کشتہ
 بجھی ہوئی شمع۔

حاصل سوائے حسرت حاصل نہیں رہا
 درخوڑ : قابل، لائق، شایاں
 شرح :- میں زندگی کی
 حسرت کا داغ ساتھ لیے جا
 رہا ہوں۔ یعنی میں نے زندگی
 میں کوئی راحت و آسائش نہ

دیکھی۔ میری کوئی آرزو پوری نہ ہوئی، بہر قدم پر نامرادی سے سابقہ چڑا، بہرتا
 خون ہو کر بہتی رہی۔ ایسی زندگی کو حسرت زندگی کے داغ کے سوا کیا کہا جاسکتا
 ہے اور اس سے بہتر تعبیر جو بھی کیا سکتی ہے، میری حالت اس شمع کی سی ہے
 جو گل ہو چکی ہو اور روشنی سے بالکل محروم ہو جائے۔ ایسی شمع کو کبھی بزم میں
 رکھتے جانے کے لائق نہیں سمجھا جاتا اور بجھتے ہی معاً اسے اٹھا دیا جاتا ہے۔

داغ حسرت ہستی کو بجھی ہوئی شمع سے تعبیر کرنا سخنوری کا ایسا کمال ہے جو بیان سے
 کہیں زیادہ عمدہ فکر کا محتاج ہے۔ دیکھیے یہ ہے غالب کی حقیقی شاعری کے چند
 الفاظ ہیں، اور ایک عام تشبیہ، لیکن شعر میں اتنا سوز اور درد بھردیا ہے کہ تفصیل
 صبح سے شام تک کرتے جاتیے، مگر اس کے معارف و محاسن ختم نہیں ہو سکتے۔

۳۔ شرح :- اے دل! اب مرنے کا کوئی اور ہی طریقہ اختیار کرنا
 چاہیے، کیونکہ میری حالت اب ایسی نہیں رہی کہ محبوب کے دست و بازو کی
 تیغ آزمائی کے قابل سمجھا جاؤں۔

شعر میں خوبی کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ عاشق خود اپنے آپ سے یہ سب
 کچھ کہہ رہا ہے۔ یعنی اے محبوب کے دست و بازو کے کمالات اور دیگاہی کا بھی

پورا اندازہ ہے، پھر اپنی حیثیت بھی ٹھیک ٹھیک سمجھا جاتا ہے۔ دونوں چیزیں برابر رکھ کر انھیں توڑتے ہوئے کتا ہے، میں تو اس قابل نہیں کہ محبوب مجھے قتل کرے، البتہ مرنا ضروری ہے، لہذا اس کی کوئی اور تدبیر کر لینی چاہیئے۔ لطف یہ کہ کوئی تدبیر معین نہیں کی، سننے والے کو موقع دے دیا کہ جتنی تدبیریں اس کے ذہن میں آسکتی ہیں، لے آئے۔ ان تدبیروں میں زہر کھا کر مرنے، ڈوب جانے، کسی بلند سی چٹان سے گرنے وغیرہ ہر قسم کی تدبیریں شامل ہیں۔ انھیں غیر معین چھوڑ دینے سے شرمیں ایک نیا لطف پیدا ہو گیا۔

بعض اصحاب نے کہا ہے کہ غالب کا یہ شعر نظیری کے اس شعر سے ماخوذ ہے۔

آں شکارم من کہ لائق ہم بہ کشتن نیستم

شرم ی آید مرا ہذا نگس کہ صیاد من است

میں وہ شکار ہوں کہ مارے جانے کے بھی لائق نہیں، مجھے اس شخص سے

شرم آتی ہے، جو میرا شکاری بنے۔

ظاہر ہے کہ دونوں شعروں میں حقیقت کوئی مناسبت نہیں۔ ایک شخص کہتا ہے کہ میں مارے جانے کے بھی قابل نہیں، لہذا مجھے اپنے صیاد سے شرم آتی ہے اور یہ ایک عام شعر ہے، جس کا تغزل محل نظر ہے۔ دوسرا کتا ہے کہ میں محبوب کے ہاتھوں مارے جانے کے لائق تو نہیں رہا۔ پھر دل سے خطاب کرتا ہے کہ مرنے کی کوئی اور ہی تدبیر کرنی چاہیئے۔

۴۔ لغات۔ شش صحبت : چھ طرفین یعنی دائیں بائیں آگے پیچھے

اور پیچھے، اس سے مراد ہے۔ عالم، کائنات۔

تشریح :- کائنات کے منہ پر آئینے کا دردِ اذہ کھلا ہوا ہے، یعنی پوری

کائنات کے سامنے آئینہ رکھا ہے۔ یہاں ناقص اور کامل، کھوٹے اور مکھرے کے درمیان کوئی امتیاز اور کوئی فرق باقی نہیں رہا۔

آئینے کی خاصیت یہی ہے کہ جس چیز کا عکس اُس میں پڑے، اسے بے کم و کاست

آئینہ را کر دیتا ہے۔ اگر ناقص اس میں اپنا چہرہ دیکھے گا تو تمام نقص واضح ہو جائیں گے۔ آگ کا عکس آگ ہی کی شکل میں نظر آئے گا۔ مذکر پانی کی شکل میں۔ ناقص و کامل، کھوٹے اور کھرے کے درمیان امتیاز ہو سکتے ہیں، لیکن کائنات کے آئینے میں کسی کے لیے کوئی امتیاز نہیں۔

شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آئینہ سامنے کھلا رکھا ہے۔ ناقص ہوا کا مل دونوں اسے دیکھ کر حیران ہیں، کیونکہ حقیقت کا راز نہیں پا سکتے۔ راز نہ پا سکنے میں ناقص کامل کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

۵۔ لغات - حائل : بیچ میں آ جانے والا، روک، آڑ۔

شرح :- حسن حقیقی کے شوقِ مناش نے نقاب کے ہر ڈورے کی گرہ کھول دی ہے، یعنی تمام پردے اٹھا دیے ہیں۔ اب ہماری نگاہ کے سوا کوئی روک کوئی آڑ اور کوئی پردہ موجود نہیں رہا، یعنی ہماری نگاہ میں دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں، وہ خود ایک پردہ بن گئی ہے، ورنہ حسن حقیقی نے تو ہمال کی مناش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

شعر میں قابلِ غور لفظ "شوق" ہے۔ اگر اس سے دیکھنے والے کا شوقِ بیتاب مراد لی جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس شوقِ بیتاب نے حسن کے تمام پردے اٹھا دیے، وہ اپنی نگاہ کا پردہ کیوں نہ اٹھا سکا اور اس میں بیانی کی صلاحیت کیوں پیدا نہ کر سکا؟ صحیح یہی ہے کہ شوق سے حسن کی نورد و مناش کا شوق مراد لی جائے۔ یعنی حسن تو ذرے ذرے میں پھیلا ہوا ہے، مگر ہمارے پاس دیکھنے والی نگاہ ہی نہیں۔

۶۔ لغات - رہمن : بگڑو، وقت۔

شرح :- اگرچہ میں زمانے کے جو دو ستم میں گرو رہا، یعنی جو دو ستم نے مجھ پر بری طرح قابو پائے رکھا، لیکن اس حالت میں بھی میں اسے محبوب! تیرے خیال سے غافل نہیں رہا۔ تیری یاد بدستور میرے دل میں تازہ رہی۔ زمانے کی کوئی گردش میرے عشق و محبت پر اثر انداز نہ ہو سکی۔

۷۔ لغات۔ ہوا : آرزو۔ خواہش

شرح :- اب میرے دل سے وفا کی کیفیت کی آرزو ہی مٹ گئی، کیونکہ وہاں سے حاصل یعنی پیداوار کی حسرت و نامرادی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آ سکتا۔
ظاہر ہے کہ جس فعل سے کچھ ہاتھ آنے اور کچھ چیلنے کی امید نہ ہو اسے ہونے یا اس کی آبیاری کرنے کی آرزو و سرا سرا حاصل ہوگی۔ ہم بھی وفا کی کثرت کاری میں سرگرم رہے۔ اس کے ساتھ ہمدی بڑی آرزوئیں وابستہ تھیں، لیکن تجربے سے ہی ظاہر ہوا کہ یہ کیفیت کچھ پیداوار نہیں دے سکتی۔

۸۔ وفا۔ کو عام معنی میں بھی استعمال کر سکتے ہیں، یعنی دوستوں کی وفا، خویش و اقارب کی وفا اور وفائے محبوب بھی مراد لے سکتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ وفا سے حسرت کے سوا کچھ مل نہیں سکتا۔

شرح :- اے استاد! میں ان تکلیفوں، مصیبتوں اور پریشانیوں سے بہرگز جنس ڈرتا، جو عشق کا خاصہ ہیں اور کسی عاشق کو ان سے مفر نہیں، لیکن کیا کرنا کہ جس دل پر مجھے فخر و ناز تھا، وہی اپنی پہلی حیثیت کھو بیٹھا ہے اور میرا ساتھ نہیں دے سکتا۔



۱۔ شرح : عاشق

کش کش میں چھن گیا ہے۔

ایک طرف رشک اسے یہ بتاتا

ہے کہ محبوب نے قریب سے

اخلاص، مہر و محبت اور میل

جول کی جو روش اختیار کر رکھی

ہے، وہ انوس کا باعث ہے

اور رشک کا تقاضا ہی یہ ہے

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف

عقل کہتی ہے، کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

ذرہ ذرہ سا غرے خانہ نیرنگ ہے

گردش محبوں، پرچشک ہائے میلی آشنا

شوق ہے ساماں طرازِ نازش ارباب عجز

ذرہ صخرِ اوست گاہ و قطرہ دریا آشنا

کہ وہ نہ تو محبوب سے کسی کی محبت برداشت کر سکتا ہے نہ کسی پر محبوب کے التفات کا ردا دار ہو سکتا ہے۔ اس استاد میں عقلِ سلیم و شک کی نفی کرتی ہے اور کہتی ہے جلا وہ محبوب، جو سراسر بے مہر ہے اور اس کی فطرت میں محبت کا جو مہر موجود ہی نہیں کسی سے دوستی اور آشنائی بناہ سکتا ہے؛ کل ہم سے دوستی کا اظہار کیا جا رہا تھا، پھر ہمیں چھوڑ کر غیر پر توجہ شروع ہو گئی، ذرا غصہ و اس سے بھی وہی سلوک ہو گا، جو ہم سے ہو چکا ہے۔ لہذا موجود صورت حال پر و شک کی کوئی وجہ نہیں۔

۲۔ لغات : نیزنگ : گردش آیام۔ انقلاب۔ سحر و سحر۔ بوقلونی۔ چشمک : آنکھ کا اشارہ۔

شرح : یہ نیزنگ زار یعنی یہ دنیا بہر وقت گردش و انقلاب میں ہے اور اس کا ہر ذرہ اسی طرح گردش و انقلاب کا پابند ہے، جن طرح شراب خانے میں ساغر گھوما کرتا ہے۔ اس کی کھل ہوئی مثال یہ ہے کہ مجنوں کا صحرا میں مارے مارے پھرنا اس کی محبوبہ یابی کے اشارہ چشم کا نتیجہ ہے، یعنی یہی جس طرف مجنوں کی باگ موڑ دیتی ہے وہ اسی طرف مڑ جاتا ہے۔ بالکل یہی کیفیت اس عالم کی ہے اور اس کی گردش بھی ایک محبوب کے اشارہ چشم کا کرشمہ ہے، جسے ہم محبوب حقیقی کہتے ہیں۔

۳۔ لغات : سامان طراز : سامان آراستہ کرنے والا۔

نیں، اور اک آفت کا لکڑا وہ دلِ وحشی کھسے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا
شکوہ سنج رشک ہم دیگر نہ رہنا چاہیے
میرا زانو مونس، اور آئینہ تیرا آشنا
رابطہ یک شیرازہ وحشت میں اجزائے بہار
سبزہ میگاہ، صبا آوارہ، گلِ نا آشنا
کوہ کن، نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسد
سنگ سے سمرار کر جووے نہ پیدا آشنا

دستگاہ : قدرت . قوت .

شرح : عاجزوں کے لیے فخر کا سامان بہم پہنچانے کا ذمہ داران کا دلولہ شوق اور جذبہ عشق ہے۔ اسی کی بدولت وہ درجہ کمال پر پہنچ جاتے ہیں، یہاں تک کہ ذرے میں صحرا کی سی وسعت و تعدد پیدا ہو جاتی اور قطرہ دریا کے جوش و خروش کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔

یہ شعر ایک ایسی حقیقت کا آئینہ دار ہے، جس سے کسی کو اختلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ اس دنیا کی زندگی میں کوئی شے بجائے خود نہ اعلیٰ ہے نہ اوثیٰ، نہ معزز ہے، نہ حقیر، صرف جذبہ عشق کی بنا پر جو عمل و حرکت کا سرچشمہ اور سرمایہ ہے، ہر شے کی قدر و قیمت اور ہر وجود کا درجہ و رفعت و پستی متعین ہوتا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی، حقیر سے حقیر اور بے حقیقت سے بے حقیقت شے کو بھی جذبہ عشق و عمل انسانی بلند ہی مٹا کر سکتا ہے کہ اس سے زیادہ بلندی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی ذرہ صحرا بن جاتا ہے، جو اس کے لیے منتانے کمال ہے اور قطرہ دریا کی صورت اختیار کر سکتا ہے جو اس کے لیے ترقی کی معراج ہے۔ گویا نظر وجود کی ظاہری حیثیت پر نہیں، بلکہ اس کے جذبہ عشق و عمل پر مبنی چاہیے۔ اسی طرح انسان جذبہ عشق و عمل کی بنا پر ترقی کرتے کرتے اشرافیت کا وہ مقام حاصل کر سکتا ہے، جو باری تعالیٰ نے پہلے سے اس کے لیے مقرر کر رکھا ہے اور جس کی وجہ سے آدم کو پوری مخلوقات پر کرامت و نفیض بخشی گئی۔

۴۔ شرح :- المہینان و دلچسپی کا قدور ختم ہو گیا۔ اب تو یہ کیفیت ہے کہ میں ہوں اور میرا دل، جو وحشت میں ڈوبا ہوا ہے اور آفت و مصیبت کا پرکارہ بن کر میرے لیے وبال جاں ہو گیا ہے۔ اس کا حال کیا بیان کروں ؟ عافیت اور راحت و آسائش سے اسے دشمنی ہے، آوارگی اور بے مقصد گردش سے اُسے خاص دل بٹگی ہے۔

ظاہر ہے کہ جس دل میں وحشت بھری ہو، وہ آرام و المہینان سے بٹھینا کبھی پسند

نہ کہے گا اور آوارگی ہرگز نہ چھوڑے گا۔

۵۔ لغات - شکوہ سنج : گلہ کرنے والا۔

مونس : اُٹس رکھنے والا۔ دوست۔ ہمد۔

شرح : ہمیں رشک اور بدگمانی کے باعث ایک دوسرے کے گلے میں

مشغول نہ رہنا چاہیے۔ اگر میں نے نانا کو ہمد بنایا ہے، یعنی ہر وقت گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا رہتا ہوں تو تو نے بھی آئینے کو اپنا دوست بنایا ہے۔ ہر وقت سامنے دکھ کر تو اسی کو دیکھتا رہتا ہے۔

بدگمانی کی کیفیت یہ ہے کہ محبوب نے عاشق کو گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا دیکھا

تو خیال ہوا کہ یہ کسی اور پر عاشق ہو گیا ہے۔ حالانکہ اس کی نظریں ہر لحظہ تجھ پر جمی رہتی چاہئیں۔ عاشق کو یہ بدگمانی پیدا ہوئی کہ محبوب ہر وقت آئینہ دیکھتا رہتا ہے

حزو پر کسی دوسرے پر مرثا ہے۔ اور اس نے کسی اور سے رشتہ محبت جوڑ رکھا ہے۔

۶۔ لغات - شیرازہ : سلسلہ۔ بندش، خصوصاً وہ بندش، جس سے کتب

کے اجزاء باہم چوست کیے جاتے ہیں۔

سبزہ بیگانہ : خود روبرو۔ اسے بیگانہ اس لیے کہتے ہیں کہ بے موقع و

بے محل آگت ہے اور اسے کاٹ کر باہر پھینک دیتے ہیں۔

شرح :- ہمارے تمام اجزاء وحشت کی ایک بندش میں بندھے ہوئے ہیں

یعنی ان سب میں صرف ایک شے مشترک ہے اور وہ وحشت ہے۔ مثلاً ہمارے اجزاء

میں سے ایک سبزہ ہے، جسے بیگانہ کہا جاتا ہے اور بیگانہ وہ ہوتا ہے، جو کسی کا آشنا

نہ ہو، یہ وحشت کی علامت ہے۔ دوسرا جزو مبالغہ یعنی صبح کو چلنے والی نرم نرم ہوا ہے

جس سے چہل کھلتے ہیں۔ اسے دیکھیے کہ ادھر ادھر پھرتی ہے اور اس کا کوئی طور

طریقہ اور تائدہ نہیں۔ تیسرا جزو پھول ہے، وہ بھی کسی سے آشنائی پیدا نہیں کرتا۔

ابھی نکلا اور تھوڑے ہی وقت میں اندر و پڑ مردہ ہو کر رخصت ہو گیا۔ غرض ان تمام

جزوہات سے صاف وحشت ٹپک رہی ہے اور وحشت ہی ان کے درمیان ایک مشترک

پیر

۷۔ لغات - کوکبن : پہاڑ کاٹنے والا۔ مزار۔

نقاش : نقش بنانے والا۔ معطر۔

تمثال : تصویر۔ مجسمہ۔

شرح :- اے استاد! مزارو سچا عاشق نہ تھا اس کی خواہش صرف یہ تھی کہ سنگتراش کی حیثیت میں شیریں کی تصویر تیار کر دے۔ درد کیا یہ ممکن تھا کہ پتھر سے سر پھوڑ کر محبوب پیدا نہ کر دیا جائے ؟ مزارو نے سر مزدور پھوڑا اور مر گیا۔ تاہم شیریں اُسے نہ ملی۔

جو معنی بیان کیے گئے ہیں، وہ اس صورت میں پیدا ہوتے ہیں کہ دوسرا مصرع استغنائی قرار دیا جائے، لیکن اگر اسے حسرت و افسوس کے انداز میں پڑھا جائے تو یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ مزارو شیریں کا مجسمہ بنانا چاہتا تھا۔ اس نے پتھر سے پھوڑ لیا اور مجسمہ نہ بنا سکا۔ لیکن نہ سوچا کہ پتھر سے سر پھوڑ کر محبوب پیدا نہیں ہو سکتا۔

۱۔ شرح :- اس پری

ذکر اُس پری و ش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا
مئے وہ کیوں نہبت پتے بزمِ غیر میں یارب
آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا
منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

جیسے محبوب کا ذکر تھا، پھر میری
جادو بیانی اور قادر الکلامی نے
ایسا سماں بنا دیا کہ جس شخص کو
میں نے اپنا راز داں اور غمگین
بنایا تھا، وہی میرا رقیب اور
دشمن بن گیا، یعنی میرے بیان
سے اتنا متاثر ہوا کہ دیکھے بغیر
میں پر عاشق ہو گیا۔

خواجہ عاتق اس شعر کی شرح

وے وہ جس قدر زلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے

بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

درِ دِل لکھوں کب تک؟ جہاؤں اُن کو دکھلاؤ

انگلیاں نگار اپنی، خامہ خوشچکاں اپنا

رگھتے رگھتے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا

خُنگِ سجدہ سے میرے سُنکِ آستانِ اپنا

تا کرے نہ غمازی، کر لیا ہے دشمن کو

دوست کی شکایت میں، ہم نے ہم زباں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے

بے سبب ہو ا غالب دشمن آسماں اپنا

میں فرماتے ہیں :

۔ میں نے جو مصوَّق کے

حسن کی تعریف کی، تو جو شخص

میرا محرم راز اور ہم نشین تھا،

وہی سن کر میرا قریب بن گیا

کیونکہ اَوّل تو ایسے پریوش

کی تعریف تھی اور وہ بھی مجھ

جیسے جادو بیان کی زبان سے

پہلے مصرع کا دوسرا رکھ یعنی

اور پھر ہاں اپنا۔ سارے شعر

کی جان ہے، جس کی خوبی بغیر

ذوقِ سلیم کے معلوم نہیں ہو سکتی۔

۲۔ شرح ۱۔ اس شعر

کے دو مضموم بالکل واضح ہیں :

۱۔ محبوب نے غیر کی محفل

میں اتنی شراب پی لی، جس کی حدود نہایت نہیں۔ لیکن الٰہی ! کیوں ایسا کیا ؟ اس

لیے کہ وہ غیر کی محفل میں امتحان لینا چاہتے تھے، کس قدر پی کر ان پر بدستی

طاری ہو سکتی ہے۔ یعنی کتنے ساغر چڑھا کر وہ مدہوش ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بزمِ غیر

میں ایسی صورتِ حال کا پیدا ہونا عاشق کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔

۲۔ محبوب جب تک غیر کی محفل میں تھا، اسے زیادہ شراب پینے کا خیال ہی

نہ آیا، لیکن میرے گھر آتے ہی اندھا دھند پی گیا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ دیکھے اور

جانچے، آیا اس کی بدستی اور مدہوشی کے عالم میں میری طرف سے کوئی نازیبا حرکت

تو نہیں ہوتی؟ یعنی مجھے آزار نہ لگے اس نے زیادہ شراب پی لی۔

۳۔ لغات - منظر : جھروکا ایسی ادنیٰ جگہ جہاں سے نیچے کی تمام

چیزیں دیکھی جاسکیں۔

شرح :- اگر ہمارا مکان عرش سے نیچے ہوتا تو ہم بلندی پر جا کر ایک

اور جھروکا یا شاہ نشین بنا لیتے، جہاں سے اپنے مکان اور اپنی حقیقت و حیثیت کا اندازہ کر سکتے۔ کاش ایسا ہوتا، لیکن نہ ہو، کیونکہ عرش ہی ہمارا مکان ہے۔

بقلم ہر شعر کا مفہوم یہ ہے۔ بلندی پر منظر بنانے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ہم صرف اپنے مقام اور مرتبے کا صحیح اندازہ کر لیتے اور حقیقت سے آگاہ ہو جاتے۔ اب ہمیں اس کے سوا کچھ معلوم نہیں کہ عرش ہمارا مقام ہے، یعنی ہم وجود مطلق ہی کا ایک جزو یا پر تو ہیں۔ اس سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لیے ایسے مقام کا انتظام ضروری تھا، جہاں سے سب کچھ ٹھیک ٹھیک نظر آسکتا، مگر یہ نہ ہو اور بجز اتنا جاننے کے کہ ہمارا مقام عرش ہے اور کوئی حقیقت ہم پر آشکارا نہ ہو سکی۔

۴۔ شرح :- خواجہ جانی فرماتے ہیں :

”خوب ہی ہو کہ محبوب کے در کا پاس بان ہمارا جان پہچان نکلا۔“

اب ہمارے لیے اس بات کا موقع حاصل ہے کہ وہ جس قدر چاہے ہم کو ذلت دے، ہم اس کو معافی میں ٹٹالتے رہیں گے اور یہ ظاہر کریں گے کہ ہمارا قدیم آشنایہ اور ہمارا اس کا قدیم سے یہی برتاؤ ہے۔“

عاشق نے یہ تو پہلے ہی سے طے کر دیا ہے کہ محبوب کے دروازے کا چوکیدار ہمیں ضرور برا بھلا کہے گا اور ہماری ذلت و رسوائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گا لیکن اس رسوائی کو انگیز کر لینے کا ایک بہانہ نکل آیا، یعنی چوکیدار پہلے کا جان پہچان نکلا۔ عاشق مطمئن ہو گیا کہ اب ہماری جتنی بھی ذلت ہوگی اس سے یہ کہہ کر معافی میں ٹٹالتے ہائیں گے کہ یہ پہلے سے ہمارا بے تکلف و درست ہے اور اس کے ساتھ دھول

دھبے اور پٹاؤں کی سلسلہ پہلے سے چلا رہا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں، جس پر پریشانی اور تذلیل کا احتمال ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسے اشعار دوادین میں ڈھونڈنے سے نظر نہیں آتے۔

۵۔ لغات - نوکار : زخمی۔

شرح :- دل کا درد دیکھتے دیکھتے انگلیاں زخمی ہو گئیں، قلم سے خون بہنے لگا۔ میں کب تک اسی طرح کھدکھد کر بھیجتا جاؤں ؟ دل میں سوچتے ہیں، یہ کیوں نہ کہوں کہ خود ان کے پاس پہنچ جاؤں اور دکھا دوں، میری زخمی انگلیاں اور خونچکاں قلم دیکھ کر میری حالت کا اندازہ فرمایا بھیجے۔ اسی سے آپ پر میرے درد و دل کی کیفیت آشکارا ہو جائے گی۔

۶۔ **شرح :-** عاشق نے محبوب کی دہلیز پر سجدہ کر دیا۔ اس سے محبوب کو اس قدر عار محسوس ہوئی کہ دہلیز کا پتھر نکال کر اس کی جگہ دوسرا لگا دیا۔ عاشق عجز و نیاز سے کہتا ہے کہ آپ نے بے سبب پتھر مرنے کی زحمت اٹھائی میں بدستور سجدے کرتا جاتا، یہاں تک کہ پہلا پتھر گھس گھس کر ناپسید ہو جاتا۔ اس وقت آپ نیا پتھر لگائیے۔

۷۔ لغات - غمازی : چنلی کھانا۔

شرح :- ہم نے رقیب کے پاس محبوب کی شکایت ایسے انداز میں کی کہ وہ ہمارا سہوا بن گیا۔ اس سے اور کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو، لیکن اتنا تو بڑا کہ اس کے لیے چنلی کھانے کا کوئی موقع باقی نہ رہا، کیونکہ چنلی اسی صورت میں کھا سکتا تھا کہ خود اسے محبوب سے کوئی شکایت نہ ہوتی۔

یہ مرزا کے کلمات ہیں، یہاں رقیب کو باتوں سے سہوا بنایا۔ ایک اور مقام پر مرزا نے کہے محبوب کو خریب دینا بھی خوب آتا ہے۔

عاشق ہوں، پہ معشوق فریبی ہے مرزا
مجھوں کو بڑا کہتی ہے یل مرے آگے

۸۔ - شرح :- خواجہ سائی فرماتے ہیں :

” آسمان کی دشمنی کے کیا خوب اسباب بنائے ہیں اور اپنی دانائی و بہزندی کس خوب صورتی سے ثابت کی ہے ۔“

شاعر نے پہلے یہ حقیقت مسلم مان لی ہے کہ آسمان انھیں لوگوں کا دشمن ہوتا ہے، جو دانا اور دانشمند ہوں، نیز کسی نہ کسی بہز میں انھیں کیتائی کا درجہ حاصل ہو۔ پھر حیرت زدہ ہو کر اپنی حالت پر نظر ڈالتے ہوئے حسرت و افسوس کے ساتھ کہتا ہے کہ ہم تو دانشمند نہ تھے اور کسی بہز میں کیتائی بھی ہمیں حاصل نہ تھی، پھر اسے غائب آسمان نے ہم سے کیوں ہے و ہر دشمنی کی ؟

بعض اصحاب نے فرمایا ہے کہ اس شعر کا مضمون عرفی کے مندرجہ ذیل شعر سے ماخوذ ہے ۔

از من بگیر عبرت و کسب بہز من
با بخت خود عداوت بخت آسمان نخواہ

مجھے دیکھ کر عبرت حاصل کر اور بہز پیدا کرنے کا خیال چھوڑ دے ۔ تجھے کیوں پسند ہے کہ اپنے ساتھ سات آسمان کی دشمنی مول لے لے ۔

نظاہر ہے کہ عرفی کے شعر میں وہ حقیقت بیان کی گئی ہے، جسے غائب نے مسلم مان کر مقدمہ چھوڑ دیا اور اس مضمون کو پرتا شیر شریعت کے سانچے میں ڈھالتے ہوئے کہا کہ ہم نہ عالم تھے، نہ عقل و دانش کے پیکر تھے، نہ کسی فن میں ہمیں کمال حاصل تھا، پھر آسمان نے ہم سے کیوں دشمنی کی ؟ عرفی کا شعر صرف فلسفہ و حکمت رہ گیا، غائب نے اسے پرتا شیر شریعت کا لباس پہنا دیا۔

بخود کی تشریح کے مطابق غائب کے شعر کے دو پہلو ہیں :

۱۔ یہ قول مشہور ہے کہ آسمان اہل دانش و عینش اور ادب باب بہز کا دشمن ہوتا ہے ۔ ہماری حالت دیکھیے کہ ہم میں کوئی خاص چیز موجود نہیں، پھر بھی زمانے کے ہاتھوں پامال ہو رہے ہیں۔ دنیا میں اس کی سیکڑوں مثالیں مل جائیں گی ۔

۲۔ زیادہ مطیبت پہلو ہے کہ شاعر نے درجہ کمال حاصل کر لینے کے باوجود عجز و انکسار سے ان جوہروں کی نفی کر دی، جو آسمان کی دشمنی کا باعث مانے جاتے ہیں اور یہ بھی اس کے کمال کی دلیل ہے۔

نیز اس امر کی دلیل ہے کہ درجہ کمال حاصل کر لینے کے باوجود اس پر مطیبت نہیں۔ ارتقا کی تشنگی موجود ہے۔ جو کچھ حاصل کر چکا ہے، اسے منتہائے کمال نہیں سمجھتا، بلکہ مزید رفعت کا طلب گار ہے۔



۱۔ لغاتِ سرمہ مفت نظر:

وہ سرمہ جو مفت دے دیا جائے

اور کوئی قیمت وصول نہ کی جائے۔

شرح :- میں وہ سرمہ ہوں

جو مفت سب میں بٹتا ہوں اور

اس کی قیمت کوئی نہیں میری

قیمت صرف اتنی ہے کہ جو بھی

سرمہ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے

کہ رہے چشم خریدار پہ احساں میرا

رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم

تیرے چہرے سے ہو ظاہر غم نہاں میرا

یہ سرمہ استعمال کرے، اس کی آنکھ پر میرا احسان رہ جائے۔

مطلب یہ ہے کہ زور و جواہر کی شکل میں میرے کلام کی کوئی قیمت نہیں ہیں

بلکہ کل الجواہر مفت لوگوں میں بانٹ رہا ہوں اور صرف اتنا چاہتا ہوں کہ اس فیض

عام سے سب فائدہ اٹھائیں۔

۲۔ شرح :- اسے ظالم محبوب! مجھے روئے دھونے اور آہ و فغاں کرنے

کی اجازت دے دے۔ اندیشہ ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ جو غم میرے دل میں چھپا

ہو جائے، اگر رو دھو کر اسے ہٹا کر لینے کی رخصت نہ ملی تو مجھ پر ایسی حالت طاری

ہو جائے گی، جسے دیکھ کر لوگوں میں پرہیزگاریاں ہونے لگیں گی اور سب کہیں گے کہ

یہ شخص فحشاں پر فریفتہ ہے، اسی وجہ سے اس کی یہ حالت ہو گئی ہے۔ اس طرح تیری

بدنامی و رسوائی ہوگی اور میرا غم پنہاں تیرے چہرے سے ظاہر ہونے لگے گا۔



۱۔ لغاتِ حکمران :

زلف، کاکل، چوٹی، طرۂ کلاہ،
پسندنا اور کلفی، طرۂ دستار،
کلفی۔

شرح : رغبت کا آنا

انسان اپنی کاروائی اور کارکردگی
پر فخر و ناز کے وہم میں مبتلا ہو
گیا ہے، اس لیے خود آرائی مینی
اپنے آپ کو یا کہاں سمجھتے ہوئے
پھولا بیٹھا ہے، حالانکہ اس کائنات
کی کوئی شے ایسی نہیں جس کے
لیے قدرت نے ضروری سامان
بہم نہ پہنچا دیے ہوں۔ آپ گھاس
جیسی حقیر چیز پر نظر ڈالیں۔ اس
کی زلفوں میں کنگھی کر کے آراستہ
کر دینے کے لیے نرم دھواں مچھو ہے۔

غافل، ہودہم ناز خود آرا ہے، ورنہ یاں
بے شانہ صبا نہیں طرہ گیہا کا
بزمِ قدح سے عیش تنانہ رکھ کر رنگ
صیدِ زردامِ حبتہ ہے اس دامِ گاہ کا
رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عُذر نہ کرنا گناہ کا
مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پُرگلِ خیالِ زخم سے دامنِ نگاہ کا
جاں و رہوائے یک نگہ گرم ہے اسد
پروانہ ہے وکیل، ترے دادخواہ کا

گھاس کی مثال اس لیے لائی گئی کہ یہ عام ہے اور ہر فرد اسے دیکھتا اور دیکھ
سکتا ہے۔ اس کی آرائش کے لیے ہوا ہی شانے کا کام دیتی ہے۔ یہ مثال اس لیے
بھی لائے کہ خود انسان گھاس کے تنکے کی طرح بے حقیقت ہے اور اس کی جتنی
ظاہر کرنے کے لیے اس سے بہتر مثال کوئی نہ تھی۔

بیشک انسان کے لیے یہی دریا ہے کہ ہر وقت جدوجہد میں لگا رہے۔

صبر و استقامت سے کام کرے، لیکن اس کے لیے یہ ذیبا نہیں کہ سب کچھ اپنی صلاحیت اور کارکردگی کا نتیجہ قرار دے دے۔ اس کا فرضائے حقیقی کو بھونڈا نہ چاہئے، جو دنیا کے تمام کاموں کا کفیل، سب کی پناہ گاہ اور سب کے لیے ذریعہ کامیابی ہے۔

۲۔ لغات : بزمِ قدح : شراب نوشی کی محفل۔
رنگ : خوشی، خوشحالی۔

صیدِ زوامِ حستہ : وہ شکار، جو جال میں پھنس کر نکل گیا ہو۔
دامِ گاہ : وہ مقام، جہاں شکار کے لیے جال بچھا ہوا ہو۔ یہاں اشارہ ہے : ”بزمِ قدح“ کی طرف۔

شرح : ۱۔ شراب نوشی کی محفل عام تصور کے مطابق عیش و عشرت کا سب سے بڑا ذریعہ بھی جاتی ہے، لیکن شاعر کہتا ہے کہ اس محفل سے بھی عیش کی تمتا نہ رکھنی چاہئے، کیونکہ اس کی خوشی، شادمانی اور خوشحالی ایک ایسا شکار ہے، جو اس شکار گاہ کے جال میں پھنس کر نکل چکا ہے۔

جو شکار جال میں پھنس کر نکل جائے، وہ پھر آسانی سے نہیں پھنس سکتا، مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں شراب نوشی کی محفل عیش و عشرت کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھی جاتی ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے یہ عیش بھی محدود درجہ عارضی اور کج حیثیت ہے۔ شعر میں ”رنگ“ کا لفظ لانے سے ایک مقصود تو یہ ہے کہ عیش اور بزمِ شراب سے اسے خاص مناسبت ہے، دوسرے ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ شراب پی کر چہرے پر جو رونق و رنگینی سی نہو، اور ہوتی ہے، وہ بھی عارضی ہی ہوتی ہے۔

۲۔ شرح : ۱۔ میں نے اتنے گناہ کیے ہیں کہ شرم و ندامت کے باعث ان کے لیے عذر پیش کرنے کی بھی تبت نہیں رکھتا اگر خدا کی رحمت گناہ کے لیے عذر پیش کرنے کے بجائے اسی شرم و ندامت کو قبول فرمائے تو کچھ عجیب بات نہ ہوگی۔

شاعر کے حسن بیان کا کمال یہ ہے کہ گناہ کے عذر کی حقیقت پیش کر دے۔
جب تک انسان کو اپنے کسی فعل پر ندامت نہ ہو وہ اسے ناجائز نہیں سمجھتا اور اس کے بعد
پیش کرنے پر آمادہ نہیں ہوگا شرم و ندامت کہ بچائے خود عذر گناہ ہے، کیونکہ فاعل اپنے
افعال کو عذر ورجہ ناپسندیدہ سمجھتا ہے۔ گو یا محض شرم و ندامت عذر گناہ کی
بہترین صورت ہے۔ پھر خدا کی رحمت سے کیا بعید ہے کہ اسے قبول کرے۔
۴۔ لغات۔ مقتل۔ قتل گاہ۔ شہادت گاہ۔

شرح : مجھے محبوب کے ہاتھوں قتل ہونے کی بشارت ملی چکی ہے۔
دیکھیے میں کس خوشی اور شادمانی سے قتل گاہ کی طرف جا رہا ہوں۔ معلوم ہوتا
ہے کہ زخموں کا خیال آتے ہی میری نگاہ کا دامن بھولوں سے بھر گیا ہے خوشی
کی یہ آخری حد ہے۔ اس کے سبب دو ہیں، اول یہ کہ محبوب کے ہاتھ سے قتل
ہو گا، دوم یہ کہ عشق و محبت میں جن کبھی ختم نہ ہونے والی مصیبتوں سے سابقہ
پڑا رہا وہ ختم ہو جائیگی اور ان کا جنجال کٹ جائے گا۔ زخموں کو بھولوں
سے دلگنی کی بنا پر تشبیہ دی گئی ہے۔

۵۔ لغات۔ ہوا : شوق۔ لگن۔

شرح : اے محبوب! اسد کو تیری ایک نگاہ گرم کی آرزو ہے اور
اسی آرزو میں اس کی جان اٹکی ہوئی ہے۔ تیرے نگاہ گرم ڈالتے ہی وہ جل مرے گا
اور تیرے اس فریادی یعنی اسد نے پروانے کو اپنا وکیل بنایا ہے وہ یہ کہ
وہ بھی شمع کی پیٹ میں جسے شمع کی نگاہ گرم کھنا چاہیے، جل مڑتا ہے۔ لہذا جو
شخص محبوب کی نگاہ گرم کا مشتاق ہو، اس کے لیے پروانے سے بہتر وکیل نہیں
مل سکتا۔



۱۔ شرح :- محبوب
نے ظلم و ستم سے ہاتھ اٹھا
لیا اور عاشق کے ساتھ سختی
بجود سے باز آئے پروا باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو مُسنہ دکھلا میں کیا

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبراہٹیں کس

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں، لگاؤ

جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ

یارب! اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے

آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

غم بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ

مر گئے، پر دیکھیے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے

کوئی بتلاؤ کہ ہم مبتلا ہیں کس

سے پیش آتا چھوڑ دیا، لیکن

کیا باقہ اٹھایا، حقیقتاً ظلم کب

چھوڑا؟ اور جو رے دست برداری

کب اختیار کی؟ اب محبوب

کہ رہا ہے، مجھے ظلم و ستم پر مسمی

پشیمانی ہوئی اور اتنی شرم آئی

کہ اب تجھے نہ نہیں دکھاسکتا

یہ پشیمانی اور یہ شرم سب سے

بڑا ظلم بن گئی، کیونکہ عاشق

کے لیے محبوب کا منہ نہ دکھانا

سراسر ناقابلِ برداشت ہے۔

ایسے نکتے غالب ہی پیدا

کر سکتا ہے کہ ظلم سے محبوب

کی دست کشی کو بھی بے اصل

قرار دینے کی ایک معقول وجہ

نکال لی۔

۲۔ شرح :- ساتوں

آسمان رات دن گردش کر

رہے ہیں۔ اسی گردش سے دنیا کے تمام کام پورے ہو رہے ہیں۔ گردش سے

واضح ہوتا ہے کہ کسی حالت کو ثبات و قرار نہیں۔ دمدم سب کچھ جرتا چلا جاتا

رہا ہے۔ اگر آج ہم حم و الم اور مصیبت میں مبتلا ہیں تو گھبرانے کی کون سی وجہ

ہے۔ آسمانوں کی گردش جاری ہے۔ جس طرح پہلی حالت باقی نہیں رہی یہ بھی

باقی نہ رہے گی۔ کچھ نہ کچھ تو ہو ہی رہے گا۔ یہی سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ ہوگا، اچھا

ہی ہوگا، پھر پریشان کیوں ہوں؟
 ۳۔ لغات۔ لاگ : دشمنی۔ عداوت۔
 لگاؤ : محبت۔ دل کا ربط و تعلق۔

شرح :- خواجہ حالی اس شعر کی شرح میں فرماتے ہیں :
 "یہ معنوں عجیب نہیں، کسی اور نے بھی باندھا ہو، مگر ہم نے آج
 تک نہیں دیکھا۔ اگر کسی نے باندھا بھی ہوگا تو اس خوبی و لطافت
 سے ہرگز نہ باندھا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کو نہ ہمارے
 ساتھ دشمنی ہے، نہ دوستی۔ اگر دشمنی بھی ہوتی تو اس لیے کہ اس
 میں ایک نوع کا تعلق ہوتا ہے، ہم اسی کو دوستی سمجھتے، لیکن جب
 نہ دوستی ہو، نہ دشمنی تو پھر کس بات پر دھوکا کھائیں؟

"قطع نظر خیال کی حمد کی اور ندرت کے "لاگ" اور "لگاؤ" ایسے
 لفظ بہم پہنچائے ہیں، جن کا تاخذ متخذ اور معنی متضاد ہیں اور یہ ایک
 عجیب اتفاق ہے، جس نے خیال کی خوبی کو چار چاند کر دیا ہے۔"

خواجہ حالی کی تشریح میں اضافہ بالکل غیر ضروری معلوم ہوتا ہے، تاہم
 یہاں اتنا بتا دینا چاہیے کہ غالب نے یہی معنوں ایک اور شعر میں بھی پیش کیا ہے
 جسے پڑھ کر معنی زیادہ بہتر طریق پر ذہن نشین ہو جائیں گے یعنی :

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے

کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی یہی

دوسرے لفظوں میں مرزا کے قول کے مطابق تعلق کی، دو صورتیں ہیں
 اول دوستی، جسے خوشگوار تعلق سمجھنا چاہیے، دوم دشمنی، یعنی ناخوشگوار تعلق۔
 تعلق دونوں ہیں۔ اسی نکتے پر مرزا کا زور ہے۔ وہ محبوب سے رشتہ قائم
 رکھنا چاہتا ہے اگرچہ محبوب دشمنی ہی کرے۔ عاشق اپنے دل کو فریب دے
 سکتا ہے کہ محبوب دشمنی نہیں، دوستی کر رہا ہے۔ سمجھ سکتا ہے کہ محبوب نے اس

کے ساتھ امتیازی برتاؤ اختیار کیا، لیکن جب دشمنی اور دوستی دونوں ناپید ہوں تو دھوکا کھانے اور فریب میں مبتلا ہونے کی کون سی وجہ رہ جاتی ہے ؟

۴۔ شرح :- محبوب کو خط لکھا اور حالت اضطراب میں قاصد کے ساتھ محبوب کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ کچھ منزل طے کر چکنے کے بعد خیال آیا کہ یہ ہم سے کیسی حرکت سرزد ہوتی ؟ بیشک یہ گمان تھا کہ قاصد خط کہیں راستے ہی میں مناسخ نہ کر دے یا یہ آرزو تھی کہ جواب کے انتظار میں نہیں بیٹھیں گے، وہیں جواب لے لیں گے، لیکن راستے میں سوچ رہے ہیں کہ کیا اپنا خط ہم خود پہنچائیں، جو سراسر باعث جنگ اور شقاق دستور ہے ؟

دوسرے مصرع سے ایک معنی یہ بھی پیدا ہوتے ہیں کہ اگر ہم قاصد کے ساتھ ساتھ محبوب کے دوست کسے پر پہنچ گئے تو وہ تو ہماری صورت سے بھی بیزار ہے، پھر خط اسے پہنچانے کی کون سی صورت رہ جائے گی ؟ یہاں کیا - یہ معنی - کیونکر بھی جانے گا اور - یارب - استغباب کے لیے ہے -

۵۔ شرح :- جب محبوب کے دروازے پر میٹھ گئے تو وہاں سے اٹھنا عاشق کے لیے باعث تنگ ہے۔ کہتے ہی حادثے پیش آ جاتیں، کتنی ہی مصیبتیں نازل ہونے لگیں، یہاں تک کہ خون کی ندی بہ نکلے اور وہ ہمارے سر سے بھی گزر جائے ہم اُس آستانے کو دھوڑیں گے۔

۶۔ شرح :- خواجہ عالی فرماتے ہیں :
- دکھلائیں کارِ صبحِ خدا کو بھڑایا ہے۔ کتنا ہے کہ عمر بھرموت کا منتظر رہا کہ وہ حالتِ زندگی سے سرزد بہتر ہو گی۔ اب دیکھیے، مرنے کے بعد کیا حالت دکھلاتے ہیں، جس کا تمام عمر منتظر رکھا ہے ؟

مراد یہ ہے زندگی بھر اتنی تکلیفیں اور مصیبتیں پیش آتی رہیں کہ اکتا کر موت کا راستہ دیکھنے لگے۔ کیونکہ زندگی میں تو ان تکلیفوں اور مصیبتوں سے خجالت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ پھر سوچتے ہیں کہ دیکھیے، مرنے کے بعد ہمارے سامنے کیا

صورت آتی ہے۔ آیا مصیبتوں کی کوئی تلافی ہوگی یا نہ ہوگی، ذکر اٹھانے کا کوئی صلہ ملے گا یا نہیں؟

۷۔ شرح :- وہ یعنی محبوب پوچھتا ہے کہ غالب کون ہے؟ اب کوئی نہیں بتانے کہ ہم کیا بتائیں اور اس سوال کا جواب کیا دیں؟ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ غالب کا یہ شعر لغت خان عالی کے مندرجہ ذیل شعر سے اخذ ہے :

زمر دم یار می پرمد کہ عالی کیست طالع ہیں :

کہ عزم و محبت رفت و کار آخر رسید اینجا

محبوب لوگوں سے پوچھتا ہے کہ عالی کون ہے؟ قسمت دیکھیے کہ ساری عمر بت میں گزر گئی اور معاملہ یہاں تک آپہنچا۔ یعنی اسے یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ عالی کون ہے؟ مرزا غالب کا شعر بظاہر اس سے ملتا جلتا معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقتہً اس سے بالکل جدا گانہ حالات و واقعات پیش کیے گئے ہیں :

۱۔ پہلے مصرع سے ظاہر ہے کہ محبوب کے سامنے غالب کا ذکر آیا اور اس نے انتہائی تجاہل کا ثبوت دیتے ہوئے پوچھا، غالب کون ہے؟

۲۔ یہ معاملہ بھری محفل میں پیش آیا، جس میں خود غالب بھی موجود تھا۔

۳۔ یہ سوال سنتے ہی بخود کے قول کے مطابق غالب پر پہلی سی گری اور گھبرا کر اس مجمع سے خطاب کیا کہ ”لقد تا قودو“ میں کیا جواب دوں، شعر کا شعر بیانِ واقعہ نہیں واقعہ ہے۔

۴۔ جان بوجھ کر امتحان بنا اور یہ سوال کیا، گویا اسے محبوب کی طرف سے ایک چھیڑ بھی سمجھا جاسکتا ہے۔

۵۔ معلوم ہوتا ہے، یہ سوال سنتے ہی غالب بے تکلف یہ جواب دینے پر آمادہ ہو گئے کہ میں وہی ہوں، جو آپ پر جان دے رہا ہوں۔ پھر خیال آیا کہ ممکن ہے اس طرح محبوب خفا ہو جائے۔

۶۔ چنانچہ محبوب کی بزم میں بیٹھنے والوں سے پوچھا کہ تمہیں محبوب کی عادات

کا علم ہے۔ بنا تو وہ مجھے اس سوال کا جواب کیا دینا چاہئے، جو غلو بہ معلومت اور ممانعت
مردمانہ جو۔

عالمی کے شعر میں اس قسم کی حالت تو پیدا کر لی گئی، لیکن سارا معاملہ اس یا اس پر
ختم کر دیا گیا کہ محبت کا نتیجہ یہ نکلا۔ غائب کے شعر کا معنوں حدود پر پہلو دار ہے اور
اسلوب بیان پر غصہ و دفا ویزی ختم ہے۔



- ۱۔ لغات۔ لطافت :
لطیف ہونا۔ مدحیت۔ یہ لفظ ان
چیزوں کے لیے بھی مستعمل ہے،
جو نظر نہ آئیں، جیسے روح۔
کثافت : گاڑھا پن، جھپٹ
بادیت، وہ شے جو نظر آئے بیچیم۔
زنگار : وہ مسالا جو شیشے کی
پشت پر لگا دیتے ہیں اور وہ آئینہ بن جاتا ہے، جس میں مگس نظر آنے لگتا ہے۔ وہ
سبزی نائل شے، جو نمی کے باعث فولادی چیزوں پر جم جاتی ہے۔
- شرح :- شاعر نے پہلے حکیمانہ اصول پیش کیا کہ کوئی لطیف شے جب تک
کثافت اختیار نہ کرے، ایسا جلوہ پیدا نہیں کر سکتی، کہ سب کو نظر آنے جیسے روح
کسی کو نظر نہیں آتی، لیکن جب وہ کسی جسم میں جاری و ساری ہوتی ہے تو جسم کی تمام
حرکات و سکنت اسی کی بدولت نظر آتی ہیں اور لوگ کہتے ہیں، نٹاں شے زندہ ہے
اور اس میں روح موجود ہے۔ گو یا روح جسم کی کثافت سے وابستگی کیے بغیر جلوہ آرا،
نہ ہو سکی۔ شاعر نے اپنے دعوے کے لیے یہ دلیل قرار دی کہ دیکھیں فصل بہار آتی ہے
اور اس کا کوئی مادی وجود نہیں کہ نظر آ سکے، البتہ اس کی آمد سے باغ میں شادابی
و تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ بہر طر سبزہ آگ آتا ہے۔ پودے ہرے ہو جاتے ہیں۔

پھول نکل آتے ہیں۔ یہ سب کچھ فصل بہار کی آمد کا روشن ثبوت ہے۔ یوں ثابت ہو گیا کہ لطافت کثافت کے بغیر جلوہ نہیں دکھا سکتی اور اگر ہم فصل بہار کو آئینہ مرز میں کریں تو اس میں عکس پیدا کرنے کے لیے پشت پر جو سالانگہ یا مہاتا ہے، وہ چمن ہے۔ اگر مرز میں کریں کہ فصل بہار کے آئینے سے مقصود فولادی آئینہ ہے تو چمن اس کا انگارہ ہے یہاں وہ شب سبزی ہے۔

۲۔ **مشریح** :- خواہم ہائی اس شرکی شرح میں مزیاتے ہیں :

• ساحل لاگو اپنے تین بچائے، مگر حب دریا طغیانی پر آتا ہے تو ساحل محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح جہاں توسا قی بوداں ہوشیاری کا دھولے نہیں چل سکتا۔ یہ شر حقیقت اور محاذ دونوں پر محمول ہو سکتا ہے۔

دریا جوش میں آتا ہے اور اس میں تلاطم پیدا ہوتا ہے تو کنارے اس کے لیے روک نہیں بن سکتے۔ وہ اپنے چھپ کو کتنا ہی بچائیں، مگر پانی اچھل کر کناروں سے باہر آ جائے گا اور دور دور تک پھیل جائے گا۔ یہ وہی منظر ہے جس سے ہر شخص آگاہ ہے۔ اسی کو سامنے رکھ کر شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب! جس فصل میں توسا قی بن جائے اور تیرے ہاتھوں زندوں کو شراب بٹھنے لگے تو سب پی پی کرست دیخو ہومائیں گے اور کوئی بھی جوش کا دھولے نہ کر سکے گا۔

محبوب کی ساقی گری کو دریا کے جوش و تلاطم سے اور اپنے جوش کو ساحل کی خود داری سے تشبیہ دی ہے۔ عام مشابہہ یہی ہے کہ جب تک دریا میں جوش نہ ہو کنارے اس کے پانی کو ایک مقررہ بہاؤ پر چلاتے ہیں اور ادھر ادھر نہیں ہونے دیتے لیکن تلاطم کی حالت میں وہ بھی بے بس رہ جاتے ہیں۔



عشرتِ قطرہ ہے، دریا میں فنا ہو جانا درد کا حد سے گزرتا دوا ہو جانا
تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ اکبر تنہا لکھا بات کے بنتے ہی مجھ کو جانا

دل ہوا کشکش چارہ زحمت میں تمام مٹ گیا گھسنے میں اس مقدسے کا دھونا
 اب جتنا سے بھی میں محروم ہم، اللہ اللہ! اس قدر دشمن ارباب دغا ہو جانا!
 صغف سے گریہ مُبَدَل ہر دم سر ہو باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
 دل سے مینا تری انگشتِ حنائی کا خیال ہو گیا گوشت سے ناخن کا مُدّا ہو جانا
 ہے مجھے ابیرِ باری کا برس کر کھلنا روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا
 گر نہیں نکستِ گل کو ترے کوچے کی ہوس کیوں ہے گردہ جو لالہ صبا ہو جانا
 بخشے ہے جلوۂ گلِ ذوقِ تماشا غالباً چشم کو چاہئے ہر رنگ میں دا ہو جانا
 تاکہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوا سے حقیق دیکھ برسات میں سبز آئنے کا ہو جانا

۱۔ شرح :- خوابِ مآلیٰ فرماتے ہیں :

”جب دردِ حد سے گزر جائے گا تو مرجاش گے، یعنی فنا ہو جائیں گے
 گویا قطرہ دریا میں کھپ جائے گا اور یہی اس کا مقصود ہے۔ پس
 درد کا حد سے گزر جانا ہی اس کا دوا ہو جانا ہے۔“

قطرے کے لیے جو نصب العینِ انتہائی مسرت و شادمانی کا باعث ہے
 ہے کہ دریا میں گم ہو جائے۔ یعنی اپنی مختصر سی ہستی کو جو جزو کی حیثیت رکھتی
 ہے، شکل میں شامل کر دے۔ دردِ حد سے گزر جائے گا تو نتیجہ اس کے سوا کیا ہو گا
 کہ موت آجائے گی۔ یہی حقیقی مقصود ہے۔ کیونکہ اس کے سوا جزو کل میں شامل بنیں
 ہو سکتا اور مراد کو نہیں پہنچ سکتا، لہذا ثابت ہوا کہ درد کا حد سے گزرنا ہی حقیقت
 میں اس کی دوا اور اس کا علاج ہے۔

۲۔ لغات - قفلِ اسجد : ایک قسم کا قفل، جو کبھی کے بغیر کھلتا اور

بند ہوتا ہے۔ اس قفل کے حلقے میں، جو کنڈے کے اندر رہتا ہے چند چھتے پڑے ہوتے ہیں، جن پر مختلف حروف کندہ کر دیے جاتے ہیں۔ قفل بنانے والا ہر خریدار کو بتا دیتا ہے کہ فلاں لفظ بننے سے یہ قفل کھلے گا، چنانچہ وہ شخص چھتے گھسا کر مطلوب لفظ بنا لیتا ہے اور قفل کھل جاتا ہے۔ پھر اسے دبا کر بند کر دیتے ہیں، جیسے آج کل قفلوں کی ایک قسم میں کھونٹے کے نیچے تو کبھی استعمال کی جاتی ہے، بند کرنے کے لیے کبھی کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی، انہی شخصوں کو کہتا ہی گھمائے اصل لفظ بنا لینے میں شاید ہی کامیاب ہو سکے۔

بات کا بننا : بظاہر یہ الفاظ قفل، اسجد کا مطلوب لفظ بنا لینے کی مناسبت سے لائے گئے ہیں۔ یہاں ان سے مراد ہے تدبیر کا کامیاب ہونا، یعنی محبوب سے رابطہ ضبط پیدا کرنے کا راستہ نکال لینا۔

شرح :- اے محبوب! میری قسمت ہی میں یہ لکھا تھا کہ بات بن جائے اور میری تدبیر کا کامیاب ہو جائے تو میں تجھ سے جدا ہو جاؤں۔ یہ بالکل ایسی ہی صورت ہوئی، جیسے اسجد کے قفل میں معین لفظ بن جائے تو وہ کھل جاتا ہے، گویا الگ ہو جاتا ہے۔

۳ - شرح :- دل درد و غم میں مبتلا تھا۔ اسے دور کرنے کے لیے مختلف تدبیریں اختیار کی گئیں۔ ان سے فائدہ تو کچھ نہ ہوا، لیکن اس کشاکش میں دل ہی ختم ہو گیا۔ گویا ایک گرہ مٹی، جسے کھونٹنے کی ہر کوشش میں وہ گہستی گئی کھل تو نہ سکی، البتہ بار بار کی کوششوں میں گہتے گہتے وہ بالکل مٹ گئی۔

۴ - شرح :- مولانا طہطائی فرماتے ہیں :

”مطلب ظاہر ہے اور تعریف اس کی امکان سے باہر ہے۔ معشوق کی خفگی کی تصویر ہے اور خفگی بھی خاص طرح کی اور یہ مصنوع بھی خاص مصنف ہی کا ہے۔“

ایک اور بزرگ فرماتے ہیں :

تشریف کے لیے مجھے الفاظ نہیں ملتے۔ ایسے ہی اشعار کی وجہ سے
جن کی تعداد اس چھوٹے سے دیوان میں کثیر ہے اور اتنی تعداد دوسروں
کے ضخیم دیوانوں میں بھی نہیں ملتی، حضرت غالب قابلِ مدح ہیں اور
خدا نے سخن کہے جانے کے مستحق بنائے۔

اے محبوب! آپ کا لطف و کرم تو مدت ہوئی، ختم ہو چکا تھا اور ظلم و ستم
کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔ ہم اس پر بھی خوش تھے کہ تعلق تو بہر حال قائم ہے لیکن
اب ہم جفا سے بھی محروم ہو گئے۔ اشد اشد! وٹاکیشوں کا اس تندر و شمن ہونا
آپ کے لیے زیبا ہے، ایک لفظ بھی "نے" اس پرے مقدرِ حق سے کو واضح
کر دیا، جسے صرف سرسری طور پر یہاں پیش کیا گیا ہے۔ پھر دوسرے مصرعے میں
جو اسلوب بیان اختیار کیا ہے، اس کی ندرت اور تاثیر فوق سے تعلق رکھتی
ہے، لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتی۔

۵۔ لغات - مُنبَہل : تبدیل کیا گیا۔

دمِ سرود : ٹھنڈا سانس، آہِ سرود۔

شرح :- ہماری کمزوری اور ناتوانی اس حد پر پہنچ گئی کہ روٹھ کی
کوئی صورت نہ رہی، اس کی جگہ ٹھنڈے سانس لینے اور سرود آہیں بھرنے لگے۔
یعنی رونے نے دمِ سرود کی شکل اختیار کر لی۔ یہ بدیہی واقعہ دیکھ کر ہمیں یقین ہو
گیا کہ واقعتاً پانی شکل بدل کر ہوا کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

۶۔ لغات : انگشتِ حنائی : وہ انگلی جسے ہندی لگی ہوئی ہو۔

شرح :- اے محبوب! تیری ہندی لگی انگلی کی یاد کا دل سے منٹ
جانا اس طرح ناممکن ہے، جس طرح ناخن سے گوشت کا جدا ہونا ناممکن ہے۔
۷۔ شرح :- محبوب کی عداوت کے عزم میں روتے روتے مر جانا میرے
بزمِ عکسِ ایسا ہی پر لطف ہے، جیسے موسمِ بہار کا بادل برس کر کھل جائے۔

موسمِ بہار کا بادل برساتا ہے تو درختوں، شاخوں، پودوں، فصلوں اور سبزے

ہر سے خزاں کے تمام اثرات دُھل جاتے ہیں۔ امن و آسائش کی تازگی سے بدل جاتی ہے۔ ہر بہنہ شاخوں میں شگوفے نکل آتے ہیں۔ پتوں کی شاواہلیں دلاویز بن جاتی ہے۔ ہر طرف سبز آگ آتا ہے۔ گویا ایک ایک شے شگفتگی و شادمانی کا پیکر بن جاتی ہے اور چمن کی سیر زیادہ پر لطف ہو جاتی ہے۔ بالکل یہی کیفیت محبوب کی عبادت کے خم میں مرجانے سے عاشق کی ہوتی ہے۔

ہاں بھی پس منظر میں شاعر کا وہی تصور کار فرما ہے، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، یعنی جزو کا مٹ کر ٹکڑی میں شامل ہو جانا اور ہر وجود کا اپنے مبداء سے جاملنا۔ یہاں فنا ہو جانا حقیقت میں محبوب سے مل جانا ہے، اسی لیے اس واقعے کو اہر بہار کا برس کر کھل جانا قرار دیا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ شاعر نے معاملہ صرف تشبیہ تک محدود رکھا ہو، یعنی غمِ فرقت میں روتے روتے مرجانا میرے نزدیک ایسا ہی ہے، جیسے اہر بہار سے اور برس کر کھل جائے۔ یہ تشبیہ تام ہے، یعنی رونا اور فنا ہو جانا، جیسے بادل برس کر ختم ہو جاتا ہے۔ گویا عاشق کے نزدیک محبوب کے فراق میں روتے روتے مرجانا کوئی ایسا مرحلہ نہیں کہ اس کے لیے مشکل یا تشویش انگیز ہو۔

۸۔ لغات - نکبت : خوشبو۔

جولان : دوڑ۔ تیز رفتاری

شرح :- اگر بھول کی خوشبو کو تیرے کوچے میں پہنچنے اور تجھ سے فیض حاصل کرنے کی ہوس نہیں تو کیا وجہ ہے کہ وہ صبا کی دوڑ اور تیزی رفتار کے راستے کی گرد بنی ہوئی ہے؟ یعنی صبا میں کمالی خاکساری کے ساتھ شامل ہو کر ادھر ادھر چکر لگا رہی ہے۔ یقیناً اس کی آرزو یہی ہے کہ اے محبوب! تجھ تک پہنچے اور تیرے گیسو سے فیض حاصل کر کے اور معطر ہو جائے۔

۹۔ لغات - اعجاز : لفظی معنی، دوسرے کو عاجز کرتا، مجبور۔ کرشمہ۔

ہوڑا : آرزو

صیقِل : چلا، چک، صفائی۔

شرح :- آئینے سے مراد فولادی آئینہ ہے۔ سبر وجود کو چلا پانے، روشن ہونے اور سبر داغ و صباغ کو کر دینے کا عشق ہے اور اس عشق کی کرشمہ کاری نے ہر شے کو اتنا مسخ کر رکھا ہے کہ وہ چاہتی ہے، کوئی داغ لگے اور اسے صاف کیا جائے۔ دیکھیے فولادی آئینہ برسات میں نہی کی وجہ سے سبز مچھتا یعنی اسے رنگ لگ جاتا ہے۔ وہ بھی صرف اس لیے رنگ آلود ہوتا ہے کہ صیقِل گر کے پاس نہنچے اور اسے صاف، روشن اور مچھتا کیا جائے۔

شاعر کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ جلا کی آرزو سبر قلب میں انتہا پر پہنچی ہوئی ہے اور سبر دل سر مشق چلا بننے کے لیے مضطرب ہے۔

۱۰۔ شرح :- اے غائب! پھولوں کا جلوہ دیکھنے سے دل میں چیزوں کے دیکھنے کا ذوق تربیت پاتا ہے اور جلوہ گل کا حقیقی مقصد ہی یہ ہے کہ انسان میں دیکھنے کا ذوق ترقی کرے۔ کوئی بھی منظر سامنے آئے، اس کا رنگ روپ کیسا ہی ہو، آنکھ کو چاہیے کہ ہر حال میں کھلی رہے اور اُسے دیکھے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک آنکھ میں دیکھنے کا ذوق اور دل میں ہر شے سے فائدہ اٹھانے کی تڑپ موجود نہ ہو، اس کائنات کے حقائق انسان پر نہیں کھل سکتے اور اللہ تعالیٰ نے اسے جو بصارت و بصیرت عطا کی ہے، اس سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

○
پھر مڑا وقت کہ ہو بال کشا، موج شراب
وے بطئے کو دل دوست شاموج شراب
بوجھ مت و جبر سید مستی ارباب چمن
ساجہ تاک میں ہوتی ہے، ہوا، موج شراب

ان اشعار میں برسات کے مناظر
پیش نظر رکھتے گئے ہیں اور برسات
کو مرزا غالب ہندوستان کی
بہار سمجھتے تھے، چنانچہ وہ خود
فارسی کی ایک غزل کے مطلع

میں کہتے ہیں :
 ہمارا جبرود برشکال ہاں غالب
 دریں خزاں کردہ ہم مومہ شرابِ جنت
 ۱۔ لغات - بال کشا ہوا
 اڑنے کے لیے پرتون۔
 بھٹا مے : شراب کی مڑی
 جس کی شکل بطن کی سی ہوتی ہے
 اس قسم کی مڑیاں عموماً اس
 وقت استعمال کی جاتی تھیں ،
 جب گرم شراب کسی حوض یا
 ندی کے کنارے آراستہ ہوتی تھی
 دل و دست ثنا :
 تیرنے کا دل اور ہاتھ یعنی حوصلہ
 اور قوت۔
 شرح : پھر وقت آ
 گیا کہ موجِ شراب اڑنے کے
 لیے پرتو لے اور شراب کی بطن
 نما مڑی میں تیرنے کا حوصلہ
 اور قوت پیدا ہو۔
 شراب کی مڑی کو تیرنے
 کا حوصلہ اور قوت دینے کا ذکر
 اس لیے کیا کہ شراب کی مڑی
 حوض کے کنارے آراستہ کی جاتی
 جو ہوا غرق نہئے ، بخت رسا رکھتا ہے۔
 سر سے گزرے پر بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب
 ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
 موجِ بستی کو کرے فیضِ ہوا ، موجِ شراب
 پار موجِ اشقی ہے طوفانِ طرب سے ہر کو
 موجِ گل ، موجِ شفق ، موجِ صبا ، موجِ شراب
 جس قدر روحِ نجاتی ہے جگر تشنہ ناز
 دے ہے تسکین بہ دمِ آبِ بقا ، موجِ شراب
 بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں غل ہو ہو کر
 شیرِ رنگ سے ہے بالِ کشا ، موجِ شراب
 موجِ گل سے چراغاں ہے گزر گاؤ خیال
 ہے تصور میں زلسِ جلوہ نما ، موجِ شراب
 نشے کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ
 بسکہ رکھتی ہے سر نشو و نما ، موجِ شراب
 ایک عالم پر میں طوفانی کیفیت فصل
 موجِ سبزہ نوخیز سے تا موجِ شراب

میں کہتے ہیں :
 ہمارا جبرود برشکال ہاں غالب
 دریں خزاں کردہ ہم مومہ شرابِ جنت
 ۱۔ لغات - بال کشا ہوا
 اڑنے کے لیے پرتون۔
 بھٹا مے : شراب کی مڑی
 جس کی شکل بطن کی سی ہوتی ہے
 اس قسم کی مڑیاں عموماً اس
 وقت استعمال کی جاتی تھیں ،
 جب گرم شراب کسی حوض یا
 ندی کے کنارے آراستہ ہوتی تھی
 دل و دست ثنا :
 تیرنے کا دل اور ہاتھ یعنی حوصلہ
 اور قوت۔
 شرح : پھر وقت آ
 گیا کہ موجِ شراب اڑنے کے
 لیے پرتو لے اور شراب کی بطن
 نما مڑی میں تیرنے کا حوصلہ
 اور قوت پیدا ہو۔
 شراب کی مڑی کو تیرنے
 کا حوصلہ اور قوت دینے کا ذکر
 اس لیے کیا کہ شراب کی مڑی
 حوض کے کنارے آراستہ کی جاتی

شرح ہنگامہ ہستی ہے، نہ ہے ہوسم گل
 رہبرِ صراطِ دریا ہے، خوشا! موجِ شراب
 ہوشِ غلاتے ہیں مرے، جلوۂ گل دیکھ، اسدا
 پھر مجاہدِ وقت کہ ہو بالِ کشا، موجِ شراب
 یہاں ہے۔ یہاں نخلِ ناصراچی کی اسی گردش کا ذکر ہے۔

۴۔ لغات - تاک : انگور کی بیل، انگور

شرح : یہ خوب چھپے کہ چمن والوں میں انتہائی مستی کس وجہ سے پیدا ہو گئی
 حالت یہ ہے کہ ہوا انگور کی بیل کے سائے میں پنپتی ہے تو شراب کی لہریں
 جاتی ہے۔

سیاہ مستی اس لیے کہا کہ برسات میں درختوں کے پتے اتنے سبز ہو جاتے
 کہ ان کی سبزی میں ہلکی سی سیاہی آ جاتی ہے۔ شاعر نے یہ کیفیت دیکھی، ساتھ ہی
 برسات کی ہواؤں میں ان کے جھونے پر نظر پڑی۔ ادھر آسمان پر سیاہ گھٹائیں
 دکھائی دیں تو یہ احساس پیدا ہوا کہ بارغ کے چھوٹے بڑے درختوں اور چودوں
 پر انتہائی مستی چھائی ہوئی ہے۔ اس مستی کا یہ اثر ہے کہ انگور سے شراب بننے
 اور لب تک پہنچنے کی حاجت نہیں، بلکہ ہوا انگور کی بیل کے نیچے پنپتی ہے، اسی
 موجِ شراب بن جاتی ہے۔ جب حالت یہ ہو تو ہوا سے اور باپ چمن کی سیاہی
 کا سبب ہو چھنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ ہوا انگور کی بیل
 کے نیچے سے گزرتی ہے اور موجِ شراب بن کر تمام درختوں اور چودوں کو مدھوش
 کر رہی ہے۔

۴۔ لغات - غرقۂ می : شراب میں ڈوبا ہوا یعنی مدھوش۔

مخت رسا : بلند اقبال اور خوش نصیب۔

بالِ بَہا : بَہا کا پَر۔ مشہور ہے کہ بَہا کا سایہ کسی پر پڑ جائے تو وہ بلند اقبال سمجھا جاتا ہے، یہاں تک کہ بادشاہ ہو جاتا ہے۔

شرح : جو شخص شراب میں غرق ہو گیا، یعنی پی پی کر اسے کچھ ہوش نہ رہا، یہ سمجھ لیجئے کہ وہ نہایت بلند اقبال اور خوش نصیب ہے۔ شراب کی لہریں عجیب چیز ہے کہ اگر سر کے اوپر سے بھی گزر جائے تو کتا چاہیے کہ بھاگے پر کی سعادت اور بلند بختی نصیب ہوئی۔

نئے میں غرق ہونے کی مناسبت سے موجِ شراب کا سر سے گزرتا لائے۔ کوئی شخص پانی میں ڈوب جائے تو وہ زندہ نہیں رہتا اور پانی سر سے گزر جائے تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ انسان ڈوب گیا اور مرزا کے نزدیک شراب کا اثر بالکل اٹا ہوتا ہے۔ یعنی اگر اس میں ڈوب جائے تو وہ خوش نصیب ہے اور شراب سر سے گزر جائے تو سمجھنا چاہیے کہ بالِ بَہا کا سایہ سر پر پڑا ہے۔

۴۔ برسات کا موسم اتنا خوشگوار اور کیفیت انگیز ہے کہ اگر ہوا کے فیض سے زندگی کی موجِ یمنِ زندگی شراب کی لہریں جاتے تو تعجب نہ ہوتا چاہیے۔

شاعر کا مقصود یہ ہے کہ برسات نے ہوا میں ایک خاص کیفیت اور نشہ پیدا کر دیا ہے۔ یہ نشہ ہر شے پر اثر ڈال رہا ہے، لہذا زندگی کی لہر شراب کی لہر بن جائے تو کیوں تعجب ہو؟

۵۔ شرح : بہر طر مسرت و شادمانی کا طوفان برپا ہے۔ اس طوفان میں چار موجیں بہ طور خاص بلند و نمایاں ہیں، اول موجِ گل، دوم موجِ شفق، سوم موجِ صبا چارم موجِ شراب۔

بلاشبہ برسات میں بے شمار بھول پیدا ہوتے ہیں، خصوصاً پہاڑوں پر اور ان کے

داسی میو۔

بھر برسات میں گرد و غبار دُھل کر فضا بالکل پاک و صاف ہو جاتی ہے، اس

بجے شفق کے سرخی میں زیادہ گیرائی اور دلآویزی نظر آتی ہے۔ یہ دوسری موج ہوو
میری موجِ مہالی، جو موسم کی قدرت کم ہو جانے کے باعث زیادہ خطرناک اور مہلک
ہے اور چوتھی موج یعنی موجِ شراب کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ ہر طرف خوشی کا
جو طوفان اٹھا ہوا ہے، یہی چار موجیں اس کے خاص اجزاء ہیں۔

۶۔ لغات : روحِ نیاقی : قوتِ نامیہ، جس سے تمام نباتات میں نشوونما
کا درزا ہے۔

جگر تشنہ ناز : عقلی معنی وہ شے جس کا جگر ناز کا پیاسا ہو، یعنی لہلہانے
کے لیے بیتابی و بقراری۔

دمِ آبِ بقا : آبِ حیات کا گھونٹ۔

تشریح : نباتات میں نشوونما کی جو قوت ہے، وہ اس لیے بیتاب ہے کہ
جلد سے جلد بڑھے اور لہلہانے لگے۔ موجِ شراب اس کی بقراری دگر کرنے کی غرض
سے آبِ حیات کے گھونٹ پلا پلا کے تسکین و اطمینان کا سامان بہم پہنچا رہی ہے۔
مطلب یہ ہے کہ روحِ نیاقی لہلہانے اور اکھیدیاں کرنے کے لیے جس قدر
مضطرب ہے، موجِ شراب اسے آبِ بقا پلا پلا کر تسکین دے رہی ہے یعنی صحت
کر رہی ہے۔ گویا شاعر کے نزدیک ایک طرف جن میں آب و تاب پیدا کرنے کا موجب
نہیں، دوسری طرف یہ برسات کے موسم در رہے۔

خوفا طبا طبائی فرماتے ہیں کہ قوتِ نامیہ :

۱۔ انسان میں بھی ہے، مطلب یہ ہے کہ ہم میں شراب سے جو انگ
اور جوش پیدا ہوتا ہے، وہ قوتِ نامیہ کی حرکت سے ہے، یعنی شراب
قوتِ نامیہ کے حق میں وہ کام کرتی ہے، جو کام کہ باطنِ نباتات کے حق
میں کرتی ہے اور ناز سے یہاں اینٹنا اور تنقا مقصود ہے، جو لازمِ نذرناز
سے اور نشوونما کے خواص سے ہے۔

۲۔ تشریح : شراب کی موجِ انگور کی، بیل کی رگوں میں خون بہہ کر دو رہا ہے۔

ہے۔ اس نے رنگ سے شہرے لیا اور اڑنے کے لیے پر تول لیے ۔
مولانا علیہا بانی فرماتے ہیں :

”ہیں طرح خونِ رگوں میں دوڑتا ہے ، اسی طرح بیلوں میں اورہ نظر اب
دوڑ رہا ہے اور اس کے سبب سے بیلیں سر سبز و شاداب ہیں۔ گویا
اس کا دوڑنا پر داز ہوا اور کھینچی و رنگینی شہر پر دان ہے ۔“
۸۔ لغات - موجہ گل : پھولوں کا جوش اور کثرت۔

شرح : ہمارے تصور میں شراب کی موج اس کثرت سے جلوے دکھا
رہی ہے کہ معلوم ہوتا ہے ، دود دوڑ تک پھولوں کا جوش ہے اور ہر طرف پھولوں
ہی کے تختے کھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ پھر پھولوں کے جلوے نے خیال کی گزر گاہ
میں چراغاں کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے ۔

مولانا علیہا بانی بالکل بجا فرماتے ہیں کہ اس شعر میں موج شراب کو پہلے موج گل
سے ، پھر چراغاں سے تشبیہ اور پھر چراغاں کی مناسبت کے پیش نظر خیال کو گزر گاہ
سے تعبیر کیا ۔

”شراب کو چراغاں سے اگر تشبیہ دیں تو کوئی وجہ شبہ نہیں ؛ اُن
موج شراب کو موج گل سے تشبیہ دیں تو وجہ شبہ رنگ و بو میں
موجود ہے اور موج گل کو چراغاں سے تشبیہ تام ہے ، یعنی ہر گل کی
افروختگی شعلہ چراغ سے مشابہ ہے ۔“

۹۔ شرح : موج شراب و ماغ کو نشوونما دینے کا اتنا خیال رکھتی ہے
کہ نشے کا پردہ اختیار کر کے وہ و ماغ میں پہنچی اور لپدی محویت سے دیکھ رہی ہے کہ
یہ کیونکر جڑتا ہے اور ترقی پاتا ہے ۔

گویا غائب کے نزدیک موج شراب اس لیے نشہ بن کر و ماغ پر اثر انداز
ہوئی کہ خوب دیکھ بجالا کر ہی ہوئی اس کے نشوونما کا فریضہ انجام دے ۔
اس شعر میں ”سبز و ماغ“ اور ”پردہ“ کی مناسبت متنازع تشریح نہیں۔

۱۰۔ لغات۔ طوفانی۔ طوفان اٹھانے والے، طوفان آفرین۔

سبزہ نوخیز : نیا اُگا ہوا سبزہ۔

شرح : ننھے اُگے ہوئے سبزے کی موجیں شراب تک ہر موج نے برسات کے موسم کی کیفیت کا ایک ایسا طوفان بپا کر دیا ہے، جو دنیا کے ہر جھٹے پر چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ یعنی برسات ہر وہی ہے۔ ہر طرف سبزہ لہریں لے رہا ہے۔ شراب کی محفلیں آراستہ ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لٹے کا طوفان اُٹھ آ رہا ہے جس نے ساری دنیا کو آغوش میں لے لیا ہے۔

۱۱۔ شرح : پھولوں کا موسم کتنا اچھا ہے کہ اس سے ہستی کے ہنگامے کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ شراب کی موج کتنی مسرت خیز ہے کہ قطرے کی رہنمائی دیا کی طرف کر دیتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ برسات میں ہر طرف سبزہ اُگ آ رہا ہے۔ پھول کھل گئے، درختوں پر بہار آگئی۔ ان سب چیزوں سے ثابت ہو گیا کہ زندگی کا ہنگامہ بھی اسی طرح گرم ہوا پھر اس میں شاعر نے ایک خاص پہلو رکھا کہ جب خزاں کا موسم آتا ہے تو یہ سب چیزیں ناپید ہو جاتی ہیں اور موسم گل میں از سر نو پیدا ہو گئیں۔ اس سے ہنگامہ ہستی کی بے ثباتی ثابت کی، گویا یہ وہی شے ہے جسے عرقی نے برہان حدوث قرار دیا، یعنی از سر نو پیدا ہونا اور یہی اس کی بے ثباتی کی دلیل ہے، کیونکہ وہ مستقل اور قائم بالذات نہیں۔ موج شراب اس وجہ سے قطرے کے لیے دریا کی طرف رہبر بن گئی کہ اس کا خاصہ ہی نشہ پیدا کر دیتا ہے اور انسان مدحوش ہو جائے تو وہ بخود اور آپس سے باہر مہم جاتا ہے۔ یوں گرد و پیش کی ہر شے سے بے تعلق ہو کر اپنے بہار کی طرف رجوع کر لیتا ہے۔ قطرے کا بہار دریا، انسان کا بہار ذات باری تعالیٰ ہے۔

۱۲۔ شرح : اے استاد! پھولوں کا جلوہ دیکھ کر میرے ہوش اُڑ رہے ہیں۔ پھر دقت آگیا ہے کہ موج شراب اُڑنے کے قصور سے پڑ تو لے۔ یعنی پھولوں کے عام جلوے نے یاد دلادیا کہ شراب کا دور چلنا چاہیے۔

۱۔ لغاتِ دیدیاں : افسوس کہ دیدیاں کا کیا رزق فلک نے
دُور کی جمع، کپڑے۔

جن لوگوں کی سنی درخور عقیدہ گھر، انگشت
عقیدہ گھر : موتیوں کی
کافی ہے نشانی تری، چھتے کا نہ دینا
طی۔

شرح : انہوں نے جن
لوگوں کی ہر انگلی موتیوں کی ٹہنی
کے لائن سنی، یعنی جسے ہر لحظہ
دیکھ کر ہر ہی سے سروکار ہوتا
خالی مجھے دکھلا کے بد وقت سفر، انگشت
چاہیے تھا، آسمان نے اسے کیڑوں
لکھتا ہوں اسد! سوزشِ دل سے سخن گرم
تارکے نہ سکے کوئی میرے حرف پر انگشت

کا زرق بنا دیا۔ یعنی وہ مر گئے اور ان کے جسم اور انگلیاں کیڑوں کی نذر ہو گئیں۔
ایک نسخہ "دیدیاں" کی جگہ "دنداں" ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوا کہ جن
لوگوں کو مال و دولت سے سرمہ اڑ رہا تھا۔ انہیں آسمان نے اس درجہ بے حال
و نامراد دکھا کہ وہ حسرت سے اپنی انگلیاں کاٹ رہے ہیں۔

شعر کی وضع و اسلوب کے پیش نظر "صحیح" دیدیاں "ہی ہے نہ کہ" دنداں۔
۲۔ شرح : سفر کے وقت کوئی چیز نشانی کے طور پر دینے کا عام دستور ہے۔
غائب نے بھی محبوب کے رخصت ہوتے وقت اس سے نشانی کے طور پر چھتہ مانگا
لیکن محبوب نے خالی انگلی دکھا دی، گویا بتا دیا کہ چھتہ میرے پاس ہے ہی نہیں، جو
نشانی کے طور پر دے دوں۔ مرزا کہتے ہیں کہ تیرا چھتہ نہ دینا اور خالی انگلی دکھانا
ہی میرے لیے ایسی نشانی ہے کہ اور کسی نشانی کی ضرورت نہیں۔
دوسرے مصرع کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محبوب نے رخصت ہوتے وقت
شوخی سے انگوٹھا دکھا دیا۔

۳۔ لغات۔ سخن گرم : غریبوں سے بھرا ہوا کلام، اعلیٰ درجے کے اشعار
انگشت رکھنا : عیب کا نہ، احترا من کرنا۔

شرح : اے اسد! میں سو نہ دل سے نہایت شگفتہ اور خوبیوں سے
 بہرہ نہ شکر کرتا ہوں کہ کوئی شخص میرے ایک حرف پر بھی انگلی نہ رکھ سکے، یعنی جیب
 نہ نکال سکے۔

”سوزشِ دل“ اور ”سرخ گرم“ اس لیے لائے کہ گرم چیز پر کوئی شخص انگلی نہیں
 رکھ سکتا۔ گویا یہ شعر محاوروں کے علاوہ بقا بہر بھی بالکل درست رہا۔

رہا اگر کوئی تا قیامت، سلامت پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت
 جگر کو مرے، عشقِ خوننا بہ مشرب لکھے ہے ”خداوندِ نعمت، سلامت“
 علی الترخم دشمنِ شہیدِ وفا ہوں مبارک مبارک! سلامت سلامت!
 نہیں گر سرو برگِ اوراقِ معنی تماشا ہے نیز نگ صورتِ سلامت!

۱۔ **شرح :** اگر کوئی شخص قیامت تک بھی سلامت رہا تو جناب والا! ہمارے
 سے تو مضر نہیں۔ بہر حال کسی نہ کسی دن اس دنیا سے رخصت ہونا ہی پڑے گا۔ یعنی
 موت برحق ہے اور کوئی اسے ٹال نہیں سکتا۔ آگے تیچھے سب کو مرنا ہے۔

۲۔ **لغات :** خوننا بہ مشرب : جس کا مشرب خون پیا، خون پینے کا رسیا
 یا عاری۔

شرح : عشق کا کام ہی یہ ہے کہ خون پیے، وہ اسی شغل کا رسیا ہے۔ میرے
 جگر سے اس نے خون پی لیا کہ خوب پرورش پائی ہے۔ اب وہ جگر کو خط لکھتا ہے تو
 خداوندِ نعمت سلامت لکھتا ہے یعنی اسے اپنا آقا و مرتبی سمجھتا ہے۔

۳۔ **لغات :** علی الترخم : برخلاف، برعکس۔

شرح : میں رقیب کی روش اور خواہش کے خلاف وفا کے واسطے کاشید
 ہوں۔ میں نے وفا داری کے تقاضے پورے کرنے میں جان دی ہے، لہذا میرے

اس امتیاز پر دینا مبارک اور سلامت کو رہی ہے۔ مبارک اس لیے کہ دفا کے مسئلے میں شہادت پائی، سلامت اس لیے کہ شہیدوں کو عید کی زندگی حاصل ہوتی ہے خواہم حافظہ فرماتے ہیں:

ہرگز نہ میر و آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت است بر حدیث عالم دوام

۴۔ لغات۔ سرور برگ : سامان

اوراک : پانا۔ سمجھنا۔ دریافت۔

شرح : اگر حقیقت کا راز پالینے اور سمجھنے کا سامان تیسر نہیں تو نہ ہی،

صورت کی نیرنگیوں کے تماشے ہی سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

حقیقت پائینا اور سمجھنا معرفت کا درجہ کمال ہے، لیکن اگر یہ درجہ حاصل نہ ہو

تو اس کائنات کی تمام اشیاء میں رات دن جو نیرنگیاں نمود پزیر ہوتی ہیں، ان پر توجہ جھانے رکھنے سے بھی بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ بھی درحقیقت معرفت ہی کی طرف لے جاتی ہیں، بشرطیکہ ہم توجہ سے انھیں دیکھیں اور غور کریں۔

مند گئیں، کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غائب

یار لائے مرے بالیں پہ اُسے پر کس وقت؟

۱۔ لغات۔ مُند جانا : بند ہو جانا

بالیں : سر ہٹانا۔

شرح : اُسے غائب آنکھیں بند ہو گئیں یعنی موت آگئی۔ انھیں کھلا رکھنے

کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ دیکھیے دوست احباب محبوب کو کیسے وقت میرے سر ہٹانے لائے۔

مراد یہ ہے کہ دوستوں نے مجھ پر احسان تو کیا، مگر ایسے وقت میں، جب میں اسی

احسان سے فائدہ اٹھانے کے قابل نہ رہا۔

یہ مضمون مرزا نے تقریباً انہیں الفاظ میں ایک اور جگہ بھی لکھا ہے :

مُتَدَغِیْشِ کھوئے ہی کھوئے آنکھیں، ہے ہے

خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس



آبدِ خط سے ہوا ہے سر و جوہرِ بازارِ دوست

دو دُشمنِ کشتہ تھا، شاید خطِ رخسارِ دوست

اے دلِ ناعاقبت! نہ شیشِ ضبطِ شوق کر

کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ رخسارِ دوست

خانہ ویراں سازِ بی حیرت، تماشا کیجیے

صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتہ رفتارِ دوست

عشق میں بیدارِ شکِ غیر نے مارا مجھے

کُشتہ دشمن ہوں آخر اگرچہ تھا بیمارِ دوست

چشمِ مارِ روشن، کہ اُس بیدارِ دلِ شاد ہے

دیدۂ پُر خوں بہارا، ساغرِ سرشارِ دوست

غیر یوں کرتا ہے میری پریشاں کے حجر میں

بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمِ خوارِ دوست

۱۔ لغات۔ بازارِ سر و جوہر:

مندا پڑنا۔ بے رونق ہونا۔

شرح۔ محبوب کے خطِ نکل

کیا اور اس کے حسن و جمال کا بازار

مندا پڑ گیا۔ شاید اس کے رخسار

کا خط بھی ہوئی شمع کا دھواں تھا۔

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے

دھواں اٹھتا ہے، گویا دھوئیں

کا اٹھنا شمع کے بجھ جانے کی دلیل

ہوتا ہے۔ مرزا نے دو کو خط

سے، شمع کو حسن و جمال اور شمع

کشتہ کو حسن و جمال کی انفرادگی

سے تشبیہ دی۔

۲۔ شرح : اے دل !

تو نے کیوں اپنے انجام کی طرف

سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں ؟

بہتر یہی ہے کہ تو شوقِ دیدار

میں جناب نہ ہو، صبر و ضبط سے

کام لے۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ دوست کے جلوے کی تاب کوئی نہیں لاسکتا؟ کیا حضرت مومنؑ کا واقعہ تجھے یاد نہیں کہ کس طرح وہ بیہوش ہو کر گر گئے تھے؟

۳۔ لغات - خانہ

دیراں سازی : گھر اُجاڑنا، گھر کو دیران کرنا۔

رفتہ : والدہ شیدا، بٹا ہوا۔

شرح : دیکھیے حیرت

نے میرا گھر کس طرح اُجاڑ دیا ہے؟ میں نقشِ پا کی طرح محبوب کی رفتار پر مٹا ہوا ہوں۔

نقشِ قدم کو حیرت زدہ ہیں

یہ کہ اس میں کوئی حس و حرکت

نہیں ہوتی۔ جیسا نقشِ پڑ گیا، ویسا ہی رہتا ہے۔ جب عاشق خود نقشِ قدم کی طرح سراپا

حیرت بن کر محبوب کی رفتار پر مٹا اور اسے گھر کی سوجھ بوجھ نہ رہی تو ظاہر ہے

کہ یہی حیرت اس کا گھر برباد کرنے کا موجب بن گئی۔

۴۔ لغات - بیمار دوست : محبوب کا بیمار یعنی عاشق۔

شرح : میں محبوب کی محبت میں بیمار تھا اور اسی بیماری میں مجھے مرنا

چاہیے تھا، لیکن اس اثناء میں محبوب نے رقیب پر مہربانیاں شروع کر دیں۔ ان

مہربانیوں پر رشک نے مجھے اس طرح ظلم و ستم کا نشانہ بنایا کہ میں جان بچھن ہو گیا۔

گویا اگرچہ بیمار دوست تھا، مگر کشتہ دشمن بن گیا۔

تاکہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی دامنِ تلک

مجھ کو دیتا ہے پیام و وعدہ و دیدارِ دوست

جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوہ ضعیفِ دماغ

سُمر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبرِ بارِ دوست

چکے چکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر

ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست

مہربانیاں دشن کی شکایت کیجیے

یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست؟

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آئی ہے آپ

ہے رولیفِ شعر میں، غالبِ زبسنِ تکرارِ دوست

جس کا سہرا ہے۔ جب عاشق خود نقشِ قدم کی طرح سراپا

حیرت بن کر محبوب کی رفتار پر مٹا اور اسے گھر کی سوجھ بوجھ نہ رہی تو ظاہر ہے

کہ یہی حیرت اس کا گھر برباد کرنے کا موجب بن گئی۔

۵۔ لغات - چشم ماروشن : ہماری آنکھ کھل جائے۔ فارسی کا یہ کلمہ خوشی کے موقع پر بولتے ہیں۔

ساغر سرشار : بھرا ہوا اور بالباب پیلا۔

شرح : ہمارے بیدار و محبوب کا دل خوش ہے تو ہمیں کیوں خوش نہ ہو؟ ہماری لہو سے بھری ہوئی آنکھیں محبوب کے نزدیک شراب کے بالباب ساغر ہیں۔
 ”دیرہ پر خون“ کی مناسبت سے ”چشم ماروشن“ کہا اور دل کی شادمانی کے لیے ساغر سرشار لائے۔

۶۔ شعر نمبر ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶ مسلسل ہیں، انہیں قطعہ بند سمجھنا چاہیے۔

شرح : رقیب مجھ فرقت کے مارے کا حال اس طرح پرچتا ہے۔ جیسے کوئی دوست دوسرے دوست کی غم خواری کر رہا ہو۔

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ تکلیف و اذیت کی حالت میں غمخواری انسان کو ہمیشہ پسندیدہ معلوم ہوتی ہے، لیکن مرزا اس پر سخت پریشان ہیں، کیونکہ انہیں رشک ٹڑ پار رہا ہے۔

۷۔ شرح : رقیب مجھے اگر پیغام دیتا ہے کہ محبوب نے دیوار کا دھندہ کر لیا ہے۔ اس پیغام سے اس کا مقصد کیا ہے؟ مقصد یہ ہے کہ میں جان لوں۔ اسے بھی محبوب تک رسائی حاصل ہے۔

۸۔ لغات - سر کرنا : فارسی سر کردن سے ہے یعنی شروع کرنا۔ اس کے معنی توپ، ہندوق چھوڑنا اور فوج کرنا بھی ہیں۔

شرح : جب میں یہ شکایت کرتا ہوں کہ میرا دماغ کمزور ہے اور میں باتوں کی تاب نہیں لاسکتا تو رقیب محبوب کی عنبر بار زلفوں کا قطعہ چھڑ دیتا ہے۔

خوشبو کو ضعف دماغ کا علاج سمجھا جاتا ہے، چنانچہ جب کوئی بیہوش ہو جاتا ہے تو اسے لٹکھڑنگھڑاتے ہیں، جو مختلف خوشبوؤں سے تیار کیا جاتا ہے۔ رقیب بھی زلف عنبر بار کی بات اس لیے شروع کرتا ہے کہ ضعف دماغ کا مراد

ہو جائے۔

سر، داغ، زلف، عنبر بار وغیرہ کی مناسبت محتاج تشریح نہیں۔

۹۔ شرح : جب وہ مجھ چپکے چپکے آنسو بہاتے ہوئے دیکھتا ہے تو خود ہنس کر محبوب کی شوخی گفتار کا بیان شروع کر دیتا ہے۔

اس شعر میں بھی رونے کے مقابل ہنسنا اور چپکے چپکے کے مقابل بیان شوخی گفتار لائے۔

دقیب نے محبوب کی شوخی گفتار کا بیان یقیناً اس وجہ سے شروع کیا کہ عاشق کے لیے اس شوخی گفتار سے بڑھ کر دلاویز و دلپسند چیز کوئی نہیں ہو سکتی تھی، لیکن اس میں ستم ظریفی کا پہلو بالکل واضح ہے اور عاشق کی نظر اسی پر ہے۔ یعنی رقیب یہ سب کچھ عاشق کو بدلنے کی غرض سے کہہ رہا ہے۔

۱۰۔ لغات - سپاس : شکریہ

شرح : یہ پوری کیفیت بیان کر چکنے کے بعد مرزا افزاتے ہیں : اب بتائیے آیا رقیب کی مہربانیوں کی شکایت کریں یا محبوب عاشق کو دیکھ پہنچانے کی جس لذت کا خوگر ہے، اس کا شکر بجالائیں ؟

دشمن یعنی رقیب کی مہربانیاں بھی عاشق کے لیے شکایت ہی کا باعث ہوتی ہیں کیونکہ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے، مقصود یہ ہوتا ہے کہ عاشق کو تکلیف پہنچے، اُس کا دل دکھے اور محبوب کی آزار دہانی بھی بہر حال مشکوہ ہی کا موجب ہوتی ہے۔

۱۱۔ شرح : اے غالب ! یہ غزل مجھے دل سے پسند آتی ہے، کیونکہ اس کی ردیف میں بار بار دوست یعنی محبوب کا لفظ آیا ہے اور عاشق اس لفظ کی تکرار سے بھی خوش ہوتا ہے۔

گلش میں بند و بست ہو رنگ و گر ہے آج
۱۔ لغات - ہر رنگ و گر :-
دوسرے رنگ کا، جداگانہ طرز کا۔
قرئی : ناخستہ کی ایک قسم جس
کی گردن میں طوق یعنی حلقہ سانا
ہوڑا ہوتا ہے۔ شرادے سرو کا
عاشق قرار دیتے ہیں۔

اے عافیت ! کنارہ کر اے انتظام ! چل
حلقہ بیرون در : دروازے
کے باہر کی کنڈی۔
سیلاب گریہ ورپے دیوار و در ہے آج
شرح : مرکا نا طبا بٹائی نراتے
ہیں، جس شخص کو محفل میں بارہ ہو اور اسے باہر ہی رک دیا گیا ہو اسے بھی
حلقہ بیرون در کہتے ہیں۔

آج باغ میں نئی وضع کا انتظام کیا گیا ہے اور قرئی کو بھی جو باغ کا مشہور پرندہ
ہے، باہر نکال دیا گیا ہے۔ گویا اس کا طوق باغ کے بیرونی دروازے کی کنڈی بنا
ہوا ہے۔ بظاہر شرکاء کا مطلب یہ ہے کہ وہ محبوب باغ میں آ رہا ہے، جس کا قدر
سرو و ششاد کے لیے بھی باعثِ صدمہ و شک ہے۔ اس وجہ سے انتظام کی صورت
بالکل دوسری ہو گئی، جیسے کسی بڑی ہستی کی آمد پر خصوصی انتظامات کر لینے کا دستور
ہے۔ اس سلسلے میں قرئی تک کو باہر نکال دیا گیا ہے۔

۲۔ لغات - پارہ : ٹکڑا

شرح : آج ہر آہ کے ساتھ دل کا ایک ٹکڑا اچلا آ رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ
میرے سانس کا تار اثر کو پہنچانے کے لیے کند بن گیا ہے یعنی میرا سانس آج اپنے اندر
اڑ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے دل کے ٹکڑے آہوں کے ساتھ باہر آ رہے ہیں۔

۳۔ شرح : اے آرام و راحت ! الگ ہو جاؤ اور اے نظم و ضبط ! الگ ہو جاؤ کیونکہ
میرے رونے سے جو بے پناہ سیلاب آیا ہے، وہ آج میرے گھر کے دیوار و در سلامت نہ

پھوٹے گا۔

مرزا عافیت اور انتظام کو اس لیے لائے کہ جو گھر ٹھے جانے والا ہو اور اس کے دلدارو در برباد ہو جانے والے ہوں، وہاں عافیت کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہتی اور نظم و انتظام ناپید ہو جاتا ہے۔



۱۔ لغات - تیار و غزوری لوہم مریض عشق کے تیار دار ہیں کرتا، بیار کی دیکھ بھال، تیار دار اس شخص کو کہتے ہیں، جو بیار کی دیکھ بھال کرتا ہو۔ بعض نسخوں میں "تیار دار" کی جگہ "بیار دار" ہے اور حضرت عیسیٰ کے مرتبہ نسخہ کے مطابق اصل لفظ "بیار دار" ہی تھا۔ اس سے معنی میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔

شرح : ہم سمجھتے ہیں کہ عشق کے بیار کا کوئی علاج نہیں۔ اگر تمہیں میساے علاج کرانے پر اصرار ہے تو معافیہ نہیں، ہم عشق کے بیار کی دیکھ بھال اپنے ذمے لے لیتے ہیں، لیکن یہ بتا دو، اگر بیار کو کوئی نائد نہ ہو تو میسا کے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہیے آخری مصرع کے مفہوم دو ہو سکتے ہیں، اول وہی، جو اوپر پیش کر دیا گیا، دوم یہ کہ اگر مریض عشق کو کوئی نائد نہ پہنچا تو میسا کے علاج کی حقیقت کیا رہ جائے گی؟ وہ علاج کس کام کا متوقع ہوگا۔ یعنی پہلی صورت میں "کیا" بہ طور استغناء استعمال ہوگا اور دوسری صورت میں اسے تحقیق کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کینچ اگر شراب نہیں، انتظارِ ماسخر کینچ
کمال گرئی سچی تلاشِ دید نہ پوچھ بہ رنگِ غلامی سے آٹنے سے جوہر کینچ
تجھے ہار دلاست ہے انتظارِ لے دل! کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کینچ
تیری طرف ہے بہ حسرت، انتظارِ رنگس بہ کوری دل چشمِ رقیب، ماسخر کینچ

یہ نیم غمزہ ادا کر حق و ولایت ناز
 نیام پروہ زخم جگر سے فخر کھینچ
 برے قدح میں ہے سہائے آتش پہنا
 بروئے سفر و کباب دل سمندر کھینچ

۱۔ لغات - انتظار کھینچنا : انتظار کرنا۔

شرح : ایک سالن بھی آرزو کی انجن سے باہر نہ نکال، یعنی آرزو کا دم
 بھرے جا اور اس کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھ۔ اگر فی الحال تجھے شراب تیسر نہیں آتی
 تو کچھ بردار کر۔ ساغر کے دودھ کا انتظار کرتا رہ اور یقین رکھ کہ کسی وقت تیری باری
 بھی آجائے گی۔

اس شعر میں حقیقت بیان کی گئی ہے کہ انسان کو آرزو کا دامن کبھی نہ چھوڑنا
 چاہیے اور کتنی ہی تکلیفیں پیش آئیں، صبر و استقامت کے ساتھ پیش نظر مقصد کے لیے
 کوشش جاری رکھنا لازم ہے، کیونکہ کاہلی اسی پر موقوف ہے۔ غمزدگی سے
 یہاں کام نہیں چل سکتا۔ اقبالؒ کیا خوب فرمائے ہیں۔

زندگی جہادِ حیات و استقامتِ نیست

۲۔ لغات - کمال گرمی سعی تلاش وید : کسی صاحب بصیرت قدردان
 کی تلاش میں سرگرم کوششوں کو انتہا پر پہنچا دینا۔

شرح : میں نے صاحب بصیرت قدردان کی تلاش میں جو دودھ و صوب اور
 حلقہ دودھ کی اور اسے انتہا پر پہنچا دیا، اس کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ پوچھیں کیا بتا
 سکتا ہوں کہ اس دودھ و صوب میں مجھ پر کیا گزری؟ اب بالکل بایوس ہو چکا ہوں۔ لمبے
 ہدم ! تو اگر کوئی خدمت انجام دے سکتا ہے تو صرف یہ ہے کہ میرے آئینہ نظرت
 میں کمال کے جو جو بہر ہیں، انہیں اسی طرح نکال ڈال جس طرح کسی کے پاؤں سے کانٹے
 نکالے جاتے ہیں اور حق یہ ہے کہ جب کوئی قدردان ہی نہیں اور کسی کو اندازہ ہی
 نہیں ہو سکتا کہ فطرت نے مجھ میں کون کون سے کمالات بھر رکھے ہیں تو ان جو بہروں کی
 حیثیت بھی کانٹوں کی سی رہ گئی ہے، پھر کیوں نہ انہیں نکال باہر کیا جائے؟

۲۔ **شرح :** اے دل ! تو نے محبوب کے انتظار کو راحت و آسائش کا ہانہ بنا لیا ہے۔ تجھے کس نے اشارہ کیا کہ بستر پر لیٹ رہ اور اسی کے آواز کھینچے جس عمر بسر کر دے ؟ عاشق کو راحت سے کیا واسطہ ؟ اس کا کام یہ نہیں کہ بستر پر لیٹ کر آنکھیں دودانے پر لگائے رکھے اس کا کام یہ ہے کہ آہ و فزاید کرے، صحرائے پیکر لگائے جیب و دامن تار تار کر کے دیوانوں کی طرح پھرے۔ محبوب تک پہنچا آسان ہے ؟ اس شعر میں بھی عمل کا درس دیا گیا ہے۔ کوئی مقصد ہو، وہ جدوجہد کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا یہ طریقہ نہیں کہ بستر پر لیٹ گئے اور بچھ لیا کہ سب کچھ خود بخود حاصل ہو جائے گا۔ یہ منزل انتہائی جانفشانی اور جفاکشی کی ہے۔ تن آسانوں کو اس میں قدم نہ رکھنا چاہیے۔

۴۔ **شرح :** اے محبوب ! زگس تجھے حسرت سے تنگ رہی ہے، گویا یہ بھی میری رقیب بن گئی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس کا دل بھی اندھا ہے، کیونکہ اس میں شوق و محبت کی جب تک تک موجود نہیں اور اس کی آنکھ بھی اندھی ہے، کیونکہ بظاہر آنکھ ہونے کے باوجود وہ نور بصارت سے محروم ہے۔ لہذا اس رقیب سے جس کے دل اور آنکھ دونوں اندھے ہیں، بالکل بے پروا ہو کر شراب کا ساغر پی جا۔

ہر کوری دل چشم رقیب بد دعا کے لیے بھی بولتے ہیں اور نظر بد کا اثر دور کرنے کے لیے بھی۔

۵۔ **لغات :** ودیعت : امانت یعنی کسی شخص کے پاس کوئی چیز حوالہ کی غرض سے رکھ دینا۔

نیام : میان، تلوار وغیرہ کا غلاف۔

شرح : تیرے ناز میرے پاس امانت کے طور پر رہے، میرے زخم جگر کے پرے نے ان کے لیے میان کا کام دیا۔ اب تو پورا نہیں، بلکہ نصف غمرہ دکھا کر اس امانت کا حق ادا کر دے، یعنی خنجر کو میرے زخم جگر کے غلاف سے باہر کھینچنے

نیم غمزہ اس لیے کہا کہ خنجر کی ضرب لگاتے وقت تو پورے غمزے کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن خنجر باہر کھینچنے کے لیے صرف نیم غمزے ہی کی تلاش کافی ہے بمقصد یہ ہے کہ اس طرح محبوب ناز و ادا کا خنجر بگڑے کھینچنے کے لیے سامنے آئے گا اور بیدار کی آرزو پوری ہو جائے گی۔

۶۔ لغات۔ قدح : پیالہ۔ ساغر۔

صبا : شراب۔

آتشِ پنہاں : چھپی ہوئی آگ۔

سفرہ : دسترخوان

شرح : میرے ساغر میں چھپی ہوئی شراب کی آگ بھری ہے، یعنی آتشِ عشق کی شراب ہے۔ اس کا تقاضا یہی ہے کہ دسترخوان پر مستند کا دل کباب کر کے رکھا جائے، کیونکہ اس کی زندگی آگ ہی میں گزرتی ہے۔ وہی کباب آتشِ عشق کی شراب کا موزوں نقل بن سکتے ہیں۔



۱۔ لغات۔ غمزہ : نفی

معنی چشم و ابرو کا اشارہ، مطلب

ہے محبوبوں کی دلغریب ادائیں،

جن سے وہ عاشقوں کو اور زیادہ

مفتون و گرویدہ کریتے ہیں۔

کشاکش : کھینچ تان۔

اہلِ جفا : ظالم، یعنی محبوب۔

شرح : میں دنیا سے نصرت

ہو گیا، اب حسنِ بینِ حسینوں کو

نازداد ادا کے کمالات دکھانے

حسنِ غمزے کی کشاکش سے چھٹا، میرے بعد

بارے، آرام سے میں اہلِ جفا، میرے بعد

منصبِ شیفنگی کے کوئی قابل نہ رہا

ہوئی معزولی انداز و ادا، میرے بعد

شرحِ بھبتی ہے تو اس میں سے دُحوالِ اُعتا ہے

شعلہٴ عشقِ سیرِ پوش ہوا، میرے بعد

کاگوئی موقع نہ رہا۔ یعنی حسن کو
 غمزدے کے لیے اہتمام میں جو کچھ
 کرنا چاہتا تھا، اس کی ضرورت
 ختم ہو گئی۔ غمزدے کے لیے کشاکش
 ہی باقی نہ رہی اور اسے سہی و
 کوشش سے فراغت مل گئی۔
 مقام مشککہ ہے کہ مجاہدوں اور جیونوں
 کو آرام مل گیا۔ کیونکہ میرے بعد
 ناز و ادا کے تصور و جفا کو انگیز
 کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔
 شعر میں قابلِ غور نکتہ یہ
 ہے کہ غمزدے کے لیے سہی و کوشش
 سے فراغت صرف اس حسین
 تک محدود نہ رہی، جس پر مرزا
 غالب فریفتہ تھے، بلکہ پورے
 عالمِ حسن کو اس کشاکش سے نجات
 مل گئی اور تمام جیونوں کو آرام
 حاصل ہو گیا۔ گو یا حقیقی عشق کا
 حامل محض ایک غالب تھا۔ اس کے سوا کسی میں محبت کے لوازم پورے کرنے کی
 صلاحیت موجود نہ تھی۔

۲۔ شرح : اس شعر میں پہلے شعر کا مضمون نئے دلکش انداز سے دہرایا گیا
 ہے۔ فرماتے ہیں، عشق کے واجبات بجا لانے کے لائق کوئی نہ رہا۔ یہ سب کچھ میرے
 ساتھ ختم ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ناز و ادا کے لیے بھی کار فرمائی کا کوئی موقع باقی نہ رہا

خوں ہے دل خاک میں احوالِ تباں پر، یعنی
 اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا، میرے بعد
 درخورِ عرض نہیں، جو ہر بیداد کو بجا
 نگہ ناز ہے سرے سے خفا، میرے بعد
 ہے جنوں اہلِ جنوں کے لیے آغوشِ وداع
 پاک ہوتا ہے گریباں سے جدا، میرے بعد
 کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردِ انگنِ عشق
 ہے مکرِ لبِ ساقی پہ صلا، میرے بعد
 غم سے مرنے والوں کہ آتا نہیں دنیا میں کوئی
 کہ کرے تعزیتِ ہر دونا، میرے بعد
 آئے ہے بکیسی عشق پہ رونا غالب
 کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا، میرے بعد
 کس کے سوا کسی میں محبت کے لوازم پورے کرنے کی

جہاں ان کا کام بھی ختم ہو گیا اور جس منصب کا وظیفہ ختم ہو جائے، اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں رہتی۔ ایک غالب تھا، جو مزاحض عشق اور اگر ملکتا تھا۔ وہ نہ رہا تو حسن و عشق کا پورا ہنگامہ سرو پڑ گیا۔

اس شعر میں لفظ "معزولی" منصب کی رعایت سے آیا ہے۔

۳۔ لغات۔ سیاہ پوش : سیاہ لباس پہننے والا۔ یہ لباس جو ناسوگ میں

پہنا جاتا ہے۔

شرح : جب شمع بجتی ہے تو اس کے رشتے سے دھوئیں کی لہرائیں اُٹھتی ہیں۔

اس سے شاعر نے یہ نتیجہ نکالا کہ شمع کے بجھنے پر اس کے شعلے نے سیاہ ماتھی لباس پہن لیا۔ اسی طرح جب میری شمع حیات گل ہوئی، جو شعلہ عشق کا مرکز و مانع تھی تو اس کے ماتم میں شعلہ عشق نے بھی سیاہ لباس ہی پہن لیا۔

شاعر کا مقصد یہ ہے کہ عشق کی حرارت و روانی صرف میرے دم سے تھی، میری ہی شمع حیات سے عشق کی انجمن میں روشنی کا سرو سامان تھا۔ میں دنیا سے رخصت ہو گیا تو اب خود عشق کے شعلے کو سوگ میں سیاہ لباس پہننے کی ضرورت پیش آگئی۔

شمع کا بجھنا روزانہ لاکھوں آدمی دیکھتے ہیں، مگر اس سے یہ معنون کسی نے پیدا نہ کیا۔ یہ شعر بھی اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ غالب کا ماث ہر کس قدر گہرا اور حقیقت پسندانہ تھا۔

۴۔ شرح : جب میں زندہ تھا تو حسینوں کو منہدی کا محتاج ہونے کی کوئی

ضرورت نہ تھی۔ وہ میرے خون و دل سے اپنے ناخن رنگ لیتے تھے۔ اب میں دنیا میں نہ رہا تو انہیں منہدی کی ضرورت پیش آئی۔ یہ کیفیت دیکھ کر قہر میں میرا دل خون ہڑا جاتا ہے۔ میرے ہوتے انہیں کسی کی محتاجی نہیں کرنی پڑتی تھی۔

۵۔ لغات۔ درغور عرق : پیش ہونے کے لائق۔ نمایا ہونے کے قابل۔

جو بہر بیداو : ظلم کا جو بہر۔ شعر میں اشارہ شمس کی طرف معلوم ہوتا ہے،

کیونکہ حسینوں کی آنکھیں جب تک سرگم نہ ہوں، ان کی نگاہیں دلدوزی میں رہیں گی۔

کو نہیں پہنچیں۔ اگر جو سہریاؤں سے اشارہ غمزہ و عشوہ کی طرف سمجھا جائے تو ظاہر ہے کہ سرگیں آنکھوں کے اشارے سے قیامت برپا کر دیتے ہیں۔

شرح : میرے مر جانے کے بعد کوئی جگہ ہی باقی نہ رہی، جہاں سرگیں آنکھوں کا غمزہ و عشوہ اپنے کمالات دکھا سکے اور اپنے جوہروں کی نمائش کر سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نگاہِ ناز سرے سے خفا ہو گئی، یعنی حسینوں نے سر مرگنا چھوڑ دیا۔

سر مرگنا چھوڑ دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی کہ حسینوں نے مرزا کے ماتم میں یہ شیوہ اختیار کیا، کیونکہ مرزا کے بعد کوئی ایسا مرزا باقی نہ رہا، جسے وہ اپنے عشوہ دادا کا تحفہ مشق بنا سکیں۔

۶۔ لغات۔ آغوش و دارع : رخصت کے وقت دوستوں اور رفیقوں کا بغل گیر ہونا۔

شرح : میرے مرنے کے بعد دیوانگی اہل جنوں سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہی ہے اور بغل گیری کی غرض سے اس نے ہانسیں پھیلا دی ہیں، یعنی اب دیوانگی کسی کو نصیب نہ ہو گی۔ وہ ہمیشہ کے لیے جا رہی ہے۔ جب تک میں باقی تھا دیوانگی کے تمام سامان موجود تھے، یعنی گریبانِ چاک ہونے لگے تھے۔ اب یہ سامان بھی جا رہا ہے۔ چاک گریبان سے الگ ہو رہا ہے، آئندہ واسن تار تار نہیں ہوں گے۔ گویا مرزا کے ساتھ عشق کے علاوہ جنوں بھی ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔

۷۔ لغات۔ مے مرد انگن : مردوں کو بیہوش کر کے گرا دینے والی شراب۔
حصلا : کھانے یا شراب پینے کے لیے بلانے کی صدا۔ عام دعوت اور پکار کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ پنجابی میں اس لفظ نے ”صلح“ کی صورت اختیار کی۔ بولتے ہیں کہ فلاں نے مجھے کھانے کی ”صلح“ بھی نہ کی یعنی کھانے کے لیے بلا یا ہی نہیں۔

شرح : خواجہ ساقی فرماتے ہیں :

اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مر گیا ہوں مے مرد انگن عشق کا ساقی یعنی مستحقِ بار بار صلا دیتا ہے، یعنی لوگوں کو شرابِ عشق کی

طرت ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ میرے بعد شراب عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا، اس لیے اس کو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوئی ہے، اگر زیادہ حذر کرنے کے بعد جیسا کہ مرزا خود بیان کرتے تھے، اس میں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرع یہی ساقی کے صلا کے الفاظ ہیں :

کون ہوتا ہے حریف سے مرد انگلی عشق

اور اس مصرع کو وہ مکرر پڑھتا ہے ایک دفعہ جلانے کے بعد میں پڑھتا ہے :

کون ہوتا ہے حریف سے مرد انگلی عشق ؟

یعنی کوئی ہے، جو سے مرد انگلی عشق کا حریف ہو، جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا تو اسی مصرع کو مایوسی کے بعد میں مکرر پڑھتا ہے !

کون پڑھتا ہے حریف سے مرد انگلی عشق !

یعنی کوئی نہیں ہوتا۔ اس میں لیجے اور طرزِ ادا کو بہت دخل ہے کسی کو جلانے کا لہجہ کوئی اور ہے اور مایوسی سے چپکے چپکے کا اور انداز ہے۔ جب اس طرح مصرع مذکور کی تکرار کرو گے تو فوراً یہ معنی ذہن نشین ہو جائیں گے :

خواجہ عاقی کی تشریح پر کسی اضافے کی ضرورت نہیں، البتہ یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پورا مصرع ایسے انداز میں مرتب کر لینا بے حد دشوار ہے جسے پڑھتے وقت صحتِ لہجہ بدل لینے سے دو مختلف معنی پیدا ہو جائیں۔ یہ شعر اس تقیاب سے بالکل بیگانہ نظر آتا ہے۔

۸۔ لغات - تعزیت : ماتم پرسی، پڑسا دینا، ماتم دسوگ۔

تشریح : میں مرنے سے پہلے اس غم میں گھل گھل کر مرا عمارتوں کو دنیا کی وسعت میں کوئی ایسا فرد نظر نہیں آتا، جس سے امید رکھی جا سکے وہ میرے مرنے کے بعد مردِ محبت اور وفادار استواری کی ماتم پرسی کر سکے، کیونکہ میں مرناؤں گا

تو ساتھ ہی مہرود فنا پر بھی موت طاری ہو جائے گی۔ اُن کی ماتم پر سی وہی کر سکتا ہے۔ جسے زندگی کی اس نہایت قیمتی متاع کا صحیح اندازہ ہو۔ ان کے حق تو کون پورے کرے گا؟ یہ بھی ممکن نہیں کہ ان کے مرجانے پر سوگواری ہی کا فرض ادا کر دے۔ اپنے دم کے ساتھ مہرود فنا کی عظمت اور اپنے بعد ان پیش بہا اوصاف کی ناقدری دکس مہر سی کا کتنا بڑا تاثیر نقشہ کھینچ دیا ہے۔

ایک معنوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مہرود فنا تو مدت سے موجود ہی نہ تھے۔ میں ان پر آنسو بہاتا رہتا تھا، اب میرے بعد کوئی اتنا بھی نہیں کہ ان کا ماتم کرتا رہے۔

۹۔ شرح : اے غالب ! جب تک میں زندہ ہوں، عشق کے سیلاب بلا کو سنبھالے بیٹھا ہوں، لیکن جب میں مرجاؤں گا تو یہ سیلاب کس کے گھر کا رخ کرے گا؟ کوئی گھرا یا نظر نہیں آتا، جو اس کا مامن بن سکے۔ امنوس، میرے بعد عشق اس قدر بکس رہ جائے گا کہ اس کے تصور ہی پر بے اختیار رونا آ جاتا ہے۔

اردو میں ایسی غزلیں بہت کم ملتی ہیں، جن کے تمام اشعار مسلسل ہوں اور ایک ہی معنوں کے مختلف پہلوؤں کی ترتیب سے بیان کیے گئے ہوں۔ مرزا غالب کی یہ غزل بھی مسلسل اشعار کا ایک نہایت نادر نمونہ ہے۔



بلا سے ہیں جو یہ پیش نظر، در و دیوار

نگاہ شوق کو میں، بال دپر، در و دیوار

و فودر اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ

کہ ہو گئے ہرے دیوار و در، در و دیوار

نہیں ہے سایہ کہ سن کر نویدِ مقدم یار

گئے میں چند قدم پیشتر، در و دیوار

۱۔ شرح : اگر در و دیوار

ہمارے لیے محبوب تک پہنچنے

میں رکاوٹ بن گئے ہیں تو ہماری

بلا سے، ہمیں ان کی کیا پدا ہے؟

نگاہ شوق کے لیے تو یہ در و دیوار

بال دپر ہیں، جن سے نگاہ میں

پداز کی قوت پیدا ہو گئی ہے؟

جو اسے اڑا کر محبوب تک پہنچا

سکتی ہے اور کوئی رکاوٹ مانگیر
نہیں ہو سکتی۔

کسی مقصد کے لیے سہا بندہ دل
میں موجود ہو تو رکاوٹ جذبے کو
تیز تر کر دیتی ہے۔ عربی کی مشہور
مشکل ہے : الانسان حريص على
ما منع ، یعنی انسان کو جس چیز سے
روکا جائے اس کے لیے وہ اور
حریص ہو جاتا ہے۔ یہ بالکل درست
ہے۔ خصوصاً عشق کے معاملات میں
تو یہ عام چیز ہے۔ بچے عشق —
یہ ہر رکاوٹ اس کی آگ کو بہتر
کا موجب ہوتی ہے۔ یہی حقیقت
مرزا نے اس شعر میں بیان کی ہے۔
رکاوٹ کے باعث زور تیز تر ہو
جانے کا مضمون مرزا نے ایک اور
شعر میں بھی کہا ہے :

پاتے نہیں جب راہ تو چلے جلتے ہیں تائے
رکتی ہے سری طبع تو ہوتی ہے دہان اور

۲۔ لغات - و نور :

کثرت - زیادتی۔

زنگ : حالت ، کیفیت۔

○

ہوتی ہے کس قدر ارزانی سے جہلوہ

کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر درد و دیوار

جو ہے تجھے سرسودا سے انتظار ، تو آ

کہ میں دکان متاعِ نظر ، در و دیوار

جھوم گریہ کا سامان کب کیا میں نے

کہ گر پڑے نہ ہرے پاؤں پر اور و دیوار

وہ آہ امرے ہمسائے میں تو سایے سے

ہوئے فدا اور و دیوار پر ، در و دیوار

نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی

ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

نہ پوچھ بے خود ہی عیشِ مقدمِ سیلاب

کہ ناچتے ہیں پڑے ، سرسبز ، در و دیوار

نہ کہ کسی سے کہ غالب ! ہمیں زمانے میں

حریفِ رازِ محبت ، مگر ، در و دیوار

شرح : آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور ایسا نیل ہر نکلا کہ میرے مکان کی ہر شے چمٹ چوٹ گئی۔ جہاں دروازہ تھا، وہاں بجے کا ڈھیر لگ جانے سے وہ پٹ گیا اور جہاں دیوار تھی، اس میں شکاف پڑ گئے اور اندر آنے جانے کے راستے پیدا ہو گئے۔ گویا دروازے دیواریں بن گئے اور دیواروں نے دروازوں کی شکل اختیار کر لی۔

دیکھیے دو غفلتوں کے اکٹ پھیر سے کتنا وسیع مضمون اور کس طرح اسلوبی سے پیش کر دیا۔

۳۔ لغات۔ نوید : خوشخبری۔

مقدم : آمد، تشریف آوردی۔

شرح : میرے گھر کے دیوار و در کا جو سایہ پڑ رہا ہے، اسے سایہ بنیں سمجھنا چاہیے، بلکہ محبوب کی تشریف آوردی کی خبر پہنچی تو در و دیوار پیشوائی اور خیر مقدم کے لیے چند قدم آگے بڑھ گئے۔

معلوم ہے کہ خاص جہتیوں کا استقبال ہمیشہ چند قدم آگے بڑھ کر کیا جاتا ہے، چنانچہ مرزا کے در و دیوار بھی سایہ کی شکل میں آگے بڑھ گئے۔

۴۔ لغات۔ ارزانی : سست پن۔

شرح : اے محبوب! خیری شراب دیدار اس قدر سستی اور عام ہو گئی ہے کہ اس سے تیرے کو پے کا ہر درد و دیوار مست ہو گیا ہے۔

محبوب کو پے میں آتا ہے تو ہر گز ایسی اس کے ساکن عیون دیدار سے شاد کام ہوتے ہیں۔ یہ شراب ان پرستی طاری کر دیتی ہے، لہذا یہ کیفیت ہو گئی ہے کہ جسے دیکھیے، وہ اسی شراب سے بخود نظر آتا ہے۔

۵۔ لغات۔ متاع : مال و اسباب

شرح : اے محبوب! اگر تجھے انتظار کا سودا خریدنا منظور ہے تو آ اور دیکھ تیرے گھر کے در و دیوار پر ایسی دکائیں آراستہ ہو گئی ہیں، جن میں صرف نظر کا مال، بھٹو

ہوتا ہے۔

محبوب کو دیکھنے کے لیے سہراؤں لگا ہیں بیتاب ہیں وہ اس کے درو دیوار پر ہم گئی ہیں اور اس انتظار میں ہیں کہ شاید اس کے حسن کی کوئی جھلک نظر آجائے اور ان کے لیے فیکین کا سامان ہم پہنچے۔ اب محبوب کو دعوت دے رہے ہیں کہ یہاں صرف انتظار نہ کا سودا بکتا ہے اور خوبی یہ ہے کہ اس دعوت میں اپنا مطلب بھی پیش نظر ہے۔ یعنی محبوب آئے گا تو بہر حال اس کے دیدار سے شرف پانے کا موقع مل جائے گا۔

۶۔ شرح : جب کبھی میرے دل میں گرے کا طوفان اٹھا اور میں ہونے پر آمادہ ہوا تو میرے درو دیوار فوراً پاؤں پر گر پڑے اور منت و خوشامد شروع کر دی کہ خدا کے لیے رُک جاؤ اور نہ ہمارا کوئی شکا تا باقی نہیں رہے گا۔ تو روئے گا تراشکوں کا ایک سیل بہ نکلے گا جو میں ہمارے جانے گا۔

شعر میں لطف کا خاص پہلو یہ ہے کہ درو دیوار کا پاؤں پر گرتا ہوا بھانے خود ان کے تباہ ہو جانے کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ یعنی شعر کا ایک معنوم یہ بھی ہے کہ جب میں نے روئے کا سودا سامان کیا تو درو دیوار میرے اشکوں کے سیل میں بہ گئے۔

۷۔ شرح : محبوب میرے گھر کے پاس آ رہا۔ اب کیفیت یہ ہے کہ میرے درو دیوار کا سایہ اس کی قیام گاہ پر پڑ رہا ہے۔ اس طرح میرے درو دیوار سامنے کے دریے سے محبوب کے درو دیوار پر قربان ہونے لگے۔

۸۔ شرح : اے محبوب اتیرے بغیر میں اپنے گھر کا آباد رہنا بڑا معلوم ہوتا ہے۔ یہ آبادی لگا ہوں میں کشک کشک رہی ہے اور کشک کا غارتھی ہے کہ آنکھوں میں آنسو آجائیں۔ گو یا جب ہماری نظر درو دیوار پر پڑتی ہے تو ساتھ ہی رونا آجاتا ہے۔ رونے کا سبب خود بیان کر دیا، یعنی محبوب کے بغیر گھر نظروں میں کشکتا ہے لیکن درو دیوار کو دیکھ کر ہمیشہ رونے سے یہ معنوم بھی پیدا ہوتا ہے کہ مسلسل رونا اور آنسو بہنا آخر اذیتیں بہائے جانے لگا اور درو دیوار بہ جائیں گے تو گھر آباد نہیں رہے گا، بر باد ہو جائے گا۔ گو یا گھر کا برا انجام بھی رونے کا ایک سبب بنا۔

۹۔ شرح : سیلاب آ رہا ہے اور اس کے آنے کی خوشی میں درو دیوار پر جو زخوری طاری ہو گئی ہے، اس کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ پوچھیے۔ میں یہ سمجھ لیجے کہ انھوں نے سراسر ناحیہ شروع کر دیا ہے۔

درو دیوار کے سر بسر تاجنہ سے عیاں ہے کہ سیلاب نے بنیادیں ہلا دیں اور ایک ایک چیز پر ہم متزلزل ہو کر گر رہے ہیں۔ گویا سیلاب گھر میں جو کیفیت پیدا کر سکتا تھا وہ عملی شکل اختیار کر گئی۔

۱۰۔ شرح : اے غالب! تو راز محبت کسی سے بیان نہ کر، کیونکہ دنیا میں کوئی بھی اس راز کو چھپائے رکھنے کا اہل نہیں اور کسی پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں درو دیوار کو تابی اعتماد سمجھا جاسکتا ہے، لیکن ان سے بات حیت کا نائدہ کچھ نہیں۔ کیونکہ وہ نہ سنتے ہیں، نہ بیان کر سکتے ہیں۔

یہ جو مافکوں نے کہا ہے : ”دیوار ہم گوش وارد“ تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ واقعی دیوار کے کان ہوتے ہیں، بلکہ یہ راز کو چھپائے رکھنے میں مبالغے کی ایک صورت ہے۔

گھر جب بنایا ترے در پر، کہے بغیر
ہانے گا اب بھی تُو نہ برا گھر کہے بغیر
کہتے ہیں، احب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن
جانوں کسی کے دل کی میں کیوں کر کہے بغیر؟
کام اس سے آپڑا ہے کہ اجس کا جہان میں
یوے نہ کوئی نام، ستمگر کہے بغیر

۱۔ شرح : میں جب کبھی
محبوب کو اپنے گھر آنے کی دعوت
دیتا تھا تو وہ جواب دیتا کہ ہم نہیں
جانتے، تیرا گھر کہاں ہے؟ آخر
مجموعہ ہو کر میں نے محبوب کے دروازے
پر دعوتی رمالی اور دیں مگر بنا
لیا۔ کہتے ہیں کہ اے محبوب! تجھ
سے احادیت لیے بغیر تیرے دروازے
پر گھر بنا لیا ہے، لیکن تیرے انتقال
اور بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ جب

تک بتاؤ دوں یہ میرا گھر ہے ،
 تجھے اس کا پتہ نہ ملے گا اور تو نہ
 جانے گا کہ یہ میرا گھر ہے ۔

۲۔ شرح : جب تک

مجھ میں بات کرنے کی تاب و تواس
 تھی ، میں حالِ دل نہ سنا تھا اور
 محبوب کو اس پر کوئی توجہ نہ تھی ۔

خود اس نے کہیں پوچھا ہی نہیں
 کہ خستہ و در ماندہ عاشق کا حال

کیا ہے ۔ اب صنعت اور اتوائی

کے باعث مجھ میں بات کرنے کی

بھی قوت نہ رہی اور اس نے

میرے حال سے بے خبر رہنے

کے لیے یہ ترش ترشایا سبازِ پیش

کر دیا کہ میں بتائے بغیر کسی کے

دل کی بات کیونکر جانوں ؟ تم

کچھ کہو تو مجھے معلوم ہو کہ کیا چاہتے

ہو ؟ حالانکہ جانتا ہے ، مجھ میں کچھ

کہنے کی طاقت ہی نہیں ۔ محبوب کی طرف سے یہ انتہائی ستم ظریفی ہے ۔

۳۔ شرح : تقدیر سے میرا معاملہ ایسے محبوب کے ساتھ آ پڑا ہے ، جس

کا نام لیتے وقت ہر شخص اسے شکر کہتا ہے ۔

ظاہر ہے کہ جو محبوب دنیا بھر کے نزدیک ظالم نہ شکر ہوا ، اس سے عاشق کی

کوئی امید کیونکر آ سکتی ہے ؟

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے ، وگرنہ ہم

سہرا بنے یا رہے ، نہ رہیں پر کہے بغیر

چھوڑوں گائیں نہ اُس بُتِ کافر کا پوجنا

چھوڑے نہ خلق ، گو مجھے کافر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ ، وے گفتگو میں کام

چلتی نہیں ہے دشمن و خضر کہے بغیر

بہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو

بنتی نہیں ہے باد و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہوا اتفاقات

سنا نہیں ہوں بات ، کمرہ کہے بغیر

غائب ! نہ کہ حضور میں تو بار بار عرض

ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

کہنے کی طاقت ہی نہیں ۔ محبوب کی طرف سے یہ انتہائی ستم ظریفی ہے ۔

۳۔ شرح : تقدیر سے میرا معاملہ ایسے محبوب کے ساتھ آ پڑا ہے ، جس

کا نام لیتے وقت ہر شخص اسے شکر کہتا ہے ۔

ظاہر ہے کہ جو محبوب دنیا بھر کے نزدیک ظالم نہ شکر ہوا ، اس سے عاشق کی

کوئی امید کیونکر آ سکتی ہے ؟

۴۔ **شرح :** ہم خاموش ہیں تو یہ سبب نہیں کہ کسی سے لڑتے ہیں یا اپنا کرکٹ جانے کا خوف ہے، ہرگز نہیں۔ ہمارے دل میں کوئی چیز ہے ہی نہیں، ورنہ ہم دشمن کے ایسے پکتے اور سر پھرے ہیں کہ جان بھی پل جائے تو بچ کدہ دینے میں کبھی تاخیر نہ کریں گے۔

۵۔ **شرح :** میں اپنے محبوب کو جسے ساری دنیا بُتِ کافر کہتی ہے، پوجنا ہرگز نہ چھوڑوں گا، برابر اس کی پرستش میں میں مصروف رہوں گا۔ اگر دنیا اس پر مجھے کافر قرار دینے میں بھی تاخیر نہ کرے تو کچھ پروا نہیں۔ میری پرستش کا سلسلہ بدستور قائم رہے گا۔

یہ ثابت قدمی اور وفاداری کی آخری حد ہے کہ اپنے محبوب کے مقابلے میں بڑی سے بڑی آفت جھیل لینے میں بھی ہرگز تاخیر نہیں۔

۶، ۷۔ **لغات :** دشمن، کٹار، خنجر
ولے : دلیک کا غنق، لیکن، مگر۔

مشاہدہ حق : ذاتِ باری تعالیٰ کے انوار دیکھنا۔

شرح : اگرچہ ہمارا مقصد ناز و غرہ کا ذکر ہوتا ہے، لیکن باتِ چیت کرتے وقت ہم ان کے لیے کٹار اور خنجر کی اصطلاحیں استعمال کیے بغیر مطلب واضح نہیں کر سکتے۔

میشک ذاتِ باری تعالیٰ کے انوار دیکھنے کا معاملہ ہو، مگر جب اسے معرضِ بیان میں لائیں گے تو شراب اور ساغر کا ذکر کیے بغیر بات نہیں بنے گی۔

ان دو شعروں میں مرزا غالب نے یہ حقیقت انتہائی غوطِ اسلوبی سے واضح کی ہے کہ حقیقت کا اظہار محاذِ کلباس اختیار کیے بغیر ممکن نہیں اور جو چیزیں نظر نہیں آتیں، احساس کے ذریعے سے ہم ان کا ادراک نہیں کر سکتے، انہیں مشہود و محسوس چیزوں کے رنگ میں پیش کیے بغیر دل کی کیفیت واضح نہیں ہو سکتی۔ دیکھیے ناز و غرہ کا ذکر آنے کا تو تشبیہ یا استعارے میں کٹار اور خنجر کا ذکر کام چلائیں گے، حقیقتاً ناز و غرہ

وہی کام انجام دیتے ہیں، جو کنکار اور خنجر سے مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح رومانی
الوار یا محبت باری تھانی کے معاملات پوری طرح واضح کرنے کے لیے بادہ و ساغر
سے کام لیا جاتا ہے، کیونکہ ان الزام کی کیفیت معنوی اعتبار سے شراب سے ملتی جلتی
مرزا نے دوسری جگہ ہی حقیقت ایک اور انداز میں پیش کی ہے :

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

چمن رنگار ہے آئینہ باد بہاری کا

۸۔ لغات - التفات : توجہ۔ لطف و کرم

شرح : یہ شعر دراصل ایک قصے کا آخری حصہ ہے، جو مرزا کے اسلوب
بیان سے بے تکلف سامنے آ جاتا ہے۔ مرزا اور محبوب کے درمیان گفتگو ہماری ہے
مرزا اپنا حال بیان کرتے ہیں، محبوب کہتا ہے : ”کیا کہتے ہو، ہماری سمجھ میں کچھ نہیں
آتا۔ پھر محبوب کوئی بات کہتا ہے تو مرزا کی سمجھ میں نہیں آتی۔ دوبارہ پوچھتا ہے
ہے تو محبوب جواب دیتا ہے : ”ہرے ہو کہ بار بار پوچھتے ہو ؟ یہ سن کر مرزا کہتے ہیں
کہ اگر میں بہرا ہوں تو چاہیے، آپ کی توجہ اور لطف و نوازش مجھ پر دو چند ہو جائے۔
کیونکہ جب تک بات بار بار نہ کہی جائے، میں بہرا ہونے کے باعث اسے سمجھ نہیں سکتا۔

۹۔ شرح : حضور سے مراد ابو ظفر بہادر شاہ ہیں۔ کہتے ہیں ”اے غائب ! تو
بادشاہ سلامت کے حضور بار بار کیوں گزارشیں پیش کر رہا ہے ؟ کیوں کر رہے کہ کچھ
پر خاص توجہ فرمائیے، میرے پاس فلاں چیز نہیں ہے، فلاں شے کی ضرورت ہے،
فلاں تکلیف ہے، فلاں پریشانی ہے، تیرا تو پورا حال کہے بغیر ہی حضور پر واضح ہے۔
یہ شعر بیان کی لذت کا ایک دلکش مرقع ہے۔ زبان سے کچھ نہیں کہا، لیکن
وہ سب کچھ کہ دیا جو کہا جاسکتا تھا۔ یہ اجمال ہر اس تفصیل پر حاوی ہے، جس کی
سمانی ایک خنجر و خنجر میں بھی نہ ہو سکے۔

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخ یار دیکھ کر
 جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر
 آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے
 سرگرم نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر
 کیا آبروئے عشق، جہاں عام ہو جفا
 رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر
 آتا ہے میرے قتل کو پر جوش رشک سے
 مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
 ثابت ہوا ہے گردِ مینا پہ خونِ خلق
 لڑے جے بوجِ بے تری رفتار دیکھ کر
 وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
 ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر
 پک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
 لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر
 زناں باندھ، شہِ صد دانہ توڑ ڈال
 رہر و چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

۱۔ شرح : یں ہو
 کے روتے دل افروز کی آبِ دیا
 دیکھ کر جل کیوں نہ گیا، میرے
 لیے صبحِ راستہ بھی تھا کہ عشق میں
 فنا حاصل کرنے کا جو مقام سامنے
 آیا تھا، اسے طے کر لیتا اور
 جل کر خاکِ سیاہ ہو جاتا۔ اب
 میرے نہ جل مرنے کا نتیجہ نکلا
 ہے کہ اپنی تاب دیدار پر رشک
 سے جل رہا ہوں اور پہلی ناہمانی
 کی سزا یوں ٹھیکت رہا ہوں۔
 مرزا غالب نے معنائیں
 شراب کی طرح رشک کے معنوں
 میں بھی وہ کمال کیا ہے، جس کی
 مثال شاید ہی کسی دوسرے شاعر
 کے ہاں مل سکے۔ ان میں سے ایک
 شعر یہ بھی ہے اور اس غزل
 نیز آئندہ غزلوں میں ایسے کئی
 معنائیں آئیں گے، لیکن ایک
 حقیقت واضح کر دینی چاہیے
 کہ بیشک ہم ایسے معنائیں تو
 رشک سے تعبیر کرنے میں حق
 بہ جانب ہیں، تاہم عشق کے مقام

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرایا تھا میں
 جی خوش ہوا ہے راہ کو پہ خار دیکھ کر
 کیا جگہاں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے
 طوطی کا مکس مجھے ہے، رنگار دیکھ کر
 گر نی تھی ہم پہ برقِ تھلی، نہ طور پر
 دیتے ہیں بادہ نظرب تدرجِ خوار دیکھ کر
 سر سچوڑ نارہ غائبِ شوریدہ حال کا
 یاد آگیا مجھے، تری دیوار دیکھ کر
 شمسوں کو معلوم ہے کہ عشق میں
 ایک قدر عاشق پر ایسا بھی ماری
 ہوتا ہے، جب وہ اپنا آئینوں
 اور اداؤں کو بھی محبوب کے
 مقابلے میں پس پشت ڈال دیتا
 ہے اور محبوب ہی اس کے پیشِ نظر
 رہ جاتا ہے۔ یہ عشق و محبت کا
 انتہائی مقام ہے کہ دوسروں
 کا محبوب نہ دیکھتا تو ایک طرف
 اپنا دیکھنا بھی گوارا نہیں،
 ہوتا، گویا مرزا نے محبت کے
 اس خاص مقام کی بات کی ہے۔

اگرچہ ہم اپنی اصطلاحات کے مطابق اسے رشک ہی کہیں گے۔

مرزا نے ایک اور غزل میں بھی یہ معنوں باندھا ہے :

دیکھنا قسمت کو آپ اپنے پر رشک آجانے ہے

میں اُسے دیکھوں، جھلاک مجھ سے دیکھا جانے ہے

۲۔ شرح : چونکہ میں رات دن ایسے ٹائے سر کرنے میں سرگرم رہتا ہوں جن سے شعلے بستے ہیں، اس لیے اہل جہاں نے مجھے آتش پرست قرار دے لیا ہے۔ یعنی اس فرقے کا آدمی، جن کے نزدیک دنیا کا مقدس ترین عنصر آگ ہے اور وہ اسی کی پرستش میں سرگرم رہتے ہیں۔

آتش، سرگرم اور شرور بار کی رعایتِ محتاجِ تفریح نہیں۔

۳۔ لغات - بے سبب آزار : بے وجہ تانے والا، بے سبب اذیت

پہنچانے والا۔

تشریح : جہاں جو روح جفا عام ہو جائے، کوئی وجہ، کوئی سبب اور کوئی علت پیش نظر نہ رہے، وہاں عشق کی آبرو کیونکر قائم رہ سکتی ہے؟ اسے محبوب میں تجھے بے دم اور بے سبب مٹانے والا پاتا ہوں، اس لیے تذبذب میں پڑ جاتا ہوں کہ آیا محبت کے واسطے میں مجھے قدم آگے بڑھانا چاہیے؟

عاشق کے نزدیک محبوب کی طرف سے جو روح جفا کی صرف ایک وجہ ہو سکتی ہے اور وہ خود عشق ہے نیز عاشق محبوب کے لطفت و نوازش ہی نہیں، بلکہ جو روح جفا کو بھی مٹنا پانا حق سمجھتا ہے۔ وہ کسی دوسرے کو اس میں شریک کرنے کے لیے تیار نہیں، بلکہ جب محبوب سبر کس و ناکس پر یکساں جو روح جفا شروع کر دے۔ اہل ہوس کو بھی اسی طرح عظم و مہم کا تختہ مشق بنائے، جس طرح عاشق ہمیشہ بنا رہتا ہے تو عشق کے لیے امتیاز کی کون سی وجہ باقی رہی؟ اس کی عزت و آبرو اور یکساں کیونکر برقرار رہ سکتی ہے؟ اس صورت حال نے عاشق پر حائل کی کیفیت طاری کر دی۔

شعر کی ایک خوبی اس کی عمومیت و افاقت ہے، یعنی مضمون صرف عام عشق تک محدود نہیں، بلکہ اسے سیاست میں بھی بے تکلف استعمال کیا جاسکتا ہے اور مرزا غالب کے اکثر اشعار کا ایک امتیازی پہلو یہ بھی ہے۔

۴۔ تشریح : محبوب میرے قتل کے لیے شمشیر سمیت آ رہا ہے۔ یہ دیکھتے ہی رنگ اس بے جوش میں آگیا کہ محبوب کا ہاتھ میری گردن میں حائل ہونا چاہیے تھا، اس میں تھوڑا کیوں پہنچ گئی؟ لطفت یہ کہ ابھی قتل کی ذہنت نہیں آئی، رنگ بھی عاشق کو موت کے گھاٹ اتار رہا ہے۔

لفظی مناسبتیں تشریح کی محتاج نہیں۔

۵۔ لغات - گردن مینا : صراحی کا بالائی حصہ نچلے حصے کے مقابلے میں تنگ ہوتا ہے، جیسے بوتلوں میں اور پر کا حصہ تنگ ہوتا ہے، اسے صراحی کی گردن کہتے ہیں۔

تشریح : تو نے شراب پی کر عالم سرور میں ایسی مستانہ حال اختیار کی کہ خلعت کا لون ہو گیا۔ مینا پر نظر ڈالنے میں تو تیری حال سے اس پر لڑھکھک طاری ہے۔ وہ اس لیے

کہ نہ تو شراب پیا، نہ تیری پیال میں صحن خدا کا خون کر دینے والی مستی پیدا ہوئی۔ گویا صحنِ خدا کا خون تیری شراب نوشی کا نتیجہ ہے اور اس خون کا دعویٰ مینا کی گردن پر ثابت ہو گیا۔ اس کی بوج کے رز نے سے اس دعوے کا ثبوت ہمہ پہنچ گیا۔ مین وہ خودت سے کانپ رہی ہے کہ آخر میں مجرم ٹھہری۔

۶۔ لغات - واحسرتا : انتہائی حسرت و افسوس کا کلمہ۔

شرح : انتہائی حسرت و افسوس کا مقام ہے کہ جب محبوب نے دیکھا اہم اس کے ظلم و ستم اور ایذا سے لذت اٹھا رہے ہیں اور اس لذت کے ہم بہت دلدادہ ہیں تو اس نے ظلم و ستم سے ہاتھ اٹھایا اور بیدار دوجھا ترک کر دی۔

انسان طبعا لطیف و فرائض پسند کرتا ہے اور جو درد و ستم سے گزیراں رہتا ہے، لیکن عاشق اپنے آپ کو جو درد و ستم کا خوگر بنالینے میں اور محسوس کی طرف سے جو دکھ اٹھیں پسپتا ہے اس میں خاص لذت پاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے لیے جو درد و ستم کا رنگ جانا انتہائی دکھ کا باعث ہے، مگر وہ دکھ نہیں جس میں لذت لے۔ مرزا کے انتہائی حسرت و افسوس کا اصل سبب یہی ہے۔

۷۔ لغات - عیار : کسوٹی۔

شرح : ہم اپنے کلام کے ساتھ خود خریدار کے ہاتھ تک جاتے ہیں یعنی اس کے دلدادہ جو جاتے ہیں، لیکن یہ ضروری ہے کہ خریدار کی طبیعت کی کسوٹی کا اندازہ جو مانتے۔ یعنی یہ جانچ میں کہ اسے کھرے کھوٹے کی تمیز ہے یا نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جو ہم ہمارے کلام کا خریدار ہوگا، سخن شناس اور قدردانی میں اس کا پایہ بلند ہونا چاہیے۔ ایسے ہاں خریدار کے ہاتھ کھنے میں ہیں کیا تاقی ہو سکتا ہے ؟ وہ ہمارا کلام نہیں، بلکہ خود ہمیں مول لے لیتا ہے۔

۸۔ لغات - گرفتار : بنینہ۔ وہ بنا ہوا دھماکا، جو ہندو اور آتش پرست لوگ گلے میں آڑا تر چھاڑا رہتے ہیں اور اسے مذہبی نشان سمجھا جاتا ہے۔

تفسیر صد دانہ : قبیح جس میں ایک سودا نے ہوتے ہیں۔

شرح : توڑنا رہنمائی اور سہولتوں کی تسبیح توڑ کر پیچیدہ دے، کیونکہ راستہ

چلنے والا یعنی مسافر ہمیشہ صاف اور سہوار راستہ پسند کرتا ہے۔ وہ راستہ پسند نہیں کرتا جس میں اونچے نیچے اور نشیب و فراز ہوں۔

اس شعر میں دو باتیں خاص توجہ کی محتاج ہیں :

۱۔ تسبیح کے دانے بھی دھاگے ہی میں پروئے جاتے ہیں، جب اسے پھیرا جاتے

تو سہرا نہ ایک لپٹی ہی بنتا ہے، پھر دوسرے دانے تک نشیب آ جاتا ہے اور یہی سلسلہ آخر تک جاری رہتا ہے۔ اس وجہ سے تسبیح کا راستہ نشیب و فراز والا راستہ ہو گیا۔ جس میں قدم قدم پر اونچے نیچے ہے اور مسافر کو ایسا راستہ پسند نہ کرنا چاہیے۔

۲۔ اگر تسبیح توڑ کر دانے نکال دیے جائیں تو اصل رشتہ زخم سے مشابہ ہو جاتا ہے۔

یعنی تسبیح کا توڑنا ہی راستے کو نشیب و فراز سے پاک کر دیتا ہے۔

۹۔ شرح : میرے پاؤں میں چھپاے پڑ گئے تھے اور میں سخت گھبرا رہا تھا

تھا کہ ان کا کیا علاج ہو۔ یکایک سامنے کانٹوں بھرا راستہ آ گیا۔ دل خوش ہو گیا کہ اب چھالوں کا علاج ہو جائے گا۔ یعنی اہل بیت کا شے چھٹیں گے اور پانی نکل جائے گا۔ تو چھپاے دب جائیں گے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ ایک دکھ دینے والی چیز کا علاج دوسری دکھ دینے والی

چیز سے کیا یہ مرزا کی ایذا پسندی ہے کہ وہ اپنے لیے سہل اور راحت بخش طریقہ اختیار کرنے سے ہمیشہ گریزاں رہتے ہیں۔

۱۰۔ شرح : دیکھیے، محبوب مجھ سے کس قدر بدگمان ہے کہ میرے فولادی آئینے میں

زنگ لگ گیا، جس کا رنگ سبز ہوتا ہے۔ محبوب نے سمجھ لیا کہ یہ تو طوطی کا عکس ہے کیونکہ اس کا رنگ بھی سبز ہوتا ہے۔

بدگمانی یہ ہوتی کہ محبوب نے سمجھ لیا، میری محبت میں کیسوی اور یک جہتی نہیں، بلکہ

ایک طرف علی میں پل رکھتا ہے۔

طوطی اور آئینے کی مناسبت قدرے تشریح کی محتاج ہے، طوطی کو بون سکھانے

کے لیے آئینہ رکھ دیتے تھے اور اس کے سامنے طوطی کا چہرہ رکھ دیتے تھے۔ سکھانے لگے آئینے کی پشت پر بیٹھتا تھا اور منہ میں چھوٹا سا پتھر رکھ دیتا تھا۔ پتھر کے ذریعے سے ہر کچھ بولتا، طوطی آئینے میں عکاس دیکھ کر سمجھتا کہ کوئی دوسرا ہم جنس بول رہا ہے، رفتہ رفتہ وہ بھی ہم جنس کی نقل شروع کر دیتا اور اس طرح بولنا سیکھ جاتا۔
اس شعر سے یہ نتیجہ بھی نکالا جاسکتا ہے کہ عاشق نے محبوب کے گمان کے مطابق کسی اور سے بھی رشتہ محبت وابستہ کر رکھا ہے۔

۱۱۔ لغات۔ تجلی : ذات باری تعالیٰ کا جلوہ، جو حضرت موسیٰ کو طور پر دکھایا گیا تھا۔

طور : جزیرہ، خانے سینا کا مشہور پہاڑ، جس کی چوٹی پر حضرت موسیٰ نے ذات باری کا جلوہ دیکھا تھا۔ نیز انہیں قرأت کے دس احکام ملے تھے۔
ظرف : صحت، قابلیت۔

قدح خوار : پیالہ پینے والا یعنی میکش، شراب نوش۔
شرح : نامبر ہے کہ شعر یہ برقی قہقہ کو شراب سے تشبیہ دی گئی ہے اور طور شام کے تصور کے مطابق ایسا شراب نوش ہے، جس کا ظرف یعنی صلاحیت عالی نہیں، دیکھیے :

بستی نہیں ہے بارہ وساغر کہے بغیر
کی کتنی عمدہ مثال سامنے آگئی۔

خواہر عاتق فرماتے ہیں :

”اس شعر میں اُس آیت کے معنوں کی طرف اشارہ ہے کہ ”ہم نے اہانت کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا، مگر وہ اس کے مستحق نہ ہوئے اور ڈر گئے اور انسان نے اسے اٹھا لیا“ شاعر کہتا ہے، کہ برقی تجلی کے گرنے کے ہم مستحق تھے نہ کہ کوہ طور، کیونکہ شراب خوار کا ظرف دیکھ کر اس کے موافق شراب دی جاتی ہے، پس کوہ طور، جو

مخلد جہاد کے ہے، وہ کیونکر تجلی الہی کا مستحق ہو سکتا ہے ؟
آخر میں فرماتے ہیں، یہ خیال ہی سچ اس تشیل کے، جو اس میں بیان ہوئی،
بالکل اچھوتا خیال معلوم ہوتا ہے ۔

خواجہ صاحب کی تشریح میں کسی اختلاف کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، لیکن یہ عرض
کر دینا چاہیے کہ طور تجلی کا مستحق نہ تھا، اس لیے سپٹ گیا۔ یعنی جو شراب اسے ملی وہ
اس کے ظرف سے بہت زیادہ تھی، البتہ ہم پر وہ، بجلی گرتی تو اسے برداشت کر سکتے
تھے۔ یہاں ہم سے مراد مرزا غالب نہیں، بلکہ نوبع انسانی ہے۔ اس شعر سے مرزا نے
تمام مخلوقات پر نوبع انسانی کے اشرف و اعلیٰ ہونے کا روشن ثبوت ہم پہنچایا ہے۔

۱۲۔ لغات۔ مشوریدہ حال : یہ نشان حال۔ دیوانہ۔

شرح : اسے محبوب! میں نے سیری دیوار دیکھی تو یاد آ گیا کہ میں دیوار مٹی
جس سے پریشان حال اور دیوانہ غالب نے سر پھوڑا تھا۔

وہ تیسے دو باتوں کا اظہار مقصود ہے، اول یہ ایک مشورہ و معروف واقعہ ہے
جو پیش آیا، دوم اس سے پورے واقعے کی یاد تازہ کرانا مقصود ہے۔ شعر میں خوبی
کا ایک پہلو یہ ہے کہ دیوار بیشک محبوب کی تھی، لیکن اس کے سلسلہ میں جو واقعہ سب
سے بڑھ کر قابل ذکر پیش آیا، وہ غالب کا سر پھوڑنا تھا، لہذا دیوار دیکھتے ہی ذہن
سب سے پہلے اس واقعے کی طرف منتقل ہوا۔

⑤

۱۔ شرح : میرا دل

روشن سودج کی تکلیف و راحت
پر کانپ رہا ہے۔ میں اقل کی
وہ بلند ہوں، جو بیابان کے
کانٹے کی ٹوک پر جو۔

مرزا ہے سرا دل، زحمت مہر و خشاں پر
میں ہوں وہ قطرہ شبہم، جو ہو غایہ بیا باں پر
نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدہ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

مطلب یہ ہے کہ شبہم

فنا تعلیم درس بے خودی ہوں، اُس زمانے سے
 کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستان پر
 فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے
 بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر
 نہیں اقلیمِ الفت میں کوئی طومارِ تازہ ایسا
 کہ پشتِ چشم سے جس کے نہ ہووے ٹھہرنواں پر
 مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلود، یاد آیا
 کہ فرقت میں تری، آتشِ برستی تھی گلستاں پر
 بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہو گا
 قیامت اک ہوائے تند ہے، خاکِ شہیداں پر
 نہ ٹامیج سے غائب کیا ہوا، اگر اُس نے شد کی
 ہمارا یہ، تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر
 سکتا، کانٹے کو ذرا سی جنبش ہو گی تو قطرہ گر جانے گا، لہذا ایسی بے حقیقت چیز کے
 لیے سودج کو تکلیف اٹھانے کی کوئی حاجت نہیں۔

کی اس حقیر بوند کے لیے
 سودج جیسے عظیم القدر وجود
 کو زحمت اٹھانے کی کیا ضرورت
 ہے اور بوند بھی ایسی، جو
 صحرا کے کانٹے کی نوک پر
 جو، سودجِ شبنم کو جذب
 کرنے کے لیے اپنی شاخ میں
 پھیلتا ہے، جو حرارتِ پہنچا
 کر شبنم کو اڑا لے جاتی ہیں،
 لیکن شاعر کہتا ہے کہ جو قطرہ
 شبنم غارِ بیاباں پر ہے، اس
 کے لیے زحمت اٹھانا کس
 بنا پر گوارا کیا جائے؟
 اس سلسلے میں دو پہلو قابل
 غور ہیں۔

۱۔ شبنم کا جو قطرہ کانٹے
 کی نوک پر ہو، وہ زیادہ
 دیر تک اپنی جگہ ٹھہر نہیں

سکتا، کانٹے کو ذرا سی جنبش ہو گی تو قطرہ گر جانے گا، لہذا ایسی بے حقیقت چیز کے
 لیے سودج کو تکلیف اٹھانے کی کوئی حاجت نہیں۔

۲۔ جو قطرہ کانٹے کی نوک پر ہو، وہ ہر لحظہ کا پتلا رہتا ہے، کیونکہ اس کا مقام
 بے مدتنگ اور نگہیہ ہوتا ہے۔ جو قطرہ پتوں پر ہو، اس کی کیفیت یہ نہیں ہوتی مرزا
 نے لکھتا ہے مراد "کھینچتے وقت نوکِ خار کے قطرے کی یہ کیفیت بھی پیش نظر رکھتی۔"

گوایا رز نے کسے، مضموم ہوئے۔ ازل قطرے کی حالت کا عام نقشہ۔ دوم اس کی
منوی پرین جی۔ سچ کی تعبیر سے پیدا ہوئی۔

شرح: ایسی سس کی بجائے جتنی درمیانے حقیقی کی عظمت و استواری کا اظہار
کرتے ہوئے تاج۔ کہ وہ رحیم واکہ ذات اونی اسے اونی اور حقیر سے حقیر شے سے
معاملت پر بھی کہ۔ انکا وہ لطیف و آئین سے۔

۲۔ لغات۔ خاتہ آرائی : لکھ کی آرائش۔

سفیدی : یہاں۔ اس کے دو مضموم ہیں، ازل وہ سفیدی، جو گھر کی۔ تانی اور
آرائش کے لیے عوا کی جاتی ہے۔ دوم وہ سفیدی، جو حضرت یعقوب کی آنکھوں پر
حضرت یوسف کی ہدائی پر دستے۔ تے پیدا ہو گئی تھی۔

شرح : حضرت یوسف قہ خاتہ بند پہنچ گئے، لیکن وہاں بھی انہوں نے
منزل کو سہانے اور سنوارنے کا شہرہ قائم رکھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت یعقوب کی
آنکھیں جو۔ دسے دتے سفید رہی تھیں، اپنے محبوب فرزند کی تلاش میں قید خانے
کی دیواروں پر چر۔ ہی تھیں۔ اسی کو عام سفیدی قرار دیتے ہوئے مرزا نے خاتہ آرائی
کا ثبوت پیش کر دیا۔

۳۔ لغات۔ فنا تعلیم : فنا کی تعلیم پانا ہوا۔ وہ شخص جو فنا کی تعلیم حاصل کر
چکا ہو۔

وہیں بیخودی : اپنے آپ سے بے خبر ہو جانے کا سبق۔

لام الف : لا جو عربی میں حرف نفی ہے اور یہاں اسے فنا کی دلیل بنایا گیا۔
دبستان : ادبستان کا مصنف، کتب۔ تعلیم پانے کی جگہ۔

شرح : میں بیخودی کا سبق لیتا ہوا اس زمانے سے فنا کی تعلیم پامیٹا ہوں

جب مجنوں یعنی قیس عامری ابھی کتب کی دیوار پر لام الف کہنے کی مشق کر رہا تھا
تھر میں مجنوں پر اپنی فصیلت و سبقت ظاہر کی ہے، لیکن کہاں یہ کیا کہ کتب
میں پڑھنے والے بچوں کا عام طریقہ، طور خاص پیش نظر رکھا۔ وہ جب تھوڑا بہت

یہ کہہ جیتے ہیں تو کوئی نام یا کلمہ یا مثنیٰ لے کر کیجیے جو نئے تروف دیواروں پر لکھنا شروع کر دیتے ہیں اور سب سے بڑھ کر کتب ہی کی دیواریں ان کا تخلص مشق جنتی ہیں۔ پھر عربوں سے انجبر نہیں لکھوائی، بلکہ لام الف لکھوایا، جس کا مطلب یہ ہے کہ بمبوں نے فنا کا صرف اجتہاد ہی سبق لیا تھا، جب میں پوری تعلیم پا کر فراغت حاصل کر چکا تھا۔

۴۔ لغات۔ تشویش : رنج، محنت، پریشانی، تردد، دوڑ و دوپ۔

بارہ ہائے دل : دل کے ٹکڑے۔

تشریح : اگر میرے دل کے ٹکڑے نکلے ان پر صلیب کر لیتے، یعنی سب اس امر پر راضی ہو جاتے کہ ان پر نمک چھڑکا جاتا۔ ہے تو کتنا اچھا ہوتا؟ میں مرہم کے لیے دوڑ و دوپ اور تردد سے بالکل فارغ ہو جاتا، لیکن دل کے ٹکڑوں کو نمک چھڑکنے سے ایسی لذت ملی کہ ان میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے سخت جھگڑے شروع ہو گئے۔ ہر ٹکڑا یہ کہنے لگا کہ سارا نمک مجھے ملنا چاہیے۔ اس لڑائی جھگڑے کو ختم کرنے کی ایک صورت یہ نظر آئی کہ ان ٹکڑوں کو نمک کی لذت سے محروم کر دیا جائے، لہذا مرہم کی تلاش کا خیال آیا۔

دامخ رہے کہ شاعر نے مرہم تلاش نہیں کیا بلکہ دل کے ٹکڑوں کو اس لذت سے محروم کر دینے کی ایک تدبیر سوچی، جس نے ان کے درمیان مدد و مدد کش کش اور کھینچ پھا پھیر کر دی تھی اور شاعر کے لیے زندگی اجیرن بن گئی تھی۔ گویا یہاں بھی بنیادی چیز ایذا، الہی کے سوا کچھ نہ تھی۔

۵۔ لغات۔ طومار : کاغذ کا ٹمٹما، نامہ، دفتر۔ یہ لفظ ان خطوں کے لیے

بھی استعمال ہوتا تھا، جنہیں دفتر کی شکل میں مرتب کر لیتے تھے یا جوڑ جوڑ کر ایک لمبا کاغذ تیار کر لیتے تھے، جسے گول کر کے چرننگے یعنی بائس یا ٹین کے خول میں رکھتے تھے، مقصود یہ ہوتا تھا کہ بچوں کو وہ خط پڑھائے جائیں تاکہ وہ مختلف وضع کے رسم، لفظ اور اسلوب تحریر سے آگاہ ہو جائیں۔ ضروری کاغذات کے رجسٹروں یا دفتروں کے لیے بھی یہ لفظ مستعمل تھا۔

پشت چشم : چشم پرشی، آنکھ پھیر لینا۔

مُہر : بریاں صرف یہ حقیقت ٹھونڈ رکھنی چاہیے کہ مہر کی شکل فی الجہد آنکھ سے بنتی جلتی ہے۔

شرح : محبت و الفت کی ولایت میں ملازدا انداز اور حسنیوں کی لعاؤں کا کوئی ایسا طواری یا صغیر یا دفر موجود نہیں جس کی پشانی پر چشم پرشی، بے رخی یا بے پروائی کی اُڑن ثبت ہو۔

مطلب یہ کہ محبت کی رسم و راہ میں محبوب جو کچھ بھی کرتے ہیں، وہ عاشقوں سے بے رخی بے پروائی اور تلافی کے سوا کچھ نہیں جوتا۔ یہ اس مقام کی عام رسمیں ہیں اور ان پر کسی کو تعجب نہ ہونا چاہیے، لیکن سچے عاشقوں نے ہمیشہ یہ سب کچھ برداشت کیا ہے اور یقیناً برداشت کرتے رہیں گے۔

۶۔ لغات - ابر شفق آلود : وہ بادل جس پر آفتاب کے طلوع و غروب کی شاعیوں سے سرخی چھا گئی ہو۔

شرح : اب میں نے شفق کی سرخی سے بالتمام ابر کو دیکھا تو یاد آگیا کہ جب اسے محبوب ایں تجھ سے جدا تھا تو باغ پر آگ برس رہی تھی۔

مولانا طہطائی نے بالکل بجا فرمایا کہ لفظ "اب" اس شعر میں کثیر المعنی ہے یعنی یہ کہنا کہ اب یاد آیا صاف بتاتا ہے کہ پہلے یہ بات بھولی ہوئی تھی۔ عاشق نے پھر میں صدے اٹھائے، وہ محبوب کو دیکھ کر انتہائی خوشی اور غویت میں سب کے سب یاد نہیں رہ سکتے۔ کچھ مدت گزر جانے کے بعد ایک ایک چیز یاد آ رہی ہے اور لعلت یہ کہ کوئی مذکورئی دلکش منظر دیکھ کر ہی پرانی یادیں تازہ ہوتی ہیں اور پتا چلتا ہے کہ جو مناظر مہر لاندہ سے دلاؤ بیٹھے، محبوب کی بردائی میں وہ بھی سرا سراً رنج و مصیبت اور دھڑولی و دلدردی کا باعث بن گئے۔ مثلاً یہی شفق کا منظر، جب وہ بادلوں پر چھا جاتی ہے، کتنا پیارا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب محبوب سے بردائی تھی تو یہی منظر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باغ پر آسمان سے آگ برس رہی ہے۔

اس شعر سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ گرد و پیش سے مناظر کی دقت و باریکی سمجھانے خود کو فی خاص حیثیت نہیں دکھتی بلکہ سب کچھ انسان کی دلی کیفیت پر موقوف ہے۔ اگر وہ خوش ہے تو غیر دلچسپ مناظر سے بھی شادمانی کے اسباب پیدا کرے گا۔ اگر وہ ناخوش، رنجیدہ اور مصیبت زدہ ہے تو بہتر سے بہتر منظر بھی اس کے لیے سوزش اور جلن کا باعث ہو گا۔

شعر میں ابرو شفق آلود کے لیے عالم رنج و غم میں گلستاں پر آگ برسنے سے تشبیہ دینا بدیع تشبیہ ہے۔ یعنی جو شے اس عالم اسباب میں زیادہ سے زیادہ فزعیت افزا ہے اور بھی آتش باری کا مرکز معلوم ہوتی ہے۔ ۱۔

۷۔ **شرح :** شنید قبروں میں جا سونے۔ ان کے جسم مٹی میں مل گئے۔ قیامت کے دن مردے زندہ کیے جائیں گے، لیکن شہیدوں کی خاک میں اس کے سوا کیا باقی رہ گیا ہو گا کہ جلوہ سرا پائے شوق میں انتہائی بے قراری موجود ہو، لہذا قیامت شہیدوں کی قبر پر سے گزرے گی تو اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ہوا کے ایک تند و تیز بھرنے کی سی ہوگی، جو اس خاک کو اٹانے میں مزید مدد دے گا، جو پہلے ہی ناز و نبوب کے شوق میں مردانہ کے لیے بیقرار ہے۔

حق یہ ہے کہ اس قسم کے لبریز حقیقت شعرا تنے دل پذیر اور پُر تاثیر انداز میں کہنا بے حد مشکل ہے اور ان کی مثالیں دو ادیبی میں بہت کم ملتی ہیں۔

۸۔ **شرح :** اسے غائب : اگر نصیحت کرنے والے نے سنی تو درشتی سے کام لیا تو اس پر لڑنے کی کون سی وجہ ہے، ہمارے پاس اپنا گریباں ہے، اسے پھاڑ سکتے ہیں اور تار تار کر سکتے ہیں۔ اپنا زور لڑنے پر کیوں صبر کرے، اگر بیان پر کیوں ڈاڈائیں؟ کیا اس طرح بھی تسکین کا وہ سامان ہم نہ پہنچے گا، جو ہم ناسخ سے لڑ کر ہم پہنچانا چاہتے ہیں؟ اس شعر میں قابلِ غور نکتہ ہے کہ جس قوت کے مقابلے میں انسان بے دست و پا ہو، اس میں تسکین کے لیے اپنا نقصان کر لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

شعر میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اگر ناسخ نے درشت کلامی سے کام لیا تو بہتر نہ تھا

پیارا کر اسے بتا سکتے ہیں کہ عشق و محبت کے معاملات۔۔۔ تیری نصیحت ہمارے لیے بالکل بے حقیقت اور بے اثر ہے۔

○ ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشان اُڈر کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اُڈر یارب اُوہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات دے اور دل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اُڈر ابرو سے ہے کیا اس نگہ ناز کو چہرہ معرہ ہے قیر مقدر، مگر اُس کی ہے کہاں اُڈر تم شہر میں ہو تو ہیں کیا غم، جب اُٹھیں گے لے آئیں گے باز اُسے، چاکر دل و جاں اُڈر ہر چند بسکہ ست ہوئے بُت شکنی میں ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سگِ گراں اُڈر ہے خونِ جگر جوش میں، ہول کھول کے روتا ہوتے جو کئی دیدہ و خوشنماہ نشان اُڈر مڑتا ہوں اُس آواز پہ، ہر چند سر اڑ جائے جلا د کو مین و وہ کہے جائیں کہ "ہاں اُڈر"

۱. لغات - نشان :

میں اس کے معنی پتا، نکتہ اور صید ہیں۔

بسکہ : چونکہ۔

شرح : چونکہ ان کے

ہر اشارے میں کوئی اُڈر ہی نکتہ اور ہی صید پایا جاتا ہے، اس لیے وہ محبت بھی کرتے ہیں تو ہلدا خیال دوسری ہی طرف جاتا ہے۔

یعنی ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں بھی کوئی نہ کوئی چال اور فریب ہے۔

عاشق محبوب کی ادائیں

دیکھ دیکھ کر اتنا پریشان ہو چکا ہے کہ اس کے دل میں کسی بھی بات کے لیے یقین کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ وہ یقین کا جو ہر ہی کھوپکا

ہے، لہذا محبوب بظاہر محبت بھی

کرے تو عاشق کے لیے اطمینان

کی کوئی صورت نہیں بنتی۔ بدتر از

وہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ محبت کا انکار

لوگوں کو ہے خود شہید جہاں تاب، کا دھوکا
 بہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغ ہنساں اُور
 لیٹا، اگر دل تمہیں دیتا، کوئی دم نہیں
 کرتا جو نہ مرنا، کوئی دن آہ و فغاں اُور
 پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے میں نامے
 تو کتنی ہے مری طبع تو بھرتی ہے رواں اُور
 ہیں اُور بھی دنیا میں سخور بہت اچھے
 کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ میاں اُور

اس جیسے کہ ہے، مجھے اپنے
 دام میں خوب اچھائیں، پھر محبوبانہ
 ناز و خاز سے ہری طرح خبریں۔
 ۲۔ شرح : بظاہر معلوم
 ہوتا ہے کہ محبوب سے غفلت میں
 غلامت کی درخواست کی جا رہی
 ہے، لیکن صاف صاف اور
 کھل کر اس لیے نہیں کر سکتے
 کہ شاید غلاب نازل ہو۔ اشارہ
 کہ اہوں سے مطلب سمجھا جا رہا ہے
 میں اور محبوب سمجھتے ہیں، لہذا
 مجبور ہو کر خدا سے دعا کرتے ہیں
 کہ اگر مجھے دوسری زبان نہیں مل سکتی، جو اپنا دماغ ٹھیک ٹھیک سمجھا سکے تو محبوب ہی کو
 کوئی اور دل دے دے، جو آسانی سے میری بات سمجھ سکے۔

اس شعر کا تعلق محبوب کے ساتھ معاملات کی صفائی سے بھی ہو سکتا ہے، یعنی محبوب
 نے بعض حرکتوں پر امانتی نہ ہو کر، ناشق نے اپنی طرف سے صفائی پیش کی۔ عاشق کا موقف
 محبوب کی سمجھ میں نہیں آتا اور عاشق پریشان ہو کر کہتا ہے کہ اے اللہ! مجھے دوسری زبان
 نہیں مل سکتی تو محبوب ہی کو دوسرا دل دے دے۔

خواجہ عاتق فرماتے ہیں کہ شعر بظاہر معشوق کے حق میں معلوم ہوتا ہے، مگر اس میں دیرپہ
 ان لوگوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو مرزا کے کلام کو بے معنی یا بعید الغہم سمجھتے تھے۔

اس صورت میں مرزا کی مراد یہ ہے کہ اگر لوگوں نے میری باتیں نہیں سمجھیں، لہذا
 میں ان سے کہنے کی امید نہیں رکھتی، تو خدا کی بارگاہ میں یہی گزارش پیش کی جا سکتی
 ہے کہ مجھے دوسری زبان نہیں مل سکتی تو ان لوگوں کو دوسرے دل دے دیے جائیں۔

مستحکم و مناسب کے درمیان مبادلہ افکار کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ دونوں کے دل و زبان میں اک گوند مناسب ہو۔ اگر مناسب نہ ہوگی تو ظاہر ہے کہ مبادعے کی کوئی صورت نہ رہے گی۔ مرزا نے شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا۔

۳۔ لغات - پیوند : علاقہ، تعلق، جوڑ

مقررہ : مزدور، چاٹہ، یقیناً -

شرح : محبوب کی نگاہ تازہ کو بھلا ابرو سے کیا تعلق ہو سکتا ہے یا یعنی یہ تیرا برو کی کمان سے نہیں نکل سکتا۔ اس کا تعلق کسی اور ہی کمان سے ہے، یہ کسی دوسری ہی کمان سے نکلا ہے اور وہ کمان بظاہر حسن کی و لغز ہی دو لاویزی ہے، لیکن اس کا ذکر نہیں کیا۔ یہ شرکی ایک اور خوبی ہے کہ ہر فرد کو موقع دے دیا، وہ اپنے احوال و فطرت کے مطابق اس کمان کا تعلق کرے۔

دیکھیے، کمان و ابرو اور تیر و نگاہ کی تشبیہ بہت پرانی اور فرسودہ تھی، اگر مرزا نے کمان وحدت سے کام لے کر اس میں نئی تازگی اور نیا حسن پیدا کر دیا۔

۴۔ شرح : اے محبوب! جب تم شہر میں موجود ہو تو ہمیں دل و جان کا کیا غم ہے؟ کیونکہ جب انھیں گے، بازار سے نئے دل و جان خرید لائیں گے، تھکے ہوتے ہر شخص کے لیے دل و جان دو بھر ہوا ہے اور وہ سستے داموں بیچ دینے کے لیے تیار ہیں۔ جو جنس بازار میں زیادہ آجائے، اسے سید و طلب کے اصول کے مطابق وہ ارزاں ہو جاتی ہے۔

اس شعر کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ دل و جان لینے میں محبوب کی مشاقتی نے اس جنس کا بازار آراستہ کر دیا ہے، جہاں یہ بے کثرت بک رہی ہے، مفقود صرف یہ بتانا ہے کہ محبوب جس شہر میں موجود ہو، وہاں کون اس سے دل و جان بچا کر رکھنے کے لیے تیار ہوگا؟ سب اس متابع عزیز کو اٹھانے بطور نذر پیش کرنے کے لیے تیار ہیں۔

یہ شاعر کا اسلوب بیان ہے، جس نے اصل موضوع کو اس رنگ میں پیش کر دیا۔

۵۔ لغات - سبکدست : چابک دست، مشاق، ماہر

شرح : خوابہ ماتی مزامتے ہیں :

”اس شعر میں سارا زور ”ہم“ کے لفظ پر ہے۔ یعنی جب تک ہماری ہستی باقی ہے، اُس وقت تک ماہ معرفت الہی میں ایک اور سنگ گراں ستر راہ ہے۔ پس اگر ہم نے بہت توڑنے میں سبکدستی حاصل کی ہے تو کیا فائدہ یہ بڑا بیماری بخت یعنی ہماری ہستی تو ابھی موجود ہے ؟“

مطلب یہ ہے کہ ہم نے جو ادھوس کے بُت توڑنے میں خوب مشاقی اور مصارت حاصل کر لی۔ جو بھی بُت سامنے آیا، اسے چکنا چور کر کے رکھ دیا، لیکن خود ہماری ہستی کا بُت جو بڑے بیماری پتھر کی حیثیت رکھتا ہے، بہارا راستہ بدستور روکے ہوئے ہے۔ جب تک یہ نہ ٹوٹے اور اس کا قطع قلع نہ ہو، نہ راستہ صاف ہو سکتا ہے نہ ہم قدم آگے بڑھا سکتے ہیں اور نہ معرفت کی منزل پر پہنچ سکتے ہیں۔ غرض یہ کہ تمنا جو ادھوس کے بُت توڑنے سے فراغت حاصل نہیں ہوتی اور معرفت کا راستہ نہیں کھلتا کیونکہ جب تک ہم موجود ہیں، جو ادھوس کا سلسلہ ساتھ رہے گا، البتہ ہمارے وجود کا بہت ٹوٹنے کا تو مقصود پر پہنچنے کا دروازہ کھلے گا۔

۶۔ لغات - ویدہ خوشنا بہ فشاں : خون برسانے اور رونے والی آنکھیں۔

شرح : جگر کا خون جوش میں آگیا ہے، یہ غم بھر اور یاد محبوب کا نتیجہ ہے۔ اگر میرے پاس ہو رونے اور خون برسانے والی کئی آنکھیں ہوتیں تو جی بھر کے رو لیتا۔ یہ معنون خاص مرزا غالب کا ہے کہ کبھی ان کے دل کا بوجھ ہکا کرنے اور خون جگر کا جوش نکالنے کے لیے کئی آنکھوں کی ضرورت پیش آئی، کیونکہ خدا کی عطا کی ہوئی دو آنکھوں کے لیے یہ وظیفہ ادا کرنا ممکن نہیں، اصل کام ان کی بساط سے بہت زیادہ ہے اسی طرح جب عموں کی مزادانی ہوئی اور اس نے سیل کی سی صورت اختیار کر لی تو فرمایا :

میری سمت میں غم گراتا تھا
دل بھی یاد ب کئی دیے ہوئے

گویا جس طرح غم کی مزادانی کے اظہار کے لیے یہ کہا کہ اس کا جھل کئی دلوں کا

تعمات کرتا ہے، اسی طرح خونِ جگر کے جوش کی طوفانی کیفیت کے اظہار کے لیے یہ پیرایہ اختیار کیا کہ اسے مزو کرنا منظور ہو تو وہ نہیں، بلکہ کچی خون رونے والی آنکھیں دکھار ہیں۔ مرزا کے نزدیک دل اور آنکھیں دکھ سنے اور رونے کا ایک پیمانہ ہیں۔ اب جتنے دکھ زیادہ ہوں گے اور خونِ جگر کا جوش جتنے زوروں پر ہو گا، اسی کے مطابق پیمانے دکھار ہوں گے۔

۷۔ شرح : میں تو محبوب کی آواز پر قربان ہوا جاتا ہوں۔ بیشک سر اڑتا ہے تو اڑ جائے، گردن کشتی ہے تو کٹ جائے، لیکن وہ جلاؤ کی سہر سرب پر کبے جائیں کہ "ہاں اُڑ دگا" یہ آواز اتنی دلکش و لغزیب ہے کہ اس پر میں بے تکلف جان قربان کر سکتا ہوں۔

دیکھیے، یہاں بھی مقصود سر کٹنا نہیں، بلکہ محبوب کی دلغزیب آواز کی کیفیت پیش کرنا منظور ہے، اس کے لیے جلاؤ کا ڈراما تیار کیا گیا۔ گویا اتنے نازک حالات میں بھی، جب جان جا رہی ہو، آواز محبوب کی دلغزیبی سہر شے پر فائق ہے۔ اور اسی کے سننے کی آرزو ہے۔

۸۔ شرح : میں ہر روز اپنا نیا چھپا ہوا داغ دکھا دیتا ہوں۔ لوگوں کو یہ دھوکا ہوتا ہے کہ آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ میرے ہر داغ کی حرارت، جہان تابی اور حقیقت بالکل سورج سے مشابہ ہے۔ اتنی مشابہ ہے کہ لوگ دیکھتے ہیں تو اول نظر میں سمجھ لیتے ہیں کہ سورج نکل آیا، البتہ کچھ مدت بعد انہیں دھوکے کا احساس ہوتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو مرزا غالب کے سینے کا ایک نیا داغ محنت تھا، جس پر سورج کا دھوکا ہوا ہے۔

۹۔ شرح : خود مرزا غالب کا اس شعر کی شرح میں قاضی عبدالجلیل جہان بریلوی کو لکھتے ہیں :

"یہ بہت لطیف تقریر ہے۔ لیتا کو ربط ہے چین سے، کرتا کو ربط ہے

آہ و فغاں سے، عربی میں تعقید لفظی و معنوی دونوں میوہ ہیں، فارسی میں تعقید معنوی اور تعقید لفظی جائز بلکہ فصیح و بلیغ و سنجیدہ تقلید ہے فارسی کی۔ حاصل معنی مصرعین یہ کہ اگر دل تھیں نہ دیتا تو کوئی دم نہیں لیتا۔ اگر نہ مرنے تو کوئی دن اور آہ و فغاں کرتا۔

فارسی میں لفظی تعقید جائز یا فصیح و بلیغ ہو تو ہو، لیکن تعقید لفظی ہو یا معنوی، بہر حال عیب ہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ردیف کی پابندی نے مرزا غالب کو اس تعقید لفظی پر مجبور کیا۔ مقصود یہ نہیں کہ ردیف و تاقید کی پابندی پر اعتراض کیا جائے اس کے بغیر شعر کی تین چوتھائی موسیقی ختم ہو جاتی ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ بعض اوقات شاعر تعقید پر مجبور ہو جاتا ہے، لیکن ایسا شعر جیسا مرزا کا ہے، بہ آسانی چھوڑا جا سکتا تھا، کیونکہ اس میں کوئی خاص بات ہی نہیں، اس طرح تعقید ختم ہو سکتی تھی۔

۱۔ شرح : خواجہ عاتق فرماتے ہیں :

”نالے یعنی ندی نالے، نہ آہ و فغاں۔ مثال کس قدر مثل لڑکے مطابق ہے اور مصنون کتنا مطابق واقعے کے ہے۔ فی الحقیقت معیبت اور رنج و تکلیف کے سبب جوں جوں شاعر کی طبیعت اُرتکتی ہے اسی قدر زیادہ راء دیتی ہے۔ خصوصاً جو مصنون وہ اس وقت اپنے حال لکھتا ہے، وہ نہایت مؤثر اور درد انگیز ہوتا ہے۔“

شعر میں مرزا نے اپنی طبع رواں کو ندی نالے سے تشبیہ دی ہے۔ پہاڑی ندی نالوں میں کٹرا لیا جوتا ہے کہ آس پاس سے بڑے بڑے پتھر بیچ میں آگرتے ہیں اور ندی کا بہاؤ ٹک مارتا ہے، لیکن رکاوٹ پر منبع کا پانی نہیں رکتا، وہ جستور آتا رہتا ہے اور جمع ہو کر اتنا زور پیدا کر لیتا ہے کہ یا تو ان پتھروں کو بہا لے جائے، جو راستے میں رکاوٹ بنیں یا اس رکاوٹ کے اوپر سے بہنے لگے اور آہستہ آہستہ اسے ختم کر دے۔ اس صورت میں ندی نالے کا بہاؤ اور تیز ہو جاتا ہے۔

دوسرے تیرہ دریائے سندھ میں آیا، وہ تھوڑے ہی آگے آگے دریا بانگن پایاب رہ گیا۔ پھر جمع شدہ پانی نے یکایک برغانی چٹانوں کو توڑ دیا اور اتنا پانی آیا کہ دریا کے اصل بہاؤ سے یہ تیرہ فٹ اونچا بننے لگا۔ اس پاس کی اکثر بستیاں تباہ ہو گئیں۔

یہی مثال مرزا نے اپنی طبع وداں کے لیے اختیار کی فرماتے ہیں کہ اگر کسی مصیبت یا رنج و غم کے باعث طبیعت میں رکاوٹ پیدا ہوتا ہے تو ندی تالوں اور دریاؤں کی طرح اس کی روانی تیز تر ہو جاتی ہے اور بہتر سے بہتر اور پر تاثیر معنوں تراوش کرتے ہیں۔

۱۱۔ شرح : دنیا میں اُرد بھی اچھے اچھے شاعر اور سخنور موجود ہیں، لیکن لوگ کہتے ہیں کہ غالب کا انداز بیان ان سب سے الگ اور اچھوتا ہے۔

اس شعر میں بھی بیان کی عذت طرازی کا کمال دکھایا، یعنی اپنے انداز کے اچھوتا ہونے کی کہانی خود کہی، دوسروں کی زبان سے کہلائی اور وہ بھی اس طرح کہ لوگوں میں عام چرچا رہے، عام شہرت ہے، غالب کا انداز بیان سب سے الگ ہے۔

۱۔ لغات۔ آبِ برجا ماندہ : صفائے حیرت آئینہ ہے، سامانِ رنگِ آخر
 اپنی جگہ ٹھہرا جو اپنی جیسے حزن اور تالاب کا پانی کہ وہ جاری نہیں ہوتا، بلکہ ٹھہرا رہتا ہے۔

تغیر آبِ برجا ماندہ کا، پاتا ہے رنگِ آخر
 نہ کی سامانِ عیش و بجاہ نے تدبیر و شست کی
 شرح : آئینے کی عیت جو اجامِ زُمرّد بھی مجھے، داغِ پلنگِ آخر
 اور صفائی ہی اس کے لیے آخر

رنگ کا سامان ہی جاتی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیں چاہیے کہ جو پانی اپنی جگہ ٹھہرا رہے گا اور جاری نہ ہوگا، اس کا رنگ بدل جائے گا اور کافی جم جانے سے اس کی صفائی اور پاکیزگی باقی نہ رہے گی۔

اس شعر کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ زندگی حرکت کا نام ہے، نہ کہ جو رکا۔ جو چیز یا جو وجود اپنی جگہ ٹھہرا رہے، وہ بہر حال زندگی کی حقیقت سے محروم ہو جائے گا۔ جس طرح پانی نہایت صاف و پاکیزہ شے ہے۔ جاری رہے گا تو اس کی پاکیزگی قائم رہے گی، ٹھہر جانے کا تو پاکیزگی سے محروم ہو جائے گا۔ خشک اسی طرح آئینہ بھی ایک حالت پر رہے گا تو اس کی صفائی ختم ہو جائے گی اور اس میں رنگ لگ جائے گا۔

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اگر انسان مدت العمر اسی مقام میں رہے گا جسے صوفیہ مقام حیرت قرار دیتے ہیں تو اس کی صفائی اور پاکیزگی زائل ہو جائے گا۔ مرحوم بھجوردی کے قول کے مطابق "وادی حیرت کا راستہ نہایت پرخطر ہے۔ بہت سے طالب حقیقت اس سے آگے نہیں پہنچ پاتے۔ یہ سراب اور تشرنوبی کی حقیقت ہے۔۔۔ لیکن جو اہل ظلمت ہیں، وہ بہر ویر ہو وقت اس وادی کو طے کر جاتے ہیں۔"

۲۔ **شرح :** عیش و بھاد کا سامان بھی وحشت کا علاج نہ کر سکا اور دیوانگی زائل نہ ہو سکی۔ دنیا کی دولت اور بھاد وحشت پہنچے عاشق کو راہ عشق سے باز نہیں رکھ سکتی۔ زمر کا پایہ دولت و وحشت کا نشان ہے، جو تپا عاشق ہے، اسے یہ پایہ بھی پہنچنے کے سبب کا داغ نظر آتا ہے، جو بھائے خود وحشت کی علامت ہے، کیونکہ جیسے آبادیوں میں نہیں، جنگلوں، پہاڑوں اور ویرانوں ہی میں ملتے ہیں۔



۱۔ لغات - دستگیری:

درو، اعانت، حمایت۔

جنوں کی دستگیری کس سے ہو، گر ہو نہ عرانی

گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے، میری گردن پر

برنگ کاغذ آتش زدہ، نیرنگ بقیابی

ہزار آئینہ دل باندھے ہے، بال یک تمدن

گریباں چاک، نکاح

بھی مانا جا سکتا ہے، جیسے گریباں

چاک، چٹا ہوا گریباں اور صاف

منقلب بھی ہو سکتی ہے، یعنی

چاک گریباں۔

شرح : برہنگی کس

جنون کا ہاتھ کون قائم کرتا ہے ؟
 کون اس کا حامی و مددگار ہو سکتا
 ہے ؟ عربانی گریبان چھاڑنے یا
 چاک ہونے کا نتیجہ ہے ۔ لہذا اس
 چاک کا حق احسان میری گردن پر
 رہ گیا ۔ اسی نے عربانی پیدا کی ،
 جس کی وجہ سے جنون کی دشگیری
 ہوئی اور میری حالت جنون قائم
 رہی ۔

ننگ سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تھا ہے
 متاعِ بڑوہ کو سمجھے ہوئے میں قرعہ زدن پر
 ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن مگر رکستا ہے
 شعاعِ مہر سے تہمتِ ننگ کی چشمِ روزن پر
 فنا کو سوئپ اگر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
 فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوفِ گلخن پر
 اسدِ سہل ہے کس انداز کا قاتل سے کتا ہے

۴۔ لغات ۔ کاغذ آتش زدہ

وہ کاغذ جسے آگ لگائی گئی ہو۔

نیرنگ بیتابی : اضطراب اور تڑپ کی نیرنگی یعنی بڑھتی۔

بال : ہر ۔ بازو

تہید : تڑپنا ۔

شرح : میرے اضطراب اور تڑپ کی نیرنگی اس کاغذ کی طرح جسے آگ لگا دی

گئی ہو ، ایک ایک تڑپ کے بازو پر دل کے سزار و سزار آگنیے باندھتی ہے ۔

عبدالرحمن بجنوری مرحوم کاغذ آتش زدہ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ،

”حرفِ آشنا کاغذ گویا بلکہ زندہ ہوتا ہے ۔ کاغذ چونکہ کلامِ ربی اور کلمات

مشری کا حامل ہے اس لیے کاغذ کے جلانے کو عیب خیال کیا جاتا ہے ،

لیکن کاغذ کی تحریر مستقل سند ہوتی ہے اس لیے شہادت کو تلفع کرنے

کی غرض سے کاغذ کا مٹانے کر نا پسند اوقات لازمی ہو جاتا ہے ۔ مشرق ابتدا

سے نامہ اے عشاق کو جلاتے آئے ہیں ، لیکن کسی شاعر کے مشاہدے میں

یہ نہ آیا کہ کاغذ کے جلنے میں کیا کیا شاعرانہ کیفیات ہوں، بلکہ عیاں ہیں
جب کاغذ کو آگ میں ڈالا جاتا ہے تو ذرا سی دیر آتش بلند ہو کر شعلہ
بجھ جاتا ہے اور سرخ و سیاہ رنگ کاغذ کا نیم جان جسم رہ جاتا ہے،
جس میں سکرات اور نزع کی تمام علامات نظر آتی ہیں۔ یہ ارتعاشی حیات
بھی مزد ہو جاتا ہے اور سراپا جل چکنے کے بعد ہزاروں نقطہ نئے روش
کاغذ پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ آخر کار کاغذ خاکستر ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔

آتش زدہ کاغذ کی اسی کیفیت کے پیش نظر مرزا نے اپنے شیر نگ بیتابی کے عمل
سے تشبیہ دی۔ جو روشن نقطہ آخر میں کاغذ کی سطح پر نمودار ہوتے ہیں، ان کی حیثیت ٹٹاٹے
تاروں کی سی ہوتی ہے۔

یہی کیفیت مرزا نے یوں پیش کی، گو یا ایک ایک تڑپ کے بازو پر ہزار ہزار
آئینے باندھ دیے گئے ہیں۔ دل اس لیے لائے کہ احساس دل کی خاصیت ہے، تڑپنا اور
لوٹنا دل ہی پر موقوف ہے۔ مشاہدے کے کمال کے علاوہ شاعر نے تشبیہ، پھر اس کیفیت
کے بیان میں حیرت انگیز کمال دکھایا۔

ایک صاحب فرماتے ہیں، آتش زدہ کاغذ میں سکڑنے اور سٹھنے کی جو کیفیت
پیدا ہوتی ہے، اس سے بیتابی کو تشبیہ دی ہے اور ایسے کاغذ میں جو روشن نقطے،
نمودار ہوتے ہیں، ان کی مناسبت سے ہزار کہا۔ مطلب یہ کہ تکلیف و بقراری میں
اگر کوئی شے موجب تمکین ہوتی ہے تو وہ تڑپنا اور لوٹنا ہے۔

۳۔ لغات - حبش رفتہ : گزرے ہوئے زمانے کی راحت و آسائش۔

منابع بُردہ : جدید ہوا مال، لوٹا ہوا مال۔

شرح : خواہجہ حالی فرماتے ہیں :

”یہ معنوں میں بالکل دو قیامتیں ہیں سے ہے۔ جو شخص آسودگی کے بغض

ہو جاتے ہیں، وہ ہمیشہ اپنے تئیں مظلوم، ستم و سیدہ اور غلام زدہ سمجھا

کرتے ہیں اور اخیر و دم تک اس بات کے متوقع رہتے ہیں کہ حذر کہیں

نہ کبھی ہمارا انصاف ہوگا اور ہمارا اقبال پھر خود کرے گا :

ہم اپنی گزری ہوئی راحت و آسائش کے لیے آسمان سے کیا کیا تقاضے کر رہے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہم سے چین گیا، وہ واپس مل جائے تاکہ پھر اس چین کی زندگی بسر کریں، لیکن انسانیں سمجھتے کہ آسمان کی حیثیت ڈاکو اور قزاق کی ہے۔ وہ جو مل متاع لوٹ کر لے گیا ہے، اسے ہم سادہ لوحی سے رہزن پر قرض سمجھ بیٹھے ہیں، کہ جب چاہیں گے، وصول کر لیں گے یا تقاضا کر کے لے لیں گے، حالانکہ رہزنوں سے ٹوٹا ہوا مال کبھی واپس نہیں ملتا۔

ہم - لغات - بے سبب رنج : بغیر کسی سبب کے خفا ہونے والا، بلا وجہ ناراض ہو جانے والا۔

آشنا دشمن : دوست کا دشمن، محبت کرنے والے سے عداوت رکھنے والا۔
روزن : روشن دان۔

شرح : ہمارا معاملہ ایسے محبوب سے آپڑا ہے، جو بغیر کسی سبب کے ناراض ہو جاتا ہے۔ دوستوں اور خیر خواہوں سے دشمنی رکھتا ہے۔ اس کی بدگمانی کا یہ عالم ہے کہ اگر اس کے گھر کے روشن دان میں سے سورج کی کرن اُتر چلی جائے تو فوراً غصے سے پکاراٹھتا ہے کہ روشن دان کی آنکھ نے نگاہ پیدا کر کے مجھے دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ یہ سورج قسمت ہے۔ کیونکہ نہ روزن کی آنکھ ہوتی ہے اور نہ سورج کی کرن ایسی نگاہ دیتی ہے۔ یا یہ کہ عاشق روزن کی آنکھ سے مجھے جھانک رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی قسمت لگانا بھانے خود بلا وجہ ناراض ہونے اور دوست سے دشمنی رکھنے کا ثبوت ہے، جس کی بدگمانی کا یہ عالم ہو اس کے باب میں عاشق کیا کہے۔
۵ - لغات - مزروع ظالم : قسمت کے ستارے کا چمکنا، خوش نصیبی۔

خاشاک : کوڑا کرکٹ، گھاس پھوس۔

گلخن : گل یعنی آتش، خن خانے کا مخفف یعنی بستی۔

شرح - اگر تو اپنی حقیقت تک پہنچنے کا مشتاق ہے تو اپنے آپ کو فنا کے

حمارے کردے، امین فنا ہو جا اور اپنے آپ کو مٹا دے۔ دیکھ، لگا اس پھوس اور کوڑے کرکٹ کی کیا حیثیت ہے؟ لیکن جب ہی بے حقیقت چیزیں جٹی میں پہنچتی ہیں تو ٹھٹھے کو بلند کرنے اور آگ بھڑکانے کا موجب ہوتی ہیں۔ گو یا ان کے فیصے کا پکنا جٹی میں پہنچ جانے پر موقوف ہے۔ تیرا نصیب بھی اسی صورت میں چپکے گا اور تو بھی اپنی حقیقت پر اُسی حالت میں پہنچے گا؛ جب اپنی ہستی فنا کر کے اصل و مبداء میں گم ہو جائے گا۔

بجزودی مرحوم کہتے ہیں،

”مرزا غالب ان نابوت بردوش فلسفیوں میں نہیں، جو زندگی کو اتم غاۓ اور اہل دنیا کو اہل جنازہ خیال کرتے ہیں، اودت الوجود کے تعلقے کا پہلا سبق یہی ہے کہ خدا اور ماسوا صریح عارضی طور پر جدا ہیں اور بعد الموت یہ جدائی ختم ہو جاتی ہے۔“

عشرتِ نظرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

انسان خود کو اپنی غلط بینی کے باعث امزاد سے علیحدہ اور ماحول سے جدا گانہ خیال کرنے لگتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ میں دنیا میں اجنبی ہوں اور مخالف اشخاص و قوانین میں گھبر ہوا ہوں، لیکن انسان اور علاقہ میں حقیقتہً کوئی رخنہ حامل نہیں، یہاں تک کہ موت بھی اس میں کوئی رخنہ پیدا نہیں کرتی۔ اُنشدوں میں لکھا ہے: ”موت اور بقا اس کا سایہ ہیں۔ موت اور حیات میں کوئی فرق نہیں، نہ تضاد ہے، بلکہ حیات میں موت ہے۔ حیات کی آمد و رفت اور رفت و آمد موت ہے۔ موت حیات عارضی کو دائمی کو دیتی ہے۔“

۶۔ شرح: ”کس“ استفہام کے لیے نہیں، تعجب کے لیے ہے،

اسد کس درجہ حیرت انگیز بسمل ہے کہ خود خاک و خون میں لوث رہا ہے۔ لیکن قافل (محبوب) سے کہتا ہے کہ کوئی ناز کی مشق کیے جا، انداز و ادا دکھائے جا۔ اگر لوگوں کا خون ہوتا ہے تو تجھ سے کوئی باز پرس نہ کی جائے گی، تیرے خلاف کوئی

دعویٰ نہ ہوگا۔ دونوں جہانوں کے خزان کی ذمہ داری میں اپنے اوپر لے لینے کے لیے تیار بیٹھا ہوں۔



۱۔ لغات :- ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خواباں تجھ پہ عاشق میں
شکش : ظلم و ستم اٹھانے والا
خواباں : حسین۔
تکلف برطرف مل جائے گا تجھ سارقیب آخر
تکلف برطرف : تکلف اٹھا رکھیے۔ یہ ایسے موقع پر استعمال کرتے ہیں جب کوئی
بات صاف صاف اور سلیکھ پیش رکھتے بغیر کہنی مقصود ہو۔

شرح :- میں تیرے ظلم و ستم سنا ہوں اور اس میں میرے سامنے ایک مصلحت
ہے۔ وہ یہ کہ اسے محبوب! حسین و گنج تجھ پر عاشق ہیں۔ سچی اور صاف بات ہے کہ
کسی نہ کسی وقت ان میں سے کوئی ایک تیرے ظلم و ستم سے کرمیرا منہوا اور ہمدرد بن
جائے گا اور یہ یہ ہمہ کردل کو اطمینان دیتا رہوں گا کہ حسن حسن کو بھی خود بیدار کا خوشخوش
بنانے میں توفیق نہیں کرتا۔ پھر عشق کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے ؟
یہ کہتا کہ ان حسین عاشقوں میں سے غالب کسی ایک سے دل لگا کر تسکین حاصل
کرے گا۔ غالب کی شعر گوئی کی سراسر تعریف ہے۔



تعمید : یہ غزل نہیں
بلکہ مرثیہ یا نوحہ ہے جو عربی
العابدین خاں عارف کی جو انگری
پر کہا گیا۔ عارف مرزا صاحب
کی بیوی کے بھانجے، آبادی
بیگم اور شرف الدین نواب
غلام حسین خاں بہادر صاحب

لازم تھا کہ دیکھو میرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور
مٹ جائیگا سر، اگر ترا پتھر نہ گیسے گا
ہوں وہ پہ ترے نامید فرما کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں۔

نانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا، کوئی دن اور جاتے ہوئے کہتے ہو۔ قیامت کو ملیں گے۔

کیا خوب قیامت کا ہے، گویا کوئی دن اور ہاں اے غلبہ پیر! جواں تھا ابھی عارف

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور تم ماہ شب چار وہم تھے، میرے گھر کے

پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا، کوئی دن اور تم کون سے تھے ایسے گھرے دادوستد کے

کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت ہی، نیر سے لڑائی بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گندی نہ بہر حال یہ مدت، خوش و ناخوش

کرنا تھا، جواں مرگ اگر ارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غائب! قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

تنتقص بہ مسرور (ابن فیض اللہ خاں) کے صاحبزادے تھے۔

سلاطین میں پیدا ہوئے۔ چونکہ آبادی یلگم اور مسرور کے تعلقات بگڑ گئے تھے، اس لیے یلگم اپنے دونوں بیٹوں عارف اور حمید حسن کو لے کر الگ ہو گئی۔ عارف

خوش ذوق شاعر تھے۔ مرزا غالب نے انہیں بیٹا بنایا تھا۔ شروع میں وہ شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے، پھر غالب کی شاگردی اختیار کر لی۔ غالب نے فارسی میں مہارت کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

مباحثہ یوں دل عارف منزه
نیش چوں دم غالب منبر
ایک مستقل قطعہ عارف کی مدح میں لکھا ہے :

آل پند یہ خوش عارف نام
کہ رخش شیخ دوداں غمت
از نشاط نگار شش نامش
خامہ دقاس در بنان غمت
آنگہ در بزم قرب و خلوت آتش
غلسار و مزاج دایہ غمت

ہم ذلکب تو خوش و لم خوشدل کال نہال شرفشاہ منت
 ہر یقین دلاں کہ غیر من نمود گر نظیر تو در گاہ منت
 اے کہ میراث خوار من باشی
 اندر اردو کہ آن زبان منت

عارف نے صرف پچیس پچیس برس کی عمر میں وفات پائی ^{۱۰۶۲ھ} عارف
 کے بیٹوں باقر علی خاں کا قتل اور حسین علی خاں شاداں کو مرزا غالب نے اپنے بیٹے بنا
 لیا تھا۔ ان کا ذکر غالب کے خطوں میں جا بجا آیا ہے۔

مرثیہ یا نوحہ ایسا ہے کہ اس کی مثال اردو زبان میں ملنا مشکل ہے۔

۱۔ شرح : اے عارف ! تھکے لیے لازم تھا کہ کچھ دلی اور میرا راستہ
 دیکھتے، یعنی میری موت کا انتظار کرتے تاکہ میں بھی تھکے ساتھ دوسری دنیا کو
 روانہ ہوتا، لیکن تم نے جلدی کی اور تنہا روانہ ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے
 کہ کچھ دلی اور تنہا رہو، یہاں تک کہ میں مروں اور تمہارے پاس پہنچوں۔

۲۔ لغات - ناصیب حرسا : ماتھا رگڑنے والا۔

شرح : میں تیرے درد دانے پر یعنی تیری قبر پر کچھ دن اور ماتھا رگڑوں گا
 اگر اس طرح تیرا پتھر نہیں گھسے گا تو میرا سر یقیناً ختم ہو جائیگا، یعنی دو چیزیں باہم
 رگڑا جائیگی تو ایک نہ ایک ضرور ختم ہو جائے گی۔

مرزا کا مقصود یہ ہے کہ میرے لیے اب تیری قبر سے سر ٹکرانے کے سوا کوئی
 چارہ نہیں رہا۔ اس میں یا تیری قبر ختم ہوگی اور وہ مادی حجاب دور ہو جائے گا جو
 تم میں اور مجھ میں مائل ہے۔ یا میرا سر مٹ جائے گا اور میں مرکز تیرے پاس پہنچ
 جاؤں گا۔

۳۔ شرح : ابھی کل تو تم اس دنیا میں آئے تھے یعنی کوئی زیادہ عمر تو نہیں
 ہوئی تھی اور اب جانے کی تیاری کر لی اور کہتے ہو کہ آج ہی چلا جاؤں گا۔ اچھا
 بھی اچھا نا ہی منظور ہے اور ہمیشہ نہیں رہ سکتے تو کچھ دن تو اور بٹھرو۔

اس شعر میں مکالمے کا طریقہ اختیار کر لیا اور باتیں ایسی کہیں، جو مسلمانوں اور غیر مسلموں میں معمول ہیں۔ اس سے شعر کی تاثیر بہت بڑھ گئی، کیونکہ باطل فطری اور طبعی حالت پیدا ہو جانے سے ایسی صورت نمایاں ہو گئی، گویا عارف سامنے بیٹھے ہیں وہ رخصت کا تقاضا کر رہے ہیں اور مرزا انھیں مٹھرانے کی تدبیروں میں سرگرم ہیں۔

۴۔ **شرح :** جاتے ہوئے ہمیں سناتے ہو کہ اب قیامت کو ملاقات ہوگی واہ ! گویا قیامت کا دن کوئی اور ہوگا، ہمارے لیے تو تمہارا جانا ہی قیامت ہے۔

۵۔ **شرح :** اب آسمان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اسے بوڑھے عارف تو ابھی جوان تھا۔ اگر یہ کچھ دن اور زندہ رہتا تو تیرا کیا بگڑ جاتا؟ تجھے کون سا نقصان پہنچ جاتا؟

۶۔ **لغات :** ماہِ شب چار و سہم : چودھویں رات کا چاند، یعنی پورا چاند۔
شرح : اسے عارف اتم میرے گھر کے لیے چودھویں رات کا چاند تھے اور تمہاری ہی وجہ سے اس گھر کا ذرہ ذرہ جگمگا رہا تھا، لیکن یہ بات مجھ میں نہ آئی کہ تمہارے ہاتھ ہی میرے گھر میں اندھیرا کیوں چھا گیا اور روشنی کی کوئی بھی جھلک کیوں باقی نہ رہی؟ چودھویں کا چاند ہر شب تھوڑا تھوڑا گھٹتا ہے اور بیٹنے کے آخر تک اس کی کچھ نہ کچھ روشنی قائم رہتی ہے۔ تمہاری روشنی تو رفتہ رفتہ کم نہ ہوئی ایک لمخت تاریکی چھا گئی۔

عارف کو چودھویں کے چاند سے اس لیے تشبیہ دی کہ بزرگوں میں بچوں اور عزیزوں کے لیے یہی تشبیہ معمول ہے۔ پھر اس سے مضمون پیدا کیا کہ روشنی رفتہ رفتہ کم ہوتی جاوے حتیٰ، ایک لمخت اندھیرا کیوں چھا گیا۔

۷۔ **لغات :** داد و ستد : لین دین۔

ملک الموت : موت کا فرشتہ

شرح : تم لین دین کے ایسے کھرے کیوں بن گئے کہ اُدھر موت کے فرشتے نے آکر کہا کہ تمہاری زندگی کے دن پورے ہو گئے اور تم نے جانے کی تیاری کر لی۔

کاش ایسا ہوتا کہ تم زندگی کا خاتمہ فوراً قبول نہ کر لیتے، جو لین دین میں کھرے لوگوں کا شیوہ ہے، بلکہ فرشتے کو کچھ دن اور مستعار زندگی حوالے کر دینے کے لیے تقاضا کرنے دیتے۔

مرزا نے یہاں زندگی کو عام لین دین کے طریقے پر ڈھال لیا، جیسے کسی کے ذمے قرض ہو اور قرض خواہ تقاضا کرے تو مقروض عذر معذرت کر کر کے کچھ دقت گزارے۔

۸۔ لغات - نیر: ضیاء الدین احمد خاں نیر، جو امین الدین احمد خاں دالی لوباد کے چھوٹے بھائی، بیگم غالب کے برادر حم زاد اور فارسی میں مرزا کے خلیفہ تھے۔

شرح: پہلے مصرع کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ عاقبت کو غالب سے نفرت تھی یا نیر سے ان کی لڑائی ہو گئی تھی۔ یہ معنی دوسرے مصرع کے لیے ایک مناسب حال گنجائش پیدا کی گئی ہے۔ یعنی اگر بہ فرمن محال مان بھی دیا جائے کہ مجھ سے تمہیں نفرت تھی، اس لیے تمہارا کرہل دیے یا نیر سے تمہاری لڑائی ہو گئی تھی، لہذا اس سے دُور چلے جانے کی تدبیر کر لی۔ ان انہونی باتوں کو بھی تسلیم کر لیا جائے تو کم سے کم تمہارے چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کا تو کوئی گناہ نہ تھا۔ نہ ان سے نفرت ہو سکتی تھی نہ لڑائی کا کوئی امکان تھا۔ پھر ان کا تماشہ کوئی دن اُور کیوں نہ دیکھا۔

۹۔ شرح: تم نے اس دنیا میں بڑے بھلے پتیس سال تو گزار دیے۔ ان میں خوشی کے موقعے بھی آئے اور غم کے بھی۔ اسے جراتی میں موت کا داغ دے جانے والے اسی طرح کچھ دن اور گزارا کر لینا تھا۔

۱۰۔ شرح: جو لوگ کہتے ہیں کہ اے غالب! اب تک کیوں ہی رہے ہو؟ اتنا بڑا صدر پیش آیا ۱۰۰ سے برداشت کر لیا اور مر گئے؟ یہ نادانی اور نا سمجھی کی بات ہے۔ میری قسمت ہی میں یہ لکھا ہے کہ کچھ دن اور مرنے کی تمنا کروں۔

صدمہ بیشک برداشت کر لیا، لیکن زندگی میں کوئی لطف باقی نہ رہا۔ جتنی بھی رہ گئی، صرف اس لیے رہ گئی کہ موت کی تمنا کرتے رہیں۔



فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبح و ہر
ہے داغِ عشق، زینتِ جیبِ کفنِ ہنوز
ہے تازہ مفلساں زرازدستِ رفتہ پر
ہوں گلِ فروشِ شوخی داغِ کہنِ ہنوز
مے خانہ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں
خمایازہ کھینچے ہے بُتِ بیدادِ فنِ ہنوز
ایک دوسرے کے بغیر و لڑائی کا تصور ہو نہیں سکتا۔ نیز جس طرح سورج سے
صبح کے لیے ذیبت حاصل ہے، اسی طرح اب تک میرے کفن کے گریبان
کی ذینتِ عشق کا داغ ہے۔

مطلب یہ کہ زندگی ختم ہو جانے کے بعد بھی داغِ عشق بدستور روشن و
سینہ تاب ہے۔

ظاہر ہے کہ صبح کو یہ لحاظ سفیدی کفن سے اور سورج کو بہ اعتبارِ حرارت و
داغِ عشق سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہ پہلو بہ طورِ خاص پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ صبح
کے ساتھ سورج کو جو کبھی منقطع نہ ہونے والا رابطہ ہے، وہی کفن کے ساتھ داغِ
عشق کو ہے۔

۲۔ لغات : زرازدستِ رفتہ : اٹھ سے گیا ہوا مال، کھوئی

ہوئی دولت۔

گل فروش : پھول بیچنے والا۔

داغ کہن : عشق کا پرانا داغ۔

مشرح : قاعدہ ہے کہ جو دولت مند لوگ غریب ہو جائیں اور ان کا مال ہاتھ سے نکل جائے تو وہ ہمیشہ اس کھوئی ہوئی دولت پر غور و تاویز کیا کرتے ہیں کہ ہم کسی زمانے میں ایسے تھے، ایسے تھے اور ایسے تھے، وہی کیفیت میری ہے، میں بھی اب تک عشق و محبت کے پرانے داغوں کی آب و تاب اور چمک دمک کے پھول بیچ رہا ہوں یعنی میرا ناز و فخر بھی محبت کے پرانے داغوں پر ہے۔

دیکھیے شاعر کا کمال کہ ہاتھ سے گئے ہونے والی تشبیہ پیش نظر رکھتے ہوئے داغ کہن کی گلفروشی نہ کہا، بلکہ شوخی داغ کہن کی گلفروشی کہا، یعنی محبت کے داغ پھولوں کی صورت میں نہیں بچتا بلکہ ان کی شوخی بیچ رہا ہے کیونکہ داغ تو زرد و دست رفتہ ہو گئے۔

۳۔ لغات - خمیازہ کھینچنا : انگڑائیاں لینا۔

بُت بیداد فن : وہ محبوب، جس کا عام طریقہ اور شیوہ ظلم و جبر ہو، یعنی جس نے ظلم و جبر کے فن میں کمال حاصل کر لیا ہو۔

خاک بھی نہیں : اس کے ایک معنی عام ہیں، دوسرے معنی محارے کے ہیں، دونوں یہاں ٹھیک ٹھیک چسپاں ہوتے ہیں۔

مشرح : میرے جگر کے شراب خانے میں خون کی شراب تو رہی ایک طرف، مٹی بھی موجود نہیں یا یہ سمجھ لیجیے کہ کچھ بھی نہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ میرا ظالم دستگیر محبوب انگڑائیاں لے رہا ہے اور اس پر خمار طاری ہے، کیونکہ میرے جگر کے میخانے سے خون کی شراب پینے کا وہ عادی تھا۔ اب وہاں کچھ نہیں رہا تو اس پر نشے کے آثار کی حالت طاری ہو گئی۔

صاف مطلب یہ ہے کہ میرا محبوب جس ظلم و ستم کا عادی ہے، اس کا پورا جزا تو اب مشکل ہے۔ کیونکہ مجھ میں اب اتنی ہی طاقت ہی نہیں رہی کہ ظلم و ستم کا ساتھ دے سکوں۔

تاب و لواں ختم ہو گئی، لیکن اس کی بے پرواہی کے بخوش میں اب تک کوئی فرق
نہیں آیا۔



حریف مطلب مشکل نہیں فنون نیاز
و عاقبول ہو یا رب کہ عمر خضر دراز!
نہ ہو بہ ہرزہ، بسا ہاں نور و وہم وجود
ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز
وصال جلوہ تماشا ہے، پروا غ کہاں
کہ دیجے آئینہ انتظار کو پرواز
ہر ایک قدہ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی د خاک ہوے پر ہو اے جلوہ ناز
نہ پوچھو وسعت کے خانہ جنوں، غالب
جہاں یہ کاسہ گردوں ہے ایک خاک انداز

۱۔ لغات۔ حریف :
حل کرنے والا، مدد دینے والا،
معاون، رفیق۔
مطلب مشکل : کوئی مشکل
کام جو آڑے۔
فنون نیاز : عجز و نیاز
کا منتر۔
عمر خضر دراز : خضر کی عمر
لمبی ہو۔ یہ محاورہ ایسے موقع
پر ہوتے ہیں، جب کوئی چیز
پہلے ہی سے موجود ہو۔
شرح : خواجہ عاتق
فرماتے ہیں :
”جو تک خیال وسیع تھا اللہ
مصنوع مطلع میں بندھنے کا مقصد

تھا اس لیے پہلا مصرع اردو روزمرہ سے کسی قدر بعید ہو گیا ہے
مگر بالکل ایک نئی شونہی ہے، جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہو گی۔ کہتا ہے
کہ کسی مشکل مقصد کے حاصل ہونے میں تو عجز و نیاز کا منتر کچھ کام
نہیں دیتا، لہذا اب یہی دعا مانگیں گے کہ الٰہی! خضر کی عمر دراز ہو!

یعنی ایسی چیز طلب کریں گے۔ جو پہلے ہی دی جا چکی ہو۔

خضر سے ظاہر ہے کہ شاعر کے نزدیک عجز و نیاز کے سوا مفید حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں، لہذا وہ کہتا ہے کہ عجز و نیاز کا جادو تو کسی مشکل کام کے پورے ہونے میں معاون نہیں بن سکتا۔ اس سے تو کوئی الجھا ہوا کام سلجھ نہیں سکتا اور کوئی پیچیدہ عقدہ حل نہیں ہو سکتا اور ہمارے پاس عجز و نیاز کے سوا کوئی تدبیر ہی نہیں لہذا ہمارا گاہ باری تعالیٰ میں التجا کرتے ہیں (اور التجا بذاتِ خود عجز و نیاز کی ایک شکل ہے) کہ خضر کی عمر لمبی ہو اور یہ التجا پہلے ہی سے پوری ہو چکی ہے۔

۲۔ لغات۔ بہ ہرزہ : بیہودہ طریق پر، فضول۔

بیابان نورد : صحرا و بیابان میں پھرنے والا۔

تشریح : تجھ وجود کے سلسلے میں وہم و گمان کی خاک نہ چھانی چاہیے اس سے کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔ اگر تو ایسا کرنا چاہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تیرے تصور میں ابھی تک اونچ نیچ باقی ہے۔

وجود کے سلسلے میں اوہام کا شکار ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ اول یہ کہ خود وجود کے مراتب مستحکم نہ جائیں، یعنی اس کا سب سے اونچا مرتبہ و جوب کا ہے اور سب سے پچھلا امکان کا۔ یہی اونچ نیچ ہے اور ظاہر ہے کہ جس راستے میں اونچ نیچ ہوا وہ مسافر کے لیے پریشانی اور مصیبت کا باعث ہوتا ہے۔

وہر و چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

دوسری صورت یہ ہے کہ خود وجود حقیقی کے سوا کسی دوسرے وجود کو تسلیم کیا جائے۔ وحدت الوجود کا عقیدہ رکھنے والوں کے نزدیک یہ بھی وہم و گمان ہی کے بیابان کی خاک چھانا ہے۔ اسے بھی اونچ نیچ کے تصور کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ انسان کی طبیعت افراط و تفریط سے پاک ہو کر اعتدال و توازن پر آجائے تو اس قسم کے اوہام کا خاتمہ ہو جائیں گے۔ صرف ایک ہی وجود باقی رہ جائے گا، جو وجود حقیقی ہے، باقی سب مٹ جائیں گے، جن کی اپنی کوئی حیثیت نہیں اور صرف وہم کی تخلیق ہیں۔

اسی طرح نشیب و فراز ختم ہو گا اور یہی نظری اعتدال و توازن کی روشنی دلیل ہے۔
۳۔ لغات - جلوہ تماشا : حسن کا تماشا دکھانے والا۔ وہ حسن جو دیکھے جانے کے قابل ہے۔

پرواز : جلا، صیقل، آرائش۔

شرح : یقیناً محبوب کا دھال حسن کے جلوے دکھانے والا ہے، یعنی دھال ہیں ہمیں حسن سے بہرہ ور ہونے کا پورا موقع ملے گا۔ یہ درست سمی، لیکن ہماری طبیعت کب برداشت کر سکتی ہے کہ انتظار کے آئینے کو صیقل کرتے اور چلا دیتے ہیں مطلب یہ کہ دھال کتنی ہی عجوبوں کا مرکز ہو، مگر ہم میں اتنی ہمت نہیں کہ مدد و رہی مدت تک انتظار کرتے رہیں۔

۴۔ لغات - آفتاب پرست : سورج کو پوجنے والا۔

شرح : عاشق کی خاک کا ذرہ ذرہ بدستور سورج کو پوج رہا ہے، دیکھیے خاک ہونے اور مر جانے پر بھی جلوہ ناز کا شوق ذاتی نہ ہوا۔

ذرتے کے آفتاب پرست ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بہر ذرہ وجود حقیقی پر مغنوں ہے۔ اسی سے چمک دیک حاصل کرتا ہے اور اسی میں مل جانے کا آرزو مند ہے۔

۵۔ لغات - کاسۂ گروں : آسمان کا کاسہ۔

خاک انداز : وہ نظرت میں میں فرض کی صفائی کے بعد کوڑا کرکٹ ڈال کر باہر پھینکتے ہیں۔

شرح : اے غائب! جنوں کے شراب خانے کی وسعت و کشادگی کا حال کچھ نہ پوچھ۔ بس اتنا سمجھ لے کہ یہ آسمان جو ایک ساغرِ ناظرت ہے، اس میںانے میں صرف اتنی حیثیت رکھتا ہے کہ اس میں کوڑا کرکٹ ڈال کر باہر پھینک دیتے ہیں۔

مولانا ہالہائی درست فرماتے ہیں کہ آسمان کو مٹی یا کوڑا کرکٹ ڈال کر باہر پھینکے کا آرتانے سے مقصود یہ ہے کہ وہ نہایت حقیر چیز ہے۔

”کاسۂ گروں اس اعتبار سے کہ کوڑا کرکٹ کو محیط ہے، خاک انداز کی

طرح خاک سے بھرا ہوا ہے۔ عرض میخانہ جنوں میں کاسے گردوں کی اتنی بھی وقعت نہیں کہ کاسہ ہائے شراب میں اس کا شمار ہو، بلکہ خاک انداز ہے۔ ایک کا لفظ اردو میں تنکیر کے لیے ہوتا ہے، یہاں تنکیر سے تحقیر مقصود ہے کہ تنکیر کے ایک معنی یہ بھی ہیں۔

اب غور فرمائیے، جس میخانہ جنوں میں آسمان کو خاک اندازہ کی حیثیت حاصل ہے، اس کی وسعت کا اندازہ کون کر سکتا ہے اور آسمان کو اس اعتبار سے بھی خاک اندازہ کہنا بہت سوزوں ہے کہ زمین جو سراپا خاک ہے ہٹا ہر اسی طرف میں پڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

⑤

۱۔ لغات : وسعت
معنی کرم : سخاوت و بخشش
کے ایک سرے سے دوسرے
سرے تک۔

۲۔ وسعت سچی کرم دیکھ، کہ سرتا سر خاک
گزرے ہے آبلہ پا، ابرو گہر بار ہمنوز
ایک قلم کا نذیر آتش زدہ ہے صفحہ دشت
نقش پا میں ہے تپ گرمی رفتار ہمنوز

آبلہ پا : جس کے پاؤں میں مچالے ہوں۔ یہ حمداً زیادہ چلنے سے پیدا ہوتے ہیں
ابر گہر بار : موتی برسانے والا بادل۔
شرح : قدرت کے طعن و نوازش کی وسعت دیکھ کہ رونے زمین کے ایک
سرے سے دوسرے سرے تک بادل اب تک موتی برسا رہا ہے، اگرچہ مسلسل چلتے
چلتے اس کے پاؤں میں مچالے پڑ گئے ہیں۔

مطلب یہ کہ خدائے کریم کی بخشش و نوازش کی کوئی حد نہیں۔ وہی اپنی رحمت
سے بادل اٹھاتا ہے اور زمین کو بارش سے کیسے سبزہ زار بنا دیتا ہے۔
پانی کے قطرہوں کو پہلے موتیوں سے تشبیہ دی یعنی جو قطرے برستے ہیں، ان کی حیثیت

موتیوں کی ہے، کیونکہ جہاں جہاں برستے جلتے ہیں، زمین کا دامن دولت کے موتیوں سے بھرتے جاتے ہیں۔ پھر سسی کو شمش اور تلک و دو کے پیش نظر انھیں قطروں کو پاؤں کے چھالوں سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی اگرچہ زمین تر کرنے کی کوشش میں بادل کو تلک و دو کرنی پڑتی ہے، جس سے اس کے پاؤں میں مچالے پڑ گئے ہیں تاہم باری تعالیٰ کی رحمت کا فیض بدستور بہر حال ہر خطے کے لیے جاری ہے۔

۲۔ **شرح :** دشت دیباہوں کا پورا صفحہ یکسر اس کاغذ کی شکل اختیار کیے ہوئے ہے، جسے آگ لگ گئی ہو۔ کاغذ آتش زدہ کی کیفیت تفصیل کے ساتھ پہلے پیش کی جا چکی ہے اور آگ لگنے سے جو منظر پیدا ہوتا ہے، وہ بھی بیان کیا جا چکا ہے۔ اسے پیش نظر رکھیے اور خود فرمائیے کہ پاؤں کے نقش میں اب تک تیز رفتاری کی حرارت باقی ہے۔

مطلب کہ انتہائی تیز رفتاری سے یہ دیباہوں میں پھر نکلا۔ تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ جہاں جہاں پاؤں کے نقش پڑے، ان میں اب تک اتنی حرارت باقی ہے کہ ان سے چنگاریاں ابھر رہی ہیں۔ گویا پورا دیباہ آتش زدہ کاغذ کی طرح شعلہ زار بن گیا ہے۔ ظلم، کاغذ اور صفحہ کی مناسبت محتاج تشریح نہیں۔ اسی طرح گرمی رفتار میں حرارت نقش پا کے اندر محفوظ ہونے کے باعث پورے دشت کو کاغذ آتش زدہ سے تشبیہ دینا انتہائی کمال ہے اور ایسی تشبیہات بڑے بڑے شعرا کے دیباہوں میں بھی نہیں ملتی۔

○
کیوں کر اس بُت سے رکھوں جان عزیز کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز؟

دل سے نکلا، چہ نہ نکلا دل سے ہے ترے تیر کا پیکان، عزیز

تاب لائے ہی بنے گی غالب ! واقعہ سخت ہے اور بان عزیز

۱۔ **شرح :** خواجہ مائی فرماتے ہیں :

”اس کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ اگر اس سے جان عزیز رکھوں گا تو

وہ ایمان لے لے گا اس لیے جان کو عزیز نہیں رکھتا اور دوسرے
لطیف معنی یہ ہیں کہ اس بہت پر جان قربان کرنا تو عین ایمان ہے، پھر
اس سے جان کیونکر عزیز رکھی جاسکتی ہے؟

گویا یہ شعر غالب کے ان اشعار میں سے ہے، جنہیں خواجہ حالی پہلو دار کہتے ہیں
کہ بادی النظر میں کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں، مگر عند کرنے کے بعد ایک دوسرے معنی
ہنا بیت لطیف پیدا ہوتے ہیں، جن سے وہ لوگ لطف نہیں اٹھا سکتے، جو ظاہری
معنی پر قناعت کر لیتے ہیں۔

۲۔ شرح : یہ ٹھیک ہے کہ تیرے تیر کا پیکان دل سے نکل گیا، مگر اس کی
لذت اب تک دل میں بدستور باقی ہے، اسی لیے دل اس کی یاد سے معمور ہے۔ اس
کا مطلب یہ ہے، تیرا پیکان اس قدر عزیز ہے کہ دل سے نکل جانے کے باوجود
وہ نہیں نکلا۔

۳۔ شرح : اے غالب! جو حادثہ پیش آگیا ہے، وہ بہت سخت ہے۔ اتنا
سخت ہے کہ جی چاہتا ہے، مرجائیں، مگر جان بھی عزیز ہے، اس لیے صبر کرنا، اسی
بڑے گا اور حادثے کو برداشت کیے بغیر چارہ نہیں۔

○
نے گلِ نغمہ ہوں، نہ پرودہ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرائشِ خیم کا گل میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز
لاب تمکین، فریب ساوہ ولی ہم میں اور راز ہائے سینہ گداز
ہوں گرفتِ الفبتِ صیاد ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز
وہ بھی دن ہو کہ اُس ستم گر سے تازہ کھینچوں بھائے حسرتِ ناز
نہیں دل میں مرے وہ قطرہٴ خوں جس سے مڑگاں ہوئی نہ ہو گلِ باز

اے ترا غمزہ، یک قلم انگیزا : اے ترا ظلم، سرسبز انداز
 تو ہوا جلوہ گر، مبارک ہو ! ریزشِ سجدۂ حبیبِ نیاز
 مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا : میں غریب اور تو غریب نواز
 استادِ خداں تمام ہوا : اے دروغا ! وہ رندِ شاہد باز
 ۱۔ شرح : میں نہ تو نغمے کا پھول ہوں، نہ ساز کا پردہ، صرف اپنی شکست
 کی آواز ہوں۔

نغمے کے پھول وہاں برستے ہیں، جہاں عیش و راحت کی مجلسیں گرم ہوں، کیونکہ
 وہیں نغمے گائے جلتے ہیں، وہیں ساز کے پردوں سے دلاویز ترانے نکلتے ہیں۔ میں
 سراپا درد ہوں، مصیبت کا مارا ہوا ہوں اور اپنی بربادی و ویرانی کا نوحہ زبانِ حال
 سے سناتا ہوں، جس طرح کسی شے کے ٹوٹنے وقت اس میں سے آواز نکلتی ہے۔

۲۔ شرح : اے محبوب! تو اپنی زلفوں کے پیچ و خم ستارے میں مصروف
 ہے، تجھے عاشق کی پریشانیوں اور مصیبتوں کا خیال کب آ سکتا ہے؟ میں ایسے
 تفکرات میں الجھا ہوا ہوں، جن کا سلسلہ بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔

وہ تفکرات کیا ہیں؟ شاعر نے واضح نہ کیے۔ غالباً اس لیے کہ ہر شخص اپنے
 احوال کے مطابق ان کی تعبیر کرے۔ مثلاً مولانا حسرت موہانی کی رائے میں ایک
 اندیشہ یہ ہو سکتا ہے، محبوب نے زلفوں کے پیچ و خم کی آرائش اس لیے مزور دی۔
 سمجھی کہ عاشق کو اس آرائش کے ذریعے سے دغا کے رشتے میں جکڑا رکھئے۔ گویا اسے
 بدگمانی پیدا ہو گئی کہ شاید عاشق کو مجھ سے پہلے کی سی محبت نہیں رہی۔ عاشق اس
 بدگمانی کو اپنے عشق کے لیے باعثِ خاک سمجھتا ہے۔ طبعِ لطیف کے نزدیک اس
 آرائش سے محبوب کا مطلب یہ ہے کہ دیکھیے، اب کون کون عاشق ہے، عاشق کے
 لیے ایک اندیشہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس طرح دوسروں کو بازو سنگار دکھانا مقصود

ہے۔ غرض ان دور و دراز اندیشوں کی کوئی حدود نہایت نہیں اور یہی شاعر کا کمال ہے کہ بتایا کچھ نہیں، مگر وہ سب کچھ بتا گیا، جو خیال میں آ سکتا ہے۔

۳۔ لغات - تمکین : وقار - شانِ منصب -

سینہ گداز : سینے کو گھٹلا دینے والا۔

شرح : عشق میں صبر و ضبط کی ڈیگیں مارنا سادہ لوحی کا ایک فریب ہے۔ یعنی انسان سادہ ولی سے اس قسم کے دھوکوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، لیکن عاشق کے سینے میں ایسے راز ایسے بھید ہوتے ہیں، جو سینہ گھٹا کر دکھ دیتے ہیں۔ کون ہے جو ان حالات میں صبر و ضبط کا دعویٰ کر سکے اور سادہ لوحی سے اس فریب میں مبتلا ہو جائے؟

۴۔ شرح : مجھے ستیہ کی الفت نے گرفتار کر رکھا ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ میرے بازوؤں میں اُڑنے کی طاقت موجود نہیں، میں اُڑ سکتا ہوں، لیکن ستیا و کی الفت نے مجھے قید کر رکھا ہے۔

شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ دنیوی تعلقات میں الجھے رہنا صرف دنیا سے محبت کا نتیجہ ہے اور نہ انسان چاہے تو یہ تمام بندھن توڑ کر آزاد ہو سکتا ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس میں ان بندھنوں کے توڑنے کی قوت موجود نہیں۔

۵۔ شرح : الہی اکاش وہ دن بھی آہائے کہ میں اپنے سنگرم محبوب کے ناز و انداز سے بہرہ حاصل کروں، ابھی تک صرف ناز و انداز کی حسرت کا تجربہ اشتیاق بنا ہوا ہوں۔

۶۔ لغات - گلہ باز : پھوٹوں سے کھیلنے والا۔

شرح : میرے دل میں خون کا ایک بھی قطرہ ایسا نہیں، جس سے میری پلکوں نے پھوٹوں کی ہولی نہ کھیلی ہو۔ یعنی دل میں جو بھی قطرہ خون تھا وہ آنکھوں میں پینچا اور پلکوں نے پھول سمجھ کر اس سے کھیلنا شروع کر دیا۔
اشکب خرمین کو گلہ بازی سے تشبیہ دی گئی ہے۔

۷۔ لغات - انگیز : اٹھانے والا - جذبات برانگیختہ کرنے والا۔

شرح : اسے محبوب اتیرا ہر جلوہ سرا سر جذبات برانگیختہ کرنے والا ہے اور تیرا ہر ظلم میں ناز و انداز ہے۔

۸۔ لغات - ریزش : گرنا۔

شرح : تونے اپنا جلوہ دکھایا۔ اس پر نیاز مندی کی پیشانی کا سجدے میں گر جانا مبارک ہو۔

۹۔ شرح : اسے محبوب اگر تونے میرا حال پوچھ دیا تو کچھ بُرا نہ ہوا۔ میں غریب ہوں اور تو غریبوں پر لطف و نوازش کرنے والا ہے۔

۱۰۔ شرح : اسداشداں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کی زندگی خاتمے پر پہنچ گئی۔ آہ ! انوس اور دندہ جو حیضوں سے محبت رکھتا تھا جس کا شیوہ حسن پرستی تھا۔ ایسا کون ہے جو اس کی جگہ لے سکے ؟

اسد کی جگہ پورا نام استعمال کیا۔ شاید کہا جائے ہے تکلف شعریاں آسکتا تھا۔ حقیقت یہ نہیں۔ مرزا غالب کے شعروں کو اس طرح نہ دیکھنا چاہیے۔ یہاں اسداشداں میں جو خفاست، بزرگی اور بلندی مرتبہ نمایاں ہے وہ تنہا اسد میں موجود نہیں اور یہاں رخصت ہونے یا تمام ہونے والے وجود کی خفاست نمایاں کرنا مستحسن شعر کا خاص پہلو ہے۔ بالکل اسی طرح دوسری جگہ کہا گیا :

اما داندے نے اسداشداں تمیں

وہ دودے کہاں ، وہ جوانی کھر گئی



مژدہ ، اسے ذوقِ اسیری ! کہ نظر آتا ہے ۱۔ شرح : اس شرکے

دوسرے مصرع میں شکاریوں

کی ایک رسم کا ذکر ہے ، جو

دام خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

تھوڑی سی تفصیل کا محتاج ہے۔ عام طریقہ یہ ہے کہ شکار کے لیے ہاتھ وقت جس جانور کا شکار منظور ہو، اس کے ایک یا ایک سے زیادہ بھینسوں کو پنجروں میں ڈال کر ساتھ لے جاتے ہیں جال بچھا کر قریب ہی جانور کے پنجرے رکھ دیتے ہیں۔ وہ بون شروع کرتے ہیں تو فصل یا جنگل سے دوسرے پرندے آواز سن کر آ جاتے ہیں اور اس طرح جال میں پھنس جاتے ہیں۔ دوسرے جانوروں کے شکار کے علاوہ بیٹروں کے شکار کے لیے اب تک بھی طریقہ رائج ہے چالو بیٹروں کو سدھایا جاتا ہے۔ جب ان کے پنجرے ایک نصب کردہ بانس میں ٹکادے جاتے ہیں تو وہ بونا شروع کر دیتے ہیں۔ جہاں جہاں تک ان کی آواز جاتی ہے، بیٹرین اڑ اڑ کر آتی ہیں اور جال میں پھنس جاتی ہیں۔

جگر تشنہ آزار، تسلی نہ ہوا
جوئے خوں ہم نے بہائی بھیر خمار کے پاس
مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں نہ ہے
خوب وقت آئے تم اس عاشق بھیار کے پاس
میں بھی رک رک کے نہ مرتا، جو زباں کے بلے
دشناک تیز سا ہوتا، میرے غمخوار کے پاس
دہن شیر میں جا بیٹھے، لیکن اسے دل!
نہ کھڑے ہو جیسے خوبانِ دل آزار کے پاس
دیکھ کر تجھ کو، چمن بسکہ منو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گل، گوشت و ستار کے پاس
مر گیا پھوڑ کے سر غالب وحشی ہے، ہے!
بیٹھنا اُس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس
ہے۔ جب ان کے پنجرے ایک نصب کردہ بانس میں ٹکادے جاتے ہیں تو وہ بونا شروع کر دیتے ہیں۔ جہاں جہاں تک ان کی آواز جاتی ہے، بیٹرین اڑ اڑ کر آتی ہیں اور جال میں پھنس جاتی ہیں۔

شرح : اسے اسمیری کے ذوق! تجھے خوشخبری ہو، کیونکہ تیرے سامنے یہ منظر رونما ہے۔ جال بچھا ہوا ہے، گر خالی ہے، اس میں کوئی پرندہ ابھی تک نہیں

پھنسا۔ پاس ہی پہلے سے پکڑے ہوئے پرندے کا پنجرہ پڑا ہے۔ وہ سب کو قید و بند کی دعوت دے رہا ہے۔ گویا تیرے لیے تسکین کا پورا سامان موجود ہے تو بھی قنّا پوری کر لے۔

اگر دام خالی نہ ہوتا تو ذوق امیری کی تسکین کا معاملہ مشتبہ رہ جاتا، کیونکہ ممکن ہے پہلے اتنے پرندے پیش کیے جوتے کہ کسی نئے مشتاق امیری کے لیے گنجائش ہی نہ رہتی، اس لیے دام کے خالی ہونے کا پہلو ہلور خاص پیش نظر لایا گیا۔

۲۔ لغات - جگر قشہ آزار : وہ جگر جو دکھ سنے اور اذیت برداشت کرنے کا پیاسا ہو۔

بُج ہر خار : ہر خار دار جھاڑی کی جڑ۔

شرح : ہمارا جگر ایذا اور تکلیف کا اتنا پیاسا تھا کہ کانٹوں والی ہر جھاڑی کی جڑ میں خون کی ندی بہا دی، لیکن جگر کی تسلی نہ ہوئی۔ اس کے ذوق ایذا کی تسکین کا سامان ہم نہ پہنچ سکا۔

خود فرمایئے کہ جس جگر کے ذوق ایذا کی تسکین کے لیے کانٹوں والی ایک ایک جھاڑی کی جڑ میں لہو کی ندی بہا دی گئی، پھر بھی اس کی تسلی نہ ہوئی، اس کا ذوق کس پیاسے پر پہنچا ہوا ہو گا؟

شاعر کا مدعا یہ نہیں کہ جہاں کانٹوں والی کوئی جھاڑی دیکھی، وہاں خون بہانا شروع کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ کانٹوں والی ہر جھاڑی میں الجھ الجھ کر کانٹے جسم میں چھو لیے اور زخموں سے اتنا خون بہایا کہ ندی جاری ہو گئی۔

۳۔ شرح : شعر کے پہلے مصرع کی شرح پیشتر بھی ہو چکی ہے، یعنی صنعت اتنا ہو چکا تھا کہ نظارۂ محبوب کے لیے آنکھیں کھولنے کی جتنی بھی کوشش کی گئی، کامیاب نہ ہوئی اور آنکھیں بند ہو گئیں، جان جسم سے مفارقت کر گئی دیکھیے محبوب اپنے بیاد عاشق کے پاس کیسے وقت میں آیا، اس نے اتنا کرم فرمایا

لیکن ایسے وقت پر جب اس کے کرم سے عاشق کوئی فائدہ نہ اٹھا سکتا تھا۔

۴۔ **شرح :** غم کھانے والے دوست نے عین آخری وقت میں لعنت ملاست شروع کر دی، طے دے، ساتھ ساتھ نصیحت بھی کی کہ تمہیں اپنے آپ کو عشق میں اس طرح برباد نہ کرنا چاہیے تھا اور میری جان رک رک کر نکلتی رہی آہ! کاش غمخوار کے پاس زبان کی تیزی کے بجائے ایک تیز خنجر ہوتا، جو اترتا اور پسِ رگ رگ کر مرنے کے بجائے فوراً ختم ہو جاتا۔

غالب کا مقصد یہ ظاہر کرتا ہے، غمخوار کی نصیحتیں یا ملاستیں اس قدر دل آزار ہوتی ہیں کہ کسی کا تیز خنجر مار کر ختم کر دینا بھی اس سے بدتر جہاں نظر آتا ہے۔

۵۔ **شرح :** اے دل! اُن حسینوں کے پاس نہ بیٹھنا چاہیے، جو ہر وقت عاشقوں کو تانے کے دوپے ربتے ہیں۔ اس سے کہیں بہتر ہے کہ انسان شیر کے منہ میں جا بیٹھے۔

مطلب یہ ہے کہ شیر کے منہ میں جا بیٹھنے سے فوری موت واقع ہوگی اور حسینوں سے دل لگانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ آہستہ آہستہ دکھ پہنچا پہنچا کر موت کے گھاٹ اتاریں گے۔

۶۔ **لغات :** نو کرنا : بڑھانا، بالیدہ ہونا۔

شرح : اے محبوب! تجھے دیکھ کر چمن میں اس قدر بالیدگی پیدا ہوئی ہے، ہر چیز اس طرح بڑھنے لگتی ہے، کہ پھول خود بخود دھڑک دھڑک کر گلے کے پاس پہنچ جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ گوشہ دستار پھولوں کے پودوں سے بہت اونچا ہوتا ہے۔ جب تک چمن میں غیر معمولی بالیدگی اور نمو پیدا نہ ہو، پھول گوشہ دستار تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔

۷۔ **شرح :** دیوانہ غالب سر پھوڑ کر مر گیا ہے ہے بڑا انسان ہے ! وہ ہر روز آکر تیری دیوار کے پاس بیٹھا کرتا تھا۔ اُس کا وہ بیٹھنا اب یاد آ رہا ہے۔ مولانا طہطاہانی نے بالکل بھانپ لیا ہے کہ شعر میں خبر سے زیادہ انشااط

پیدا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشاق شاعر خبر کو بھی انشا بتا دیتا ہے۔ مثلاً اگر کہا جاتا کہ وہ تیری دیوار کے پاس آکر بیٹھتا تھا۔ تو یہ خبر ہوتی، لیکن موجودہ صورت میں جملہ انشائیہ بن گیا۔ پھر لفظ ”وہ“ سے اشارہ اس طرف ہے کہ جس محبوب سے خطاب ہے، وہ اس واقعے سے بے خبر ہے اور ”وہ“ کو ”کرا“ سے غالب دیوانہ کا شیوہ یاد دلایا گیا ہے۔ لفظ ”آکر“ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس دیوانے کا دستور یہ تھا۔ جب جن اوقات میں اسے جمالِ محبوب دیکھنے یا آوازِ محبوب سننے کی امید ہوتی تھی، اس لی دیوار کے پاس آ بیٹھتا تھا۔ اگر ”آکر“ اس مصرع میں نہ ہوتا تو فقط اس کے بیٹھے رہنے کا واقعہ ضرور تازہ ہو جاتا، مگر غالب دیوانہ کا آکر بیٹھتا پیش نظر نہ آتا اور شعر کا حسن کم ہو جاتا، کیونکہ آکر بیٹھنا ایک حرکت اور ایک اداسی، محض بیٹھے رہنا سکون و طمانیت ہے اور وہ دونوں کا فرق ظاہر ہے۔



نہ یوے گر خس جو سہرا طراوت سبزہ خط سے
لگا دے غائے آئینہ میں روے نگار آتش
فروغِ حسن سے ہوتی ہے جلِ مشکلِ عاشق
نہ نکلے شمع کے پاسے، نکالے گردِ غار آتش
تنگے جلد آگ کپڑے میتے اور جل اٹھتے ہیں۔
روے نگار : محبوب کا چہرہ۔

شرح : محبوب آئینہ دیکھ رہا ہے۔ شاعر کو معاً خیال آیا کہ ایسے آتشیں رخسارِ محبوب کا عکس تو جوہرِ آئینہ کے تنکوں کو آگ لگا سکتا ہے اور غائے آئینہ آگ کی نذر ہو سکتا ہے۔ پھر خیال آیا، جوہر کے تنکے اس لیے آگ

نہیں پکڑتے کہ محبوب کے سبزہٴ خط سے ان تنگوں کو عراوت پہنچ رہی ہے اور جوئے
نم آلود ہو جاتے، وہ آگ نہیں پکڑتی۔

پودے شمرے معقود صرف یہ ہے کہ محبوب کے مہال کا نقشہ پیش کیا جائے۔
وجود سروں کے نزدیک ممکن ہے، مہانے پر مبنی ہو، مگر عاشق کے نزدیک احساسات
کا زیادہ سے زیادہ صحیح مرتب ہونا ہے۔

۲۔ شرح : حسن کی جلوہ آرائی ہی سے عاشق کی ہر مشکل دور ہوتی ہے
اور اس سے عمدہ برآ ہونے کا راستہ نکل آتا ہے۔ اس کی مثال دیتے ہوئے فرماتے
ہیں کہ شمع کے اندر جو دھالکا ہوتا ہے، وہ کانٹے کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن ٹکا ہر
ہے کہ وہ کانٹا آگ ہی نکالتی ہے۔ یعنی شمع روشن ہو تو دھالکا جلتا رہتا ہے۔ موم
پگھل پگھل کر ختم ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ شمع ختم ہو جاتی ہے اور دھالکا بھی
باقی نہیں رہتا۔ اس حالت کی تعبیر یوں کی گئی کہ شمع کے پاؤں سے کانٹا نکل گیا۔
مقامیہ کہ جس طرح آگ شمع کے پاؤں سے کانٹا نکالتی ہے، اسی طرح حسن
کی جلوہ آرائی عاشق کی مشکلیں حل کر دیتی ہے۔



۱۔ لغات : خور : جادۂ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شاعر

خورشید - سورج -
دا کرنا : کھول۔
پہر خ واکرنا ہے ماؤ نو سے آغوش و دل

وداع : رخصت۔

شرح : اس شعر میں سورج کے غروب اور ہواں کے نکلنے کا منظر پیش

کیا گیا ہے۔ شام کا وقت ہے۔ کرن کا تار سورج کے لیے سفر کا راستہ بن گیا
ہے۔ افق پر نیا چاند طلوع ہو گیا ہے۔ چونکہ اس میں صبح کا وقت ہے، اس لیے
اسے آغوش سے تشبیہ دی گئی ہے اور فرمایا گیا کہ یہ نیا چاند نہیں، بلکہ آسمان نے
سورج کو رخصت کرنے کے لیے آغوش کھول دی ہے۔

عام دستور ہے کہ رخصت کے وقت در فبق نفل گیر ہوتے ہیں گویا نفل کھول کر
لٹے ہیں۔ اسی طرح سورج کو رخصت کرنے کے لیے آسمان نے ماو نو سے نفل کھول دی۔

○

سرخ نگارے ہے سوزِ حب و ادائی شمع
ہوئی ہے آتشِ گل، آپ زندگانی شمع
زبانِ اہل زباں میں ہے مرگِ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانی شمع
کرسے صرف بہ ایامے شعلہ، قصہ تمام
بطرزاہلِ فنا ہے فناءِ خوانی شمع
غم اس کو حسرت پر دانہ کا ہے لے سعد
ترے رزنے سے ظاہر ہے ناتوانی شمع
ترے خیال سے روحِ استہزا کرتی ہے
بہ جلوہ ریزیِ باد و بہ پر فانی شمع
نشاطِ داغِ غمِ عشق کی یہاں نہ پوچھ
خفگی ہے شہیدِ گلِ خزانِ شمع
جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو
نہ کیوں ہو دل چمرے داغِ بدگمانی شمع

۱۔ لغات۔ آتشِ گل؛

لغوی معنی پھول کی آگ، یہاں
اشعار ہے محبوب کی سرخیِ رخسار
کی طرف، جو آگ سے مشابہ ہے۔
شرح : شمع میں جو متعل
سوز اور علین موجود ہے، وہ محبوب
کے رخسار کی وجہ سے ہے۔ یہی
آتشِ گل ہے، جو شمع کے لیے
آپ حیات بن گئی ہے، یعنی محبوب
کے رخسار ہی کی بدولت شمع میں
روشنی ہے۔

شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہے
کہ محبوب کے حسن پر حسد کے باعث
شمع میں جلن پیدا ہو گئی گویا اس
کے جلنے کی وجہ رخسارِ محبوب کا حسد
ہے۔ دوسرے مصرع کا مطلب
اس صورت میں بھی وہی رہے گا
جو بیان ہو چکا ہے، یعنی یہی رخسار
جسے بہ اعتبارِ غائمت و تلاویزی
پھول اور ٹوٹا ہونے کے باعث

آگ سمجھنا چاہیے، شمع کے لیے آب حیات بن گیا۔

۲۔ **شرح :** اہل زبان کے مادیوں میں موت چمپ ہو جانے کا نام ہے یہ حقیقت مجلس میں شمع کی زبانی روشن و آشکارا ہوئی۔

شعر میں نکتہ صرف اتنا ہے کہ شمع کے بجھنے کو خاموش ہو جانا بھی کہتے ہیں۔ جس طرح موت چمپ ہو جانا ہے، اسی طرح شمع کا بجھنا اس کے لیے موت ہے، لیکن وہ روشن ہو تو اسے زندہ مانا جاتا ہے۔ محفل اس کی روشنی سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہ حقیقت بھی شمع نے بزم میں روشنی سے آشکار کر دی۔ اگر وہ روشن نہ ہوتی تو دھبہ جاتی تو بزم میں اسے بارہی نہ ملتا۔

مرگ، خاموشی، بزم، روشن، شمع کی مناسبت محتاج بیان نہیں۔

۳۔ **لغات :** ابرا : اشارہ۔

شرح : دیکھیے شمع صرف شعلے کا اشارہ پاتے ہی اپنا قصہ تمام کر دیتی ہے، یعنی جل جلتی ہے، مگر یا شمع کی انسانہ خوانی میں بھی اہل فنا کا طریقہ نایاں ہے۔ جس طرح بہت دور لوگ حقیقی کی نوک کا کرنائی لذات ہو جاتے ہیں، اسی طرح شمع شعلے کا اشارہ پاتے ہی سر سے پاؤں تک پگھل کر ختم ہو جاتی ہے۔

قصہ اودھنا نہ خوانی کی مناسبت ظاہر ہے۔

۴۔ **شرح :** آپ نے اکثر دیکھا ہو گا کہ موم جتنی جلاتی جائے تو اس کی نو لہزاں ہوتی ہے۔ اسے شعلے کا لہزا قرار دیا۔ کہتے ہیں کہ اسے شعلہ ایتیرے لہزے سے ظاہر ہے کہ شمع بے حد کمزور ناتواں ہو گئی ہے۔ پھر خود ہی وجہ بیان کرتے ہیں کہ اسے پروانے کی حسرت کا غم کھا گیا، وہی غم اس کی ناتوانی کا سبب بنا۔

۵۔ **لغات :** استہزاز : لغوی معنی جنبش، حرکت۔ چونکہ سرور و نشاط میں بھی جسم کے اندر ایک خاص چستی اور حرکت پیدا ہوتی ہے اس لیے یہ لفظ سرور و نشاط کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔

جلوہ ریز بی باو : ہوا کا جلوہ دکھانا یعنی چلنا۔

پرفشانی شمع : شمع کا پڑھنا یعنی جھلانا۔

شرح : اسے محبوب : تیرے خیال سے روح میں اسی طرح جنبش و حرکت پیدا ہوتی ہے جس طرح ہوا کے چلنے سے شمع جھلکانے لگتی ہے۔

دوسرے مصرع میں ہوا کے چلنے اور شمع کے جھلکانے کو تشبیہ انداز میں کیا۔ یعنی دونوں کے ساتھ فارسی کا یہ تشبیہ لگایا۔ مطلب یہ ہوا کہ یقیناً تیرے خیال سے روح رقص کرنے لگتی ہے اور اس کے لیے ہم ہوا کے چلنے اور شمع کے جھلکانے کی قسم کھاتے ہیں۔ مطلب یہ ہر حال وہی ہے جو پہلے بیان ہو چکا۔

۶۔ لغات۔ گل خزانہ : وہ بھول جس پر خزاں نے اثر کیا ہو۔

شرح : غم عشق کے داغ سے ہمیں جو سرور و نشاط حاصل ہے، اس کی بہار کے بارے میں کچھ نہ پوچھ۔ یہ سمجھ لے کہ شمع کے خزاں دیدہ یعنی مسرور و پڑ مسرور بھول پر شگفتگی قربان ہو رہی ہے۔ شمع کا خزاں دیدہ بھول وہ گل ہوتا ہے جو اس کے چلنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اسے داغ غم عشق سے تشبیہ دی گئی۔ بہار نشاط کے لیے شگفتگی دے۔

۷۔ لغات۔ بالین : سرانا۔

شرح : شمع مجھے محبوب کے سر ہانے دیکھ کر حسد سے جل رہی ہے، یعنی وہ مجھے اپنا رقیب سمجھ رہی ہے۔ اس کی ہلکانی کا داغ میرے دل سے مٹ نہیں سکتا۔

بیم رقیب سے نہیں کرتے دواغ ہوش
ا۔ شرح : ہمارا ہی تو یہ چاہتا
مجتہد ریاں ملک ہوئے اسے اختیار حیف !
حقاک ہوش و حواس کو رخصت کر دیں
اور دیوانے بن کر مٹیہ جائیں، لیکن
جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
رقیب کے ڈنٹے مجبور کر دیا۔ اور
لے ناما ہی نفس شعلہ بار، حیف !
ہوش و حواس کو رخصت نہ کیا۔
اسے اختیار ! تجھ پر امنوس !

ڈرے ہے کہ یا تو ہوش و حواس کو دینے سے رقیب پر راز و عشق فاش ہو جانے لایا

یہ اندیشہ ہے کہ ہم ہوش و ہراس کو بیٹے تو رقیب محبوب کے انکساف سے بے تکلف
 فائدہ اٹھائے گا۔ اختیار پر انوس کا سبب یہ ہے کہ اگر یہ نہ ہوتا تو ہم یقیناً ہوش و حواس
 کھو بیٹھے کہتے ہیں، اب ہم اس درجہ مجبور ہو گئے کہ ہوش و حواس کو بھی رخصت نہیں
 کر سکتے۔ اس لحاظ سے اختیار پر انوس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے کام نہیں لے سکتے
 ایسے اختیار اور بے اختیاری میں کوئی فرق نہ رہا۔

۲۔ شرح : ہمارا دل اس پر گڑھتا ہے کہ سانس لے کیوں ایسی آگ نہ
 برساتی جو ہمیں ایک ہی دفعہ جلا دیتی۔ آہ ! اس آگ برسانے والے سانس کی
 ناکامی اور ادھر اپن کہ وہ ہلکی ہلکی آگ برساتا ہے، جو نہ ہمیں جلا سکی اور نہ جلنے
 سے نجات دلا سکی۔

○

زخم پر چھڑکیں کہاں، طفلان بے پروا تک
 کیا مزہ ہوتا، اگر سچر میں بھی ہوتا تک
 گرد و راہ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل
 ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا تک
 مجھ کو آرزائی نہ ہے، تجھ کو مبارک ہو جو
 نالہ لمبیل کا درد اور خندہ گل کا تک
 شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج
 گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجِ دریا تک

۱۔ شرح : لڑکوں کی
 بے پروائی اور لالچالی پن سے
 کہاں امید ہو سکتی ہے کہ زخموں
 پر تک چھڑکیں گے؟ وہ تو دیوانے
 کو سچر مار مار کر ایذا پہنچے اور
 خوش ہونے کے عادی ہیں کاش
 پتھر تو ان میں بھی تک ہوتا، لڑکے
 بچے پتھر اتارے اور خوش ہوتے۔
 اس طرح ایذا کے علاوہ زخموں
 کے بے تک کا انتظام بھی ہوتا
 جاتا اور خوب مٹھتا آتا۔

۲۔ شرح : زخمِ دل
 کے لیے غم و ناز کا سامانِ محبوب

داد دیتا ہے سرے زخمِ جگر کی 'واہ' واہ!
 یاد کرتا ہے مجھے، دیکھے ہے وہ جسِ نانک
 چھوڑ کر بانا تخی مجروح عاشقِ حیف ہے
 دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا
 غیر کی مرثیہ نہ کھینچوں گا پے تو فیر درد
 زخم، مثلِ خندۂ قاتل ہے، سترتا پانک
 یاد ہیں غالب! تجھے وہ دن؟ کہ صدِ فوقِ مینا
 زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چتا تھا نانک
 دوسرے مصرع کے پہلے گٹھے سے ہے اور پہلے مصرع کے دوسرے مصرع

کے ماتھے کی گرد ہے۔ اُسی گرد
 سے زخموں کو نانک کا مزہ مل سکتا
 ہے، اسی سے وہ بھر سکتے ہیں
 دردِ دنیا میں اتنا نانک کہاں پیدا
 ہوتا ہے کہ زخمِ دل کے لیے برقعہ
 ذوقِ لذت اور اندامِ کاسان
 دیتا ہو سکے۔

۳۔ لغات۔ ارنانی ر
 نصیب رہے، ملتا رہے۔

شرح : شعر میں
 لعل و نشر مرتب ہے۔ یعنی پہلے
 مصرع کے پہلے گٹھے کا تعلق
 دوسرے مصرع کے پہلے گٹھے سے ہے اور پہلے مصرع کے دوسرے مصرع
 کے دوسرے سے۔

مطلب یہ کہ مجھے نازِ بیل کا دردِ نصیب رہے، میرے لیے یہی مناسب ہے اور
 اسی کو زندگی کا حاصل سمجھتا ہوں اور اسے محبوب؛ تجھے خندۂ گل کا نانک مبارک ہو۔
 خندۂ گل سے سراپا چھوٹوں کا کہنا ہے، جسے چھوٹوں کی ہنسی قرار دیا جاتا ہے
 اور محبوبوں کی ہنسی شاعروں کے نزدیک نانک کا حکم رکھتی ہے، خصوصاً اس حالت
 میں کہ عاشق پریشانیوں اور مصائب سے لاچار ہوں، یہ ایسی ہر چھوٹوں کی ہنسی میں فرق
 نہ آئے۔ یہ کیفیت گل و بیل کے معاملے میں بالکل آشکارا ہے۔ یعنی بیل کے دل
 سے دردِ نانک صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ چھوٹے ستور کھلتے رہتے ہیں اور ان کی ہنسی
 بیل کے زخمِ دل پر نانک چھڑکتی رہتی ہے۔

۴۔ لغات : شویرِ حولاں : گھوڑا دوڑانے اور شمشواری کرنے

کا شور۔

تشریح : آج سمندر کے کنارے کس کے گھوڑا دوڑانے کا شور مچا رہا ہے۔
 کہ ساحل کی مٹی تھوچ دریا کے زخم کے لیے نمک بن گئی ہے شور سے یہاں دو معنی
 مراد لیے، اول غوغا و ہنگامہ دوم نکلیں۔ پھر سمندر کا کنارہ لائے اور اس کے
 اندر جو موجیں اٹھتی تھیں، ان میں زخم فرض کیے اور ان کے لیے ساحل کی مٹی کو
 نمک بنا دیا، جس میں حقیقت محبوب کے گھوڑا دوڑانے سے ملاحیت پیدا ہو
 گئی تھی۔

مرزا نے خود عبدالرزاق شاکر کو لکھا ہے :

"پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک معنائیں خیالی لکھا کیا
 دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان
 کو دور کیا۔ اور اسی ایک قلم چاک کیے۔ دس پندرہ شعروں کے نمونے
 کے دیوان حال میں رہنے دیے۔"

مرزا نے نہیں بتایا کہ وہ کون کون سے شعر تھے، جو نمونے کی طرح سے باقی
 رکھتے، لیکن وہ ایسے ہی ہوں گے، جیسے یہ شعر یا پوری غزل، جس کی روایت نمک
 پھر فرمائی۔

۵۔ تشریح : داد و محبوب میرے زخم جگر کی خوب داد دیتا ہے جہاں
 کہیں نمک دیکھتا ہے، میں اسے یاد آجاتا ہوں۔ اس کا ایک مطلب ہے کہ وہ
 چاہتا ہے، سارا نمک میرے زخم جگر کے لیے وقف ہو جائے۔ دوسرے معنی
 یوں پیدا ہوتے ہیں کہ یاد کرنے سے مراد بلا لینا یا جانے، یعنی محبوب کو جہاں
 نمک نظر آتا ہے، مجھے بلا لینا ہے کہ میرے زخم جگر پر چھڑک دے یا اس میں چھڑک۔
 مقصد کہ دنیا بھر کا نمک بھی میرے زخم جگر کے لیے کافی نہیں، محبوب کو
 اس حقیقت کا علم ہے اور وہ میرے زخم کی داد پوری فراخ حوصلگی سے دے
 رہا ہے۔

۶۔ لغات - تن مجروح : زخموں سے چوڑ جسم -

شرح : اے محبوب عاشق کے جسم کو جو زخموں سے چوڑ ہے ایوں چھوڑ جانا قابل المنوس ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ اور زخم لگیں۔ اعضا چاہتے ہیں کہ ان پر خوب نمک چھڑکا جائے۔ گویا عاشق کے زخم تو لگا دیے گئے، لیکن جتنے زخموں کا وہ طلب گار تھا، اُسے نہ لگائے گئے اور ان پر نمک پاشی بھی نہ ہوئی۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جسم کو تو مجروح کر دیا، لیکن دل پر کوئی چرکا نہ لگا، حالانکہ وہ بھی زخموں کا طلب گار ہے اور اعضاء کو نمک بھی نصیب نہ ہوا۔
غرض عاشق کی لذت ایذا کے لیے قسین کا کوئی سامان نہ ہوا۔

۷۔ مرثیت کھینچنا : احسان اٹھانا۔

توفیر : دائر کرنا، زیادہ کرنا۔

شرح : میں اپنا درد بڑھانے اور زیادہ کرنے کے لیے غیر کا احسان نہ اٹھاؤں گا۔ میرا زخم خود غنہ قاتل یعنی محبوب کی ہنسی کی طرح سرا سر نمک ہی ہے۔ اس لیے خود بخود میرے درد میں اضافہ ہو رہا ہے، پھر غیر کا احسان کیوں اٹھاؤں ؟

۸۔ لغات - وجہ ذوق : لطف کی سرسستی اور لذت کی بخودی۔

شرح : اس شعر میں ایک پرانا خیال شاعر نے پیش نظر رکھا، جو عموماً عورتوں میں رائج تھا۔ یعنی نمک کے سلسلے میں استیاذ کی غرض سے کہا کرتی تھیں کہ دیکھنا، نمک گرنے نہ پائے، اور نہ قیامت کے دن پلوں سے ٹپنا پڑے گا۔

یہ خیال غالباً یوں پیدا ہوا کہ زمانہ قدیم میں اُن حصّوں کے اندر نمک کیاب تھا، جو ساحل بحر یا نمک کی کانوں سے دور تھے۔ اس لیے نمک کی حفاظت زیادہ سے زیادہ ضروری تھی۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ اے غالب ! تجھے وہ دن بھی یاد ہیں، جب لطف

کی سرمستی اور لذت کی بخودی میں میری حالت یہ تھی کہ اگر تک زخم سے گر جاتا تھا تو میں اسے پلوں سے چٹتا تھا۔

بعض اصحاب نے لکھا ہے کہ یا تو ”تجے“ کی جگہ ”مجھے“ ہونا چاہیے۔ ”میں“ کی جگہ ”تو“ لیکن اس تغیر کی کوئی ضرورت نہیں۔ دو آدمی ایک کیفیت دیکھ چکے ہوں تو ایک دوسرے کو مخاطب کر کے وہ کیفیت یاد دلا سکتا ہے۔ شاعر نے غائب کو اپنا رفیق اور ساتھی قرار دے کر یہ سب کچھ کہہ دیا کہ تو تو اس کیفیت سے واقف ہے، میں ایک زمانے میں زخموں سے گرتا ہوا تک پلوں سے چٹتا تھا۔



آہ کو چاہیے اک عمر، اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر جو چمک
دام ہر موج میں ہے، علقہ صد کام رنگ
دیکھیں، کیا گزرے ہے قطرے پہ، مگر جو چمک
عاشقی صبر طلب اور تمتا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں، خون جگر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے، لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہو چمک
پر تو خور سے ہے شعبنم کو فنا کی تسلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر جو چمک

۱۔ لغات۔ سر ہونا:
اس محاورے کے معنی میں اختلاف
ہے اور کسی ایک معنی کو ترجیح
دینے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں۔
فارسی میں ”سر شدن“ شروع
ہونے کی طرف اشارہ ہے۔
سر شدنِ قلم کا مطلب ہے قلم
بن جانا۔ مولانا طہطاہائی نے
اس کے معنی سمجھے اور باخبر
ہونے کے لکھے ہیں۔ لفظ لغات
میں مرزا غالب کا یہ شعر ہے
طوبہ سند پیش کر کے سر ہونے
کے معنی پہنچ کھٹنے کے بتائے
ہیں۔ ساتھ ہی لکھ دیا ہے کہ
اب یہ معنی متروک ہیں۔ اس

ایک نظر میں ہمیں فرصت ہستی، غافل؛ کے ایک نام سنی مسوکن بھی

گر ہی بزم ہے اک رقص شر و چو نچک

شرح : آہ کے اثر پذیر

غم ہستی کا استاد ! کس سے ہو جو نرنگ علاج

ہونے کے لیے ایک عروکار

شع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ہے۔ اب محبوب اتیری ذلف

کے سر پہنے تک کون جیتا

رہے گا؟ زندگی ختم ہو جانے گی اور تیری ذلف بدستور عاشقوں کے حال زار سے

بے خبر رہے گی۔ اس کے خبردار ہونے یا پہنچ و غم کھلنے تک ہمارے یا کسی دوسرے

کے زندہ رہنے کی امید ہی کب ہے؟ یا کون کہہ سکتا ہے کہ تیری ذلف کب مسخر

ہوگی اور ہم اس وقت تک جیتے رہیں گے۔

۲۔ لغات : کام شنگ : گرچہ کا حلق۔

شرح : خواہجہ عالی فرماتے ہیں :

”جو مطلب اس شعر میں ادا کیا گیا ہے، وہ صرف اس قدر ہے کہ انسان

کو درجہ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔“

کوئی شبہ نہیں کہ اس دنیا میں حوادث کے جو طوفان اٹھتے رہتے ہیں، ان میں سے

صبر و ہمت کے ساتھ گزرتے ہوئے کوئی بڑا کارنامہ انجام دینا بہت مشکل ہے اور

ہر انسان کسی بلند و شایان مقصد پر نہیں پہنچ سکتا، جب تک وہ ہر قسم کی مصیبتیں

برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو جائے۔ زندگی ایک ایسا سمندر ہے، جس میں

قدم قدم پر چال نیچے ہوئے ہیں اور ان کے حلقے ڈوروں سے تیار نہیں ہوئے

بلکہ ان کی جگہ مگر پھوپھوں کے حلق رکھ دیے گئے ہیں۔ پھر ایک ایک قدم پر بیگزوں

مگر چھ حلق کھولے بیٹھے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان مصائب کو انگیز کرتے ہوئے کسی بلند

مقصد کی طرف بڑھنا ہرگز سہل نہیں۔ مرزا نے پہلے مصرع میں خطرات کا منظر

پیش کیا۔ دوسرے میں اصل مقصد واضح کیا۔ پوری کیفیت کا خلاصہ یہ ہے :

۱۔ زندگی کے سمندر کی ہر موج ایک جہال کی حیثیت رکھتی ہے۔ موج کو جہال سے تشبیہ دینا عام مشاہدہ ہے۔

۲۔ یہ جہال ڈور لپوں سے تیار نہیں ہوتے، بلکہ سیکڑوں مگر چھوٹے کھول کر میٹھے گئے اس طرح ان کے حلقوں کے تواتر سے جہال تیار ہو گئے۔

۳۔ خطروں اور ہلاکتوں کی یہ کیفیت سامنے رکھ کر وہ سوچتے ہیں کہ ان میں سے گزرتے ہوئے قطروں کو موتی بننا ہے۔

۴۔ قطرہ سمندر سے باہر نکلے گا تو موتی میں مذب ہو جائے گا۔ اندر ہی رہ کر اسے اوج کمال تک پہنچنا ہے۔

۵۔ ظاہر ہے کہ وہ جب تک خطروں کے مقابلے کے لیے صبر اور اپنے مقصد کے لیے استقامت پیدا نہ کرے گا، منزل مقصود پر نہ پہنچ سکے گا۔

۶۔ مرزا کا کمال یہ ہے کہ خطرات زیادہ سے زیادہ معین شکل میں پیش کر دیے۔ باقی رہا یہ امر کہ عمل اور تقاریر میں قطرے پر کون کون سی آفتیں آئیں گی ان کا کوئی تعین نہ کیا اور تعین ہو بھی نہیں سکتا، کیونکہ ہر قطرے کو یکساں حالتیں پیش نہیں آ سکتیں اور ان کا اندازہ ہر پڑھنے والا خطرات پیش نظر رکھتے ہوئے خود کر سکتا ہے۔ حقیقتاً شعر میں یہ مدح تعین بھی مطلق اندوزی کا ایک خاص عامل ہے۔

بطور خاص غزل طلب کہتے ہیں کہ ان تمام خطرات میں نصب العین قطرے کا گوہر بننا ہے، اسے شاعر قطرے کے لیے منتہائے کمال قرار دیتا ہے۔

۳۔ لغات - رنگ : حال - کیفیت۔

مشرح : عشق کے لیے صبر کے سوا چارہ نہیں اور تنہا بے قرار ہے،

یعنی چاہتی ہے کہ ہر مقصد ابھی پورا ہو جائے۔ اب حیران ہوں کہ جگر کا خون ہونے تک دن کا کیا حال کروں؟

تنہا کا مقام دل ہے اور صبر کا مقام جگر اور مرزا نے دل و جگر کے یہ وظیفے

الگ الگ واضح کر دیے۔ صبر کا خاصہ یہ ہے کہ مگر پر زیادہ سے زیادہ بار پڑے اور وہ غم
جو ہو کر بتا جانے۔ مرزا اچھے تھے ہیں کہ صبر کی آخری منزل پر پہنچنے تک میں دل کو ٹوٹ کر جا
میں لائن ۵

شعر میں بے تکلفی سے جتنی مناسبتیں جمع کر دی گئی ہیں، وہ دراصل اعجازِ سخنوری کا ایک
کوشش ہے۔

۴۔ شرح : عاشقِ محبوب سے اپنا حال بیان کر رہا ہے۔ محبوب کتنا ہے آنکھ
خاکروہ میں ہمارے حال سے تفاعلِ ذہنوں کا۔ عاشق کہتا ہے : میں مانتا ہوں کہ آپ
تفاعل نہیں کریں گے، لیکن یہ بھی تو ظاہر ہے کہ جب تک آپ کو ہماری خبر ملے گی اور
آپ ہمارے حال پر توجہ فرمائیں گے، اس وقت تک تو ہم ختم ہو کر نہ محض قبر میں جا سکیں
بلکہ ہمارا جسم بھی مٹی میں مل جائے گا۔

شعر میں دراصل محبوب کے تفاعل کا نقشہ بنائیت پر تاثیر انداز اور بنائیت و نشیں
الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔ کوئی مصور اس ذہنی کیفیت کی تصویر نہیں کھینچ سکتا اور مرزا
نے چند لفظوں میں اسے ایسا پرداز دے دیا ہے کہ ہر فرد کے سامنے پوری کیفیت آ
جاتی ہے۔

۵۔ لغات : پر تو خور : سورج کا جلوہ، جس کی حدت اور تمازت شبہم کو اٹھ
لے جاتی ہے۔

شرح : سورج کی روشنی شبہم کے لیے فنا کا سبق ہے، یعنی کرنیں پڑتے
ہی شبہم کے قطرے اڑاڑ کر غائب ہو جاتے ہیں۔ گویا سورج کی کرنیں انھیں فنا کے فنا
پر پہنچا دیتی ہیں۔ اسے محبوب اسی طرح میری جتنی بھی عنایت کی مرث ایک نظر مٹانے
تک بات ہے، جب آپ کی نظر عنایت مجھ پر پڑ جائے گی، جس طرح سورج کی کرنیں شبہم
پر پڑتی ہیں، میں بھی اسی طرح فنا کے گھاٹ اتر جاؤں گا۔

شاعر نے دوسرے مصرع میں کوئی معین مخاطب نہیں رکھا۔ بلکہ ہر اس سے
مقصود وجودِ حقیقی ہے، جس کی نظر عنایت تمام غیر حقیقی اور اعتباری ہستیوں کو اپنے

اندر جذب کر سکتی ہے۔

۶۔ شرح : اے غافل انسان ! زندگی کی صدمت ایک نظر سے زیادہ نہیں۔
یعنی نظر اٹھاؤ، دیکھا اور ختم ہو گئی۔ دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ فرصت بیک
جھپکنے تک محدود ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھنا چاہیے کہ ہستی ایک بزم اور ایک انجمن
ہے، اس کی گرمی اور رونق صرف اتنی ہوتی ہے، جتنی دیر میں چنگاری تڑپ کر
اٹھے اور ختم ہو جائے۔

۷۔ شرح : خواجہ جمال فرماتے ہیں :

”انسان کی زندگی کو اس لحاظ سے کہ جب تک موت نہیں آتی، غم سے
نجات نہیں ہوتی، شمع سے تشبیہ دی ہے کہ جب تک صبح نہیں ہوتی،
وہ برابر جلتی رہتی ہے۔“
ساختہ ہی فرماتے ہیں :

”اس قسم کی نادر و جریح قیامات سے مرزا کے دونوں دیوان، اردو
اور فارسی بھرے ہوئے ہیں۔“

اے استاد ! زندگی کے غم کا علاج موت کے سوا کون کر سکتا ہے ؟ یہ بیماری
مرنے ہی پر ختم ہو گی۔ دیکھیے، صبح کو رات کے وقت جلاتے ہیں اور جب تک صبح
نہ ہو جائے، وہ برابر جلتی رہتی ہے یعنی اس کی سوزش کا خاتمہ صبح طلوع ہو جانے پر
ہوتا ہے۔ یہی کیفیت غم ہستی کی ہے اسے بھی ایک شمع سمجھنا چاہیے، جو کار جلتی
رہے گی اور صرف موت اسے بجھائے گی، کیونکہ غم ہستی کی شمع کے لیے موت ہی
صبح کا حکم رکھتی ہے۔

گر خجہ کو ہے یقین بجا بت، دمانہ مانگ

۱۔ لغات۔ اجا بت :

یعنی بغیر بک دل بے دمانہ مانگ

قبول ہونا۔ منظور ہونا۔

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد ! دل بے دعا : ایسا دل جس
مجھ سے برے گنہ کا حساب الے خدا ! نہ مانگ
کا کوئی مدعا نہ ہو جو ہر غرض
سے پاک ہو ۔

شرح : اگر تجھے دعا کے قبول ہونے کا یقین ہے تو ایک ایک چیز کے
یہ دعا مانگ ۔ اگر مانگتا چاہتا ہے تو خدا سے ایسا دل مانگ لے جس کا کوئی مدعا
نہ ہو جو غرض سے بالکل پاک ہو جب ایسا دل مل جائے گا تو کبھی کسی چیز کے لیے
دعا مانگنے کی ضرورت نہ رہے گی کیونکہ وہ بے دعا ہونے کے باعث کسی شے پر
ملففت ہی نہ ہو گا ۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرزا نے دل بے دعا مانگنے کے لیے قبول ہونے کے
یقین کی شرط کیوں لگائی ، یعنی کیوں کہا کہ اگر تجھے دعا قبول ہونے کا یقین ہے تو یہ
مانگ اور یہ نہ مانگ ؟ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر شخص کو یقین اجابت ہو تو دعا مانگے
مطلب صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر واقعی کسی کی کو قرآن سے اجابت کا یقین ہو
جائے تو دل بے دعا مانگنا چاہیے ۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ دل بے دعا کیوں مانگا جائے ؟ آیا واقعی مرزا غالب
لوگوں کو دعا سے روک رہے ہیں اور اسی لیے انہوں نے دل بے دعا مانگنے کی
تلقین کی ؟ بعض اہل تحقیق نے فرمایا ہے : خدا عالم الغیب ہے ، لہذا جو تمنا کسی
کے دل میں پیدا ہوتی ہے ، اس کا علم عالم الغیب کو ہو جاتا ہے ، پھر مانگتا فعل عبث
ہے ۔ اگر وہ تمنا پوری نہیں ہو سکتی تو اس کا بھی علم ہے اور مانگنا اس صورت میں
بھی بیکار ہو گا ، لیکن یہ سب تکلفات ہیں ۔ مرزا نے دعا سے نہیں روکا ، بلکہ ہر لحظہ
سہر وقت ایک ایک چیز کے لیے دعائیں مانگنے سے روکا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ دینی ،
مقا صد اور تمناؤں کی کوئی حدود نہایت نہیں ۔ انسان مانگنے پر آتا ہے تو مانگتا ہو ۔
ہے ۔ دل میں استقامت پیدا کرنی چاہیے ۔ دنیا کی چیزوں سے زیادہ وابستگی نامناسب
ہے اس غرض سے دل بے دعا مانگ لینا بہتر ہے ۔

دل بے مدعا سے بھی مرزا کا مدعا یہ نہیں کہ دل میں کوئی آرزو کوئی تمنا باقی ہی نہ رہے، مدعا صرف یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتوں کے لیے بھی کی حیثیت سراسر وغوی ہے، مانگنا مناسب نہیں۔

۲۔ شرح : اے خدا! مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ، کیونکہ جب حساب کا معاملہ سامنے آئے گا تو گناہوں کے ساتھ مجھے یہ بھی یاد آتا ہائے گا کہ کون کون سی حسرتیں دل میں رہ گئیں اور گناہ بھی یہ انداز شاہیں ذکر رکھا۔ ان حسرتوں کے داغ دل پر موجود ہیں اور گناہوں کا حساب دیتے وقت وہ تمام داغ تازہ ہو جائیں گے۔

مرزا کو یہ مضمون بہت پسند ہے۔ اردو میں وہ دوسری جگہ کہتے ہیں۔

ناگروہ گناہوں کی بھی حسرت کی طے داو

یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

پھر فارسی کی ایک غزل میں مزیاتے ہیں :

اندراں روز کہ پرستش روز از ہر چہ گوشت

کاش با من سخن از حسرت مانیز کنند

یعنی جس روز اعمال کی پرستش ہوگی، کاش اُس روز میری حسرتوں کے متعلق

بھی بات چیت کر لی جائے۔

مثنوی : ابراہیم گرباڑ میں یہ مضمون تفصیل سے بیان کیا ہے، جس کا خلاصہ خواجہ

عالی مرحوم نے اس شعر کی شرح کرتے ہوئے "یادگار غالب" میں پیش کر دیا ہے۔

خواجہ مرحوم مزیاتے ہیں :

"بظاہر درخواست کرتا ہے کہ اے خدا! مجھ سے میرے گناہوں کا

حساب نہ مانگ اور درپودہ الزام دیتا ہے۔ گویا کہتا ہے کہ گناہوں کا

حساب کیونکر دوں؟ وہ شمار میں اس قدر زیادہ ہیں کہ جب ان کو شمار

کرتا ہوں تو وہ داغ جو کونے دنیا میں دیے ہیں اور جو شمار میں اسی

کثرت سے ہیں جن کثرت سے میرے گناہ ہیں۔ ان کی گنتی یاد آ
باقی ہے۔

”گناہوں اور داغوں کے شمار میں برابر ہونے سے یہ مراد رکھتی ہے
کہ جب کسی گناہ کا مزگب ہوا تو بہ سبب ہدم استطاعت کے اسے
خاطر خواہ نہ کر سکا۔ کوئی نہ کوئی حسرت مزور باقی رہ گئی۔ مثلاً شراب
پی تو دسل نصیب نہ ہوا، دسل قیسر آیا تو شراب نہ ملی۔“

”ابو گہر بار“ کی مناجات میں کم و بیش نوے اشعار اسی موضوع پر ہیں اور
وہ اس قابل ہیں کہ انھیں پڑھ کر مرزا غالب کے نقطہ نگاہ کا صحیح اندازہ کیا جائے۔
گناہوں کے سلسلے میں بے استطاعتی کے باعث حسرت رہ جانے کا قصہ آں
سوز و درد سے بیان کیا ہے کہ انسان کے لیے اسے اطمینان سے پڑھنا مشکل ہے
اور لطف یہ کہ بندگی اور عبودیت کا کوئی بھی پہلو باقی نہیں چھوڑا۔ آخر میں کہتے ہیں۔

بہر جرم کز دوسے دفتر رسد	زمن حسرتی در برابر رسد
بغیر مائے کین داوری چوں بود	کہ از جرم من حسرت افزوں بود
ہر آئینہ چھوں منے را بمند	تلافی فراخود بود نے گزند
بدین مویہ در روز امید و بیم	بگویم ہذا انسان کہ عرش عظیم
شود از تو سیلاب را چارہ بخور	تو بخشی جہاں گریہ ام آبرو

مطلب یہ کہ جو جرم میرے اعمال نامے سے پیش کیا جائے گا، میں اس کے
مقابلے میں ایک حسرت پیش کر دوں گا۔ اب سزا دینے، فیصلہ کیونکر ہوگا؟ میری
حسرتیں تو جرموں سے بڑھ جائیں گی۔ میرے لیے تو سزا کے بجائے تلافی کا سروسامان
ہونا چاہیے۔ قیامت کے دن میں اس درد سے روؤں گا کہ عرش عظیم تجھ سے خواہاں
ہوگا، مجھے سیلاب سے بچائے۔

پھر کہتے ہیں کہ میں رند ہوں، پارسائی کی کوئی چیز مجھ میں موجود نہیں، میری
فلک کج ہے اور میں آتش پرست ہوں، جو اپنے آپ کو مسلمان ٹاہر کر رہا ہے، لیکن

میں تیری کتاب کا پرستار اور تیرے پاک نبی کا محب ہوں، میرے لیے آزادی کا فرمان صادر کر دے۔

یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ مرزا غالب ناسزا اور میں بھی برابر سزاوار طریقے کے قائل رہے، مثلاً وہ فرماتے ہیں :

باوہ ہوام خور وہ وز رہ قمار باختہ

وہ کر ز ہر چہ ناسزا مست ہم پر سزا نہ کہہ ایم

یعنی شراب اُدھار پیتے رہے اور پیسے جوئے میں ہار دیے: افسوس کہ ہم نے غیر شایاں افعال بھی شایاں طریق پر نہ کیے۔ جو پیسے جوئے میں ہارے، وہ شراب کی قیمت میں ادا کیے جاسکتے تھے، یہ شایاں طریقہ تھا۔

ہے کس قدر ہلاک فریبِ وفائے گل

بیل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

آزادی نسیم مبارک کہ ہر طرف

ٹوٹے پڑے ہیں حلقہٴ دایم ہولے گل

جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مریگا

اسے ولے نالہ لبِ خونیں نواے گل

خوش حال اس حریفِ سیرِ مست کا کہ جو

رکھتا ہو، مثلِ سایہ گل، سر پہ پائے گل

۱۔ لغات - ہلاک :

مٹا ہوا، دار و شیفٹہ۔

شرح : اس شعر کا

دوسرا مصرع پہلے ایک غزل

میں آچکا ہے، یعنی :

بیل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

کہتے ہیں جس کو عشق، نعل ہے دماغ کا

شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں

کی حالت دیکھیے، وہ پیدوں کے

عشق کے فریب میں مر رہا ہے۔

پھول و فاداری کریں گے حالانکہ

صحن اور وفا ایک جگہ جمع نہیں ہو

سکتے۔ یہ بیل کی فریبِ خودگی

ہے۔ پھولوں کی کیفیت یہ ہے کہ
اُس غریب کے کاروبار کی مہنسی
اڑا رہے ہیں۔

پھولوں کے کھٹنے کو ان کا خنڈ
یعنی مہنسی قرار دیا اور شاعر کے
تصور کے مطابق یہ مہنسی میل کی
نادانی اور فریب خوردگی پر ہے
کہ پھولوں کی محبت پر مٹی جا رہی
ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اسے
عجب فریب دیا۔

ایک محاکمے پر عشق کی
کیفیت یہی ہے کہ حق ناشناس
لوگ اس کی مہنسی اڑاتے ہیں۔
خواہ اس عشق کا تعلق کسی فرد
سے ہو یا مقصد ہے۔

ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لیے بہار
میرا قیب ہے، انفسِ عطر سائے گل

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے باو بہار سے
مینا سے بے شراب و دل بے ہوائے گل
سطوت سے تیرے جلوہ حسنِ غیور کی
خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل
تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ گنجِ تنگ

بے اختیار دوڑے ہے گل اور قفا سے گل
غائب! مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گل جیبِ قبلے گل

۴۔ شکر نسیم کے بے آزادی کے چونکہ پھولوں کے اشتیاق و آرزو کا جو بال بچھا ہوا ہے اس
کے حلقے ٹوٹے پڑے ہیں۔ اس شعر میں چند امور غور طلب ہیں :

- ۱۔ پھولوں کے اشتیاق و آرزو کا جو بال بچھا ہوا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے
کہ بہار آئی تھی۔ جس میں پھولوں کی کثرت تھی اور لوگ شوق سے پھول دیکھنے آتے تھے
- ۲۔ اس دامن کے حلقے ٹوٹے پڑے ہیں مراد یہ ہے کہ بہار ختم ہو گئی اور خزاں
آگئی۔

۳۔ جب پھولوں کی کثرت تھی، نسیم کو پابندی سے ان کی خدمت بجالانی پڑتی تھی
کیونکہ پھول نسیم ہی کے چلنے سے کھٹتے تھے اور وہی ان کی خوشبو ما بجا لیے پھرتی تھی۔

۴۔ جب پھول نہ رہے تو نسیم کے لیے پابندی بھی ختم ہو گئی لہذا فرمایا اسے آزادی مبارک وہ وہاں چلے جاتے۔ جس طرف چاہے چلے۔

۵۔ جال کے حلقے ٹوٹ جاتیں تو وہ اس قابل نہیں رہتا کہ شکار اس میں پھنسے۔

نسیم اس اعتبار سے بھی آزاد ہو گئی

۶۔ تقریباً تمام شرمین نے نسیم کے معنی خوشبو لے کر شرح کی ہے، جو نوزوں معلوم نہیں ہوتی۔ اگر خوشبو ہی مراد تھی تو مرزا نے نسیم کی جگہ شیم کیوں نہ لکھا؟

۷۔ لغات : لبِ خوئیں نوا : وہ لب، جس سے لبو بھری صدائیں نکلتی ہیں۔

شرح : جسے دیکھو، وہ رنگ کی لبر بھر کے دھوکے میں پھنس گیا۔ آہ!

پھول کا وہ الم کسی نے نہ مٹا، جو لبو بھری صدائیں بلند کرنے والے لب پر جاری تھا!

مطلب : سب کو ہر شخص لبو بھر رہا تھا جو اسے انہیں چیزوں پر نظر رکھتا

ہے، جو اس کو اپنی طوٹ گینیتی ہیں، لیکن حقیقت پر کسی کی نظر نہیں۔ پھول کے

اندسے جس خون بھری نفاں بلند ہو رہی ہے اس پر کسی کی توجہ نہیں اور رنگ

پر سب شے جا رہے ہیں، حالانکہ وہ محض دھوکا ہے، محض ظلم ہے، جو جلد سے

جلد ٹوٹ جاتے گا۔

۸۔ شرح : وہ شخص کتنا خوش نصیب ہے، جو عشق کی سیاه مستی میں

پھول کے سائے کی طرح اپنا سر پھول کے پاؤں پر رکھتے رہتا ہے۔

ہاں پھول سے مراد محبوب ہے۔ یعنی خوش نصیب وہی عاشق ہے، جو ہر

تعلق سے کنارہ کش ہو کر، بخود مدہوش آدمی کی طرح اپنے محبوب کے قدم نہ

چھوڑے اور سایے کی طرح اس کے قدموں پر جھکا رہے۔

۵۔ لغات۔ نفسِ عطر سائے گل : پھول کا عطر بھرا سانس یعنی اس

کی دلدادہ خوشبو۔

شرح : اے محبوب میں جانتا ہوں کہ ہمارے پھول صرف تیرے لیے پیدا

کیے ہیں کہ تو ان سے کام لے۔ مثلاً ہار بنا کر گلے میں ڈالے، زلف و کاکل میں لگائے۔

بستر پر بچھا ہے۔ ان کی خوشبو سونگھے، ان سے نکلا ہوا عطر جسم پر لے۔ پھول کا مستطو
معطر سانس میرا قریب بن گیا ہے اور مجھے اس کی حالت پر رشک آرہا ہے۔ کہ وہ
ہر لحظہ تیرے ساتھ رہتا ہے اور میں تجھ سے دُور ہوں۔

۶۔ شرح : میری صراحتی شراب سے خالی ہے۔ دل میں پھولوں کی سیر
کا کوئی دلولہ نہیں۔ یہ حالت میرے لیے فصل بہار کے سامنے شرمندگی اور خواست
کا باعث ہے۔

بہار کا تقاضا ہی یہ ہے کہ شراب پی جائے اور پھولوں کی سیر کی جائے لیکن
میرے پاس فصل بہار کے خیر مقدم کا یہ سامان موجود ہی نہیں، اس لیے میں شرمندہ
ہو رہا ہوں۔

مولانا طاباٹبائی کے ارشاد کے مطابق شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اسے سوالیہ
کا جواب سمجھ لیا جائے، یعنی میرا شراب پینا اور باغوں کی سیر کرنا لوگ بُرا سمجھتے ہیں
مگر ایسا نہ کروں تو مجھے باو بہار سے شرمندگی ہوتی ہے، لہذا میں شرمندگی گوارا
نہیں کر سکتا اور اپنا مشغول ضرور جاری رکھوں گا۔

۷۔ لغات : مسطوت : دہرہ۔

شرح : اے محبوب! تیرا حسنِ خیور اس امر کی تاب نہیں لاسکتا کہ تیرے عاشق
کی نظر کسی اور طرف اٹھے اسی حسنِ خیور کے وہ بچنے میری نگاہوں میں پھول کے رنگ
کو لہو بنا دیا۔ یعنی میں اس کی رنگینی کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتا اور یہ سب کچھ تیرے
خیورِ مہوۃ حسن کے رعب اور دہرے کا کرشمہ ہے۔

۸۔ لغات : گل در تقاضے گل : پھول کے چمچے پھول۔

شرح : اے محبوب! یہ تیرے ہی جلوے کا دھوکا ہے کہ آج تک اس
دھوکے میں مبتلا ہو کر پھول کیے بعد دیگرے بے اختیار دوڑے چلے آ رہے ہیں کہ شاید
اُس جلوے سے فیضیاب ہو سکیں۔

مطلب یہ ہے کہ روئے زمین پر پھولوں کی نوآبادی اور شگفتگی کا جو کبھی ختم

نہ ہونے والا سلسلہ جاری ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ تیرے جلوے کے اشتیاق میں یہ بخود نہ چلے آ رہے ہیں، حالانکہ وہ بھی جلوہ نہیں، بلکہ اس کا فریب انہیں کھینچے لیے آ رہا ہے۔

۵۔ شرح : اے غالب ! مجھے اس محبوب سے ہم بھل ہونے کی آرزو ہے، جس کا خیال بھی بھول کی جیبِ قبا کے لیے ایک آرائشی بھول کی حیثیت رکھتا ہے۔ عام طریقہ ہے کہ قبا کی زیب و زینت کے لیے مناسب مقامات پر بھول کا ڈھ لیے جاتے ہیں۔ غالب کا محبوب ایسا ہے، جس کا خیال اور تصور بھول کی قبا کے لیے زینت کا باعث ہے۔

○
غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش ازیک نفس
برق سے کتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم
مخفیں برہم کرے ہے گنجہ باز خیال
ہیں ورق گردانی نیرنگ یک بتخانہ سم
باوجود یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں
ہیں چراغانِ شہستانِ دل پروانہ ہم
ضعف سے ہے نے قناعت یہ ترک جستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاؤ تہمتِ مردانہ ہم
دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تہمتیں اسد
جاتے ہیں سینہ پر خوں کو زنداں خانہ ہم

۱۔ شرح : بھڑی رحم

فرماتے ہیں :
"دنیا کی تکالیف ملاؤ سے
ہیں۔ جو لوگ اسلاف و نسبت سے
بھری ہیں وہ الم سے بھی بکدوش
ہیں۔ آزادوں کا ہر مں سب سے زیادہ
آزاد پاتے اور رنج اٹھاتے ہیں اور
شب و روز تار یک ماتم خانہ میں
رہتے ہیں لیکن واقعہ ہم کا اثر
ان پر عارضی اور فوری ہوتا ہے
مرزا اپنے اس سکونِ بصیرت کی
کیا فوق الخیال مثال دیتے ہیں کہ جب
بمق پر گرتے ہے تو ہم بھوکے خون
اور پریشان ہونے کے کمالِ طبعین

سے اٹھ کر جزائر برق سے اپنے الم کبے کی خاموش و کشتہ طبع روشنی
کر لیتے ہیں ۔

بلاشبہ اس دنیا میں انسان کے لیے رنج و غم ملائق کی بنا پر ہے اور آزاد لوگ وہی
کہلاتے ہیں، جن کا دامن ملائق سے پاک ہو بیگم غم انہیں بھی ہوتا ہے کیونکہ جب تک
دنہ کی باقی ہے، ملائق سے کامل علیدگی ناممکن ہے چونکہ ان کا دل کسی شے سے گہری
وابستگی نہیں رکھتا، اس لیے غم بھی پاؤں اور جنہیں ہو سکتا اور مرزا کے قول کے مطابق وہ
صرف دم بھر کے لیے متاثر ہوتے ہیں مصائب کی چو بھدیاں ان پر گرتی ہیں انہیں کو اپنے
ماتم خانے کی شمع بنا لیتے ہیں۔ یعنی بھلی چمکی، گری، ایک لمے میں غائب ہو گئی۔ بس یہی
کیفیت آزاد لوگوں کے غم کی ہے۔

ایک اور پہلو بھی الفاظ سے واضح ہے۔ یعنی دنیا، بھلی بنے لرزتی اور کاہنتی ہے
ہمارے لیے اس کی حیثیت ایک دیاسلائی کی ہے، بھلی چمکی اور ہم نے سمجھ لیا کہ ہر
ماتم خانے کے لیے روشنی کا سامان لیتا ہو گیا۔

۲۔ لغات۔ گنجفہ : تاش کی طرح کا ایک کھیل، جس کے پتے تاش کے
پتوں کے برعکس گول ہوتے ہیں، نیز ان کی تعداد باون کے بجائے چھیانوے ہوتی
ہے اور آٹھ آدمی اسے مل کر کھیلتے ہیں۔ گنجفہ باز، گنجفہ کھیلنے والا۔

دوق گردانی : تاش یا گنجفہ کے پتے پھینٹنا اور ہاتھوں میں پھیرنا۔
نیرنگ : عجائب۔

ثبت خانہ : مراد ہے آرزوؤں اور تمناؤں کا ثبت خانہ
شرح : ہمارے سامنے تمناؤں اور آرزوؤں کا ایک ثبت خانہ عجائب و
غرائب سے آراستہ ہے۔ اس کی دوق گردانی کا نقشہ ہم بنے ہوئے ہیں۔ خیال کا
گنجفہ باز ان پتوں کو برابر پلٹتا جا رہا ہے۔ ایک نقشہ آتا ہے اور وہ برہم ہو جاتا
ہے، پھر دوسرا نقشہ سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ اس طرح غفلتیں قائم ہوتی اور بھرتی
چلی جا رہی ہیں۔ یہی انسانی زندگی کا عام نقشہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس نقشے کو

پیش کرنے کی یہ ایک بہترین صورت ہے ۔

۳۔ لغات ۔ پیدا ئی : غلور ۔ نمود و نمائش ۔

شرح : ہماری حیثیت پر نظر ڈالیے ، دنیا بھر کا ہنگامہ بپا کر رکھا ہے لیکن نمود و نمائش پہنچ ہے ، اس کا کہیں تپا ہی نہیں چلتا ۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ہم دل پر دھڑکے شبستان میں چراغاں کی طرح ہیں ۔

یہودانے کے دل کو ایک شبستان فرض کیا ، پھر اس میں چراغاں کا انتظام ہوا ۔ گویا ایک سوہوم دوسو سوہوم صحت پیدا ہو گئی ۔

جس طرح شمع روشن ہوتے ہی پروانے کے دل میں شوق وصال کی بیخودی ہنگامہ بپا کر دیتی ہے اور وہ اگر ایک لمحے میں اپنے محبوب یعنی شمع پر قربان ہو جاتا ہے ۔ اسی طرح ہم نے دنیا بھر کے ہنگامے کا سرو سامان کر رکھا ہے ۔ لیکن پروانے کے شوقیہ جہاں کی محفل میں چراغاں کا خارجی وجود کوئی نہیں ، وہی حیثیت ہماری ہے ۔

۴۔ لغات ۔ تکیہ گاہ : ہمارے کی جگہ ۔ ٹیک لگانے کا مقام ۔

شرح : ہم نے تگ و دو چھوڑی ہے تو اس لیے نہیں کہ ہم میں قناعت پیدا ہو گئی ہے ۔ بلکہ ہم اتنے کمزور و ناتواں ہو چکے ہیں کہ تگ و دو کر ہی نہیں سکتے ۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں ہم مثبت مردانہ کی تکیہ گاہ کے لیے باعث تگ ہیں ۔ یعنی ہمارا موقف ایسا نہیں ، جسے مردانگی کے نزدیک زیادہ سمجھا جائے ۔ مردانگی کا تقاضا یہ تھا کہ ہم آرزوؤں پر قابو پاتے ۔ اور کم سے کم پر قناعت کر لیتے ، مگر ہماری جگہ دوڑ اس وقت تک نہ رکھی ، جب تک ہماری قوت و طاقت ختم نہ ہو گئی ۔ یعنی ہم جیگ دوڑ کے قابل ہی نہ رہے ۔ پھر مثبت مردانہ کے لیے ہم وبال ثابت ہوئے تو اس پر تعجب کیا ہے ؟

۵۔ لغات : دائم الحبس : ہمیشہ کے لیے قید ۔ عمر قیدی ۔

شرح : اے استاد ! ہم اپنے لبو بھرے سینے کو قید خانہ سمجھتے ہیں ، کیونکہ اس میں لاکھوں تمنائیں ہمیشہ کے لیے قید ہیں اور انہیں کے خون جوتے جانے سے

سینہ لہو سے بھر گیا ہے ۔

بہ نالہ حاصل دل بستی مزا حسم کر
۱۔ لغات۔ دل بستی :
دل کا تعلق ۔
مترشح : اے عاشق! تو بہو
آہ و فغان کر، کیونکہ دل لگانے اور محبوب سے عشق کرنے کا حاصل اس کے سوا کچھ
نہیں۔ تیری حیثیت زنجیر کی ہے۔ زنجیر کے گھر کا مال و متاع آواز کے سوا کچھ
نہیں ہوتا ۔

مجھ کو دیارِ غیسر میں مارا، وطن سے دور
۱۔ مترشح : خواہ ماتی
مزا تے ہیں :
پرویس میں مرنا، جو ہر شخص
وہ حلقہ ہائے زلف، کہیں میں ہیں، اے خدا
رکھ لی برے خدا نے، مری بیکسی کی شرم
رکھ لیجو میرے دعویٰ وارسنگی کی شرم
کو ناگوار ہوتا ہے، اس پر خدا
کا شکر اس لیے کرتا ہے کہ اگر
وہاں بے گورو گھن پڑے رہے

تو کچھ معافیہ نہیں، کیونکہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ یہ کون تھا اور کس رتبے کا
آدمی تھا، لیکن وطن میں مرنا، جہاں ایک زمانہ واقف حال ہو اور
خبردار و غمخوار ایک بھی نہ ہو، وہاں مردے کی اس طرح مٹی خراب
ہونی سخت رسوائی اور ذلت کا باعث ہے۔ میں خدا کا شکر ہے کہ
اس نے پرویس میں مار کر میری بیکسی کی شرم دکھ لی۔ اس میں گونہ ظاہر
خدا کا شکر ہے، مگر فی الحقیقت سراسر اہل وطن کی شکایت ہے،
جس کو ایک خاص پیرایے میں ظاہر کیا۔

اتنا عزم کر دینا ضروری ہے کہ شعر کا نایاں پہلو بیکسی کی شرم رکھ لیجیے۔

خدا کا شکر نہیں، نمایاں پہلو یہی ہے کہ اہل وطن میری حقیقی حیثیت سے نا آشنا ہے
انہیں کچھ خیال نہ آیا کہ میں کس قدر و منزلت کا مستحق تھا۔ اس ناقدی اور کس مہر
کی حالت میں یہی بہتر ہوا کہ مجھے اہل وطن سے بہت دُرا ایک اجنبی ملک میں موت
آئی۔ اس طرح میرے رحیم و کریم خدا نے میری بیکی کی شرم دکھ لی۔

مرزا نے اس سے ملتے جلتے شعر بھی کہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں
اہل وطن کی ناقدی کا بہت گہرا احساس تھا!

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشیتِ خس کہ لکھنؤ میں نہیں

نیز :

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب!
تم کو بے مہرِ یارِ اہل وطن یاد نہیں؟

۲۔ لغات - کہیں : گھات -

دارنگی : آزادی -

شرح : اے خدا! محبوب کی ذلت کے حلقے گھات میں بیٹھے ہیں اور مجھے

پہانس لینے کے درپے ہیں۔ میں آزادی کا ترغیبی ہوں۔ اب اس دعوے کی شرم
دکھ لینا تیرے ہی ہاتھ ہے۔

شعر کا مقصود یہ ہے کہ محبوب کے حلقے ہنسٹا گرفت سے بچنے کی کوئی امید نہیں
اب بیپارگی کی حالت میں اپنے دعوے آزادی کی شرم محفوظ رکھنے کے لیے کوشاں
ہیں۔



لوں دام بختِ خفتہ سے ایک خوابِ خوش دے

غالب! یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں،

۱۔ لغات : دام :

قرض - اُدھار

خوابِ خوش : بے نگر

کی نیند۔ گہری نیند، جس میں غفلت کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔

شرح : میرا نصیب گہری نیند سوراہا ہے اور میری حالت یہ ہے کہ نیند آتی ہی نہیں۔ کبھی خیال آتا ہے کہ نصیب ہی سے ایک آدھ نیند ادھار لگ لوں، لیکن اسے غالبؔ بخوت یہ ہے کہ یہ فرض ادا کہاں سے کروں گا؟
شعر کا مقصد صرف یہ ہے کہ بد نصیبی کا اظہار کیا جائے، جو اتنا پرہیزگار ہوئی ہے اور نصیب کے اس طرح سوچا تا یقیناً انتہائی بد نصیبی ہے۔



وہ فراق اور وہ وصال کہاں؟	وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں؟
فرصتِ کار و بارِ شوق کسے	ذوقِ نظارۂ جمال کہاں؟
دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا	شورِ سودا سے خط و خال کہاں؟
تمہی وہ اک شخص کے تصور سے	اب وہ رحمتِ بے خیال کہاں؟
ایسا آساں نہیں ہو رہا!	دل میں طاعت، جگر میں مال کہاں؟
ہم سے چھوٹا قمار خانہٴ عشق	داں جو جادوی گرہ میں مال کہاں؟
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں	میں کہاں اور یہ وبال کہاں؟
مضمحل ہو گئے قویؔ، غالبؔ!	وہ عناصر میں اعتماد کہاں؟

یہ پوری غزل اس گزرے ہوئے زمانہ کی یاد میں کہی گئی ہے، جب عشق اپنے رنگ میں تھا اور پوری غزل مسلسل چل جا رہی ہے۔

۱۔ **شرح :** وہ سے اشارہ اسی گزرے ہوئے زمانہ کی طرف ہے، جس

کی یاد اس غزل میں تازہ کی گئی ہے ۔

وہ دور اب کہاں ، محبوب فراق کو فراق اور وصال کو وصال سمجھتا تھا ،
یعنی جب عشق کا زور تھا ، محبوب سے عذائی تڑپاتی تھی اور اس کا وصال آرزوؤں
اور تمنائوں کے لیے روزِ عید تھا ۔ وہ راتیں ، وہ دن ، وہ مہینے اور وہ سال اب
کہاں ہیں ؟ سب رخصت ہو گئے ۔

۲۔ شرح : اب یہ حالت ہے کہ شوق کے کاروبار اور اس میں مشغولیت
کے لیے فرصت ہی نہیں رہی ۔ محبوب کے جمال سے لذت اندوز ہونے کا ذوق
ہی باقی نہیں رہا ۔

۳۔ شرح : دل کا تذکرہ کیا ، پہلے جیسا دماغ بھی باقی نہیں رہا جس
کے خط و خال دیکھ کر جو بخودی اور دیوانگی طاری ہوتی تھی ، وہ اب کہاں باقی ہے ؟

۴۔ شرح : جب عشق نوروں پر تھا تو خیالات میں رنگینی ، رعنائی اور
شوخی نمایاں تھی ۔ اب وہ حالت کہاں ؟ یہ کیفیت صرف ایک شخص کے قصود پر
موقوف تھی ۔

مولانا طہطائی نے صحیح فرمایا ہے کہ اس شعر میں ”اک شخص“ کا لفظ بہت
بلیغ ہے ۔ اگر اس کی جگہ ”اک شوخ“ کہا ہوتا تو یقیناً محبوب کی تعریف نکلتی ، لیکن
ساتھ ہی ظاہر ہوتا کہ ابھی تک ذوق و شوق باقی ہے ، لیکن یہ مقننہ سے مقام کے
خلاف ہوتا ، کیونکہ یہاں ذوق و شوق کی نفی منظور ہے اور اس کا تقاضا یہی ہے کہ
لگن کی خفیف سی کیفیت بھی باقی نہ رہے ۔

۵۔ شرح : لہو و نا آسان نہ سمجھا جائے ، دل میں طاقت و قوت ہو اور
جگر اپنے اصل حال میں ہو ، یعنی اس میں خون موجود ہو ، اس وقت لہو رو یا جاسکتا
ہے ۔ جب دل و جگر اپنی ہر چیز کھو چکے ہیں تو لہو کیونکر رو یا جائے ۔

اس مقام پر لفظ ”آسان“ نے نظیر ہی کا ایک شعر بے اختیار یاد دلایا :
نیمت آسان بر صفت آتش زدن می نماید گر چہ از پروان خوش

یعنی شعلہ افزہ آگ پر مردانہ وار جاگنا سہل کام نہیں، اگرچہ پروانے کا ہل مرنہ دیکھنے والے کو بڑا اچھا منظر معلوم ہوتا ہے۔

۶۔ لغات - قمار خانہ : جڑا کیلنے کی جگہ۔

شرح : ہم سے عشق کا جڑا گھر چھوٹ گیا۔ وہاں جایش تو ہمارے پاس مال کہاں ہے۔ جو دائرہ پر لگائیں، ہنگامہ نوازوں نے خوب کہا کہ نہ نقد دل پاس ہے نہ داغ ہیں، جو اشتہریوں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ نہ زرد چہرہ ہے، جسے نہ سمجھا جائے اور نہ سبر و شکیب کی دولت ہے۔ عاشق کے لیے یہی مال و متاع ہے، جسے لے کر وہ عشق کے قتل خانے میں بازی لگانے جاتا ہے۔

۷۔ شرح : اب دنیا کی پریشانیوں میں الجھا رہتا ہوں، حالانکہ مجھے اس دہال جاں مشغلے سے کوئی مناسبت نہ تھی۔

۸۔ لغات - مضنعل : کمزور، سست، ضعیف۔
قوی، قوت کی جمع۔

عناصر : عنصر کی جمع یعنی وہ اجزاء جن سے اجسام مرکب ہوتے ہیں۔
شرح : اسے غائب، جسمانی قوتیں ضعیف، کمزور اور سست ہو گئیں

اب اجزائے وجود میں اعتدال باقی نہ رہا۔

اجزائے وجود کا اعتدال قوتوں کے اونچ کمال کا نام ہے۔ یہ اعتدال عموماً اہل شباب میں اعلیٰ پیمانے پر ہوتا ہے، جب شباب گیا، بڑھاپا آیا تو قوتوں کا منصف اعدان کا نام باقی رہ گیا۔

کی دفا ہم سے، تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
شرح : محبوب نے ہم سے وفا کا آغاز کیا تو فیروں اور قیہوں نے وفا کو جفا کا نام دے دیا۔ ان کا مقصد

یہ تھا کہ محبوب کے حبس ہو کر
پر نکلتے چینی کر کے اسے
برگشتہ کر دیں تاکہ وہ دنیا
حرک کر دے۔ عاشق کو یہ
اندیشہ پیدا ہوا تو اس نے
کہا کہ عزیزوں کی نکتہ چینی
کوئی بات نہیں۔ دنیا کے
لوگوں کا دستور ہمیشہ سے
یہی چلا آتا ہے کہ وہ اچھوں
کو برا کہتے ہیں اور نیک
کام کی مذمت کرتے ہیں۔
۲۔ شرح : ہم
نے فیصلہ کر لیا ہے کہ دل
کی پریشانی کا حال محبوب
سے ہمارا کڑا آئیں۔ کہنے
جاتے ہیں، لیکن دیکھیے،
کیا کہتے ہیں۔
دوسرے معرکہ کے
دو مطلب ہیں :

۱۔ ہم دل کی پریشانی
محبوب سے کہنے کے لیے
تھاڑتے تو ہیں، لیکن دیکھیے
جداں باکر کچھ کہا جا سکے گا

آج ہم اپنی پریشانی خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھیے کیا کہتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو بے فائدہ کو، اندوہ رُبا کہتے ہیں
دل میں آجائے ہے، ہوتی ہے جو فرست گئی ہے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں
ہے پرے سرحد اور اک سے اپنا مجھو
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں
پاے افکار پر جب سے تجھے رحم آیا ہے
خارہ کو ترے ہم میسر گیا، کہتے ہیں
اک شرر دل میں ہے، اس سے کوئی گھبرائے گا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو، جو ہوا کہتے ہیں
دیکھیے لاقی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اس کی ہر بات پر ہم نام خدا کہتے ہیں
وحشت و شیفۃ اب مرثیہ کہو یں، شاید
مر گیا غالب آشفتبہ نوا کہتے

یا محبوب کو دیکھ کر ایسی محویت طاری ہو گئی کہ زبان پر کچھ آ ہی نہ سکے گا۔
میر تقی نے کہا ہے :

یہ کہتے، وہ کہتے ہم، متبادل میں جو بار آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں، کچھ بھی نہ کہا جاتا

یعنی جب تک یار سامنے نہ تھا، دل میں یہی کہتے تھے کہ یہ بات بھی اسے سنائیں گے
وہ بات بھی اسے سنائیں گے، لیکن یہ سب کہنے کی باتیں ہیں، وہ سامنے آتا تو کچھ
بھی نہ کہا جاتا۔

۲۔ ہم کہنے جاتے تو ہیں، مگر دیکھیے وہ یعنی محبوب سن کر کیا کہتا ہے۔

۳۔ لغات - اندر وہ رُبا : غم دُور کرنے والا۔

شرح : جو لوگ کہتے ہیں کہ شراب اور گانے سے غم دُور ہو جاتا ہے۔
وہ پرانے زمانے کے بھولے بھالے اور سادہ لوح لوگ ہیں۔ جنہیں اصل حقیقت
سے آگاہی نہیں۔ انہیں کچھ کہنے یا سمجھانے کا کیا فائدہ ہے ؟ وہ اصل حقیقت کا
اندازہ کر ہی نہیں سکتے۔

مطلب یہ ہے کہ شراب اور راگ رنگ غم عشق کو زائل نہیں کر سکتے اور دل
کی لگی نہیں بھگا سکتے، بلکہ ان سے غم اور بڑھتا ہے۔

۴۔ لغات - نالہ رسا : ایسی مزید وفتاں جو مقصد پر پہنچ جائے،

یعنی جس میں تاثیر ہو۔

شرح : میں آہ و فغاں کرتا ہوں اور لوگ کہتے ہیں کہ یہ آہ و فغاں بے اثر
ہے، کیونکہ مقصد پر نہیں پہنچتی، لیکن یہ خیال غلط ہے۔ آہ کہتے ہی مجھ پر غشی طاری
ہو جاتی ہے۔ جب وہ کیفیت دور ہوتی ہے تو پھر نالہ دل میں آ جاتا ہے۔ اب بتاؤ
کہ اگر یہ نہیں تو کون سے تالے کو رسا کہا جاسکتا ہے، جس میں اثر ہو اور جو مقصد کو
پہنچ جائے۔ عاشق محبوب کے طریق سلوک سے اتنا مایوس ہو چکا ہے کہ ہوش آتے
ہی تالے کا دل میں آ جاتا، اس کی رسائی تصور کیے بیٹھتا ہے۔

۵۔ لغات - ادراک : پالنا ، عقل ، سمجھ ۔

سجود : جسے سجدہ کیا جائے ۔

قبلہ نما : ایک آلہ جو قبلے یعنی کعبہ کا رخ بتاتا ہے ، جیسے قلب ناقطب کا رخ بتاتا ہے ۔ یہاں قبلہ نما سے مراد وہ مقام ہے ، جو حقیقی قبلے کی طرف رہنمائی کرتا ہے ۔

شرح : ہم کعبہ کی طرف سجدہ نہیں کرتے ۔ بلکہ سجدہ تو اس وجود حقیقی کی طرف ہے ، جو عقل اور سمجھ کی حدوں سے باہر ہے اور ہمارے ادوی حواس اسے پا نہیں سکتے ۔ جس مقام کو عام اصطلاح میں قبلہ کہا جاتا ہے ، یعنی کعبہ ، اس کے باہر میں تو اہل علم و بصیرت کا قول یہ ہے کہ وہ حقیقی قبلے کی طرف رہنمائی کرنے والا ایک مقام ہے ۔

مولانا طہطائی فرماتے ہیں ، مرزا نے یہاں ،

” اس مسئلے کو نغم کیا ہے کہ کعبہ کی طرف سجدہ کرنے سے کعبے کو سجدہ

کرنا مفسود نہیں ۔ جسے ہم سجدہ گزے ہیں ، وہ حیات سے منزہ ہے ۔

اور سجدے کے لیے محبت مزبور ہے ۔ اس سبب سے محبت کعبہ کو معین کر لیا ہے ۔ وہ محبت بہ منزلہ قبلہ نما ہے ۔

۶۔ لغات : پائے انگار : زخمی پاؤں ۔

بہر گیا : ایک نہایت جس کی خاصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کی جڑ جس

کے پاس ہو ، لوگ اس پر مرہبان ہوتے ہیں اور اس سے محبت کرتے ہیں ۔

شرح : اے صہب! میرے پاؤں تیرے راستے کے کانٹوں سے زخمی

ہو گئے ، انھیں لوبان دیکھتے ہی تجھے رحم آ گیا ۔ ہم نے اسی وقت سے تیرے راستے

کے کانٹوں کو ” بہر گیا “ کہنا شروع کر دیا ، کیونکہ انھیں کی دم سے دم نے تیرے دل

میں جوش مارا ۔

۷۔ شرح : مولانا طہطائی فرماتے ہیں :

”یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ روح حیوانی، جو دل میں ہے، اس کی حرارت سے گھبرا کر انسان کو سانس لینے کی ضرورت ہوتی ہے، بلکہ اصل یہ ہے کہ اور اس کا اشتغال مطلوب ہوتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ ہوا اتنے ضرورتیہ میں داخل ہے (ایسی چھ چیزیں، جن کے بغیر زندگی ممکن نہیں) تاکہ بار بار سانس لینے سے حرارت عزیزی کا اشتغال ہوتا رہے۔ اس مضمون کو مصنف نے تو ایک تفسیرِ شعریت کی طرح نظم کر دیا، لیکن دوسرا خون کا مسئلہ جب سے ثابت ہوا، اس سے ظاہر ہو گیا کہ واقع میں ایسا ہی ہے۔ ہر سانس میں ہوا سے روح حیوانی کو اشتغال مطلوب ہے اور جو ہوا نکلتی ہے، بعینہ واپس ہے، جیسی ہوا چراغ کی کو سے پیدا ہوتی ہے۔ اس شعر سے مصنف کے فلسفیانہ مذاق کا اندازہ ہوتا ہے۔“

ہمارے دل میں عشق یا زندگی کی جو چنگاری ہے، اس سے ہم کیا گھبراہٹیں گے؟ ہم ہوا کے نہیں، آگ کے خواہاں ہیں اور ہوا سے مقصود یہ ہے کہ یہ آگ کو خوب بھڑکا دے، کیونکہ ایک چنگاری سے ہمارے ذوق کی تسکین نہیں ہوتی، ہمیں تو زبردست اشتغال درکار ہے اور وہ ہوا کے بغیر ممکن نہیں۔
شعر کے فلسفیانہ پہلو پر جو روشنی مولانا طہطاہانی نے ڈالی ہے، اس میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں۔

۸۔ لغات - نامِ خدا : دعائیہ کلمہ یعنی ماشاء اللہ چشم بدوود۔
تشریح : ہم محبوب کی بات بات پر نامِ خدا، ماشاء اللہ چشم بدوود کہہ رہے ہیں اور اس کا تکبر بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ دیکھیے، یہ تکبر، یہ غرور آخر کیا رنگ لاتا ہے اور کیا گل کھاتا ہے۔

۹۔ لغات - وحشت : سید غلام علی خاں وحشت۔ دہلی کے ممتاز لوگوں میں سے تھے، والد کا نام سید فرحت اللہ خاں۔ خود وحشت مولانا رشید الدین خاں مرحوم کے داماد تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں بنا بہت خوش بیان تھے۔ شعر کا مذاق

بہت جلد تھا۔ پہلے سرکار انگریزی میں ملازم رہے، پھر اوروں میں فوجیاء ہو گئے۔ بعد ازاں لکھنؤ چلے گئے اور ایک معزز خدمت پر مامور ہوئے۔ ~~خوشنہ~~ کے بعد سرشتہ تعلیم میں شک ہو گئے تھے۔ مصطفیٰ خاں شیفتہ کے ہنایت عزیز دوست تھے۔ غالب سے بھی گہرے تعلقات تھے۔

شیفتہ : نواب مصطفیٰ خاں، اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرت کی تخلص۔

~~خوشنہ~~ : ~~خوشنہ~~ موتی کے بعد غالب سے مشورہ سنبھالتے رہے۔ ہنایت عزیز دوست تھے، جنہوں نے ہر موقع پر غالب کی مدد کی۔

آشفٹہ نوا : جس کی نواؤں سے پریشانی ٹپکتی ہو، درد بھرے نغمے سنانے والا۔

شرح : درد بھرے نغمے سنانے والا۔ غالب دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اب

شاید وحشت اور شیفتہ اس کا مرثیہ کہیں، کیونکہ وہ اس کے ہنایت عزیز دوست تھے۔



۱۔ لغات :

ننگ پیراہن : لباس

کے لیے باعث ننگ عدا

شرح : اس

پھول کی عزت و آبرو کیا

ہر سکتی ہے جو باغ میں

دہو یا کیونکہ پھول باغ

ہی میں بھلے لگتے ہیں،

جہاں لوگ سیر و تفریح

کے لیے جاتے ہیں۔ ال

کے رنگ، خوشبو اور طراوت

سے لطف اٹھاتے ہیں۔

آبرو کیا خاک اُس گل کہ گلشن میں نہیں

ہے گریباں ننگ پیراہن، جو دامن میں نہیں

صنعت سے الے گزریہ! کچھ باقی مرے تن میں نہیں

رنگ ہو کر اڑ گیا، جو خوں کہ دامن میں نہیں

ہو گئے ہیں جمع، اجزائے نگا و آفتاب

فتے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

کیا نکوں تار کی زندانِ غم، اندھیر ہے

چنبہ نورِ صبح سے کم، جس کے روزن میں نہیں

بالکل ہی کیفیت گریبان
کی ہے۔ اگر وہ پھٹ کر
داسن تک پہنچ جائے تو
بھوڑا پائے کہ باس
کے باغ میں ایک پھول
کھلا اور اس نے عزت اکہو
کا مقام حاصل کر لیا۔ اگر
وہ پھٹ کر داسن تک نہیں
پہنچ سکتا تو باس کے لیے
باعث ننگ و عار بن جائے
اور اس کی حیثیت وہی
ہوگی، جو باغ سے باہر
پھول کی ہوتی ہے۔ یعنی
وہ ٹھکانے سے محروم ہو
جاتا ہے۔

شعر میں پہلے گریبان کے
پھٹ کر داسن تک آنے
کو پھول کے کھلنے سے
تشبیہ دی اور کوئی شبہ نہیں
کہ جس لباس کو پارہ پارہ
کر کے داسن تک پہنچا دیا

جائے وہ کھلے ہوئے پھول سے مشابہ ہوگا، کیونکہ اس کی پتیاں بھی کھلنے کے بعد
وہی ہی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ پھر داسن کے گھیرے کو گلشن کے برابر رکھا، جس میں ہلکا

روشنی مبتدی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجن بے شمع ہے، مگر برق خرمن میں نہیں
زخم سلوانے سے، مجھ پر چارہ جوتی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں
بسکہ ہم ہیں اک بہار ناز کے مارے ہوئے
جلوہ گل کے ہوا، گرد اپنے مدفن میں نہیں
قطرہ قطرہ اک ہیوا ہے ننھے ناسور کا
خوں بھی، فودق درد سے، غارِ بھرے تن میں نہیں
لے گئی ساقی کی نخوت، قلزم آسمانی مری
موجئے کی آج رگ، مینا کی گردن میں نہیں
ہو نشانِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش بھرے تن میں نہیں
تھی وطن میں شان کیا، غالب! کہ ہو عزت میں قلند
بے تکلف، ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

گریبان کے پھول کھلے دیتے ہیں۔

۲۔ **شرح :** اسے گریہ اکثر دی نے میرے بدن میں کچھ باقی نہیں چھوڑا۔ جب جسم میں طاقت تھی، میں خون بھی دوتا تھا اور وہ خون آنسو بن کر بھی آنکھوں سے بہتا تھا۔ جب طاقت ہی نہ رہی تو بدنوں کیونکر؟ میرے رونے میں جو خون پہلے بہا تھا اور دامن کو اس نے رنگین کر دیا تھا، وہ بھی رنگ بن کر اڑ گیا۔ غرض مغیبت نے کچھ بھی میرے پاس نہ چھوڑا۔

۳۔ **شرح :** محبوب کے گھر کی دیواروں میں جو روشن دان ہیں، ان میں نور سے نقصان نظر آتے ہیں۔ اصل میں یہ نور سے نہیں، بلکہ سوچ نے اپنی نگاہ کے اجزا پیدا دیے ہیں تاکہ کسی طرح محبوب کے جمال کی ایک عینک دیکھ لے۔

جب سوچ کی کرنیں دیوار کے روشن دان سے گزرتی ہیں تو روشنی میں نہایت چھوٹے چھوٹے فتے رقص کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مرزا نے ان فتوں کو آفتاب کی نگاہ کے اجزاء قرار دیا۔ آفتاب اتنی جرات نہیں کر سکتا تھا کہ نگاہ کو اصل حالت میں روزن سے گزار دے، لہذا اس نے نگاہ کا تجزیہ کیا اور فتے بنا کر اسے روزن میں پہنچا دیا تاکہ وہ براہ راست، دیدار کے الزام سے بری رہے۔

۴۔ **لغات - پنبہ :** پ پر زبر اور پیش سے دونوں طرح مستقل ہے، معنی روئی، روئی کا چھوٹا سا گایا گولا، جو پرانے زمانے میں مینا سے پر بھی دکتے تھے اور کافوں میں رکھنا اب تک رائج ہے۔

شرح : غم کے قید خانے کی تاریکی کا حال کیا بتاؤں؟ اس بلا کا اندھیرا ہے کہ اگر اس کے روزن میں روئی کا چھوٹا سا گولا رکھ دیا جائے تو ایسا معلوم ہو کہ پدیدہ سحر طلوع ہو۔

جب تاریکی انتہا پر پہنچ جائے تو چھوٹی سے چھوٹی سفید شے بھی اس میں روشن داتا بن نظر آتی ہے۔

۵۔ لغات - خانہ ویراں ساز : گھر برباد کر دینے والا۔

شرح : خواہجہ عالی فرماتے ہیں۔

”دنیا میں جو رونق اور چہل پہل ہے، وہ عشق و محبت کی بدولت ہے

خواہ زن و فرزند کی محبت ہو، خواہ مال و دولت کی، خواہ ملک و ملت

کی خواہ کسی اور چیز کی۔ پس اگر خرمین میں برق یعنی دلوں میں محبت

نہیں تو اس کی مثالی اس انجن کی ہے، جس میں شمع کی روشنی نہیں۔“

یقیناً عشق گھر بھی برباد کرتا ہے یعنی انسان کو کسی چیز کی لگن ہو تو وہ اپنے

نفع نقصان کی کوئی پروا نہیں کرتا، لیکن یہی عشق ہے جس سے دنیا کے کاغذات میں

رونق پیدا ہوتی ہے، حتیٰ کہ ہر انسان عقل کی راہ میں جو بھی قدم اٹھاتا ہے، وہ

عشق و محبت ہی کے بل پر اٹھاتا ہے۔ پھر عشق کی قسمیں ہیں اور مقاصد کی بنا پر

اس کے درجے ہیں، مگر اس کے بغیر مستی کی کارگاہ میں رونق ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر

عشق نہ ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ مستی کے خرمین پر بجلی نہیں گری۔ اگر اس خرمین پر بجلی

نہ گری تو یقین کر لینا چاہیے کہ یہ ایک ایسی محفل اور ایسی انجمن ہوگی، جو شمع سے

محروم ہو اور معلوم ہے کہ دنیا کی کوئی انجمن شمع کے بغیر جم ہی نہیں سکتی۔

دیکھیے۔ آٹھ آٹھ لفظوں کے دو مصرعے ہیں لیکن زندگی کی کتنی بڑی حقیقت

انہیں لفظوں میں پیش کر دی اور محفل یہ کہ اس سلسلے میں شاعری کے تمام کمالات

محفوظ رکھے۔ ساتھ ہی ایک حقیقت کے سلسلے میں کئی حقیقتوں کی طرف اشارہ کر دیا

پھر مثال بالکل انوکھی کہ اگر بجلی خرمین میں نہ ہو تو انجن بے شمع رہ جائے گی۔

۶۔ شرح : میں نے زخم سلوا دیے، غیروں نے طعنہ دیا کہ دیکھو کہ یہ عاشق

ہو کر زخموں کا علاج کراٹنے کے درپے ہے، حالانکہ عشق صادق ہو تو وہ چارہ جوئی

کا رداوار ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن غیر حقیقت کو کیا سمجھ سکتے ہیں؟ انہیں یہ خیال ہو

نہیں ہو سکتا کہ زخم سینے کے لیے سوئی سے کام لیا جاتا ہے اور خود سوئی بھی حلہ

مہدیاتی ہے۔ میں ان زخموں کی لذت سے کیونکر محروم رہ سکتا ہوں؟ نیز اس کے

اندازہ شناس نہیں ہو سکتے۔

دیکھیے، چاندہ جوئی میں بھی لذتِ آزار کا پہلو پیدا کر لیا۔

۷۔ شرح : ہم ایسے محبوب پر مرٹے ہیں، جو سراپا ناز و انداز کی بہار ہے، اس لیے ہماری لحد میں جو گردِ نظر آتی ہے، یہ گردِ نہیں، بلکہ پھولوں کا جلوہ ہے اور بہارِ ناز نے ذائقے ذائقے میں پھول ہی کھلا دیئے۔

۸۔ لغات - بیوٹی : وہ مادہ جو بہت کی صورتوں کا محل سمجھا جاتا ہے مثلاً مٹی سے کرپٹے گھوڑا بنایا، پھر اسی مٹی سے ایک پرندہ تیار کر لیا۔ گھوڑے اور پرندے کا بیوٹی وہ مٹی ہے، جس سے یہ بنے۔

ناسور : وہ زخم جو ہمیشہ رستا رہے اور کبھی اچھا نہ ہو۔

شرح : میرے جسم میں جو خون ہے، وہ بھی درد کی لذت میں ڈوبا ہوا ہے اور اس لذت سے اسے فراغت حاصل نہیں۔ دلیل یہ ہے کہ اس خون کی ایک ایک ہونڈ ایک نئے ناسور کا بیوٹی بنی ہوتی ہے۔ گویا جسم کا ایک ایک قطرہ خون ناسور بن جانے والا ہے، جو ہمیشہ رستا رہے گا اور کبھی اچھا نہ ہوگا۔

۹۔ لغات - خوت : تکبر، غرور۔

قلزمِ آشتامی : سمندر پی جانا، یعنی پی جانے کی ہر حد توڑ دینا۔

شرح : ساقی کو اپنی بخشش و عطا پر بڑا غرور تھا، لیکن میں سمندر کے سمندر انڈیل لینے والا بادہ کش آگیا تو ساقی کا تکبر و غرور ختم ہو گیا۔ ثبوت یہ ہے، آج مینا کی گردن میں موجِ شراب کی کوئی رگ نظر نہیں آتی، یعنی صراحیوں شراب سے بالکل خال نظر آتی ہیں۔

ساقی کا دعویٰ یہ تھا کہ میری شراب پینا سہل نہیں، غالب کی بادہ نوشی نے یہ دعویٰ باطل کر دیا۔ دوسرے مصرع میں موج سے کی رگ مینا کی گردن میں نہیں، اس لیے کہا کہ کسی کا غرور ٹوٹ جاتا ہے تو گردن جھک جاتی ہے اور رگ گردن میں اکڑ جاتی نہیں رہتی۔ چونکہ غالب کثرت سے شراب پی گیا، صراحیوں خالی ہو گئیں

گویا ان کی گردنیں موج سے کی رگ سے محروم رہ گئیں۔ اب وہ اکڑ نہیں سکتیں۔

۱۰۔ لغات - فشار : بہر طرف سے بھینچنا، چاروں طرف سے دباؤ۔

شرح : صنعت اور کمزوری نے مجھے چاروں طرف سے اس طرح بھینچ رکھا ہے کہ میرا قد جھک بھی نہیں سکتا، جو ناتوانی کی جیسی علامت ہے۔ اب مزایا، اس فشار میں میں جھک کیونکر سکتا ہوں اور میری ناتوانی دنیا پر آشکارا کیونکر ہو سکتی ہے ؟

۱۱۔ شرح : خواجہ حالی مرحوم فرماتے ہیں :

”اپنے تیش خس یعنی پھوس وغیرہ سے اور وطن کو گلخن سے تشبیہ دی ہے، یعنی جس طرح پھوس گلخن میں ہوتا ہے تو جلتا ہے اور گلخن میں نہیں ہوتا تو اس کی کچھ قدر نہیں ہوتی، یہی حال میرا ہے کہ وطن میں تھا تو جلتا تھا اور اب پردیس میں ہوں تو بے قدر ہوں“

اسے غالب وطن میں میری کون سی شان تھی کہ غربت یعنی مسافری اور دک غیر میں میری قدر ہو؟ میری مثال گھاس پھوس کی اس مُشتی کی ہے، جو گھریا باغ میں ہو تو اسے اٹھا کر ایک طرف پھینک دیتے ہیں، پھر بھٹی میں جلا دیتے ہیں، اپنی گھاس پھوس یا کانٹے بھٹی سے باہر ہوئے تو جب بھی حقیر سمجھے جاتے ہیں اور بھٹی میں جو سے تو جب بھی ان کی منت میں جلتا اور دک اٹھاتا ہی ہے۔

کمال یہ ہے کہ وطن اور غربت دونوں جگہ بے قدری اور تکلیف و اذیت کے لیے مثال ایسی تلاش کی، جو سب کے سامنے ہے مگر کبھی کسی کو سوچھی نہیں۔ یہی غالب کی باغ نظری ہے۔

آخر میں اتنا اور بتا دینا چاہیے کہ یہ مقلع خیالی غربت سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ جب مرزاپنشن کے مقدمے کے لیے حکمت گئے تھے تو یہ غزل ہاندہ کے ایک مشاعرے میں پڑھی گئی تھی۔ گویا اس شعر میں جو کچھ کہا، وہ عالم غربت میں کہا۔ اس کی تصدیق اس دیوان غالب سے ہوتی ہے، جس کا خطی نسخہ حافظ شیرانی مرحوم

نے مزاہم کیا تھا اور اب وہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔ دیوان کے حاشیے پر لکھا ہے کہ یہ غزال ہاندہ میں کسی گئی۔



۱۔ شرح : میں
ناز و اندازِ محبوب کی تلاش
سے عمدہ برآ نہ ہو سکا۔ اگر
اس کی ادا ایک ہوتی تو
میں کر سکتا تھا کہ میرے
لیے قضا کا حکم رکھتی ہے،
لیکن یہاں تو خدا جانے
کتنی ادائیں ہیں ؛ اب میں
ایک ایک کے بارے میں
کیا کہوں ؛ بس یہ سمجھ لیجے
کہ اس ناز و انداز اور غمزہ
ادا کی طرح کے لیے مجھ
میں طاقت ہی نہیں۔

۲۔ لغات۔ نگہ سرمہ سا : سرگس آنکھ کی نظر سرمہ آلود نگاہ۔
شرح : میرے محبوب کی زلف میں جو گرہیں نظر آتی ہیں، ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ وہ گرہیں نہیں، بلکہ کھلی ہوئی آنکھوں کے حلقے ہیں، جن کا رخ دل کی
طرف ہے۔ ان آنکھوں میں زلف کے ہر تار کو ایسی نگاہ کی حیثیت حاصل
ہے، جو سرگس آنکھ سے نکل رہی ہو۔

۳۔ لغات۔ نہ شنیدن : نہ سنا۔

شرح : میرے دل سے لاکھوں آہیں اٹھ رہی ہیں، جو جگر کو چیرھا کر

ٹکڑے ٹکڑے کر سکتی ہیں۔ اسے محبوب ! تیری حالت یہ ہے کہ تو ایک بھی آہ
سننے کے لیے تیار نہیں اور ضد پر اڑا بیٹھا ہے۔ ایسے حالات میں میرے لیے
کچھ کہنے کی کیا گنجائش ہے ؟

۴۔ لغات - منفعل : شرمندہ، منفعل نہ چاہ۔ دراصل "منفعل مخاؤ"
کا اردو ترجمہ ہے اور یہ شعر یقیناً اُسی دور کے ہیں، جب مرزا پر فارسیّت غالب تھی۔
خدا نہ کر دہ : خدا نہ کرے۔

مشرح : اے ظالم محبوب ! میرا گمان تو تجھے بے وفا سمجھا بیٹھا تھا، لیکن
میں نے تیرے حق میں ایسا خیال گوارا نہ کیا۔ اب خدا کے لیے مجھے میرے گمان
سے تو شرمندہ نہ ہونے دے کہ میں بے بس ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاؤں، تو واقعی
بے وفا ہے۔

اس شعر کی لفظی اور معنوی خوبیاں بیان کرنا مشکل ہے۔ مثلاً محبوب کو ظالم
کہ کر خطاب کیا، گویا ایک لفظ میں بتا دیا کہ وہ برابر ظلم کر رہا ہے اور وفا کا اسے
کچھ خیال نہیں۔ پھر فرمایا کہ گمان پہلے ہی یہی کہ رہا تھا لیکن میں گمان کی بات
ماننے کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔ پھر فرمایا کہ اب میں شرمندگی سے دوچار ہو
رہا ہوں، کیونکہ گمان سچا نکلا اور میں جھوٹا ثابت ہوا۔ اس حالت میں وفا کی
دیتے ہیں کہ کچھ سوچ، کچھ خیال کر، ہے ہے ! خدا نہ کرے میں تجھے بیوفا کہوں !



۱۔ شرع : اے محبوب !
تو نے سختی کی، میں دل برداشتہ
ہو کر الگ بیٹھ گیا۔ کیا تو
نے سمجھ لیا کہ میں دوبارہ
تیرے پاس نہیں آ سکتا ؟
یہ بالکل غلط ہے۔ خدا مہربان

مہرباں ہو کے بلا لومجھے، چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
ضعف میں طعنہ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سہ تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

فرایئے اور مجھے بلایے۔ زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو، ستمگر! ورنہ
 بیٹک گزرا ہو وقت وباد کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں
 نہیں آسکتا، لیکن کیا میں گزرا ہو وقت ہوں کہ دوبارہ آ بھی نہ سکوں؟

۲۔ شہرح : بیٹک مجھ پر انتہائی صنعت کاری ہے اور غیر طعنے دے
 رہے ہیں۔ ان طعنوں کی کیا شکایت کروں؟ طعنے محض باتیں ہیں، پھر کیا باتیں
 کوئی سرہیں کہ اٹھا بھی نہ سکوں؟

مطلب یہ کہ خیروں کے طعنے اٹھا سکتا ہوں یعنی برداشت کر سکتا ہوں،
 البتہ مجھ میں صنعت کے باعث سر اٹھانے کی تاب نہیں۔

۳۔ لغات - ملنے کی قسم کھا لینا : ملنے سے انکار کر دینا۔
 شہرح : خواجہ عاتق فرماتے ہیں۔

۔ جب کہا جاتا ہے کہ اس کو فلاں کام کرنے کی قسم ہے تو اس کے
 یہ معنی ہوتے ہیں کہ اس کو اس کام کے کرنے سے انکار ہے۔ پس
 عاشق معشوق کے ملنے کی قسم کیونکر کھا سکتا ہے؟ کہتا ہے کہ زہر
 کچھ تیرے ملنے کی قسم نہیں کہ اس کو کھا نہ سکوں۔ چونکہ وہ ملتا نہیں،
 اس لیے نہیں کھا سکتا۔

اے ظالم! مجھے زہر ملتا ہی کہاں ہے؟ ورنہ کیا وہ تیرے ملنے کی قسم ہے
 جو کھا بھی نہ سکوں؟

ان تینوں شعروں میں افعال ایسے لائے، جن کے دو معنی ہیں، ایک حقیقی
 دوسرے مجازی یعنی ایک از روئے لغت، دوسرے از روئے محاورہ۔ مثلاً
 آنا وقت کا بھی ہو سکتا ہے اور اپنا بھی اٹھانا بات کا بھی ہو سکتا ہے اور سر
 کا بھی، کھانا زہر کا بھی ہو سکتا ہے اور محبوب سے ملنے کی قسم کا بھی۔ اس
 قسم کے اشعار اساتذہ کے دیوانوں میں شاف ہی ملتے ہیں۔

۱۔ لغات : کھل جاؤ :

بے تکلف ہو جاؤ۔

مے پرستی : شراب نوشی۔

شرح : اے محبوب !

کسی روز شراب نوشی کے

وقت ہمارے ساتھ بیٹھ

کر بے تکلف ہو جاؤ، ورنہ

ہم مستی اور مدہوشی کا بہانہ

بنا کر تمہیں چھیڑنے لگیں گے

اس طرح چھیڑ کر وہی

کیفیت پیدا کر دیں گے،

جو بے تکلفی میں ہمارے

پیش نظر ہے۔ اگر کچھ

کہو گے یا اعتراض کرو گے

تو ہم کڑ دیں گے کہ صبا !

شراب پی لی تھی، جوش و حواس قائم نہیں تھے۔ ارادے کی باگ ڈور بے اختیار

کے حواسے ہو گئی تھی۔ اگر کوئی ایسی ویسی حرکت سرزد ہو گئی تو سمجھ لو کہ جلا ارادہ

ہو گئی اور مستی میں انسان کو اپنے آپ پر قابو نہیں رہ سکتا۔

۲۔ لغات : عثرۃ : غرۃ : غرور، گھمنڈ، ناز، فخر۔
بنا : بنیاد۔

عالم اسکان : ملکات کی دنیا یعنی یہ کائنات جو بہر حال فنا ہو جائے گی۔

دنیا۔

شرح : اس دنیا کی بنیاد کے بلند ہونے پر غرور بہرگز ذیبا نہیں، کیونکہ

ہم سے کھل جاؤ بد وقت مے پرستی، ایک دن

ورنہ ہم چھیڑیں گے، رکھ کر غرور مستی، ایک دن

عثرۃ اور بچ بنائے عالم اسکان نہ ہو

اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی، ایک دن

قرض کی پتی تھے مے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں

رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی، ایک دن

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل ! غنیمت جانیے

بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ مہستی، ایک دن

و حول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں

ہم ہی کر بیٹھے تھے، غالب ! پیش دستی، ایک دن

اس بلندی کی قسمت میں ایک دن پستی ملتی ہے ۔

مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن یہ کائنات تہل تہل ہوجائے گی۔ اس کی بلند عمارتیں، عایشان قصر، وسیع اور فرحت افزا باغ، غرض جو کچھ اس میں غرور کا باعث ہو سکتا ہے، وہ سب مٹ جائے گا۔ پھر اس پر غرور و ناز کی کون سی وجہ ہے ؟

۳۔ لغات ۔ نفاقہ مستی : اس کے دو معنی ہیں، اول نفاقہ و سنگدستی میں بھی مست رہنا اور تنگی کو محسوس نہ کرنا، دوم تنگی کی یاد جو قمرن کے شراب چٹا اور مست رہنا۔

شرح : ہم قمرن کی شراب پیتے تھے، لیکن اس حقیقت سے خوب آگاہ تھے کہ یہ ہماری نفاقہ مستی ایک دن لازماً رنگ لائے گی اور غرور کُل بھلائے گی۔ ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ مرزا غالب پر قمرن کے سلسلے میں دھوئی دار ہوا۔ مقدمہ مفتی صدر الدین آزاد نے سنا ابو صدر الصدور تھے۔ مرزا کے بیان کی باری آئی تو یہی شعر پڑھ دیا۔ صدر الصدور شعر سن کر مسکرائے۔ ڈگری غالب کے خلاف کردی اور قمرن کا روپیہ اپنی جیب سے دے دیا۔

۳۱، قفے کے سلسلے میں یہ تفریح کر دینی چاہیے کہ اگر ایسا ہوا تو کوئی چھوٹے سے قمرن کا مقدمہ ہوگا، کیونکہ مرزا پر قمرن کی جو بڑی رقمیں واجب تھیں، وہ انھوں نے خود ہی ادا کیں۔

۴۔ شرح : اے دل ! اگر مسرت و شادمانی کے نغمے سننا ہمارے مقدمہ میں نہیں تو غم ہی کے نغموں کو غنیمت سمجھو، کیونکہ آخرِ مہتی کا یہ ساز ایک دن بے آواز رہ جائے گا اور اس سے مسرت و شادمانی ہی نہیں، غم کے نغمے بھی نکلنے بند ہوجائیں گے۔

بلاشبہ ایک زمانے کے بعد ذرا صحت باقی رہے گی، ذرا بچ، نہ زندگی کے ساز سے نشاط کے نغمے بلند ہوں گے، نہ درد کے۔ اگر ایک چیز نہیں ملتی، تو

دوسری ہی تھی۔

دوسری جگہ مرزا نے اس سے ملتا ہوتا شعر کہا ہے۔

ایک ہنگامے پر موقوف ہے گھر کی رونق

نومذغم ہی تھی، نغمہ شادی نہ تھی

ایکس واضح ہو کہ زیرِ غور شعر میں نومذغم ہائے غم نہیں، نغمہ ہائے غم ہی کہا، یعنی

دونوں اصلاً نغمے ہیں۔ ایک مستحکم پیدا کرتا ہے، دوسرا غم۔ پھر یہاں گھر کی رونق

پیش نظر نہ تھی، بلکہ سازِ ہستی کا بے صدا ہو جانا پیش نظر تھا۔ لہذا جو کچھ بھی نصیب

ہو، اسی کو غنیمت سمجھنا ضروری ہو گیا۔

۵۔ شرح : اے غالب ! میرے سراپا نازِ محبوب کا طریقہ تو یہ نہیں کہ

دھول دھپتے سے کام لے اور زود کو بنگ ٹوٹ پھٹ جائے، نصیبت یہ پیش آئی

کہ ہمیں سے ایک روز دستِ درازی میں پہل ہو گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا اب اُسے

برداشت ہی کرنا ہو گا، شکوہ شکایت سے کچھ نہیں بن سکتا۔



ہم پر جفا سے، ترکِ وفا کا لگاں نہیں

اک چھپر ہے، وگرنہ مراد امتحاں نہیں

کس منہ سے شکر کیجیے، اس لطفِ خاص کا

پڑ سسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہم کو ستمِ عزیز، ستمِ گر کو مسمِ عزیز

نا مہرباں نہیں ہے، اگر مہرباں نہیں

۱۔ شرح : محبوب

ہم پر جفا کر رہا ہے تو اس

کا مطلب یہ ہے کہ اسے

جہاں سے سچے عشق پر پورا

بھروسہ ہے اور خیال بھی

نہیں ہو سکتا کہ ہم کسی صورت

میں وفا چھوڑ دیں گے اور اس

سے رشتہ توڑ لیں گے۔ اسی

یقین نے اسے بے پروا بنا

بوسہ نہیں، نہ دیکھیے، دشنام ہی سہی
 آخر دباں تو رکھتے ہو تم، گرداں نہیں
 ہر چند جاگد اذی قہر و عتاب ہے
 ہر چند پشت گرمی تاب و تواں نہیں
 جاں، مطرب ترانہ کھل، من مزیں ہے
 لب، پردہ پنج زمزمہ، الا ماں نہیں
 خنجر سے چیر سینہ، اگر دل نہ ہو دو نیم
 دل میں چھری چھجو، مژہ گر خوں چکاں نہیں
 ہے ننگ سینہ دل، اگر آتش کدہ نہ ہو
 ہے عارِ دل نفس، اگر آذر فشاں نہیں
 نقصان نہیں، جنوں میں، بلا سے ہو گھر خراب
 سو گز زمیں کے بدلے، بیاباں گراں نہیں
 کہتے ہو؟ کیا نکلا ہے تری سرِ نوشت میں؟
 گویا جیس پہ سجدہ بُت کا نشان نہیں
 پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
 رُوح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

دیا ہے۔ جفا کا مطلب یہ بھی
 نہیں کہ ہمارا امتحان مقصود
 ہے، یعنی محبوب یہ بھی نہیں
 چاہتا کہ ہمارے عشق کے
 غلوں کی آزمائش کرے۔
 سبب دلوں چیزیں ختم ہو
 گئیں، یعنی نہ ہم پر ترک و نا
 کا لگان ہے اور نہ امتحان
 مقصود ہے تو کھا ہر ہے کہ
 جو بھی جفا وہ کر رہا ہے وہ
 محض ایک پیٹھ ہے، ایک
 محبوبانہ اداس ہے اور یہ بھی
 مبالغہ ان چیزوں کے ہے،
 جن پر ہم فریفتہ و دما ہیں۔
 ۲۔ لغات -

پائے سخن درمیاں نہیں:
 بات کا پاؤں درمیان نہیں
 یعنی بات کوئی نہیں کی منہ
 سے کچھ نہیں کہا۔

شرح: محبوب
 کے اس خاص لطف و نوازش
 کا شکر ادا کرنے کے لیے منہ
 کہاں سے لاؤں؟ مجھ میں

جاں ہے بہاے بوسہ دے کیوں کہے، ابھی اور اُنے شکر کی مجال اور بہت کہاں ہے بہ لطف و نوازش یہ کہ اشاروں اور اداؤں سے حال پوچھ رہے ہیں، لیکن مجھ سے کچھ نہیں کہا، بات کوئی نہیں۔

۳۔ لطف خاص: اس لیے کہا کہ حال پوچھنے کا یہ طریقہ محبوب نے صرف شاعر کے لیے مخصوص رکھا، اوروں کے تعلق میں اس سے کام نہیں لیا۔

۴۔ شرح: ہم اپنی ایذا دوستی کے باعث محبوب کے جو دوستم کو پسند کرتے ہیں۔ اس کے برعکس محبوب ہمیں عزیز رکھتا ہے اور جو دوستم اس پیمانے پر نہیں کرتا کہ ہمارا وجود ہی ختم ہو جائے، اس لیے ظاہر ہے کہ اگر وہ ہم پہ ہر بات نہیں تو ناہریان بھی نہیں۔

شعر بہت سہل اور واضح ہے، مثالیں بھی مل جائیں گی کہ شاعروں نے لفظوں کے الٹ پھیر سے بڑے اچھے شعر کہے ہیں، لیکن ایسے شعر کی مثالیں بہت کم نظر آئیں گی کہ صرف دو لفظوں پر پورا مضمون قائم ہے، یعنی ”ستم“ اور ”مریان“، زیادہ سے زیادہ ایک لفظ ”عزیز“ اور شامل کر لیجیے ”جو حقیقت ہمارے شعر نہیں، بلکہ مضمون شعر کا لازمہ ہے۔“

۴۔ شرح: دہن کی تنگی لوازمِ حُسن میں سے ہے، اگر شاعروں نے مبالغہ کرتے کرتے محبوب کے دہن کو ایک لفظ ”موجوم“ بنا دیا، بلکہ معدومیت تک پہنچا دیا، مرزا نے بھی اس شعر میں شاعروں کے اسی تعود سے کام لیا ہے، کہتے ہیں کہ اے محبوب: بوسہ دے دینے کا بہانہ تو یہ ہو گیا کہ ہمارا منہ ہے نہیں، جو بوسہ دیں۔ لیکن بوسہ نہیں دیتے تو گالی ہی دیجیے، کیونکہ آپ کا منہ معدوم ہے تو زبان تو موجود ہے، اس سے تو کام لیا جاسکتا ہے۔

۵۔ ۶۔ لغات: پشت گرمی: یاوری، درد، تقویت، بہارا، ساتھ۔

مغرب: گانے والا۔

بل من مزید : قرآن مجید کی ایک آیت کا ٹکڑا جس کے معنی ہیں : کیا کچھ اور بھی ہے ؟ یہ ٹکڑا اسودۃ ق سے ہے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔

وَقَوْلٍ لِّمَنْ يَحْمِلُهُ الْعُلَمَاءُ
وَقَوْلٍ لِّمَنْ يَحْمِلُهُ الْعُلَمَاءُ
کیا تو سہر گئی ؟ اور وہ کہے گی : کیا کچھ اور بھی ہے پتہ

پروہ سنج : ساز کے پروے سے کام لینے والا یعنی نغز دل ، تو اگر ۔

الامان : پناہ ۔ رحم ۔

شرح : اگرچہ محبوب کا غضب اور غصہ جان گھٹائے جا رہا ہے ۔ مگر چہ طاقت و قوت ساتھ دینے اور مہار اٹھایا کرنے کے لیے تیار نہیں ، پھر میں جان بل من مزید کا ترانہ گارہی ہے یعنی چاہتی ہے کہ غضب اور غصہ اور زیادہ ہو اور مجھے مزید شدت سے ان کا تختہ مشق بنایا جائے ۔ ساتھ ہی لب کی یہ حالت ہے کہ اس پر پناہ یا رحم کا زمزمہ کبھی نہیں آیا ۔

مطلب یہ کہ جان گھٹی جا رہی ہے ، جسم کی طاقت جو اب دے چکی ہے ، لیکن عشق مزید قہر و عقاب کا غلبہ گارہے ۔ لب شدت اور سختی سے پناہ مانگنے کے لیے تیار نہیں ۔

۷۔ لغات ۔ دو نیم ۔ دو ٹکڑے ۔

شرح : اگر تیرا دل عشق و محبت میں دو ٹکڑے نہ ہو ، تو تجھے چاہیے کہ خنجر سے سینہ چیرے ۔ اگر چلوں سے خون نہیں ٹپکتا تو ضروری ہے کہ دل میں چھری چبھو دے ۔

دل اسی طرح پارہ پارہ ہو سکتا ہے کہ سینہ خنجر سے چیر دیا جائے اور آنکھوں

سے اردو میں جہنم اور دوزخ ذکر استعمال ہوتے ہیں : عربی میں جہنم مؤنث ہے ، لہذا ترجمے میں قرآن مجید ہی کی پیروی کی گئی ۔

سے اسو اسی وقت ٹپکے گا، جب چھری چھوٹنے سے دل خون ہو جائے گا، لیکن مرزا غالب کا مطلب یہ نہیں کہ وہ قہراً ایسا کیا جائے، مطلب صرف یہ ہے کہ دل کو بحال دو پارہ اور پیکوں کو سہر حال خوشچکان ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہو تو سینہ اس قابل ہے کہ اسے خنجر سے چیر دیا جائے اور دل اس لائق ہے کہ اس میں چھری چھو دی جائے یہ حقیقت اگلے شعر سے بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

۸۔ لغات۔ آتشکد سے : آتش کا گھر۔ آتش پرستوں کا عبادت خانہ،

جہاں ہر وقت آگ جلتی رہتی ہے۔

آذر فشاں : آگ جھارنے اور برسانے والا۔

شرح : جو دل آتش عشق سے سراپا آتش کدہ بن جائے، وہ سینے کے لیے باعث ننگ ہے اور جو سانس آگ نہ آگئے، وہ دل کے لیے عار اور شرم کا موجب ہے۔

۹۔ شرح : دیوانگی کی حالت میں گھر خراب ہوتا ہے تو ہونے دو،

میں بیابان کے پکڑ لگاؤں گا تو گھر کی دیکھ بھال کرنے والا کون ہوگا ؟ اس حالت میں وہ اچھڑتا ہے تو اچھڑ جائے۔ اس میں میرا کیا نقصان ہے ؟ گھر کی نہ میں زیادہ سے زیادہ سو گز ہوگی۔ اس کے بدلے میں مجھے بیابان ملتا ہے، جس کی وسعت اور پیمائی کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

ظاہر ہے کہ مرزا نے گھر اور بیابان کا موازنہ کرتے وقت صرف رقبہ پیش نظر رکھا اور اندازہ بیان ایسا اختیار کیا کہ پڑھنے والے کو کسی دوسری چیز کا احساس ہی نہیں ہو سکتا۔ یہی شاعر کا کمال ہے، ورنہ گھر اور بیابان کے موازنے کی یہ کوئی اچھی صورت قطعاً نہیں۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ اگر ویرانی میں ددازں کیساں ہوں تو تزیج کا فیصلہ دست رقبہ ہی کی بنا پر کیا جائے گا۔

۱۰۔ لغات۔ سر نوشت : تقدیر، قسمت، خط پیشانی یعنی پیش آنے والے

حالات کی غیبی تحریر۔ مقدر۔

شرح : اسے محبوب باتم پوچھتے ہو کہ تیری قسمت میں کیا کچھ لکھا ہے ؟
مقام حیرت ہے کہ تمہیں میری پیشانی پر بہت کے سجدے کا نشان نظر نہیں آیا !
اپنے محبوب کو سجدے کرتے کرتے میرے ماتھے پر تو گنا پڑ گیا اور پوچھتے ہو کہ
تیرے خط پیشانی میں کیا کچھ لکھا ہے ؟ حالانکہ ماتھے کا نشان خود میرا خط پیشانی
اور میری تقدیر واضح کر رہا ہے اور اسی پر مجھے ناز ہے ۔

۱۱۔ لغات ۔ روح القدس : حضرت جبریلؑ ۔

شرح : اگر یہ جبریلؑ میرا ہم زبان نہیں ، یعنی جو زبان مجھے ملے ہے وہ
اسے نہیں ملی ، لیکن اس سے اپنے کلام کی کچھ داو پاتا ہوں ، یعنی وہ پورا تو نہیں
کچھ کچھ میرا کلام سمجھتا ہے ۔

مطلب یہ کہ میرے شعر سرا سرا ہمائی ہیں ، مگر ہندوستان کی وسیع سرزمین
میں ان کے سمجھنے اور داو دینے والے کہاں ملتے ہیں ، صرف روح الامیت سے
کچھ داو پاتا ہوں ۔

خدا بہ حالی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ہمزبان کے لفظ میں ایہام بخلاہری
معنی تو یہی ہیں کہ انسان اور فرشتے کی زبان ایک نہیں ہو سکتی ، ورنہ اس میں
یہ اشارہ ہے کہ جیسی فصیح میری زبان ہے ، ویسی روح القدس کی نہیں ۔

۱۲۔ لغات ۔ بہا : قیمت ، معاوضہ ۔

شرح : بیشک محبوب نے بوسے کی قیمت جان رکھ دی ہے ، یعنی بوسے
کے عوض میں وہ جان طلب کرتا ہے ، لیکن ابھی اس کے اعلان کے لیے تیار
نہیں اور کیوں اعلان کرے ، جب جانتا ہے کہ ابھی غالب نیم جاں نہیں ہوا ۔

حاصل یہ ہے کہ جب پوری جان بوسے کی قیمت شہری تو غالب فوراً ادا
کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا ، حالانکہ محبوب کی مرضی یہ نہیں ، چنانچہ وہ انتظار
میں بیٹھا ہے کہ غالب عشق کی سختیاں سہ سہ کر نیم جاں ہو جائے ۔ اس وقت پکار
کر کہو گے گا کہ اب جان دے کر بوسہ لیا جاسکتا ہے اور غالب نیم جانی کے باعث

مقررہ قیمت ادا کر سکے گا اور نہ بوسے کا حق دار بنے گا۔

○ مایع دشت نوروی کوئی تدبیر نہیں

ایک چکر ہے برے پاؤں میں، زنجیر نہیں

شوق اُس دشت میں دوڑے ہے مجھ کو کہ جلا

جادو غیر از نگہ ویدہ تصویر نہیں

حسرت لذت آزار رہی جاتی ہے

جادو راہ و فنا، جز دمِ شبمیر نہیں

سرخِ نومیڈی جاوید! گوارا رہو

خوش ہوں، مگر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

سر کھاتا ہے، جہاں زخمِ سراچھا ہو جائے

لذتِ سنگ، بہ اندازہٴ تقریر نہیں

جب کرمِ رخصت ہے باکی و گستاخی سے

کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

غائب اپنا یہ عقیدہ ہے بد قولِ ناسخ

آپ بے برہ ہے جو معتد میر نہیں

۱۔ لغات۔ دشت نوروی:

بیابان کی خاک چھانتا، جھل جھل
پھرتا، صحرا گردی۔

چکر: پھرنے کی کثرت، گردش

کا عادتِ ثانیہ بن جاتا۔

مشرح: مجھے کوئی تدبیر

صحرا و بیابان کی خاک چھاننے

سے روکنے والی نہیں۔ دیوانے

کو زنجیر میں اس لیے پھنسی جاتی

ہیں کہ وہ جا بجا پھرنے سکے۔ گویا

یہ ایک تدبیر ہوتی ہے، جو

اسے صحرا گردی سے روک دیتی

ہے، لیکن جس شخص کے پاؤں

کی زنجیر خود ایک پکر بن جائے

اسے زنجیر یا ایسی ہی کوئی دوسری

تدبیر کیونکر روک سکتی ہے،

جو شخص سہرقت پھرتا ہے،

اس کے متعلق کہتے ہیں کہ اس

کے پاؤں میں پکر ہے۔ جس شخص

کے پاؤں میں زنجیر پکر بن جائے

یعنی گردش سے روکنے والی چیز

خود گردش میں جاتے، اسے کون روک سکتا ہے ؟

۲۔ شرح : عشق مجھے اس صحرا میں دوڑا رہا ہے، جہاں کوئی راستہ ہے تو صرف ایک اور وہ تصویر کی آنکھ کی نگاہ ہے، گویا بالکل موحوم ہے۔

بجنوری مرحوم اس شعر پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”دشتِ وفا میں عشق کی تلک و دو کا انجام موت ہے۔ اس بحرِ سراب کا کوئی ساحل نہیں، کوئی جادو نہیں، جس سے مسافر جان سلامت لے جائے۔ راہِ عدم کو مرزا کمالی شاعری سے یوں بیان کرتے ہیں کہ صرف ایک راستہ ہے اور وہ نگہِ دیدہ تصویر ہے۔ یعنی کوئی راستہ نہیں۔ عدم کو وجود کے لباس میں کیا خوب جلوہ گر کیا ؟“

۳۔ شرح : خواجہ مآقی فرماتے ہیں :

”جادو یعنی بیٹا (پگنڈی)، کو دمِ شمشیر سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ عشق کے آزار و تکلیف میں جو لذت ہے۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس لذت سے خوب دل کھول کر متنع ہوں، مگر چونکہ وفا کی راہ سراسر تلوار کی دھار پر ہے، اس لیے پہلے ہی قدم پر موت نظر آتی ہے۔ پس افسوس ہے کہ لذتِ آزار کی حسرت دل کی دل ہی میں رہی جاتی ہے۔“

تلوار کی دھار پر جو بھی قدم رکھتے گا، وہ یقیناً کٹ مرے گا اور وفا کا راستہ تلوار کی دھار کے سوا کوئی ہے بھی نہیں، اس لیے ظاہر ہے کہ عاشق دکھ اٹھانے اور ایذا سہنے کی جس لذت کے رسیا میں، تلوار کی دھار پر چلنے سے وہ پوری موتی نظر نہیں آتی، لہذا صورتِ حال یہ ہے کہ نہ وفا کو چھوڑ سکتے ہیں نہ دمِ شمشیر پر چلنے میں متاثر ہو سکتے ہیں، نہ دکھ کی لذت بہ قدرِ فوق حاصل کر سکتے ہیں اس لذت کی حسرت دل ہی میں رہی جاتی ہے۔

سم۔ لغات۔ زبونی : بے بسی، لاچارگی، وقت۔ عاجزی، زبونی کش

کے معنی میں وقت اٹھانے والا۔

شرح : اسے ہمیشہ کی مایوسی اور نامرادی کے رنج ! مجھے تو ہی خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ خدا کرے تو ہی مجھے نصیب رہے۔ میں اس بات پر خوش ہوں کہ میری آمد و رفتوں نے تاثیر کی وقت ڈاٹھائی۔

ہمیشہ کی مایوسی کا رنج گوارا کر لیا، مگر تاثیر کا احسان ڈاٹھایا۔

۵۔ لغات۔ بہ اندازہ تقریر : وہ بات جو تقریر میں نہ سہا سکے۔

جس کی حقیقت کا اظہار لفظوں سے متبادر ہو، یعنی لفظوں میں بیان نہ کیا جاسکے۔

شرح : سر کا زخم اچھا ہو جاتا ہے تو سر کھانے لگتا ہے، یعنی اسے پھر یہی آند و پیدا ہوتی ہے کہ پھر دہرائے جائیں اور وہ از سر نو زخموں سے بھڑ ہو جائے۔ پھر کھانے میں ایسی لذت ہے کہ اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا، تقریر کا لباس نہیں پہنایا جاسکتا۔

سر کھاتا ہے۔ میں خونی کا ایک پہو یہ بھی ہے کہ جب زخم اچھا ہو جاتا ہے اور کھرنڈ بن جاتا ہے تو مقام زخم پر کھلی شروع ہو جاتی ہے۔ اس کھلی کو عام لوگ زخم کے اندھاں کی دلیل سمجھتے ہیں۔

۶۔ لغات۔ خجلیت : شرمندگی۔

شرح : جب محبوب کا لطف و کرم بیباکی و گستاخی کی اجازت دے دے تو سمجھ لیتا چاہیے کہ کوتاہی پر شرمساری کے سوا اور کوئی کوتاہی نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جب محبوب نے ازراہ کرم اجازت دے دی کہ تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو، کر لو تو جو بھی اس اجازت سے فائدہ اٹھانے میں توقف کر لیا وہ گنہگار ہو گا، کیونکہ اس نے محبوب کے کرم سے فائدہ نہ اٹھایا۔

شعر میں دراصل اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ اصل شے محبوب کی رضا اور خواہش ہے۔ گناہ وہی ہے، جو محبوب کی رضا کے خلاف ہو۔ جن اُمید کو اس

نے اذراہ لطف و نوازش گن جوں سے خارج کر دیا، ان کا نہ کرنا یقیناً گناہ سمجھا جانا چاہیئے۔

۷۔ **تشریح :** اے غالب! ناسخ کے قول کے مطابق ہمارا بھی یہ عقیدہ ہے کہ جو شخص میر تقی میر سے عقیدت نہیں رکھتا، وہ دراصل خود شاعری سے بے بہرہ ہے۔ یعنی میر سے عقیدت ہر شخص کے لیے لازم ہے۔

نسخہ حمید یہ میں اس شعر کا پہلا مصرع یوں بھی ہے۔

رہنختے کا وہ ظوری ہے یہ قول ناسخ

اس زمین میں ایک اور شعر بھی غالب سے منسوب ہے، یعنی :

میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب !

جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

۱۔ **لغات :**
مردمک دیدہ : آنکھ
کی پتلی ۔
سُویدا : دل کا
سیاہ نقطہ ۔

تشریح : یہ نہ سمجھیے کہ آنکھ کی پتلی میں نگاہیں موجود ہیں، یہ کیسے کہ آنکھ کے دل میں جو ایک سیاہ نقطہ موجود ہے، اس میں آپن جمع ہو گئی ہیں۔
یہ کوہ کندن دکاہ بر آردون کی عجیب مثال ہے۔ پہلے آنکھ کی پتلی کو آنکھ کا دل قرار دیا، پھر نگاہوں کو اس دل کے سیاہ نقطے میں آہن کیا۔

برشکالی گریٹ عاشق ہے، دیکھا چاہیے
 کھل گئی مانند گل، سو جا سے دیوار چمن
 لغات - برشکال :
 برکھارت - برسات -
 شرح : عاشق کی آنکھوں
 نے جو جھڑی لگا رکھی ہے
 دیکھیے، وہ کیا رنگ لائے،
 باغ کی دیوار سو جگہ ہے پھول
 سر وہ ہے باد صدف آزادی گرفتار چمن
 کی مانند کھل گئی ہے۔

مولانا طباطبائی کی یہ رائے خاص توجہ کی مستحق ہے کہ ہے "کی جگہ اصل میں ندیا
 "بھی" کا لفظ تھا۔ کاتب نے غلطی سے "بھی" کی جگہ ہے " بنا دیا۔ یعنی عام برساتیں
 تو دیکھ چکے۔ اب ذرا ودیۃ عاشق کی برکھارت بھی دیکھیے اور اندازہ کیجیے کہ یہ کیا
 رنگ لائے گی۔

دوسرے مصرع میں لفظ "گل" اور "کھل" دونوں طرح معنی دیتا ہے۔ دیوار سے
 مناسبت کھل جانے یعنی پھٹ جانے یا شکاف ہو جانے کو ہے اور پھول سے تشبیہ
 کا تقاضا یہ ہے کہ اسے "کھل" پڑھا جائے، معنی دونوں صورتوں میں ایک ہے۔
 شعر کا معنوم بظاہر یہ ہے کہ ودیۃ عاشق کی جس برسات نے دیوار چمن کو پھول
 کی مانند سو جگہ سے کھلا دیا، اس نے چمن میں خدا جانے کیا گل کھلائے ہوں۔

۲۔ لغات - وار شگی : آزادی۔

شرح : خواہجہ عالی فرماتے ہیں :

"مطلب یہ ہے کہ کوئی کیسا ہی آزاد اور ستم مزاج ہو، دنیا میں عشق و محبت
 کے پھندے سے نہیں چھوٹ سکتا۔"

پھول کی محبت سے آزادی حاصل کرنے اور چھٹکارا پانے کا دعویٰ بالکل
 غلط ہے۔ سرود کو دیکھیے اسے آزاد کہا جاتا ہے، لیکن آزادی کے باوجود وہ باغ
 میں قید ہے۔ گویا باغ کے دائم محبت میں گرفتار ہے۔

صحیح ہے کہ زندگی میں انسان دنیوی مصلحت سے چپکلا نہیں پاسکتا۔ اس کے مزاج میں کتنی بے پروائی اور بے نیازی ہو، لیکن اس کا رشتہ محبت دنیا سے بہر حال قائم رہے گا۔

مزن صرف درجوں کا ہوتا ہے۔ کسی کی گرفتاری کا درجہ بہت بڑھ جاتا ہے اور کسی کا کم رہتا ہے۔ کوئی ان بدشعوروں میں سر نہ پا جکڑا جاتا ہے، کسی کو نسبتِ عزت حاصل ہوتی ہے، مگر کامل آزادی کا دعویٰ صحیح نہیں سمجھا جاسکتا۔

عشق تا شیر سے فوسید نہیں	جاں سپاری شجر بید نہیں
سلطنت دست بہ دست آئی ہے	جاہم سے، خاتمِ حبشید نہیں
ہے تجلی تری سبامِ وجود	دترہ بے پروا نورِ شید نہیں
رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے	ور نہ مر جانے میں کچھ بید نہیں
گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے	عجب محرومی جاوید نہیں
کہتے ہیں، جیتے ہیں اُمید پہ لوگ	بہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

۱۔ لغات۔ جاں سپاری : جان سوچ، دنیا، یعنی جانِ قربان کر دنیا، جانِ فانی، جانتازی۔

شجر بید : بید کا درخت۔ بید میں کوئی پھل نہیں لگتا، اس لیے اسے بے ثمر درخت کہا جاتا ہے۔ چونکہ شر کے معنوں کو اس پہلو سے خاص تعلق ہے، اس لیے تصریح ضروری ہوئی۔

شرح : عشق تا شیر سے ناامید نہیں ہو سکتا، یہ لازم ہے کہ وہ مراد پر پہنچے

اور کامیابی حاصل کرے۔ جان پر کھیل جانا اور زندگی سے ہاتھ دھو لینا بید کا درست نہیں کہ اسے کوئی پھل نہ ملے اور بالکل بے ثمر دے نتیجہ ہے۔

بجنوری مرحوم فرماتے ہیں کہ مرزا غالب نے افلاطون کے اس و سقراط کی طرح ذہرباب کو ہڈیے نریش پر ترجیح دی۔ غالب کا علم الافلاک جاس سپاری ہے اور :

جاں سپاری شجر بید نہیں

مرزا نے اس شعر میں ایک بہت بڑی حقیقت واضح کی ہے۔ اس دنیا میں جتنے بھی کام جوئے جو رہے ہیں یا آئندہ ہوں گے، ان کی تہ میں عشق کا مرزا ہے۔ لوگ ہواؤں کی بند ترین چوٹیوں پر پہنچے، انہوں نے اتنا ہمنہ کنگال ڈالے، بڑا عظم آباد کر دیے، سمراؤں کو گلزار بنا دیا، قطبین کے راز معلوم کر لیے۔ ایک دوسرے سے جڑ کر حیرت انگیز ایما دیں کرتے کرتے انہوں نے زمین کا اندوہ بھی دیکھ لیا۔ اب ستاروں کی طرف اڑے جا رہے ہیں۔ ان میں سے کون سا کار نامہ ہے، جو عشق یعنی ایک خاص مگن کے بغیر انجام پایا اور مگن بھی ایسی کہ ایک کے بعد ایک پشت ہا پشت تک ایک کام کی دھن میں مصروف رہا، یہاں تک کہ کئی پشتوں کے بعد راز ملا اور منزل مقصود تک رسائی نصیب ہوئی۔ اگر عشق تاثیر سے نا اُمید ہو جاتا اور جا بنا زمی و جانفشانی چھوڑ دیتا تو یہ سب کچھ کیونکر بروئے کار آتا؟ انسان کسی مقصد کے لیے جان دینے پر آمادہ ہو جائے تو وہ یقیناً حصول مقصد میں ناکام نہ رہے گا۔ اور انسانی سب کوشش کی صورت ایک تسلسلے کی ہے۔ ہر انسان قدم بہ قدم آگے بڑھتا جاتا ہے۔ جہاں ایک کی زندگی ختم ہوتی ہے، دوسرا اس کا کام سنبھال لیتا ہے۔ اسی طرح منزل مقصود سامنے آ جاتی ہے۔ یہ بہت بڑی حقیقت ہے، جو آٹھ دس مفقود میں مرزا غالب نے پیش کر دی۔

اس شعر کی عاقبت ہر کمال حقیقت کا یہ حال ہے کہ اس عشق بھری و عشق بھری

علم و حکمت، سیاست و ملک داری، ایجاد و اکتشاف سب پر یکساں چسپاں کر سکتے ہیں۔

۲۔ لغات۔ جمشید : ایران کا بادشاہ، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے سب سے پہلے شراب بنائی۔

خاتم : وہ انگشتری، جس پر مالک کا نام کندہ ہو۔
سلطنت سے اشارہ جام سے کی طرف ہے۔

شرح : جام سے کی حیثیت ایک سلطنت کی ہے اور یہ سلطنت باقیوں ہاتھ پکڑ کھاتی ہوئی چلی آرہی ہے۔ آج ایک کے پاس ہے اور کل دوسرے کے پاس، ہم کیوں سمجھیں کہ جام سے جمشید کی انگشتری ہے، جس پر اس کا نام کندہ تھا اور وہ اسی کے بے مخصوص تھی۔ یہاں تخصیص کی کوئی وجہ نہیں۔ کسی زمانے میں جمشید اس سلطنت کا مالک تھا، آج ہم مالک ہیں۔

۳۔ شرح : اسے مالک حقیقی، تیری ہی جلوہ نماائی سے وجود کو سرد سامان نصیب ہوا، یعنی کائنات وجود میں آئی۔ بے شک اس کی حیثیت ایک ذرے کی ہے، لیکن کوئی ذرہ سورج کے جلوے کے بغیر تب و تاب کا حامل نہیں ہو سکتا۔

۴۔ شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

”بھید کے معنی پوشیدہ بات کے ہیں، خواہ پوشیدہ مصلحت ہو اور خواہ پوشیدہ قباحت ہو، یہاں پوشیدہ قباحت مراد ہے۔ اگر مر جانے کی جگہ نہ مرنے کا لفظ ہوتا تو بھید کے معنی پوشیدہ مصلحت کے ہو جاتے۔“

مطلب یہ ہے کہ میرے مر جانے میں کوئی پوشیدہ قباحت موجود نہیں صرف یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ اس طرح کہیں محبوب کا راز فاش نہ ہو جائے اور اس کی رسوائی نہ ہو۔ یعنی لوگ یہ نہ کہیں کہ دیکھو اس شخص کے مر جانے کا باعث

فلان یعنی محبوب ہے۔ اس طرح مجھے اس سے جو عشق ہے، وہ سب پر کھل جائے گا۔ یہ تو محبوب کی رسوائی ہوئی۔ خود مجھے لوگ یہ طعنے دیں گے کہ دیکھو عشق کا مدعی تھا اور اس کی کڑیاں سبھ نہ سکا۔ یہ طعنے میرے علاوہ محبوب کے لیے عزت کا باعث نہ ہوں گے۔ اگر ان قباحتوں کا ڈر نہ ہوتا تو میرے لیے سر جانا کون سا مشکل کام تھا؟ میں تو موت کا خیر مقدم کرتا، کیونکہ عزتوں اور مصیبتوں سے نجات مل جاتی۔ لیکن کروں کیا، راز محبوب کے کھل جانے کا خوف پریشان کر رہا ہے۔

۵۔ شرح : ڈر ہے تو یہ کہ عیش و نشاط کا عالم بدل جائے گا۔ یہ گردش کی نذر ہو جائے گا اور ہمیشہ باقی نہیں رہ سکتا، لہذا میں عیش و نشاط کا خواہاں ہی نہیں، کیونکہ جو چیز آج ہے اور کل نہیں ہوگی، اسے لے کر کیا خوشی ہو سکتی ہے اور وہ حاصل بھی ہو جائے تو بہر لحظہ اس کے بدل جانے اور ختم ہو جانے کا دغدغہ لگا رہے گا، اس وجہ سے عیش و نشاط حاصل ہونے کی حالت میں بھی اطمینان سے فائدہ نہ اٹھایا جاسکے گا۔ اس کے برعکس ہمیشہ کی محرومی کا کوئی غم ہی نہیں، کیونکہ برابر ایک حالت قائم رہے گی اور اس میں تبدیلی کا کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔

مرزا نے یہ مضمون ایک فارسی شعر میں بھی نہایت عمدہ طریق پر باندھا ہے۔

زینہ از تعب آتش جاوید مترس

خوش بہار مسیت کز دیم خزاں بر خیزد

یعنی ہمیشہ کے لیے آگ میں جلنے کی سزا اٹھانے کا اندیشہ ہو تو خوفزدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس بہار کی اچھائی میں کسے کلام ہو سکتا ہے، جس پر کبھی خزاں نہ آئے۔

۶۔ شرح : مشورہ ہے کہ لوگ اُمید پر جیتے ہیں، دنیا پر اُمید قائم، گویا اُمید جینے کا سہارا ہے۔ لیکن یہاں خود زندگی ہی معرضِ خطر میں ہے۔ یعنی جو چیز

کے لیے امید سہارا بھی مل سکتی ہے، وہ چیز ہی بھتی نظر نہیں آتی تو ہمارے لیے امید کیونکر نکلیے گا۔ گاہ بن سکتی ہے۔ خواہ حالی نے بالکل درست فرمایا ہے :
 "یہ شعر سہل مستح ہے"۔ مین اتنا سہل ہے کہ بظاہر معلوم ہو، ایسا کہ
 لینا کچھ مشکل نہیں۔ مگر جب کوئی کہنے بیٹھے تو کڑکے۔ یقیناً اس زمین
 میں اس سے بہتر شعر نکالنا مشکل ہے۔

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں
 دل آشفٹاں خالی کنج دہن کے سودیا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں
 توڑے سروِ قیامت اک قدرِ آدم قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
 تماشا کر، اے محو آئینہ داری تجھے کس تناسل سے ہم دیکھتے ہیں
 سراغِ قلبِ نالہ لے داغِ دل سے کہ شبِ رُود کا نقش قدم دیکھتے ہیں
 بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب تماشا لے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

۱۔ لغات۔ خیاباں : پھولوں کی کھادی، باغ کی روش، تختہ محل۔
 فارسی کے کسی لفظ کی تکرار کثرت کے معنی دیتی ہے، یعنی خیابان خیابان کے
 معنی ہیں، بکثرت تختہ ہائے گل۔

اِرم : ایک قدم شہر کا نام، جو شداد سے منسوب تھا اور وہیں اس کا شہر
 آفاق باغ بنایا جاتا تھا۔ اب یہ لفظ مطلق بہشت کے معنی میں مستعمل ہے۔

شرح : اے محبوب! جہاں کہیں ہم چھڑے پاؤں کے نقش دیکھتے ہیں،
 ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ ہر طرف بہشت کی کھادیاں پھیلی ہوئی ہیں، جن میں کثرت

سے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ یعنی مرزا نے محبوب کے نقش قدم کو بہشت کی امین کیاری سے تشبیہ دی، جس کا دامن پھولوں سے مبرا ہوا ہو۔

۲۔ لغات۔ دل آشفگان : آشفۃ دل، وہ لوگ جن کے دل بہت سے پریشان ہوں، عشان۔

غالب کچھ دہن : وہ تہی جو دہن کے کسی ایک سرے پر ہو۔
 شرح : شعر کا پورا مضمون شاعروں کے اس مبالغہ آمیز تصور پر مبنی ہے کہ محبوب کا دہن تنگی کے سبب معدوم ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ جو لوگ تیرے دہن کے سرے کے تہی کی محبت میں دل کھو بیٹھے ہیں، وہ اپنے دل کے سیاہ لفظوں میں عدم کی سیر کرتے ہیں۔

جو نگہ دہن ناپید ہے، اس لیے اسے عدم قرار دیا۔ تہی کو سوید اسے مناسبت ہے۔ لہذا سوید میں بیٹھ کر عدم کی سیر ہو رہی ہے۔

۳۔ شرح : خواجہ عاتق مزارتے ہیں :

”اس کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ تیرے سردقامت سے قدرتی قیامت کتر

ہے۔ دوسرے یہ معنی بھی ہیں کہ تیرا قد اسی میں سے بنایا گیا ہے،

اس لیے وہ ایک قد آدم کم ہو گیا :“

قامت، قیامت، سردا، قد، قننہ وغیرہ الفاظ کی مناسبت ظاہر ہے۔ دیکھیے چھوٹی سی بھر کے شعر میں بھی دو معنی پیدا کر لیے اور کم سے کم لفظوں میں بھی شعر کہتے نصف پہلو دار بنا دیا۔ یہ کمالات عجز و فکر اور ریاضت سے حاصل نہیں کیے۔

یہ اس کی دین ہے، جسے پند و گار دے

۴۔ لغات۔ آئینہ دار سی : آئینہ سامنے رکھنا۔ شعر میں اس کا مفہوم

یہ ہے کہ آئینہ سامنے رکھ کر اس میں عکس ہو جاتا۔

شرح : اسے آئینہ سامنے رکھ کر اپنے حسن و جمال میں عکس ہو جانے والے

عکسوں پر اندازہ بھی تو دیکھ کہ ہم تجھے کس ذوق و شوق سے دیکھ رہے ہیں۔

اس شعر میں ایک خاص منظر پیش کیا ہے۔ جب تک اسے پیش نظر نہ رکھ لیا جائے، شعر کی معنویت واضح نہیں ہو سکتی۔ محبوب آئینہ رکھ کر اپنے جمال میں محو ہے۔ عاشق بار بار چاہتا ہے کہ محبوب کی نظر اُس کی طرف اٹھے، مگر محبوب پر بدستور محویت کا عالم طاری ہے۔ آخر پریشان ہو کر عاشق پکار اٹھتا ہے کہ اے اپنے حسن و جمال میں محو جانے والے! ذرا ہمیں بھی نگاہِ مہطف سے شاد کام کر دیکھ، ہم کس آرزو اور کس محویت سے تجھے دیکھ رہے ہیں؟ محض اس لیے کہ تیری نگاہِ مہطف اُٹھے گی تو ہماری آرزوؤں کے چین میں تازگی و نشاطِابی کی بہار آ جائے گی۔

۵۔ لغات - ثقبِ نالہ : آہ و فغاں ۔

شبِ رُخ : رات کو چلنے والا۔ یہ لفظ عموماً پتھر کے لیے مستعمل ہے اور یہاں بھی اس سے چمڑی مراد ہے۔

شرح : اگر تو ہماری آہ و فغاں کی گرمی اور پیش کا کھوج لگانا چاہتا ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ ہمارا داغِ دل دیکھ، کیونکہ عام قاعدہ ہے، چور کا کھوج لگانا جو تو اس کے پاؤں کے نشان دیکھتے ہیں۔ گویا دل کا داغ ہماری گرم آہ و فغاں کا ایک نقشِ پا ہے۔

نالے کو شبِ رُخ اس لیے کہا کہ آہ و فغاں عموماً رات ہی کو کی جاتی ہے۔

۶۔ شرح : اے غائب! ہم نے اہلِ کرم کے خوف اور شانِ کرم کا اندازہ کرنے کے لیے فقروں کا بھیس بنایا ہے۔ ہمیں انگٹنے کی ضرورت نہ تھی، درویشی اختیار کر لینے پر مجبور نہ تھے، محض اس لیے درویشی کا بھیس بدل لیا کہ دیکھیں، اہلِ کرم کی داود و دمش کا کیا حال ہے؟ وہ فقروں سے کیا برتاؤ کرتے ہیں؟ ان کے دینے کا اندازہ ایسا ہے کہ انھیں واقعی اہلِ کرم میں شمار کیا جائے؟

اہلِ کرم کی حقیقی حیثیت کا اندازہ کرنے کے علاوہ شعر کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگرچہ ہم محتاج نہ تھے، لیکن محض اس لیے درویشی اختیار کر لی کہ میں اہلِ کرم

کا انداز بہت پیارا معلوم ہوتا ہے۔ اس نے ہمارا دل بھال لیا اور ہم فقیر بن گئے۔
شعر میں "تاشا" یہ معنی "سیر" ہے۔

۱۔ لغات - التهاب :

اشتعال، شعلوں کا بھڑک اٹھنا۔

شرح : مجھے دوزخ میں

ڈال دیا گیا، جہاں ہر طرف آگ

بھڑک رہی ہے اور آگ کا رے

دک رہے ہیں۔ یہ اشتعال

میرے محبوب کی طبیعت و عادت

سے ملتا جلتا ہے۔ اس لیے

مجھے جتنا عذاب ہوتا ہے، اتنی

ہی راحت نصیب ہوتی ہے

کیونکہ میں اپنے آگ بھڑک کا محبوب

کے غیظ و غضب کا مادی پلا

آتا ہوں۔ اگر اس عذاب میں

راحت نہ ملے تو سمجھ لینا چاہیے

کہ میرا ایمان جاتا رہا اور میں

کافر ہو گیا۔

۲۔ شرح : میں کیا بناؤں

کہ اس جہاںِ خراب میں کب سے

مقیم ہوں ؟ اگر ہجر کی باتوں

کو بھی حساب میں شامل کروں۔

بلتی ہے خوشے یا رے تار، التهاب میں

کافر ہوں، اگر نہ بلتی ہو راحت عذاب میں

کب سے ہوں ؟ کیا تباؤں ؟ جہاںِ خراب میں

شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گہ حساب میں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عُمر بھر

آنے کا حمد کر گئے، آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھوں

میں جانتا ہوں، جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام

ساقی نے کچھ علائقہ دیا ہو شراب میں

جو منکر و قفا ہو، فریب اس پہ کیا چلے

کیوں بدگماں ہوں دوست و دشمن کے باب میں

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے

ڈالا ہے تم کو وہم نے کس بیچ و تاب میں

میں اور خط و وصل، خدا ساز بات ہے
 جاں نذر دینی بھول گیا، اضطراب میں
 ہے تیر سی چڑھی ہوئی، اندر نقاب کے
 ہے اک شکن پڑی ہوئی، طرف نقاب میں
 لاکھوں لگاؤ، ایک چراتانگہ کا
 لاکھوں بناؤ، ایک بگڑتا عتاب میں
 وہ نالہ دل میں شمس کے برابر جگہ نہ پائے
 جس نالے سے شکات پڑے آفتاب میں
 وہ سحر، دعا طلبی میں نہ کام آئے
 جس، سحر سے سفینہ رواں ہو سرباب میں
 غالب چھٹی شراب، پر اب بھی کبھی کبھی
 پیتا ہوں روز ابرو شب مابستاب میں

خود رازی میں اپنی مثال آپ
 ہوئی ہیں تو میرے لیے اس دنیا
 میں رہنے کا اندازہ ممکن ہی نہیں
 یہ معاملہ حساب میں آ ہی نہیں سکتا
 اند کوئی وقت معین ہو ہی نہیں
 سکتا۔

اس شعر میں مرزا نے شہانے
 بھر کی دوازی کا معنوں بالکل
 اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔
 اس سلسلے میں دو شعر پیش
 کیے جاتے ہیں، جنہیں مرزا کے
 اس شعر کا ناخذ قرار دیا جاتا
 ہے۔ اول امیر خسرو کا شعر:
 ذہے عمر دراز عاشقان گر
 شب بھراں حساب عمر گیرند
 یعنی وہ عاشقوں کی عمر
 کتنی دوازی ہے، بشرطیکہ بھر کد اتنی
 بھی عمر میں شمار کی جائیں۔

دوم کمال اصفہانی کا شعر:

ذخیرہ عمر فزون است عشقاں را

اگر ز عمر شمارند روز بھراں را

عاشقوں کی عمر خضر سے بھی بڑھ جائے، اگر وہ بھر کے دنوں کو بھی عمر میں شمار

کر لیں۔

امیر خسرو کے شعر میں ہجر کی راتوں کا ذکر یقیناً ہے، مگر سارا انداز عاشقوں کی اندازِ ہجر پر ہے۔ کمالِ اصغریٰ کے شعر میں ”روزِ ہجر“ لکھا، حالانکہ مقام کا اقتضا ”شبِ ہجر“ تھا۔ ہجرتِ عینِ کردیا کہ عاشقوں کی عمرِ خسرو سے بڑھی ہوئی ہے۔

ملا وہ بریں دونوں شعروں میں شہرتِ جس درجے کی ہے، اس کے متعلق کچھ کہنا غیر منطوقی ہے۔ ان دونوں کے برعکس مرزا نے پہلے مصرع میں دو ابہام پیدا کیے، اولیٰ یہ کہ ”کب سے ہوں“ دوسرا یہ کہ کیا ”تاؤں“ اور دنیا کو تہاں خراب کیا۔ خواہ اس لیے کہ یہ ہے ہی خراب، خواہ اس لیے کہ مرزا کو ہجو و مزاق کے مصائب کے باعث یہ جہاں سازگار نہ ہوا۔ دو ابہام اس امر کے گواہ ہیں کہ جہانے ہجراں کو حساب میں شامل کر لینے کے بعد نہ کوئی مدت، نہ کسی رسائی میں آتی ہے اور نہ اس کے متعلق کوئی سچا بات زبان پر لائی جاسکتی ہے۔ ہجر، حیثیتِ معمولی شہرتِ کمال پر پہنچا دی۔

اگر مزمن بھی کر دیا جائے کہ مرزا نے اصل معنی امیر خسرو ابی کمالِ اصغریٰ سے لیا تو اس میں کیا کلام ہے کہ اسے ایسے انداز میں پیش کیا، جو اس کا حق ہے ساتھ ہی واضح ہو گیا کہ امیر خسرو اور کمالِ اصغریٰ اصل معنی پر پہنچ جانے کے باوجود اس کے بیان کا حق ادا نہ کر سکے۔

۲۔ شرح : میں محبوب کا انتظار کرنے کرتے سو گیا، لیکن اس شوخ کو میرا سونا پسند نہ آیا۔ چنانچہ خراب میں آیا اور وعدہ کر گیا کہ میں آؤں گا۔ یوں اس کا مقصد یہ تھا کہ اسی انتظار میں میری عمر گزر جائے۔ نہ وہ وعدہ پورا کرے اور نہ مجھے فائدہ آئے۔

مولانا عبدالمطلبانی فرماتے ہیں کہ شعر میں مرزا نے ”وہ“ کا لفظ ترک کیا۔ اس ترک سے یہ لطیف معنی پیدا ہوئے، جیسے ہم سب جانتے ہیں کہ اس کے سوا کسی کا ذکر نہیں کرتے یا یوں سمجھو، جیسے دل سے محبوب کی باتیں کرتے کرتے یہ بات زبان سے نکل گئی اور ضمیر دل ہی میں رہ گئی۔

۴۔ شرح : خواجہ عاتق فرماتے ہیں :

وہ سرے مصرع میں ہر طور طنز کے کتا ہے کہ جو کچھ وہ جواب میں لکھیں گے۔ مجھے معلوم ہے، یعنی وہ کچھ نہیں لکھنے کے، اس لیے قاصد کے واپس آنے سے پہلے ایک اور خط لکھ رکھوں :-

شعر کا مطلب صاف ہے، یعنی میں جانتا ہوں کہ وہ جواب میں کچھ نہیں لکھیں گے۔ پھر قاصد کے واپس آتے آتے کیوں نہ ایک اور خط لکھ رکھوں ؟

بعض اصحاب نے اس شعر کا آغاز مرزا ابیدل کا مندرجہ ذیل شعر قرار دیا ہے :

آئینہ جواب نامہ عاشقِ تغافل است

بیہودہ انتظارِ خبری کشیم

یعنی محبوب کے ہاں عاشق کے خط کا جواب تغافل کے سوا کچھ نہیں نکلا ہے کہ ہم خواہ مخواہ خبر کا انتظار کر رہے ہیں۔

مرزا ابیدل کا شعر اچھا ہو یا بُرا، لیکن اسے غائب کے شعرے کوئی تعلق نہیں۔ بیدل نے صرف یہ کہا کہ محبوب کا ہمیشہ ہی تغافل ہے، وہ عاشق کے خط کا جواب کچھ نہ دے گا اور تغافل برتے گا۔ لہذا ہمدی طرف سے کسی خبر کا انتظار فضول ہے۔ غائب کے ہاں مضمون بتاتا ہے کہ ضرور ہے، لیکن انھوں نے خود لکھنا ضروری سمجھا۔ اگرچہ ہاتھ ہی انھیں علم ہے کہ محبوب کچھ جواب نہ دے گا۔ خواہ اس کی وجہ یہ ہو جو غائب نے خود ایک جگہ بیان کی۔

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخ مکتوب
مگر ستمزدہ ہوں فوقِ خامہ فرسا کا۔

خواہ یہ ہو کہ :

خط لکھیں گے۔ اگرچہ مطلب کچھ نہ ہو

ہم تو عاشق ہیں توہارے نام کے

مولانا طہطائی فرماتے ہیں کہ یہ شعر بہت بلیغ ہے۔ معالمتِ عشق میں اپنا

صاحب تجربہ اور معشوق کا مزاج دان ہونا اور مشوق کا بد عہد و حیلہ ٹو ہونا، یہ سب معنی اس سے سمجھ میں آتے ہیں۔

۵۔ شرح : خواہجہ جاتی فرماتے ہیں :

”اس شعر میں پہلے مصرع کے بعد اتنا جملہ محذوف ہے، ”پھر آج جو خلافِ عادتِ جام کی نوبت مجھ تک پہنچی ہے“ اس سذت نے شعر کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے۔ ایسا حذف جس پر قرینہ دلالت کرتا ہو اور جو الفاظ محذوف کیے گئے ہیں، وہ بغیر ذکر کیے دونوں مصرعوں میں ہوں رہے ہوں، محضات شعر میں شمار کیا جاتا ہے۔“

خود مرزا غالب تفتہ کو لکھتے ہیں۔

”اب جو دردِ مجھ تک آیا ہے تو میں ”ڈرتا ہوں“ یہ پورا جملہ محذوف ہے میراثاری دیوان جو دیکھے گا جانے گا کہ جملے کے جملے مقدّم چھوڑ جاتا ہوں۔“

محبوب کی بزم میں پہلے تو دردِ جام کہی نہیں آیا تھا، یعنی مجھے شراب نہیں چلائی گئی تھی۔ پھر آج جو خلافِ عادتِ مجھ پر نوازش ہوئی ہے کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ ساقی یعنی محبوب نے شراب میں کچھ ملا دیا ہو؟

مرزا نے خود نہیں بتایا کہ کیا ملا دیا؟ صرف اتنا کہا کہ ”کچھ ملا دیا ہو“ یہاں ہنلا سہر قمر نے زہر کا ہے، لیکن قرائن کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ جس شے کی آمیزش تصور میں آنے اور ہی مزمن کر لیجیے۔

۶۔ شعر میں دوست سے مراد محبوب ہے اور دشمن سے مراد رقیب۔

شرح : محبوب و وفا کا منکر ہے۔ نہ خود اس نے کسی سے وفا کی اور نہ دوسروں کی وفا کا کہیں اسے یقین ہوا۔ اگر اس نے رقیب سے میل جول شروع کر دیا ہے تو میرے لیے جگمگانی کی کوئی وجہ نہیں۔ جب میں باتا ہوں کہ وہ کسی کا بھی ہو کہ نہیں وہ سکتا اور اسے کوئی فریب نہیں دے سکتا تو میرے لیے رقیب سے اس کا

کامیل جمل پریشانی کا باعث کیوں ہوا اور میں کیوں یہ خیال کروں کہ رقیب نے اسے
دام فریب میں الجھایا ہے ؟

کہاں یہ ہے کہ مرزا کے نزدیک رقیب کے پاس فریب کے سوا اور کوئی
تدبیر ہے ہی نہیں، لیکن جو محبوب وفا کا منکر ہے، اس پر کسی کا فریب کیونکر کارگر
ہو سکتا ہے ؟

۷۔ شرح : مجھ پر تو وصل میں اس لیے اضطراب طاری ہے کہ کہیں رقیب
اس موقع پر نہ آ جائے اور رنگ میں جھٹک نہ پڑ جائے۔ تمہیں کس وہم نصیبی و جاہ
میں ڈال رکھا ہے ؟

عاشق اس لیے پریشان ہے کہ بڑی مشکل سے محبوب کے ساتھ ملاقات کا
موقع ملنے آیا ہے۔ اگر اس موقع پر رقیب آ گیا تو لطف صحبت برباد ہو جائے گا۔
محبوب یہ سمجھتا ہے کہ عاشق نے کسی اور سے رشہ محبت استوار کر رکھا ہے اس
لیے اس پر گھبراہٹ طاری ہے۔ عاشق اسے محبوب کا وہ ہم قرار دے کر حقیقت
واضح کر رہا ہے تاکہ جس بیچ و تاب میں وہ مبتلا ہے، وہ نہ اٹل ہو جائے۔

۸۔ لغات : خدا ساز : خدا کا بنایا ہوا کام، خدا کی دی ہوئی نعمت،
خدا داد۔

شرح : میرے نصیب ایسے کہاں کہ وصل کا حقد حاصل ہوتا ہے تو
خدا کا بنایا ہوا کام تھا، اس کی عطا کی ہوئی نعمت تھی۔ اس خوشی میں شادی مرگ
ہو جاتا بعد نہ تھا، مگر مجھ پر ایسی گھبراہٹ اور حیرت طاری ہوئی کہ جان بہ طور
نذر پیش کرنا بھول گیا۔

ملاقات کے یہ دقیق پہلو اس حسن و خوبی اور اس قادر الکلامی سے بے تکلف
پیش کر دینا مرزا غالب پر غم ہے۔ وصل کی خدا ساز نعمت و شادی مرگ کی قربت
کیوں نہ آئی ؟ صورت اس لیے کہ لمحہ پر اتنے بٹکے، غیر معمولی اور سراسر غیر متوقع
واقعات سے حیرت طاری ہو گئی اور اس عالم میں جان کی نذر دینا بھول گیا۔

۹۔ شرح : عاشق محبوب کے دیدار سے فیض یاب ہونے کا مشتاق ہے لیکن محبوب نے عاشق کو دیکھتے ہی غصے سے تیزی چڑھائی اور چتون پر بل ڈال دیے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نقاب کے گوشے میں ٹسکن چڑ گئی۔ یہ دیکھتے ہی عاشق پر محبوب کا عتاب واضح ہو گیا اور اس نے سمجھ لیا کہ دیدار کی تتر بتر آنے کا کوئی امکان نہیں۔ محبوب کے عتاب کی شان ملاحظہ فرمائیے کہ اس کی چتون کا بل نقاب میں ٹسکن ہو کر ابھرا یا۔

۱۰۔ شرح : عوام برحالی فرماتے ہیں :

۔ یہاں لگاؤ سے مراد لگاوٹ ہے۔ یعنی معشوق کا عاشق کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا جس سے اس کا اتفاق اور میلان طبع پایا جائے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ دوست کی لاکھوں لگاوٹیں ایک طرف۔ اس کے لاکھوں بناؤ سنگار ایک طرف اور عتاب میں لگڑنا ایک طرف۔ یہ شعر میں سہل متنع ہے۔ اگر الفاظ کی طرف دیکھیے تو تعجب ہوتا ہے کہ کیونکر ایسے دو ہم تہ مصرعے ہم پہنچ گئے، جن میں حسن ترصیع کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے اور اگر معنی پر نظر کیجیے تو ہر ایک مصرع میں ایک ایسا معاملہ بندھا گیا ہے، جو فی الواقع عاشق و معشوق کے درمیان گزرتا رہتا ہے۔ معشوق کی لگاوٹ عاشق کے لیے بہت بڑی چیز ہے، مگر اس کا آنکھ چرانا، جو لگاوٹ کی تدبیر ہے، عاشق کی نظر میں لگاوٹ سے بہت زیادہ و لغزب و دلآویز ہوتا ہے۔ اسی طرح بناؤ سنگار سے معشوق کا حسن بیشک دو بالا ہو جاتا ہے، مگر اس کا غصے میں لگڑنا اس کے بناؤ سے بہت زیادہ خوش نما اور دلربا معلوم ہوتا ہے۔ اس شعر کے متعلق یہ سب ظاہری اور اوپری باتیں ہیں جو ہم دیکھ رہے ہیں۔ اس کی اصل خوبی و جدائی ہے جس کو صاحب ذوق کے ہوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

مولانا مباحثائی فرماتے ہیں : جملوں کی ترکیب میں تماشل اور لفظوں کی نشست میں حسن تقابل کی مثالیں شاذ ملتی ہیں۔ اردو میں یہ شعر بھی اس تماشل و تقابل کی نہایت نادر مثال ہے۔

۱۱ - لغات - مدعا طلبی : مقصد حاصل کرنا مطلب برآری۔
سفینہ : کشتی۔

شرح : جس فغاں سے آفتاب میں شگاف پڑ جائے وہ محبوب کے دل میں خس کے برابر بھی نہیں سمجھی جاتی، یعنی اس کی حیثیت ہیچ ہے، کیونکہ خس یعنی تنکا بالکل بے حقیقت شے ہے۔

وہ بادو مقصد حاصل کرنے میں کچھ کام نہیں دے سکتا، جس کے دگر سے سراب میں کشتی چلائی جاسکے۔

مطلب یہ ہے کہ جن تہیروں کو زور اور تاثیر کے اعتبار سے غیر معمولی حیثیت حاصل ہے۔ مثلاً مزایہ و فغاں آفتاب میں شگاف پیدا کر دیتی ہے، حالانکہ یہ ہلکا پھلکا غیر ممکن ہے اور سراب میں کشتی چلائی جاسکتی ہے، حالانکہ اس کا بھی کوئی امکان نہیں، ایسی پُر زور اور پُر تاثیر تدبیریں بھی نہ محبوب کے دل پر کوئی اثر رکھتی ہیں۔ نہ ان سے مطلب برآری کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔

۱۲ - شرح : اے غالب ! شراب تو چھوٹ گئی، اس کا بالاتزام مینا تو ختم کر دیا، لیکن اب بھی کبھی پی لیتا ہوں۔ پینے کے دو موقعے ہیں۔ دن کے وقت جب ابر چھایا ہو اور ترشح ہو رہا ہو۔ رات کو جب چاندنی چھلکی ہوئی ہو۔

باول اور برسات کے موقع پر پینے کا ذکر غالب کی زبان سے پہلے ہی آ

چکا ہے، یعنی :

بہارِ بہند بود برشکال ہاں غالب !
دیں خزاں کرہ ہم موسمِ شرابِ بہت

شب و شب کے سلسلے میں فرماتے ہیں :

پتی جس قدر نے شب و شب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گزری ہی راس ہے

نیز :

کوئی کہے کہ شب و شب میں کیا برائی ہے
بلا سے آج اگر دن کو ابرو باد نہیں

مقطع میں شراب چھوڑنے کا جواز کر ہے ، وہ محض سخن گستری ہے ، کیونکہ مرثیہ کی زندگی میں انوائے شراب کا مستند واقعہ صرف ایک ہے ، یعنی ۲۲۔ جون نگہ سے ۱۰۔ جولائی تک ۱۹۶۶ء تک ، جیسا کہ ملائی کے نام ایک مکتوب سے واضح ہے ۔ یہ دو غزل بظاہر ششماں کا ہے ، کیونکہ اس زمین میں موت کی جہنی ایک غزل ہے اور فراق کے بھی چند شعر ہیں ۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ یہ سب ایک طرحی شاعر سے کا کلام ہے ۔ مومن کا انتقال مئی ۱۹۶۶ء میں ہوا اور یہ دو غزل اس سے پیشتر کا ہونا چاہیے ۔ گویا مقطع میں کسی واقعے کی طرف اشارہ نہیں ، محض سخن طرازی کی گئی ہے ۔

لغات : نخست : پہلے

کنجوسی ۔

سو بوطن : غیر شایاں گان ۔

شرح : خواجہ عاکی فرماتے

ہیں :

آج اقل نموت سے شراب

ددی کہ کل نہ لے گی ، ساتی کوثر

کی فیاضی پر سو بوطن کرتا ہے ۔

کل کے لیے کر آج نہ نخست شراب میں

یہ سو بوطن ہے ساتی کوثر کے باب میں

ہیں آج کیوں ذلیل ؟ کہ کل تک نہ تھی پسند

گستاخی فرشتہ ہمدانی جناب میں

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دم سماع

گر وہ صدا سناٹی ہے چنگ و رہاب میں

زو میں ہے ریش عمر کہاں دیکھیے تھے
 نے ہاتھ باگ پر ہے، شپا ہے رکاب میں
 آتا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے لُبت ہے۔
 جتنا کہ دہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں
 اصل شود و شاید و مشہود ایک ہے
 حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
 ہے مشتعل نمود نمود پر و نمود بحسب
 یاں کیا دھرا ہے قطرہ دموج و حباب میں
 شرم اک اداے ناز ہے، اپنے ہی سے ہی
 میں کتنے بے حجاب کہ میں یوں حجاب میں
 آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
 پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
 ہے غیب غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
 میں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں
 غالب! ندیم دوست سے آتی ہے بوے دست
 مشغول حق ہوں بندگی بو تراب میں

کل کے نیسے کے دور
 مطلب ہو سکتے ہیں، ایک
 مدد قیامت کے لیے، دھرا
 مدد آئندہ یعنی نروا کے لیے۔
 پہلے مضمون کے مطابق شعر کا
 مطلب یہ ہے کہ مدد قیامت
 کے خیال سے مشروب پائے ہیں
 بخل ذکر۔ عوام کا عقیدہ ہے
 کہ جو لوگ یہاں شراب سے
 پرہیز کریں گے، انہیں قیامت
 کے دن حضرت ساقی کو گڑ شراب
 طور پر پائیں گے۔ مرزا کہتے ہیں
 کہ ساقی کو گڑ کی نیا منی عام ہے
 اس میں کسی کے لیے کام کی
 گنجائش نہیں۔ یہ اس پاکیزگی
 کے متعلق غیر شاہان گمان ہے
 کہ وہ کسی کو اپنی عام نیا منی
 سے محروم رکھنا گوارا نہ کریں گے۔
 اس مضمون کے مطابق
 لفظ خست یعنی بخل کا مطلب
 کیا ہو گا؟ آیا بخل سے مراد
 یہ ہے کہ پانے والوں کو
 کہ نہیں پلا تا، تنہا تنہا

دیتا ہے۔ یا اس سے چلانے کی مطلق نفی مراد ہے؟

دوسرا مضمون یہ ہو سکتا ہے کہ مرزا نے اپنے داروغے سے شراب مانگی، جسے بقول معانی تاکید کر دی گئی تھی کہ نشے کی حالت میں دیا وہ شراب مانگوں تو ہرگز نہ دینا۔ داروغے نے غدر کر دیا کہ کل، یعنی فردا کے لیے بھی کچھ رکھ لیجیے، مرزا کہتے ہیں کہ دیکھ تو کل کا غدر رکھ کر شراب دینے میں بھل نہ کر۔ یہ ساقی کو شرکے باب میں غیر شایاں گمان ہے۔ جس طرح اب تک شراب ملتی رہی، اسی طرح ساقی کو شرکے کی مہربانی سے آئندہ بھی ملتی رہے گی۔ اس پاک فطرت کی مہربانی کے متعلق دل میں غلط گمان کو جگہ نہ دے۔ یعنی دنیا میں جو کچھ پینے کو ملتا ہے یہ بھی ساقی کو شرکے ہی کی مہربانی ہے۔ جس طرح قیامت کے دن جو کچھ عطا ہوگا، وہ بھی ساقی کو شرکے ہی کی مہربانی سے عطا ہوگا۔

۲۔ لغات۔ کل : اس سے مراد یوم الاست ہے، جس روز روحوں سے بندگی کا اقرار لیا گیا تھا اور انسانوں کے ابراء الہا حضرت آدمؑ کی جناب میں سجدہ نہ کرنے پر عزا ذیل کو، جو فرشتوں میں محسوب ہوتا تھا۔ سزا الہی تھی۔ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا تھا یعنی آدمؑ کی عظمت تسلیم کر لی تھی، کیونکہ آدمؑ ہی حقائق اشیاء بیان کر سکے تھے۔

شرح : کہتے ہیں کہ آج ہم یعنی انسان اتنے ذلیل کیوں ہو گئے کہ کوئی ہماری بات بھی نہیں پوچھتا۔ ہم اگست میں تو فرشتوں کو بھی مجال نہ تھی کہ ہماری شان میں گستاخی کریں

یہ شعر حقیقۂ شرف انسانی کے لیے ایک دعوت ہے، یعنی مرزا بہر انسان کو اس طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارا مرتبہ فرشتوں سے بھی بالاتر تھا، لیکن اعمال بد کے باعث ہم ذلیل ہو گئے اور اپنے مقام شرف سے گر گئے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ ایسا کیوں ہوا اور ان اعمال سے دست کش ہو جانا چاہیے، جو تذلیل کا باعث ہوئے۔

اس شعر میں لفظ ”کیوں“ استعمال کے لیے نہیں، بلکہ تنبیہ کے لیے ہے۔
خواجہ سائے فرماتے ہیں :

”اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ معشوق کو یا تو ہماری خاطر ایسی عزیزیت تھی کہ اگر بالفرق فرشتہ بھی ہماری نسبت گستاخی کرتا تو اسے گوارا نہ ہوتی اور یا اب ہم کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے، دوسرے عمدہ معنی یہ ہیں کہ اس شعر میں آدم اور فرشتوں کے اس قصے کی طرف اشارہ ہے، جو قرآن مجید میں موجود ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عالم کو پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو فرشتوں نے کہا : ”کیا تو دنیا میں اس شخص یعنی اس نوز کو پیدا کرنا چاہتا ہے، جو اس میں فساد اور خوریزی کرے؟“ وہاں سے ارشاد ہوا کہ تم نہیں جانتے، جو کچھ میں جانتا ہوں پھر آدم سے ان کو ذک و لوائی اور حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں۔ کتا ہے کہ ہم آج دنیا میں کیوں اس قدر ذلیل ہیں، کل تک تو ہماری ایسی عزت ہوگی“

۳۔ لغات۔ سماح : راگ۔

چنگ : ایک باجا جو تار کی قسم سے ہے۔

رباب : سازنگی کی ایک قسم۔

شرح : اس شعر میں بھی ”کیوں“ استعمال کے لیے نہیں تنبیہ کے لیے ہے،

اگر چنگ و رباب میں جو آلات موسیقی ہیں، محبوب حقیقی ہی کی صدا سوائی ہوئی

ہے تو عجیب بات ہے کہ یہ صدا سننے ہی بہن سے جان کیوں نکلنے لگتی ہے ؟

وہ صدا تو بہر حال جان بخش اور حیات افروز ہونی چاہیے، کیونکہ حقیقی

محبوب کی صدا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ارباب و مرد و حال اس صدا پر پورا اعتقاد

نہیں رکھتے۔ اگر اعتقاد ہو تو ان کی روحوں میں بالیدگی آئے، لیکن وہ تڑپنے اور

لوٹنے لگتے ہیں۔

اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر باب و بعد و حال اپنے محبوب کی
صدائیں کر اس میں جذب ہو جانے کے لیے بنیاب ہو جاتے ہیں اور ان کا تڑپنا
اور لڑنا اسی کیفیت کا نتیجہ ہے۔

۴۔ لغات۔ کو : راہ، رفتار، پانی کا بہاؤ، وحارہ۔ یہاں اس کے منی
گرم رہا اور تیز رو کے ہیں۔

دخش : گھوڑا، رستم کے گھوڑے کا نام ہی تھا۔

مشریح : عمر کا گھوڑا تیزی سے دوڑا جا رہا تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ
کہاں پہنچ کر ٹھہرے ؟ ہم اس پر سوار ہیں، لیکن حالت یہ ہے کہ باگ پر ہاتھ ہے۔
نہ پاؤں رکاب میں ہے۔

انسانی زندگی کی بے بسی اور بے اختیاری کا نقشہ اس سے بہتر الفاظ میں کھینچنا
غالباً ممکن نہیں۔ گھوڑے پر انسان سوار ہوا، مگر نہ باگ قبضے میں ہو، نہ رکاب قابو
میں اور یہ بھی معلوم نہ ہو کہ گھوڑا سر پٹ دوڑا جا رہا ہے، اس کا رخ کس طرف
ہے اور وہ کہاں پہنچ کر رکنے والا ہے ؟ اس سے بڑھ کر سوار کی بے اختیاری کیا
ہو گی ؟ اور انسانی زندگی کا یہ نہایت صحیح نقشہ ہے۔

خواہر معافی فرماتے ہیں :

”سوار کی بے اختیاری اور گھوڑے کا اس کے قابو سے باہر ہو جانا

اس سے بہتر بیان نہیں ہو سکتا اور عمر کو دیکھ کر بے قابو گھوڑے سے

تشبیہ دینا حسن تشبیہ کا حق ادا کر دیتا ہے۔“

عموماً سمجھا جاتا ہے کہ مصنف تو قلم سے جو تصویر بنا دیتا ہے، اس میں قلب و نظر
کے لیے زیادہ سے زیادہ تاثیر پیدا ہو جاتی ہے، کیونکہ مجسم نقشہ آنکھوں کے
سامنے آ جاتا ہے اور ایسے معاملات میں الفاظ ایسا کام نہیں دے سکتے، لیکن
مرزا غالب نے الفاظ میں جو نقشہ پیش کر دیا ہے، اس میں بڑے سے بڑا دستور
دلگدرد و غن کے ذریعے سے وہ تاثیر پیدا نہیں کر سکتا جو مرزا نے لفظوں کے

قدیچے سے پیدا کر دی ہے۔ غالب کے جن شعروں کی تصویر بنانا بظاہر دشوار ہی نہیں، محال ہے، ان میں سے ایک شعر یہ بھی ہے۔ ایسا ہی شعر یہ ہے۔

منجھلنے دے مجھے لے نا امیدی ! کیا قیامت ہے
کہ دامن خیالی یار چھوٹا ہائے ہے مجھ سے

۵۔ لغات - بُعد : دوری۔

شرح : عبدالرحمن بھٹوی اس شعر کے سلسلے میں فرماتے ہیں :

”روح اور مادے کا امتیاز حقیقت میں ایک ضرب خیال ہے، ورنہ

مادہ محض مایا ہے۔ جب اور اک کامل اور عقل رسا ہو جاتی ہے تو

مادے کی غیریت خود بخود زائل ہو جاتی ہے۔“

میں فہر کے دہم میں جتنا ہیچ کتاب کھاتا ہوں اور جس قدر اس خیالی گود کھ

دھندے میں الجھتا رہتا ہوں۔ اُتنا ہی اپنی حقیقت یعنی وجود حقیقی سے دور

ہونا جاتا ہوں۔

خواجہ حاکمی فرماتے ہیں :

”غیر سے یہاں ماسوی اللہ مراد ہے، جو صوفیہ کے نزدیک بالکل

معدوم ہے، اس لیے کہ وہ وجود واحد کے سوا سب کو معدوم

سمجھتے ہیں۔“

۶۔ لغات - شہود : دیکھنا۔ عدیت اصطلاح صوفیہ میں ایک درجہ ہے،

جس میں سالک مراتب کثرت اور مہربانات صمدی سے گزر کر ایسے مرتبے پر

پہنچ جاتا ہے کہ اسے ساری موجودات میں جلوہ حق بلکہ ہر شے عین حق نظر آنے

لگتی ہے۔

شاد : دیکھنے والا، شہادت دینے والا۔

مشہود : جسے دیکھا جائے۔

مشاہدہ : دیکھنا، معاینہ کرنا۔

شرح : جب مشہود، شاہد اور مشہود کی اصل ایک ہے (اور یہ تینوں لفظ ایک ہی مادے سے ہیں) تو حیرت کا مقام ہے کہ مشاہدے کو کیا سمجھا جاتے اور اسے کس درجے میں رکھا جائے ؟

پوری کائنات صرف وجود و احد یعنی وجود حقیقی کی دہرے قائم ہے تو شاہد و مشہود ایک ہی ہوتے۔ اسی کے سوا اور وجود نہیں۔ جو بھی شے ہے وہ سراسر عین ذات ہے، کیونکہ ذات اور وجود میں غیرت نہیں ہو سکتی، مشاہدہ اسی حالت میں ہوگا، جب شاہد و مشہود میں غیرت ہوگی۔ جب غیرت ہے ہی نہیں تو مشاہدہ کہاں رہا۔ وجود و عبادگانہ وجودوں کا تقاضا کرتا ہے ؟

۷۔ لغات - مشتمل : شال - میل -

نمود : نمود، وجود، نمائش -

صنوع : صورت کی جمع -

شرح : خواجہ قالی فرماتے ہیں :

”ای شعر، وحدت وجود اور کثرت موعوم کی تشبیل ہے۔ قطرہ و موج و حباب کے بیچ و ناچیز ہونے کو ایک عام محاورے میں اس طرح ادا کرنا کہ ”یاں کیا دھرا ہے“ منتہا سے بلاغت ہے۔“

قطرے، موج اور چیلے کی اپنی کوئی ہستی نہیں، یہ تو سمندر میں چند صورتیں ہیں، جو ماضی طور پر نمایاں ہو گئیں اور ان کی ہستی سمندر ہی پر موقوف ہے۔

شعر میں یہ طور تشبیل یہ بتایا گیا ہے کہ حقیقی ہستی صرف واجب الوجود کی ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے، وہ ممکنات میں شامل ہے۔ ممکنات اسی وقت تک ہیں، جب تک سمندر ہے۔ سمندر نہ ہو تو یہ بھی ناپید ہو جائیں۔ گویا ہندسہ، لہریں اور چیلے سمندر کی ذات سے الگ وجود نہیں رکھتے۔ لہذا انہیں کون وجود شمار کر سکتا ہے اس کی ایک مثال یوں سمجھنی چاہیے کہ قوت نامیہ زمین کی ہر روئیدگی سے تعلق رکھتی ہے۔ ایسی کاظمہ و درختوں، پودوں اور فصلوں کی شکل میں ہوتا ہے، لیکن اصل نامیہ ایک

شے ہے۔ ممکنات واجب کے مختلف شیون ہیں، ان کی اپنی کوئی حیثیت نہیں۔
مولانا طباطبائی کے قول کے مطابق اس تمثیل کی غرض یہ ہے کہ ممکنات کی ہستی
کو وجود واجب کے ضمن میں ثابت کیا جائے۔

۸۔ **شرح :** بیشک محبوب حقیقی کا شرانا اور سامنے نہ آنا ایک محبوبانہ ادا
ہے۔ اگرچہ یہ ادا اپنے ہی ساتھ ہے، کیونکہ یہاں دوسرا کوئی موجود ہی نہیں۔ گویا ان
کا پردہ اختیار کرنا اور حجاب میں رہنا بھی تو بے حجابی ہی ہے۔

مقصود یہ ہے کہ وجود واجب نے کائنات کے اندر مختلف صورتوں میں ظہور کیا
لیکن شرم و حجاب کا یہ عالم ہے کہ اب تک کھل کر سامنے نہ آیا، حالانکہ اس کا پردہ
میں رہنا اور حجاب کرنا بھی ادا اے ناز کی حیثیت میں بے حجابی ہی ہے۔ یعنی نہ کھل
کر سامنے آتا ہے، نہ پوری طرح مستور رہتا ہے، بین بین رہ کر عشاق کو ترپاتا ہے۔

۹۔ **شرح :** بجنودی مرحوم فرماتے ہیں :

”مشتوق عالم جو موجودات کے نقاب میں پناہ ہے، برابر اپنی ہمال آرائی
میں مصروف ہے اور آئینہ نقاب ہی میں۔ یہے ہوئے اپنے غامضے کو
دوست کر رہا ہے۔ جب عالم تکمیل کو پہنچ جائے گا تو نقاب اٹھ دیگا
عالم کو دیکھنے ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کسی چیز کی کمی ہے بیشش
حسب آراستہ ہو رہے ہیں اور منتظر ہیں۔“

مطلب یہ ہے کہ ابھی تک کائنات کی تکمیل نہیں ہوئی اور اس کی آرائش کا سلسلہ
برابر جاری ہے۔ اس کا خالق یعنی وجود واجب نقاب میں بھی آئینہ سامنے رکھتے
ہوئے ہے، گویا بننا ستورنا بدستور جاری ہے اور آرائش ہمال سے فراغت حاصل
نہیں ہوئی۔ قرآن مجید کی آیت : ”حَلَّ يَوْمَ هَوِّ شَانَ (ہر روز وہ ایک شان
میں ہے ابھی اسی کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

۱۰۔ **لغات :** غیب غیب : اس سے مراد مرتبہ احدیت ہے جہاں
تک عقل، ادراک اور بصر کی رسائی ممکن نہیں۔

شرح : خواہ مآلی مزانے میں :

”ساگ کو تمام موجودات عالم میں حق ہی حق نظر آئے تو اسے شہود کہتے ہیں اور غیب الغیب سے مراد مرتبہ احدیت ذات ہے۔ جو عقل و ادراک اور بصیر و بصیرت سے وراد الوداء ہے۔ کہتا ہے کہ جس کو ہم شہود سمجھتے ہوئے ہیں وہ درحقیقت غیب الغیب ہے اور اس کو غلطی سے شہود سمجھنے میں ہماری مثال ایسی ہے۔ جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں، پس گودہ اپنے تیش بیدار سمجھتا ہے، مگر فی الحقیقت وہ ابھی خواب ہی میں ہے۔ یہ مثال بالکل نئی ہے اور اس سے بہتر اس معنوں کے لیے نہیں ہو سکتی۔“

مطلب یہ ہے کہ ذات احدیت حقیقۃً غیب الغیب ہے یعنی غیب کے اندر غیب ہے، لیکن ہم اسے شہود سمجھتے ہوئے ہیں، یعنی یہ قرار دے بیٹھے ہیں کہ اس نے ظہور اختیار کیا۔ ہماری مثال ایسی ہے، گویا کوئی شخص سو یا ہوا ہو اور خواب دیکھے کہ جاگ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ محض جاگنے کا خواب دیکھ لینے سے اسے بیدار نہیں سمجھا جاسکتا۔ ایسا سمجھنا سراسر دھوکا ہے۔

۱۱۔ لغات - نعیم : ہم نشین، ہمد، رفیق۔

بو تراب : حضرت علیؑ کی کنیت۔ اگرچہ صورت کنیت کی ہے، لیکن حقیقت میں یہ ان کا لقب ہے۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؑ مسجد نبویؐ میں فرشِ خاک پر سوئے ہوئے تھا اور آپ کے کپڑے خاک آلود ہو گئے تھے۔

”رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تشریف لائے تو فرمایا :

”اے بو تراب! (خاک میں پڑے ہوئے یا خاک آلود) اٹھ۔“ پس اسی وقت سے حضرت علیؑ کا یہ لقب مٹ گیا۔

شرح : پہلے مصرع میں ”دوست“ سے دونوں جگہ خدا مراد ہے۔

اے غائب! دوست (خدا) کے رفیق اور ہم نشین (حضرت علیؑ) سے دوست

(خدا) ہی کی خوشبو آتی ہے۔ میں حضرت علیؑ کی بندگی میں مصروف ہوں اور اس طرح
میں خدا کی بندگی کر رہا ہوں۔

۱۔ شرح : میرے

دل اور جگر دونوں پر کاری نہیں
ملگ چکی ہیں۔ دونوں پر گریو
نوحہ مزدی ہے، لیکن میں
ہر ایک وقت دونوں کے سلسلے
میں یہ فرمن اور انہیں کر سکتا۔
استقامت ہو تو ایک ماتم
کرنے والا ساتھ رکھ لوں گا کہ
نہ اپنے دل پکاروں اور وہ
ہائے جگر کتا ہائے۔ اس طرح
دونوں کے ماتم کا حق ادا ہوگا
مرزا کا مقصود صرف

یہ ظاہر کرتا ہے کہ عشق میں دل
اور جگر دونوں فنا ہو گئے۔ اس
کے سوا جو کچھ ہے، وہ اسلوب
بیان ہے، جس نے شعر کی
حیثیت کچھ سے کچھ بنا دی۔

اسلام سے پیش عرب
میں یہ دستور تھا کہ گلے والوں
کی طرح نوحہ کرنے والوں کے

حیراں ہوں، دل کو روؤں کہ پٹیوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
سہراک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کہ صحر کو میں؟
جانا پڑا رقیب کے در پر، ہزار بار
اے کاش! جانتا نہ تری رگزر کو میں
ہے کیا؟ جو کس کے ہاندھے؟ میری بلاؤں سے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں؟
لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے۔
یہ جانتا اگر تو کُشتا نہ گھر کو میں
چلتا ہوں تھوڑی دُور سہراک تیرے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی، راہبیر کو بھی
خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوچھتا ہوں اُس بُت بیداد گر کو میں؟

ہر بخودی میں بٹول گیا، راو کو سے نثار
 جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں
 لیجئے پھر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا
 سمجھا ہوں دل پذیر، متاع ہنر کو میں
 غالب! خدا کرے کہ سوارِ سمندر تاز
 دیکھوں علی بہادر عالی گنر کو میں
 بھی ملائے ہوئے تھے جنہیں
 ماتم کے موقع پر بلا لیا جاتا تھا
 اور وہ ماتم کر کے گھروالوں کو
 خوب دلا یا کرتے تھے۔ کچھ مدت
 پیشتر ملک ہندوستان میں بھی
 پیشہ وراتمی عورتیں موجود تھیں۔
 مرزا بھی کسی ایسے ہی سے ارادہ
 کے خواہاں تھے تاکہ دل و دگر
 دونوں کا ماتم بیک وقت ہو سکے۔

۲۔ شرح : عاشق ہزار ہو کر گھر سے نکل آیا ہے۔ اس کا دل کسی صورت
 جینے پتہ نہ ہے، حیدر چہ ہو؟ ہے، یہاں تو دل بے کدھر باؤں؟ لنگیں کا مقام
 مرث محبوب کا گھر ہے، لیکن رنگ کے مارے اس کا نام نہیں لینا اور یونہی پکارے
 جا رہا ہے، کدھر کو باؤں؟ کس طرت کا رخ کروں؟ رنگ یہ کہ میں نے محبوب کا نام
 لے لیا تو دوسرا شخص بھی اس سے واقف ہو جائے گا۔ اندیشہ ہے کہ دیکھتے ہی وہ
 محبوب پر عاشق ہو کر رقیب بن جائے گا۔ اس ڈر کے مارے محبوب کا نام نہیں لیتا۔

۳۔ شرح : تیری آمد و رفت کے واسطے سے میرا واقف ہو جانا غضب
 ہو گیا۔ وہ راستہ رقیب کے گھر کے سامنے سے گزرتا ہے۔ تیرے شوق و بیار میں
 مجھے ہزار مرتبہ وہاں جانا اور رقیب کے گھر کا دروازہ دیکھنا پڑا۔ اتنی کوفت ہوئی۔
 دل پر ایسی پھریاں چلیں کہ آرزو ہو رہی ہے، کاش : مجھے تیری دگر کا علم نہ ہوتا۔

۴۔ شرح : پہلے بتایا جا چکا ہے کہ شاعروں نے جس طرح محبوب کے
 دہن کی تنگی میں مبالغہ کرتے کرتے اسے معدوم قرار دے دیا، اسی طرح کر کے نازک
 اور تپکے ہونے پر زور دیتے دیتے اسے ناپید کر دیا۔ اب محبوب غالب سے کہ رہا
 ہے کہ میں نے تیرے قتل کے لیے کرکس لی ہے یعنی پختہ ارادہ کر لیا ہے کہ تجھے نہیں

چھوڑوں گا۔ جواب دتا ہے کہ آپ کی گھر ہے کیا وجہ کس کے باندھا جائے؟ کیا میں اس کی حقیقی حیثیت سے واقف نہیں؟ یعنی جو کمر اتنی پتلی ہے کہ اسے موبہوم ماننا جاتا ہے، اسے آپ کس کر کیا باندھیں گے؟

۵۔ **مشریح :** میں نے محبوب کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے گھر بار لٹا دیا اور اپنی حیثیت بگاڑ لی۔ اس پر دوسروں کا طعنہ دینا تو تعجب کا مقام نہ تھا لیکن دیکھیے، محبوب بھی یہی گزرا ہے کہ یہ ایک بے رنگ و نام شخص ہے۔ نہ اس کی کوئی حیثیت ہے، نہ معاشرے میں کوئی مرتبہ ہے۔ نہ اسے کوئی امتیاز حاصل ہے، اب میں ایسے شخص سے کیا علوں، جس کے پاس نہ گھر ہے، نہ شریفیوں کا سامان ہے اور مال اسباب ہے۔

شعر کا اسلوب ایسا ہے کہ اسے مضامین غزل کے بہتے زندگی کی ہر صورت حال پر اُٹھال سکتے ہیں۔ مثلاً سیکڑوں مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے قوموں اور ملکوں کی بہتری برتری کے لیے اپنا سب کچھ لٹا دیا اور انھیں لوگوں کی نظروں میں بے وقعت اور ذلیل ہوئے، جن کی خاطر قربانیاں کی تھیں، غرض شعر میں عموماً یہ ہے اور اس کا اطلاق مختلف حالات پر ہو سکتا ہے۔ مرزا کے خیر فانی شعروں میں ایک یہ بھی ہے۔

۶۔ **مشریح :** خواہر عاتق فرماتے ہیں :

”طالب را وہ خدا کو جو حالت ابتدا میں پیش آتی ہے، اس کو اس تشیل میں بیان کیا ہے۔ طالب اول اول جس شخص میں کوئی کرشمہ یا وہب و سماع و جوش و غرور و شکستہ ہے، اسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پھرتا ہے۔ پھر جب کوئی اس سے ہٹ کر نظر آتا ہے تو اس کا مقابلہ کرتا ہے، وہ بھم بھرا اور وجہ اس تذبذب اور تزلزل کی یہی تو ہے کہ وہ کالین کو پہچان نہیں سکتا۔“

یہ شعر کا صرف ایک پہلو ہے۔ زندگی کے ہر دائرے میں ایسے ہی حالات پیش آتے رہتے ہیں کہ انسان جس شخص کو دوسروں کے مقابلے میں ذرا تیز چلنے والا پاتا ہے،

اس کا دامن اس امید پر تمام لیتا ہے کہ اس کے ذریعے سے وہ بھی منزل مقصود پہ پہنچ جائے گا۔ تھوڑے خاملے تک ساتھ چلتا رہتا ہے، پھر واضح ہو جاتا ہے کہ منزل بہت دور ہے اور یہ شخص تو وہاں تک نہیں پہنچائے گا۔ بعد ازاں کسی دوسرے تیز رفتار کے انتظار میں بیٹھ جاتا ہے۔ یہ کیفیت اس وقت تک جاری رہتی ہے، جب تک حقیقی رہنما اور رہبر کی پہچان نہ پیدا ہو جائے۔ قومی خدمت کے دائرے میں ایسی مثالیں عموماً زیادہ ملتی ہیں۔

اس مرتبے کے اشعار اساتذہ کے دوا دین میں بہت کم ملتے ہیں۔

۷۔ **تشریح :** میں تو اپنے ظالم محبوب کی محض پیاد میں مبتلا ہوں۔ عقل کے اندھوں اور احمقوں نے اسے پرستش قرار دے لیا یعنی یہ سمجھ لیا کہ میں اسے خدا سمجھ کر پوج رہا ہوں۔ یہ کتنا اندھیر اور کیسی اُن ہونی بات ہے؛ شکر کی اصل خوبی یہ ہے کہ خود عاشق کو پرستش اور خواہش کے درمیان ہندی کی تمیز نہیں۔ وہ جس شے کو خواہش قرار دے رہا ہے، عملاً وہ پرستش کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ لوگ ٹھیک کہہ رہے ہیں کہ عاشق نے محبوب کو پوجنا شروع کر دیا، لیکن عاشق حقیقی حالت سے بے خبری کے عالم میں اسی بات پر زور دے جا رہا ہے کہ میرے دل میں تو اس کے لیے صرف پیاد ہے اور جو لوگ پرستش کا طعنہ دیتے ہیں، انھیں احمق قرار دے کر اپنے دعوے کو قوت پہنچا رہا ہے۔

۸۔ **تشریح :** عاشق ایک مرتبہ محبوب کے کوچے میں پہنچا اور اپنا سب کچھ کھوکھو کر بیخود وہیں آگیا۔ اسی عالم میں اس نے کئی مرتبہ گوسے یا رکھ کا قصد کیا، لیکن بیخودی کے عالم میں راستہ بھول جاتا رہا اور کہیں لاکھیں جا پہنچا۔ اب وہ پریشان ہو کر کہتا ہے کہ دیکھیے، میں نے پھر گوسے یا رکھ کا قصد کیا تھا اور بیخودی کے باعث راستہ بھول گیا، اور نہ وہاں ضرور جاتا اور اپنی خبر بے کر آتا۔

چونکہ پہلی مرتبہ وہاں جاتے ہی بیخود ہو گیا تھا، یعنی اپنا آپ وہاں کھو آیا تھا، اس لیے خود تو اسے کچھ خبر نہیں۔ وہاں جاتے تو اپنا پتہ لے کر کیا حالت ہوتی۔

شعر میں بخودی کے لفظ سے جو دقیق معنی پیدا کیے ہیں وہ مرزا غالب ہی کا حصہ ہے۔

۹۔ لغات - دل پذیر : دل میں سما جانے والا۔ دل میں آ کر جانے والا۔
 شرح : میں عقل و دانش اور بصیرت و ادراک کو دل میں اتر جانے والی چیز سمجھتا ہوں۔ یہ ایسی شاعری ہے جس کے حسن و خوبی اور فضیلت یہ امر آئی شجائش نہیں۔ اپنے آپ پر قیاس کرتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ دنیا بھر کے لوگوں کی یہی کیفیت ہے، لیکن یہ میری غلط فہمی ہے، حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اہل دنیا کے نزدیک یہ چیزیں کچھ قدر و قیمت نہیں رکھتیں اور میرے جیسے ساری دنیا کو اپنا بھنیاں، ہم مشرب اور ہم ذوق سمجھنا قطعاً درست نہ تھا۔
 اس شعر میں انتہائی خوش اسلوبی سے علم و ہنر کی بے وقعتی اور قدر شناسی کا اظہار کیا ہے اور یہ طریق اظہار بھی مرزا غالب ہی کا حصہ ہے۔

۱۰۔ لغات - علی بہادر : اس سے مراد نواب علی بہادر بن نور علی بہادر نواب باندہ ہے۔ علی بہادر ^{۱۱۳۲} سنہ میں سند نشین ہوا۔ ^{۱۱۳۲} سنہ میں مجاہدین آزادی کے ساتھ مل گیا۔ نومبر ^{۱۱۳۲} سنہ میں کلکتہ و کٹورا کے اعلان عفو عام کی بنا پر اس نے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ انگریزوں نے ریاست چھین لی اور اندر میں نظر بند کر دیا۔ صرف تین سو روپیہ امانت و عفیہ دیتے تھے۔ ^{۱۱۳۲} سنہ میں انگریزوں کو کچھ خیال آیا اور اسے بیٹنی بٹا کر دربار میں بلکے دی گئی۔ ^{۱۱۳۲} سنہ میں وفات پائی۔
 منیر شکوہ آبادی کو نواب علی بہادر سے ولی تعلق تھا۔ اس کی وفات پر جو تاریخ لکھی، اس میں نواب کی پوری سیرت کا نقشہ پیش کر دیا۔

نواب علی بہادر! اسے بھر کر م یوسف طعنت، شجاعیت کا شہ ہے!!
 اسے قدر شناس و نامزد برواہ منیر اسے اہل سخن کے عزت افزا ہے!!
 اسے سند نشین خلق و اقبال و مشکوہ اسے بزمِ کرم کے مستند آرا ہے!!

اٹھ جائے جہاں جو توڑنے سے اٹھے مدحیف افسوس، داد لینا ہے ہے !
 تاریخ تری بیرونہ کے کتا ہے شیر قیاضِ دماں، امیرِ زیبا، ہے ہے !
 بڑا فیاض اور دوست نواز تھا۔ مرزا غالب کے ساتھ شخصیات کے ذریعے سے
 رشتہ داری بھی تھی۔ کلکتہ جاتے ہوئے مرزا اسی رشتہ داری کے باعث ہانڈو ٹھہرے
 تھے۔ غالباً اس زمانے میں ذوالفقار بہادر نواب تھا۔ اسی کے لیے غالب نے فارسی
 میں کہا ہے :

نواب ذوالفقار بہادر کہ بودہ است

نام تو در معارف نکلک ذوالفقار میں

شرح : اسے غالب، خدا کرے کہ میں اپنے عزیز نواب علی بہادر کو، جس
 کا خاندان بہت بلند ہے، فخر و اقیان کے گھوڑے پر سوار دیکھوں۔

۱۔ شرح : محبوب کو یہ
 بھی منظور نہیں کہ کوئی شخص
 اس کی محفل میں میرا ذکر برائی
 کے ساتھ کرے۔ یعنی اسے
 اتنی نفرت ہو گئی ہے کہ کسی
 بھی شکل میں میرا نام سننا
 گوارا نہیں کرتا۔ رقیب عادی
 ہے کہ اس نے میرا ذکر برائی
 کے ساتھ کرے۔ اب اس
 پر محبوب بگڑ جائے اور رقیب
 کو بھی قہر و عتاب کا تحفہ پیش
 بنائے تو کچھ بعید نہیں۔

ذکر میرا، بدی بھی، اسے منظور نہیں
 غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دُور نہیں
 وعدہ سیرِ گلستان ہے، خوشا طالع شوق !
 مژدہ قتلِ مقدّر ہے، جو مذکور نہیں
 ناہد بستی اطلاق کی کر ہے، عالم
 لوگ کہتے ہیں کہ ہے ”پر بھی منظور نہیں
 قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا، لیکن
 ہم کو تقلیدِ تنگ ظرفی منظور نہیں

۲۔ لغات - مقتدر:

بات کرتے یا کہتے وقت ایسے الفاظ چھوڑنا جو قرینے سے سمجھ میں آجائیں۔ پوشیدہ مراد۔

شرح: میرے

عشق کی کتنی خوش نصیبی ہے کہ محبوب نے بارغ کی سیر کا وعدہ کر لیا ہے۔ اس وعدے میں ایک بات مقتدر چھوڑی اور اس کا ذکر نہ کیا۔ یعنی ضمناً قتل کی خوشخبری بھی سنادی۔

مطلب یہ ہے کہ سیر

بارغ سے حقیقتہً سیر مقصود۔

حسرت اسے فوقِ خرابی! کہ وہ طاقتِ شری عشق پر عجزِ گدہ کی گویں تن رنجور نہیں میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں کس رعزت سے وہ کہتے ہیں کہ "حسم جو نہیں"

ظلم کر ظلم، اگر لطف در یخ آتا ہو تو تنائی میں کسی رنگ سے معذور نہیں صاف دُردی کش پیمانہ غم ہیں، ہم لوگ واسے وہ بادہ کہ اُنشردہ انگور نہیں ہوں ظویری کے مقابل میں خفائی غالب

میر نے دعوے پر یہ ٹجھت ہے کہ مشہور نہیں

نہیں، بلکہ میرا خون بہانا مقصود ہے تاکہ اس کی سرخی سے گردِ پیش چول کھلے ہوئے نظر آئیں اور زمین میرے خون سے اسی طرح آراستہ ہو جائے، جس طرح بارغ چھوڑنے سے آراستہ ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ عاشق نے سیرِ گلستان کے وعدے سے سمجھا، یعنی سیرِ گلستان کا ذکر ہوا اور عاشق نے اسے بشرۂ قتل سمجھ لیا۔ مذکورہ سیرِ گلستان ہوئی اور مقتدر بشرۂ قتل۔

۳۔ لغات - شادی بستی مطلق: وہ محبوب، جو علی الاطلاق موجود ہے

یعنی محبوب حقیقی۔

منظور: مولانا طلبا بانی نے اسے مبشرِ مرئی (یعنی دیکھا گیا) کے

معنی پر لیا ہے، پھر فرمایا ہے کہ محاورہ ساتھ نہیں دیتا۔

لیکن اس تکلف کی ضرورت کیا ہے؟ ”منظور نہیں“ کو عام معنی میں کیوں استعمال نہ کیا جائے؟ یعنی ہم نہیں مانتے، ہمیں یہ تسلیم نہیں۔

شرح : لوگ کہتے ہیں کہ یہ دنیا محبوب حقیقی کی کمر ہے، جو شاعروں کے نزدیک مہجور مانا جاتی ہے۔ یقیناً اس طرح ہستی دنیا کی نفی تو ہو گئی، لیکن لوگ ساتھ ہی ”ہے“ کا لفظ استعمال کرتے ہیں، جس سے اثبات کا پہلو نکلتا ہے، لہذا ہم ان کا قول تسلیم نہیں کرتے، کیونکہ دنیا اس درجہ معدوم ہے کہ اس کی نفی کرتے ہوئے بھی کوئی اثباتی لفظ لانا قابل قبول نہیں سمجھا جاسکتا۔

۴۔ لغات :- تنگ ظرفی : ظرف کا تنگ ہونا، کم حوصلہ اور بے ہمت ہونا
منصور : اصل نام حسین تھا، منصور اس کے والد کا نام تھا، لیکن شعراء میں اصل نام کے بجائے باپ ہی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ روایت ہے کہ اس نے ”انا الحق“ کہا، یعنی میں خدا ہوں اور موت کی سزا پائی۔

شرح : یقیناً ہمدی ہستی کا قطرہ بھی سمندر میں مل کر سمندر بن چکا ہے، یعنی ہمیں جس فانی لذات کا مقام حاصل ہو چکا ہے، لیکن ہمارا ظرف منصور کی طرح تنگ نہیں کہ چھلک جائیں اور ”انا الحق“ پکار اٹھیں۔ ہم اس کم حوصلہ اور بے ہمتی کی پیروی نہیں کر سکتے، جو فانی لذات کے مقام پر پہنچ جانے کے بعد اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے۔ اور صبر و ضبط نہ کر سکے۔

۵۔ لغات :- پُر عمر بدہ : جنگو، ڈاکا، ہنگامہ آرا۔

گوں : روش۔ ڈھب۔ قابل۔ لائق۔

دنجور : بیمار۔ کمزور۔ ناتواں۔

شرح : اسے خرابی کے ذوق و شوق! افسوس کہ پہلے کی سی طاقت باقی نہ رہی۔ میرا جسم عشق کے صدمے سے تھک کر اس درجہ بیمار، کمزور اور ناتواں ہو گیا کہ اب عشق کی صعر کہ آرائیوں اور ہنگامہ خیزیوں کے قابل نہیں رہا۔

حسرت اس امر پر ہے کہ مزید تباہ و برباد ہونے کا ذوق باقی ہے، لیکن جسم اب ساتھ نہیں دیتا۔ عشق ایسی بلا ہے کہ اس کے لیے ہر قسم کی سختیاں سہنے کی تاب ہوتی چاہیے۔ میرے جسم میں اب یہ خصوصیت باقی نہیں رہی۔

۶۔ لغات : رغونت : غرور۔ تکبر۔

شرح : جب میں اپنے محبوب سے کہتا ہوں کہ قیامت کے دن جزاؤں کا فیصلہ ہوگا۔ ہم جنت میں جائیں گے اور حوریں ملیں گی تو ہم کہیں گے کہ ہمارا محبوب ہی ہمیں دے دیجے اور تمہیں کو ہم لے لیں گے تو دیکھیے، کس غرور و تکبر سے جواب دیتے ہیں ! معناب ! ہم حور نہیں، کہ آپ ہمیں لے سکیں۔

اس شعر میں بھی اچھوتے انداز سے محبوب کو حوروں سے اتنا برتر ثابت کیا گیا ہے کہ وہ نفرت بھرے غرور سے اپنے حور ہونے کا منکر ہے، گو یا حور کو ایک حقیر چیز سمجھتا ہے۔

۷۔ لغات : دریغ آنا : دریغ ہونا، تامل کرنا، الجھل سے کام لینا۔

معذور : عذر کیا گیا۔ مجبور۔ ناچار۔ معافی کے قابل۔

شرح : اے محبوب ! اگر تجھے لطف و کرم میں تامل ہے اور اسے میرے لیے گوارا نہیں کرتا تو ظلم ہی کرتا جا۔ ظلم کی تکرار سے مقصود تاکید ہے کہ معذور ظلم ہی کر۔ لیکن تو تامل سے کام لینا چاہتا ہے۔ اس بارے میں تیرا کوئی غلط فہمی نہیں سمجھا جا سکتا۔

تامل کا مطلب یہ ہوگا کہ تجھے ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ہمیں منکدر نہیں۔ دونوں صورتوں میں سے کوئی ایک اختیار کرے۔ تو ہمیں ہربانی کے قابل نہیں سمجھتا تو نہ ہی ہم ظلم سہنے کے لیے تیار ہیں۔ ان حالتوں میں تجھ سے تعلق قائم رہتا ہے، جیسا کہ دوسری جگہ مرزا نے کہا ہے :

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے

کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی ہے

نیز :

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ، صداوت ہی کیوں نہ ہو

۸۔ لغات - وردی کش : تھپھٹ پینے والا۔

تخم : حبشہ، ایران کا بادشاہ جس سے شراب کی ایجاد منسوب ہے۔

افشرۃ انگور : انگور کا پختلا طعق۔

شرح : ہم لوگ حبشہ کے پیالے کی تھپھٹ پینے والے ہیں۔ اس شراب

پر امنوس جو انگور کے عرق سے تیار کی گئی ہو۔

اپنی شراب نوشی کو حبشہ سے منسوب کر کے اس کا رتبہ حدودِ جہلند کر دیا۔ پھر

کہا کہ اس رتبے کے میکشوں کے لیے عرق انگور کے سوا جو شراب ملے، وہ باعثِ

امنوس ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سرزد کو دہی شراب سے سخت نفرت تھی، جو گڑ اور بول

کی چھال سے تیار کی جاتی تھی۔ وہ خود ایک خط میں لکھتے ہیں : ”یہ گڑ چھال کی

شراب مجھے پسند نہیں، یہ مجھے مسخرت کرتی ہے“ فارسی میں بھی کہا ہے :

غالب اشراپ قندی ہندم کباب کو

ذہیں بعد بادہ اے گوارا کشیدہ باد

نیز :

شراب قندی ہندوستان دماغِ سخت

ذشیرۃ خاۃ کشیر آورند شراب

اسی لیے وہ انگوری شراب کے رسیا تھے، لہذا کہا :

واسے وہ بادہ کہ افشرۃ انگور نہیں۔

۹۔ لغات - ظہوری : لفظی معنی صاحبِ ظہور، یعنی ظاہر و آشکار اور

مشہور۔ فارسی کا ایک مشہور شاعر وادیب، جس نے زندگی کا بڑا حصہ بیجا لیا، ”گزارا

اور وہیں وفات پائی۔

خفائی : لفظی معنی چھپا ہوا اور پوشیدہ ، یعنی جو شہرت سے محروم ہو۔
 شرح : اے غالب ! میں خفائی ہونے کے باوجود غلوڑی کی ٹکڑیاں ہوں
 میرے دعوے پر دلیل یہ ہے کہ مجھے شہرت حاصل نہیں۔
 چونکہ میں مشہور نہیں ، اس لیے غلوڑی کے مقابلے میں مجھے خفائی کہنا چاہیے ،
 لیکن مشہور نہ ہونے کے باوجود میں غلوڑی کا قدر مقابل ہوں۔
 - غلوڑ اور خفا : نیز غلوڑی اور خفائی کا تقابل بالکل واضح ہے ۔

۱۔ لغات ۔

حُسنِ طلب : کوئی چیز
 اچھے طریقے پر طلب کرنا۔

ستمِ ایجاد : وہ محبوب ،
 جو ظلم و ستم کے نئے نئے طریقے
 نکالتا ہے ۔

شرح : اے

ظلم و ستم کے نئے نئے طریقے
 نکالنے والے محبوب ! اگر
 میں آہ و فغاں کرتا ہوں تو
 اس سے تیرے ظلم و ستم
 کی شکایت مقصود نہیں ، بلکہ
 یہ تو حسنِ طلب ہے ۔ میرا
 مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ تجھ
 سے مزید محروم و جفا کا تقاضا

نالہ ، جُز حُسنِ طلب ، اے ستمِ ایجاد ! نہیں
 ہے تقاضا اے جفا ، شکوہ بیداد نہیں
 عشق و مزدوریِ عشرت گہ خسرو کیا خوب !
 ہم کو تسلیم نہ کو نامی فر باد نہیں
 کم نہیں وہ بھی خرابی میں ، پہ وسعت معلوم
 دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر باد نہیں
 اہلِ مینش کو ہے طوفانِ حوادث ، مکتب
 لطمہ موج کم از سیلی استاد نہیں
 واسے ! محرومیِ تسلیم و بدادِ حال و فنا
 جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ مزید نہیں

رنگ تمکین گل و لالہ پریشاں کیوں ہے ؟
 گر چہ راخان سیر و بگزیر باد نہیں
 سب کو گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں
 مرثوہ ، اے مرغ ! کہ گلزار میں صبا و نہیں
 فتنی سے کرتی ہے اشبات تراوش گویا
 دی ہے جاسے دہن اس کو دم ایسا " نہیں "
 کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
 یہی نقشہ ہے ، ولے اس قدر آباد نہیں
 کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
 تم کو بے مہری یاران وطن یاد نہیں

کروں ۔ لیکن ایسے طریق پر
 جو اچھا اور پسندیدہ ہو ۔
 مطلب یہ ہے کہ اور جو حفا
 کا تقاضا یوں کیا کہ آہ و فغا
 شروع کر دی تاکہ محبوب
 ناراض ہو اور غصے میں آ
 کر مزید بیدار کرنے لگے ۔
 گویا آہ و فغاں مزید جو حفا
 کی طلب کا ایک اچھا اور
 احسن ذریعہ بن گئی ۔

۲۔ لغات خسرو:
 ایران کا ایک بادشاہ ،
 جسے خسرو پرورد کہتے ہیں
 مشہور حسینہ شیریں اس کی
 بیوی تھی ۔

عشرت گہ : دو مقام ، جہاں عیش و عشرت کی جائے ۔ یہاں اس سے
 مقصود خسرو کا محل اور باغ ہیں ۔ یہ بتا دینا چاہیے کہ بغداد سے ہمدان کی
 طرف بائیں تو غنائین ، و حلوان کے درمیان پہاڑوں میں ایک مقام
 آتا ہے ، جہاں ایک مقام اب تک قصر شیریں کے نام سے معروف
 ہے ۔ یہی مقام تھا ، جسے "عشرت گہ خسرو" کہا جاسکتا ہے ۔ اب اس
 کے صرف کھنڈر رہ گئے ہیں ۔

فرزاد : شیریں کا عاشق ، جس کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اسے
 شیریں کے باغ کے لیے پہاڑ چیر کر سڑ لانے کا حکم دیا گیا تھا اور وہ

کر لیا گیا تھا کہ نہ مکمل ہوتے ہی شیریں تمیں مل جائے گی۔ مزاد نے نہ مکمل کر دی، لیکن اسے شیریں کے مرجانے کی جھوٹی خبر سنا کر خود کشی پر مجبور کر دیا گیا۔ یہ عام امنا ہے تاہم کئی حقائق سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ سمجھا جاسکتا ہے کہ پانی ضرور پہاڑ سے لایا گیا، مگر پہاڑ کاٹ کر نہیں زیادہ تر وہی ہی صحرائی گزر لگائیں بنا کر جیسی وہی پانی لانے کے لیے ننگ و گچھ سے بنایا کرتے تھے۔

شرح : مرزا کہتے ہیں کہ مزاد تو عشق کا دعویٰ رکھتا تھا، پھر اس نے اپنے رقیب خسرو پر دیز کے باغ اور محل کے لیے پہاڑ کاٹ کر ہنر لانے کی مزدوری کیوں قبول کی؟ جہاں سچے عاشق بھی رقیبوں کی عیش و عشرت کے لیے مزدوری کر کے مزدوری سر و سامان بہم پہنچاتے ہیں؟ حق یہ ہے کہ ہم تو مزاد کی نیک نامی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

بحث یہ نہیں کہ مزاد اچھا تھا یا بُرا، اس کا رتبہ بلند تھا یا نہیں تھا۔ یہاں بحث صرف یہ ہے کہ مرزا نے مزاد کے انسانے سے ایک نکتہ ایسا پیدا کر لیا، جو یقیناً اس مسکین کے لیے نیک نامی کا باعث نہیں سمجھا جاسکتا۔ یعنی عاشق ہو کر رقیب کی عیش و عشرت کے لیے مزدوری پر آمادہ ہو جانا کون سی خوبی کی بات ہے؟ اگر کہا جائے کہ مزاد شیریں کے لیے ہنر لانے پر آمادہ ہوا تھا تو شیریں خسرو پر دیز کی بیوی تھی، اس کے محل اور باغ کے لیے جو ہنر لائی گئی، وہ بہر حال خسرو پر دیز ہی کی عشرت گاہ کے لیے تھی۔

۲۔ **شہر :** پہلے مصرع میں ”وہ“ کا اشارہ گھر کی طرف ہے، تصریح اس لیے مزدوری ہوئی کہ مرزا غالباً ضرورت شہری سے مجبور ہو کر ”دشت“ کو ”گھر“ سے پہلے لائے۔

جیشک میرا گھر بھی خرابی و ویرانی کے اعتبار سے دشت کے مقابلے میں کم قیمت نہیں رکھتا، لیکن اس میں وہ پشائی اور کشادگی کہاں، جو دشت میں ہے؟

گھر کا قتبہ زیادہ سے زیادہ سو گز اور دشت کے طول و عرض کا اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اس بے دشت میں میری زندگی ایسی خوش اسلوبی سے گزر رہی ہے اور میں اتنا خوش ہوں کہ گھر مجھے یاد ہی نہیں۔

۴۔ لغات۔ اہل بنفش : اہل بصیرت، اہل عقل و دانش، دیدہ ویر۔
حوادث : حادثہ کی جمع۔

نظر : تہیہ

سیلی : طمانچہ۔ پتڑ۔

شرح : حادثوں کے جو طوفان اٹھتے ہیں، وہ اہل نظر و بصیرت کے لیے ایک درس گاہ ہیں، جہاں انھیں زندگی کے مزید سی سبق ملتے ہیں، یعنی ان سے کوئی غلطی ہوتی ہے تو تپا چل جاتا ہے کسی معاملے میں ٹھیک ٹھیک تدبیر نہ کر سکے ہوں، اس لیے نقصان اٹھایا ہو تو حقیقت ان پر واضح ہو جاتی ہے۔ گویا تمام آفتیں اور حادثے ان کے لیے دھیری اور مہنائی کا سامان ہیں اور ہر حادثے کی لہر سے ان پر جو ضرب لگتی ہے، وہ دراصل استاد کا پتڑ ہوتا ہے، جو شاگرد کو غلطی پر تہہ کر لے اور اس میں سراسر شفقت کا پنپو ہوتا ہے۔

مرزا نے طوفانِ حوادث کو کتب قرار دینے میں حقیقت اس طرح واضح کر دی کہ اس سے زیادہ توضیح ممکن نہ تھی، مثلاً :

۱۔ جس طرح حصولِ علم کے لیے کتب میں جانا ضروری ہے، اسی طرح زندگی کے مراحل میں طوفانِ حوادث سے گزرنے بغیر عاقلہ نہیں۔

۲۔ جس طرح کتب کا ماحول شاگرد کے لیے شفقت و تربیت اور علم و بصیرت کا ماحول ہوتا ہے، اسی طرح حوادث کو بھی خوف یا کراہت سے نہ دیکھنا چاہیے، قدرت کی طرف سے ان کا انتظام اس لیے ہوتا ہے کہ انسانوں نے جو باتیں سیکھی نہیں یا سیکھیں اور بھول گئے یا انھوں نے فہم و بصیرت سے ٹھیک ٹھیک کام نہ کیا، حوادث کے ذریعے سے ان کی یہ کمی پوری کر دی جائے۔ گویا زندگی کے مراحل میں حوادث کی حیثیت یہی ہے

جو کتب میں استاد یا اساتذہ کی ہوتی ہے۔

۳۔ طوفانِ حوادث کو کتب قرار دیتے ہی۔ ان کی تلخی، ناخوشگواری اور وحشت زائل کر دی اور یہ بتا دیا کہ ان سے مزید علم حاصل کرنا چاہیے اور حوادث کے بغیر علم و تجربہ میں پختگی پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔

۴۔ یہ حقیقت آشکارا کر دی کہ زندگی میں انسان کے لیے کتنے ہی ناخوشگوار واقعات پیش آئیں۔ اگر حقیقت پر نظر ہو تو وہ تمام واقعات درگاہِ ہیں جن سے سبق لیکھا جاتا ہے تاکہ زندگی زیادہ کامیابی سے بسر کی جاسکے۔

۵۔ لغات - ہدا : بہت بُرا۔ امنوس۔

شرح : آہ ! تسلیم و رضا کا مظلوم مونا اور امنوس اودھا کی بد حالی، ہم تو اس لیے غامض ہیں کہ محبوب سے وفاداری پر کوئی حرف نہ آئے اور اس کے دوبارہ تسلیم و رضا میں غفلت پڑے، لیکن اس نے یہ سمجھ لیا کہ ہم میں آہ و فغاں کی طاقت ہی نہیں رہی۔ گویا ہم نے جو طریقہ عشق و محبت کے تقاضوں کی بنا پر اختیار کیا، محبوب سمجھتا ہے کہ وہ ہماری بچاؤ کی دانتوانی کا نتیجہ ہے۔ ظاہر ہے کہ تسلیم و رضا کی منظوری اور اودھا کی بد حالی اس سے بڑھ کر کیا ہوگی ؟

۶۔ لغات - تمکین : ٹٹکن۔ شہراؤ : بھاؤ، قرار۔

شرح : اگر لالہ گل ہوا کے راستے پر چراغاں کی حیثیت نہیں رکھتے تو

ان کے شہراؤ، بھاؤ اور قرار رنگ پریشاں کیوں ہے ؟

جو چراغ راستے پر بجایا جائے اور راستہ بھی ہوا کا ہو، وہ کسی طبیعت پریشان نہیں رہ سکتا، برابر جھلکتا رہے گا اور جلد بجھ جائے گا۔ بالکل یہی کیفیت لالہ گل کی ہے۔ ان کی حیثیت بھی ہوا کے راستے کے چراغوں کی ہے۔ وہ بھی جلد بجھ جانے والے ہیں اور ایسے چراغوں میں قیام و قرار کا رنگ لازماً پریشاں ہوگا، یعنی ان کے لیے قیام و بقا کی کوئی صورت نہیں۔ آج کھلتے ہیں، تموری دیر میں پنکھڑیاں ایک ایک کر کے الگ ہو جائیں گی اور وہ ناپید ہو جائیں گے۔ ایسی چیزوں کے لیے ثبات کا رنگ

بھنے کی کوئی صورت نہیں۔

جو چیزیں زندگی میں حسن و جمال کے اعتبار سے بہت عزیز بھی ہوتی ہیں، ان کی بے ثباتی ایسے عمدہ اور مناسب حال انداز میں پیش کی گئی ہے کہ اس سے بہتر طریقہ ذہن میں نہیں آ سکتا۔

۷۔ لغات - سُبْدِ کُلُّ : وہ ٹوٹ کر جس میں پھول چن چن کر جمع کیے جاتے ہیں۔

شرح : اسے پرندے، خوشخبری جو کہ گلچیں یعنی پھول چننے والا تجھے پھولوں کی ٹوٹ کر کے بچے بند کر رہا ہے اور صیاد باغ میں موجود نہیں۔

مرغ سے مراد بظاہر تمبیل ہے۔ پھولوں کی ٹوٹ کر میں بند کر دینے سے اول بچنے کے سختیاں ختم ہوئیں، دوم پھولوں سے نہ محض قرب حاصل ہوا، بلکہ بیل کے ارد گرد ہر طرف پھول ہی پھول ہوں گے اور صیاد جو پرندے کے لیے سب سے بڑی مصیبت ہے، موجود نہیں۔

جس صورت حال پر اس کا اطلاق نہایت موزوں طریق پر ہو سکتا ہے۔ یہ ظاہر وہ مرزا کے سامنے نہ تھی، مثلاً انگریزی تسلط کے آخری دور کو سمجھ لے۔ آزادی کا جذبہ عام ہو گیا تھا۔ انگریزوں کے لیے اطمینان سے تسلط رہنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ انہوں نے اصلاحات کا خاکہ تیار کیا۔ اور اسے نافذ کر دیا۔ یہ پرندے کو سبھ گل کے تنے بند کرنے کی صورت تھی اور ظاہر یہ کیا گیا تھا کہ صیاد باغ سے نکل گیا ہے یا اس نے صیاد کی جگہ گلچینی اختیار کر لی ہے یعنی اب پہلے کی طرح شکار نہیں کرتا، قوت کے بل پر محکموں کو نہیں دباتا صرف مالی قفسے اٹھاتا ہے، یعنی پھول چنتا ہے۔ ایسی صورتیں مختلف احوال میں مختلف مقامات پر پیش آئیں۔

۸۔ لغات - نفی و اثبات - نفی کے معنی "نہیں" اثبات کے معنی

"ہاں"۔ اصطلاح میں ان دونوں فقروں کے معنی وسیع ہیں۔ کلہ غتیہ بھی انہیں دونوں کا مجموعہ ہے۔ پہلے کلہ نفی ہے یعنی لا الہ (کوئی معبود نہیں) پھر کلہ اثبات ہے یعنی لا الہ (اللہ کے سوا)، نفی اصطلاح تصوف میں اپنے آپ کو وجود حقیقی میں فنا کر دینے

اور اس طرح اس وجود کا اثبات کرنے کو بھی کہتے ہیں۔ اذکار میں ذکر نفی و اثبات سے مقصود کلّہ طیبہ کا ذکر ہے۔

تراوش : چکنا، ٹکنا، ٹکنا، ٹکنا، ٹکنا۔

شرح : جس طرح کلّہ توحید میں نفی سے اثبات کا ظہور ہوتا ہے، وہی کیفیت ہمارے محبوب میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تخلیق کے وقت اسے دہن تو دیا ہی نہیں، اس کی جگہ نہیں۔ ”وہی سین وہ ہر بات پر انکار کرتا ہے اور کلّہ نفی استعمال کرتا اس کا شیوہ ہے۔ اسی نہیں اسے ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کا وہی ہے، گویا نفی سے اثبات کا ظہور ہوتا ہے۔

بیشتر اصحاب نے اعتراض کیا ہے کہ مرزا نے یہاں اثبات کو مؤثرت استعمال کیا، حالانکہ یہ ذکر ہے اور مرزا خود کہہ گئے ہیں :

ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

لیکن جن الفاظ کی تذکیر و تانیث معنی اعتباری ہے، ان میں زیادہ میں میکر نہیں نکالنی چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرزا نے ایک معنوں پیدا کیا اور ”اثبات کرتا ہے“ لاتے تو کرتا، کالاف دب جاتا اور مرزا نے خود سیاح کے نام لکھا ہے کہ جہاں لاف دیتا ہے، میرے کیلجے میں ایک تیر لگتا ہے۔ یقیناً اسی وجہ سے ”کرتا ہے“ کے بجائے ”کرتی ہے“ لکھ دیا اور اعتباری تذکیر و تانیث میں اسے قابل گرفت نہ سمجھنا چاہیے۔

۹۔ شرح : ظاہری جلوہ آرائی میں بہشت بھی تیرے کو چہ سے کم نہیں۔

نقشہ قرداقی یہ ہے، میکن وہاں اتنی آبادی نہیں۔

مطلب یہ کہ محبوب کے کوچے میں عشاق کا جو جوم رہتا ہے، ویسا جوم بہشت میں نظر نہیں آتا۔

ایک پہلو یہ نکالا جا سکتا ہے کہ محبوب حقیقی کے شدید انہوں کا جو جوم اس کا جلوہ دیکھنے کا مشتاق ہے، وہ تعداد میں اتنا زیادہ ہے کہ بہشت میں جانے والوں کی تعداد کو اس سے کوئی مناسبت نہیں۔ مرزا غالب کے فلسفے کے مطابق بہشت میں وہ جہاں گئے

جو نیک عمل کی جزا پائیں گے، لیکن دیوار کے آرد و مند بہشت سے نوری سرکار و نگین گے
اور دیوار ہی کے منتظر رہیں گے۔ ان کی تعداد حسن عمل کی جزا پانے والوں سے بہت
زیادہ ہوگی۔

۱۰۔ شرح : اے غالب ! تم کس منہ سے بے وطنی کی شکایت کر رہے ہو؟
کیا تمہیں یاد نہیں کہ وطن کے دوستوں اور رفیقوں نے کیسی بے مہری سے کام لیا اور
تمہاری قدر و منزلت پہچاننے سے کس دوسرے غفلت برتی۔

وطن سے محبت اہل وطن کی مہربانی، قدر شناسی اور مہمدوی کی بنا پر ہے۔ جہاں
یہ چیزیں تاپید ہوں، وہاں وطن اور بے وطنی میں کچھ فرق نہیں رہتا۔ مرزا غالب بھی
بے وطنی کی شکایت اسی بنا پر بجا قرار دیتے ہیں کہ یارِ اہل وطن سے بے مہری کے انتہائی
صد سے اٹھا چکے ہیں۔

دیوان غالب کا جو نسخہ شیران مرحوم نے فراہم کیا تھا، اس کے حاشیے کی تحریر
سے واضح ہوتا ہے کہ یہ غزل بھی باندہ میں کہی گئی تھی، جب مرزا غالب لکھتے ہاتھ
ہوئے باندہ میں مٹھرے تھے اور اغلب ہے، وہاں کے کسی مشاعرے میں پڑھی گئی ہو۔
لہذا مقطع کی مناسبت کسی تشریح کی محتاج نہیں۔

۱۔ شرح : خواہ جہاں
فرماتے ہیں :

۰ اپنی مزاح و مسکمی اور اس
کے ساتھ مشرافت نفس کا
اظہار ہے۔ یعنی میں جو دونوں
جہاں سے کہ خاموش رہا، اس
کا سبب یہ نہیں تھا کہ میں ان
پر قافی ہو گیا، بلکہ مجھ کو زیادہ

دونوں جہاں سے کہ وہ سمجھے، یہ خوش رہا

یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے

تیرا پتا نہ بتائیں تو ناچار کیا کریں؟

کیا شمع کے نہیں ہیں جوا خواہ اہل بزم؟

جو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں؟

مانگنے اور ٹکرا کر مارنے سے شرم آئی، اس لیے خاموشی اختیار کر لی :

اللہ تعالیٰ سے انسان کو دو فرائض جہاں سے دیے۔ دنیوی زندگی کی شادمانیاں اور کامرانیاں بھی عطا کی، آخری زندگی کی نعمتیں بھی بخشیں اور انہیں انسان کے لیے خوش کامان قرار دیا۔ انسان ان پر قناعت نہیں کر سکتا تھا، دل سے خوش نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ یہ نعمتیں ذات سے جدائی قبول کرنے کی صورت میں مل رہی تھیں، لیکن یہاں یہ شرم و انگیر ہوئی کہ اب عطا کرنے والے سے ٹکرا کر کیا کریں۔ کیا کہیں کہ ہمیں ان نعمتوں کے بھائے صرف ذات میں شرم ہی رہنا منظور ہے، واقعی خواہجہ حالی کے ارشاد کے مطابق یہ فرائض صلی اور شرافت نفس کا اظہار ہے اور اسے انسان کی بندگی و عبودیت کا بھی ایک کرشمہ سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ مل گیا، اگرچہ اس پر قناعت کی کوئی وجہ نہ تھی، لیکن عطا کرنے والے سے ٹکرا کر عبودیت کے منافی سمجھا اور شرم کے اسے چُپ رہا۔

۲۔ شرح : تیرے شیدائی تیری تلاش میں نکلے، لیکن دو دو چار چار سلوک و معرفت کی منزلوں میں ٹھک ٹھک کر ٹھہرتے گئے۔ تو ہی فرما کہ تیرا پتا ملے تو یہ جیسے اور بے چارہ لوگ کیا کریں ؟

مطلب یہ ہے کہ سلوک و معرفت کی کتنی ہی منزلیں ملے کر لی جائیں، لیکن انسان کے لیے حقیقت تک پہنچنا مشکل ہے۔ جسے دیکھو سفر سے چور ہو کر کسی نہ کسی منزل پر رُک گیا ہے، آگے قدم بڑھانے کی ہمت نہیں رہی۔

۳۔ لغات - ہوا خواہ : خیر خواہ، ہمدرد، غلام۔

شرح : کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اہل بزم کے دل میں شمع کی خیر خواہی، ہمدردی اور غلامی کا کوئی جذبہ موجود نہیں ؟ یہ غلط ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ جب علم ہی جان گھٹا دینے والا ہو تو بچارے غلاموں کے بس میں کیا رہ جاتا ہے ؟

محفل کا ہمارا صرف شمع کے روشن رہنے پر موقوف ہے۔ شمع نہ ہو تو محفل جم ہی نہیں سکتی۔ اس سوزیت میں کون کر سکتا ہے کہ اہل محفل شمع کے ہمدرد نہیں ؟ لیکن اس کے لیے قدرت نے علم کا ایسا سوز مقدّر کر دیا ہے ۱۶۱۴۰ کی روشنی کا لازمہ ہے۔

وہ جب تک روشن رہے گی۔ گھٹتی جائے گی۔ اس جان گھٹا دینے والے ختم کا علاج غمخوار نہیں کر سکتے۔ علاج یہ ہے کہ شمع بجھا دی جائے۔ شمع بجھ جائے گی تو محفل ہی باقی نہیں رہے گی۔

اس شعر میں ایک حقیقت یہ بیان کی ہے کہ ہر شے کا وجود کسی نہ کسی مقصد کے لیے ہے۔ شمع کے وجود کا مقصد یہ ہے کہ محفل میں روشنی کرے۔ روشنی ہوگی تو وہ گھٹنے لگی اور غمخواروں کی ہمدردی اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی، کیونکہ اسے مقصد سے ہٹانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ہستی ختم ہو جائے۔ اسی طرح کائنات کا ہر وجود قدرت کا مقرر کیا ہوا مقصد پورا کر رہا ہے اور تکمیل مقصد کے جو لوازم ہیں ان سے وہ کچھ نہیں کتا۔

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیاں کا رگر ۱۔ شرح : غیر کی خوش بانی
 اور چکنی چٹری باتیں محبوب کے
 عشق کا اُس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں
 دل پر اخڑ کر گئی ہیں اور اس نے
 غیر کو اپنا سچا عاشق سمجھ لیا ہے۔ ہم اپنے بارے میں کچھ کہنے سے اتنا پرہیز کر رہے ہیں کہ کتنا
 چاہیے، ہم بے زبان ہیں۔ ہم واقعی اس کے چھ عاشق ہیں، لیکن ہم پر اسے عشق کا لگتی
 ٹھک نہیں۔

اس شعر میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ بسا اوقات انسان ظاہری غم و غماض کا اثر قبول کر لیتا ہے اور وہ حقیقت تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس وجہ سے منافق درجہ اعتبار حاصل کر لیتے ہیں، کیونکہ وہ اپنے متعلق بے تکلف بے چوڑے دعوے کرتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ محسوس ہیں اور غمخوس کی بنا پر زبانی دعووں کو کوئی وقت نہیں دیتے وہ محروم رہ جاتے ہیں۔ زندگی کے ہر دائرے میں اس صورت حال کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

۱۔ شرح : عاشق نے محبوب کو رام کرنے کی غرض سے مجنوں اور میلی کا قبضہ ستایا جب یہ بتایا کہ میلی قیس کی دلہاری کے لیے اس کے پاس صحرا میں پہنچ گئی تھی تو ستم دیکھے کہ اس پر محبوب کے دل میں کوئی مہربانی اور کوئی ملائت پیدا نہ ہوئی۔ بلکہ وہ تعجب سے بولا کہ آیا دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے ! یعنی یہ بھی ہوتا ہے کہ محبوب بے حجاب ہو کر عاشق کے پاس پہنچ جائے۔

مولانا طیب الدہلوی نے اس شعر سے لزوم کا ایک طویل سلسلہ پیدا کیا ہے، فراتے ہیں، میلی کے اس فعل پر تعجب کا سبب یہ ہوا کہ محبوب نے ایسا شرم و حیا کے خلاف سمجھا۔ شرم و حیا کے خلاف سمجھنے سے یہ معنی لازم آئے کہ میلی پر اس نے تشبیہ کی، یعنی اسے طعن دیا۔ ساتھ ہی یہ حقیقت ظاہر ہو گئی کہ خود محبوب کے نزدیک عاشق کی خیر یعنی میں شرم و حیا مانع ہے۔ غرض اس شعر میں بلا غفلت کی وجہ یہی سلسلہ لزوم ہے۔

۲۔ شرح : اے غالب ! مجھے محبوب کے نازک دل پر رحم آتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تو اس کا مزہ کو عشق کی آزمائش میں سرگرم نہ کر۔

مطلب یہ کہ عاشق عشق کا امتحان دینے کے لیے نہ محض تیار ہے، بلکہ محبوب کو آزمادہ کر رہا ہے کہ وہ اٹھے اور جس طریقے پر چاہتا ہے، آزمائش کرے۔ آزمائش کا سب سے بڑا انداز یہ وہ ہے، جس میں عاشق کو جان قربان کر دینے کی نوبت آئے۔ عاشق اس کے لیے بھی ہمدرد بنا رہا ہے، لیکن اس کا رفیق اور مددگار عاشق کو سمجھا رہا ہے کہ صبر! تو تو جاں نثاری سے اپنے عشق کا ثبوت دے دے گا، مگر محبوب کا دل نازک ہے۔ مجھے قند ہے کہ وہ تیرے جان دے دینے پر پشیمان و طول ہو گا اور اس کا نازک دل ملال برداشت نہ کر سکے گا۔ بہتر یہی ہے کہ تو اسے عشق کی آزمائش پر آزمادہ نہ کر تا کہ اس

کا دل صدمہ اور مہر اندیشے سے محفوظ رہے ۔

۱۔ شرح : محبوب بھی
 دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا
 آخر کسی سے دل لگا بیٹھا
 بارے اپنی بیکسی کی جہم نے پاٹی دادیاں
 یعنی کسی پر عاشق ہو گیا ۔
 میں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
 اب وہ بھی ختم عشق میں تنہا
 بیٹھا رہتا ہے ۔ بارے
 اس طرح ہمیں اپنی بیکسی
 مہر گردوں ہے چراغِ رہ گزارِ یادیاں
 اور تنہائی کی داو مل گئی یعنی
 جس طرح ہم عاشق ہو کر سب سے الگ تنگ بیٹھے رہتے تھے وہی کیفیت
 اب ہمارے محبوب کی ہے ۔

۲۔ لغات ۔ زوال آمادہ : فنا ہو جانے پر آمادہ ، یعنی فنا ہو
 جانے والا ۔

آفرینش : پیدائش ۔ مخلوق ۔

شرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

۔ یہاں سورج کو اس لحاظ سے کہ وہ بھی اجزائے عالم میں سے ہے
 اور تمام اجزائے عالم آمادہ زوال و فنا ہیں ، چراغِ رہ گزارِ بادے
 تشبیہ دی ہے ، جو بالکل نئی تشبیہ ہے ۔

کائنات میں جتنی بھی چیزیں ہیں ، ان کے لیے فنا ہو جانا مقدر ہے ۔
 من علیہا ناز و بقیۃ احدہ ربکذا الجلال والا کرام ان چیزوں میں بقا ہر
 سب سے بڑا اور نمایاں وجود سورج کا ہے ، جس پر پورے نظامِ شمسی کا انحصار
 ہے ، لہذا مرنے والے فنا کا ثبوت دینے کے لیے اسی کو بطور مثال چنا اور بتایا
 کہ یہ سورج جو آسمان پر روشن نظر آ رہا ہے ، یہ کیا ہے ؟ ایک ایسا چراغ ہے

جو ہوا کے راستے میں روشن ہے۔ کیا کہا جاسکتا ہے کہ کس وقت کون سا ہنر کا آئے گا، ہوا سے گل کر دے گا؟ اور ظاہر ہے کہ جو چراغ ہوا کی گزر گاہ میں روشن ہو گا، اس کا زیادہ دیر تک جلتے رہنا ممکن ہی نہیں۔ جب سب سے بڑے وجود کا یہ حال ہے تو باقی اشیاء کا سالہ قابلِ توجہ بھی نہیں۔

مولانا طہطاہائی فرماتے ہیں :

”باد استعارہ ہے زمانے کے تجدد و مرد سے، غیر محسوس کو محسوس سے تشبیہ دی ہے، پھر وہ شے حرکت ہے۔ اس سبب سے یہ استعارہ بہت ہی بدیع ہے“

۱۔ شرح :

حالتِ فراق میں ہماری نظریں دیوار اور دودانے پر جگی ہوئی ہیں۔ دیوار پر اس لیے کہ شاید صبا ہوگے ایسے کوئی پیغام لے آئے۔ دودانے پر اس لیے کہ شاید ہمارا خط پہنچا نہلا جواب لے کر آجائے۔ صبا بھی شاعروں کی خبر رساں اور نامور ہے۔ وہ دیوار ہی کے اوپر سے آسکتی ہے۔

یہ ہم جو سحر میں، دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو، کبھی نامہ بُر کو دیکھتے ہیں
وہ آئیں گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے!
کبھی ہم اُن کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں ہرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں
ترے جواہرِ طرٹ کلا کو کس کی دیکھیں
ہم اوجِ طایعِ نعل و گوہر کو دیکھتے ہیں

لہذا مزاقِ زندہ عاشق کی نظریں بار بار دیوار کی طرف اٹھ رہی ہیں۔ قاصدِ درد کا

ہی سے آئے گا، اس لیے دردِ اذہ بھی عاشق کی نظروں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اصل مقصد صرف یہ واضح کرتا ہے کہ حالتِ فراق میں میں محبوب کی طرف سے کوئی نہ کوئی پیغام پہنچنے کا کتنا اشتیاق و انتظار ہے اور یہ طبعی حالت کا نہایت عمدہ نقشہ ہے کہ نظریں دیوار و در پر بھی ہوئی ہیں۔

۲۔ شرح : خواہجہ عالی فرماتے ہیں :

۱۔ اپنے گھر میں مصروف کے آنے سے جو تعجب اور حیرت ہوتی ہے۔ دوسرے مصرع میں اس کا کیا عمدہ تصویر کشی ہے، یعنی کب تک مصروف کو دیکھتا ہے، کبھی اپنے گھر کو دیکھتا ہے کہ اس گھر میں اور ایسا شخص وارد ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ عاشق کو اپنے گھر میں جب تک آمد کا یقین نہیں آتا، اگرچہ وہ آچکا ہے۔ عشقِ حیرت کا عالم طاری ہے۔ کبھی اپنے گھر کی حالت دیکھتا ہے، کبھی محبوب پر نظر ڈالتا ہے۔ کبھی یہ شہر پیدا ہوتا ہے کہ گھر میرا نہیں، کسی اور کا ہے۔ کبھی یہ خیال دامگیر ہو جاتا ہے کہ محبوب نہیں آیا، کوئی اور آیا ہے۔ جہاں کہیں بالکل غیر معمولی اور بغاہر غیر ممکن الوقوع واقعات پیش آ رہے، وہاں صاحبِ خانہ کی کیفیت ہو ہو ہی جاتی ہے۔

۳۔ شرح : خواہجہ عالی فرماتے ہیں :

عشقِ سرتیجی ہو یا مجازی، اس کے زخم کی گہرائی اس سے بہتر کسی اسلوب میں بیان نہیں ہو سکتی۔

لوگ کیوں آ کر میرے جگر کا گھاؤ دیکھ رہے ہیں، جو عدد درجہ گہرا ہے ؟
مشتاقِ نادک ممکن ایسا ہی زخم لگا سکتا تھا۔ مجھے یہ ڈر ہے، کہیں زخم کی گہرائی کا ستائش آمیز ذکر کرنے سے میرے محبوب کے دست و بازو کو نظر نہ لگ جائے
عام قاعدہ یہی ہے کہ جب کسی کی تعریف کرتے ہیں تو نظر بد کا اثر دیکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی کلمہ کہہ جیتے ہیں، مثلاً چشم بد دور، ماشاء اللہ وغیرہ۔ عاشق کی

جہاں شادی اور محبت کے کمالات ملاحظہ ہوں کہ اپنے کاری زخم کا کوئی خیال نہیں، صرف یہ خیال ہے کہ محبوب کے دست و بازو کو نظر نہ لگ جائے۔

مولانا طباطبائی بالکل بجا فرماتے ہیں :

”اس شعر کی خوبی بیان سے باہر ہے۔ بڑے بڑے مشاہیر شعراء کے دیوانوں میں اس کا جواب نہیں نکل سکتا۔“

یعنی لوگوں نے اس کا آخذ فارسی کا مندرجہ ذیل شعر قرار دیا ہے :

بہر کس کہ زخم کاری مارا نظارہ کرد

تا حشر دست و بازو سے اوراد و عائد

نظاہر ہے کہ اس شعر کو مرزا کے شعر سے قطعاً کوئی مناسبت نہیں، اس کے معنوں اور مرزا کے معنوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ بڑی مولویت ہے، وہ خالص عشق ہے۔

۴۔ لغات۔ طرفِ گلہ : ٹوپی کا گوشہ۔ جہاں رقیع کلنی وغیرہ

لگا لیتے ہیں۔

شرح : تو نے اپنے کلاہ کی کلنی میں جو اسیرات ٹانگ لیے ہیں۔ ہمارے

لیے ان سے تیرے ٹخن میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا کہ انھیں بار بار دیکھیں، البتہ

یہ ضرور دیکھ رہے ہیں کہ ماشاء اللہ لعل و گہر کی قسمت کتنی اونچی ہے کہ انھیں

تیری طرف کلاہ میں جگہ نصیب ہوئی۔ مقصود بہر حال وہی ہے۔ لیکن مرزا

غائب جب ذکر کریں گے تو طرف کلاہ کی آرائش نہیں، بلکہ لعل و گہر کی بلند فضا

ہی کا ذکر کریں گے۔

۱۔ لغات۔ روزِ جزا :

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں

وہ دن جب اعمال کا بدلہ لائے گا

شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

یعنی روزِ قیامت۔

کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا بُرائی ہے؟

بلا سے، آج اگر دن کو ابر و بار نہیں

جو آؤں سامنے اُن کے تو سرِ حبا نہ کہیں

جو جاؤں واں سے کہیں کو تو "خیر باد" نہیں

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں

کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب

گد لے کو چڑھے خانہ نامہ مراد نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام

دیبا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

تم کہہ دے کا ذکر ان سے کیوں کرو غائب

یہ کیا کہ تم کو اور وہ کہیں کہ "یاد نہیں"

یہ تو بتاؤ کہ چاندنی رات میں محفلِ ناز و نس جہاں ہائے تو کیا مستفاد ہے؟

مرزا غالب ہی نہیں، بلکہ ہر صاحبِ ذوق کے لیے عرقِ نوشی کے دو

ہی موقعے ہیں۔ یا دن کے وقت ابر چھایا ہو، ترشحِ جو رہا ہو اور ٹھنڈی

جو اچل رہی ہو یا رات کے وقت جب چاندنی پھلکی ہوئی ہو۔ اس شعر میں

شرح : یہ کس نے کہا کہ

میں قیامت کا منکر ہو گیا ہوں؟

یہ غلط ہے میرا اعتقاد قیامت

پر بدستور قائم ہے، البتہ یہ

ضرور کہتا ہوں کہ جدائی کی رات

میں جو مصیبتیں اور مشقتیں عاشق

پر گزری ہیں، ویسی قیامت کے

دن پیش نہیں آ سکتیں، اس

لیے قیامت کا دن سچ کر رات

سے بڑھا ہوا نہیں۔

کہتا معمولی اور عام مسنون

ہے، لیکن محض بیان کی خوبی سے

اسے کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔

۲۔ شرح : اگر آج دنِ محبت

بادل نہیں چھائے اور ٹھنڈی

مرزا غیبِ چیل چلے، سا یہ

شراب کا سا دکھ اور سو سو

نہیں تو نہ سہی، آخر

یہ تو بتاؤ کہ چاندنی رات میں محفلِ ناز و نس جہاں ہائے تو کیا مستفاد ہے؟

مرزا غالب ہی نہیں، بلکہ ہر صاحبِ ذوق کے لیے عرقِ نوشی کے دو

ہی موقعے ہیں۔ یا دن کے وقت ابر چھایا ہو، ترشحِ جو رہا ہو اور ٹھنڈی

جو اچل رہی ہو یا رات کے وقت جب چاندنی پھلکی ہوئی ہو۔ اس شعر میں

نیک ذکر کر دیا۔

۳۔ **لغات**۔ **مرحبا** : دہائیہ کلمہ، کلمہ تحنیں۔ یہ مرحب سے ہے جس کے معنی ہیں کثائش اور فراخی۔ **مرحبا** کہا جاتا ہے تو مقصود یہ ہوتا ہے کہ آنے والے کو بتایا جائے، ہمارا گھر وسیع اور کشادہ ہے، آپ کے لیے کوئی تنگی نہ ہوگی۔
خیر باد : خیریت ہو، اچھے رہو۔

دونوں میں سے **مرحبا** کسی کے آقا و قوت کا، **خیر باد** مجاہد و قوت کلمہ کا ہوتا ہے۔
شرح : مرزا اس شعر میں محبوب کی انتہائی بے توجہی اور بے اتفاقی کا نقشہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں اس کے سامنے جاتا ہوں تو کبھی اس کی زبان پر **مرحبا** کا لفظ نہیں آیا اور اس کے پاس سے کسی طرف جاتا ہوں تو کبھی اس نے **خیر باد** نہیں کیا۔ اس سے بڑھ کر بے نیازی اور بے پرواہی کیا ہوگی۔
۴۔ **شرح** : پہلے شعر سے ظاہر ہوا شعر ہے، یعنی اگر محبوب کو کسی وقت میرا خیال آ بھی جاتا ہے تو وہ یوں ذکر کرتا ہے کہ کیا بات ہے، آج ہماری صفات

چھ کوئی فتنہ و ضلالت نظر نہیں آتا تو بزم میں پہنچ جاتے تھے تو ہر ایک سے ملتے، مطلب یہ ہے کہ جب آکر تو بزم میں پہنچ جاتے تھے تو ہر ایک سے ملتے، جھگڑتے دھتکتے تھے، کبھی بے تکلفی میں کسی کی زبان سے کوئی بات نکل گئی تو مرزا الجھ پڑتے تھے، کبھی کسی نے شوخ نظروں سے محبوب کو دیکھ لیا تو مرزا نے لڑائی چھیڑ دی۔ یوں محبوب کی بزم میں ایک ہنگامہ بپا رہتا تھا۔ مرزا موجود نہیں ہوتے تھے تو ہر طرف سکون و اطمینان نظر آتا تھا۔ پس یہی کیفیت اس شعر میں پیش کی گئی ہے۔

۵۔ **شرح** : عید کے دن تمام فیضوں میں خیرات بٹی ہے، لیکن میں نے لا دستہ یہ نہیں کہ خیرات کے لیے خاص دن کا تعین ہو۔ وہاں ہر وقت سلسلہ داود ہش جاری رہتا ہے۔ میخانے کے کوچے میں جو درویش پھرتے ہیں ان کی سراو بجا رہتی ہے۔ گویا شراب نما، زمانے کے عام دستوروں سے بالکل الگ اپنے خاص دستور رکھتا ہے، جنہیں زمانے کے عام دستوروں پر قیاس نہ کرنا چاہیے۔

۶۔ شرح : اس شعر میں غمزدگی کی انتہائی صورت پیش کی گئی ہے۔ دنیا میں خوشی اور غم نے جملے آتے ہیں۔ آج خوشی ہے تو کل غم ہے۔ آج غم ہے تو کل خوشی ہے۔ خزاں کے بعد بہار اور بہار کے بعد خزاں آتی رہتی ہے کہتے ہیں کہ دنیا میں یہ دستور رائج ہو گا۔ شادی اور غم یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہونگے، لیکن ہمیں ان سے کیا غرض ہے ؟ ہماری حالت تو یہ ہے کہ خدا نے جو دل ہمیں عنایت کر دیا ہے، اس میں شادی اور مسرت کی کوئی صلاحیت باقی نہیں۔ وہ سراپا غم ہے۔ لہذا ہمیں غم کے ساتھ فشاط و مسرت کی کوئی اتید نہ رکھنی چاہیے۔

مولانا طیبانی فرماتے ہیں۔

” دنیا میں غم، شادی کا بہم ہونا اس مقام پر ذکر کرتے ہیں، جہاں دنیا کے سرور، خوشی سے لغزت ظاہر کرنا منظور ہو۔ اس شعر میں مصنف نے تازگی یہ پیدا کی ہے کہ غم و شادی کے بہم ہونے پر حسرت ظاہر کی ہے۔ کہتے ہیں، ہمیں کیا کام ؟ مینی ہم تو محروم ہیں۔ ہم کو تو کبھی ایسی خوشی حاصل نہیں، جو غم سے متصل ہو اور شادی مخلوط بہ غم کی حسرت کرنے سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ شاعر کو انتہائی غمزدگی ہے کہ ایسی بیچ و ناکارہ خوشی کی تمنا رکھتا ہے اور یہی وجہ بلاغت ہے اس شعر میں ؟“

ماہوش بیک محبوب نے وعدہ کیا اور اسے پورا نہ کیا۔ اسے غائب ! اب اس وعدے کا ذکر محبوب سے کیوں کرتے ہو ؟ ذکر کرو گے تو نتیجہ کیا ہو گا ؟ یہ کہ وہ کہ دیں گے، ہمیں یاد نہیں رہا۔ پھر اس سے کیا فائدہ ہو گا ؟ بہتر یہ ہے کہ اس ذکر ہی سے دست بردار ہو جاؤ۔

مولانا طیبانی فرماتے ہیں :

” معشوق کی بد عہدی و وعدہ خلافی کو جو لوگ الٹ پلٹ کر کہا کرتے

ہیں، وہ اس شعر میں تامل کریں کہ اس مضمون کس کو کیا آپ دیکھا
 دیا ہے! مطلب تو یہ ہے کہ میں جب انھیں وعدہ یا دولا تا بہوں
 دے، کہتے ہیں، یا دہنیں، مگر اس مطلب کو علامت گر کی زبانی ادا
 کیا ہے، اس خبر کے پہلو کو ترک کر کے مضمون کو انشاء کے
 سانچے میں ڈھالا ہے۔

تیرے تو سن کو صبا باندھتے ہیں	بہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں
آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے	بہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں
تیری فرصت کے مقابل اے عمر!	برق کو پا پر حسا باندھتے ہیں
قیدِ بستی سے رہائی معلوم	اشک کو بے سرو پا باندھتے ہیں
نشد رنگ سے ہے واشدِ گل	مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں
غلطیہاے مضامین، مت پوچھ	لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں
اہل تدبیر کی دامانڈ گسٹیاں	آہلوں پر بھی حسا باندھتے ہیں
سادہ پُرکار ہیں خواباں، غائب!	بہم سے بیانِ دغا باندھتے ہیں

۱۔ لغات - تو سن : گھڑا۔ کلیں کرنے والے گھوڑے۔

ہوا باندھنا : جھوٹی ساکھ قائم کرنا۔

شرح :- اے محبوب! جس کلیں کرنے والے گھوڑے پر نوسل ہے
 ہم نے اسے صبا کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اس طرح اپنے مضمون کے لیے

جھوٹی ساکھ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یعنی یہ تشبیہ ایسی نہیں کہ ہم اس پر فخر کر سکیں۔

توسن : وہ با اور ہوا کی مناسبت محتاج بیان نہیں۔

۲۔ لغات : ہوا باندھنا : رعب جانا، زور دکھانا۔

شرح : ہم آہ تو کرتے ہیں، لیکن اس کے اثر کی حقیقت ہم پر بھاری واضح ہے۔ آج تک تو اس کا اثر دیکھا نہیں۔ بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس طرح ہم محبوب کے دل پر رعب جاتے اور اسے اپنا زور دکھانے کی کوشش کرتے ہیں، نتیجہ معلوم۔ شعر کی ایک خوبی یہ ہے کہ فرمایا : آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے ؟ یمن اپنی آہ تو بے اثر ہے ہی، مگر اس کی بے اثری کا ایسا یقین دل میں پیوست ہو گیا ہے کہ کسی دوسرے کی آہ کا اثر بھی قابل قبول نہیں سمجھا جاسکتا۔

۳۔ لغات : پا بہ حنا : جس کے پاؤں میں منہدی لگی ہو۔

شرح : اے عمر! تیری فرصت اتنی کم، بلکہ بے حقیقت ہے۔ کہ اس کے مقابلے میں بھلی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کے پاؤں کو منہدی لگی ہوئی ہے۔

مطلب یہ کہ بھلی کی چشمک سے زیادہ کم فرصت کوئی چیز نہیں، لیکن عمر اس کے مقابلے میں بھی اتنی کم فرصت ہے کہ بھلی کے پاؤں کو بھی گویا منہدی لگی ہوئی ہے۔

جس کے پاؤں کو منہدی لگ جائے، وہ اول تو چل ہی نہیں سکتا، چلے گا تو تیز بالکل نہیں چلے گا۔ جس کے مقابلے میں بھلی کے پاؤں کو منہدی لگ جائے، اس کی کم فرصتی کا تصور کرنا چاہیے۔

۴۔ شرح : ہستی کی قید سے رہائی پانے کی کوئی صورت نہیں۔

آنسو کو دیکھیے کہ نہ اس کا سر ہے، نہ اس کے پاؤں۔ گویا وہ ہستی کی قید سے نکل بھاگنے کی پوری تیاری کر چکا ہے، لیکن اسے بھی بے سر و پائی کے باوجود

باندھ دیا جاتا ہے یعنی شراب معنائیں میں اسے بے سرو پاٹی کے باوجود باندھے چلے جاتے ہیں۔ پھر سقا کی قید سے رطوبتی پانی کی کیا صورت ہے ؟

۵۔ لغات :- **واشدر گل** : پھول کا کھلنا۔

شرح : پھول رنگ کے نشے میں پرست ہو کر کھل جاتا ہے سب لوگ جانتے ہیں کہ پرستوں کی تباؤں کے بند کب باندھے جاتے ہیں ؟ مطلب یہ کہ جب پھول نشے کے رنگ میں مست ہو گیا تو اس کی تبا کے بند کھل گئے، گو بادہ کھل گیا۔

پھول کو رنگ کی شراب فطرت نے پلا کر مست کر دیا۔ اس قسم کی محذوں شراب فطرت نے ہر وجود کے لیے مہیا کر رکھی ہے۔ جب یہ شراب رنگ دکھاتی ہے تو ہر وجود کے دل کا فغیر بستہ پھول کی طرح کھل جاتا ہے۔

۶۔ **شرح** : اس شعر کے دو مضمون بالکل واضح ہیں۔ اول یہ کہ نالے کو رسا کہنا اور ظاہر کرنا بالکل غلط ہے۔ دوسرا اور گہرا مطلب یہ کہ اگر نالہ رسا ہوتا تو باندھنے میں کیونکر آتا ؟ اس کا باندھا جاتا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ وہ رسا نہیں۔ یعنی مضمون شعر کی غلطی بالکل ظاہر ہے۔ بندھ جانے ہی سے اس کی رسائی کا بطلان ہوتا ہے۔

۷۔ **لغات** : **واماندگی** : واماندگی کی جمع۔ **تکاث**، **تکان**، **بچارگی**، **لاچارگی**۔

شرح : جو لوگ اپنے آپ کو اہل عمریر یعنی عقل و دانش اور چارہ گر سمجھتے ہیں ان کی بچارگیوں اور لاچاروں پر نظر ڈالیے کہ کسی کے پاؤں میں چپالے پڑ جائیں تو ان پر مٹدی لگاتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ چپالے تو بذات خود چلنے میں مانع ہوتے ہیں امدان پر مٹدی لگا دی جائے تو چلنا اور بھی دو بھر ہو جائے گا۔ یہ تدبیر اور چارہ گری تو نہ ہوتی، بلکہ لاچار کو اور لاچار بنا دیا۔

اس شر سے ضحّا اہل جنوں کی ستائش کا پہلو نکل آیا ، یعنی دو پاؤں کے چالوں کے ساتھ صحرائے پُر خار میں بے تکلف دوڑتے ہیں اور کاتھوں ہی سے چھالوں کا علاج کرتے ہیں ۔

۸۔ لغات - پُرکار : ہوشیار ، چالاک ۔

شرح : اسے غائب ! بیشک محبوب بظاہر سیدھے سادے اور حقیقتاً بڑے چالاک اور ہوشیار ہیں ۔ ان کا کمال دیکھیے ، ہم ایسے لوگوں سے وفاداری کا پیمانہ بندھتے ہیں ۔ گویا ہمیں وفا کا یقین دلانا چاہتے ہیں ، حالانکہ ہم اس فرب میں نہیں آسکتے ۔

ان کی سادگی یہ ہے کہ سمجھ لیا ، ہم ان کے فرب میں آجائیں گے اور پناہ لیں یہ کہ ہمیں فرب دینے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔

۱۔ لغات سخت کم آزار :

حدود بہ کم دکھ دینے والا ۔

شرح : اسد میں

غائب کی جان کی قسم زمانہ

زمانہ سخت کم آزار ہے بہ جان اسد

وگر نہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

اپنے آپ کو بہت آزار دینے والا سمجھتا ہوگا ، یعنی اس کا خیال یہ ہوگا کہ میں لوگوں کو بہت دکھ پہنچاتا ہوں ، حالانکہ جتنا آزار اب تک میں پہنچا ہے ، وہ تو بہت کم ہے ۔ ہم تو امید رکھتے بیٹھے تھے کہ اس سے بہت زیادہ دکھ دیا جائے گا ۔ شر میں بظاہر دکھ نہ لینے کی زیادہ سے زیادہ بہت کا اظہار کیا ہے ۔

گویا زمانے نے مصائب کے جو جام پے در پے ہمارے لبوں کو لگائے ، وہ ہمارے غریب برداشت کے مقابلے میں بہت کم تھے لیکن اسی سلسلے میں یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ زمانے نے ہمیں دکھ دینے میں اپنا طرت سے کوئی کسر اٹھا رکھی ۔ یہاں بہ ہم نہ معنی اس سے زیادہ دکھ برداشت کر سکتے تھے ، بلکہ

امید بھی یہی تھی کہ اس سے زیادہ دکھ دیے جائیں گے۔ گویا حقیقت اس شعر میں بھی اپنی نثرِ آلام زندگی کا نقشِ بڑے اثر انگیز انداز میں کھینچا ہے۔

ادھر شرح : میری

زندگی ناکارہ، ایچ اور قابلِ نثر ہے، کیونکہ میں پتھر بنا۔ اے کاش! پتھر ہوتا تو ہمیشہ محبوب! تیرے دروازے پر پڑا رہتا۔

عام قاعدہ تھا کہ کلاؤں کے صحن گلیوں سے اونچے رکھتے تھے اور آمد و رفت کی آسانی کے لیے دبیر کے ساتھ ایک پتھر لگادیتے تھے۔ آج کل یہی کام سینٹ یا انٹوں کے پاؤں سے لیا جاتا ہے۔ اس پتھر کو سنگ در یعنی دروازے کا پتھر کہتے تھے۔

شاعر کہتا ہے، اگر میں پتھر ہوتا تو تیرے دروازے پر پڑا رہتا۔ آتے جاتے تیری پاؤں نصیب ہوتی۔ اب میری زندگی کس کام کی ہے کہ تیرے

داغِ ٹپڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ سمپھر نہیں ہوں میں
کیوں گردشِ مدام سے گھبرانے مل
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟
لوح جہاں پہ حرفِ مکر نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں، عقوبت کے واسطے
آخر گندگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں
کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
عللِ دُور و زور و گوہر نہیں ہوں میں
رکھتے ہو تم قدمِ بری آنکھوں سے کیوں دینے
رُتبے میں نہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منج قدم بوس کس لیے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں؟

غالب و ظیفہ خواہ ہو، دوشاہ کو دعا
وہ دن گئے، جو کتے تھے، نوکر نہیں ہوں میں
دروازے تک نہیں پہنچ
سکتا اور وہیں نہیں پڑا رہتا۔
۴۔ لغات۔ گردشِ ہلام :
داغی گردش، ہمیشہ پھرتے رہنا۔

شرح : شراب کی محفل میں پیالہ و ساغر ہمیشہ گھومتے رہتے ہیں۔ ان کا وظیفہ ہی یہی ہے کہ چکر میں رہیں تاکہ مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگ باری باری نوبت بہ نوبت شراب پیتے جائیں۔ لیکن یہ کام پیالہ و ساغر کا ہے، جن کا خاصہ ہی ہمیشہ گھومتے رہنا ہے۔ میں انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں کہ پیہم اور مسلسل گردش سے میرا دل گھبرا د جائے۔ پھر کون سی وجہ ہے کہ میں اس مسلسل گردش میں مبتلا ہوں؟ کیا آسمان نے مجھے انسان کی جگہ پیالہ و ساغر سمجھ لیا ہے؟
۴۔ لغات۔ حرفِ مکثر : وہ حرف جو غلطی سے دوبارہ لکھا جائے۔
ایسا حرف مٹا دیتے ہیں اور غلطی کی تلافی ہو جاتی ہے۔ مرزا نے مٹائے جانے کی بنا پر اپنے آپ کو حرفِ مکثر یعنی حرفِ غلط سے تشبیہ دی ہے۔

شرح : اے اشد! زمانہ کیوں مجھے مٹا لینے کے درپے ہے؟ کیا میں جہان کی حقنی پر کوئی ایسا حرف ہوں جو دوبارہ لکھے جانے کے باعث غلط قرار پایا ہو اور اسے مٹا دینا ضروری ہو؟
مولانا طباطبائی فرماتے ہیں،

اگر یوں کہتے کہ زمانہ مجھے حرفِ غلط کی طرح مٹائے دیتا ہے تو
اس قدر بلیغ نہ ہوتا، جس قدر اب بلیغ ہے اور بلا عنت کی وجہ
ذیادتی معنی ہے اب اتنے معنی اور بڑھے ہیں کہ باوجودیکہ میں
حرفِ مکثر نہیں ہوں اور کوئی وجہ میرے مٹانے کی نہیں ہے
(بہ این مجد) زمانہ مجھے مٹا رہا ہے۔

اس شعر سے یہ نکتہ سمجھنا چاہیے کہ ایک تشبیہ مبتذل میں

زیادتی معنی پیدا کرنے کا کیا طریقہ ہے۔ پھر زیادتی معنی سے
بلاغت کس قدر بڑھ جاتی ہے۔

۴۔ لغات - عقوبت : عذاب ، تعذیب ، سزائی ، بعض اصحاب
نے سزا و عقوبت کو ہم معنی بتایا ہے ، لیکن معاملہ عام و خاص کا ہے۔ یہ ایسی
ہی بات ہے ، جیسے محض سزائے قید اور قید با مشقت دونوں ایک چیز نہیں۔
شرح : جزا و سزا کا عام اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ مومن کو گناہوں کے
مطابق سزائے گی اور وہ سزا دائمی نہ ہوگی ، لیکن مشرک و منکر کے لیے سزا کی
کوئی حد نہیں خود قرآن کہتا ہے : ان الله لا يعصون اشيئاً بد . (اللہ نہیں
بخنے گا جو اس کے بارے میں شرک کا مرتکب ہو گا) اسی عقیدے کی بنا
پر مرزا کہتے ہیں کہ گناہوں کی سزا میں مجھے جو عذاب دیا جا رہا ہے اس کی
کوئی حد تو ہونی چاہیے۔ میں گنہگار ہوں ، کافر نہیں ، یعنی مجھے گناہوں کے
مطابق سزا دی جا سکتی ہے ، جو بہر حال عارضی ہونی چاہیئے۔ کفر و شرک کی
طرح دائمی سزا کا مستوجب تو نہ سمجھنا چاہیئے۔

۵۔ ۶۔ ۷۔ لغات - قدم بوس : پاؤں چومنا۔

شرح : یہ تینوں شرفیہ سببے جلتے ہیں اور یقیناً انہیں اور معنی پر
محول نہیں کیا جا سکتا۔ یا رسول اللہ (صلعم) حضور اس عاجز کو کس وجہ سے عزیز
نہیں جانتے ؟ میں لعل نہیں ، زمرہ نہیں ، سوتا نہیں ، مرقی نہیں ، یعنی مجھے میں دنیوی
دولت کی کوئی خصوصیت موجود نہیں۔ دنیوی دولت تو حضور والا کی نگاہوں
میں برابر بے وقعت رہی۔ جب میں دولت کے لوٹ سے پاک ہوں تو حضور
مجھے عز و عزیز قصود فرمائیئے۔ حضور والا نے معراج کی رات سرواہ کو قدم لگا دیا۔
میں درجے میں سرواہ سے کم نہیں ، پھر عز و میری آنکھوں کو قدم مبارک سے کیوں
مشرقت نہیں فرماتے ؟ حضور نے معراج کی رات آسمان کو قدم بوسی کا شہادت عطا
فرمایا ، لیکن مجھے یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ کیا آپ کا یہ قدام آسمان کے ہی

برابر نہیں ہے

۸۔ **شرح :** اسے غالب ! تم بادشاہ کے ولیعز و خوار ہو۔ بارگاہ و شاہی سے
تقصیر باقاعدہ تخرام ملتی ہے ، لہذا بادشاہ کو دعا دو۔ اب وہ وقت تو نہیں رہا عجیب
کہا کرتے تھے : میں بادشاہ کا نوکر نہیں ، اب تو تصاری ملازمت کا باقاعدہ انتظام ہو
گیا ہے۔

مرزا غالب ۳ جولائی ۱۸۵۷ء کو ملازم ہوئے تھے۔ انہوں نے ہدایت
عرشی صاحب خود نواب کلب علی خاں والی رام پور کو ۱۸۵۷ء میں لکھا کہ حسب
شاء دہلی نے مجھے نوکر رکھا ، خطاب دیا اور خدمت تاریخی نگاری تفویض کی
تو میں نے یہ حزل طرز تازہ پر لکھی۔
ظاہر ہے کہ یہ حزل ۴۔ جولائی ۱۸۵۷ء کے بعد قریبی زمانے کی ہے۔

۱۔ **شرح :** شاعر
کی نظر لالہ و گل کے من
پر پڑی تو خیال آیا کہ
ایسی چیزیں تو صرف
حسینوں کی مٹی سے
پیدا ہو سکتی ہیں ساتھ
یہ سوچا کہ خدا جانے
زمین میں کیسی کیسی مٹی
جا چکی ہیں ، جنہوں نے
ظہور تازہ کے لیے لالہ گل
کی شکل اختیار کی ، کیسی
جتنے حسین زیریں جا

سب کہاں ، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگ و رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاقِ نیاں ہو گئیں
تیس بناتِ اشعثِ گروں کو پروں میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عرماں ہو گئیں
قید میں یعقوب نے لی گوئیوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزِ دین دیوارِ زنداں ہو گئیں

چھتے ہیں، وہ سپ توین
 پھولوں کی شکل میں
 نمایاں نہیں ہو سکتے،
 ان میں سے کچھ توں
 جلوہ گری پر آمادہ
 ہو گئے ہیں۔

لادو گل کی صفائے
 اور درباری نے حساس
 شاعر کے دل میں یہ
 سلسلہ خیالات پیدا کر
 دیا۔ کمال یہ ہے کہ
 اس کی نظر لادو گل
 کی صفائی میں الجھتی ہیں
 بلکہ مگر ان صدقوں
 کی طرف متغزل ہو گئی
 جو زمین میں جا چکی ہیں
 اور ان میں سے سب
 نہیں، کچھ یوں حال
 افزہ ہو تیں۔

بہمن اصحاب نے
 اس شعر کا ماخذ خیام
 کی ایک رباعی اور شمس
 کے ایک شعر کو قرار دیا

سب رقیبوں نے ہوں ناخوش، پر زمانِ سحر
 ہے زکینا خوش کہ محو ماہِ کنکس ہو گئیں
 جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
 میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں
 ان پر سی زادوں سے یس گے غلہ میں ہم انتقام
 قدتِ حق سے یہی حو ریں اگر واں ہو گئیں
 فینداس کی ہے داغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
 تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشیاں ہو گئیں
 میں جن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
 بلبلیں سن کر مرے تالے، غزل خواں ہو گئیں
 وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں، یارب! دل کپڑے
 جو مری کوتاہی قسمت سے، مڑگاں ہو گئیں
 بسکہ روکائیں نے اور سینے میں ابھریں پے پر پے
 میری آہیں بخیہ چاک گر سیاں ہو گئیں
 واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
 یاد تھیں جتنی دعائیں، صرف ورباں ہو گئیں

جہاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
 سب لکیریں ہاتھ کی، گویا، رگ جہاں ہو گئیں
 ہم موقوف ہیں، ہمارا کیش ہے ترک رسوم
 ملتیں جب مٹ گئیں، اجڑے ایماں ہو گئیں
 رنج سے خوگر ہوا انسان، تو مٹ جاتا ہے رنج
 مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آسماں ہو گئیں
 یونہی گر روتا رہا غالب! تو اے اہل جہاں!
 دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں
 یہ چاند جیسے کھڑے داسے کی خاک سے اٹکا ہے۔

خسرو کا شعر ہے :

اے گل، چو آدمی نرزمین گو چگونہ اند
 آں دوسے ہاک ورتہ گرد فنا شدند

یعنی اے پھول! تو زمین سے نکلا ہے، بتا، ان چہروں کا کیا حال ہے جو
 فنا کی گردش کے نیچے دب گئے؟

نظا ہر ہے کہ ان دولوں شعروں کو غالب کے شعر سے کوئی خاص نسبت نہیں
 خیام نے سبزے کو مجبوروں کے سبزہ خط سے لگا لگا دکھا دیا کہ اس پر پاؤں نہ رکھنا
 چاہیے۔ خسرو نے پھول زمین سے نکلا ہوا دیکھا تو پوچھا کہ جو گل نہ بخ اس میں
 دفن ہو چکے ہیں، بتا ان کی کیا کیفیت ہے؟

ان کے برعکس غالب صرف یہ کہتا ہے کہ لالہ و گل کی شکل میں تمام حسین تو

ہے خیام کہتا ہے :
 ہر سبزہ کہ بولن دجے رفت است
 گویا زب فرشتہ خمرے رفت است
 پا بر سر سبزہ تا بہ غوا ری زانی
 کال سبزہ ز خاک لہر ز رفت است
 یعنی ہر سبزہ ندی کے
 کنارے اٹکا ہے، سمجھنا
 چاہیے کہ کسی فرشتہ خور
 کے لب پر سے اٹکا ہے
 دیکھ اس سبزے کو ذلیل
 سمجھتے ہوئے بے خیال
 سے پاؤں نہ رکھ، کیونکہ

نمایاں نہیں ہو سکتے تھے، ان میں سے کچھ نمایاں ہونے میں، پھر لادو گل کی دھانی دیکھ کر کہتا ہے : خدا جانے کیا کیا صورتیں ہوں گی، جو زمین میں جا چکی ہیں۔ اس نے پورے منظر سے دنیا کی بے ثباتی کا جکھانہ نکلتے پیدا کیا اور اسے نہایت پرتاثر و دلپذیر انداز میں پیش کر دیا۔

۲۔ لغات - نقش و نگار طاقِ نسیاں : بھول کے طاق کی ذہنیت و آرائش۔

شرح :- ہمیں بھی رنگ رنگ کی محفیں سجانا یاد تھا، لیکن اب وہ محفیں بھول کے طاق کی آرائش و زیبائش بن گئیں، یعنی بالکل بھول گئیں اور فراموشی کی نذر ہو گئیں۔

یہ شعر ان لوگوں کے لیے درسِ عبرت ہے، جو جوانی کے عالم میں رنگارنگ محفیں آراستہ کرنا کے واسطے رہتے ہیں۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ اس شعر میں ”بھی“ کا لفظ دیکھنا چاہیے یہ دوسری کا لفظ نکال دیا جائے تو سوچیے، معنی شعر میں کس قدر کمی آجائے گی۔ اس لفظ نے جو زائد معنی پیدا کیے، یہ ہیں :

”جس طرح تم لوگ رنگارنگ جیسے کیا کرتے ہو، کبھی ہم کو بھی ان صحبتوں کا شوق تھا، لیکن اب ہمارا حال دیکھ کر تم کو عبرت کرنا چاہیے کہ شباب کو قیام نہیں ہے۔“

۳۔ لغات - بناتِ التئش : نفی معنی نقش اٹھانے کا شمال جانب سا ستارے ہیں۔ چار کھٹوے کی شکل میں ہیں، جنہیں نقش کہتے ہیں اور تین ٹکے ہوئے ہیں، جنہیں بنات کہا جاتا ہے یعنی نقش اٹھانے والے۔ تین ستاروں میں سے بیچ والے کے پاس ایک چھوٹا سا ستارہ ہے، جو بٹھا کہلاتا ہے۔ یہ ستارے قطب کے ارد گرد گھومتے رہتے ہیں۔ چاند اٹھانے والے

کو عربی میں - ابن النعش - کہا جاتا ہے اور اس کی جمع عربوں کے
 محاورے میں - بنات النعش - ہے - فارسی میں انھیں - سروختر -
 بھی کہا گیا ہے - اور اردو میں ساتوہ ستاروں کو سات سیلیوں
 کا جبر کا یا گنچا یا سات سیلیاں بھی کہتے ہیں - ان کا ایک نام
 عقیدت یا بھی ہے -

شرح : بنات النعش دن کے وقت تو پردے میں چھپی رہیں اور
 لڑکیوں کے لیے ہی زیبائتھا کہ دن کی روشنی میں بے پردہ نہ ہوں اور چہرے
 چھپائے رکھیں - رات کو خدا جانے ان کے دل میں کیا آ یا کہ لڑکیاں بے پردہ
 ہو گئیں اور نقاب چہروں سے اتار دیے -

مرزا نے اس شعر میں بنات کے لفظ سے ناٹھ اٹھایا ہے - بنات النعش
 عربی محاورے میں تو ابن النعش کی جمع ہے ، لیکن مرزا نے بنات سے
 لڑکیاں مراولے کہ دن کے وقت اللہ کے چھپے رہنے اور رات کو بے پردہ
 ہو جانے کا معنوم پیدا کر لیا -

بظاہر مرزا نے صرف ایک منظور کش انداز میں پیش کر دیا ہے ، لیکن
 کوئی شخص چاہے تو یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ سات سیلیوں نے محبوب کی بزم شبینہ
 کے نظارے سے لطف اندوز ہونے کے لیے چہروں سے نقاب اٹھ دیے -

۴ - شرح : بجزوری مرحوم فرماتے ہیں :

”حضرت یعقوب کی آنکھیں فرزند کے فراق میں روتے روتے
 سفید ہو گئی تھیں - مرزا کی فکر سنانے اس سے تاثیر عشق کا کیا
 طرہ معنوں پیدا کیا ہے - کہ وہ مدون ، جو دیوار زندان یوسف
 میں ہیں ، حضرت یعقوب کی نابینا آنکھیں ہیں ، جو اپنے فرزند کو
 دیکھتی رہتی ہیں - سفید نابینا آنکھوں کو مدون سے جو مشابہت
 ہے ، ظاہر ہے - قطرہ قطرہ پانی اگر کہیں گرتا رہتا ہے تو مر مراد

فولاد تک میں سوراخ کر دیتا ہے۔ حضرت یعقوبؑ کی مام اٹھنا سے دیوار زنداں میں سوراخ ہو گئے ہیں۔ جس طرح روزِ دن دیوار کبھی بند نہیں ہوتے، حضرت یعقوبؑ کی تابنا آٹکھیں بھی بند نہیں ہوتیں۔ رات دن بے خواب جانبِ یوسفؑ مگر ان رہتی ہے۔ حضرت یعقوبؑ کی آنکھیں روزِ دن دیوارِ زنداں ہو گئیں تاکہ تاریکی اور محبس سے یوسفؑ کا دم خفا نہ ہو۔ آنکھیں روزِ دن دیوارِ زنداں ہو گئیں تاکہ یوسفؑ زنداں سے دنیا کا تماشا دیکھ سکیں اور تنہائی سے پریشان نہ ہوں ۝

شاعر کی مراد یہ ہے کہ اگرچہ دنیا بہر حضرت یوسفؑ سے ربط و تعلق قائم کرنے کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی، کیونکہ قدرت کو یہی منظور تھا، حضرت یوسفؑ کو جس اورچ کمال پر پہنچانے کے لیے مصائب کا ریلہ ان پر آیا تھا، وہ اس پر پہنچ جائیں اور ان کی معنوی تکمیل کا سلسلہ پورا ہو جائے، پھر باپ اور بیٹے میں یکجائی کی صورتیں پیدا ہوں، یہاں ہر حضرت یعقوبؑ فرزندِ ارجمند کی تلاش سے ایک لمحے کو بھی غافل نہ ہوئے اور سعی و تلاش کی آخری حد یہ تھی کہ حضرت یوسفؑ زنداں میں پہنچے تو حضرت یعقوبؑ کی آنکھیں زنداں کی دیوار میں روزِ دن بن گئیں۔

۵۔ لغات۔ زنانِ مصر: مصر کی وہ عورتیں، جنہوں نے عزیزِ مصر کی بیوی (زلیخا) کو طعنہ دیا تھا کہ وہ اپنے ایک غلام پر فریفتہ ہو گئی۔ قرآن مجید کے بیان کے مطابق عزیزِ مصر کی بیوی نے ان عورتوں کو دعوت دی۔ کھانے پینے کا سامان سجا دیا۔ جب وہ کھانے میں مصروف ہو گئیں تو یوسفؑ سے کہا کہ ان کے سامنے آ جائیں۔ انہوں نے یوسفؑ کو دیکھتے ہی اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور بے اختیار پکار اٹھیں کہ یہ تو انسان نہیں، بلکہ ایک فرشتہ

ہے، بڑے مرتبے والا فرشتہ اس طرح ان عورتوں پر حضرت یوسفؑ کی عظمت و منفیت آشکارا ہو گئی اور عورتوں کا طعن و تشنیع باطل ثابت ہوا۔

مشرح : مرزا نے اس داستان سے یہ مضمون پیدا کر لیا کہ دنیا بھر کے لوگ رقیبوں سے ناغوش رہتے اور جلتے ہیں، لیکن عزیز مصر کی بیوی یعنی زلیخا ان رقیب عورتوں سے خوش ہے، جو حضرت یوسفؑ کی عظمت کی مسترت ہو گئی تھیں اور زلیخا کے خلاف طعنہ زنی پر پشیمانی ہوئی تھی۔

۶۔ **مشرح :** جہاڑی کی شام آگئی۔ اندھیرا چھا رہا ہے۔ میری آنکھوں سے خون کی ہوند تپ رہی ہے، اسے بھنے دیجیے۔ میں یہ سمجھوں گا کہ اس اندھیرے میں ابالا کرنے کے لیے دو شمعیں روشن ہو گئی ہیں۔ گویا آنکھوں سے خون بھنے کو چراغ کی روشنی سے تشبیہ دی۔

۷۔ **مشرح :** ان حسینوں نے دنیوی زندگی میں ہم پر جو مظالم ڈھائے اور جو آفتیں نازل کیں، ان کا بدلہ بہشت میں لیا جاسکے گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہی حسین وہاں حوریں بن جائیں۔

جسے سے یہ مراد نہیں کہ ہم ان پر ظلم و ستم کریں گے، مراد صرف یہ ہے کہ زندگی میں ہم ان کی رضا کے تابع رہے اور بہشت میں پہنچ جانے کے بعد یہ ہم پر زیاد حوریں بن کر ہماری رضا کے تابع ہو جائیں گے۔

۸۔ **مشرح :** زلفوں کے پریشان ہونے سے اشارہ اغلاط کی گرجویش کی طرف ہے۔ اے محبوب! تو جس خوش نصیب عاشق کے بازو پر سر رکھ کر محو استراحت ہو اور تیری زلفیں بازو پر کبھری ہوئی نظر آئیں تو نیند کی حقیقی راحت اسی کو حاصل ہوگی۔ وہ اپنے آپ میں پھولا نہ سائے گا اور اس کا دل باغ سب سے ادھنچا ہوگا۔ راتیں بھی اسی کی لطف و مسترت اور نشاط و شادمانی میں بسر ہوں گی۔

مرلا تا لمبا بھائی فرماتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ شعر بیت الغزل

اور کارنامہ ہے۔

۹۔ شرح : میں نے چمن میں جاتے ہی درد بھرے نالے کیے تو بلبلوں

کے دل پر ایسا اثر پڑا کہ انہوں نے ایک دم غزل خوانی شروع کر دی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ چمن نہیں، بلکہ ایک مکتب، ایک درس گاہ ہے، جس میں بچھا پنا اپنا آموختہ یاد کر رہے ہیں۔

شاعر کے نالے سن کر بلبلوں کا غزل گواں ہوتا اس امر کی دلیل ہے۔ کہ بلبلوں نے ان نالوں میں عشق و محبت کا ایسا سوز پایا کہ وہ خود بے اختیار ہو کر اپنے درد عشق کے اظہار پر مجبور ہو گئیں۔

بعض اصحاب نے اس سلسلے میں نعمت خان عالی کا یہ شعر پیش کرنا پسند

فرمایا ہے :

آب در نگاہ گلستانِ عشق اکنوں ازمین است

عند لیباں ہر چہ می گویند مضمون ازمین است

یعنی بارخِ عشق کی رونق اب حرف میرے دم سے ہے۔ بلبلیں جو کچھ بھی کہتی ہیں، مضمون مجھ سے لیتی ہیں۔

ہر صاحب ذوق پر آشکارا ہے کہ دونوں شعروں کا مضمون ایک نہیں اور نعمت خان عالی کا شعر غالب کے شعر کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

۱۰۔ لغات : کوتاہی قسمت : کم نصیبی، بد قسمتی۔

شرح : خواہ عالی فرماتے ہیں :

”نگاہوں کے مڑگاں ہونے سے یہ مراد ہے کہ شرم و حیا کے

سبب اوپر نہیں اٹھتیں، بلکہ پلکوں کی طرح نیچے ٹھکی رہتی ہیں۔“

اگرچہ شرم و حیا کے باعث محبوب کی نگاہیں اوپر نہیں اٹھتیں اور میری

کم نصیبی کے باعث نیچے ٹھکی رہتی ہیں، گویا ان کی حیثیت بظاہر مڑگاں کی ہے

لیکن اسے خدا ! یہی ننگا ہیں میرے دل کے پار کیوں ہوئی جاتی ہیں ۔
 مطلب یہ کہ ظاہری کوتاہی کے باوجود دل تک ان کی رسانی اور تاثیر و نفوذ
 میں کوئی کمی نہیں آتی ۔ یہ چیزیں بیان سے نہیں ، احساس سے قلمبند رکھتی ہیں جس
 کا ایک پہلو مڑگاں کی درازی بھی ہے ، لیکن مڑگاں انتہائی درازی کے باوجود
 ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتیں ۔ ننگا ہوں کی تاثیر دور تک جاتی ہے ، مگر
 جو ننگا ہیں مشرم و حیا کے باعث سمٹ کر مڑگاں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں یعنی
 جھکی رہتی ہیں ، ان کا حسن اور ان کی جاذبیت بھی ویرنی ہے ، اسے بیان میں نہیں
 لایا جاسکتا ۔ اسی دلاویزی کو مرزا نے زیرِ غور شعر میں واضح کیا اور حق یہ ہے
 کہ اصل نکتے کی توضیح کے لیے اس سے بہتر طریقہ ذہن میں نہیں آسکتا ۔

۱۱۔ شرح : میں آہوں کو بار بار سینے میں روکتا تھا اور وہ بار بار جوش و فدا
 سے ابھرتی تھیں ۔ اس طرح پہلے ، پے دبانے اور ابھرنے ، دبانے اور ابھرنے
 کا منظر پیدا ہو گیا ۔ گویا کپڑے کی سلائی کی سی صورت سامنے آگئی ، کیونکہ سلائی
 یعنی بنچے میں بھی دھاگا پیچے اوپر ، نیچے اوپر ہوتا رہتا ہے ۔ اس دھک آہوں
 کو روکنے اور ابھرنے کا عام منظر تھا ۔ بنچے کا سلسلہ ہاتھ آگیا تو مرزا نے اسے
 چاک گر یاں کی سلائی سے تعبیر کر لیا ۔ لطف یہ کہ گر یاں عموماً سینے ہی پر سے
 چاک ہوتا ہے ۔

مصنوع محض خیالی ہے ، اگرچہ اسے رنگ ایسا دے دیا گیا ہے کہ بالکل
 واقعی اور فطری معلوم ہوتا ہے ۔

۱۲۔ شرح : خواجہ عالی مرزا تھے ہیں :

”اب نئی دعا تو کوئی ذہن میں باقی نہیں رہی اور وہ مستقل دعائیں
 جو وہاں کو دے چکا ہوں ، دوست کے حق میں صرف کرنے کو ہی
 نہیں چاہتا ۔ شعر میں جو اصل غرض اور لطافت ہے وہ یہ ہے کہ
 گامیوں کے جواب میں دعائیں دینے کو ایک ایسی ضروری بات

ہونا ہی ہر کرتا ہے گویا اس کو ہر شخص ضروری جانتا ہے۔ کیونکہ
 سب سے حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ تاؤ، ان کی گالیوں کا کیا
 جواب دوں گا۔ جبکہ دعائیں سب نبٹ چکیں۔

شاعر کہتا ہے کہ میں محبوب کے پاس گیا۔ جتنی دعائیں مجھے یاد تھیں، وہ
 سب کی سب دربان کو دے دیں، جس کی مہربانی کے بغیر شاعر اندر داخل نہیں
 ہو سکتا تھا۔ پھر محبوب سے ملاقات ہوتی تو اس نے معمول کے مطابق بڑا سبلا
 کہنا شروع کر دیا۔ اب شاعر حیران ہو کر اس پاس والوں سے پوچھتا ہے کہ میں
 ان گالیوں کا جواب کیا دوں؟ صرف دعائیں دے سکتا ہوں، لیکن دعاؤں کے
 سلسلے میں مصیبت یہ پیش آئی کہ جتنی مجھے یاد تھیں، وہ دربان کو دے دیں۔ جو
 دعائیں دربان کے لیے صرف ہو چکیں، وہ محبوب کے لیے استعمال کرنا مناسب
 نہیں سمجھتا۔

شعر میں یہ حقیقت واضح کرنا مقصود ہے کہ تجتنے وسائل عاشق کے پاس
 تھے، وہ سب اصل مقصد کے قریب پہنچنے میں صرف ہو گئے۔ اب مقصد سے
 استفادے کے لیے کون نئے وسائل سے کام لیا جائے؟

۱۳۔ شرح : شراب جان کے لیے تازگی اور قوت و توانائی کا موجب
 ہے۔ جس شخص کے ہاتھ میں شراب کا پیالہ آ جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
 ساتھ ہی اس کے ہاتھ کی ٹکیریں رگ رگ ماں بن جائیں گی، یعنی شراب ٹکیروں کی
 رگوں کے ذریعے سے تازہ خون جان تک دوڑا دے گی۔

مولانا طہطاوی فرماتے ہیں کہ اس شعر میں لفظ ”گویا“ خاص توجہ کا محتاج
 ہے۔ عام شاعر ”گویا“ کا لفظ شعر میں بھرتی کے طور پر استعمال کرتے ہیں، لیکن
 اس شعر کی کیفیت بالکل دوسری ہے۔ یہاں شاعر نے اس لیے ”گویا“ کا لفظ
 استعمال کیا کہ مبالغہ و اسکان سے حجاب و زنا نہ کر جائے۔ یعنی وہ یہ نہیں کہتا کہ ٹکیریں
 سچ جی رہیں، جان بن گئیں، کہتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رگ رگ ماں بن گئیں۔

گویا مبالغے کو حد کے اندر رکھا اور اغراق نہ بنایا، جو عموماً بڑا سمجھا جاتا ہے۔
 ۱۴۔ لغات : مؤتجد : توحید پرست، خدا کو ایک ماننے والا۔
 وحدت مبداء کا قائل۔

کشیش : مسلک و مشرب، طریقہ۔

رُسوم : رسم کی جمع، مراد یہ ہے۔ بہ طور خود اختیار کردہ طور
 طریقے یا جنہوں نے رفتہ رفتہ مستقل مذہبی حیثیت اختیار کر لی۔
 ملت : فرقہ، گروہ، قوم، مذہب۔

شرح : خواجہ سائی فرماتے ہیں :

”تمام ملتوں اور مذہبوں کو منجھ دیگر رسوم کے قرار دیتا ہے، جن
 کا ترک کرنا اور مٹانا موحّد کا اصل مذہب ہے اور کہتا ہے کہ
 یہی قیمتیں جب مٹ جاتی ہیں تو اجزائے ایمان بن جاتی ہیں۔“
 مولانا طہطاہی نے اس شعر کی تشریح فلسفیانہ نقطہ نگاہ سے فرمائی ہے،
 وہ کہتے ہیں :

”ہم موحّد میں یعنی وحدت مبداء کے قائل ہیں اور اس کی ذات
 کو واحد سمجھتے ہیں اور واحد وہ ہے، جس میں نہ تو ”اجزائے مقداری“
 ہوں، جیسے طول، عرض وغیرہ اور نہ ”اجزائے ترکیبی“ ہوں جیسے
 میوئی صورت اور نہ ”اجزائے ذمّی“ ہوں، جیسے جنس و فعل۔

عرض اس کا علم محض سلبیات کے ذریعے سے حاصل ہے، جیسے
 کہیں کہ اس کا کوئی شریک نہیں ہے، وہ جسم نہیں ہے، وہ
 متخیّر نہیں ہے، وہ مرفی نہیں ہے، وہ حادث نہیں ہے
 یہی سب سلبیات ہیں کہ ان کے اعتقاد سے اور سب ملّاتیں

باطل و محو ہو جاتی ہیں۔ اور یہی عین اجزائے توحید ہیں۔“

ظاہر ہے کہ ذات باری تعالیٰ کے اس تصور سے فنی صفات کا راستہ

صاف ہو جاتا ہے۔ ایجاب و اثبات کا کوئی ذریعہ ہاتھ نہیں آتا۔ قرآن مجید نے خدا کا جو تصور پیش کیا، اس کا یہ پہلو تو بالکل واضح ہے کہ جس حد تک انسانی عقل کی پہنچ ہے، صفاتِ باری تعالیٰ کو مخلوق کی مشابہت سے پاک اور بلند رکھا جائے، اسی کو اصطلاح میں تنزیہ "کہتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ "تعطیل" کا راستہ کھول دیا جائے، یعنی صفات کی نفی کر دی جائے۔ قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کے لیے صفاتِ خیر کا تصور پیدا کیا، ساتھ ہی مشابہتِ مخلوق کی نفی بھی کر دی۔ وہ خدا کی تمام صفات کو حسن و خوبی کی صفات قرار دیتا ہے یعنی وہ حق ہے، قیوم ہے، رب ہے، قادر ہے، رحیم ہے، صمد ہے، بعیر ہے، علیم ہے، لیکن ان صفات کا تصور عام انسانی صفات سے بالکل بالا ہے، لہذا انہی صفات کی تعبیر مرزا غالب کے اس شعر کے لیے کچھ موزوں معلوم نہیں ہوئی۔ مقصود یہ نہیں کہ مرزا غالب کے ہر شعر کو اسلامیات کی قراؤں میں تولنے کی کوشش کی جائے، تاہم اگر ایسی تعبیر ممکن ہو، جو تعطیل یعنی نفیِ ثبات کی طرف نہ لے جائے، تو اسے اختیار کر لیتے ہیں تا کہ نہ ہونا چاہیے جس حد تک میں سمجھ سکا ہوں، شعر میں بنیادی حیثیت توحید کو حاصل ہے اسی پر مرزا نے نور دیا ہے اور توحید ہی ہر پہلے اور الہامی مذہب کی اصل بنیاد ہے۔ مرزا سمجھتے ہیں کہ جن لوگوں نے مختلف فرقے، گروہ، جماعتیں اور قومیں بنالیں، انہوں نے اختلافات کی بنیاد ان رسوم پر رکھی، جو بطور خود اختیار کر لیں اور وہ مذہب کی بنیاد و اساس یعنی توحید کے تحفظ پر مبنی نہ تھیں۔ میں ممتد ہوں، میرے سلسلے کا آغاز توحید سے ہوتا ہے بنگرہد ہوں نے توحید کو مرکز نہ مانا اور الگ الگ رسوم کے پابند ہو گئے، وہ دراصل توحید پر ایمان ہیں سچے اور مخلص نہ تھے۔ اب ان اختیار کردہ رسوم کو ہم جس حد تک ترک کرتے جائیں گے اور توحید کو بنیاد و اساس بنائے رکھیں گے، اصل مقصد حاصل ہو جائے گا۔ گو یا مختلف گروہوں کے درمیان کش مکش کے

جو سامان موجود ہیں، وہ گھٹتے جائیں گے۔ ان کا زور افزاوتیت کے بجا نئے توحید پر ہوتا جائے گا۔ اس طرح یہ خود ساختہ ملتیں جس قدر شبیں گی، خاص توحید پر سچے ایمان کے اجزا جتنی جائیں گی، واللہ اعلم بالصواب۔

۱۵۔ تشریح : خواجہ جمالی فرماتے ہیں :

”یہ خیال بالکل اچھوتا ہے اور نہ خیال نہیں، بلکہ ٹیکٹ ہے۔ ایسی خوبی سے بیان ہوا ہے کہ اس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتا۔ مشکلات کی کثرت کا اندازہ عند حقیقی یعنی ان کے آسان ہو جانے سے کرنا درحقیقت حسن مبالغہ کی معراج ہے، جس کی نظیر آج تک نہیں دیکھی گئی۔“

نفیات کا واضح مسند ہے کہ جب کوئی شخص کسی رنج و یا اذیت رساں چیز کا عادی ہو جاتا ہے تو اس کا احساس رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوئے بالکل مٹ جاتا ہے۔ نماز میں التفیات کے وقت انسان بیٹھتا ہے تو ابتدا میں بائیں پاؤں پر غاصا بوجھ پڑتا ہے اور ذرا تکلیف محسوس ہوتی ہے، لیکن نماز کی عادت ہو جائے تو مقام نشست پر ایک گنا سا پڑ جاتا ہے۔ پھر نشست کے وقت تکلیف کا کوئی احساس نہیں رہتا۔ مرزا یہی پہلو سامنے رکھ کر اپنی مشکلات کا ذکر کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مجھ پر اتنی مشکلیں اور صعوبتیں مسلسل نازل ہوئیں کہ میں ان کا عادی ہو گیا اور ان سے جو تکلیف پہنچتی تھی، اس کا احساس ہی باقی نہ رہا۔ انسان رنج کا عادی ہو جائے تو اس کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مشکلات کا ہجوم اور تواتر ہی میرے لیے آسانی کا موجب بن گیا۔

یہ پہلو ایسے انداز میں پیش کرنا صرف مرزا پر غم ہے اور بقول جامی مشکلات کا اندازہ عند حقیقی یعنی ان کے آسان ہو جانے سے کرنا حسن مبالغہ کی معراج ہے، یعنی اتنی مشکلات پڑیں کہ چاروں ناچار میں ان کا خوگر ہو گیا اور ان سے جو اذیت پہنچ سکتی تھی، اس کا احساس ہی باقی نہ رہا۔ واضح ہے کہ مشکلات ختم نہیں

ہوئیں۔ وہ بدستور قائم ہیں، لیکن ان کا احساس نہ رہا تو ظاہر ہے کہ وہ مشکلیں نہ رہیں۔ خواہم حال ہی بجا فرماتے ہیں کہ اس شعر کی نظیر آج تک نہیں دیکھی گئی۔

۱۶۔ شرح : اگر غالب اسی طرح روتا رہا تو اسے دنیا والو! تم دیکھنا کہ یہ بستیاں اور آبادیاں جو تمہیں نظر آرہی ہیں، وہ سب کی سب اس کے سیلاب اشک میں برباد و ویران ہو جائیں گی۔ غالب دور رہا ہے۔ اسی وہ کیفیت پیدا نہیں ہوئی کہ نوح جیسا طوفان آجائے، لیکن اگر دونا اسی طرح جاری رہا تو یقیناً وہ کیفیت بھی کچھ دور نہ سمجھنی چاہیے۔

ایک لحاظ سے اہل جہاں کے لیے یہ انتباہ ہے کہ وہ غالب کو یوں رہنے سے روکنے کی کوئی تدبیر کر لیں۔ ورنہ دنیا کے ویران ہو جانے میں کوئی کلام نہیں۔ یہ غزل سلسلہ کی ہے، کیونکہ یہ ”دہلی اردو اخبار“ کی اشاعت مؤرخہ ۲۱۔ شوال ۱۳۶۶ء مطابق ۲۸۔ اگست ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی تھی اور شائع کرتے وقت تہذیب میں لکھا گیا تھا کہ مرزا ابوالدین، جو مرزا سلیمان شکوہ کے پوتے تھے، لکھنؤ سے دہلی آئے تو ساتھ ہی یہ زمین لے کر آئے۔ بادشاہ نے بھی غزل کہی اور مرزا کو بھی غزل کہنے کا حکم دیا۔

خود مرزا نے منشی نبی بخش حقیر کو یہ غزل بھیجی تو ساتھ ہی لکھا:
”بھائی! خدا کے واسطے غزل کی داد دنیا، اگر رنجتہ یہ ہے تو میرزا میرزا میرزا (اور میرزا سودا) کیا کہتے تھے؟ اگر وہ رنجتہ تھا تو پھر یہ کیا ہے؟“

(نادرات غالب)

۱۔ شرح : دیوانگی کے جوش میں ہمارا لباس اس طرح پارہ پارہ ہو گیا کہ ایک دیوانگی سے دوش پہ زُتار بھی نہیں یعنی، ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں

دل کو نیا دِ حسرت دیدار کر چکے !
 دیکھا تو ہم میں طاقت دیدار بھی نہیں
 ملتا تھا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
 دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
 بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اوریاں
 طاقت یہ قدر لذت آزار بھی نہیں
 شہیدگی کے ہاتھ سے ہے سرو بال پوش
 صحرا میں، اے خدا ! کوئی دیوار بھی نہیں
 گنجائشِ عداوتِ اغیار اک طرف
 یاں دل میں، ضعیف سے، ہوس یا رہی نہیں
 فدا نامہ لائے زار سے میرے، خدا کو مان
 آخر تو لے مرغِ گزشتہ بھی نہیں
 دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے کشی
 حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں
 اس سادگی پہ کون نہ مہربانے لائے خدا !
 سجھتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

تار بھی جسم پر باقی نہ رہا۔
 جسے ہم تار قرار دے لیتے
 اور سمجھتے کہ صم پرستی کے
 مذہب کا ایک نشان تو ہمارا
 جسم پر موجود ہے۔

۲۔ شرح : مہار
 دل محبوب کے دیدار کی
 حسرت میں غم ہو گیا۔ گویا
 وہ اس حسرت کی تجدید چڑھ
 گیا، لیکن اپنی حالت پر غور
 کیا تو معلوم ہوا کہ ہم میں
 محبوب کے دیدار کی تاب و
 توان بھی موجود نہیں۔ یعنی
 جس مقصد کے لیے ہم نے
 زندگی کے بہترین مواقع
 صرف کر دیے، اس مقصد
 سے فائدہ اٹھانے کی ہم
 میں طاقت ہی نہیں۔

۳۔ شرح : خد
 مرزا غالب قاضی عبدالحمل
 جتوں برعلوی کو اس شعر کی
 شرح یوں لکھتے ہیں :
 ” اگر تیرا مان آسان

نہیں تو یہ امر مجھ پر آسان ہے دیکھا اسد کو خُلوّت و جَلُوّت میں بارہ
 خیر تیرا ملنا آسان نہیں، نہ دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں
 سہی۔ نہ ہم مل سکیں گے، نہ کوئی اور مل سکے گا۔ مشکل یہ ہے کہ وہی تیرا ملنا دشوار بھی
 نہیں۔ جس سے تو چاہتا ہے، مل بھی سکتا ہے، ہجر کو تو ہم نے
 سہل کر لیا تھا، رشک کو اپنے اوپر سہل نہیں کر سکتے۔
 خواہجہ جانی فرماتے ہیں :

۱۔ ایک فیکٹ کے بیان میں ایسے متناسب محاورات کا دستیاب
 ہو جانا ایک عجیب اتفاق ہے۔ اس معنوں کو چاہو حقیقت کی
 طرف لے جاؤ، چاہو مجاز پر محمول کرو۔ دونوں صورتوں میں مطلب
 یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آسان نہ ہوتا یعنی دشوار ہوتا تو کچھ وقت
 نہ ہتی، کیونکہ ہم یا بس ہو کر بیٹھ رہتے اور شوق و آرزو کی غلش
 سے چھوٹ جاتے، مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جس طرح آسان نہیں،
 اسی طرح دشوار بھی نہیں۔ اس لیے شوق و آرزو کی غلش سے
 کسی طرح نجات نہیں ہوتی ۱۔

خواہجہ جانی مرحوم نے شوق و آرزو کی غلش سے چھوٹنے کا جو ذکر کیا، وہ
 میرے نزدیک مرزا غالب کے معنوں میں ایسا اضافہ ہے جس کے لیے بظاہر کوڑ
 گنجائش نہیں۔ مرزا کا معنوم صرف یہ ہے کہ ہجر کو برداشت کر لیا، رشک برداشت
 نہیں ہو سکتا۔ شوق و آرزو کی غلش قائم ہے، لیکن مفارقت پر ہم صبر کر سکتے ہیں
 غیر کا تجھ سے ملنا گوارا نہیں ہو سکتا۔

۴۔ مثنوی : زندگی عشق کے بغیر سب نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس کے
 لیے کوئی نہ کوئی مگن ہوا ہے، خواہ اس کی نوعیت کچھ ہو، لیکن ہر عشق اور مہر مگن
 میں انسان کو دکھ اٹھانے پڑتے ہیں۔ مصیبتیں جھیلنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ہماری

حالت یہ ہے کہ اتنی طاقت ہی نہیں، جو دکھ سہ لینے اور مصیبتیں جھیل لینے کے لیے ضروری ہے۔ لطافت یہ کہ محض دکھوں کا ذکر نہیں کیا، بلکہ دکھوں، مصیبتوں اور پریشانیوں سے لذت اندوز ہونے کا ذکر کیا۔ ”لذتِ آزار“ دو وجہ سے قابلِ توجہ ہے۔ اول یوں کہ جب تک شوق سے دکھ نہ اٹھائے جائیں، عشق کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا، دوم یہ کہ اگر دکھ اٹھانے میں ایک خاص لذت نہ ہو تو کون اسے قبول کرے گا اور کیونکر ممکن ہے کہ اس حالت میں اصل مقصدِ عشق کے لیے سب کو کوشش جاری رہے؟

۵۔ لغات - شوریدگی : دیوانگی، پریشانی، آشفتگی۔

شرح : حالت جنوں میں پریشانی اور آشفتگی کا یہ عالم ہے کہ سرگردانی کے لیے ایک مصیبت خیز بوجھ بن گیا ہے، لیکن صحرا میں بھر ہو رہی ہے۔ وہاں کوئی دیوار بھی تو موجود نہیں کہ اس سے سر پھوڑ لوں اور اس دہال سے نجات پاؤں۔

۶۔ شرح : صنعت کی شدت کا یہ عالم ہے کہ اس میں رقیبوں سے دشمنی کی سہائی تو کیا ہوتی؟ خود محبوب کی آرزو بھی باقی نہیں رہی۔

شرح کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ محبوب کی آرزو باقی نہیں رہی۔ مرزا کا مطلب صنعت کی انتہا ثابت کرنا ہے اور اس کے لیے اس سے بہتر پیرایہ کوئی نہیں جو کہتا تھا کہ اتنا کمزور ہو چکا ہوں دل میں محبوب کے لیے آرزو بھی موبہوم سی نظر آتی ہے۔

۷۔ شرح : اسے محبوب! میری درد بھری مزیاں و فغاں سے قور اور خدا کا خوف کر۔ کیا یہ مزیاں و فغاں اس پرندے کا درد بھرا گہیت ہے، جو پتھرے میں بند ہے؟ مطلب یہ کہ میری مزیاں و فغاں ایسی بے اثر نہیں، جیسی کسی قیدی پرندے کی صدا ہو سکتی ہے۔

۸۔ لغات - رُک کشتی : مقابلہ

شرح : دل میں محبوب کی صفت مڑگاں کے سامنے ڈٹ جانے کا ارادہ ہے۔ یعنی ارادہ کیے بیٹھے ہیں کہ تیر پر تیر کھائیں گے اور سامنے سے نہیں ہٹیں گے، حالانکہ دل کی حالت دیکھی جائے تو ایک کانٹے کی غلش بھی برداشت کر لینے کی ہمت نہیں رکھتا۔

یہ شعر ان لوگوں کی کیفیت کا نہایت عمدہ اور مکمل مرقع ہے، جو بڑے بڑے عزائم دل میں لیے بیٹھے ہوں، لیکن ان کی خاطر خفیف سی بھی ذمت اٹھانے سے گریزاں ہو، حالانکہ کوئی بڑا عزیم اور کوئی بڑا مقصد انتہائی محنتیں مشقتیں اور فوجیں اٹھانے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔

۹۔ شرح : محبوب کی اس سادگی اور سہولت پر کون جان دے دینے کے لیے آادہ نہ ہو گا کہ لڑ رہے ہیں، لیکن ہاتھ میں تلوار بھی موجود نہیں ہے، مقصود یہ ہے کہ محبوب تیغ و خنجر سے نہیں لڑا کرتا، اس کی لڑائی حسنِ جمال، حمزہ واد اور ناز و انداز کے بن پر ہوتی ہے۔ اسے مرزا نے سادگی قرار دے لیا اور کہا: یہ سادگی ہی ایسی چیز ہے کہ ہر شخص اس پر جان قربان کر دے۔ تلوار سے کر چلاتے تو اس کا انجام بھی اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا؟

مولانا شبلی نے پہلی جنگ یورپ پر ایک نظم کہی تھی جس کا مناد یہ تھا کہ ایک جرمن نے غزوہ میں آکر کہا کہ ہماری فوج آسان نہیں تو دشوار بھی نہیں، برطانیہ کی فوج تعداد میں بھی کم ہے اور تیار بھی نہیں، فرانس دند ہے، اسے جنگ سے کیا کام؟ میں نے کہا کہ تو غلط کہتا ہے۔ ہم اہل ہند جرمنوں سے دس گئے ہیں۔ وہ غزوہ سے میری بات سن رہا۔ پھر اس نے جو کچھ کہا۔ وہ لائقِ اظہار نہیں، کہا!

اس سادگی پر کون نہ مر جائے اسے خدا!

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

مرزا غالب کے شعر کا آفاقی پہلو ملاحظہ ہو کہ اس سے ایک خالص جنگی

بحث میں بھی کام لے لیا گیا۔

۱۰۔ تشریح : ہم نے اسد یعنی نائب کو تنہائی اور مجلس دونوں حالتوں میں بار بار دیکھا۔ اگر تم اسے دیوانہ اور پاگل نہیں سمجھتے تو یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ عقل و فہم سے کوئی سروکار رکھتا ہے، یعنی وہ ہوشیار ہے۔

۱۔ لغات

درخورد :

لائق۔

چشم سوزن :

سوئی کا ناکا۔

تشریح :

میرے بدن کا

کوئی بھی زخم

سجے جانے کے

قابل نہ سمجھا

گیا۔ اس سے

انتہائی ایوسی

ہوئی۔ سوئی

کی آنکھ بینا

نلکے میں جو

دھاگاتھا،

وہ ایوسی کے

آنسوؤں کا تار

نہیں ہے زخم کوئی بچنے کے درخورد میرے تن میں

جوا ہے تار اشک یاس، رشتہ چشم سوزن میں

ہوئی ہے مانع ذوق تماشا، خانہ ویرانی

کعبہ سیلاب باقی ہے یہ رنگ پنبہ روزن میں

ودیعت خانہ بیدار کا دوشمائیے مرگاں ہوں

نگین نام شاہد ہے، مرا ہر قطرہ خوں تن میں

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی

شب مہم ہوا جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے سوزن میں

نکو مبش مانع بے ربطی شور جنوں آئی

جوا ہے خندہ احباب بخیہ حبیب و دامن میں

ہوئے اُس ہروش کے جلوؤ تمثال کے آگے

پرفاشاں جو ہر آئینے میں، مثلِ ذرہ روزن میں

بن گیا۔
 نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں، پر صحبت مخالف ہے
 جو گل ہوں تو ہر گلشن میں، جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں
 کوئی خاص بات نہیں،
 ہزاروں دل دیے جوش جنوں عشق نے مجھ کو
 زخم، بچہ،
 سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں
 تار، اشک
 اسد! زندانی تاثیر الفتہائے خواباں ہوں
 چشم، رشتہ
 خیم دست نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں
 سوذن وغیرہ
 الفاظ کی
 مناسبت ظاہر ہے۔

۲۔ لغات۔ مانع : روکنے والا۔

مشرح : ہمارے گھر کا برباد ہونا نظارے کے ذوق میں بھی
 رکاوٹ بن گیا۔ جو سیلاب آیا تھا اور گھر ویران کر گیا۔ اس کا حباگ
 روٹی کی طرح روشن دان میں نظر آ رہا ہے۔

جن لوگوں نے ندیوں اور دریاؤں کے کنارے کی آبادیوں میں رہ کر
 ٹھہر، کیا ہے یا ان کی کیفیت دیکھی ہے، انہیں معلوم ہے کہ جب طبعانی
 آتی ہے اور پانی زور شور سے چڑھتا ہے تو جہاں جہاں آبادی میں اسے
 راستہ ملتا ہے، نکل جاتا ہے۔ جہاں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے وہاں پانی
 کا جوش حباگ لے آتا ہے، جو روشن دانوں یا دوسرے چھوٹے چھوٹے
 شگافوں میں ٹپک کر جم جاتا ہے۔ اسی منظر کے پیش نظر مرزا غالب نے
 یہ مقرر کیا۔ یعنی سیلاب آیا، گھر ویران ہو گیا۔ روزوں اور شگافوں میں
 حباگ ٹپک گیا۔ اب یہ اندر بیٹھے ہوئے باہر کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں۔
 روزن کے سوا کوئی جگہ نہیں، جہاں سے دیکھ سکیں۔ اس میں حباگ اشکا

ہوا ہے اور باہر کی کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ یوں خانہ دیرانی ذوقِ نظر میں
رکاوٹ بن گئی۔

۳۔ لغات : ودیعت : امانت ، ودیعت خانے سے مراد ہے
وہ مکان ، جہاں لوگوں کی امانتیں محفوظ رہیں۔

ہنگین : انگشتری کا نگینہ جس پر مالک کا نام کندہ ہوتا ہے۔
شرح : محبوب کی پکیوں نے چُجھ چُجھ کر جو غلم کیے ، میں ان کا امانت
بن گیا ہوں۔ میرے بدن کے خون کا ہر ایک قطرہ ایسا ہے ، جس پر ہنگین کی طرح
محبوب کا نام کندہ ہو چکا ہے۔

یہ شعر بھی کوہِ کندن و گاہِ ہر آوردن کی حیثیت رکھتا ہے مرزا غالب
پہلے بھی کہ چکے ہیں۔

ایک ایک قطرے کا مجھ دینا چڑا حساب

خونِ بکر ودیعتِ مرثاگانِ یار تھا

۴۔ لغات : ظلمت گستری : ظلمت آرائی ، اندھیرے کا پھیلاؤ۔

شبستان : رات بسر کرنے کی جگہ۔ گھر۔

شرح : میرے شبستان میں اندھیرے کا پھیلاؤ جو صودت اختیار کر
چکا ہے ، اس کی کیفیت کو بیان کر سکتا ہے ؟ حالت یہ ہے کہ اگر روتی
کا کوئی گلابیواروں کے روزنوں میں رکھ دیں تو ایسا منظر پیدا ہو جائے ،
گویا چاندنی چٹائی ہوئی ہے۔

پہلے ایک شعر میں روتی کے اسی گالے کو نورِ صبح مزیایا تھا۔

کیا کبوں تارِ بکی زندانِ غم ، اندھیرے

پنسہ نورِ صبح سے کم اس کے روزن میں نہیں

۵۔ لغات : نکو ہش : طاقت ، تادیب ۔

شرح : دوستوں نے میرے شوہر جنوں کی بے رحمتی اور سہلے تفریح

حاصلت کی۔ میری ہنسی اڑائی۔ اس وجہ سے شور جنوں رک گیا۔ گویا دوستوں کا خندہ دند اس نما روہ ہنسی، جس میں راحت ظاہر ہو جائیں، میرے جیب اور دامن کے چاک کے لیے بجنیے بن گیا۔ یعنی وہ چاک رفتہ ہو گئے اور شور جنوں ختم ہو گیا۔

خندہ کو خندہ دنداں نما سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ اسے نیچے سے مشابہت پیدا ہو جائے۔

بے ربطی شور جنوں اس لیے کہا کہ جنوں کا ہر فعل بے ربط و مضطر ہوتا ہے۔

۶۔ لغات - مرادش : سورج جیسا۔

تمثال : صورت، پیکر، تصویر۔

پرافشال : پر پھڑ پھڑانے والا۔

شرح : میرے سورج جیسے محبوب کا پیکر جلوہ افروز ہوا تو اس کے آگے آئینے کے جوہر اسی طرح اڑنے اور پر پھڑ پھڑانے لگے، جیسے سورج کی کرنوں میں روزن کے اندر چھوٹے چھوٹے ذرے بیتا باز اڑتے نظر آتے ہیں۔ یعنی آئینے کے جوہر اس کے جلوے کا مقابلہ نہ کر سکے۔

۷۔ لغات - گلشن : بھٹی - بھاڑ۔

شرح : مجھے کچھ خبر نہیں کہ اچھا ہوں یا بُرا، لیکن یہ جانتا ہوں کہ میرا ماحول سازگار نہیں۔ جس دائرے میں مجھے رکھا گیا ہے، اس کے ساتھ میرے لیے موافقت و مناسبت کی کوئی صورت نہیں۔ اگر میں اچھا ہوں تو میری مثال پھول کی سی ہے، جسے محبوبوں کی زلفوں لگے یا بستر کی زینت بننا چاہیے۔ اس کے برعکس مجھے بھٹی میں ڈال دیا گیا ہے۔ اگر میں بُرا ہوں تو سمجھنا چاہیے کہ میری حیثیت گھاس پھوس اور خس و خاشاک کی ہے۔ گویا مناسب مقام بھٹی ہے، لیکن مجھے باغ میں رکھا گیا ہے، جہاں خس و خاشاک

کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا اور اٹھا کر باہر پھینکنے کی کوشش کرتا ہے۔
 نہایت غفلتوں میں دو عام قبیلوں سے نیک و بد اور ناسازگار عملوں
 کی کیفیت اس طرح بیان کر دی کہ اس سے بہتر ممکن نہیں۔

۸۔ شرح : میرے بدن کے خون کا ہر قطرہ جنونِ عشق کے
 باعث سیاہ ہو کر سودا بن گیا، یعنی اس سیاہ نقطے کی صورت اختیار کر گیا
 جو دل میں تصور کیا جاتا ہے۔ گویا ہر قطرہ ایک دل کی صورت اختیار کر گیا
 اس طرح جنونِ عشق کے جوش نے میرے لیے ہزاروں دل متیا کر دیے۔
 جتنی نقطہ نگاہ سے معلوم ہے کہ سودا یعنی جنون کا رنگ سیاہی
 مائل ہوتا ہے، اسی لیے اسے سودا کہتے ہیں۔ یعنی کالا۔

۹۔ لغات - زندانی : قیدی، اسیر۔

شرح : اے استاد! میں حسینوں کی تاثیرِ محبت کا قیدی ہوں۔
 انھوں نے مہربان ہو کر میرے گلے میں بانیں ڈال دیں، وہی بانیں میرے
 لیے اسیری کا ایسا طوق بن گئیں، جس سے رہائی پانا ممکن نہیں۔
 تاثیرِ الفت اس لیے کہا کہ محبت نے اثر پیدا کیا اور حسینِ خلافت
 عادت اتنے مہربان ہوئے کہ اس کے گلے میں بانیں ڈال دیں۔

۱۔ شرح : ہماری

نگاہ میں دنیا کی لذتیں

اور راحتیں بھج رہ گئی

ہیں۔ بیشتر خونِ جگر پنے

میں مزہ آتا تھا اور یہی

ہمارا دستور تھا کہ خون

بی بی کر زندگی گزارا کرتے

مزے جہان کے اپنی نظریں خاک نہیں

سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں

مگر غبارِ ہو سے پر ہوا اڑا لے جائے

وگر نہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
 کہ غیر جلوۂ گل رہگزر میں خاک نہیں
 بھلا اُسے نہ سہی، کچھ بھی کو رحم آتا
 اثر مرے نفس بے اثر میں خاک نہیں
 خیال جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش
 شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں
 بٹوا ہوں عشق کی غارت گرمی سے شرمندہ
 سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں
 ہمارے شعر میں اب صرف دل لگی کے اسدا
 کھلا کہ فائدہ عرض بہز میں خاک نہیں

۲۔ لغات - مگر : شاید۔

شرح : میرے بال و پر میں اب طاقت و قوت بالکل باقی نہیں
 رہی۔ گویا یہ ممکن نہیں کہ میں خود اثر کر اپنے آشیانے یا محبوب تک پہنچ سکوں
 البتہ یہ ممکن ہے کہ اب یہیں پرے پرے فرسودگی سے گرد و غبار بن جاؤں
 اور ہوا سے اڑا کر حنزل مقصود پر پہنچا دوں۔

۳۔ لغات - شمائل : شہید کی جمع، سرشت، طبیعت،

خصلت، عادت۔

شرح : یہ کون سے بہشت جیسے صفات و سرشت کے محبوب کی

تھے، مگر اب بگڑیں بھی
 کچھ باقی نہیں رہا۔ خون
 کی جتنی دولت تھی، وہ
 سب ہم نے صرف کر ڈالی۔
 شعر میں قابلِ حذر
 نکتہ یہ ہے کہ خون بگڑ پیا
 کسی کے لیے بھی باعث
 راحت نہیں ہو سکتا، لیکن
 مرزا اس کے عادی ہو
 گئے تھے اور اسی میں نطف
 لیتے تھے۔ اب انتہائی
 دکھ کی یہ چیز بھی، جس
 سے عادی ہونے کے
 باعث نطف آنے لگا
 تھا، ختم ہو گئی۔

آمد آمد ہے کہ راستے میں خاک کے بجائے پھولوں کا جلوہ نظر آتا ہے۔

جس محبوب کی خصلتیں بہشت کی سی ہوں اور اس کے ذوق میں بھی انتہائی لغات نمایاں ہو، ظاہر ہے کہ وہ آئے تو گرد و غبار کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ہاں، خاک کی جگہ پھولوں کا جلوہ ہو تو بات بنتی ہے۔

۴۔ شرح : اگر محبوب کو میری مزید وفتناں پر رحم نہ آیا تو خیر خود مجھے تو اپنے آپ پر رحم آنا چاہئے تھا۔ اگر میری مزید وفتناں میں اتنا اثر نہیں تھا کہ محبوب کو متاثر کر سکتا تو خود مجھے تو ضرور متاثر کر دینا چاہیے تھا لیکن ظاہر ہو گیا کہ میری مزید وفتناں بالکل بے اثر ہے۔ یہ محبوب پر تو کیا اثر کرے گی، ستم یہ ہے کہ مجھ پر بھی کچھ اثر نہیں کرتی۔

۵۔ لغات۔ خراب : مست، مدہوش۔

شرح : شراب پینے والے جلوہ گل کے تصور سے مدہوش ہو گئے ہیں۔ شراب خانے کے دیوار و در میں تو کچھ بھی نہیں۔

جلوہ گل سے اشارہ بہار کی طرف ہے۔ بظاہر مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ شراب خانے میں تو کچھ بھی نہیں رہا۔ اس کے دیوار و در میں تو خاک اڑ رہی ہے۔ اب شراب نوش صرف بہار کے خیال سے بدست ہیں۔

۶۔ شرح : عشق نے میرا سب کچھ برباد کر دیا۔ اب میرے گھر میں تعمیر کی حسرت کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ یعنی پھر سے سب کچھ بنالینے کی آرزو ہے، لیکن بنالینے پر قدرت حاصل نہیں وہ آرزو حسرت بن کر رہ گئی ہے۔ عشق بدستور غارتگری میں لگا ہوا ہے وہ بربادی کی خوش چھوڑ نہیں سکتا۔ میں شرمندہ ہوں کہ اس کے ذوقِ غارت کی تسکین کے لیے کیا پیش کروں؟

۷۔ شرح : اے استاد! اب ہم صرف دل لگی کی خاطر شکر کہتے ہیں ورنہ وہ جو غرہ تھا کہ ہم صاحبِ مہر میں اور دنیا کو اپنے جوہر دکھائیں گے تو

مسموم کر رہیں گے، وہ ختم ہو گیا۔ ہم نے دیکھ لیا کہ ہنرمندی کی کوئی بات پیش کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ یہ لوگ ہنر کو پہچان نہیں سکتے، اس کی قدر نہیں کر سکتے۔ لہذا ہم ان کے لیے کیا نکلیں؟ اب تو صرف اپنے دل کی تکیں کے لیے کچھ لکھ لیتے ہیں۔
معاشرے کی خیرہ ذاتی پر کتنا بڑا طغیان ہے۔

۱۔ تمہید:

یہ غزل دہلی اور
اخبار کی اشاعت

بابت ۴۰ جلدی
اڈوئی ۱۶ ص ۱۶

۱۳۔ مزدوری ۵۵ روپے
میں چھپی تھی۔ قہید

میں جو عبارت لکھی
گئی تھی، اس کا

مغادرہ تھا کہ مرزا
نور الدین زبیر

سیماں بکھوہ جھلک
ہر شاہی دہلی آئے

اور انہوں نے
شاہی دربار اور

مشاعروں میں شعر
گوئی کے کلمات

دل ہی تو ہے، نہ سنگ و خشت، ورنہ سے بھرنا آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں؟
ویر نہیں، حرم نہیں، ویر نہیں، آستان نہیں
بیٹھے ہیں رگبزر پہ ہم، کوئی ہمیں اٹھائے کیوں؟
جب وہ جمالِ دل فروزا، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوزِ پردے میں منہ چھپائے کیوں
وشہِ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکس رُخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں؟
قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے سخبات پائے کیوں؟
حُسن اور اس پر حُسن ظنِ مرہ گئی بُواہِ موس کی شرم
اپنے پر اعتماد ہے، غنیر کو آزمائے کیوں؟

وال وہ غور و عز و ناز، یاں یہ حجاب پاس وضع
 راہ میں ہم ہیں کہاں؟ بزم میں وہ بلائے کیوں؟
 ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
 جس کو جو دین و دل عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں؟
 غالب خشتہ کے بغیر، کون سے کام بند ہیں؟
 رویشے زار زار کیا؟ یکبیچے ہاے ہاے کیوں؟
 دکھائے بہادر
 شاہ قلعہ نے
 مرزا غالب سے
 فرمائش کی کہ کوئی
 ایسی غزل کہیں
 جائے جس پر
 مصرع لگانا دشوار
 بلکہ ناممکن ہو۔
 چنانچہ مرزا غالب

نے یہ غزل کہی اور مرزا نور الدین نے - ادنیٰ غور و تامل میں کہاں محبت سے
 محسوس تیار کر کے پڑھ دیا اور سب حضار دربار والا نے نہایت پسند کیا۔ حضور نے
 پانچ دفعہ اس محسوس کو پڑھوایا اور بہت خوش ہوئے۔

مرزا نور الدین کا محسوس سامنے نہیں کہ اندازہ کیا جاسکے، وہ کیسا تھا۔
 درباریوں اور بہادر شاہ کی پسندیدگی یا خوشنودی کوئی معیار نہیں۔ مرزا نور الدین
 شاہی خاندان کے فروختے، اس لیے سب انھیں شہزادہ سمجھ کر اندھا دھڑ
 متاثر کرتے تھے اور بہادر شاہ قلعہ کے اسلوب کلام سے بھی دامنخ ہے کہ
 ان کا ذوق کس قسم کا تھا۔

شرح : ہمارے سپرد میں دل ہی تو ہے، جوتانے اور دکھ دینے
 سے الم زندہ ہو جاتا ہے، اینٹ اور پتھر تو نہیں کہ اس پر کچھ اثر نہ ہو۔ اگر
 ہمیں دکھ پہنچے گا تو مہزار بار رویش گئے۔ یہ بتاؤ کہ کسی کو ہمیں دکھ دینے
 کا کیا حق ہے؟

شرکی وضع و سیاق سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محبوب ستم زندہ عاشق سے
 کہ رہا ہے، ہم حذر و ظلم و ستم جاری رکھیں گے۔ تمہیں ہرگز رونا نہ چاہیے

اور سب کچھ صبر و تحمل سے برداشت کر لینا چاہیے۔ غریب عاشق پریشان ہو کر کہتا ہے کہ میرے پہلو میں اینٹ یا پتھر کا بے حس ٹکڑا نہیں، دل ہے، جو الم انگیز سلوک پر درو سے بھرا آتا ہے۔ ہم تو ضرور روئیں گے، کوئی ہمیں ستا تا کیوں ہے ؟

لفظ "کوئی" سے مراد محبوب ہے، کیونکہ عاشق کو محبوب کے سوا کوئی نہیں ستا سکتا، لیکن "کوئی" کے لفظ سے اجنبیت ظاہر ہے اور جب انسان ظلم و ستم سے گھبرا جائے تو وہ ستانے والے کا نام لینے یا اسے براہ راست مخاطب کرنے کے بجائے ایسے ہی لفظ استعمال کرتا ہے، جن سے اک گونہ اجنبیت یا تنگیر ٹپکتی ہو۔

۲۔ **تشریح :** ہم بہت خانے کے سامنے نہیں بیٹھے کہ پنڈتوں اور برہمنوں کو ہمیں اٹھا دینے کا حق ہو۔ ہم نے کبے کے دروازے پر نشست نہیں جہاں کہ ارباب انتظام ہمیں اپنے خیال کے مطابق رنڈ یا بے شرب سمجھ کر اٹھانے کے دوپے ہوں۔ ہم نے کسی محبوب یا کسی بڑے آدمی کا دروازہ نہیں سنبھالا۔ کسی کے آستانے پر ڈیرا نہیں جمایا۔ ہم تو راستے کے کنارے بیٹھے ہیں، جو گزرگاہ عام ہے۔ پھر کسی کو کیا حق ہے کہ ہمیں اٹھائے ؟

مولانا طہطاہانی فرماتے ہیں کہ اس شعر کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں مل سکتے

۳۔ **لغات :** مہر نیمروز : دوپہر کا آفتاب، جس کی طرف نظر اٹھانے ہی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ یعنی وہ "نظارہ سوز" ہوتا ہے۔

"منہ چھپانے کیوں" کے معنی بدابہت دو ہیں۔ اول یہ کہ اسے منہ چھپانے کی کیا ضرورت ہے ؟ دوم یہ کہ اس نے منہ چھپایا ہی نہیں، بالکل بے نقاب اور آشکارا ہے۔

تشریح : میرے محبوب کے جمال سے دل میں روشنی اور نور پیدا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی دوپہر کے آفتاب کی طرح وہ جمال اس درجہ بے پناہ ہے کہ اس

کی طرف آنکھ نہیں اٹھ سکتی۔ جو آنکھ اٹھے گی، معاً چن دیا جائے گی اور اس جمال سے بہرہ اندوز نہ ہو سکے گی۔ جب حالت یہ ہے تو اسے پردے میں چھپے رہنے کی کیا ضرورت ہے؟

پردے میں چھپنے کا دوتا یہی ہو سکتا ہے کہ کوئی اسے دیکھ نہ سکے جب آنکھ میں اسے دیکھنے کی صلاحیت ہی موجود نہیں تو پردہ بالکل بے سود ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا، دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ واقعی پردے میں چھپا ہوا نہیں، بلکہ پوری شان سے جلوہ آ رہا ہے اور جانتا ہے کہ اس کے جمال سے کوئی لطف اندوز نہیں ہو سکتا، کیونکہ کسی نگاہ کو اسے دیکھنے کی ہمت ہی نہیں۔

خواجہ عاتقی کے قول کے مطابق یہ شعر مہاز اور حقیقت دونوں پر محمول ہو سکتا ہے، حقیقت پر بعد جہاں زیادہ، کیونکہ وجود حقیقی کائنات میں غایاں اور آشکارا ابھی ہے اور پنہاں و مستور بھی۔ یہ ایں ہمہ کوئی اس کے جمال سے براہ راست بہرہ اندوز نہیں ہو سکتا۔

۴۔ لغات۔ دُشنہ : شجر۔

جانستاں : جان لیوا۔

نادرک : تیر۔

مشرح : غمزے کا خنجر جان لیوا اور نادرک کا تیر اس درجہ سخت ہے کہ کوئی پناہ اس سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ ہم نے مانا کہ تو ہی اپنا چہرہ آئینے میں دیکھنا چاہتا ہے، لیکن خدا کے لیے غمزہ کہ کہ ناز و ادا کی ان تلواروں اور تیروں سے تیرا کیا حال ہو گا؟ ضروری ہے کہ تو اپنا چہرہ آئینے میں نہ دیکھے تاکہ وہ صورت، جس نے دنیا کو ذہنوں سے تڑپا رکھا ہے، تیرے لیے بھی کسی آفت کا باعث نہ بن جائے۔ تیرے سوا تو جتنے تھے وہ تڑپ کر گر گئے، تو اپنے آپ کو کیوں ایسے خطروں میں ڈال رہا ہے؟

۵۔ **شرح :** زندگی کا ایک وقت مقرر ہے، جسے بسر کرنے پر ہم مجبور ہیں۔ ساتھ ہی ہم کا سلسلہ لگا ہوا ہے۔ یہ دونوں چیزیں اصلاً ایک ہیں لہذا ممکن ہی نہیں کہ انسان زندگی کی مبادی پوری کیے بغیر غم سے نجات حاصل کرے۔ جب دونوں چیزیں اصل میں ایک ہوئیں تو ہر حال میں ساتھ ساتھ رہیں گے اور دونوں اکٹھی ختم ہوں گی۔

یہ بھی ایک حکیمانہ نکتہ ہے، جو نہایت بڑا تاثیر ادا میں بیان کیا گیا ہے زندگی نام ہے احساسات و ادراکات کا۔ جب تک موتِ احساس باقی ہے، انسان کے لیے ممکن ہی نہیں کہ اس دنیا میں چلے پھرے زندگی گزارے اور ماحول سے متاثر نہ ہو۔ یہ تاثر بعض اوقات وقتی طور پر سترت و نشاط بھی پیدا کرتا ہے، لیکن انجام اس کا بھی غم کے سوا کچھ نہیں۔ مثلاً کوئی اچھی چیز کھا کر یا دیکھی، پھر وہ چھٹی یا جاتی رہی، جس کا نتیجہ غم کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ غمِ حبيب تک دنیا کی احساس بھری زندگی قائم ہے۔ غمِ زندگی کے لیے ایک ناگزیر شے ہے، جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں غم اسی وقت ہانے لگا، جب زندگی ختم ہوگی اور زندگی کے غموں کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔

۶۔ **لغات -** بوا الہوس : ہوا و ہوس سے بھرا ہوا، یعنی غیر۔
شرح : مرزا غالب نے تاعنی عبد الجلیل جنوں کو اس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے :

”مولوی صاحب ! کیا لطیف معنی ہیں ! واد دینا۔ حسنِ عارض اور حسنِ نکل دو صفیتیں محبوب میں جمع ہیں، یعنی صودت اچھی ہے اور گمان اس کا بھیج ہے، کبھی خطا نہیں کرتا اور یہ گمان اس کو نہایت اپنے ہے کہ میرا مارا کبھی نہیں پہنتا اور میرا شیرِ نرہ خطا نہیں کرتا پس جب اس کو اپنے اوپر ایسا بھروسہ ہے تو رقیب کا امتحان کیوں

کسے؟ حسنِ ظن نے رقیب کی شرم رکھ لی۔ ورنہ یہاں محبوب نے مغالطہ کھایا تھا۔ رقیب عاشقِ صاوق نہ تھا، ہوسِ ناک آدمی تھا۔ اگر پائے امتحان درمیان آتا تو حقیقت کھل جاتی؟

شعر کے معنی بالکل واضح ہو گئے۔ یعنی رقیب نے عشق نہیں، محض ہوس کی بنا پر محبت کا دعویٰ پیش کر دیا۔ محبوب حسین بھی تھا اور اسے اپنے بارے میں انتہائی حسنِ ظن بھی تھا، یعنی یہ کہ میں جس پر ایک نظر ڈال دوں۔ وہ عاشق ہوے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ اس وجہ سے امتحان ایسے بغیر ہی محبوب کو رقیب کے عشق کا یقین ہو گیا۔ اپنے حسن پر اعتماد اور حسنِ ظن پر اعتماد کی بدولت رقیب کی آزمائش کا وقت ہی نہ آیا۔ یوں اس کی شرم رہ گئی اور بھرم نہ کھلا۔ اگر امتحان کی نوبت آ جاتی تو رقیب کے ایسے یقیناً بڑی مصیبت پیش آتی۔

۷۔ لغات - پاس وضع : وضع داری کا لحاظ۔

شرح : شعر میں لغت و نشر غیر مرتب ہے۔ یعنی غرور عزت و نام کا تعلق ہے، بزم میں نہ لانے سے اور حجابِ پاس وضع کا تعلق ہے راہ میں نہ لینے سے۔

محبوب کو اپنے وقار و تمکین کا غرور ہے، لہذا وہ ہمیں بزم میں لانے پر آمادہ ہی نہیں ہو سکتا، کیونکہ لانے سے اس کے غرور کو صدمہ پہنچے گا۔ ہم اپنی وضع داری کے لحاظ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ہمیں یہ شرم ماسک جاتی ہے کہ راستے میں اس سے کہاں ملیں، کیونکہ راستے میں محبوب سے ملنا وضع داری کے خلاف ہے۔ عزمِ اس غرور عزت و نام اور اس حجابِ پاس وضع کا نتیجہ یہ ہوا کہ محبوب اور عاشق میں ملاقات کی کوئی صورت نہ رہی۔ راہ میں ملنا اور بات کرنا مشکل اور بزم میں بلایا جانا خیر ممکن۔

۸۔ شرح : شعر کے اسلوب سے ظاہر ہے کہ لوگ مرزا کو سمجھا

رہے ہیں، تو کس مصیبت میں پڑ گیا ہے ؟ جسے محبوب بنائے بیٹھا ہے اسے
 مرنے والے کوئی واسطہ ہے، نہ وفا ہے۔ وہ منکر بھی ہے اور بے وفا بھی۔
 تیرا دین بھی برباد ہو گا اور دل بھی عمر بھر بے وفائی کی ٹھوکریں کھائے گا۔
 مرزا ان سمجھانے والوں کی بات کاٹتے ہوئے کہتے ہیں : اچھا بھئی ! ہم نے
 مانا، ہمارا محبوب کافر بھی ہے اور بے وفا بھی لیکن تم میں سے جسے اپنا دین
 اور اپنا دل پیارا ہے، وہ اس کی لگی میں کیوں جائے، جہاں دونوں برباد ہونگے
 ہم تو دین و دل دونوں برباد کر چکے۔ بسیں تمہاری نصیحتوں کی ضرورت نہیں۔
 مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ اس زمین میں یہ شعر بھی بیت الغزل
 ہے۔ اس معاملے کی طرف اشارہ ہے کہ لوگ سمجھا رہے ہیں اور یہ ان کی
 بات کاٹ رہے ہیں۔

۹۔ شرح : غالب اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اب وہ اپنے
 کسی رفیق کی زبان سے دوستوں، عزیزوں اور ماتم داروں کو سمجھا رہے ہیں
 کہ بھئی ! زار زار رونے اور ہانے ہانے کرنے سے کیا فائدہ ہے ؟ کیوں
 اس طرح ماتم کیا جائے ؟ ایک خستہ حال غالب کے بغیر دنیا کے کون
 سے کام رک جائیں گے ؟ ماتم چھوڑو اور مبر سے کام لو۔

۱۔ شرح :
 میں نے پوچھا کہ بڑے
 کیونکر لیا جاتا ہے ؟
 تو نے دُور سے مجھے
 ایک منہ بند بینی
 ناگفتہ کل دکھا دی
 اس کے دکھانے سے
 غنچہ ناگفتہ کو، دُور سے مت دکھا کہ یوں
 بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں
 پر سش طرز دلبری کیجیے کیا کہ بن کے
 اس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

کیا غاشہ؟ میں نے
تو یہ سوال کیا ہے،
منہ سے بوسے لے
کر بتا کیوں یا
جاتا ہے۔

اس میں خوبی
صرف یہ ہے کہ
بوسہ لیتے وقت
منہ کا نقشہ بالکل
ناگفتہ کلی کا سا
ہوتا ہے۔

۲۔ شرح:

میں محبوب سے
دل لینے کا طریقہ
کیا پوچھوں؟ کچھ
بتائے بغیر ہی اس
کے ہر اشارے
سے کوئی نہ کوئی
ہوا ٹپک رہی ہے
جو بتاتی ہے کہ
دل یوں لیا جاتا ہے

۲۔ شرح:

اس میں لغو و نشر

رات کے وقت مے پیے، ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے! پر نہ کرے خدا کہ یوں
”غیر سے رات کیا بنی؟“ یہ جو کہا تو دیکھیے
سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ ”یوں“
بزم میں اُس کے روبرو، کیوں نہ خوش بیٹھیے
اس کی تو خامشی میں بھی ”ہے یہی“ مدعا کہ ”یوں“
میں نے کہا کہ ”بزم ناز چاہیے غیر سے تھی،
”سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ ”یوں“؟
مجھ سے کہا جو یار نے ”ساتھ میں ہوش کس طرح؟“
دیکھ کے میری بخودی، چلنے لگی ہوا کہ ”یوں“
کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی، حیرتِ نقشِ پا کہ ”یوں“؟
گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوقِ کازوال
موجِ محیطِ آب میں، مارے ہے دستِ و پا کہ یوں
جو یہ کہے کہ ”ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی،
گفتہ غالب ایک بار، پڑھ کے اُسے سنا کہ ”یوں“

مرتب ہے۔

رات کا وقت ہو، محبوب نے شراب پی رکھی ہو۔ خدا کرے، وہ یہاں
منور آئے۔ ساتھ ہی خدا نہ کرے کہ وہ رقیب کو ساتھ لے کر آئے۔

۴۔ **شرح :** جب میں نے محبوب سے پوچھا کہ رات غیر کی صحبت
میں کیا صورت پیش آئی تو دیکھیے، وہ سامنے آ بیٹھا اور بولا : ”دیکھنا، یوں نہ
”دیکھنا کہ یوں“ کے دو مطلب ذہن میں آتے ہیں۔ اول یہ کہ غصے سے
عاشق کی طرف دیکھنا۔ مقصد یہ تھا کہ تمہارے لب پر ایسا گستاخانہ سوال نہ
آنا چاہیے تھا۔ دوسرے یہ کہ محبوب نے ڈسٹائی اختیار کر لی اور سامنے بیٹھ
کر کہا کہ یوں صورت پیش آئی تھی، گویا بے حجابی اور بے تکلفی کی صورت تھی۔

۵۔ **شرح :** بزم میں محبوب کے رد و رد چپ بیٹھے رہنے کے سوا
چارہ نہیں، وہ خود چپ بیٹھا ہے اور اس کا مطلب یہی ہے کہ کسی اور کو بھی
کچھ نہ بولنا چاہئے۔

۶۔ **لغات :** ستم ظریف : وہ شخص، جو ظلم و ستم میں بھی ظرافت
کا پہلو نہ چھوڑے۔

شرح : میں نے محبوب سے کہا کہ آپ نے بزم تازہ آراستہ
کر رکھی ہے۔ ایسی محفل غیر سے بالکل خالی کرا لینی چاہیے۔ یہ سنتے ہی
اس ستم ظریف نے مجھے بزم سے اٹھا دیا، پھر پوچھا کہ تمہاری مراد یہ تھی؟
شعر میں ستم ظریفی کا پہلو یہ ہے کہ مرزا نے اپنے آپ کو خویش سمجھتے ہوئے
غیر کو اٹھا دینے کی تدبیر کی۔ ظالم محبوب نے خود مرزا ہی کو غیر سمجھ کر اٹھا
دیا، ساتھ ہی پوچھا : ”تم یہی چاہتے تھے؟“

۷۔ **شرح :** جب محبوب نے مجھ سے پوچھا کہ جوش کس طرح اُٹھتے
ہیں تو مجھ پر بخودی کا عالم طاری ہو گیا۔ یہ دیکھتے ہی ہوا چلنے لگی اور اس
نے بتایا کہ جوش یوں اُٹھتے ہیں۔ یعنی محبوب کا جلوہ دیکھ کر جوش و حواس

اس طرح رخصت ہو جاتے ہیں، جیسے ہوا چلتی ہے۔

۸۔ شرح : مجھ محبوب کے کوچے میں رہنے کا طور طریقہ یاد نہ تھا۔ یہ دیکھتے ہی نقشِ پا کی حیرت میرے لیے آئینہ دار بن گئی، یعنی اس نے دکھا دیا کہ محبوب کے کوچے میں رہنا چاہو تو اس کی صورت یہ ہے کہ نقشِ پا کی طرح خاک میں مل جاؤ اور جلوۂ حسن سے سراپا حیرت بن کر پوری زندگی گزار دو۔

۹۔ لغات : موجِ محیط : سمندر کی لہر۔

شرح : اگر تیرے دل میں یہ خیال ہو کہ وصل کے بعد شوق پر نوال آجاتا ہے تو یہ صحیح نہیں۔ سمندر کی لہروں کو دیکھ، وہ عین پانی میں بھی بدستور ہاتھ مارتی رہتی ہیں۔ یعنی وصل کا کمال بھی ان کے شوق پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا۔ وہ ہمیں بتا رہی ہیں کہ شوق سچا اور خالص ہو تو وصال کے بعد بھی اس کی جیتابی اور بھیراری میں کوئی فرق نہیں آتا۔

۱۰۔ لغات - رنجتہ : اردو غزل

شرح : اگر کوئی شخص کہے کہ اردو کی غزل کیونکر فارسی کے لیے باعثِ رشک ہوتی ہے تو اسے ایک بار غالب کے کچے ہوئے شعر سنا دے ساتھ ہی کہ دے کہ ایسے شعرواقعی فارسی کے لیے باعثِ رشک ہوتے ہیں۔

۱۔ شرح :

خواہ سائی خزانے

ہیں :

یہ مصنف خیالی

مصنوع نہیں ہے

بلکہ حقیقتِ واقعی

حسد سے دل اگر افسردہ ہے، گرم تماشا ہو

کہ چشمِ ننگ، شاید، کثرتِ نظارہ سے دامو

ہر قدر حسرتِ دل، پہا بیسے فوقِ معاصی بھی

بھروں یک گوشہ و امن، گر آبِ ہفت دریا ہو

کو ایک نہایت : اگر وہ سرود قد، گرم خرام ناز آ جاوے
 عمدہ پیرائے کف ہر خاک گلشن، شکل قمری، نالہ فرسا ہو
 میں بیان کیا

ہے۔ فی الواقع جب انسان گھر کی چار دیواری میں محصور دنیا
 کے حالات سے ناواقف اور لوگوں کی ترقی و تنزّل کے اسباب
 سے بے خبر ہوتا ہے تو اپنی محدود جماعت میں سے کسی کو عمدہ
 حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن جس قدر اس کا دائرہ تعارف
 زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے، اسی قدر اس پر یہ بات کھلتی جاتی
 ہے کہ لوگوں کی خوش حالی محض اتفاقی نہیں ہے، جس پر حدود
 رشک کیا جائے، بلکہ ان کی محنت و تدبیر کا نتیجہ ہے اور اس
 لیے انصاف و فیاضی اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور خود
 بھی کوشش و تدبیر کی طرف مائل ہوتا ہے۔ بجائے حدود رشک
 کے اعدوں کی بریں اور پیروی کرنے میں متوجہ ہو جاتا ہے۔
 اس معقول بات کو ایک محسوس تمثیل میں بیان کرتا ہے کہ چشم
 تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو۔ جس طرح مشرا نے بخیل
 کے دل کو تنگ باندھا ہے، اسی طرح حاسد کی آنکھ کو تنگی
 کے ساتھ موصوف کیا۔“

مولانا غلامحسین نے حسد کرنا اس لیے ہیبا قرار دیا کہ ”دنیا میں دولت
 کے لیے کوئی سبب درکار نہیں، ہر جگہ یہی حال ہے“۔ یعنی اگر کوئی شخص
 پھر حسد کر دیکھے گا تو اس پر واضح ہوتا جائے گا کہ دولت خاص اسباب کی
 بنا پر ہوتی نہیں آتی۔ مثلاً ایک تاجر کا بیٹا صرف اس لیے دولت مند بن جاتا
 ہے کہ اس کا باپ دولت مند تھا اور یہ تو سب کو معلوم ہے کہ بادشاہ کا
 بیٹا ملک کا والی بن جاتا ہے، حالانکہ اس میں ملک داری کی کوئی خصوصیت

نہیں ہوتی۔ جب کوئی شخص اس قسم کی مثالیں کثرت دیکھے گا تو امید یہی ہے کہ حسد اس کے دل میں یا تو بالکل باقی نہیں رہے گا یا بہت کم رہ جائے گا۔

دو لوں صورتوں میں سے خواجہ حاکمی کی اختیار کردہ صورت بہترین ہے۔ اسے واقعی اخلاقی سبق قرار دے سکتے ہیں۔ محض یہی نہیں کہ دنیا میں پہل بصر کہ حالات پر غائر نظر ڈالی جائے تو انسان کے دل میں کسی بھی نقطہ نگاہ سے تنگی باقی نہیں رہ سکتی، بلکہ بعض ملکوں اور قوموں کا ماحول ایسا ہوتا ہے کہ دوسری قوموں کے نکتے افراد و ہاں پہنچ کر اعلیٰ درجے کے کارکن بن جاتے ہیں۔ اسی طرح انسانوں کے دل سے حسد دور ہو سکتا ہے۔ مرزا نے ”شاید“ کا لفظ استعمال کیا، جس سے مراد یہ ہے کہ لازمی اور یقینی نہیں، بہر شخص پر کثرتِ نظارہ کا یہی اثر ہو۔ اثر زیادہ یا کم بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ بالکل نہ ہو۔ بعض طبیعتیں کسی بھی حال میں احتیاجِ اثر قبول نہیں کرتیں، لہذا ”شاید“ کی قید بالکل بجا ہے اور میرزا کی گہری بصیرت کا پتا دیتی ہے۔

۲۔ لغات۔ معاصی : معصیت کی جمع۔ گناہ

شرح : میرے دل میں مختلف گناہ نہ کر سکنے کی جتنی حسرت ہے

اس کے مطابق گناہوں کا ذوق ہونا چاہیے۔ میری حسرت لا متناہی ہے، اس لیے ذوقِ گناہ بھی لا متناہی ہے۔ حالت یہ ہے کہ اگر گناہ سات سمندر بن جائیں تو میرے دامن کا صرف ایک گوشہ تر ہو سکے گا۔

میرزا پہلے بھی اس مضمون کا ایک شعر کہ چکے ہیں :

دیا نے معاصی تنک آبی سے ہوا تنک

میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

۳۔ لغات۔ نالہ فرسا : آہ و نالوں کرنے والا۔

مشریح : اگر میرا محبوب، جس کا قد سرود کی طرح بلند ہے، تازہ اذان سے ٹلتا ہو، باغ میں آجائے تو خاکِ باغ کی ہر سُطّھی قمری کی طرح آہو فناں کر اُٹھے۔

خاک کی ہر سُطّھی کو قمری اس لیے قرار دیا کہ قمری ناخستہ کی ایک قسم ہے، جس کا رنگ خاکی ہوتا ہے پھر قمری کو سرود سے جو تعلق ہے، وہ محتاج تشریح نہیں اور سرود کے لیے خرامِ ناز کی موزونیت واضح ہے۔

۱۔ لغات :

کنشت : بُت خانہ

مشریح :

اگر میں کبے میں

جا کر مقیم ہو گیا ہوں

تو مجھے طعنہ نہ دو، کیا

میں وہاں جا کر بُت خانے

کے لوگوں کا حقِ صحبت

بھول گیا ہوں ؟ ان

میں رہ کر میں نے جو

فیض پائے، جن

مہربانیوں سے فائدہ

اٹھایا اور جو کچھ سیکھا،

اسے بھول سکتا ہی نہیں، وہ بدستور میرے دل میں تازہ ہیں۔

مقصد یہ ہے کہ مقام کی تبدیلی سے لازم نہیں آتا۔ انسان کے

فکر و خیال اور عقیدت و نیاز میں بھی تغیر آجائے انسان کبے میں جا کر بھی

کبے میں جا رہا، تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں

بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

طاہت میں تا رہے نہ سے واگیں کی لاگ

دورخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ہوں منحرف نہ کیوں رہ درسمِ ثواب سے؟

ٹپڑھا لگا ہے قلمِ سرِ نوشت کو

غالب کچھ اپنی سعی سے کہنا نہیں مجھے

خزمنِ جلے، اگر نہ ملج کھائے کشت کو

بُت پرست رہ سکتا اور بُت پرستوں سے محبت رکھ سکتا ہے۔ عقیدہ و ایمان کا تعلق دل سے ہے، نہ کہ کسی خاص مقام میں قیام سے۔

۲۔ لغات۔ طاعت : بندگی، عبادت، فرمانبرداری۔

مے و انگلیں : شراب اور شہد۔ اشارہ ہے بہشت میں شراب

اور شہد کی بنوں کی طرف۔

شرح : خواجہ حاکمی فرماتے ہیں :

”جب تک بہشت قائم ہے، لوگ عبادت اس امید پر کرتے

ہیں کہ وہاں شہد اور شراب طہور وغیرہ ملے گی، پس بہشت کو

دوزخ میں جھونک دینا چاہیے تاکہ یہ لالچ باقی نہ رہے

اور لوگ خالصاً لوجہ اللہ عبادت کریں۔“

عام عقیدہ یہ ہے کہ خدا کی عبادت کرنے سے بہشت میں شراب اور

شہد کی بنیں ملیں گی۔ میرزا کہتے ہیں کہ عام لوگ شراب اور بہشت کی

آرزو دل میں لے کر خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ سچی اور بے لوث عبادت

تو نہ ہوتی، جو ہر غرض کی آلائش سے پاک ہو اور صرف خدا کے لیے ہو۔

مناسب یہ ہے کہ بہشت کو اٹھا کر دوزخ میں ڈال دیا جائے تاکہ لوگ صرف

خدا کے لیے عبادت کر سکیں، اور کوئی غرض ان کے سامنے نہ رہے۔

۳۔ لغات۔ منحرف : پھر جانے والا۔ برگشتہ :

پھر نوشت : تقدیر، قسمت۔

شرح : میں ان طور طریقوں سے کیوں نہ پھر جاؤں جن پر چل کر

ثواب حاصل ہوتا ہے ؟ میری حالت تو یہ ہے کہ جس قلم سے میری قسمت لکھی

گئی ہے اسے قط ہی ٹیڑھا لگا تھا، لہذا جو تحریر لکھی گئی ہے وہ بھی ٹیڑھی ہے

اور میرے لیے سیدھے راستے پر چلنا اور ثواب حاصل کرنا طبعاً غیر ممکن ہو گیا ہے۔

۴۔ لغات۔ لمخ : ٹیڑھی

کہنا : قسمت، نصیب، قائدہ، حاصل

شرح : اسے غائب ! میں اپنی کوشش، محنت اور جدوجہد سے کوئی

فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر میں کبھی باڑی کروں تو پہلے یقین ہے، ٹڈی دل آ کر اسے صفا چٹ کر جائے گا۔ اگر اتفاقہً فصل ٹڈیوں سے بچ گئی اور میں نے کھدیاں جمع کر لیا تو اسے بہل بدوے گی۔

۱۔ لغات :

وارستہ : آئندہ

شرح : اسے

محبوب ! ہم اس سے

آزاد ہیں کہ آپ ہم

سے محبت ہی کریں۔

اگر محبت نہیں کرنا چاہتے

تو کچھ سنا یہ نہیں۔

دشمنی ہی کا طریقہ اختیار

کر لیں۔ دونوں صورتوں

میں تعلق قائم رہے گا۔

ایک میں خوشگوار اور

دوسری میں ناخوشگوار

لیکن دونوں ہی صورتیں

غائب ہو جائیں تو کامل

بے تعلقی رونما ہو جائیگی

یہ کسی بھی حالت میں منظور

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو

کیجئے ہمارے ساتھ، عداوت ہی کیوں نہ ہو

چھوڑا نہ مجھ میں شغف نے رنگ اختلاف کا

ہے دل پہ بار، نقش محبت ہی کیوں نہ ہو

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرہ غیبر کا گلہ

بہر حذر بسبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو

پیدا ہوئی ہے، کہتے ہیں، بہر درد کی دوا

یوں ہو تو چارہ غم الفت ہی کیوں نہ ہو

ڈالانا بیکی نے کسی سے معاملہ

اپنے سے کھینچتا ہوں، نجات ہی کیوں نہ ہو

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خمبہ

ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو

ہنگامہ زبونی محبت ہے ، انفعال

نہیں ، میرزا خور

کہتے ہیں :

حاصل نہ کیجے دہر سے ، عبرت ہی کیوں نہ ہو

لگ ہر تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب تک کہ ہمیں تو دھوکا کھائیگا

وارثگی بہانہ بیگانگی نہیں !

اپنے سے کر ، نہ غیر سے ، وحشت ہی کیوں نہ ہو

تعلیق کیجئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی نہیں

ٹھٹھا ہے قوتِ فرصتِ ہستی کا عزم کوئی ؟

۲ - لغات -
اختلاط : میل جول -

عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو

شرح : ضمت
اتنا بڑھ گیا کہ میل

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسد

جول قائم رکھنے کی
جس تاب نہ رہی -

اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

ایک ایسا
بوجھ معلوم ہوتا ہے ، جو برداشت نہیں کیا جاسکتا -

جس تاب نہ رہی - حالت یہ ہے کہ محبت کا نقش بھی دل کے لیے ایک ایسا

اس شعر میں بھی صرف صنعت کی شدت واضح کرنا مقصود ہے ، یہ نہیں کہ

محبت ہی سے ہزار ہو گئے - اسلوب بیان ایسا اختیار کیا کہ جو چیز ہمیں سب

سے بڑھ کر عزیز ہے بلکہ ہمارے لیے روح و رواں کی حیثیت رکھتی ہے یعنی

محبت ، وہ بھی ایسے صنعت میں بار محسوس ہو -

۳ - لغات -
برسبیل شکایت : شکایت کے طور پر ، گلے کے

رنگ ہیں -

شرح : اے محبوب ! مجھے تجھ سے یہ گلا ہے کہ غیر کا ذکر مجھ سے

کیوں کیا ؟ انا کہ تیرا مقصد اس کی شکایت کرنا تھا ، لیکن مجھے شکایت کے

رنگ میں بھی اس کا ذکر گوارا نہیں -

رنگ میں بھی اس کا ذکر گوارا نہیں -

۴۔ شرح : مشہور ہے کہ ہر درد کے لیے دنیا میں دوا موجود ہے اگر یہ قول درست ہے تو کون سی وجہ ہے کہ محبت کے عہ میں کوئی دوا کہیں نہیں ملتی۔ یعنی اس قول کو، جو عام رواج پا چکا ہے، غلط ثابت کرنے کے لیے کم از کم یہ بدیہی مثال تو ضرور موجود ہے۔

۵۔ لغات - تجالوت : شرمندگی، پشیمانی۔

شرح : میں عمر بھر بکیں رہا۔ کسی نے میرا ساتھ نہ دیا اور اس وجہ سے کسی کے ساتھ مجھے کوئی معاملہ پیش نہ آیا۔ اگر لوگوں سے تعاون ہوتا تو کوئی مجھ سے فائدہ اٹھاتا اور کسی کا حق پورا نہ کر سکنے کے باعث مجھے شرمندگی اور پشیمانی سے سابقہ پڑتا۔ جب کسی سے معاملہ ہی نہ پڑا تو شرمندگی بھی اپنے آپ ہی سے جو رہی ہے۔ اور کسی سے نہیں۔

شرمندگی اس لیے کہ میں اتنا ناقص ہوں، کسی کو میرے ساتھ معاملے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔

۶۔ شرح : آدمی اپنے دل و دماغ میں گونا گوں خیالات کا ایک عشریہ ہوتے ہے۔ کوئی وقت، کوئی صورت اور کوئی حالت ہو، ان خیالات سے الگ نہیں ہو سکتا۔ وہ مختلف منصوبے سوچتا ہے، نئی نئی سکیں بناتا ہے اور ایک لمحے کے لیے بھی ان باتوں سے فارغ نہیں ہو سکتا۔

اگر وہ دنیا سے کٹ کر گوشہ تنہائی میں بھی بیٹھ جائے تو وہاں بھی اپنے خیالات سے سلسلہ منقطع نہیں کر سکتا۔ گویا گوشہ تنہائی میں بھی اس کے دل و دماغ کے اندر ایک مستقبل انجمن آراستہ رہتی ہے، لہذا ہم اس کی خلوت کو خلوت نہیں، انجمن ہی سمجھتے ہیں۔

روحانی نقطہ نگاہ سے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ انسان دنیوی تعلقات سے الگ ہو جانے کے کتنے ہی دعوے کرے، اس کے لیے الگ ہونا ہے غیر ممکن، کیونکہ وہ دنیا والوں سے الگ ہو سکتا ہے، اس کے اندر دنیوی خیالات

کا جو معشر بپا ہے، اس سے الگ نہیں ہو سکتا۔

۷۔ لغات۔ زبونی ہمت : ہمت کی پستی۔

انفعال : دوسرے کا اثر قبول کرنا۔

شرح : دوسرے کا اثر قبول کرنا پست ہمت کی دلیل ہے۔ لوگ زمانے

سے عبرت حاصل کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی بصیرت سے
فائدہ اٹھایا، لیکن میں کتنا ہوں کہ زمانے سے عبرت بھی حاصل نہ کرنی چاہیے
کیونکہ یہ بھی دوسرے کا اثر قبول کر لینا ہے اور اثر قبول کر لینا پستی ہمت کا
باعث ہے۔ پھر کون سی وجہ ہے کہ انسان اپنے عزم و ہمت کے لیے ذلت
و سوائی کا سامان فراہم کرے ؟

۸۔ لغات۔ وارستگی : آزادی

بیگانگی : بے تعلق، اجنبیت

وحشت : دور بھاگنا۔

شرح : آزادی کے دعوے ارو ! آزادی کا مطلب یہ نہیں، کہ

اسے لوگوں سے بے تعلق کا بہانہ بنا لیا جائے، بے تعلق اپنی ذات سے پیدا
کرنی چاہیے، نہ کہ غیروں سے۔ وحشت و بیگانگی اپنی ہی ذات سے لازم
ہے، دوسروں سے نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ گرد و پیش سے الگ ہو کر سمجھتے ہیں کہ

ہم آزاد اور آزادہ رو ہیں۔ آزادی یہ نہیں، یہ تو اپنی ذات کی خاص
پاسداری اور دوسروں سے علیحدگی ہے۔ حقیقی آزادی یہ ہے کہ دوسروں
کے ساتھ رہ کر ان کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دی جائے، ان کے
دکھ بٹائے جائیں اور ان کی ہر ممکن اعانت کی جائے۔ یہ اسی صورت میں
ممکن ہے کہ اپنی ذات کو مثایا جائے اور سب سے پیچھے رکھا جائے۔ یہی
حقیقی آزادی ہے۔

اقبال اس مقام میں کیا خوب کہ گیا ہے :

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں، جنوں میں پھرتے ہیں بسے مارے
میں اس کا بندہ جنوں گا، جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

۹۔ لغات - فہرست فرصت : فرصت کا چھن جانا، منافع ہو جانا۔

شرح : اگر انسان کی عمر عزیز کا ایک ایک لمحہ عبادت ہی میں صرف ہو، جو نہایت پاکیزہ مشغلہ ہے تو کیا اس حالت میں زندگی کی فرصت منافع ہو جانے کا غم ملے جائے گا ؟

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کی جو مہلت عطا کی ہے، وہ اتنی بیش بہا ہے کہ انسان ایک ایک لمحہ خدا کی عبادت میں بھی گزار دے تو احساس ہی ہوتا ہے کہ اس فرصت سے پورا فائدہ نہ اٹھایا گیا۔

یہاں لفظ ”عبادت“ حقیقی نہیں، روحانی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ حقیقی عبادت کا دائرہ نہایت وسیع اور بن نوع انسان کے لیے حدود و جفاۃ رساں ہے۔ غالباً میرزا غالب یہی واضح کرتا چاہتے ہیں کہ روحانی عبادت میں زندگی صرف کر لینے کے باوجود اس کا حق ادا نہیں ہوتا۔ مطلوب یہ ہے کہ اسے واقعی ان کاموں میں صرف کیا جائے، جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے دے دیے ہیں اور انہیں کاموں کی بجا آدمی کو حقیقی عبادت قرار دیا ہے اگر ایسا نہ ہو تو ظاہر ہے کہ زندگی کی عارضی مہلت منافع ہوئی اور اس کا غم باقی رہ گیا۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بیشک انسان دل میں سمجھ سکتا ہے، اس نے ارادۃ کسی نیک کام میں کوتاہی نہیں کی، لیکن کیا کہا جاسکتا ہے کہ تمام کام نیک۔ بیشک اسی طرح پورے ہوئے، جس طرح ہونے چاہیے تھے۔ لہذا ابھی فرصت بہت کے منافع ہونے کا سبب بنا۔

۱۰۔ **شرح :** ہمارے محبوب کی فطرت ہی فتنہ انگیزی ہے۔ اسے استاد! اب ہم اس کے دروازے پر آ بیٹھے ہیں اور پختہ ارادہ کر چکے ہیں۔ کہ یہاں سے نہیں اٹھیں گے۔ اگرچہ ہمارے سر پر قیامت ہی ٹوٹ پڑے، جو مردوں کو قبروں سے اٹھا کر باہر کھڑا کر دے گی۔

”قیامت ہی کیوں نہ ہو“ میں اشارہ قیامت کی طرف بھی ہو سکتا ہے اور یہ مطلب بھی نکل سکتا ہے کہ ہم پر ایسی مصیبتیں نازل کر دی جائیں جو قیامت سے مشابہ ہوں۔

۱۔ **لغات :**

شیون : تار، فغان
نوا سخن : گلشن
باغ میں گانے والے بندے
شرح : میں بخرے میں قید ہوں اور فریاد و فغان کرتا رہتا ہوں۔
مان بھیجے کہ باغ کے

قفص میں ہوں، اگر اچھا بھی نہ جائیں میرے شیون کو
مرا ہونا بڑا کیا ہے نوا سخن گلشن کو
نہیں گر محمدی آساں، نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے
نزدی ہوتی خدایا آرزوئے دوست، دشمن کو
نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو، اس بوجہ احت پر
کیا سینے میں جس نے خو نچکاں، مژگانِ سوزن کو
خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو، کبھی جانناں کے دامن کو
ابھی ہم قتلگہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں، تیرے توسن کو

آزاد و خوش نوا
 پرندوں کو میری
 فریاد و غنائ بھی
 معلوم نہیں ہرق
 لیکن میرے
 ہونے میں کیا
 بُرائی ہے ؟
 میرا وجود انہیں
 کیوں ناگوار
 معلوم ہوتا ہے
 حالانکہ میری
 وجہ سے ان کی
 آزادی اور
 خوش نوائی کو
 کوئی نقصان
 نہیں پہنچتا ۔
 ممکن ہے ،
 میرزا غالب نے
 باغ کی صرف
 عام کیفیت
 پیش نظر رکھتے

ہوا چہرہ پا جو میرے پانوں کی زنجیر بننے کا
 کیا بے تاب کاں میں ، جنبش جو ہرنے آہن کو
 خوشی کیا ، کھیت پر میرے ، اگر سوار ابر آوے
 سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو
 وفاداری ، بشرط استواری ، اصل ایماں ہے
 مرے بُت خانے میں تو کبے میں گاڑ و برہمن کو
 شہادت تھی مری قسمت میں ، جو دی تھی یہ نو مجھ کو
 جہاں تلوار کو دیکھا ، جھکا دیتا تھا گردن کو
 نہ کُٹا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
 رہا کھٹکانہ چوری کا ، دُعا دیتا ہوں رہزن کو
 سخن کیا کہ نہیں سکتے کہ جو یا ہوں جوابہر کے
 جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو
 مرے شاو سلیمان جاہ سے نسبت نہیں ، غالب !
 فریدیوں و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

ہونے یہ شعر کہ دیا ہوا دہان کے سامنے کوئی خاص واقعہ نہ ہو ، لیکن جلد ہی
 ہمارے ملک کی قومی زندگی میں کئی ایسے واقعات پیش آئے ، جن پر یہ شعر ٹھیک ٹھیک

منطبق ہوتا تھا۔ مثلاً ابتدا میں جن لوگوں نے بہت دجرات سے کام لے کر آزادی کے لیے سنی و جہد مشروع کی اور وہ آلام و مصائب میں مبتلا ہوئے تو ایک دو نہیں، ہزاروں افراد اپنے ولی مقتدرات کی بنا پر یا مکران قوم کو خوش کرنے کے لیے ان مجاہدین کی مذمت کرتے رہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک آزادی کا جذبہ عام نہ ہو گیا۔ ایسے مجاہد اہل وطن کو یہی شعر سن کر حقیقت حال واضح کر سکتے ہیں کہ قید ہم ہوئے، مصیبتیں ہم پر آئیں، آزادی کی صدا ہم نے بلند کی۔ اس سے اہل وطن کے مشغلوں پر تو کوئی اثر نہ پڑا، پھر انھیں ہمارا وجود کیوں نا پسندیدہ معلوم ہوتا ہے ؟

شاعر کے فکر و نظر کی غیر معمولی صلاحیت کا ایک منظر یہ بھی ہے کہ وہ شعر میں ایسی صورت حال پیش کر دے، جو اگرچہ اس کے زمانے میں موجود نہ ہو، لیکن آگے چل کر ٹھیک ٹھیک اسی طرح پیش آنے والی ہو۔ اسے بھی شاعر کے کلام کی آفاقیت کا ثبوت سمجھنا چاہیے۔

۲۔ شرح : اگرچہ رقیب کے لیے عشق و غبت اور وفا و نفاق کاری میں مجھ ایسا ہونا آسان نہ ہو، مگر یہ رشک کم نہیں کہ اس کے دل میں بھی میرے محبوب کی آرزو ہے۔ اے خدا ! کاش یہ آرزو اسے نصیب نہ ہوتی ! یہی محبوب کے لیے کسی دوسرے کے دل میں خواہش کا پیدا ہونا بھی گوارا نہیں۔ اس سے بھی رشک کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔

کلیات غالب (فارسی) میں ایک شعر ہے، جس میں اس سے ملتا جلتا مفہوم یوں پیش کیا ہے۔

یاد از عدد نیامدیں ہم ز دور بینی ست

کا ندرد لم گوشتن ! یا رہم نیشنی ست

۳۔ لغات - جراحہ : زخم - گھاؤ۔

شرح : جن زخموں نے سینے کے اندر سونے کی آنکھوں سے خون

ٹپکا دیا، اے محبوب ! اُن زخموں پر تیری آنکھ سے ایک بھی آنسو نہ
 بعض اصحاب نے اس لیے سوزن سے سوزن غم مراد لی کہ سبب غم
 کا مقام ہے، لیکن یہ خیال نہ فرمایا کہ سوزن غم سے زخم یہ نہیں جاتے،
 اور تجرہ ہی میں آج کل کی طرح پہلے بھی اندرونی زخم برابر سے جاتے تھے
 اور سونوئوں کی آنکھوں سے خون کے قطرے ٹپکتے تھے۔ سبب یہ معنی صدر
 کی جگہ سینا بہ معنی دوختن سمجھنا بھی میرے نزدیک قرین صواب نہیں۔ شعر کا
 مضمون یقیناً زیادہ گہرا نہیں، لیکن شاعر محبوب کی بے پروائی اور بیدردی
 کی تصویر پیش کر رہا ہے اور اس نقطہ نگاہ سے شعر نہایت اچھا ہے۔

۴۔ شرح : خدا کرے کہ میرے ہاتھوں کو شرم آئے۔ ان کے
 دو ہی کام رہ گئے ہیں یا تو میرے گریبان کو کھینچنا تانی میں رکھتے ہیں یا محبوب
 کے دامن کو کھینچتے ہیں۔ کاش، یہ اپنے اس فعل سے باز آئیں۔

عاشق کے لیے زندگی کی وہی صورتیں ہیں یا محبوب سے وصال یا ہجر
 و فراق۔ محبوب سے قرب ہو تو عاشق کے ہاتھ اس کا دامن کھینچنا شروع
 کر دیتے ہیں، یہ حرکت بھی نازیبا ہے۔ اگر محبوب سے مفارقت ہو تو بیاہنی
 اور بے قراری میں عاشق کے ہاتھ گریبان تار تار کر دینے لگے پے ہو جاتے ہیں۔
 میرزا نے ہاتھوں کے لیے بدو و عاصروں کی، لیکن ہجر و وصال کا جو نقشہ پیش
 کر دیا، وہ بالکل بے مثال ہے۔

۵۔ لغات۔ شناور : تیرنے والا۔

توسن : گھوڑا۔

شرح : عشق کی قتل گاہ کو فی معرہ چیز نہیں۔ جب یہ رونق
 پر آتی ہے تو خون کا دیا بہ نکلتا ہے، جس میں قاتل کا گھوڑا تیرتا پھرتا ہے۔
 اس شعر کی آفاقیت قابلِ غور ہے۔ قوی زندگی میں ایسے ہزاروں
 منظر پیش آئے اور ہمیشہ پیش آتے رہیں گے۔ لوگوں نے سمجھا کہ آزادی حاصل

کر لینا آسان ہے۔ جب قربانیوں کا موقع آیا، قزاقوں اور پشتوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ واقعی خون کے دریا بہ گئے، پھر آزادی کی منزل میں قدم پہنچ سکے۔ شعر میں یہ منظر نہایت خوش اسلوبی سے پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ دو چاروس ہیں قربانیوں سے یہاں کام نہیں چل سکتا۔ اس منزل کو آسان نہ سمجھو۔ یہاں واقعی بے دریغ قربانیاں کرنی پڑیں گی۔

۶۔ شرح : میں وہ وحشی اور مجنوں ہوں کہ جب میرے پاؤں کی زنجیر ہٹنے کا چرچا ہوا تو جو سہرا اس طرح حرکت میں آگئے کہ فولاد کان کے اندر بیتاب و بے قرار ہو گیا۔ یعنی فولاد بھی ایسے وحشی کی زنجیر بن جانے کا انتہائی خواہاں تھا۔

شعر میں گرفتاری اور قید و بند کے فوق کا جو جذبہ پیش کیا گیا ہے، وہ واقعی اعلیٰ مقاصد کے لیے جدوجہد کرنے والوں کے تعلق میں قابلِ تقلید ہے۔

۷۔ شرح : اگر میرے کھیت پر بادل سوار بھی آئے تو اس کا صرف یہ پہلو نہیں کہ کھیت پر بارش ہوگی اور اس سے فصل پک جانے میں مدد ملے گی۔ ایک پہلو یہ بھی تو ہے کہ ابر کی آمد مصیبت کا سامان بھی بن سکتی ہے، یعنی ابر کے پردے میں بجلی آئی اور تماش کر رہی ہے کہ کب موقع پائے اور کھیت کا حاصل جلا کر راکھ کر دے۔

میرزا نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ دنیا کی ہر چیز میں دو پہلو موجود ہیں، ایک منفعت کا ہے، دوسرا نقصان کا۔ انسان کو صرف ایک ہی پہلو پر نظر نہ رکھنی چاہیے۔ لوگ ایسے اشعار کی بنا پر میرزا کو قنوطیت کا شاعر قرار دیتے ہیں، حالانکہ یہاں رجائیت و قنوطیت کا کوئی سوال نہیں۔ بصیرت کا تقاضا یہی ہے کہ دونوں پہلو پیش نظر رکھتے ہائیں۔ گویا یہ اخبارِ قنوطیت نہ، بلکہ دعوتِ بصیرت ہے۔

۸۔ شرح : ایمان کی اصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ وفاداری کے

مسک پر انسان برابر قائم و استوار ہے، یہاں تک کہ مر جائے۔ اگر برہمن اسی اصل ایمان کو پیش نظر رکھ کر بتھانے میں مر جائے تو وہ اس قابل ہے کہ دفن کے لیے اسے کچے میں جگہ ملے۔

ظاہر ہے کہ نہ برہمن کو دفن کیا جاتا ہے اور نہ کعبہ مکرمہ قبرستان ہے کہ وہاں لوگ دفن ہوں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ ایمان کی اصل (اپنے عقیدے پر پوری وفاداری سے قائم و استوار رہنا) کی اہمیت و عظمت نمایاں کی جائے۔ جس فرد میں ایمان کی یہ اصل موجود ہو، اس کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو، وہ اس قابل ہے کہ اسے دنیا کے مقدس ترین مقام میں جگہ ملے۔

بعض اصحاب نے لکھا ہے کہ عرتی پیشتر ایک شعر کہ چکا ہے، جس کا

مصنوع قریب قریب یہی ہے، یعنی :

بہ کیش برہمن آں کس از شیدان است

کہ در عبادت ثبت روئے بر زمین میرد

برہمنوں کے عقیدے کے مطابق شیدہ ہے، جو ثبت کے سامنے

سجدے میں گرے ہوئے جان دے دے۔

ظاہر ہے کہ اس شعر کو بہ اعتبار مصنوع غالب کے شعر سے کوئی

نسبت نہیں۔ عرتی صرف یہ بتاتا ہے کہ برہمنوں کے عقیدے کے مطابق شیدہ کون ہے؟ غالب ایمان کی اصل و اساس واضح کرتے ہیں اور اس پر پورے مصنوع کی بنیاد رکھتے ہیں۔

۹۔ شرح : میری قسمت میں شہادت کسی تھی، لہذا اللہ تعالیٰ

نے میری فطرت ہی میں یہ چیز ڈال دی کہ جہاں تلوار کچی ہوئی دیکھتا تھا، وہیں گردن جھکا دیتا تھا۔

جن لوگوں کے عزائم بلند ہوں، ان کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے کہ وہ خطرات سے ڈرتے نہیں، بلکہ ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ یہی حقیقت اس شعر میں واضح کی گئی ہے۔

۱۰۔ **تشریح :** اگر میں دن کے وقت رہزن کے ہاتھوں نہ لٹ جانا اور جو کچھ میرے پاس تھا، وہ چھین نہ لیا جاتا تو رات کے وقت میرے لیے یوں سو جانے کی کون سی صورت تھی کہ مدد بخدہ ہی نہ رہی۔ بے خبری کی یہ نیند اس لیے آئی کہ چوری کا کوئی وعدہ باقی نہ رہا اور رہزن کو وادیا ہو ا سو گیا کہ وہ دن کے وقت سب کچھ چھین لے گیا۔

اس شعر سے ملتا جلتا ایک شعر نظیری نیشاپوری کا بھی ہے۔

ہر بانی ازاں شادم کہ از تشویش آزد اوم

گر یابانے ندام تا کہے از دست من گیرد

یعنی میں برہنگی پر اس لیے خوش ہوں کہ تشویش سے فارغ ہو گیا۔ میرے پاس کپڑا ہی نہیں، جو کوئی چھین کر لے جائے۔

دونوں کا مرکزی مضمون ایک ہے، یعنی دنیا کا ساز و سامان اور علانیہ انسان کے لیے تشویش و اضطراب کا سرچشمہ ہیں۔ ان سے آزاد رہنا باعث اطمینان ہے، لیکن دونوں کے بیان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ نظیری نے محض ایک دعویٰ کر دیا، مرزا نے پورے مضمون کو عام و قومی صورت دی اور کہا کہ رہزن دن کو سب کچھ لوٹ نہ لے جاتا تو رات کو بے خبر سونا نفییب نہ ہوتا، کیونکہ چوری کا اندیشہ باقی رہتا۔

پھر مرزا کی دقیقہ بینی ملاحظہ فرمائیے :

۱۔ دو شخص پیدا کیے، جو سامان لے جا سکتے تھے، ایک رہزن، جو دن و رات

نور و قوت سے سب کچھ لوٹتا ہے، دوسرا چور، جو رات کو چھپ چھپا کر چیزیں اٹھاتا ہے۔

۲۔ رہزن اور چور دونوں موجب تشویش ہیں۔ مگر رہزن دن کو ٹوٹتا ہے اس لیے نیند میں خلل انداز نہیں ہو سکتا۔ چور رات کو چوری کرتا ہے اور اس کے متعلق کھشکامات کی غینہ حرام کر دیتا ہے۔

۳۔ انسان کو اطمینان و فراخ کی ضرورت سب سے بڑھ کر رات ہی کے وقت پیش آتی ہے، کیونکہ یہی سونے کا وقت ہے۔ رہزن نے دن کو دوستی تعجب ملاز کیا اور رات کے لیے اطمینان بہم پہنچا دیا، لہذا مرزا کے نزدیک وہ دعا کا مستحق ٹھہرا۔

۴۔ پھر مرزا نے یہ پورا واقعہ ایسے انداز میں پیش کیا، گویا یہ ہو چکا ہے، یہ نہیں کہ ہونے والا ہے۔

۱۱۔ **تشریح :** اس شعر میں کلام کو جواہرات سے اور سخن گوئی کو کان کنی سے افضل و برتر قرار دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ کیا ہم شعر نہیں کہہ سکتے کہ جواہرات ڈھونڈتے پھریں؟ کیا ہمارے پاس جگر نہیں جس کی کاوش سے اعلیٰ درجے کے اشعار نکال سکتے ہیں کہ کانیں کھودتے پھریں؟

۱۲۔ **تشریح :** اکامیٹیشک ایران میں بڑے بڑے بادشاہ گذرے ہیں، مثلاً فریدوں، جمشید، کیمینرو، دارا گشتاسپ اور بہمن، مگر ان سب کو میرے بادشاہ سے جو حضرت سلیمانؑ کا سار تہہ رکھتا ہے، کیا نسبت ہے؟

۱۔ لغات :
پاؤں دھو کر پینا :
استثنائی تعلیم ،
استثنائی فرائض برداری
اور استثنائی محبت
کا ایک فعل ہے

دھوتا ہوں جب میں پینے کو ، اس سیم تن کے پاؤں
رکھتا ہے ، منہ سے ، کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں
دی ساوگی سے جان ، پڑوں کو ہ کن کے پاؤں
بیہات اکیوں نہ ٹوٹ گئے ، پیر زن کے پاؤں

بھاگے تھے ہم بہت، سو اسی کی سزا ہے یہ
 ہو کر اسیر دہتے ہیں، راہزن کے پاتو
 مرہم کی جستجو میں، پھرا ہوں جو دُور دُور
 تن سے سوانگار ہیں، اس خستہ تن کے پاتو
 اندر سے ذوقِ دشتِ نور دی کہ بعد مرگ
 جلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاتو
 ہے جوشِ گلِ بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
 اُڑتے ہوئے الجھتے ہیں، مرغِ چمن کے پاتو
 شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
 ڈکھتے ہیں آج اُس بُتِ نازکِ بدن کے پاتو
 غالب! مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو؛
 پیتا ہوں دھوکے خسرو شیریں سخن کے پاتو
 اس سے محبت کا یہ انتہائی اظہار رکوں۔

۱-۲۔
 شرح :

میں اس حسین و
 جمیل کے پاؤں
 اس لیے دھوتا
 ہوں کہ دھوؤں
 اپنی جاؤں تو وہ
 خند سے اپنے
 پاؤں کھینچ کر لگن
 سے باہر رکھ
 لیتا ہے۔ یعنی
 مجھے یہ سعادت
 بھی حاصل نہیں
 کرنے دیتا کہ

۲۔ لغات۔ ہیہات : لفظی معنی "بہت بعید ہے" اور وہیں یہ
 کلر تاسف ہے اور اس کے ایک ٹکڑے یعنی "ہات" کو پاؤں سے مناسبت ہے۔
 پاؤں پڑنا : قدم چومنا، عزت اور تعظیم کرنا۔
 پیرزن : مشورہ ہے کہ فرار سے کہا گیا تھا، پہاڑ چیر کر شیریں کے باغ

کے لیے ہنرے آئے تو اسے شیریں مل جائے گی۔ مزہ دینے یہ شرط پوری کر دی۔ اب خسرو کو توثیق ہوئی۔ آخر ایک بڑھیا کو یا ایک روایت کے مطابق ایک مصاحب کو بڑھیا کا بھیس بدلوا کر مزہ دے کے پاس بھیجا گیا۔ وہ روٹی چٹائی گئی۔ مزہ دینے سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ میں شیریں کی دایہ ہوں، میں نے ہی اسے پالا تھا۔ وہ آج مر گئی۔ مزہ دینے یہ سنتے ہی تیشہ سر پر مارا اور مر گیا۔

تشریح : مزہ دینے بھولپن سے جان دے دی۔ میرے دل میں اس کی اس سادگی کی انتہائی عزت ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس کے پاؤں چوم لوں۔ افسوس، صد افسوس، اُس بڑھیا کے پاؤں کیوں نہ ٹوٹ گئے، جس نے شیریں کی موت کی جھوٹی خبر مزہ دے تک پہنچائی اور اسے یوں موت کے گھاٹ اتارا۔

مزہ دے کی سادگی یہ کہ محبوب کی خبر موت سنتے ہی چھان بین بھی نہ کی اور اسے درست مان کر جان دے دی۔

۳۔ **تشریح :** انسان سے جیسا جرم سرزد ہوا، ویسی ہی اسے سزا ملتی ہے۔ اس کا نہایت اچھا نمونہ اور اس سے اگلا شعر ہیں۔ کہتے ہیں کہ رابہزن کا حملہ ہوا اور ہم نے اس کی گرفت سے بچ نکلنے کے لیے بھاگنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، لیکن پکڑے گئے اور ہمارے لیے یہ سزا تجویز ہوئی کہ رابہزن کے پاؤں دبائیں۔ گویا گرفتاری اور اسیری سے بچنے کے لیے رابہزن کو جتنا دھڑایا تھا، اتنی ہی سزا مل رہی ہے اور سزا میں مشقت یہ ہے کہ رابہزن کے پاؤں دبائیں۔

۴۔ **تشریح :** میرا بدن زخموں سے چور تھا۔ اُن زخموں کے لیے مرہم کی تلاش میں ہمیں دُور دُور پھرنا پڑا۔ اب حالت یہ ہے کہ پاؤں بدن سے زیادہ زخمی ہیں۔ دُور دُور پھرنے کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ پاؤں کو دیاوہ سے زیادہ تکلیف پہنچے۔ شکر کی عوامی صورت ایسی ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ مرہم کی تلاش میں دُور دُور پھرنے کا تو کچھ فائدہ نہ ہوا، لیکن بدن جیسا زخمی

نقا، دویا ہی رہا۔ مزید مصیبت یہ پیش آئی کہ پاؤں تن سے بھی بڑھ کر زخمی ہو گئے۔

یہ صورت حال بھی زندگی میں پیش آتی رہتی ہے۔ مثلاً تکلیفوں کو دور کرنے کے لیے تنگ دودو شروع کر دی، لیکن سود مند بیر یا سنی کی خامی کے باعث پسلی تکلیفیں دور ہونے کے بجائے مزید تکلیفیں پیش آ گئیں۔

۵۔ **مشریح :** صمراؤں میں پھرنے کا ذوق اس طرح فطرت میں رچ گیا تھا کہ مرنے کے بعد غسل بھی دے دیا گیا، کفن بھی پہنا دیا گیا، لیکن پاؤں بدستور پل رہے ہیں۔ یہ اسی فطری ذوق کا کرشمہ ہے۔

۶۔ **مشریح :** بہار کے موسم میں بہر طر پھولوں کے جوش کا یہ عالم ہے کہ پرندے باغ میں اڑتے ہیں تو ان کے پاؤں جا بجا الجھتے ہیں۔ اس کے دو منہم ہو سکتے ہیں، اول یہ کہ پھولوں کا جوش خود حال کی طرح پورے باغ پر بھا گیا ہے اور اس میں پرندوں کے پاؤں الجھ رہے ہیں۔ دوم یہ کہ پھولوں کے جوش نے باغ میں بہر طر عجیب کیفیت پیدا کر رکھی ہے، پرندہ اڑتا ہے، لیکن پھولوں کی کیفیت دیکھتے ہی پر سمیٹ کر چنچے اتر آتا ہے، گو یادہ جانا نہیں چاہتا۔

۷۔ **مشریح :** پرانے انداز کا ایک خیالی شعر ہے۔ محبوب کی نزاکت کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں، آج اس نازک بدن کے پاؤں ڈکھ رہے ہیں، کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ رات کو کسی کے خواب میں آیا ہو۔ اس نزاکت کا کیا کنا کہ محبوب خواب میں بھی چل کر جائے تو اس کے پاؤں ڈکھنے لگتے ہیں۔

۸۔ **مشریح :** اے غالب! میرا کلام کیوں پر طعت اور مزیدار نہ ہو؟ میں تو شیریں سخن خسرو کے پاؤں دھو کر پتا ہوں۔

آخری مصرع میں خسرو سے مراد بادشاہ بھی ہو سکتا ہے اور امیر خسرو بھی، دونوں شاعر تھے، اگرچہ شعر کے مدارج میں بڑا فرق تھا۔

یہ غزل سہ ماہی کے دیوان میں چھپی تھی، گویا یہ قلم کے ساتھ علامت کے تعلق سے پیش کی ہے۔ لہذا قرینہ یہی ہے کہ میرزا کے پیش نظر امیر خسرو ہوں۔ لیکن عموماً یہی سمجھا گیا ہے کہ اشارہ ابو ظہر بہادر شاہ کی طرف ہے۔

خسرو، شیریں اور مزہ کی مناسبت واضح ہے۔

۱۔ لغات۔

ہولِ دل : ہول
بہ معنی خوف، ہولِ دل
ایک بیماری ہے،
جس میں دل دھڑکنے
لگتا ہے اور اختلاج
شروع ہو جاتا ہے۔

واں اس کو ہولِ دل ہے، تو یاں میں ہوں شمسار
یعنی، یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو
اپنے کو دیکھتا نہیں، ذوقِ ستم تو دیکھ
آئینہ تاکہ دیدہٴ پنجخیر نہ ہو

شرح : محبوب کو ہولِ دل کی بیماری ہو گئی ہے اور میں یہاں
تادم و شمسار بیٹھا ہوں کہ یہ کہیں میری آہ و فغاں ہی کا اثر نہ ہو۔
کبھی تو یہ عالم ہوتا ہے کہ جس آہ و فغاں سے سو دج میں شکات پڑ
جاتے، وہ محبوب کے دل پر نفسِ برابر اثر نہیں رکھتی اور کبھی خوش فہمی کا یہ
عالم ہوتا ہے کہ محبوب کو ہولِ دل کی بیماری ہوئی اور عاشق نے سمجھ لیا،
کہ یہ میری آہ کا اثر ہے اور آہ کے کرنے پر شرمندہ ہیں۔

۲۔ لغات۔ تاکہ : جب تک۔

پنجخیر : فکاد۔

شرح : محبوب کا ذوقِ ستم ملاحظہ فرمائیے کہ جب تک کسی جانور کو
فکاد کر کے نہ لائے اور اس کی آنکھوں کو آئینہ بنا کر سامنے نہ رکھے۔

ذیباٹش و آرائش اور بختے سوز نے ہی کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

شکار مارا جانے تو اس کی آنکھیں یا تو بالکل کھل جاتی ہیں یا نیم وار ہوتی ہیں اور صاف و شفاف آئینے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ محبوب ایسا ظالم ہے کہ ان آنکھوں کو آئینہ بناتا ہے، پھر کنگھی چوٹی کرتا ہے۔

۱۔ لغات :

پئے ہم : ہم

لگاتار ، مسلسل۔

صدرہ : سوسو

طرح ، سوسو پار۔

آہنگ : ارادہ

زمین بوس : زمین

چومنا۔

شرح : محبوب

کے کوچے میں پہنچ کر

مجھے لگاتار غش پر

غش آتے ہیں اگر یا

میں اپنے قدموں کی

زمین چومنے کے لیے

سوسو طرح ارادہ

کرتا ہوں۔

قدموں نے محبوب

کے کوچے میں پہنچایا

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو

صدرہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

دل کو میں اور مجھے دل، محروفا رکھتا ہے

کس قدر ذوق گرفتاری ہم ہے ہم کو

ضعف سے نقش پئے مور ہے طوق گردن

تیرے کوچے سے کہاں طاقت رم ہے ہم کو

جان کر کیجے تغافل کہ کچھ اتمید بھی ہو

یہ نگاہ غلط انداز تو سہ ہے ہم کو

ریشک ہم طرحی و در و اثر بانگ حزیں

نالہ مرغ سحر، تیغ دو دم ہے ہم کو

سراٹانے کے جو وعدے کو مکر چاہا

سہنس کے بولے کہ "ترے سر کی قسم ہے ہم کو"

وہاں پہنچ کر غش آئے
 لگے۔ عاشق نے
 سمجھا کہ یہ غش نہیں
 بلکہ میں قدموں کے
 احسان سے اتنا زبردست
 ہوں کہ جی چاہتا ہے
 سو سو طرح ان کی
 زمین چوموں، کیونکہ
 انہیں کی بددست میں
 یہاں پنپا، جسے
 میرے شوق اور
 میری آرزو کی سوز
 سمجھنا چاہیے۔

۲۔ لغات - ہم : ایک دوسرا جیسے باہم دگر۔
 شرح : اگرچہ وفا کے واجبات ادا کرنے میں بڑی مصیبتیں اور بڑی
 پریشانیاں امکانی پڑتی ہیں، پھر بھی میں دل پر زور دیتا رہتا ہوں کہ وفا کا
 راستہ نہ چھوڑنا چاہیے اور دل مجھے سمجھاتا رہتا ہے کہ آداب و فاسد
 الگ نہ ہونا۔ اسی سے اندازہ کر لیجیے کہ مجھے اور میرے دل کو باہم دگر
 عشق میں الجھانے رکھنے کا کتنا شوق ہے !
 ۳۔ لغات - نقش پے مورد : چوٹی کے پاؤں کا نقش۔

رزم : بھاگنا، چلا جانا۔
 شرح : ہماری کمزوری کا یہ عالم ہے کہ چوٹی کے پاؤں کا نقش
 میری گردن میں طوق کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے بعد ادھر ادھر جنبش محال

ہے۔ اسے محبوب! سوچ کہ اس حالت میں ہمارے لیے تیرے کوچے سے جاگنے یا چلے جانے کی کون سی صورت ہے ؟

اس شعر میں ضعف کی شدت پر اس لیے زور دیا گیا کہ اگر چلے جانے کی طاقت ہوتی تو اس کا امکان خیال میں آ سکتا تھا۔ جب طاقت ہی نہیں رہی تو امکان ہی خارج از بحث ہے، ہم جا سکتے ہی نہیں۔

۴۔ لغات۔ نگاہ غلط انداز : وہ نظر جو غلطی سے، بھٹوے سے بے اتفاقی سے بلا ارادہ کسی پر پڑ جائے۔

سُرم : زہر۔

شُرَح : شناسائی اور جان پہچان کا ساتھ نفل کیجئے تاکہ دل کے لیے امید کی کوئی روشنی باقی رہے۔ یہ آپ انجانوں کے سے انداز میں بے اتفاقی سے بلا ارادہ جو نظر ڈال رہے ہیں، یہ تو ہمارے لیے زہر ہے، جو ہمیں موت کا پیغام دیتی ہے۔

میر نے اس شعر میں تنافل کی دو صورتیں پیدا کی ہیں، ایک وہ جو جانے پہچانے آدمیوں سے برتا جاتا ہے، دوسرا وہ جو انجانے آدمیوں سے کیا جاتا ہے۔ میرزا تنافل پر راضی ہیں، لیکن ایسا تنافل، جو جانے پہچانے آدمیوں سے روا رکھا جاتا ہے، کیونکہ اس میں عاشق کے لیے یہ امید باقی رہتی ہے کہ کسی وقت تنافل ختم ہو جائے گا اور محبوب کے اتفاقات سے جی بھر کر محفوظ ہونے کا موقع ملے گا، لیکن جو تنافل انجانے آدمیوں سے کیا جاتا ہے، اس میں امید کی کون سی صورت ہو سکتی ہے وہ تو ہر انجان آدمی کے لیے برتا جاتا ہے۔ وہ تو یقیناً عاشق کے لیے زہر کا حکم رکھتا ہے۔

۵۔ لغات۔ ہم طرحی۔ ہم مشرن، یک رنگی، ایک جیسا ہونا۔

بانگ خزیں : درد بھری صدا، غم انگیز آواز

تیغ دو دم : دو دھاری تلوار۔

شرح : صبح کو پرندہ جو مزید و فغاں کرتا ہے، وہ میرے لیے دو دھاری توار ہے۔ اس کی ایک دھار تو یہ ہے کہ اس نے مزید و فغاں میں میرا اذان ہے اور وہی سوز ہے، جو میری مزید و فغاں میں پایا جاتا ہے یہ رنگ مارے ڈالتا ہے دوسری دھار یہ ہے کہ اس کی صدا انسانیت غم انگیز ہوتی ہے اور وہ جہاں جہاں پہنچتی ہے، اور وہ کی آگ بھڑکا دیتی ہے۔

۶۔ **شرح :** خواجہ عالی فرماتے ہیں :

”تیرے سر کی قسم ہے جم کو“ اس جملے کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ تیرے سر کی قسم ہے، ہم ضرور اڑا دیں گے اور دوسرے یہ کہ ہم کو تیرے سر کی قسم ہے، یعنی کبھی ہم تیرا سر نہ اڑائیں گے جیسے کہتے ہیں کہ آپ کو تو ہمارے ان کھانے کی قسم ہے، یعنی کبھی ہمارے ان کھانا نہیں کھاتے۔“

ہم نے محبوب سے سر اڑانے کا وعدہ دوبارہ لینا چاہا۔ اس نے کہ دیا کہ کو تیرے سر کی قسم ہے، گویا عاشق کو غصے میں ڈال دیا، کیونکہ سر کی قسم کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے، تیرا سر ضرور اڑا دیں گے اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے : ہرگز نہ اڑائیں گے۔ اور لطف یہ ہے کہ ”تیرے سر کی قسم ہے جم کو“ کہا تو نہیں کر کہا۔

۷۔ **لغات :** آہم : بہت زیادہ اہم ہے۔

شرح : ہمارے لیے دل کو خون کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی، لیکن کیا کرتے، مجبور ہو گئے۔ آنکھیں بالکل بے رونق ہو رہی تھیں۔ دل خون ہو کر ان میں نہ پہنچتا تو بے رونق دور نہ ہو سکتی اور آنکھوں کی بے رونق کا ہمیں ہمد پاس دل کا لہذا دل کو لہو میں تبدیل کر دیا تاکہ وہ بہ کر آنکھوں میں پہنچے اور ان میں غوٹیں آنسوؤں سے تازہ کی و شادابی پیدا ہو۔

۸۔ **شرح :** تمہاری نزاکت کا یہ حال ہے کہ میں نے مزید و فغاں چھوڑ

کر خاموشی اختیار کر لی۔ اور نزاکت کے باعث تم اس خاموشی کو بھی مزید و نشان قرار دے رہے ہو۔ میری عاجزی اور ناتوانی کی یہ کیفیت ہے کہ تم نے ستم سے ہاتھ کھینچ کر تعادل اختیار کر لیا تو میں اسے بھی اپنے لیے ستم سمجھ رہا ہوں۔

میرزا کا مقصد صرف یہ ہے کہ محبوب کی نزاکت اور بے خبر و ناتوانی کی کیفیت واضح کر دیں۔ اس کی نزاکت کے لیے خاموشی کو مزید و نشان قرار دیا، اور اپنی ناتوانی کے لیے تعادل کو ستم بنا دیا۔

۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ثنات - مقطع : سفر ختم ہونے کا مقام، آخری منزل۔

نجف : عام روایت کے مطابق وہ مقام جہاں حضرت علی کا مدفن ہے۔

طوافِ حرم : خانہ کعبہ کے گرد طواف کرنا، یہاں گھومنا۔

کشش کا کرم : لفظ "کرم" کے کاف کی کشش۔ چونکہ یہ کشش

بہی جرتی ہے اس لیے اسے راستہ قرار دیا۔ اس سفر کا مقصد حصولِ کرم تھا، یعنی لطف و کرم سے فائدہ اٹھانے کی آرزو تھی، لہذا کشش کا کرم کی مناسبت بالکل واضح ہے۔

شرح : ہمارے لکھنؤ آنے کا سبب واضح نہیں ہوتا۔ ایک وجہ یہ بھی

ہو سکتی ہے کہ ہم سیر و تماشا کے لیے آئے، لیکن اس کے ہم چنیداں شائق نہیں

یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ لکھنؤ ہمارے سفر کا مقام اختتام اور ہمارے سلسلہ

شوق کی آخری منزل ہے، کیونکہ ہمارا ارادہ تو یہ ہے، نجف اشرف پہنچیں،

حضرت علی کے مدفن کی زیارت سے مشرف ہوں، پھر کٹر مکرر پہنچ کر خانہ کعبہ

کا طواف کریں اور مزینہ چچ سے فارغ ہو جائیں۔ گویا ہماری آخری منزلیں

تو نجف اور مکہ مکرمہ ہیں۔

اسے غالب ! ایک اُمید ہمیں یہ جارہی ہے اور کرم کے کاف کی کشش

ہمارے لیے راستہ بن گئی ہے۔

یہ غزل میرزا غالب نے اُس زمانے میں کہی تھی، جب وہ پنشن کے لیے

مقتدے کے سلسلے میں ملکات جاتے ہوئے مکھنٹو شہر سے تھے۔ غالباً وہاں کوئی طبری مشاعرہ پڑا، جس کے لیے غزل کہی گئی، اور وہ ایسی زمین میں مرزا خود کوئی غزل لکھنے کے لیے تیار نہ ہوتے۔

میرزا کے خاندان کے لیے ابتدا میں دس ہزار روپے پنشن مقرر ہوئی تھی، لیکن نواب احمد بخش ناس والی فیروز پور جھڑک نے پہلے یہ رقم نصف کرائی، پھر اس میں دو ہزار روپے کا حصہ دار ایک ایسے شخص (مرزا حاجی) کو بنا دیا، جو مرزا کے خاندان میں شامل نہ تھا۔ گویا پنشن دس ہزار کے بجائے تین ہزار رہ گئی۔ میرزا غالب اس بے ملکات گئے تھے کہ دس ہزار کی ابتدائی پنشن سماں کرائش اور جتنی رقم بقایا رہ گئی، وہ یکبشت وصول کریں۔ اسی امید کا ذکر انہوں نے مطلع میں کیا ہے۔ مقتدے میں کئی سال صرف ہو گئے، نتیجہ میرزا کے غم و غلہ۔

مقطع کا پہلا مصرع ابتدا میں یوں تھا:

لائی ہے معتد الدولہ باد۔ کی امید

معتد الدولہ آغا تیر اس زمانے میں الدولہ کے نائب اسطنت یعنی وزیر اعظم تھے، لیکن ان سے ملاقات کی مناسب صورت پیدا نہ ہوئی اور میرزا نے مصرع بدل دیا

۱۔ شرح : شعر سے

واضح ہے کہ اس میں ایک حصہ

مقتد ہے، یعنی محبوب سے

بہت کہا کہ رقیب سے میل

جول دکھو اور ہمیں تجھ میں عشق و شوق

لیکن محبوب نے عاشق کی باتوں کو

کا خیال نہ کیا اور رقیب کے ساتھ سلسلہ

روابط بدستور قائم رکھا۔ اس

کے برعکس خود عاشق سے روابط

تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو

مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

بچتے نہیں مؤانذہ روزِ حشر سے

قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

کیا وہ بھی بیگنہ کش و حق ناشناس ہیں؟
 مانا کہ تم بشر نہیں، خور شید و ماہ ہو
 ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار
 مڑتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
 جب میکہ چھٹا، تو پھر اب کیا جگہ کی قید
 مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو
 سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف، سب درست
 لیکن خدا کرے، وہ تری جلوہ گاہ ہو
 غالب بھی گرنے ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
 دنیا ہو یا رب! اور مرا بادشاہ ہو

منقطع کر لیا۔ اب
 عاشق بے بس سا ہو
 گیا تو پریشان ہو کر
 کہتا ہے کہ اگر تم
 رقیب سے رسم و راہ
 قائم رکھنے پر تے
 بیٹھے ہو اور کسی طرح
 رک نہیں سکتے تو بڑا
 تم جانو اور رقیب
 جانے۔ میں رشک
 کی سمیت جھیل رنگا
 لیکن مجھ سے بھی تعلق
 قائم رکھو تو کون سا
 گناہ ہو جائے گا۔
 جب میں نے اقرار

کر لیا کہ رقیب سے تمہارے تعلق پر اعتراض نہ کروں گا تو تمہیں میری پریشانی
 حال میں کیوں شائل ہے۔ کبھی کبھار ہی پوچھ لیا کرو کہ بھئی اکیسے ہوا زندگی کیونکر
 گذرتی ہے؟

۲۔ لغات۔ مواخذہ : جواب دہی۔ پوچھ گچھ۔

شرح : اے محبوب! روزِ حشر کی جواب دہی اور پوچھ گچھ سے تمہارے
 بچے رہنے کی کوئی صورت نہیں۔ بیگم قتل کا ذمہ دار رقیب تھا، لیکن تم اس
 قتل کے گواہ ہو۔ جس طرح جرم کا مرتکب لازماً سزا پائے گا، اسی طرح جرم کا
 گواہ پوچھ گچھ سے بچ نہیں سکتا۔ ضروری ہے کہ اس سے گواہی لی جائے۔

۳۔ شرح : ہم نے مانا کہ تم بشر نہیں ہو، بلکہ سو درج اور چاند ہو لیکن سوال یہ ہے کہ کیا سو درج اور چاند بھی بے گناہوں کو مارتے ہیں اور لوگوں کا حق نہیں پہچانتے ؟

مطلب یہ ہے کہ بے گناہ کو مارنا اور حق نہ پہچانتا محبوب کی خاص صفیتیں ہیں۔ مرد اکہتے ہیں کہ محبوب حسن و جمال کے بل پر سو درج اور چاند ہونے کا مدعی بن گیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا سو درج اور چاند میں بھی وہ صفیتیں موجود ہیں جو محبوب کا خاصہ ہیں ؟

۴۔ شرح : محبوب کے نقاب میں ایک تار ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔ بدگمانی عاشق کا خاصہ ہے۔ اسے فوراً خیال ہوا کہ مبادا یہ کسی کی نگاہ ہو۔ جو عین نقاب پر اگر جم گئی ہے اور اسی غم کے مارے عاشق مر جا رہا ہے۔

۵۔ شرح : خواجہ حاکم فرماتے ہیں :
 - اس شعر میں ازراہ تہذیب اس کام کا ذکر نہیں کیا، جس کے کرنے کے لیے مسجد و مدرسہ و خانقاہ کو مساوی قرار دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میکہ، جہاں حریفوں کے ساتھ شراب پینے کا لطف تھا، جب یہی چھٹ گیا تو اب مسجد مل جانے تو اور مدرسہ و خانقاہ ہاتھ آجائے تو سب جگہ پی یعنی برابر ہے۔ مسجد وغیرہ کی تخصیص ازراہ شوخی کی گئی ہے۔ یعنی یہ مقامات، جو اس شغل کے بالکل لائق نہیں ہیں، وہاں بھی میکہ چھٹنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے اور شراب پینے کی تصریح نہ کرنا عین مقتضائے بلاغت ہے۔“

جو مقام شراب نوشی کا مرکز تھا جہاں پینے کی تمام لذتیں متبائع تھیں، جب وہی ہاتھ سے نکل گیا تو اب کسی خاص جگہ کی قید کیا ہے ؟ جہاں بھی موقع ملے اپنی لینے سے انکار نہیں۔ مسجد، مدرسہ اور خانقاہ تینوں ایسے مقام ہیں

جہاں شراب نوشی ہو ہی نہیں سکتی۔ مقصود یہ ہے کہ جب ہم ان مقامات میں بھی پینے کے لیے تیار ہیں، جو شراب نوشی کے لائق نہیں تو باقی مقامات میں ہمیں کب انکار ہو سکتا ہے ؟

مولانا طہطائیؒ بجا فرماتے ہیں کہ حاصل زمین بھی شرع ہے اور اس کا اطلاق زندگی کے مختلف دائروں میں یکساں ہو سکتا ہے۔ میرزا نے اپنے دل کی جو کیفیت بیان کی ہے، وہ بالکل طبعی اور عام ہے، جب وہ مقام ہاتھ سے نکل جائے، جس میں دل اُلجھا ہوا ہو اور جو مختلف اعتبارات سے انسانی روابط کا مرکز ہو تو ایسی حالت پیدا ہو جاتی ہے کہ انسان کو کسی اچھے یا بُرے مقام کا کوئی خاص لحاظ نہیں رہتا۔ تقسیم کے دور ان میں ہم نے دیکھا کہ جن آبادیوں کو مدیروں کے وطن چھوڑنے پڑے۔ وہ عالم غربت میں جہاں کہیں پہنچے، ٹھہر گئے اور ان کے دلوں میں کسی بھی مقام سے کوئی وابستگی باقی نہیں رہی تھی۔ یہ بھی اسی حقیقت کی دلیل تھی کہ جب میکدہ چھوٹ گیا تو کسی جگہ کی قید کا سوال ہی باقی نہیں رہ سکتا۔

۶۔ - شرح : بہشت کی تائش میں جو کچھ کہا جاتا ہے، اس سے اختلاف کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم مانے لیتے ہیں کہ وہ بالکل درست ہے۔ ہمیں اس کی خوبی میں کوئی کلام نہیں، لیکن ہمارے لیے اصل معیار یہ ہے کہ تیرا جلوہ وہاں نظر آئے، خدا کرے کہ ایسا ہو! اگر یہ جلوہ موجود نہیں، ہم دیدار سے فیض یاب نہیں ہو سکتے تو جو بھی خوبی بیان کی جاتی ہے، ہماری نظروں میں بیچ ہو گی۔ اے محبوب حقیقی ! ہمارے لیے بہشت وہی ہے، جہاں تیرا قرب نصیب ہو تیرا دیدار میسر آئے۔ اگر یہ دولت نہیں مل سکتی تو سب کچھ بیچ ہے۔

میرزا غالب نے جزا و سزا کے باب میں جو کچھ کہا، اس میں دو چیزیں بالخاصہ قابلِ توجہ ہیں۔ اول یہ کہ عبادت میں کسی ایسے عیش و راحت کی کوئی ترغیب نہ ہو، جیسا مادی صورت میں یہاں تیرا سکتا ہے، دوم بہشت سے

مقصود حقیقی باری تعالیٰ کا دیدار ہے۔ اس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ یکسر ناقابلِ توجہ ہے۔

ایک نسخہ - تری جلوہ گاہ - کی جگہ - ترا جلوہ گاہ - بھی ہے۔

۷۔ شرح : اے خدا ! تجھ سے میری دعا ہے کہ دنیا قائم رہے۔

اور میرا بادشاہ یعنی ابو ظفر بہادر شاہ ہمیشہ تختِ حکومت پر جلوہ افروز ہو۔ بہتر تو یہ ہے کہ غائبِ بیبا با کمال بھی ساتھ رہے، لیکن اگر یہ منطوق نہ ہو تو کچھ معافیہ نہیں اس سے کوئی نقصان نہ ہو گا۔ مگر دنیا اور بادشاہ کا ہونا بہر حال ضروری ہے۔

۱۔ شرح :

وہ دن ہی نہ رہے
جب کہا کرتے تھے
کہ محبوب سے گفتگو
ہوگی تو دیکھیے کیا
کچھ کہا جائے! ہمیں
جو کچھ کہنا تھا، کر چکے
عجوب سن چکا اور
کچھ بھی نہ ہوا۔ اب
بتاؤ کہ دوبارہ کہیں
تو کیا ہو، میں دوبارہ
کہنے کا نتیجہ کیا منظر لگا؟

۲۔ شرح :

ہمارے ذہن میں

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا، پھر کہو تو کیونکر ہو،
ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گرنے ہو تو کہاں جائیں؟ ہو تو کیونکر ہو؟
ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے؟
حیا ہے اور یہی گوگو تو کیونکر ہو؟
تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی نحو تو کیونکر ہو؟
اُجھٹتے ہو تم، اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو؟

جسے نصیب ہو اور نہ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو؟
ہمیں پھر ان سے امید اور انہیں ہماری تقلد
ہماری بات ہی پر چسپ نہ دو تو کیونکر ہو؟
غلط نہ تھا، ہمیں خط پر گناہ تسلی کا
نہ مانے دیدہ ویدار جو تو کیونکر ہو؟
بتاؤ اُس مژدہ کو دیکھ کر کہ مجھ کو قرار
یہ نیش ہو رگ جاں میں فرو تو کیونکر ہو؟
مجھے جنوں نہیں، غالب! لے، بر قولِ حضور
”فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو“
طاری کر دکھا ہے۔ اس طرح ہم کشمکش کی بلا میں پھنسے ہوئے ہیں اور کچھ سمجھ
میں نہیں آتا کہ کیا کریں؟ دوسری طرف محبوب کی حالت یہ ہے کہ اس پر بیا طاری
ہے اور وہ گوگوں میں مبتلا ہے۔ اس کو گلو سے نجات کیونکر ہو سکتی ہے؟
۴۔ شرح : اے محبوب! ہم تمہیں سے پوچھتے ہیں کہ اگر تمہیں یمنِ حبیبوں
کی عادت ایسی ہو، جیسی تھاری ہے تو جن لوگوں کا شیوہ صنم پرستی ہے، یعنی
وہ حبیبوں پر جان دیتے ہیں اور انہیں پوچھتے ہیں، ان کا گزارہ کیونکر ہو؟
مطلب یہ ہے کہ بیشک حبیبوں کے لیے عقلی اور عتابِ دنیا ہے، لیکن
اس حد تک کہ عاشق اسے برداشت کر سکیں اور اس طرح گزارہ ہوتا جائے۔ اگر

ایک نگرہ اور ایک سوچ ہے
اسی کو ہم وصال سمجھ رہے
ہیں۔ سوچ یہ ہے کہ اگر وصال
نہ ہو تو کہاں جائیں اور جو تو
اس کی صورت کیونکر بنے؟
ہم رات دن اسی سوچ
میں ڈوبے رہتے ہیں، گویا
اس سوچ سے آگے کوئی قدم
نہیں اٹھا۔ صاف مطلب یہ
ہے کہ وصال نہیں ہوا۔ بس
اس سوچ ہی میں ہم گم ہیں۔
۵۔ شرح :
ہم محبوب کا ادب اور پاس
لحاظ کرتے ہیں۔ اُدھر گنبدِ قدس
اور اربابوں نے دل پر بھڑک
پڑی ہے۔ اس طرح ہم کشمکش کی بلا میں پھنسے ہوئے ہیں اور کچھ سمجھ
میں نہیں آتا کہ کیا کریں؟ دوسری طرف محبوب کی حالت یہ ہے کہ اس پر بیا طاری
ہے اور وہ گوگوں میں مبتلا ہے۔ اس کو گلو سے نجات کیونکر ہو سکتی ہے؟
۴۔ شرح : اے محبوب! ہم تمہیں سے پوچھتے ہیں کہ اگر تمہیں یمنِ حبیبوں
کی عادت ایسی ہو، جیسی تھاری ہے تو جن لوگوں کا شیوہ صنم پرستی ہے، یعنی
وہ حبیبوں پر جان دیتے ہیں اور انہیں پوچھتے ہیں، ان کا گزارہ کیونکر ہو؟
مطلب یہ ہے کہ بیشک حبیبوں کے لیے عقلی اور عتابِ دنیا ہے، لیکن
اس حد تک کہ عاشق اسے برداشت کر سکیں اور اس طرح گزارہ ہوتا جائے۔ اگر

خفگی اور عتاب ہی پر سلوک کا مار ہو تو ہرے کے بچاڑے عاشق زیادہ مرے
نمک گزارہ نہ کر سکیں گے اور ختم ہو جائیں گے۔

۵۔ شرح : خرابہ حالی فرماتے ہیں :

اس کا مطلب ایک تو یہ ہے کہ تم جیسے نازک مزاج شہر میں
ایک دو اور ہوں تو شہر کا کیا حال ہو ؟ دوسرے معنی یہ ہیں کہ
جب تم کو اپنے عکس کا بھی اپنی مانند ہو ناگوارا نہیں تو شہر
میں اگر فی الواقع تم جیسے ایک دو حسین موجود ہوں تو تم کیا قیامت
برپا کرو گے ؟

محبوب آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر غصے اور جوش میں آجاتا ہے۔ گویا اسے
اپنا عکس دیکھنا بھی ناگوارا نہیں۔ جب حالت یہ ہے تو واقعی شہر میں ایک دو
حسین محبوب جیسے موجود ہوں تو خدا جانے اس کا غصہ اور عتاب کیا رنگ
لائے ؟

دوسرے معنی بقول حالی یہ ہیں کہ ایک ہی حسین نے قیامت برپا کر رکھی
ہے، اگر ایسے ہی ایک دو اور شہر میں موجود ہوں تو واقعی اہل شہر کا جینا و بھر
ہو جائے۔

۶۔ شرح : جس سیاء نصیب کو ایسا ہی تیرہ و تار یک دن نصیب ہوا
جیسا میرے لیے مقدر ہے، وہ شخص رات کو دن نہ کہے تو کیا کہے ؟
مطلب یہ ہے کہ میرے درد گار کی تاریکی اس درجے پر پہنچی ہوئی ہے کہ
رات اس کے مقابلے میں بہ منزلہ دن کہے۔

بعض اصحاب نے اسے عرفی کے مندرجہ ذیل شعر سے مناجات قرار دیا ہے :

زخروغ آقام نمود خبر کہ بے تو !

چند روز لعب قست کیساں شب و روزم از سیاہی

مجھے سودج کی روشنی کی خبر ہی نہیں ہوتی، کیونکہ اسے محبوب ! تیرے بغیر

میرے دن اور رات تیری دو زلفوں کی طرح یکساں سیاہ ہیں۔
 ظاہر ہے کہ دونوں مصنوع یقیناً سیاہ نصیبی کے ہیں، لیکن دونوں میں
 حقیقتہً کوئی یکساںی نہیں، نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ دوسرا پہلے سے اخوذ ہے عرقی
 کہتا ہے کہ سودج کے روشن ہونے کی مجھے خبر بھی نہیں ہوتی، کیونکہ میرے دن
 اور رات یکساں سیاہ ہیں، جس طرح تیری زلفیں سیاہ ہیں۔ غالب کہتا ہے میرا
 دن اتنا تاریک ہے کہ اس کے مقابلے میں رات، دن معلوم ہوتی ہے۔
 سیاہ نصیبی کے اور بھی بہت سے مصنوع کہے گئے۔ مثلاً میرزا غالب :

نومیدی ماگروش ایام ندارد
 روزے کہ یہ شد سحر و شام ندارد

ہمدی مایوسی میں دن رات کی گردش ناپید ہے۔ جو دن تاریک ہو جائے
 اس کی صبح و شام کیا ہو سکتی ہے ؟ یا
 گشت در تاریکی روزم نہاں
 کو چراغے تا بجو نیم شام را

میری شام دن کی تاریکی میں چھپ گئی۔ چراغ کہاں ہے تاکہ میں اسے
 ٹھونڈوں۔

جو ہر طبعم درخشان است یک
 روزم اندر ابر پنہاں می رود

میری طبیعت کے جو ہر یقیناً درخشان ہیں، لیکن میرا دن تاریک ٹھانڈا
 میں چھپا ہوا گزر رہا ہے۔

۷۔ تشریح : جب محبوب ہمدی بات ہی نہ پوچھے تو ہمیں اس سے
 کیا امید ہو سکتی ہے اور اس کے دل میں ہمارے لیے قد و منزلت کی کون
 سی گنجائش رہ جاتی ہے ؟

۸۔ **شرح :** ہم سمجھتے تھے کہ اسے محبوب ! تمہارا خط آنے سے دل کو تسکین ہو جائے گی ، لیکن دیدار کی مشتاق آنکھیں نہ مٹیں تو کیا کیا جائے وہ تو خط پر مطمئن نہیں ، بلکہ جلوہ دیکھنے کی طلب گار ہیں۔

۹۔ **شرح :** اس شعر میں خاصی تعقید ہے۔ کہتے ہیں کہ محبوب کی مرثیہ کو دیکھ کر قرار کیونکر آ سکتا ہے ؟ یہ تو ڈنک بن کر رگ ہاں میں آ کر باقی ہے اور چہرہ ڈنک بن کر رگ ہاں میں آ جاتے۔ وہ قرار کیونکر آنے دے گی۔
- قرار کا تعلق کیونکر ہو سکتا ہے اور تینیش ہو رگ ہاں میں فرو تو ، بیچ میں جہلہ معترضہ ہے۔

۱۰۔ **شرح :** یہ قول حضور سے واضح ہے کہ مقطع کا دوسرا مصرع البظرف بہ اور شاہ کا ہے جس کی تفسیر مرزا نے کر دی۔

کہتے ہیں کہ اسے غائب ! میں دیوانہ نہیں ، اس لیے بقیہ ہوں کہ محبوب سے بدائی کا عالم ہے اور بہادر شاہ بھانڑا چلے ہیں کہ محبوب کے فراق میں تسکین و تسلی پانے کی کوئی صورت نہیں۔

۱۔ **لغات :**
کسی کو دے کے دل کوئی ، تو اسنج فتاں کیوں ہو؟
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو؟
وہ اپنی خونہ چھوڑیں گے ، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں؟
بک سرن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو؟
کیا غم خوار نے رسوا ، لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی ، وہ میرا رازواں کیوں ہو؟

نوا سنج فتاں :
فریاد کرنے والا۔
شرح :
عشق کا تقاضا
یہ ہے کہ صبر
ضبط کیا جائے۔
ماشق کے لیے
مزید وقتاں

زیبا نہیں۔ جب دل کسی کو دے دیا تو روئے دھوئے اور فریاد و فغاں کرنے کا مطلب کیا ؟ زبان دل کے جذبات کی ترجمان ہے۔ جب دل ہی پہلو میں نہ ہو تو زبان کیوں کھولی جائے ؟

۲۔ لغات : وضع : روش ، دستور ، طوط طریق ، انداز ، یہاں پر معنی خود داری۔

سبک سر : اوجھا ، کم حوصلہ

سرگراں : خفا ، ناراض ، ناخوش۔

شرح : محبوب ناراضی اور خفگی کی عادت نہیں چھوڑ سکتا۔ ہم اپنی وضع یعنی خود داری کیوں ترک کریں ؟ کیا اوجھے اور کم حوصلہ ہو کر ہم ان سے پوچھیں کہ ہم سے ناراض کیوں ہوں ؟

مولانا طہطائی فرماتے ہیں : اس نے وہ بندش پائی کہ نشر میں بھی ایسے برجستہ فقرے نہیں ہو سکتے۔

۳۔ لغات - محبت : مراد ہے ، غمخوار کی محبت ، دل سوزی

اور ہمدردی۔

شرح : غمخوار نے میری تھوڑی سی کیفیت سنی اور اس درجہ مضطرب

ہو گیا کہ سب کے سامنے راز عشق فاش کر دیا۔ اس طرح میں رسوا ہوا۔ میرے عشق کا مجید کھل گیا ، جسے میں انتہائی صبر و ضبط سے چھپانے بیٹھا تھا۔

محبوب کے لیے بھی رسوائی پیدا ہوئی۔ ایسی محبت ، دل سوزی اور غمخواری کو آگ لگ جائے جس شخص میں غم کو ضبط کرنے کا حوصلہ نہیں ، وہ میرا راز دہاں کیوں بنے ؟

شعر کا غور طلب پہلو یہ ہے کہ خود ہر معیبت نہ رہے تھے ، لیکن انتہائی ضبط سے کام لے رہے تھے اور عشق اسی امر کا متقاضی تھا۔ غمخوار سے سرسری بات بھی برداشت نہ ہو سکی اور اس نے رسوائی تک نوبت پہنچا دی۔ گئے آگ

وفا کیسی ہے کہاں کا عشق ہے جب سر پھوڑنا مٹھرا
 تو پھر اے سنگِ دل! تیرا ہی سنگِ آستانِ کیوں ہو؟
 قفس میں مجھ سے رُودادِ چمن کہتے نہ ڈر مہم!
 گری ہے جس پہ کل بجلی، وہ میرا آسٹیاں کیوں ہو؟
 یہ کہہ سکتے ہو؟ ہمِ دل میں نہیں ہیں؟ پر یہ بتلاؤ
 کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو؟
 غلط ہے جذبِ دل کا جھگڑہ دیکھو، جُرمِ کس کا ہے؟
 نہ کھینچو گرمِ اپنے کو، کشاکشِ درمیاں کیوں ہو؟
 یہ فتنہ آدمی کی خانہ دیرانی کو کیا کم ہے؟
 ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو؟
 یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں؟
 عدو کے ہو یہ جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو؟
 کہا تم نے کہ "کیوں ہو غیر کے طے میں رسوائی؟"
 بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کیوں کہ "ہاں، کیوں ہو؟"
 نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب؟
 ترے بے مہر کہنے سے، وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو؟

اس محبت کو "سے آخر شعر تک غم خوار کی مذمت سے واضح ہے کہ دوسری اور ہمدردی کا یہ طریقہ انتہائی ناراضی کا باعث ہوا۔ نہیں چاہتے تھے کہ ایسا ہو، مگر غم خوار کی بے حوصلگی نے کہیں کا نہ رکھا۔

۴۔ شرح : جب ہماری وفا اور ہمارے عشق کی کوئی قدر نہ ہوئی اور صرف سر پھوڑ کر مر جانا ہی باقی رہ گیا۔ تو اسے پتھر جیسے دل داغے ہوئے بتا کہ تیرے ہی دردانہ کے پتھر سے کیوں ٹکرائیں؟ جہاں کہیں موقع ملے گا، یہ بھی کر لیں گے۔

مطلب یہ کہ محبوب کے سنگ آستان سے جو بھی تعلق ہے، اس کی بنیاد تو یہ ہے کہ عاشق کی وفاداری اور پُر غلوص عشق کا پاس و لحاظ کیا جائے۔ جب پاس و لحاظ ہی نہ رہا تو سر پھوڑنا باقی رہ گیا۔ اس کے لیے محبوب کے سنگ آستان کی تخصیص کیوں؟

مولانا طہطاہائی فرماتے ہیں : "یہ شعر رنگ و سنگ میں گوہر شہوار ہے۔" مولانا نے شعر کے اس پہلو پر بھی بحث کی ہے کہ "سنگ دل" کی جگہ "ہونا" کا لفظ بھی آ سکتا تھا، لیکن میرزا نے سنگدل کو اس لیے ترجیح دی کہ یہ سنگ آستان سے قریب تھا اور بے وفا اس لیے نظر انداز کیا کہ وہ لفظ "وفا" سے دُور ہو گیا تھا۔

۵۔ شرح : مولانا طہطاہائی نے بجا فرمایا ہے کہ ان دو مصرعوں میں اس قدر معانی سمائے ہیں، جن کی تفصیل لطف سے خالی نہیں، مثلاً :
۱۔ لفظ "قفص" سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک پرندہ نشین سے جدا ہو کر قید ہو گیا ہے۔ یہ پورا ٹکڑا اصل شعر میں مفرد ہے۔ صرف لفظ "قفص" سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے۔

۲۔ اس پرندے نے باغ میں بھلی گرتے ہوئے دیکھی اور بہ حالت امیری اسے بل بوتی کہ خدا مانے امیرانہیں اجڑ گیا یا بھل گیا۔ کہاں یہ ہے کہ

دوسرے مصرع کا صرف ایک لفظ، یعنی "کل" اس پورے مضمون پر دلالت کر رہا ہے۔

۳۔ ایک اور پرندہ، جو طائر اسیر کا ہم سفر و ہمدم ہے، چبڑے کے سامنے کسی شاخسار پر آ بیٹھا ہے۔ اس مضمون پر صرف لفظ "ہمد" دلالت کر رہا ہے۔

۴۔ طائر اسیر ہمد سے پوچھتا ہے کہ ذرا باغ کی دوداد تو بتاؤ۔ لیکن اس کا آشیانہ جل چکا ہے اور ہمد دوداد سنانے میں مترقو ہو گیا ہے۔
۵۔ طائر اسیر نے ہمد کے تردوسے اندازہ کر لیا کہ اس کے نشین پر آفت آئی، مگر اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ باغ میں سیکڑوں آشیانے ہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ بھلی میرے ہی آشیانے پر گری ہو؟

۶۔ اس طرح اپنے دل کو سمجھا کر ہمد سے کہتا ہے کہ بھائی! تو باغ کی کیفیت بتانے میں کیوں متذبذب ہے۔ جو بھلی کل گری تھی، کیا ضروری ہے کہ وہ میرے ہی آشیانے پر گری ہو؟

۷۔ یہ پوری داستان اس درجہ درد انگیز اور غم ناک انداز میں بیان کی گئی ہے کہ ہر سننے والا تڑپ اٹھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسے شعر کہے نہیں جاتے، اتفاقاً ہوتے ہیں۔

۶۔ **مشرع :** پہلے مصرع میں استغناء انکاری ہے۔ یعنی تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم دل میں موجود نہیں۔ جب حقیقت یہی ہے، یعنی دل میں تھما ہے سو کوئی موجود نہیں تو ہمیں بتاؤ کہ آنکھوں سے کیوں پوشیدہ ہو؟

بظاہر یہ خطاب محبوب حقیقی سے ہے اور تعنا یہ ہے کہ محض دل میں موجود رہنا کافی نہیں، ذرا آنکھوں کو جمال سے بھی شرف بخٹیے۔

۷۔ **مشرع :** تمہارا کسی پر مہربان ہونا اور دوست بننا ایک ایسا فتنہ ہے، جو کسی کا گھر برباد کرنے کے لیے کم نہیں۔ پھر آسمان کو اس سے

دشمنی کرنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے ؟ یعنی اسے محبوب اتھاری دوستی کی حیثیت وہی ہے جو آسمان کی دشمنی کی ہے ۔

اس شعر میں عشق کے لوازم کی تصویر نہایت حمد کی سے کھینچی گئی ہے ۔

۹۔ **شرح :** جب تم نے میرے دشمن یعنی رقیب سے دوستی کا رشتہ جوڑ لیا اور اس کے محبوب بن گئے تو مجھے کیوں آزماتے ہو ؟ میرا استحقاق کیوں لیتے ہو ؟ اگر اسی کا نام آزماتا ہے تو بتاؤ سنا تا کہسے کہتے ہیں ؟ آزماتش کے لیے مزدوری تھا کہ رقیب کے ساتھ محبوب کا کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو ۔ جب فیصلہ ہو چکا تو آزماتش واقعی دل آزادی ہے ، بالکل بے سبب اور بے وجہ ۔

۱۰۔ **شرح :** ہم ہر چند کہتے رہے کہ غیر سے نہ ملو اور سوا ہو جاؤ گے ۔ تم نے کہا : بھلا اس میں رسوائی کی کیا بات ہے ؟ " ہاں صاحب ! ٹھیک کہا سوچ کر کہا ، پھر فرمائیے کہ " ہاں رسوائی کیوں ہو ؟

دوسرے مصرع کا حرف حرف محبوب کے قول پر ایک بھرپور طنز ہے کہ اس سے بہتر طنز کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی ۔ مولا ! طباطبائی بے اختیار دیکھ اٹھے کہ " اس کی بندش سحر کے مرتبے تک پہنچ گئی ہے "۔ یقیناً بھر ہے ۔

۱۱۔ **شرح :** اسے غالب ! کیا اب علموں سے مطلب برآری مقصود ہے ؟ یعنی محبوب کو بے ہرگز کہہ کر مہراں بنا لینا چاہتے ہو ؟ تم لاکھ ایسے طلسمات بھلا وہ تم پر مہراں کیوں ہونے لگا ۔

۱۔ **شرح :** " اب " کے لفظ سے " اب " ایسی جگہ چل کر ، جہاں کوئی نہ ہو
بہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زبان کوئی نہ ہو
نظا ہر ہے کہ شاعر کو دوستوں ، رفیقوں

اور ہم وطنوں سے بے درد دیوار سا اک گھر بنا یا چاہئے
 اتنے آزار پہنچے ہیں کہ وہ ان کی صحبت سے بزار ہو گیا ہے
 کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو پڑیے گریہ تو کوئی نہ ہو تیمار دار
 اس درد پر بزار ہو گیا ہے کہ کسی ایسی
 اور اگر مر جائے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو جگہ ہمارے کا ارادہ کر دیا ہے، جہاں کوئی موجود نہ ہو۔ کسی سے بات ہو سکے، نہ کوئی اس کی بات سمجھ سکے۔

”ہم سخن“ سے واضح ہے کہ کوئی ایسا شخص موجود نہ ہو جس سے بات کی جا سکے۔ ہم ذہاں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی ایسا شخص نظر نہ آئے، جو اس کی بات سمجھ سکے، کیونکہ بات سمجھنے کے لیے ہم دہانی لازم ہے۔ ہم جنہوں کی صحبت سے اتنی بزاری اس امر کی دلیل ہے کہ اسے بدرجہ کمال رنج پہنچے۔

۲۔ شرح : ایک ایسا گھر بنا یا جائے، جس کی نہ کوئی دیوار ہو اور نہ کوئی دروازہ۔ مقام ایسا ہو، جہاں نہ کوئی پڑوسی ہو اور نہ کسی چوکیدار کی ضرورت پیش آئے۔ گویا ساری دنیا سے علیحدگی ہو۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ دیوار نہیں ہوگی تو پڑوسی بننے کا امکان ہی درجہ گاہ کوئی شخص پڑوسی اس صورت میں بن سکتا ہے کہ اس کی جگہ متعین ہو جائے۔ تعین کے لیے دیوار لازم ہے، جب دیوار بنا فی ہی منظور نہیں تو پڑوس خود بخود خارج ہو گیا۔ چوکیدار دروازے پر مقبوض کیا جاتا ہے۔ جب دروازہ ہی نہ ہوگا تو چوکیدار کی کیا ضرورت رہی۔ کمال یہ ہے کہ ”بے درد دیوار گھر“ نہیں کہا ”بے درد دیوار سا اک گھر“ اگر بالکل بے درد دیوار کہہ دیجئے تو گھری نہ بنتا۔ اس لیے مزایا ایسا گھر جو بے درد دیوار معلوم ہو۔

۳۔ لغات - تیمار دار : بیمار کی دیکھ بھال، علاج معالجہ اور خدمت

کرنے والا۔

شرح : اگر مہار پڑ جائیں تو دوا دارو، دیکھ بھال اور خدمت کرنے والا کوئی موجود نہ ہو۔ اگر مہار پڑ جائیں تو نہ کوئی ماتم کرے، نہ کوئی فوسے پڑے اور نہ کوئی سوگ منائے۔

لغات :
شش جہت : از ہر تہا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
 طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ
 چھوٹے میں مشرق مغرب شمال جنوب اور پچھلے مین دنیا۔

شرح : سورج سے ذرہ تک ہر دل ایک آئینہ ہے۔ گویا طوطی کے لیے اس کائنات کی ہر شے آئینے کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں اسے اپنی شکل نظر آ رہی ہے۔

ہیاں بظاہر طوطی سے مراد صاحب علم و عرفان ہے، جس پر حقیقت واضح ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کی کوئی شے ایسی نہیں، جس میں ہر وجود کو اپنی حقیقت اسی طرح نظر نہ آئے۔ جس طرح آئینے میں نظر آتی ہے۔ صاحب علم و عرفان کے لیے پوری کائنات وجود حقیقی کا منظر ہے اور اسے ہر شے میں وہی وجود نظر آتا ہے۔

۱۔ لغات : ہے سبزہ زار ہر در و دیوار عزم کدہ
 عزم خاند، عزم کا گھر، عزم کا مرکز، مراد عاشق کا گھر۔
شرح : جس کی بہار یہ ہو، پھر اُس کی خزاں نہ پوچھ
 ناچار یکسی کی بھی حسرت اٹھائیے
 عزم خانے کی دیواروں اور
 شہواری رہ و سہم ہماراں نہ پوچھ

وردانے پر اتنا سبزہ آگ آیا ہے کہ اسے سبزہ زار کہنا چاہیے۔ جس کی بہار کا یہ عالم ہو، اس کی خزاں کے متعلق کیا کہا جائے ؟

کچھ مکاؤں یا ان مکاؤں میں جو اینٹ گارے یا پتھر گارے سے بنے ہوں، برسات کے موسم میں سبزہ آگ آتا ہے۔ اہل خانہ موجود ہوں تو دیکھ بھال کے سلسلے میں سبزہ بھی الگ کرتے دہتے ہیں۔ لیکن جب گھر میں کوئی موجود نہ ہو تو دیکھ بھال نہیں ہوتی اور سبزہ مزروع پاکر درو دیوار پر چھپا جاتا ہے۔ کھنڈروں میں ایسے نظارے عموماً ملتے ہیں۔ چونکہ سبزے کا آگنا اور ہلدیانا ہمارا کامنظر ہے اس لیے کہا کہ جس ویران اور برباد غمخانے کی بہار ہے کہ ہر طرف سبزہ آگ لگا ہوا ہے، اس کی خزاں کے متعلق کچھ نہ پوچھنا چاہیے۔

۲۔ شرح : راستہ عدد درجہ دشوار ہے اور ساتھی مسافروں نے جو غلم کیے اور ستم توڑے، وہ ناقابل بیان ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ کاش ہم تنہا ہوتے، کوئی ہمارا ساتھی نہ ہوتا۔ راستے کی دشواری تو برداشت کر لیتے، مگر ساتھیوں کے غلم و ستم سے تو محفوظ رہتے۔ اب تنہائی اور بیکسی کی حسرت دل میں بے بیٹھے ہیں۔ ساتھیوں سے الگ ہو نہیں سکتے اور ان کے غلم وجود برداشت کیے بغیر چارہ نہیں۔

۱۔ شرح :

آنکھ اٹھاتے ہی محبوب کے سیکڑوں جلوے سامنے آ جاتے ہیں اس کی ہر جلوہ گری نگاہ شوق پر احسان عام ہے رہیم یا اتنی طاقت کہاں

صد جلوہ رو برو ہے، جو شرکاں اٹھائیے طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے ہے سنگ پر براتِ معاش جنوں عشق یعنی ہنوز منتِ طفلان اٹھائیے

دیوار، بارِ مشیتِ مزدور سے ہے ختم
کہ دیدار کا احسان ، اٹھاتے جائیں ۔

لے خانماں خراب ! نہ احساں اٹھایے
میرزا کا مقصود یہ ہے کہ جس طرف بھی
یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے
آنکھ اٹھے، محبوب
یا پرودہ تبسم پنہاں اٹھائیے
ہی مختلف شکلوں میں

جلوہ گر نظر آتا ہے اور جلوں کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ ہم میں ان کے دیکھنے
کا احسان اٹھانے کی تاب ہی نہیں۔ حقیقتہً وہ محبوب حقیقی کے جلوں کی فراوانی
نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔۔۔ اس کے لیے پیرایہ یہ اختیار کیا کہ ہم میں ان کے
دیکھنے اور احسان دینے اٹھانے کا یارا ہی نہیں۔

۲۔ لغات - ہرابتِ معاش : روزی کا خزان یا حکمِ حصہ

شرح : جنونِ عشق کی روزی کا حکم پتھر پر ہے، یعنی پتھر کھائیے اور
نگہبازی کا تھمنا مشق بنیے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی لڑکوں کا احسان اٹھانا
مزدوری ہے۔

کوئی شخص جنون کا شکار ہو جائے تو لڑکے عموماً اسے پتھر اڑتے ہیں۔ غالب
کہتے ہیں کہ جنونِ عشق کے لیے روزی کا جو خزان صادر ہوا، وہ پتھروں کے لیے
صادر ہوا یا جو حصہ ہماری قسمت میں لکھا گیا، وہ پتھروں کا تھا۔ جس طرح جاگیر میں
زمینیں ملتی ہیں یا نقد روپے کے لیے خزانے کے نام کھٹانے جاری ہوتے ہیں
اس طرح جنونِ عشق کی روزی میں پتھر کھ دے گئے اور پتھر لڑکے اڑتے ہیں۔
گویا اس روزی کا انحصار لڑکوں کا احسان اٹھانے پر ہے۔ وہ پتھر باری تو
جنونِ عشق کی روزی کا سرو سامان ہو۔

۳۔ لغات - خانماں خراب : وہ شخص، جس کا گھر ویران ہو۔
شرح : دیوار کو دیکھیے، یہ مزدور کے بارِ احسان سے ٹھک گئی ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ احسان اٹھانا ٹھیک نہیں۔ اس کا بوجھ دلیوار تک کو جھکا دیتا ہے، انسان کا تو ذکر ہی کیا۔ اسے وہ شخص! جس کا گھر دیران ہے، اس نظر سے عبرت حاصل کر اور ہم سب کے لیے یہی لازم ہے کہ کسی کا احسان نہ اٹھائیں۔ خانہ خراب کا خطاب قابلِ توجہ ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ جس شخص کا گھر دیران ہو چکا ہو، وہ اسے دوبارہ تعمیر کرنے کے لیے مضطرب ہوتا ہے، لہذا اسے بینِ موقع پر عبرت دلار ہے ہیں۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ خانہ دیرانی قبول کر لینی چاہیے، احسان نہ اٹھانا چاہیے۔

۴۔ - شرح : یا ذمیرے دل کے زخمِ رشک کو بدنام نہ کیجیے، یعنی لوگوں سے یہ نہ کہتے پھرے کہ دیکھو، یہ شخص غیروں سے میرے بے تکلف میل جول پر غل رہا ہے اور رشک کے باعث اس کے دل میں گھاؤ پڑ رہا ہے یا غیروں سے پردے میں چھپ چھپ کر مسکرانا اور ناز و انداز کرنا پھوڑ دیکھیں ان سے جو بھی سلوک کرنا چاہتے ہیں، وہ خلوت میں نہیں، بلکہ برسرِ عام کیجیے گویا زخم کے باعث دل پر چر کے اس وقت لگتے ہیں، جب آپ پردے میں غیروں کے ساتھ بیٹھ کر مسکراتے اور ہنستے ہیں۔

۱۔ لغاتِ خرابات:

شراب خانہ۔

قبلہ حاجات : سب

کی ضرورتیں پوری کرنے والا۔

تغذیم کا کلمہ ہے۔ اس کا

حقیقی معنی استعمال تو خدا

کے لیے ہے، لیکن عموماً

واعظ، شیخ اور بزرگ کے

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے

بھوں پاس آنکھ، قبلہ حاجات چاہیے

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی، اک اور شخص پر

آخرِ رسم کی کچھ تو مکافات چاہیے

وہے دادا، اسے فلک، اولِ حرمت پرست کو

ہاں کچھ نہ کچھ تلافی مکافات چاہیے

بیٹھے ہیں مہرِ رخوں کے لیے ہم مصدّی

تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

مے سے غرض نشاط ہے، کس رو سیاہ کو

اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

نشود نما ہے اصل سے، غالب! فروع کو

خاموشی ہی سے نکلتے ہے، جو بات چاہیے

ہے رنگِ لالہ و گل و ٹہریں جدا جدا

ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

سہرا مئے غم پہ چاہیے جھنگام بے خودی

رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانہ صفات

عارف! ہمیشہ مست مے ذات چاہیے

لیے بھی مستقل ہے۔

شرح : شر

میں شراب خانے کو

آنکھ سے اور مسجد کو

یہ اعتبارِ محراب ابرو

یعنی بھوؤں سے تشبیہ

دی گئی ہے۔ شراب

خانہ مسجد کے زیرِ سایہ

یعنی پاس مونا چاہیے

دیکھیے قبلہ عبادت!

آنکھ ابرو کے پاس

ہوتی ہے۔

مولانا طہطائی

فرماتے ہیں کہ قبلہ

عبادت، مسجد کے

ضلع کا لفظ ہے جہاں

محض ضلع بولنے کے

لیے محاورے میں تعارف

کرتے ہیں، وہاں ضلع برا معلوم ہوتا ہے اور محاورہ پورا اترے تو ضلع بولنا

حسن پیدا کرتا ہے۔ یہاں یہ لفظ محاورے کے لحاظ سے آیا ہے۔

۲۔ لغات۔ مکافات : بدلا۔

شرح : اے محبوب! ہم آپ پر عاشق تھے اور آپ نے جی بھر

کر ہم پر ستم توڑے۔ اب اشاء اللہ آپ کو بھی کسی سے عشق ہوگا اور جتنے

ظلم آپ نے کیے تھے، ان کا بدلہ ملنا چاہیے تھا، چنانچہ مل جائے گا۔ جزاء
سیئۃ، سیئۃ مثلاً۔

۳۔ لغات۔ تلافی مافات : جو کچھ گزر چکا، اس کی تلافی
لفضان کا پورا ہونا۔

شرح : اے آسمان ! تو نے میری کوئی بھی آرزو پوری نہ کی۔ ہر
آرزو کا نتیجہ حسرت کی شکل میں نکلا اور میرا دل بے در پے حسرتوں سے بہرے
ہوتا رہا، یہاں تک کہ اس کے حصے میں حسرتوں کے سوا کچھ نہ آیا۔ اب میرے
دل کی حسرت پرستی ہی کی داد دے دے۔ میں پہلے جو دکھ اٹھا چکا ہوں، جو
مصیبتیں برداشت کر چکا ہوں ان کی کچھ نہ کچھ تلافی تو ہو جانی چاہیے۔

مطلب یہ ہے کہ حقیقی آرزو کوئی پوری نہ ہوئی، اب آسمان سے صرف
یہ کہہ میں کہ دل نے جس بہت و اصرار سے حسرتیں برداشت کیں،
اسی کی داد مل جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انسان پر ہر قسم کی رنج و غم
کا ہجوم ہو تو محض اتنی بات بھی بڑی تسکین کا باعث ہوتی ہے کہ کوئی کہہ
دے، واہ ! فلاں شخص نے کس پامردی سے کام لیا۔ میرزا آسمان کی طرف
سے اتنے کلمہ تحمیں کو بھی اپنی برداشت کی ہوئی مصیبتوں کی ایک حد تک
تلافی سمجھتے ہیں۔

۴۔ لغات۔ تقریب : ذریعہ، سبب، باعث، شادی بیاہ،
جلب، موقع، محل، سفارش، ذکر۔

شرح : ہم نے چاند جیسے چہرے والے۔ مجاہدوں کی خاطر مصوری
یکھی ہے۔ آخر ان سے ملاقات کے لیے کوئی نہ کوئی سبب اور وسیلہ تو
ہونا چاہیے۔

مصوری اس لیے سیکھی کہ حسینوں کو ہمیشہ تصویریں کچھ اٹنے کا شوق
ہوتا ہے اور وہ وقتاً فوقتاً انھیں بلاتے رہیں گے اور تصویر کھینچنے کے سلسلے

میں ان کے پاس بیٹھنے اور دیدار سے لذت اندوز ہونے کا موقع ملتا رہے گا۔
شعر میں مقصود کمرے کے اندر سے تصویر لیتا نہیں، بلکہ وہ تصویر مراد
ہے، جس میں صاحب تصویر سامنے بیٹھ کر مقصود سے تصویر اتروانا ہے اور اس
کی تکمیل میں کئی دن صرف ہو جاتے ہیں۔

۵۔ **شرح :** شراب پینے سے کس روسیاء کا مقصد ہے کہ نشاط و شادانی
حاصل ہو؟ ماحشا و کلام۔ میرا مقصد تو صرف اتنا ہے کہ دن رات ایک طرح کی بیخودی
طاری رہے۔

کمال یہ ہے کہ عیش و نشاط کی خاطر شراب پینے کو روسیاء ہی قرار دے دیا۔
بعض اصحاب کہتے ہیں کہ میرزا کا یہ شعر عمر خیام کی مندرجہ ذیل رباعی سے
ماخوذ ہے۔

مے خوردن من ذاذرباے طرب است نے بہر قضا وین و ترک ادب است
خواہم کہ ز بیخودی برآرم نفسے مے خوردن دست بودم زین سب است
یعنی میں جو شراب پیتا ہوں تو اس لیے نہیں کہ خوشی حاصل ہو، اس لیے بھی
نہیں کہ دین پر باد ہو اور ادب کا رشتہ با حق سے چھوٹ جائے۔ صرف یہ چاہتا ہوں
کہ بیخودی کی حالت میں ایک سالن لوں۔ میرے شراب پینے اور مست رہنے کا سبب
یہ ہے۔

بلاشبہ خیام نے دوسرے بعض امور کے علاوہ عیش و طرب کی بھی نفی کی اور
بیخودی کا لفظ بھی استعمال کیا، لیکن مرزا کا پورا مضمون اس سے الگ ہے۔ بعض
نے صرف نشاط کی نفی کی اور عام شراب نوشوں کے سامنے صرف یہی مقصد ہوتا
ہے۔ ایک ہی مصرع میں نہ محض نشاط کی نفی کی، بلکہ یہ مقصد پیش نظر رکھنے کو
روسیاء ہی قرار دے دیا، گویا نفی آخری حد پر پہنچا دی۔ پھر یہ نہیں کہا کہ ایک دو
سالن حالت بیخودی میں لے لوں، بلکہ مزایا، دن رات ایک طرح کی بیخودی چاہیے۔
نشاط کی نفی کے بعد کسی دوسری غرض کی طرف اشارہ تک نہ کیا اور یہ سارا

سامع پر چھوڑ دیا کہ وہ اپنے حالات کی مناسبت سے جو مقصد چاہے، پیش نظر رکھے۔ لیکن میرزا کو صرف دن رات کی ایک خاص، بخودی درکار ہے۔ دن کو بخودی اس لیے مطلوب ہے کہ زندگی میں قدم قدم پر تکلیف دہ حالتیں پیش آرہی ہیں۔ بخودی کی حالت میں ان کا احساس تک نہ ہوگا۔ رات کو اس لیے بخودی درکار ہے کہ دوسرے اور خواب پریشان نہ کریں گے۔

سب سے آخر میں یہ کہ خیام کی رباعی میں وہ کیفیت موجود نہیں، جو اس کی اکثر رباعیات کا خاتمہ ہے، مگر مرزا نے دو مصرعوں میں تمام حقائق یکجا کر دیے۔ اور شعر کو اس درجہ پر کیفیت بنا دیا کہ انسان پڑھے اور وجد و سرخوشی میں گم ہو جائے۔

۶۔ ۹۔ لغات۔ مروع : مروع کی جمع، شائیں۔

نسری : سیوق کا پھول۔

عارف : خدا شناس، صاحب عرفان۔

شرح : اسے غالب ! شاخوں کا بڑھنا اور پھولنا پھلنا جڑ پر موقوف ہے جڑ پھٹی ہوئی ہے اور شاخیں نمایاں ہیں۔ دوسری مثال یہ ہو سکتی ہے کہ ہر بات خاموشی سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی پہلے بات کا تصور ذہن میں آتا ہے، پھر روزوں الفاظ کی شکل میں وہ زبان پر آجاتی ہے۔ پہلی حالت اس کے چھپے ہوئے ہونے کی تھی، دوسری حالت نمود و نمائش کی ہوئی۔ گویا خاموشی اصل ہے، باتیں اس کی مروع ہیں۔

ایک اور مثال یہ ہے۔ دیکھیے، لالے، گلاب اور سیوق کے پھولوں کا رنگ وضع قطع، خوشبو اور ہر چیز مختلف ہے، لیکن ان سب کا پیدا ہونا، ہمارے پر موقوف ہے، جس کا ظاہری وجود کوئی نہیں۔ پھول رنگ لاتے ہیں تو ہم کہتے ہیں، بہار آگئی۔ ہمارا ذہن یہ ہے کہ پھولوں کے رنگوں میں نہ الجھیں، بلکہ بہار کے اثبات پر زور دیں۔ بہار اصل ہے، لالہ و گل و نسری اس کی مروع ہیں۔

انسان کو زندگی میں مختلف حالتوں سے سابقہ پڑتا ہے اور ہر حالت کا

ایک خاص مقتضا ہے، وہ ضرور پورا ہونا چاہیے۔ مثلاً بخودی اورستی کا وقت ہو تو سر شراب کے منگنے کے پاؤں میں نچلے جھٹے پر ہونا چاہیے اور دعا و مناجات کا موقع آجائے تو منہ قبلہ کی طرف کر لینا چاہیے۔ گویا بخودی ایک کیفیت ہے، جس کی اصل شراب کا خم ہے اور مناجات ایک کیفیت ہے، جس کی اصل قبلہ ہے۔ ان تمام بیانات سے یہ فیجور نکلتا ہے کہ صفات باری تعالیٰ کا پیمانہ جس طرح گردش کرتا جائے، یعنی مختلف صفات جس طرح و تما فرما تصور کریں، ان کے تقاضے ضرور پورے کیے جائیں، لیکن خدا شناس اور صاحب عرفان کے لیے لازم ہے کہ صفات کے تقاضے پورے کرنے کے ساتھ ساتھ ذات کو ہرگز نہ بھولے، بلکہ اسی کی شراب سے ہمیشہ مست رہے۔

ان چاروں شعروں میں مرزا نے اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ کائنات کا مبداء ایک ہے۔ زندگی میں اس کے مظاہر سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ ہر نظر جن وجہات کا طلب گار ہے، وہ ضرور پورے کیے جائیں، لیکن مبداء کو ایک لمحے کے لیے بھی بھولنا نہ چاہیے، مقصود حقیقی مبداء ہی ہے۔

مروجہ دیوانوں میں مخلص والا شعر سب سے آخر میں رکھ دیا گیا، حالانکہ اس کا اصل مقام اس قطعے کا آغاز ہے۔

بساطِ عجز میں تھا ایک دل، ایک قطرہ خوں، وہ بھی
سورمٹا ہے، بہ اندازِ چکیدن سرنگوں، وہ بھی
رہے اُس شوخ سے آزر وہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف، تھا ایک اندازِ جنوں، وہ بھی

۱۔ لغات؛
بساطِ عجز؛
عاجزی کی
بساط، عاجزی
کی حیثیت،
سرور سامان؛

خیالِ مرگ کب تسکینِ دلِ آزرده کو بخشے
 مرے دامنِ تنہا میں ہے اک صیدِ زبوں، وہ بھی
 نہ کرتا کاش ! نالہ، مجھ کو کیا معلوم تھا، ہمس
 کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں، وہ بھی
 نہ اتنا بڑا ششِ تیغِ جفا پر نازِ مزاؤ
 مرے دریائے بے تابی میں ہے اک موجِ خوں، وہ بھی
 مے عشرت کی خواہشِ ساقیِ گردوں سے کیا کبھی
 لیے بیٹھا ہے اک، دو، چار، جامِ واژگوں، وہ بھی
 مرے دل میں ہے غالبِ شوقِ وصلِ دشکوۂ ہجران
 خدا وہ دن کرے، جو اس سے میں یہ بھی کہوں، وہ بھی
 گویا ابھی ٹپک پڑے گا۔

مطلب یہ ہے کہ دل کے سوا میرے پاس کوئی سرورِ سامان نہیں اور دل کی کیفیت
 وہ ہے، جس کی تفصیل بتا دی گئی۔ یعنی ایک قطرۂ خون ہے اور وہ بھی ٹپکا، ہی
 چاہتا ہے۔

بعض اصحاب نے اس شعر کو فیضی کے مندرجہ ذیل شعر سے ماخوذ بتایا ہے
 دریاب کہ ماندہ است ذولِ قطرۂ خونے
 آن قطرہ ہم از دستِ تو لبریزِ چکیدن
 یعنی اسے مجرب احباب نے کہ دل میں سے خون کا ایک قطرہ باقی رہ گیا

بھی جنوں عشق ہی کا ایک انداز تھا۔

مطلب یہ کہ محبوب سے آزدہ ہونے کی حقیقت مجال ہی نہیں، لیکن تکلف سے آزدگی کی صورت پیدا کر لی۔ گویا سمجھ لیا کہ ایسا طریقہ اختیار کرینگے تو محبوب کو خیال ہوگا وہ پوچھے گا کہ آزدگی کا سبب کیا ہوا؟ اس طرح قدر و منزلت بڑھ جائے گی، لیکن حتیٰ یہ بناوٹ جو جنوں عشق کے انداز میں اختیار کی گئی۔ جب دیکھا کہ محبوب پر کچھ اثر نہیں ہوا تو تکلف اٹھا دیا، پھر پہلے کی طرح اس سے ربط منقطع پر آمادہ ہو گئے۔

۳۔ لغات - صیدِ زبولوں؛ دہلا اطلاع و ناتواں شکار جسے شکاری پسند نہیں کرتے۔

شرح : جب دل ونجیدہ و غمزہ ہو تو اسے موت کے خیال سے کیا تسلی ہو سکتی ہے؟ اگر ہو بھی تو میری یہ حالت ہے کہ آزد کے حال میں جسٹن شکار میں نے پھانس رکھتے ہیں، ان میں سے ایک دہلا اور مرلی شکار خیال مرگ بھی ہے۔ یعنی مدت سے یہ سمجھ بیٹھا ہوں کہ موت آئے گی اور غمزہ دل کے لیے تسکین کا سامان بہم پہنچے گا۔ لیکن موت آتی ہی نہیں اور یہ مرلی شکار میری تنہا کے دام میں مدت سے الجھا ہوا ہے۔ گویا یہ ایک فضول اور بے فائدہ خیال ہے جو پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔

۴۔ شرح : اسے ہمدام! کاش مجھے معلوم ہوتا کہ فریاد و فغاں نہ کرنی چاہیے۔ میں نے بے خبری میں کی، نتیجہ یہ نکلا کہ اس سے دل کا درد اور بھی بڑھ گیا۔

فریاد و فغاں کی غرض تو یہ تھی کہ دل کا ہنار نکل جائے گا جس درد نے مجھے پریشان کر رکھا ہے، اس میں کمی آجائے گی، مگر اس نے اٹل کر کہا۔ درد میں اضافہ کر دیا۔ اگر پہلے سے مجھے اس نتیجے کی خبر ہوتی تو فریاد و فغاں کیوں کرتا؟

یہ بھی ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ انسان بعض اوقات اپنے مصائب کی تخفیف کے لیے ایسی تدبیر اختیار کرتا ہے، جس سے پریشانی میں کسی قدر تخفیف ہو جائے، لیکن وہ تدبیر مصیبتوں اور پریشانیوں کی شدت میں اضافے کا باعث بن جاتی ہے۔

۵۔ لغات۔ مبرزش : کاٹ۔

شرح : اے محبوب ! تیغ حیفہ کی کاٹ پر ناز کرنے کی کون سی وجہ ہے ؟ میرے دل میں بیتابی کا درد یا لہریں لے رہا ہے۔ اُن لہروں میں سے ایک خونیں لہر آپ کی تیغ حیفہ میں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جن لہروں نے مجھے بیتابی و اضطراب کا تھوڑا مشق بنا رکھا ہے، آپ کی تیغ حیفہ میں سے صرف ایک لہر ہے۔ اس کے علاوہ بھی خدا جانے کتنی لہریں اس دریا میں اضطراب کی تصویر بنی ہوئی ہے ؟

۶۔ لغات۔ واژگول : اٹ۔

شرح : حب جام الٹ دیا جائے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ جتنی شراب غمی، وہ پی جا چکی۔ اب کچھ باقی ہی نہیں، جس کی خاطر جام سے کام لینے کی ضرورت ہو۔

آسمان کے ساقی سے عیش و عشرت کی شراب کی خواہش کا کون سا مقام ہے ؟ اس کے پاس ہے ہی کیا ؟ اک دو چار جام، جو اس کے پاس ہیں۔ انہیں بھی اوندھا کر رکھا ہے۔ گویا جتنی شراب اس کے مینانے میں تھی، وہ ختم ہو چکی۔

اک دو چار کو جمع کیا جائے تو سات بنتے ہیں، یہ اشارہ سات آسمانوں کی طرف بھی ہو سکتا ہے اور سات تیاریوں کی طرف بھی۔

مراویہ ہے کہ اب آسمان کے ساقی سے کسی کو شراب عشرت نہیں مل سکتی، کیونکہ وہ سب کچھ ختم کر کے دکان بڑھانے بیٹھا ہے۔

بعض اصحاب نے کہا ہے کہ غالب کا یہ شعر جاتی کے اس شعر سے
 ماخوذ ہے۔

چرخ را جامِ نگوںِ داںِ کز مے عشرتِ تمیست
 بادہ از جامِ نگوںِ جستنِ نشانِ ابلہیست

آسمان ایک اوندھا پیالہ ہے۔ یہ عشرت کی شراب سے خالی ہے۔ جو
 پیالہ اوندھا ہو، اس سے شراب ڈھونڈنا طاقت کا نشان ہے۔

بلاشبہ دونوں شعروں کی ظاہری وضع سے مصنفوں بتا جلتا معلوم ہوتا
 ہے، لیکن اسے پیش کرنے کا جو انداز غالب نے اختیار کیا، وہ جاتی کے
 ہاں ناپید ہے۔ جاتی نے صرف یہ کہا کہ آسمان خود اٹا پیالہ لیے بیٹھا ہے۔

اٹھے پیالے سے خراب کیونکہ حاصل کی جا سکتی ہے؟ غالب نے یہ مصنفوں
 واعظانہ نہیں، حقیقی شاعرانہ رنگ میں پیش کیا اور کہا، آسمان کے ساتی سے
 مے عشرت نہیں مل سکتی۔ کیونکہ وہ تو خود اک دو چار پیالے اٹائے بیٹھا ہے
 بخود کوٹانی کہتے ہیں کہ غالب کو اپنی بے سرد سمانی پر کڑھنے کڑھتے

یہ خیال گزرا کہ آسمان کے ساتی سے سوال کرنا چاہیے۔ شاید وہ ہمارے جام
 میں بھی کچھ ڈال سکے۔ پھر یکایک خیال آیا کہ وہ تو خود جام اٹائے بیٹھا ہے
 گویا اس کے اپنے پاس ہی کچھ نہیں، وہ دوسرے کو کیا دے سکے گا؟

بقولِ بجنود: "دونوں شعروں میں واقعہ اور بیان واقعہ کا فرق ہے
 ایک پیکر بے جان ہے اور ایک پیکر ذی روح"

۷۔ - شرح: اے غالب! میرے دل میں وصل کا شوق بھی ہے
 اور عداوت کی شکایتیں بھی۔ خدا وہ دن لائے کہ میں اپنے محبوب سے دونوں
 چیزیں کھ سکوں۔ یعنی وصل کا شوق بھی عرض کروں اور ہجر کی جتنی شکایتیں
 ہیں، ان کا بخار بھی نکال لوں۔

۱۰۔ شرح :

محبوبوں کی بزم میں کلام
لبوں سے آزد وہ اور
دکھی ہے۔ گویا لبوں
تک آنا نہیں چاہتا
یہ لوگ اتنے خوش و
طلب ہیں، پاپوسی
کے اتنے مادی ہیں
کہ ہم تک آگئے ہیں
... خوشامد طبی کا طلب
یہ ہے کہ ان کی مجلس میں
کوئی ایسی بات زبان پر

ہے بزمِ بیاں میں سخن آزد وہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم، ایسے خوشامد طلبوں سے
ہے دورِ قدح و جہ پریشانی صہبا
یک بار لگا دوزخِ مے میرے لبوں سے
رندانِ درمیکدہ گستاخ ہیں، زاہدا
زہار نہ ہونا طرف، ان بے ادبوں سے
بیدا و وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر
بہرِ چند مری جان کو تھارِ بطن لبوں سے

لاہی نہیں کہتے، جو سچائی اور راستبازی پر مبنی ہو یا ان کے حسن کی تعریف
کریں گے یا معمولی نوازشوں کو اپنی خوش نصیبی قرار دیں گے یا ان کے ظلم و جور
کی مدح و ستائش کریں گے۔ غرض وہی باتیں زبان پر آئیں گی، جو ان کے لیے
خوشی اور ان کی خوشنودی کا باعث ہوں، اس وجہ سے کوئی بات بے تکلف
لبوں تک نہیں آتی۔ اسے کھینچ تان کر ہی لانا پڑتا ہے۔

محبوبوں کے تعلق میں بھی اس شعر کی موزونیت محتاجِ تشریح نہیں، لیکن
کم ظرف اور خود غرض حاکموں کی مجلس کے تعلق میں تو یہ ہر اعتبار سے موزوں و
بر محل ہے۔

۲۔ لغات - دورِ قدح : شراب پینے کا دور، جس میں پیالہ باری
باری ایک ایک میکش کے سامنے آتا ہے۔
صہبا : شراب۔

شرح : یہ جو باری باری ساغر ایک ایک کے سامنے دیا جاتا ہے ، اس سے تو شراب جزو جزو ہو کر بکھر جاتی ہے ۔ چاہیے کہ شراب کا خم میرے لبوں سے لگا دو تاکہ اسے یکدم پی جاؤں اور پیالہ بھر بھر کر باری باری دینے کی ضرورت نہ رہے ۔

۳۔ لغات ۔ طرف ہونا ؛ مقابل ہونا ۔ بحث و فکر اور کرنا ۔
 زہار ؛ ہرگز ۔

شرح : اے زائد ! میخانے کے دروازے پر جو رند ہیں ، وہ بڑے مستاخ اور منہ پھٹ ہیں ۔ ان بے ادبوں سے ہرگز سرگز بحث و فکر اور ذکر نہیں ۔
 ۴۔ شرح : اگرچہ میری جان کو لبوں سے گہرا ربط مضبوط تھا ، یعنی وہ ہر وقت لبوں پر رہتی تھی اور دغا کا پورا حق ادا کرتا چاہتی تھی ، لیکن دغا کے تقاضے اتنے کڑے ، اتنے سخت اور اتنے جاگداز ہوئے کہ اس نے لبوں کا ساتھ چھوڑ دیا اور نکل گئی ۔

مقصود شریعہ معلوم ہوتا ہے کہ دغا کے سلسلے میں عاشق کو جن مصیبتوں اور آفتوں سے سابقہ پڑتا ہے ، ان کا بے پناہ ہونا واضح کیا جائے ۔

۱۔ شرح :

اب محبوب نے یہ طریقہ اختیار کر لیا ہے کہ جب کوئی شخص میرا ذکر ان کے سامنے پھیلا دیتا ہے تو اسے منع نہیں کرتے چپ چاپ سن لیتے

تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا سن لیتے ہیں ، گو ذکر سب را نہیں کرتے غالب ! ترا احوال سنا دیں گے ہم ان کو وہ سن کے بُلا لیں ، یہ اجارا نہیں کرتے ہیں تاکہ مجھے شکایت کی کوئی گنجائش نہ رہے ۔ البتہ خود میرا ذکر کسی نہیں کرتے

اگر کسی کی طرف سے ذکر کے لئے روایت تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ سخت بگاڑ ہو گیا ہے اور عاشق کے لیے شکایت کا موقع پیدا ہوتا۔ اب صورت یہ ہے۔

۱۔ محبوب ذکر پر خفگی کبھی ظاہر نہیں کرتا۔ اگر ایسا ہوتا تو عاشق معذرت کر دیتا۔

۲۔ لغزت بھی ظاہر نہیں کرتا۔ اگر ایسا ہوتا تو شکایت کی گنجائش پیدا ہو جاتی۔

۳۔ اظہارِ ہلال بھی نہیں کرتا کہ عاشق کے لیے منا لینے کا موقع نکل آتا۔

یہ تمام صورتیں ختم کر دیں، البتہ اگر کوئی ذکر پھیلے تو سن لیتا ہے، ذکاوت بے تعلقی ہے، نہ خفگی ہے، نہ حال ہے اور عاشق کے لیے یہ صورتِ حال گولگی ہے۔ نہ وہ اسے توجہ قرار دے سکتا ہے، نہ بے توجہی۔

۲۔ تشریح : اے غالب ! ہم تیرا احوال محبوب کو مزور سنا دیں گے، لیکن وہ سب کچھ سن کر تجھے بلا لے، اس کا ذمہ ہم نہیں لے سکتے۔

مولانا طباطبائی نے لکھا ہے کہ اس شعر کے وجوہِ بلاغت بہت دقیق ہیں۔ بیچ والوں کا کہنا کہ سنا دیں گے ہم ان کو "اس کے معنی عمارے کے دوسے یہ ہیں۔ کہ کسی نہ کسی طرح مناسب موقع دیکھ کر اور محبوب کے مزاج کا اندازہ کر کے باتوں باتوں میں یا ہنسی ہنسی میں تیرا حال گوش گزار کر دیں گے۔ اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ تمام معنی الفاظ کے موقع استعمال سے ظاہر ہیں اور پتا چلتا ہے کہ محبوب بڑا مغرور، نازک مزاج، خود ہیں اور خود کہا ہے۔ مولانا مزاتے میں کہ اگر ان الفاظ کی جگہ کہتے : "کر دیں گے ہم ان سے" تو ان میں سے اکثر معانی فوت ہو جاتے۔ پھر "ابارہ نہیں کرتے" ایسے موقع پر بولا جاتا ہے، جب کوئی شخص اصرار سے کہے، کہ جس طرح بنے، میرا ان کا عاپ کرادو۔ غرض شعر سے عاشق کی بیانی اور اصرار، محبوب کا غرور و ناز و دونوں تصویریں واضح ہو گئیں۔

شرح :

میرے گھر میں کوئی چیز متی ہی کہاں ہے

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا ہے

وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

اے محبوب ! تیرا غم عشق تیرا باد کرتا ہے، میں ایک تعمیر کی حسرت پہلے سے چل آتی تھی، وہ بدستور باقی ہے۔ تعمیر کی حسرت سے مراد ہے کہ تعمیر کا خیال تو ہے، مگر کوئی سامان موجود نہیں، جس سے یہ آرزو پوری کی جاسکے۔ حسرت باقی ہے۔

۱۔ لغات۔

تقریب : یہاں یہ

لفظ قریب، باحدث،

سبب کے معنی میں استعمال

ہوا ہے۔ اصطلاح

منطق میں "تقریب" کا

ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ

بات ایسے طریقے پر کی

جائے جس سے دلیل

یا تجربہ ذہن میں آجائے۔

شرح :

غم دنیا ہم پر اس طرح

سلط ہے کہ اول تو

سراٹھانے کی فرصت

بھی نہیں ملتی۔ اگر کہیں

الٹان سے سر اوپر

غم دنیا سے، گر پائی بھی فرصت سراٹھانے کی

فلک کا دیکھنا، تقریب تیرے یاد آنے کی

کھلے گا کس طرح مضمون مرے کہوتوب کا یارب

قسم کھاتی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

پٹنا پر نیاں میں شعلہ آتش کا آساں ہے

وے مشکل ہے حکمت دل میں سوز غم چھپانے کی

انہیں منظور اپنے زخمیوں کو دیکھ آنا تھا

اٹھے تھے سیرِ گل کو، دیکھنا شوخی بہانے کی

ہماری سادگی تھی اتفاستِ ناز پر مرنا

ترا آنا نہ تھا ظالم، مگر تمہید جانے کی

کد کوپ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی
 اٹھتا ہے اور جو نظر آسمان
 میری طاقت کہ ضامن شقی تہوں کے تازا کھانے کی
 پر پڑتی ہے تو ساتھ ہی
 کہوں کیا خوبی او ضائع ابنائے زماں غائب
 اے محبوب! تو یاد آجاتا
 ہے۔ گویا آسمان پر نظر
 بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بار بار نیکی
 پڑنا تیرے یاد آنے کا
 اس طرح غم کا سامنا ہو جاتا ہے۔

۲۔ لغات - قہم کھانا : جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، اس کے دو
 معنی ہیں۔ ایک یہ کہ محبوب نے فیصلہ کر رکھا ہے، جو کا غذا اس کے پاس پہنچے گا
 اسے جلا دے گا۔ دوسرے یہ کہ وہ ہرگز نہ جلائے گا۔

شرح : فرماتے ہیں، اے اللہ! میرے خط کا معنون محبوب پر
 کیونکر کھلے گا؟ اے کیونکر معلوم ہو گا کہ مجھ پر کیا کچھ گزر رہی ہے؟ اس کا فر
 نے تو فیصلہ کر رکھا ہے کہ جو کا غذا اس کے پاس پہنچے گا، اسے دیکھے اور کھولے
 بغیر ہی جلا دے گا۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ خط کھول کر معنون پڑھ لینے کی تو اس سے کوئی امید
 ہی نہ تھی، البتہ اس نے ہر کا غذا جلا دینے کی قسم کھا رکھی تھی۔ میرا خط جاتا تھا،
 وہ آگ کی نذر ہوتا تھا، اس سے شعلے اٹھتے تھے، یوں میرا سوزِ غم اس پر واضح
 ہو جاتا تھا۔ اب اس ظالم نے خط نہ جلا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ گویا میرے سوزِ غم
 کے اظہار کی جو گنجائش باقی تھی، اس کا دروازہ بھی بند ہو گیا۔ لہذا میں اپنے کتب
 کا معنون کھلنے سے بالکل محروم رہ گیا۔

پہلا مطلب کسی ہمدردی کے بغیر واضح ہے، دوسرے میں کسی قدر پھیر ہے،
 لیکن مرزا غالب کے ہاں معمولی پھیر کی کوئی حیثیت نہیں۔

۳۔ لغات - پرشیاں : ریشم

شرح : معلوم ہے کہ شد ریشم میں لپٹا ہوا نہیں رہ سکتا۔ وہ فوراً بھڑک اٹھتا ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ شد ریشم میں برآسانی پھیلا جاسکتا ہے، لیکن سوئے غم کو دل میں چھپائے رکھنے کی تدبیر بہت مشکل ہے۔

گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ دل ریشم سے بدرجہا زیادہ آتشگیر اور غم عشق کا سوز آگ سے زیادہ سرکش و بے پناہ ہے۔

۴۔ **شرح :** محبوب نے باغ کی سیر کا قصد کیا۔ شاعر کہتا ہے کہ حقیقتاً وہ باغ کی سیر کے لیے نہیں نکلے، بلکہ یہ ایک شوخی آمیز بہانہ ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے خدا کار زخمیوں کو ایک نظر دیکھ آئیں۔ گویا باغ میں پھولوں کے کھلنے کا منظر وہی حیثیت رکھتا ہے، جو محبوب کے تیز نگاہ اور جھنجھڑ کے گھائیوں کا ہے۔ بہانے کی شوخی کا مطلب یہی ہے کہ وہ ان گھائیوں کو دیکھنا سیر باغ کی طرح مزحت و انبساط کا باعث سمجھتے ہیں۔

۵۔ **لغات۔** التفات : توجہ، مہربانی، لطف، کرم

تہید : ابتدا، آغاز، پیش خمیہ۔

شرح : تو آیا، ہم سادگی سے یہ سمجھتے رہے کہ ہم پر خاص توجہ اور لطف و کرم ہوا ہے، مگر اب اس لیے یہ لطف و کرم ایسی خاص چیز تھا، جس پر جان بک نثار کر دینے کے لیے آمادہ تھے۔ لیکن اسے ظالم اتیری حالت یہ کہ ادھر آیا، ادھر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ گویا تیرا آنا التفات اور لطف و کرم کی بنا پر نہ تھا، بلکہ تیرے چلے جانے کی تہید تھا۔

دوسرے مصرع سے اول یہ واضح ہوتا ہے کہ محبوب صرف رواروی آیا اور چل دیا، دوم اس میں خوبی ہے کہ کوئی بھی آتا ہو، وہ بہر حال جانے کی تہید ہوتا ہے۔

۶۔ **لغات۔** لکد کوہ : لات، مارنا، ٹھکراؤ، پامالی، کڑی ضربیں۔

شرح : میری طاقت کسی دماغ میں حسینوں کے تازے تکلف اٹھایا

کرتی تھی، اب حالت یہ ہے کہ زمانے کے حادثات کی ضربیں بھی برداشت نہیں کر سکتی۔

اس شعر سے جہاں اپنے صنعت اور ناتوانی کا اظہار مقصود ہے، وہاں یہ بھی واضح کرنا چاہتے ہیں کہ زمانے کے حادثات کی ضربیں تہوں کے نازاٹھانے کے نکلنے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

۷۔ لغات - اوصناع : وضع کی جمع - طور طریقے - سلوک - برتاؤ دستور -

ابتا : ابن کی جمع : بنائے ذہن سے مراد ہے۔ دنیا والے، عام لوگ۔
 شرح : اس درد کے لوگوں نے جو طور طریقے اختیار کر رکھے ہیں، اے غائب ! میں ان کے بارے میں کیا کہوں؟ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جس فرد سے ہم نے ایک مرتبہ نہیں، بار بار نیک برتاؤ کیا، اسے جب موقع ملا، ہمارے ساتھ برائی ہی کی۔

۱۔ لغات : حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ، اے آرزو خرامی
 حاصل : پیداوار
 دل جوش گریہ میں ہے، ڈوبی ہوئی اسامی
 محصول - فائدہ - نفع۔
 آرزو خرامی : اس شمع کی طرح سے، جس کو کوئی بھجوا دے
 خرام بہ حسب آرزو میں بھی جلے ہوؤں میں، ہوں داغ ناتمامی
 یعنی اپنی آرزو کے مطابق چلنا۔

شرح : اے آرزو کے مطابق نفع حاصل کرنے کی امید رکھنے والے! تو پیداوار سے ناامید ہو جا، کیونکہ رونے دھونے کے جوش میں دل کی اسامی ٹڈب چکی ہے۔ یعنی اس کے پاس کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہی، جو ہاتھ آ سکے۔

مطلب یہ ہے کہ خیال تھا، رو دھو کر مدعا حاصل کر لینے کی کوئی صورت نکل آئے گی، لیکن رونے دھونے نے دل کی رہی سہی حیثیت بھی ختم کر ڈالی۔

۲۔ **مشریح :** میری مثال اس شمع کی سی ہے جسے جلتے جلتے کسی نے چھونک مار کر بجھا دیا ہو اور سرا پا جل جانے کا موقع نہ ملا ہو۔ اس طرح وہ جلے ہوؤں میں تو شمار ہو گئی، ساتھ ہی اس پر ناکامی کا داغ لگ گیا۔ یہی کیفیت میری ہے کہ جلے ہوؤں میں تو شمار ہوتا ہوں، لیکن پورا نہ جل سکا اور ناقص رہ گیا۔

۱۔ لغات :
ستم زدگاں :
ستم زدہ کی جمع :
غم کے مارے ہوئے
بہینہ مور :
چیونٹی کا انڈا۔

مشریح :
ہم لوگ ظلم کے مارے ہوئے ہیں۔ دیکھیے ہماری دنیا کتنی تنگ ہے جس میں چیونٹی کے اتنے تنگ کو آسمان کی حیثیت حاصل ہے۔

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بہینہ مور آسمان ہے
ہے کائنات کو حرکت تیرے فوق سے
پر تو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے
حالانکہ ہے یہ سیلی خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے پر مے کا گمان ہے
کی اُس نے گرم سینہ اہل ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے
کیا خوب ! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چُپ رہو، ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

بظاہر مبالغہ

بیٹھا ہے جو کہ سائیہ دیوارِ یار میں
فرماں رواے کشورِ ہندوستان ہے
ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ دافع، جگر کا نشان ہے
ہے بارے اعتماد و فاداری اس قدر
غالب! ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہ بیان ہے
محبت کا سلسلہ چلا جائے گا، دنیا وسیع ہوتی چلی جائے گی۔ مگر جو لوگ غلوم
اور ستم زدہ ہیں، اخصیں کسی سے محبت اور ہمدردی کی توقع کیا ہو سکتی ہے،
ظلم و ستم کی مزا دانی کے ساتھ ان کی دنیا تنگ ہوتی جاتی ہے، یہاں تک
کہ یہ کہنا بھی بے جا نہیں، ان کی دنیا کا آسمان چیونٹی کے انڈے کی حیثیت
رکھتا ہے۔

۲۔ شرح : بجنوری مرحوم اس شعر کی شرح میں فرماتے ہیں :

۔ مادہ خود بجان اور حامد ہے۔ جو چیز مادے کو تحریک و جنبش
میں لاتی ہے وہ حرکت ہے، مگر حرکت خود اپنی ذات سے
آفرینش کی قدرت نہیں رکھتی، جب تک کہ معین نہ ہو۔ اگر
حرکت میں قاعدہ نہ ہوتا، دنیا عالمِ فساد سے عالم کون میں نہ
آسکتی۔ پس علت العلل وہ ذات یا طاقت ہے، جو حرکت
کے پس پشت حرکت کو قعین دیتی ہے۔

کائنات میں جو حرکت نظر آتی ہے، اسے مالکِ کل ادھیرے ذوقِ شوق
کی وجہ سے ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ذرہ خود کوئی حیثیت نہیں رکھتا،

لیکن دنیا بھر کو تاپان و درخشاں بنا دینے والا آفتاب فذبے پر جلوہ انگلن ہوتا ہے تو اس میں جان پڑ جاتی ہے ۔

یہ حقیقی منظر کی تصویر ہے ۔ آپ اسے دیکھنا چاہیں تو کسی روزن میں سے سورج کی کرنیں گزرنے کا سماں دیکھ لیں ۔ اس میں اُن گنت ذرّے حرکت کرتے ہوئے نظر آئیں گے ۔ گویا آفتاب کی روشنی نے کروز کے ذریعے سے ان میں جان ڈال دی ۔ یہی کیفیت کائنات کی ہے ۔ اس میں ہر جنبش ، تڑپ اور اضطراب نظر آتا ہے وہ کائنات کے خالق کے ساتھ ، عشق و محبت کا کرشمہ ہے ۔ معلوم ہوتا ہے ، ہر چھوٹا بڑا وجود عشق میں سرشار اُنسی کی طرح دوڑا چلا جا رہا ہے ۔

میرزا غالب نے یہ مضمون مختلف صورتوں میں بانٹا ہے ، مثلاً :

سہجہ تجلی تری سامانِ وجود

فدہ بے پرو تو خورشید نہیں

طبیعیات کے نقطہ نگاہ سے بھی یہ مضمون بالکل مطابق حقیقت ہے آفتاب کے پرتو یعنی حرارت کے باعث ہوا گرم ہو کر پھیلی ہے اور پھینے کے باعث بجلی ہو کر اوپر چڑھتی ہے ۔ دوسری جگہ سے ہوا اوڑ کر اوپر چڑھنے والی ہوا کی جگہ لیتی ہے اس طرح ایک حرکت ایک تسلسل قائم ہو جاتا ہے ۔ اس طرح یہ کتنا بالکل درست ہے کہ آفتاب کے پرتو سے فذوں میں جان پڑ گئی گو یا جہاں جہاں یہ پرتو پڑا پوری فضا میں مسلسل حرکت شروع ہو جاتی ہے اور یہ تعبیر بالکل درست ہے کہ فذوں میں جان پڑ جاتی ہے ۔

۳۔ لغات ۔ ریشی : تھپڑ ، مزب

شرح : حقیقت یہ ہے کہ میرے دل کا شیشہ نگ نمارا کی حزب کھا کر لے گی طرح سرخ ہو گیا ۔ جن لوگوں کو حقیقت کی روشنی نہیں ملی ، وہ سمجھتے ہیں کہ میرے دل کے شیشے میں شراب بھری ہوئی ہے ۔

شاعر کا مقصد یہ ہے کہ حقیقت ناشناس لوگ میری ظاہری حالت دیکھ کر سمجھتے ہیں، گویا میں اہل بیت و دلجوئی سے عیش و عشرت میں مصروف ہوں، حالانکہ دنیا کے آفات و مصائب کی منزلوں سے میرا وجود سراپا خون آلود ہے۔

شاعر نے دونوں صورتوں میں سرخی کو مابہ الاشتراک قرار دیا۔ غافل اسے شراب کی سرخی سمجھتے ہیں، حالانکہ اصلاً یہ سرخی حوادث کی چوٹ کا نتیجہ ہے۔ بعض اصحاب کو یہ دوسرا ہوا کہ پتھر کی حزب شیشے کو چکنا چور کر دیتی ہے، اس میں سرخی پیدا نہیں کرتی، لیکن شعر میں یہ کوئی پیچیدہ معاملہ نہیں۔ شاعر نے شیشے کو دل کا استعارہ ٹھہرایا اور اس کے لیے چوٹ کے آثار کی عمومی حیثیت پیش کر دی۔ یعنی حزب شیشے پر نہ لگی، دل پر لگی اور وہ پتھر کی چوٹ نہ تھی، بلکہ حوادث کی چوٹ تھی، لہذا اس شیشے کا لالہ رنگ ہو جانا تعجب خیز نہیں سمجھا جاتا۔

۴۔ **شرح :** محبوب نے اہل ہوس یعنی رقیب کے سینے میں دلفن افروز ہونا مناسب سمجھا۔ اہل ہوس مکان ٹھنڈا ہو، وہ مجلس آرائی کے لیے کیوں پسند نہ آئے۔

اہل ہوس کے سینے کو ٹھنڈا اس لیے قرار دیا کہ وہ عشق کی حرارت سے نا آشنا ہوتا ہے۔

شعر میں الفاظ کی مناسبت محتاج تشریح نہیں، معنوی اعتبار سے اس کی حیثیت معمول ہے۔

۵۔ **شرح :** خواہجہ عالی فرماتے ہیں :

”ہمارے بھی منہ میں زبان ہے؟ اس میں دو معنی رکھتے ہیں، ایک یہ کہ ہمارے پاس ایسے ثبوت ہیں کہ اگر بولنے پر آئے تو تم کو قائل کر دیں گے اور دوسرے شوق معنی یہ ہیں کہ ہم زبان سے چکھ کر بتا سکتے ہیں کہ غیر نے بوسہ لیا یا نہیں؟“

شعر کے عام انداز سے ظاہر ہے کہ عاشق اور محبوب میں بوسہ رقیب کے

مستحق بحث اور مدد و کد شروع ہو گئی تھی۔ عاشق محبوب پر الزام لگاتا تھا کہ تم نے ضرور رقیب کو بوسہ دیا۔ محبوب الکار کرتا تھا۔ جب جھگڑے نے طول کھینچا تو عاشق نے کہا: "اچھا، ہمارے سامنے مکتے جوتے جوتے ہم ثبوت پیش کر سکتے ہیں یا زبان سے چمک کر بتا سکتے ہیں کہ تم نے رقیب کو بوسہ دیا۔ اس میں بھی لفظی مناسبتیں واضح ہیں۔

۶۔ **شرح :** جو شخص محبوب کی دیوار کے سایے میں جا بیٹھا ہے وہی حیثیت اور وہی شان و عظمت حاصل ہو جاتی ہے، جو ہندوستان جیسے وسیع و عظیم ملک کے فرما نروا کو حاصل ہو۔ ہندوستان سے صرف موجودہ ہندوستان مقصود نہیں، بلکہ وہ ملک مقصود ہے جس میں پاکستان بھی شامل تھا اور جس کی حدیں خیبر سے برائیک اور قراقرم سے اس کی کمری تک پھیلی ہوئی تھیں۔

کشور ہندوستان کا فرما نروا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مرزا کے تصور کے مطابق جو شخص اس وسیع ملک کے تحت کا ملک ہو، نہ کوئی اس کی عظمت کا مقابلہ کر سکتا ہے اور نہ اس کی کوئی آرزو و امانہ تکمیل رہ سکتی ہے۔ یقیناً محبوب کے سایہ و دیوار میں بیٹھنے کا نتیجہ بھی یہی ہو سکتا ہے۔

ایک پہلو یہ بھی نکالا گیا ہے کہ سایے میں اک گود تیرگی ہوتی ہے، ہند کے معنی بھی "سایہ" کے ہیں اور یہ ہے بھی کالے لوگوں کا ملک، لہذا اسے سایے کے ساتھ مناسبت پیدا ہو گئی۔ یہ مناسبت کسی دوسرے ملک کی فرما نروائی میں نہ تھی۔

۷۔ **شرح :** ہمارا جگر سوز عشق سے جلتے جلتے محو ہو گیا اور اس کی جگہ ایک داغ پڑ گیا، جو جگر کی نشان دہی کر رہا ہے، لیکن عموماً کے ہجوم نے میری یہ حالت کر رکھی ہے کہ مہتی کا اعتبار ہی باقی نہیں رہا۔ وہ اعتبار ہی بالکل مٹ گیا۔ بیشک داغ جگر کی نشانی موجود ہے، مگر اپنی نفسیاتی کیفیت کے

پیش نظر کس سے کموں اور کیونکر کموں کر یہ واضح جگر کا قائم مقام ہے ؟ ایسا کتنا ہستی کے اعتبار کی دلیل ہو گا اور میرے دل سے وہ اعتبار بالکل داخل ہو چکا ہے ۔

مولانا طہطائی فرماتے ہیں " یہ مضمون بہت نیا اور خاص مصنف مرحوم کا نتیجہ فکر ہے ۔

۷۔ شرح : اسے غالب ! ہم اس میں خوش ہیں کہ محبوب ہم پر نامہراں ہے ۔ کسی بھی صورت میں لطف و کرم سے نوازنے کے لیے تیار نہیں ، ظلم و ستم ہی میں سرگرم رہتا ہے ۔ اس سے واضح ہو گیا ہے کہ اسے ہماری وفاداری پر پورا بھروسہ ہے اور جانتا ہے کہ کتنی ہی بے رخی اور سختی کا برداشت کیا جائے ۔ یہ عاشق محبت ترک نہیں کرے گا ۔

نامہرانی بے رخی اور کثرت ظلم و ستم کو اپنی وفاداری کے لیے ستاؤں اعتماد بنا تا مرزا غالب ہی کا حصہ ہے ۔

پہلوری تھی

غزل کسی محبوب

کا مرثیہ ہے ۔

خلفت شہوں

سے معلوم ہوتا

ہے کہ اس

میں زیادہ تر

اشعار اس

وقت کی کیفیت

پیش کر رہا ہے

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ' اے اے !

کیا ہو فی ظالم تری غفلت شکاری ' اے اے !

تیرے دل میں گزرتا آشوبِ غم کا حوصلہ

تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ' اے اے !

کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال ؟

دشمنی اپنی تھی میری دوست داری اے اے !

عمر خیر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
 عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے !
 زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوا سے زندگی
 یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے !
 گلِ فشانہا سے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
 خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے !
 شرمِ رسوائی سے ہا چھپنا نفاپ خاک میں
 ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے !
 خاک میں ناموسِ پیمانِ محبتِ دل گئے
 اٹھ گئی دنیا سے راہِ رسمِ یاری ہائے ہائے !
 ہاتھ ہی تیغِ آزما کا کام سے جاتا رہا
 دل پر اک لگنے نہ پایا زخیمِ کاری ہائے ہائے !
 کس طرح کاٹے کوئی شہا سے تارِ برشکال
 ہے نظرِ نحو کردہ اخترِ شماری ہائے ہائے !
 گوشِ معجودِ پیام و چشمِ محسوسِ جمال
 ایک دل، بس بدیہِ نا امید داری ہائے ہائے !

ہیں، حبیبِ محبوب
 پر حالتِ نزع
 ظاری تھی۔
 اشرح
 اسے محبوب !
 آج تجھے نزع
 کی حالت میں
 دیکھ کر میں تڑپ
 رہا ہوں تو تو
 بھی بیتاب
 و بیقرار ہے۔
 وہ دن کدھر
 گئے، حبیب !
 تجھ پر متاعِ خدا
 اور تو تقاضا
 سے کام لیتے
 ہوئے میری
 بات تک نہ
 پہنچتا تھا۔
 ۲۔ لغات
 آشوبِ غم !
 غم کا طوفان
 غم کا ہجوم۔

عشق نے پکڑا نہ تھا، غالب! ابھی وحشت کا رنگ : شرح :
 رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خوارِی، اے اے! اگر تیرے دل
 میں غم کے طوفانِ برداشت کر لینے کی ہمت نہ تھی، تو تو نے کیوں مجھ سے ہمدردی اور غمخواری
 کا شیوہ اختیار کیا تھا؟ بہتر ہوتا کہ مجھ سے نا آشنا اور بے پروا رہتا تاکہ آج میری
 پریشاں حالی پر تجھے پریشان نہ ہوتا پڑتا۔

۳۔ شرح : تجھے کیوں میری غمخواری کا خیال آیا؟ کیوں میرے
 دل کو سہارا دینے کے لیے قدم بڑھایا؟ آہ! مجھ سے دوستی کر کے تو نے
 اپنے ساتھ دشمنی کی۔

۴۔ شرح : بیشک تو نے عمر بھر کے لیے وفاداری کا جھوک لیا،
 لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ عمر کو بھی تو پائنداری اور استواری حاصل نہیں
 یعنی جو عہد وفا باندھا تھا، وہ اس اعتبار سے بھی تو نا استوار ہی رہا۔

۵۔ شرح : اس دنیا کی آکھ و ہوا مجھے ذہیر معلوم ہوتی ہے،
 کیونکہ یہ آب و ہوا تیرے لیے سازگار نہ ہوئی۔ تو نے کوچ کی تیاری کر لی تو
 میں بھی جینے سے بالکل بیزار ہوں۔

۶۔ شرح : پہلے تیری جلوہ افروزی کے وقت عشوہ و ناز کے
 بھول جھڑتے تھے، آج یہ حالت ہے کہ تیری تربت پر پھول اگائے جا
 رہے ہیں۔

۷۔ شرح : تو نے خاک کا پردہ اوڑھ لیا، لیکن عشق کی نیک نائی
 پر حرف نہ آنے دیا اور رسوائی کی سرم گوارا نہ کی۔ اے میرے محبوب!
 تجھ پر محبت کی پردہ داری ختم ہو گئی۔ اس میں تو نے وہ کمال کر دکھایا جو
 دوسرے سے ممکن نہ تھا۔

۸۔ شرح : افسوس عہدِ محبت کی عزت خاک میں مل گئی اور دنیا میں

دوستی کی راہ و رسم باقی نہ رہی۔

۹۔ **شرح :** جس محبوب سے برابر زخم کھاتے رہنے کی آرزو تھی اس کا تیغ آزمایا تھے ہی معطل ہو کر رہ گیا اور ابھی میرے دل پر ایک بھی کاری زخم نہیں لگا تھا۔

اس شعر اور اس سے پہلے شعر میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ ابھی محبت کی ابتدا ہوئی تھی، اسی حالت میں محبوب دنیا سے رخصت ہو گیا، دل کی تمنائیں اور آرزوئیں دل ہی میں رہ گئیں۔

۱۰۔ **لغات :** برشکال : برسات۔

شرح : ہماری نگاہیں تو ہجر کی راتیں تارے گن گن کر کاٹنے کی عادی ہو گئی تھیں۔ برسات کی اندھیری راتیں آگئیں، انہیں کوئی کس طرح کاٹے؟ برسات کی راتیں اس لیے کہا کہ فراقِ محبوب میں مسلسل رونے دھونے کے سوا کچھ کام نہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ برسات کی کالی راتوں میں ابر کے باعث تارے عموماً نظر نہیں آتے اور جو شخص تارے گن گن کر رات کاٹنے کا عادی ہو، اس کی عروسی محتاج بیان نہیں۔

۱۱۔ **شرح :** کانِ محبوب کا پیغام سننے کے لیے ترستے ہیں اور آنکھیں جمال دیکھنے کے لیے تڑپ رہی ہیں۔ پہلو میں ایک دل ہے اور اس پر یابوسی و ناامیدی کا یہ طوفان اُٹا آیا ہے، کوئی کرے تو کیا کرے؟

۱۲۔ **شرح :** اے غالب! میرا عشق ابھی وحشت کے درجے پر نہیں پہنچا تھا۔ یعنی دنیا اور اہل دنیا سے بے پروا ہو کر سوائی اور بدنامی کی طرف سے آنکھیں بند کرتے ہوئے صراگردی اور دشتِ نوردی کی نوبت نہیں پہنچی تھی۔ دل میں ذلت و رسوائی اور خواری و بدنامی کا جو ذوق تھا، وہ دل ہی میں رہ گیا۔

شعر میں عشق اور وحشت کے آثار واضح کر کے دونوں میں جو فرق نمایاں کیا

وہ نام تو تہ کا محتاج ہے۔

۱۔ لغات -
سرگشتگی : سرہنگ
جنون ، دیوانگی ۔

شرح : جنون و
دیوانگی نے یہ حال کر
دیا ہے کہ اب زندگی
سے بالکل نا امید ہو
گئی ۔ آرام و سکون کی
خواہش کو خوشخبری سنا
دو کہ مر جانے کی امید
ہے اور مرتے ، سی
جنون و دیوانگی سے
نجات مل جائے گی ۔
یعنی جو چیز موت کا
سبب ہے ، وہی آخر
تسکین و آرام کا باعث
بن جائے گی ۔

۲۔ شرح :

محبوب مصطفیٰ و بے اختیار دل کی ذرا پروا نہیں کرتا ۔ یعنی وہ اس سے تغافل
برت رہا ہے اور یہی سمجھتا ہے کہ اب تک دل میرے ہی پاس ہے ، حالانکہ
وہ میرے اختیار سے باہر نکل چکا ہے ۔

سرگشتگی میں ، عالم ہستی سے یاس ہے
تسکین کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے
لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے
کیجے بیاں سرورِ تب غم کہاں تک
ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے
ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانہ و نا
بہر چند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے
پنی جس قدر بے شبِ مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے
ہر اک مکان کو ہے کیس سے شرفِ اسدا
مجھوں جو مر گیا ہے تو جنگلِ اُداس ہے

”قیصر ہی پاس ہے“ کے دو معنوم ہیں۔ اول یہ کہ عاشق کے پاس ہے۔ جس کی تشریح اوپر ہو چکی، دوم یہ کہ محبوب ہی کے پاس ہے اور جو چیز اس کے پاس ہے، اس کے تعلق بے خبری اور تغافل کسی تشریح کا محتاج نہیں۔

۳۔ لغات۔ پاس : شکر، شکرگزاری

مشرح : تپ چڑھنے کے وقت بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اسی کیفیت کے پیشِ نظر فرماتے ہیں کہ تپ غم چڑھنے کی لذت و شادمانی کہاں تک بیان کی جائے ؟ میرے جسم کا ایک ایک رونگٹا شکرگزاری کے لیے زبان بنا ہوا ہے۔ یہ اس بہرہ لذت معروضِ بیان میں نہیں آ سکتی۔

۴۔ شرح : محبوب کو حق کے گمنام نے وفاداری سے بے پروا کر دیا ہے، حالانکہ اس کے پاس حق پہچاننے والا دل موجود ہے۔

حق پہچاننے والا دل محبوب کا دل نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو غرورِ حق اسے وفاداری سے برگشتہ نہ کر سکتا۔ یہ عاشق کا دل ہے۔ یعنی اگرچہ عاشق کا حق شناس دل اس کے پاس ہے، جو دنیا کے تقاضوں سے اسے آگاہ کر رہا ہے، لیکن حق کے غرور نے اس میں حق شناسی کا جو سہرا باقی ہی نہیں چھوڑا

۵۔ شرح : چاندنی رات مطلوب ہونے کے باعث ٹھنڈی ہوتی ہے، اس لیے کہتے ہیں کہ چاندنی رات میں جتنی بھی شراب پیئے، پیتا جا، کیونکہ بلغم کی اصلاح شراب ہی سے ہو سکتی ہے۔

۶۔ لغات۔ مکین : رہنے والا۔ سکونت رکھنے والا۔

مشرح : اے استاد ! ہر مکان کی عزت و برتری اور رونق و آبادی اس میں رہنے والے پر موقوف ہے۔ دیکھیے، مجنون جب تک صحرا میں مقیم تھا وہاں رونق اور چہل پہل تھی۔ جب سے وہ مرا ہے، پورے صحرا پر ادا اسی بھلائی ہوئی ہے۔ نہ کہیں کوئی ہنگامہ ہے، نہ کہیں آبادی نظر آتی ہے۔ ایک ستارہ ہے، جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک یکساں طاری ہے۔

۱۔ لغات ۔

اخفاء: چھپانا
پوشیدہ رکھنا ۔

شرح: اگر

خاموشی کا فائدہ یہی

ہے کہ انسان کی دل

کیفیات اور حقیقی حالات

چھپے رہتے ہیں اور

لوگوں پر واضح نہیں

ہوتے تو میں اس بات

پر خوش ہوں کہ یہ فائدہ

مجھے بولنے کے باوجود

حاصل ہے، اکیوں کو جو

باتیں میں کہتا ہوں ان

کا سمجھنا بے حد مشکل

ہے ۔

خاموشی کا مطلب یہ

ہے کہ انسان چپ

رہے اور کوئی بات

زبان پر نہ لائے بلکہ

اگر کوئی شخص باتیں کرتا

ہے اور ان کا سمجھنا ممکن نہیں تو بولنے کے باوجود اسے خاموشی کا حقیقی فائدہ

حاصل ہے ۔ یہی حقیقت مرزا غالب اس شعر کے ذریعے سے واضح کر رہے ہیں

گر خاموشی سے فائدہ اخفاء سے حال ہے

خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

بکس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ

دل فرو جمع و خرچ نہ بابتہا سے لال ہے

کس پردے میں ہے آئینہ پرواز لے خدا

رحمت کہ عذر خواہ لب بے سوال ہے

ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی

اے شوقِ منفعل ! یہ تجھے کیا خیال ہے

مشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان

نابِ زمین ہے نہ کہ نابِ غزال ہے

وحشت پر میری عرصہ آفاق تنگ تھا

دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

ہستی کے مرتضیٰ میں آجائو اسد

عالم تمام حلقہٴ دامِ خیال ہے

ہے اور ان کا سمجھنا ممکن نہیں تو بولنے کے باوجود اسے خاموشی کا حقیقی فائدہ

حاصل ہے ۔ یہی حقیقت مرزا غالب اس شعر کے ذریعے سے واضح کر رہے ہیں

اغلب ہے، یہ اشارہ مرزا کے کلام کی طرف ہو، جسے عام اسلوب بیان کے عادی مشکل سمجھتے تھے اور آسان کہنے کی ذرائعیں کرتے رہتے تھے۔

۲۔ لغات - فروع جمع و خرچ : وہ رجسٹر جس میں آمدنی اور خرچ کا اندراج ہوتا ہے۔

زبانہائے لال : گونگی زبانیں۔

شرح : جو کچھ میرے دل میں ہے، انہوں نے اسے کبھی بیان نہ کر سکا۔ اس باب میں جو حسرت رہ گئی، اس کا بگڑا کس سے کروں؟ دل کی یہ کیفیت ہے کہ وہ گونگی زبانوں کی آندہ خرچ کا رجسٹر بنا ہوا ہے۔ یعنی اس کا پورا اندر غنہ گونگی زبانوں پر مشتمل ہے، جن سے مناسب موقع پر حقیقی کیفیت ظاہر نہ ہو سکی۔

دل کی کیفیات کا اظہار زبان گویا پر موقوف ہے۔ جو زبان گویائی کی صلاحیت سے محروم ہو، وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ مرزا کہتا ہے چاہتے ہیں کہ دل میں جتنی بھی کیفیات تھیں، وہ اس لیے معروض بیان میں نہ آسکیں کہ جو زبانیں طبعی وہ گونگی تھیں، لہذا ان کیفیات کے اظہار کی حسرت باقی رہ گئی اور لطف یہ کہ اس حسرت کا شگوہ بھی کسی سے نہیں کر سکتا۔

۲۔ لغات - آئینہ پرواز : آئینے کو جلا دینے اور روشن کرنے والا۔

مُذَرِّعُ خَوَاه : خود عذر کرنے یا کسی کا عذر قبول کرنے والا، یعنی وہ جو خود عفو خواہ ہو یا دوسرے کو معذور سمجھے۔

شرح : اے خدا! تیری رحمت کس پر دے میں آئینے کو جلا دے رہی ہے؟ وہی اس لب کی عذر خواہ ہے، جسے سوال کا حوصلہ نہیں اور وہ گناہوں کی کثرت کے باعث کچھ کہتا ہوا شرماتا ہے۔

رحمت کے لیے آئینہ پرواز می کا ذکر غالباً اس لیے کیا کہ اسی کی برکت سے

گناہوں کے رنگ ڈائل ہوتے ہیں۔ اب بے سوال اس بنا پر بھی ہو سکتا ہے کہ گناہوں کی مزا دانی کے پیش نظر کچھ کہنے کی حجت نہیں پڑتی، اس بنا پر بھی ہو سکتا ہے کہ نظر صرف اللہ کی رضا پر ہے اور اپنی طرف سے کچھ کہنا رونا کے معانی۔ مولانا طباطبائی نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ جو اب بے سوال ہو گا، اس کا بے نفس ہونا ضروری ہے۔ انسان بولے اور آئینہ منہ کے پاس ہو تو وہ سانس سے کدھر ہو جاتا ہے۔ غالباً اسی لیے رحمت کو آئینہ پرواز قرار دیا۔

۴۔ لغات - منفعل : شرمندہ - ہشیمان -

شرح : شوق اپنی تمام کوششوں کو بے نتیجہ دیکھ کر شرمندہ و ہشیمان ہے اور اسے یہ خیال ہو رہا ہے کہ میں نے جس سے محبت کی وہ دوست نہیں۔ دشمن ہے۔ شاعر شوق کو سمجھا رہا ہے کہ تجھے یہ خیال کیونکہ آیا، خدا نہ کرے کہیں یہ ممکن ہے کہ محبوب ہم سے دشمنی کا طریقہ اختیار کرے۔

اصل مقایہ ہے کہ محبت کے راستے میں مختلف منزلیں آتی ہیں بغیثوں پریشانیوں، مصیبتوں اور نا کامیوں سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔ تھکاوٹ لوگ ایسے مواقع پر محبت ہار بیٹھتے ہیں، لیکن مرزا اپنے شوق کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ محبوب کی طرف سے دشمنی کا خیال بھی نہیں ہو سکتا۔ شوق کی سرگرمی ہر دستور جاری رہتی جا رہی ہے۔

۵۔ لغات - لباس کعبہ : اس سے مراد وہ کپڑا ہے جو حرم

پاک کی دیواروں کو باہر سے ڈھانپے رہتا ہے اور جسے عام اصطلاح میں غلاف کعبہ کہتے ہیں۔ ابتدا میں غلاف کے لیے رنگ کی کوئی تخصیص نہ تھی، اب وقت سے سیاہ رنگ ہی کا غلاف چڑھایا جاتا ہے۔ یہ غالباً عبا سیوں کے عہد میں شروع ہوا، جنہوں نے خانہ کائناتوں کے لیے کالا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اس رنگ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں میلے پن کا اثر نمایاں نہیں ہوتا، نیز

وصوب یا بارش کے باعث اس میں تغیر نہیں آتا۔
نافِ زمین : زمین کا مرکز۔

نافِ غزال : بہرن کی ناف، جہاں ایک خاص قسم کے بہرن میں مکنا پیدا ہوتا ہے۔

مشرع : حرمِ پاک کے لباس کا ٹکٹ جیسا رنگ حضرت علی کے قدم کی برکت ہے، وہ یہ مقدس مقامِ زمین کا مرکز تو یقیناً ہے، لیکن بہرن کی ناف قطعاً نہیں۔

لوگوں نے نافِ زمین پر بحثیں کی ہیں، حالانکہ ان کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ کعبے کو نافِ زمین کہنا حدیث کا معنون ہے۔ اور نافِ زمین سے وسطیٰ زمین مراد ہے، لیکن کعبہ وسطِ زمین نہیں، کیونکہ خطِ استوا سے ہٹا ہوا ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ ایسی حدیثیں بہت کم ہیں، جن کا محفوظ الحاق اور قطعی القدر ہونا ثابت ہو۔ ایک توجہ راہوں نے یہ بھی کی ہے کہ چنی خطوں میں برت اور سردی کی انتہا ہے، وہاں ایسے جانوروں کی ہڈیاں ملتی ہیں، جو گرم ملکوں کے رہنے والے ہیں۔ گویا ایک زمانے میں اتنا سا شمال کا منطقہ بارہ منطقہ عارہ میں تھا۔ اس وقت عرب کا ملک ضرور خطِ استوا پر ہو گا۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، یہ بحث بالکل بے محل ہے۔ حرمِ پاک کو نافِ زمین جغرافیائی اعتبار سے نہیں کہا گیا کہ اس بارے میں خطِ استوا کی بحث ضروری ہوتی۔ یہ متبرک مقام اپنی عظمت و جلال اور تقدس و پاکیزگی کے اعتبار سے زمین کا مرکز اور اس کی ناف ہے، کیونکہ ہدایت و ارشاد کی ہر کرن اسی سے نکل کر اتنا سا عالم میں پھیلتی ہے۔

۶۔ لغات - عرصۂ آفاق - روئے زمین کی وسعت۔

عرقِ النفال : شرمندگی اور ندامت کا پسینا۔

شرح : جب مجھ پر وحشت طاری ہوئی اور میں نے صواگدی شروع

کی تو دنیا وسعت کے باوجود میرے لیے تنگ نظر آئی۔ اس پر اسے ندامت کا پینا شروع ہوا۔ وہی پینا ہے، جس نے نہ نہ کر دیاؤں اور سمندروں کی شکل اختیار کر لی ہے۔

۷۔ **شرح :** یہ دنیا بعض خیالی اور اعتباری حیثیت رکھتی ہے یعنی فکر و خیال کا پیدا کیا ہوا ایک حلقہ ہے، اس کی حقیقت کوئی نہیں۔ اے اسدا! کہیں اس دھوکے میں مبتلا نہ ہو جانا کہ دنیا کا وجود حقیقی ہے اور ہستی کوئی خارجی حیثیت رکھتی ہے۔ اعتباری اور خیالی شے کو حقیقی سمجھ لینا یقیناً عقل و فہم کا فریب ہے، جس سے دور رہنا چاہیے۔

۱۔ **شرح :** میرے
دل میں بے شمار شکوے
موجود ہیں اور ان کی
حیثیت ایسی ہے،
گو یا راکھ کے بچے
انگارے دے ہوئے
میں۔ اے محبوب!

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کر پوچھو
مذکورہ سرے دل سے کہ اس میں آگ نہ بی ہے
ولایہ درد و الم بھی تو مفتنم ہے کہ آخر
نہ گریہ سحری ہے نہ آہ نیم شبی ہے

تم کہہ کر یہ کہ پوچھ رہے ہو کہ آخر تمہیں کیا شکایت ہے؟ خدا کے لیے اس سے قطع نظر کرو۔ اگر تم اس طرح کہہ دیتے رہے تو راکھ کے بچے سے دے ہوئے انگارے نکل پڑیں گے اور آگ بھڑک اٹھے گی۔
راکھ کے بچے دے ہوئے انگاروں سے ضبط کیے ہوئے شکوؤں کی تشبیہ بدیع تشبیہ ہے۔

۲۔ **لغات :** مفتنم : غنیت سمجھا گیا یعنی غنیت۔

شرح : اے دل! تو دیکھ اور غم سے کیوں گھبرا رہا ہے؟ یہ بھی

تو بہر حال ایسی چیز ہے، جو غنیمت سمجھنی چاہیے، کیونکہ آخر صبح کا رونا بھی ختم ہو جائے گا اور آدھی رات کی آہ و فغاں کا ہنگامہ بھی سرور پڑ جائے گا۔

یہ معنوں میں انانے مختلف شعروں میں باندھا ہے، مثلاً :

نغمہ ہائے غم کو بھی اسے دل انغمیت جانے
بے صدا ہو جائے گا یہ سانی ہستی ایک دن

نیز :

ایک ہنگامے پر موقوف ہے گھر کی رونق
نورِ عظم ہی سہی، نغمہ شادی نہ سہی

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا وہ بھی مٹ گیا

ظاہر اکا غز ترے خط کا غلط بردار ہے

جی جملے فوقِ فنا کی ناتما می پر نہ کیوں

ہم نہیں جلتے نفس بہر چند آتش بار ہے

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا

بہر کوئی در ماندگی میں تالے سے ناچار ہے

ہے وہی بد مستی بہر فردہ کا خود عذر خواہ

جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی

زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

۱۔ لغات :

غلط بردار کا غذا

وہ کاغذ جس پر ہے

کوئی لفظ یا حرف

بہ آسانی مٹایا جاسکے

اور اس کا کوئی نشان

باقی در ہے۔ غالباً

یہ اس مسالہ لگے ہوئے

کاغذ کا نام تھا، جیسا

آج کل کا تب کا ہیں

کھینے کے لیے استعمال

کہتے ہیں۔ اس پر

سے بھی حرف چھری

یا چاقو (دکڑکلب قلمی)

آنکھ کی تصویر سہرِ نامہ پہ کھینچی ہے کہ تما
 آسانی شانے جا سکتے ہیں اور کوئی نشہ
 نچھہ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرت دیدار ہے
 باقی نہیں رہتا۔

شرح بخواب
 عالی فرماتے ہیں :

” یہاں از راوِ نظرافت غلط بردار کے یہ معنی لیے ہیں، جس پر سے
 حرف غلط خود بخود وارڈ ہاٹے۔ کتا ہے، خط میں حرف ایک جگہ
 وفا لکھا تھا، سودہ بھی مٹ گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ
 کے خط کا کالذ غلط بردار ہے کہ جو بات پچھے دل سے اس پر
 نہیں نکلی جاتی، وہ خود بخود مٹ جاتی ہے۔“

محبوب نے خط میں حرف وفا لکھا۔ چونکہ وہ محض رسماً لکھ دیا تھا اور خلوص
 پر مبنی نہ تھا، اس لیے کاغذ نے غلط بردار ہونے کے باعث اسے خود بخود
 دیا۔ مراد حرف یہ ہے کہ محبوب کیسے وفا کا ذکر بھی کر دیں تو اسے بے نیا د
 سمجھنا چاہیے، کیونکہ اس طبقے سے وفا کی امید ہو ہی نہیں سکتی۔

۲۔ شرح : سانس پے در پے آگ برسا رہا ہے، لیکن ہم جیسے تھے
 ویسے ہی رہے اور جلے نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال دل کی جلن کا باعث
 ہے، کیونکہ ذوقِ فنا ناقام کا ناقام رہا۔ سانس کی آتشکاری کے باوجود ہمیں جلا
 نہ سکا۔ اس مضمون کا ایک شعر پہلے بھی آچکا ہے :

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
 اسے ناقامیِ نفسِ مشعل بار حیف

مولانا طاعبا بائی نے اس کی سائنٹیفک توجیہ فرمائی ہے، یعنی ہر نفس سینے
 میں جا کر اشتعال پیدا کرتا ہے اور وہی اشتعال باعثِ حیات ہے، مالاں کہ ہر

اشتعال میں جسم کا آئس اور بدن کا ہیر (جو ہیرا ست) فنا ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات صاف نکلی کہ بہ حسب طبیعت وہ مقتنا سے فطرت ہر ذی حیات کو ذوق فنا ہے اور وہی اشتعال جو فنا کرتا ہے، عین حیات ہے، لیکن اس ذوق فنا کی ناقامی پر جی جلتا ہے کہ ایک بار جلا کیوں نہیں دیتا۔ جو لوگ مصنف کی سوانح عمری سے واقف ہیں، انھیں حیرت ہوگی کہ ان کو یہ مسئلہ دورانِ خون کہاں سے معلوم ہوا؟

۲۔ شرح : اگرچہ آگ خاموش ہے اور اسے زبان عطا نہیں ہوئی، لیکن جب بجھانے کے لیے اس پر پانی ڈالا جائے تو اس سے ایک صدائے داویلا اٹھتی ہے۔ اس سے یہ نظریہ پیدا ہوا کہ حالتِ دراندگی میں سب وجود کو نامہ و فغاں کے سوا چارہ نہیں رہتا لفظ ”دراندگی“ خاص توجہ کا محتاج ہے۔ آگ جل رہی ہو اور اس پر پانی ڈال دیا جائے تو وہ چار و ناچار بجھتی ہے، اس لیے دراندگی پر آہ کرتی ہے۔ نظریے کے لیے جو مثال پیدا کی ہے، وہ یقیناً بے مثال ہے۔
بجز درمی فرماتے ہیں :

”کس شاعر نے آج تک آتش کے فرو ہونے کی اس ظاہر اور ادنیٰ کیفیت کو مشاہدہ اور محسوس کیا ہے؟ لفظ ”ہیر کوئی“ میں آگ کے طبعاً مغرور اور سرکش ہونے کا اشارہ نہایت خوبی سے منظر ہے۔“

۴۔ لغات - سرشار : لبریز، لبالب، فراوان۔ بعض اصحاب نے اسے مست و بیخود کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے۔ یہاں بظاہر یہی معنی قابلِ ترجیح معلوم ہوتے ہیں۔

شرح : خواصہ عالی فرماتے ہیں :
”اس شعر میں دعویٰ ایسے طریق پر کیا گیا ہے کہ خود دعویٰ متعزیز نہیں واقع ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذراستِ عالم یعنی ممکنات جو

فی الحقیقت معلوم محض ہیں۔ ان کی بدمستی و غفلت کا عذر
خواہ وہی ہے، جس کے پر تو وجود سے یہ تمام مصیبت و وجود
کادم بھرتے ہیں۔

اس کائنات کی مخلوقات سے بدمستی اور از خود رفتگی میں جو کچھ سرزد
ہو رہا ہے، اس کا الزام ان پر عائد نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ تو صرف اعتدالی
وجود رکھتی ہیں۔ ان کے اندر جان اور حرکت تو اس حقیقی وجود کی وجہ سے
ہے، جس کے جلووں کی فراوانی زمین و آسمان پر چھائی ہوئی ہے اور کوئی
وجود ایسا نہیں، جو اس جلوہ افزوی سے مست و سرشار نہ ہو۔

گویا فترت داری اسی حقیقی وجود کی ہے، ان ذرات یا ممکناتِ عالم کی
کیا فترت داری ہو سکتی ہے، جو صرف اس وجود کے پر تو کی بدولت زندہ ہیں؛

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے

پر تو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

۵۔ شرح : شعر سے بظاہر یہ واضح ہوتا ہے کہ عاشق یعنی مرزا غالب

محبوب سے خفا ہو گئے ہیں۔ محبوب انھیں منار ہا ہے۔ باتوں باتوں میں اس
نے کہ دیا : ”بھئی ! تو تو ہمیں اپنی زندگی قرار دیتا تھا، یعنی یہ کہتا تھا کہ میرے
جینے کا مار تو ہے۔“ یہ غفلت کے عالم میں فرماتے ہیں کہ ایسی بات منہ سے نہ

نکلیے، میرا دل ان دنوں زندگی سے بیزار ہے۔ یعنی جب حقیقی چیز سے
بیزار ہیں تو اس سے بیزار کیوں نہ ہوں گے، جسے مجازاً زندگی کہتے تھے۔

عشق و محبت میں اس قسم کے معاملات بھی پیش آتے رہتے ہیں اور
میں ممکن الوقوع ہیں، لیکن مرزا غالب کے سوا کون ہے، جس نے انھیں
ایسے دلکش انداز میں باندھا ہو ؟

۶۔ شرح : میں نے پتا لکھنے کے مقام پر آنکھ کی تصویر کیلینج دی

ہے تاکہ اے محبوب ! تجھ پر واضح ہو جائے کہ میری حسرت و دیدار کا کیا عالم ہے۔

نکل جائے۔ کو سرتاے سے بھی مناسب ہے اور انگلی سے بھی۔

لغات :
پینس : پنس یا پنڈ
پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
یا پاگل - ایک سواری
جسے کھار اٹھاتے تھے
اور عموماً امراد یا عورتوں کے لیے استعمال ہوتی تھی۔

شرح : محبوب پینس میں سوار ہو کر میرے کوچے سے گزرتا ہے تو اتنی تیزی سے نکل جاتا ہے کہ کھاروں کو کھدھا بننے کا موقع بھی نہیں دیتا، مہادا ایک دولھے کی دیوہو جھٹے اور مرزا غالب گھر سے باہر آ کر اتفاقاً قیدیار کر لیں۔ اس سے محبوب کی انتہائی بے رخی واضح کرنا مقصود ہے۔

لغات :
عفتا : ایک پرندہ
جو مشورہ بے حد ہے
لیکن اس کا وجود
کوئی نہیں۔
شرح : محبوب
کی تمنا ہے اس درجہ
حیرت میں ڈال دیتا
ہے، اگر یا حیرت کی
ایک بستی آباد ہو گئی
ہے۔ میرا وجود اور
مری بستی فتنائے حیرت آباد تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عفتا ہے
خزاں کیا؟ فصل گل کہتے ہیں کسکو؟ کوئی موسم ہو
تو ہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے
وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اسے بدم
اثر فریاد دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے
نہ لائے شوخی اندیشہ تاب رنج تو میدی
کعبہ افسوس ملنا عہد تجھ پر تمنا ہے

میری بہتی اسی بستی کی فضا ہے۔ تھتا کے لیے آہ و فغاں مزوری ہے۔ لیکن حیرت کا تقاضا یہ ہے کہ حرکت اور آواز دونوں چیزوں کی فنی ہو جائے۔ کہتے ہیں کہ جس حد تک نالہ و مزایہ کا تعلق ہے، اسے اس فضا کا عبق سمجھنا چاہیے کہ اس کی سہرت تو ہے، مگر کبھی کسی نے دیکھا نہیں، سراسر معدوم و مہجوم ہے۔ صاف الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ تھتا نے سراپا حیرت بنا رکھا ہے اور فریاد و فغاں کوئی نہیں۔

۲۔ لغات۔ فصل گل : پھول کھلنے کا موسم۔ موسم بہار۔
 شرح : ہمیں معلوم نہیں کہ خزاں کیا ہوتی ہے اور بہار کسے کہتے ہیں۔ کوئی بھی موسم ہر، ہماری کیفیت یہ ہے کہ اپنے حال پر قائم ہیں۔ پتھرے میں بند ہیں اور بال و پر کا ماتم کر رہے ہیں :
 مولانا طہطائی فرماتے ہیں :

۔ اس شعر کی بندش میں یہ حسن ہے کہ چھ جملے دو مصرعوں میں آ گئے اور ادائے معافی میں یہ حسن ہے کہ بیل کی زبانی شکایت بڑی ہے اور شکایت میں الغاب لطف دیتا ہے۔ سنی تحلیل کو الفاظ کثیر میں یہاں مصنف نے ادا کیا ہے اور الغاب کا زیادہ لطف اسی میں ہوتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے جملے بہت سے ہوں، نہ یہ کہ ایک طولانی جملہ ہو، گویا اس میں الفاظ زیادہ تر ہوں، مگر الغاب کا لطف نہیں پیدا ہوتا۔

۳۔ شرح : اے ہم نشین ! اگر محبوب ماضیوں سے وفا کرتے ہیں اور ان پر مہربان ہوتے ہیں تو اسے ایک اتفاقی خوش نصیبی سمجھنا چاہیے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ درد مندوں کی فریاد کا اثر کس نے دیکھا ہے ؟ کون ان کی مہربانی کو آہ و فغاں یا محبت کی تاثیر کا نتیجہ قرار دے سکتا ہے ؟ مقصود یہ ہے کہ ہم تاثیر کچھ نامک نہیں۔

۴۔ لغات۔ کتبِ امنوس ملنا : امنوس کے عالم میں ہاتھ ملنا جب کوئی شخص امنوس اور پشیمانی کے عالم میں ہو تو طبعاً ہاتھ ملنے لگتا ہے۔
 عہدِ تنجدید تمنا : تمنا تازہ کرنے کا عہد۔ جب کوئی عہد تازہ کیا جاتا ہے تو بعیت کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھا جاتا ہے۔ کتبِ امنوس ملنے اور تنجدید تمنا کا عہد کرنے کی مناسبت واضح ہے۔

تشریح : ہمارے اندیشے کی شوخی نا اتمیدی اور مایوسی کا رنج برداشت ذکر کی۔ مایوسی کے عالم میں ہم نے ہاتھ ملنے شروع کر دیے۔ یہ دراصل مایوسی کا اظہار نہیں، بلکہ ہم تمنا تازہ کرنے کا عہد باندھ رہے ہیں۔
 ہاتھ دونوں صورتوں میں مل جاتے ہیں۔ امنوس کی صورت میں بھی اور عہد باندھنے کی صورت میں بھی مرد کی شوخی اندیشہ نے امنوس کی کیفیت کو از سر نو تمنا کرنے کی کیفیت سے تعبیر کر دیا۔

۱۔ لغات۔
 بوو : ہستی۔
 چراغِ کُشتہ :
 بجھا ہوا چراغ۔
 بیمار وفا :
 جو شخص وفا کا بیمار ہو،
 جیسے بیمار محبت۔ جسے

کوئی چیز راہِ وفا سے ہٹا دے، عاشق صادق و مہرباناز۔
 تشریح : اسے ظالم محبوب! میں عشق میں مجھے ہوئے چراغ کی صورت اختیار کر گیا ہوں۔ تو خود سوچ، مجھے ہوئے چراغ کی ہستی ہی کیا ہوتی ہے؟ سچے اہلِ مہرباناز عاشق کی نبض وہی حیثیت رکھتی، جو مجھے ہوئے چراغ سے ٹٹنے

والے دھوئیں کی ہوتی ہے کہ اٹھا اور ختم ہو گیا۔

مولانا طالعائے فرماتے ہیں :

”نبض کو دو چراغ کشتہ سے تشبیہ متحرک یا متحرک ہے اور وہ شبہ میں حرکت ہے یعنی سرد ہونا، کمزور ہونا، بتدیج کمزور ہوتے ہانا وغیرہ جتنے یہ سب صفات نبض کے چراغ کے دھوئیں میں ہیں، وہ سب دم نکلتے وقت نبض بہار میں ہوتے ہیں۔ انسانی یہ ہے کہ متحرک کی تشبیہ میں مصنف کو یہ غلطی ہے۔

اطباء اس وقت کی نبض کو دودی کہتے ہیں، یعنی کیڑے کے ریگنے سے تشبیہ دیتے ہیں کہ عربی میں دود کیڑے کو کہتے ہیں۔ دونوں تشبیہوں کے مقابلے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی تشبیہ اس سے زیادہ تر بدیع ہے۔“

۲۔ شرح : بہر شخص کا مشاہدہ کرشن ہو یا چراغ، ان کے لیے روشن ہونا اور جلنا نقصان کا باعث ہے، کیونکہ جلنے سے شمع پھسل پھسل کر فنا ہوتی جائے گی۔ چراغ کا تیل اور نفتہ دونوں کم ہوں گے۔ لیکن ان کی رونق روشن رہنے اور جلنے ہی سے ہے اگر انہیں جلایا نہ جائے تو بالکل بے رونق رہیں گے گویا روشن نہ ہونا اور بے رونق رہنا شمع و چراغ کے لیے نفع بخش ہے۔ یہی کیفیت ہماری ہے۔ ہم بھی بے رونق قبول کر لیں اور عشق کے پیکر سے نکل جائیں تو اس میں ہمارا نفع ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ہمیں کہیں نہ کہیں دل لگا لینے کی آرزو بے چین رکھتی ہے۔ یہی بے چینی ہمارے لیے نقصان کا باعث ہے۔

عزم انسان میں دل لگا لینے کی جو فطری تڑپ موجود ہے، اس کی حیثیت وہی ہے جو شمع و چراغ کے روشن ہونے کی ہے۔ انسانی زندگی کی رونق

اسی تڑپ سے ہے، جس طرح شمع و چراغ کی رونق ان کی روشنی سے ہے۔
روشنی شمع و چراغ کو رفتہ رفتہ فنا کے گھاٹ اُتار دیتی ہے۔ اسی طرح انسان
کے لیے عشق کی تڑپ پیغام اجل بن جاتی ہے۔

۱۔ لغات۔

نوا پر داز :-
بولنے والا، باتیں
کرنے والا۔
شعلہ آواز :-
آواز کا شعلہ۔ اس
سے مراد وہ پرسوز
آواز ہے، جو دلوں
میں اڑ کر جائے۔

چشمِ خراباں خامشی میں بھی نوا پر داز ہے
سُرمہ تو کسوں کے دود شعلہ آواز ہے
پیکرِ عشاق، سازِ طالعِ ناساز ہے
نالہ گویا گردشِ ستارہ کی آواز ہے
دستِ گاہِ دیدہ و خوباںِ مجنوں دیکھنا
یک بیاباںِ جلوہ گلِ فرشِ پا اُتار ہے

شرح :

حسینوں کی آنکھ خاموشی میں بھی بڑی دل پذیر باتیں کرتی ہے۔ مطلب یہ ہے
کہ اس سے ہر لحظہ ایسے عشوے اور اشارے ہوتے رہتے ہیں، جو دلوں میں
اُتر جاتے ہیں اور عاشقوں کے لیے ان میں باتوں سے بدرجہا زیادہ دلآویزی
ہوتی ہے۔ پھر وہ آنکھوں میں سرمہ لگا لیتے ہیں۔ یہ سرمہ گویا آواز کے شعلے
کا دھواں بن جاتا ہے۔

سرے کی خاموشیت یہ ہے کہ اس کے کھانے سے آواز بیٹھ جاتی ہے،
لیکن حسینوں کی آنکھ کے سرے کو ان کی دلآویز گفتگو کے شعلے کا دھواں
سمیٹنا چاہیے۔

۲۔ لغات۔ طالعِ ناساز :- ناسازگار قسمت۔ بد نصیبی۔

گردش تیارہ : ستارے کی گردش یعنی قسمت کا پٹا۔

شرح : عاشقوں کا وجود ہی تقدیر کی ناسازگاری اور بد نصیبی کا ساز ہے اور جو وہ فریاد و فغاں کرتے ہیں، اسے ستارے کے پٹا کھا جانے کی آواز سمجھنا چاہیے۔

مطلب یہ کہ عاشق بہر حال سیاہ بخت میں اور تقدیر ان کا ساتھ نہیں دیتی، ہمیشہ خلاف رہتی ہے۔ پیکر، ساز، ناساز، نالہ، گردش تیارہ، آواز کی مناسبت محتاج تشریح نہیں۔

مولانا طہطائی فرماتے ہیں کہ عشاق بھی ساز کے ضلع کا لفظ ہے، کیونکہ اہل فانس کی موسیقی میں مقام عشاق ایک راگ کا نام ہے۔

۳۔ لغات۔ دستگاہ : قوت، قدرت، مہارت، طاقت، دسترس۔

یک بیاباں جلوۂ گل : پھولوں کی انتہائی کثرت۔

فرش پا انداز : وہ فرش یا ٹاٹ، جو جوہروں کی گردش و صاف کرنے کے لیے کرے کی بیرونی چوکھٹ سے ملا کر بچھا دیتے ہیں۔

شرح : دیکھیے، مجنوں کی لہو روئے والی آنکھ کی قدرت و دسترس کا کیا عالم ہے ! ننھ کے صحرا میں پھولوں کی کثرت اس پیمانے پر پہنچ گئی ہے کہ پھول ہی فرش پا انداز کا کام دے رہے ہیں۔

دستگاہ، دیدۂ خونبار، یک بیاباں جلوۂ گل، فرش پا انداز کی مناسبت واضح ہے۔

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی
 ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
 اپنی ہستی ہی ہے ہو جو کچھ ہو آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
 عمر بھر چند کہ ہے برقی خرام دل کے خوں کرنیکی فرصت ہی سہی
 ہم کوئی ترک و فاکرتے ہیں نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
 کچھ تلوے اے فلکِ نا انصاف آہ و حرا بد کی رخصت ہی سہی
 ہم بھی تسلیم کی ٹوڑا لیں گے بے نیازی تری عادت ہی سہی
 یار سے چھیڑ چلی جائے اسد گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

۱۔ شرح : محبوب عاشق کے مینا بانہ اظہارِ عشق پر کرتا ہے کہ یہ عشق ہے ؟ یہ تو وحشت و دیوانگی ہے ۔ عاشق جواب دیتا ہے ۔ ” بہتر وحشت و دیوانگی ہی سہی اور میری دیوانگی بہر حال آپ کی شہرت کا باعث ہوگی ۔

۲۔ شرح : یہ مضمون مرزا غالب کا خاص ہے اور ایک سے زیادہ شعروں میں مختلف انداز میں کے ساتھ آچکا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر محبوب التفات کے بجائے دشمنی سے کام لے تو یہ بھی تعلق کی ایک صورت ہے اس لیے محبوب سے انتہا کرتے ہیں کہ آپ ہم سے رشتہ تعلق نہ توڑیں ، اور کچھ نہیں تو دشمنی ہی قائم رکھیں ۔

اس مضمون کے بعض دوسرے اشعار ملاحظہ فرمائیے :

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
 جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

دار سے اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
 کیجئے ہمارے ساتھ، عداوت ہی کیوں نہ ہو
 اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
 اس قدر دشمن اور باپ و فدا ہو جانا

مولانا طہطائی فرماتے ہیں :

” معاملات عاشقانہ میں یہ معنوں بھی مصنف کے حقے کا ہے ۔
 خوب خوب اسے نظم کیا ہے اور جہاں نظم کیا ہے، نئے انداز
 سے باز دعا ہے ۔“

۳۔ شرح : محبوب سے پوچھتے ہیں کہ آپ فرمائیں، میرا موجود ہونا
 آپ پر کیوں گراں گزرتا ہے ؟ اس میں آپ کی کیا رسوائی ہے ؟ اگر مجلس
 میں میرے حاضر ہونے سے آپ کو یہ خیال ہو کہ لوگوں کی انگلیاں میری
 طرف اٹھیں گی اور اس طرح آپ کی بدنامی ہوگی تو میں مجلس سے درگزر
 تنہائی میں بلا لیجیے۔

شعر کی خوبی یہ ہے کہ جس ملاقات کو بدرجہ تنزل قبول کرتے ہیں، وہ
 معاملات عاشقانہ میں آرزو کی آخری منزل ہے۔

۴۔ شرح : اگر غیر کو تجھ سے محبت ہے تو ہوا ہم بھی تو اپنے
 دشمن نہیں۔

شاعر کا مقصود یہ ہے کہ محبوب سے محبت نہ کرنا اپنے سے دشمنی ہے
 لہذا وہ کہتا ہے کہ ہم اپنے دشمن نہیں گویا اگر تو سمجھتا ہے کہ غیر کو تجھ
 سے محبت ہے تو ہماری محبت کا بھی یقین ہونا چاہیے، کیونکہ اگر تجھ سے
 محبت نہ کی جائے، تو وہ اپنے سے دشمنی ہوگی۔

جن اصحاب نے اس شعر کا مطلب سمجھا کہ اگر تجھے غیر کی محبت
 کا یقین ہو گیا ہے تو ہم تجھ سے محبت کر کے اپنے ساتھ دشمنی کیوں کریں۔

انہوں نے مرزا کے اسلوب بیان پر پورا غور نہیں کیا اور دوسرے مصرع کا معنوم بھی ٹھیک ٹھیک ذہن نشین نہیں فرمایا۔ ان کا بیان کردہ معنوم آداب عشق کے اعتبار سے سراسر تازیانا ہے اور مرزا غالب سے ایسا معنوم منسوب ہی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ عشق تھیں، بلکہ ایک عام بازار سی جنس ہے کہ ایک دکان سے نڈلی، دوسری سے لے لی۔

۵۔ شرح : اس دنیا کے تعلق میں انسان کے لیے روش کی دو صورتیں ہیں۔ اول یہ کہ مختلف اشیاء سے کچھ حاصل کیا جائے، دوم یہ کہ ان سے غفلت اور بے پروائی اختیار کر لی جائے۔ مرزا کہتے ہیں کہ انسان کو اپنی ذات کے سوا کسی کا خیال تک دل میں نہ لانا چاہیے۔ اگر آگاہ ہی مقصود ہے، حقیقت منہی منظور ہے تو وہ بھی اپنی ہی ذات سے ہو۔ اگر غفلت و بے پروائی اختیار کرنی ہے تو وہ بھی اپنی ہی ذات سے کرنی چاہیے۔

تصوت کا بہت بڑا مسئلہ ہے، جو مرزا نے ان چند الفاظ میں پیش کر دیا ہے اور الفاظ نہایت موزوں ہیں۔ اپنی ذات سے آگاہی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی حقیقت سے آشنا ہو جائے، سمجھ لے کہ وہ بندہ ہے اور دنیا میں اس کے پیدا کرنے کا ایک خاص مقصد و نصب العین ہے، جو پورا ہونا چاہیے اور یہ نصب العین خالق کا مقرر کیا ہوا ہے۔

وما خلقت الجن والانس اور میں نے جنوں اور انسانوں

الا لیعبدون کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ

وہ میری عبادت کریں۔

عبادت سے مقصود احکام الہی کی پیروی ہے۔ اسی طرح اصل مقصد پورا ہونا ہے۔

ایک روایت مشہور ہے، جسے حدیث بتایا جاتا ہے، اگرچہ انساب صحیح

نہیں یعنی :-

من عرفت نفسه فقد عرف
ربہ
جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس
نے اپنے پروردگار کو پہچان لیا۔

یہ اپنی ذات سے آگاہی ہے۔

غفلت و بے پروائی یہ ہے کہ اپنے آپ کو بالکل بے وجود اور نیست سمجھے۔ اس کا نتیجہ بھی خدا کو وجود حقیقی ماننے کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ گویا اپنی ذات کے متعلق آگاہی اور غفلت دونوں صورتیں اختیار کرنا انسان کو اس منزل پر پہنچا دیتا ہے کہ اس کے نزدیک خدا کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ مولانا طباطبائی کیا خوب فرماتے ہیں:

۔۔ اس شعر کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ حق یہ ہے

کہ مشائخ طریقت جن کا کلام ترجمان حقیقت ہوا کرتا ہے ان کے دیوان بھی آج اس شعر کی نظیر سے خالی ہیں۔

۶۔ لغات - برق خرام : بجلی کی طرح تیز رفتار۔

شرح : ہم نے مانا کہ عمر بجلی کی طرح تیز رفتار ہے یعنی ابدی اور ادھر گئی، چمکی اور ناپید ہو گئی۔ گویا فرصت اتنی کم ہے کہ کوئی خاص کام انجام نہیں دیا جاسکتا۔ چلو اور کچھ نہیں ہو سکتا تو اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر دل ہی کو خون کر لینا چاہیے۔

اکثر لوگ اس وہم میں مبتلا رہتے ہیں کہ عمر کی مہلت بے حد ذلیل ہے، کریں تو کیا کریں۔ مگر انہیں یہ نہیں کہ اگر اس فرصت کو چمک برق بھی تصور کر لیا جائے تو مصائب نہیں، مگر کچھ کرنے سے باز نہ رہنا چاہیے۔ مرنا کے نزدیک سب سے اہم اور ضروری کام یہ ہے کہ دل کو خون کر لیا جائے۔

یقیناً یہی زندگی کا دیباچہ کام ہے۔ دل کے خون کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ وجود حقیقی سے سچا عشق پیدا کیا جائے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں : ”وہمنا سببت یہ کہ برق بھی تو خون رنگ ہے“

۷۔ شرح : ہم نے عشق کیا۔ اگر تکلیفوں اور سختیوں کی فراوانی کے باعث عشق مصیبت بن گیا تو کچھ پروا نہیں، ہم صبر و سکون سے ہر آفت اور ہر مصیبت برداشت کریں گے، لیکن ترک و غا پر کبھی آمادہ نہ ہوں گے۔

۸۔ شرح : اے نالصاف آسمان ! میں یہ نہیں کہتا کہ وہی مجھے دے، جس کی آرزو ہے۔ فریاد و فغاں کی مصلحت ہی دے دے۔

شعر میں جو کیفیت بیان کی گئی ہے، اسے سادہ الفاظ میں پیش کرنا سہل نہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک مصیبت زدہ شخص ایک ایک آرزو اور مراد کے لیے کوششیں کر چکا ہے، مگر ناکامی کے سوا کچھ اس کے ہاتھ نہیں آیا۔ انتہائی یاس و ناامیدی کی حالت میں وہ کہتا ہے کہ اے آسمان ! اگر تو کوئی مراد پوری نہیں کرتا تو اتنی ہی رخصت دے دے کہ میں اپنی حالت پر روپیٹ لیا کروں۔

لفظ : نالصاف سے واضح ہے کہ آسمان نے شاعر کی کوئی بھی مراد برپا کرنے دی اور اتنی بے انصافی کی کہ اسے فریاد و فغاں کا بھی موقع نہ دیا گیا اور وہ بچاؤ کے عالم میں آکر کچھ نہیں مانگتا، صرٹ روئے پٹینے کی اجازت مانگتا ہے۔ یہ آسمان کی نالصافی اور شاعر کی مایوسی و ناامیدی کی انتہا ہے۔ آسمان کے ہاتھوں وہ اتنا تنگ ہے کہ روئے پٹینے کو بھی ایک نعمت سمجھ کر آسمان سے طلب کرتا ہے۔

جس کی بہار یہ ہوا پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

۹۔ شرح : ہم نے مانا کہ بے نیازی تیری عادت ہے۔ تو کسی مسکین کی حالت پر متوجہ نہیں ہوتا اور تیرا عام شیوہ ہی یہ ہے کہ ہر ایک سے بے پروائی اختیار کیے رہے۔ اگر حقیقت یہی ہے تو ہم بھی رفتہ رفتہ تسلیم کی خوشیا کریں گے اور تیری بے نیازی کو برداشت کرنے کے عادی بن جائیں گے۔
”خو ڈالیں گے“ سے واضح ہوتا ہے کہ ابھی طبیعت برداشت کی عادی

نہیں، رفتہ رفتہ اسے قابو میں لا کر عادی بنائیں گے۔

۱۰۔ شرح : میر غلام حسین قدو بلگرامی نے یہ شعر نیز تاسخ کا ایک شعر مرزا غالب کی خدمت میں پیش کر کے پوچھا تھا کہ ”سہی“ اور ”تو سہی“ کا ترجمہ فارسی لغت میں کیا آیا ہے۔ جواب میں مرزا فراتے ہیں :

”اسماء کے واسطے یا لغات کے واسطے یہ بات ہے کہ عربی میں

یہ کہتے ہیں اور فارسی میں یہ اور ہندی میں ہے۔ طرہ گفتار ہندی

کی فارسی یا فارسی کی ہندی کبھی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً چوری کا گڑ

میٹھا۔ اس کی فارسی نہ پوچھیے گا، مگر نادان۔ ”سہی“ اور ”تو سہی“

کی فارسی کیونکر بنے ؟ یہ روزمرہ کی اردو ہے۔

گر ہمیں وصل تو حسرت ہی سہی

اس مطلب کے مطابق فارسی عبارت یوں ہو سکتی ہے : وصل

اگر نصیت، حسرت نیز عالمے دارو۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ اے استاد ! محبوب سے چھوڑ کا سلسلہ بابر قائم

رہنا چاہیے۔ اگر وصل تیسر نہیں آتا تو معافیہ نہیں، وصل کی حسرت کا اظہار

ہی کرتے رہنا چاہیے۔

۱۔ لغات۔ آرمیدگی :

آرام پانا، راحت طلبی۔

نکو ہش : حالت سرزنش

شرح : میں صحرا

گردی اور وحشت نوردی

چھوڑ کر راحت کی غرض سے

ہے آرمیدگی میں نکو ہش بجا مجھے

صبح وطن ہے خندہ دندان نما مجھے

دھونڈے ہے اس مفتی آتش نفس کو جی

جس کی صدا ہو جلوہ برق فنا مجھے

گھر آجیسا تو عجیب ہیں متانہ طے کروں ہوں رو وادی خیال
 سلامت و سرزنش کا منزل تا باز گشت سے نہ رہے مدعا مجھے
 ہوں۔ میرے گھر یعنی کرتا ہے بس کہ باغ میں تو بے حجابیاں
 وطن کی صبح میرے لیے آنے لگی ہے نکست گل سے حیا مجھے
 دغاں نما خندہ بنی ہوئی کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
 ہے تو یہ ہرگز بھانپیں شعروں کے انتخاب نے رُسا کیا مجھے
 بلکہ بالکل بجا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ
 عشق میں راحت و آرام

کا شائبہ بھی کسی کے لیے زیبا نہیں۔ اگر کوئی راحت طلبی پر ہاتھ ہوتا ہوں کی
 ہر چیز اس کے لیے پیغام سلامت بن جائے گی۔
 ۲۔ لغات۔ معنی: بھانے والا۔

آتش نفس : جس کا دم آگ اُگلے، جس کی آواز سوز و گداز سے بھری
 ہوئی ہو۔

شرح : دل ایسے گانے والے کا طلب گار ہے، جس کی آواز سوز و گداز
 سے اس طرح لبریز ہو کہ میرے لیے فنا کی بجلی کا جلوہ بن جائے، یعنی میں ایسے
 سماج کا خواہاں ہوں جو مجھے جلا کر فنا کر دے۔

۳۔ لغات۔ باز گشت : واپسی، مراجعت، لوٹنا۔

شرح : میں خیال کی وادی مستی و بیخودی کے عالم میں طے کرتا ہوں
 تاکہ کونٹے سے مجھ کوئی غرض نہ رہے۔

انسان جو راستہ ہوشمندی کے عالم میں چوکس رہ کر طے کرے اس کے
 نشیب و فراز، موڑوں اور مختلف منزلوں کے خاص نشاں کی یاد دل میں باقی
 رہ جاتی ہے، لیکن جو راستہ بیخودی اور مدحوشی میں طے ہوا اس کے متعلق کچھ

خیال نہیں رہ سکتا۔ مرزا بھی خیال کی دادی اسی انداز میں ملے کرتے ہیں کہ واپس نہ آئیں۔ مطلب یہ کہ ہر وقت خیال میں غرق رہتے ہیں۔

۴۔ شرح : تو نے باغ میں ایسی بے حجابیاں شروع کر دی ہیں کہ مجھے پھولوں کی خوشبو سے شرم آنے لگی ہے۔

شرم کی وجہ یہ کہ میرے نزدیک تو نکستہ گل ہی بے حجاب سخی کہ ذرا ہوا کی لہر اسٹی اور وہ پھول کا پردہ چاک کر کے بے اختیار نکل پڑی، لیکن اسے محبوب! تیری بے حجابیاں اس پیانے پر پہنچ گئی ہیں کہ میں جو پھول کی خوشم کو بے حجابی کے طعنے دیا کرتا تھا اب شرم کے مارے اس کے آگے آگے نہیں اٹھا سکتا۔

۵۔ شرح : میرے دل کی حقیقی کیفیت کسی پر ٹھیک ٹھیک آشکارا

نہیں ہو سکتی تھی۔ مصیبت یہ پیش آئی کہ میں نے اپنے مطلب کے شعر چن چن کر جو مجھ کو تیار کیا، اس نے میرا راز فاش کر دیا۔

شاعر کا مقصود یہ ہے کہ انسان کے دل کی جو حالت ہو، اسی کی مناسبت سے وہ اشعار کا انتخاب کرتا ہے۔ یہی انتخاب دوسروں کے لیے اس کی اصل کیفیت معلوم کر لینے کی کلید بن جاتا ہے۔ اگر اپنے مطلب کے شعر نہ چنے ہوتے تو رسوائی کی نوبت نہ آتی

شرح : جب

ہماری زندگی انتہائی

بری حالت میں

گزری تو ہم کیا یاد

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

کریں گے کہ ہمارا بھی کوئی خدا تھا۔

دوسرا مصرع پورے کا پورا ایک کہادت ہے جو حسن و خوبی سے نظمی کر دی

گئی ہے۔ غلامی میں یہی مضمون یوں بانڈھا ہے :

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت

می توان گفت کہ این بندہ خداوند نداشت

مرزا آفتاب کو ۱۸۔ جولائی ۱۸۵۷ء کے ایک خط میں فرماتے ہیں کہ اپنے

کلمے ہوئے تمام اشعار بھول گیا، صرف ڈیڑھ شعر یاد رہ گیا، ایک مطلق یعنی :

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب !

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

۱۰۔ دس پانچ بار یہ پڑھ لیتا ہوں، پھر جب سخت گھبراتا ہوں تو یہ مصرع

پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں کہ :

اے مرگ ناگماں ! تجھے کیا انتظار ہے ؟

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے

بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

دل ہی تو ہے سیاست درباں سدا گیا

یہیں اور جاؤں در سے تیرے بن صدا کیے

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنئے

وقت ہوئی ہے دعوت آب و ہوا کیے

بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہوگرچہ عمر خضر

حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

۱۰۔ شرح : محبوب کی

بزم میں خیریت اور حیا واری

سے کام لیا جانے تو گزارہ

نہیں ہو سکتا اور بے حیا بنے

بغیر چارہ نہیں۔ چنانچہ میں اس

کی محفل میں گیا، اگرچہ لوگ

اشارے کرتے اور آواز سے

کہتے تھے، لیکن میں ان سے

بے پروا ہو کر بیٹھا رہا۔ پروا

کرنا تو اٹھنا پڑتا اور یہ گوارا

نہیں ہو سکتا تھا۔

نقدور ہو تو خال سے پوچھوں کہ اولیٰئم
 نوئے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے
 کس روز تمہیں نہ تراشا کیے عذوبہ
 کس دن ہمارے سر پہ نہ آئے چلا کیے؟
 صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
 دینے لگا ہے بوسے بغیر التجا کیے!
 جند کی ہے اور بات مگر خو بُری نہیں
 بھٹوے سے اس نے سیکڑوں وعدہ وفا کیے
 غالب تمہیں کہو کہ لے گا جواب کیا؟
 مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

۲۔ لغات
 سیاست و ربانی؛
 چو کیدار کی طوط سے
 باز پرس، وارو گیر
 اور ڈانٹ ڈپٹ۔
 شرح : دل
 ہی تو ہے، جو وہاں
 کی وارو گیر اور کپڑ
 دھکڑ سے ڈر گیا،
 درد کیا یہ ممکن تھا
 کہ میں آپ کے رونا
 پر پنچوں اور صدا
 لگائے بغیر وہاں سے
 گزر جاؤں؟

دل ہی تو ہے سارے دو پہلو ہیں، اول یہ کہ وہ حساس ہے، اچھی چیز کی
 طوط پکاتا ہے، منور ریاں چیز سے دور بھاگتا ہے۔ وہ چو کیدار کی تعزیر سے
 ڈر گیا۔ دوم یہ کہ دل میرے قابو سے باہر ہے۔ مجھے اس پر کوئی اختیار نہیں۔
 لہذا دل کی وجہ سے مجھے چپ چاپ نکل جانا پڑا۔

۳۔ لغات : خرقہ : گھڑی، جو فقراء کا خاص لباس سمجھی جاتی ہے۔
 سجادہ : جس پر سجدہ کیا جائے۔ جائے نماز۔
 آب و ہوا : یہاں اس سے مراد فصل بہار ہے۔

شرح : میں اب خرقہ اور سجادہ شراب خریدنے کی غرض سے گرد
 رکھنے کے لیے کوشاں ہوں، کیونکہ مدت گزر گئی۔ میں نے فصل بہار کی دھوا

لوہٹام نہیں کیا۔

مصل بہار کی دعوت کا مطلب یہ ہے کہ اس خوشگوار موسم میں ناو نوش کا لطف نہیں اٹھایا۔ خرقة و سجادہ دونوں کو شراب کے لیے گرد رکھنے کی عزت غالباً اس لیے پیش آئی کہ خاصی مقدار بہم پہنچ سکے تاکہ ہی بھر کر پی سکیں، مگر میرزا غالب کے نزدیک ان سے بڑی چیزیں بھی کوئی زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں، کیونکہ فرماتے ہیں :

از فرنگ آمدہ در شہر فراوان شدہ است

جرم را دیں عوام اگر بد سے اوزاں شدہ است

۴۔ لغات۔ بے صرفہ : بے فائدہ بے سود بے نتیجہ۔

شرح : عمر کتنی ہی لمبی ہو جائے، آخر بے سود اور بے فائدہ رہتی گزر جاتی ہے۔ دنیا داری کے جہاں اتنا موقع ہی نہیں دیتے کہ عام انسان کوئی شایاں کام انجام دے سکیں۔ مثلاً حضرت خضرؑ ہی کی مثال لے لیجیے جن کی عمر عام روایت کے مطابق نہایت لمبی ہوئی، بلکہ اب تک زندہ ہیں۔ وہ بھی کل یعنی قیامت کے دن کیا فرمائیں گے کہ ہم کیا کچھ کرتے رہے۔

مقصود خدا شہزادستہ یہ نہیں کہ حضرت خضرؑ کو ہدفِ طعن بنایا جائے بلکہ طویل عمر کی ایک مثال پیش نظر رکھ لی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں بے شمار ایسے انسان ہیں، جنہیں زندگی کی خاصی مدت ملتی ہے، مگر ان سے اپنی ذات کے لیے تگ و دو کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور وہ شاید ہی کوئی ایسا کام انجام دیتے ہیں، جو خلقِ خدا کے نقطہ نگاہ سے مفید و شایاں ہو۔

۵۔ لغات۔ لیشیم : کبھوس۔ بخیل۔

شرح : اگر ممکن ہو اور میں دسترس پاؤں تو دین سے پوچھوں کہ اے نامراد کبھوس ! جو ہمیشہ ہانڈا نے تیرے حوالے ہوئے تھے اور تیری تربیت پہنچ گئی، وہ کہاں گئے اور ان کا کیا بنا ؟

مطلب یہ ہے کہ بے شمار گراں قدر ہستیاں یہاں رونما ہوئیں۔ انھوں نے قابل قدر کارنامے انجام دیے اور سر کر تجھ میں دفن ہو گئیں اور اب ان کا کوئی پتا نہیں ملتا۔ زمین سے پوچھتے ہیں کہ تو نے ان سے کیا برتاؤ کیا؟

۶۔ **تشریح** : کون سے دن رقیبوں اور مخالفوں نے ہم پر تہمتیں نہ تراشیں اور کون سے دن ہمارے سر پر آرمے نہ چلے، یعنی ہمیں انتہائی دکھ دیے گئے؟

”تراشنے“ اور ”آرمے چلنے“ کی نسبت واضح ہے۔

۷۔ **تشریح** : محبوب نے وصل میں خاص التفات سے کام لیا۔ تو عاشق کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہو گیا کہ پہلے تو یہ عادت نہ تھی اور بدگلی کی بنا پر سمجھ لیا کہ کہیں رقیب کی صحبت میں یہ عادت نہ پڑ گئی ہو۔ اور مشہور ہے :

عشق است و ہزار بدگلی

عاشق بے التفاتی پر مزایا و نفاں کرتا ہے، لیکن محبوب کی طرف سے التفات ہو تو یہ شہرہ ہونے لگتا ہے کہ یہ عادت غیر سے اختلاط کے باعث نہ پیدا ہو گئی ہو۔

۸۔ **تشریح** : میرے محبوب کی عادت یقیناً بری نہیں، البتہ کبھی منہ پر آجائے تو جو کچھ کرنا چاہیے، نہیں کرتا۔ چنانچہ جب کبھی وہ منہ بھول گیا تو ایک دو نہیں، اس نے سیکڑوں وعدے پھدے کر دیے۔

اعتیاد دیکھیے کہ خوسے محبوب کے بارے میں اُشبہات نہیں، نفی کا پہلو اختیار کیا، یعنی یہ نہیں کہا کہ خُواچھی ہے، یہی کہا کہ بُری نہیں، مرزا کے کلام کی یہی باریکیاں اور نزاکتیں ہیں، جو کسی دوسری جگہ عموماً نظر نہیں آئیں۔

۹۔ **تشریح** : اسے ثابت ! تم جو اپنا حال سنانے اور اظہارِ عشق کرنے کی غرض سے محبوب کے پاس جاتے ہو، خود ہی تباہ و تباہی دہشتاں

مشرافی کا جواب کیا ملے گی ؟ ہم کہتے ہیں کہ اچھا ، تم نے سب کچھ کھینچ
محبوب نے سن لیا ، لیکن اس سے نتیجہ کیا نکلے گا ؟

یہ سب کچھ ایک بہادر تاج مرزا کو سمجھا رہا ہے ، گویا اظہارِ عشق کا
تصدد دیکھ کر سمجھ گیا ہے کہ غالب دیوانہ ہو رہا ہے ۔ وہ اُس کے سامنے
اظہارِ عشق کرنے چلا ہے ، جہاں اس کے پہنچنے کا بھی کوئی امکان نہیں ۔
پھر پوری بات سن لینے اور اسے مان لینے کا کون سا امکان ہے ؟

۱۔ شرح : عمر

کی رفتار پر نظر ڈالی جائے
تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم
حالتِ اضطراب میں کھٹے ملے
داستے پر جا رہے ہیں ۔ سال
کے حساب کی صورت یہ ہے
کہ آفتاب بارہ منزلیں طے
کرے تو سمجھتے ہیں کہ ایک
سال ہو گیا اور معلوم ہے کہ
شمسی سال تین سو پینسٹھ دن
پانچ گھنٹے ، اٹھائیس منٹ
اور ساڑھے سینتالیس سیکنڈ
کا ہوتا ہے ۔ گھنٹوں ہی کی
گنتی پوری کرنے کے لیے چوتھے
سال مزدوری کے مہینے میں ایک
دن بڑھا دیتے ہیں ، جسے لونڈ

رفتارِ عمر قطع رہ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو برقِ آفتاب کے
مینائے مے ہے سر و نشاطِ بہار سے ۔
بالِ تذرو جلوۂ موجِ شراب ہے
زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب کے
جاوادِ بادۂ نوشی رنداں ہے ششِ شجرت
خافلِ گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے
نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حُسن کا
جوشِ بہارِ جلوے کو جبکہ نقاب ہے

میں نامراد دل کی قستی کو کیا کروں
 کاون کہتے ہیں۔ مرزا فراتے
 مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے
 ہیں کہ جس طرح سال کا حساب
 گزرا اسد مسرت پیغام یار سے
 سوچ کی بنا پر کیا جاتا ہے
 قاصد پہ معجزہ کو رشکِ سوال و جواب ہے
 اسی طرح عمر کا حساب مطلوب
 ہو تو برق کی بنا پر کیا جاتا ہے۔

مقصود یہ کہ عمر بھلی کی طرح تیز رفتار ہے اور زندگی کی منزل طے کرنے
 کی وہی صورت ہے، جیسے کوئی مسافت حالتِ اضطراب میں طے کی جائے۔
 - تیزی، رفتار، اضطراب اور برق کی مناسبت محتاج تشریح نہیں۔
 ۲۔ لغات - تذرو : ایک خوش رنگ اور خوش رفتار پرندہ ابو
 استر آباد کے جنگل میں بہ کثرت ہوتا ہے۔ محققین کے نزدیک ذال ہی سے
 صحیح ہے۔ فاختہ اور قمری کی طرح شعراء تذرو کو بھی سرو کا عاشق قرار دیتے
 ہیں :

شرح : شراب کی صراحی بہار کی شادمانی کے جوش میں سرو کی
 شکل اختیار کر گئی ہے یا یوں سمجھئے کہ بہار نے ہر شے پر عیش و نشاط کی ایسی
 کیفیت طاری کر دی ہے کہ شراب کی صراحی سرو بن گئی ہے۔ اسی طرح
 تذرو کے بال و پر پورج شراب کا جلوہ معلوم ہوتے ہیں۔
 شعر میں بہار کا نقشہ و نگار انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔
 ۳۔ لغات - پاشنہ : ایڑی۔
 گوں : طاقت، بہت۔

اقامت : قائم رہنا، بر جا رہنا، ٹھہرنا۔

شرح : اپنی جگہ کھڑا رہنے سے پاؤں کی ایڑی ہی زخمی ہو گئی :
 اب رہ جانے کی بہت وقوت ہے، نہ ٹھہرے رہنے کی طاقت ہے کیونکہ

قیام و فرار کا انحصار ایڑیوں ہی کی سلامتی پر ہے۔

میدان جنگ میں دو ہی صورتیں پیش آ سکتی ہیں۔ یا انسان بہت دجڑت سے کام لے کر ثابت قدمی دکھائے یا نامرد بن کر بھاگ جائے، لیکن جس شخص کے پاسے ثابت کی ایڑی زخمی ہو جائے، وہ دونوں میں سے کوئی بھی کام انجام نہیں دے سکتا اور گر جاتا ہے۔ اسی حالت اضطراب کا نقشہ مرزائے اس شعر میں کھینچا ہے۔

مرزائے اس سے ملتا جلتا ایک اور بھی شعر کہا ہے :

ہوے میں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
دبھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جا ہے کب

۴۔ لغات - جہاداد : جہاداد، ملکیت

شش جہت : چھ طرفین، یعنی دنیا یا کائنات۔

تشریح : یہ پوری کائنات رندوں کی شراب نوشی کے لیے جاگیر

ہے۔ جسے حقیقت کا کوئی احساس نہیں، وہ سمجھ بیٹھا ہے کہ یہ جہان بالکل ویران و تباہ حال ہے۔

مولانا طہطاہائی فرماتے ہیں :

”بارہ سے عرفان اور رند سے عارف مراد ہے اور عالم کے

خراب و ویران ہونے سے مطلب یہ ہے کہ جو شخص جلوئے

حقیقت سے غافل ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اس کا کوئی صانع

اور مدبر نہیں۔“

یعنی ساری کائنات عارفوں کے نزدیک معرفت کی ایک جلوہ گاہ ہے

اس کی ہر شے سے حقیقت شناس دل یہ سبق لیتے ہیں کہ اس کے پس پردہ

ایک عظیم القدر صانع کی تدبیر و کار فرمائی جاری ہے۔ جو لوگ عرفان کا

ذوق نہیں رکھتے، وہ سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا ابترا، بے ترتیب اور بے مدبر ہے۔

سی ہے، جس کی کوئی کل سیدھی نہیں۔

متصوفانہ نقطہ نگاہ کے علاوہ بھی شعرِ بدہی حقیقتوں کا حامل ہے۔ مرزا یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اس کائنات میں کوئی بھی شے ایسی نہیں جو کوئی نہ کوئی مقصد پورا نہ کر رہی ہو۔ حقیقت شناس لوگ ہر شے سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں اور رفتہ رفتہ فطرت کی قوتوں کو مستخرج کرتے کرتے انسان زمین سے ستاروں کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے، لیکن جن لوگوں کو حقائق کا کوئی احساس نہ ہو سکا اور غافل رہے، وہ اتنے ہی پر قانع رہے کہ دنیا کو بے حقیقت اور ناقابلِ توجہ قرار دے کر اس سے دور بھاگنے کی تلقین فرماتے رہے۔

۵۔ شرح : نقطہ اس برقی حسن کے جلوے کا کیونکر محفل ہو سکتا ہے، جس کے لیے فصلِ بہار کا جوشِ پروے کا کام دے رہا ہے۔

مولانا طبا طبائی جوشِ بہار کو عالمِ اجسام کے طور سے تعبیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں، یہ طور جس شاہِ حقیقی کے لیے حفاظت کا باعث ہے، اسے نظر کیونکر دیکھ سکتی ہے؟ نظر جب پڑے گی، نقاب ہی پر پڑے گی۔ یعنی اچھو جب دیکھے گی، اجسام ہی کو دیکھے گی۔

مرزا یہ کنا چاہتے ہیں کہ جوشِ بہار کی گلوکاریوں اور طراوت افزائیوں کا نقطہ آسان نہیں، حالانکہ جوشِ بہارِ حسنِ حقیقی کا ایک نقاب ہے۔ اس صورت میں کوئی اصل حسن کی تاب کیا لا سکتا ہے۔

۶۔ شرح : میں نے مانا کہ نگاہیں حیرے رخِ انور پر پڑ رہی ہیں لیکن اس نامراد دل کو کیونکر تسلی دوں؟ وہ محض دیدار سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے کچھ اور چاہیے، جس کی تعبیر مولانا طبا طبائی نے ”سینہ بہ سینہ“ ہونے سے کی ہے۔

۷۔ شرح : اسد یعنی غائب نے محبوب کے پیغام کو خوشی خراپان کر دی اور یہ رشک بھراشت نہ کر سکا کہ قاصد اس کے پاس جاے، بات چیت کرے۔

پھر پیغام لائے۔

محبوب کا پیغام عاشق کے لیے ہمیشہ انتہائی مسرت کا باعث ہوتا ہے، لیکن مرزا کو یہ منظور نہ ہوا کہ قاصد پیغام لینے کے لیے جاتے اور محبوب سے ہم کلام ہو۔ اس رشک کے باعث پیغام وصول کرنے کی خوشی سے دست برداری اختیار کر لی۔

۱۔ شرح :
مرزا نے رشک کے عین غریب پہلو پیدا کیے ہیں، ان میں سے ایک وہ بھی ہے جو اس شرمی پیش کیا گیا ہے فراتے ہیں :
پرستہ لافظ ہو کہ مجھے خود اپنے آپ پر رشک آنے لگا۔ محبوب کی زیارت کرنا چاہتا

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پر رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
ہاتھ وصول سے یہی گری گرا اندیشے میں ہے
آگینہ تندی صبا سے پگھلا جائے ہے
غیر کو یا رب ! وہ کیونکر منع گستاخی کرے
گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے
شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جاوے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے
دور چشم بد : تری بزم طرب سے واہ وا !
نغمہ ہو جاتا ہے واں گرتالہ میرا جائے ہے
گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دانی رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے سے

اس کی بزم آراشیاں سن کر دل رنجور یاں ہوں، مگر شک
 مثل نقشِ مدعا ئے غیر بیٹھا جائے ہے یہ موقع ہی
 ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا نہیں دیتا کہ
 رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے اسے دیکھ سکوں
 نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز، مین ! مولا، طباطبائی
 کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھینچتا جائے ہے نے خوب فرمایا
 سایہ میرا مجھ سے مثل دور بھاگے ہے اسد، اتنا نے شک
 پاس مجھ کو آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے
 اپنے تئیں بھی محروم رکھتا ہے : اس قسم کے مزید اشعار میں سے ایک دو درجہ
 فرمایا ہے :

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
 مرتے ہیں، مگر ان کی تمنا نہیں کرتے
 تکلف برطرف نظارگی میں بھی سبھی، لیکن
 وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے
 چھوڑا نہ رشک نے کرتے مگر کا نام لوں
 ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ ہاؤں کہہ کر کو میں

۲۔ لغات - آگینہ : شیشہ، شیشے کی مراچی

مشرع : اگر فکر و اندیشہ کی گری کا یہی حال ہے تو دل سے ہاتھ دھو
 بیٹھنے کے بغیر جا رہے نہیں، کیونکہ شراب اتنی تیز و تند ہے، جو شیشے کو پگھلائے

جلد ہی ہے۔

مکرواخذیش کی گرمی کو شراب تند سے اور دل کو آگینے سے تشبیہ دی ہے۔
مطلب یہ ہے کہ دل کا آگینہ گہل کر ختم ہو جائے گا۔

غالب نے دوسرے مصرع کا مضمون ایک فارسی شعر میں بھی بانٹھا ہے
اگرچہ باقی مضمون کچھ اور ہے، یعنی :

مینا سے نئے از تند ہی ایسے نئے بگدازد

پیغامِ عنایت و درغورِ تحویلِ صبا نیست

۲۔ شرح : خواجہ عاتقی فرماتے ہیں :

”یہ شعر معاملے کا ہے، جو طالب و مطلوب کے درمیان اکثر گزرتا

ہے اور شاعرانہ نزاکت دوسرے مصرع میں پائی جاتی ہے۔ ظاہر

ہے کہ حیا آئی اور شرمنا داہ اصل ایک ہی چیز ہے۔ پھر اس کے

کیا معنی کہ حیا بھی آتی ہے تو شرمنا جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس

مقام پر حیا آنے کا متعلق اور ہے اور شرمنا ہانے کا متعلق اور۔

”گر حیا بھی اس کو آتی ہے“، یعنی ”غیر کی گستاخی پر خواہش، حیا

سے تو شرمنا ہانے ہے“ یعنی ”غیر سے یا اس کے ساتھ مکرواخذ کرنے سے“

شعر کا مطلب واضح ہو گیا، صرف اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ حیا دار شخص

علیٰ خود زیادہ سے زیادہ تکلیف اٹھا لیتے ہیں اور دوسرے سے مکرواخذ نہیں کرتے

یا کوئی ایسی بات نہیں کہتے، جو اس کی دگذاڑی کا باعث ہو۔ یقیناً غیر کی گستاخی

دیکھ کر مجرب کو حیا آتی ہے۔ وہ غیر کو منع کرنا چاہتا ہے، لیکن انتہائے دلداری

میں جو حیا داری کا طبعی خاصہ ہے، منع کر نہیں سکتا، یہی بات مرزا غالب نے

شعر کے پہلے مصرع میں واضح کی ہے۔

۴۔ لغات - لغت : لپکا، ٹٹو۔ یہ لفظ لپکا کی طرح بری عادت

کے لئے بھی مستعمل ہے۔

شرح : شوق کو توڑ لپکا پڑ گیا ہے کہ سب دم فریاد و فغاں ہی کرتا ہے۔ لیکن دل کی حالت ضعف کے باعث ایسی ہے کہ سانس لیتے ہوئے بھی گھبراتا ہے۔ شوق اور دل کی اس کھمکش کے باعث جان مضارب میں ہے۔

۵۔ شرح : تُو نے عیش و نشاط کی جو محفل آراستہ کر رکھی ہے، خدا اسے بُری نظروں سے بچائے۔ واہ وا ! سبحان اللہ ! اُس بزم کی یہ کیفیت ہے کہ میں تالہ بھی کرتا ہوں تو وہاں پہنچتے پہنچتے وہ نغمہ ہو جاتا ہے۔ گویا بزمِ مہربان کی فضا میں ایسی تاثیر ہے، ابوتالے کو نغمہ بادِ وحی ہے، جلیبا کہ دوسری جگہ کہا ہے :

بہشتیں امت کہ کہ ہم کر نہ بزمِ عیش دست

واں تو میرے تالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

شرح : اگرچہ ہم نے ایسا اعزاز انفرادی کر رکھا ہے کہ عشق کا جیوہ محبوب پر بکھلنے نہ پائے اور ہمارے لیے اس کے پاس جانے میں سوک ٹوک کی نوبت نہ آئے، لیکن جب ہم اسے دیکھتے ہیں تو اس طرح کھوئے جاتے ہیں اور از خود رفتگی کا ایسا عالم ہم پر طاری ہو جاتا ہے کہ محبوب عشق کا راز ایک صد تک پاجاتا ہے۔ یعنی اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کھویا جاتا خالی از علت نہیں۔

۷۔ لغات ۔ دل بیٹھا جانا : دل پر مددِ وجہ ضعف طاری ہونا ،

یعنی غش کی ابتدائی حالت ۔

رنجور : بیمار ۔ اضرہ ۔

نقش بیٹھنا : نقشِ قائم ہو جانا ، کسی کے دل میں جگہ لے لینا ۔

شرح : محبوب کے ہاں عیش و نشاط کی محفلیں آراستہ ہو رہی ہیں۔

میں ان کا ذکر سنتا ہوں تو بیمار و اضرہ دل پر مددِ وجہ ضعف کے باعث غشی طاری ہونے لگتی ہے۔ خیر کے مطلب و مقصود کا نقش قائم ہوتا جاتا ہے اور وہ محبوب کے دل میں گھر کرنا بار بار ہے۔

پٹھنے کا تعلق عاشق کے دل سے ہے اور رقیب کے قدام سے ۔ ایک سے مراد انتہائی صنعت ہے ، دوسرے سے مراد پوری کامیابی و کامرانی ۔

۸۔ لغات ۔ رنگ کھلنا : رنگ کا نمایاں اور زیبا ہونا یا سفید ہونا ۔

شرح : میرا پری جیسے چہرے والا محبوب کسی پر عاشق ہو گیا عشق کا نتیجہ ہی ہو سکتا تھا کہ اس کا رنگ اڑنے لگے ۔ چنانچہ اس وجہ سے وہ اور بھی نازک بن گیا اور ظاہر ہے کہ رنگ بتنا اڑے گا ، اتنا ہی کھلے گا ۔ ہر فرد پر واضح ہے کہ کسی چیز پر کوئی رنگ ہو ، وہ بتنا اڑتا جائے گا ، چیز اتنی ہی سفید ہوتی جائے گی ۔

۹۔ لغات ۔ کھنچتا ہائے ہے : (۱) تصویر بنتی جا رہی ہے (۲) محبوب پیچھے ہٹتا جا رہا ہے ، یعنی پہلے کھنچتا کی حند ۔

شرح : اس کی تصویر مصور سے بھی کیا کیا ناز کر رہی ہے ۔ وہ متنی کوشش پوری کر دینے کے لیے کرتا ہے ، اتنا ہی محبوب دُور ہٹتا یعنی کشیدہ ہوتا جاتا ہے ۔

مطلب یہ کہ محبوب کے ناز و انداز اور عشوہ واداکے باعث مصور کو تصویر پوری کر دینے کا موقع نہیں ملتا ۔

۱۰۔ لغات ۔ آتش بجان : جس کی جان میں آگ بھڑک رہی ہو ۔ جو سراپا آگ ہے ۔

شرح : اے استاد ! میرا یہ اسی طرح عجب سے دُور بھاگتا ہے ، جس طرح آگ سے دھواں نکل کر آگ بھڑک جاتا ہے ۔ سچ ہے ، میرے دل و جان میں آگ بھڑک رہی ہے اور میں سراپا آتش ہوں ۔ بھلا میرے پاس مٹرنے کی تاب کبھی ہو سکتی ہے ؟

۱۔ لغات - نہالی

تکب، لغات، رہنما،
ہیں بظاہر لغات مراد
ہے۔ لغاتوں اور تو شکلوں
پر آرائش کی غرض سے
خوش وضع شکلیں بنانے
کا عام دستور تھا، جس
طرح قالینوں پر اب تک
قسم قسم کے نقشے اور
شکلیں بنائی جاتی ہیں۔
بکرو : سردی،
شہد ۔

گرم فریاد رکھا شکل نہالی نے مجھے
تب اماں بھجریں دی بردیالی نے مجھے
نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری بہشت عالی نے مجھے
کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری و ہم
کر دیا کا مزان اصنام خیالی نے مجھے
ہوس گل کا تصور میں بھی کھٹکانہ رہا
عجب آرام دیا ہے بد و بالی نے مجھے

بیالی : نیل کی جھج، راتیں ۔

شرح : لغات پر جو شکل بنی ہوئی تھی، اسے دیکھتے ہی محبوب
یاد آگیا اور میں نے فراق میں فریاد و فغان شروع کر دی۔ یہ سلسلہ رات بھر
جاری رہا۔ اسی کی بدولت راتوں کی سردی سے مجھے پناہ ملی، یعنی سردی بھج
پر کوئی اثر نہ کر سکی، کیونکہ میں گرم مزید تھا۔

۲۔ لغات - رشید : عام معنی ادھار، مقصود وہ چیز ہے، جو

ابھی ہاتھ نہیں آئی اور آنے کی امید ہے۔ یعنی آخرت کی زندگی، بہشت۔
نقد : وہ چیز، جو میسر ہے، یعنی دنیا اور اس کی زندگی۔

شرح : مجھے دنیا اور عقبی کی حقیقت معلوم ہے۔ میری بلند ہمتی
نے اہل کے عزم پکنا گوارا نہ کیا۔ دونوں کو ٹھکرا دیا اور دونوں سے بے نیازی

مطلب یہ کہ انسان اپنی حقیقت پر خود کرے تو نہ دنیا کی کوئی چیز اسے
بھگا کر دام میں الجھا سکتی ہے اور نہ عقبا کی کوئی نعمت اس کے لیے تخریب
کا سامان بن سکتی ہے۔ وہ ذاتِ باری تعالیٰ کی رضا کے سوا ہر شے سے
بچے پروا رہے گا۔ یہی دعوت مرزا غالب کا اصل مقصود ہے۔

۳۔ لغات۔ اصنام : صنم کی جمع، محبت

شرح : وجودِ حقیقی صرف ایک ہے۔ جو لوگ ہزاروں لاکھوں
وجودوں کو کسی نہ کسی شکل میں مانتے ہیں اور وحدت میں کثرت آرائی کے
قائل ہیں، وہ حقیقت میں وہم کی پوجا کر رہے ہیں۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ
ایک وجود کے سوا کسی کو نہ مانا جائے۔ توحید کے معنی یہی ہیں۔ آہ! لوگوں
نے وہم کی پرستش میں جو خیالی مٹ قائم رکھے ہیں، انہوں نے مجھے ایمان
کے راستے سے ہٹا کر کامزنا دیا ہے۔

جب ایمان توحید پر ہو تو کثرت کو تسلیم کرنا یقیناً توحید کے منافی ہے
اس لیے اسے ایمان کے بجائے کفر کہنا چاہیے۔

۴۔ شرح : جب تک میرے بال و پر موجود تھے، دل میں پھولوں
کی آرزو تھی، لیکن جب بال و پر کٹ گئے اور میں پرداز کے ہر سامان سے
محروم ہو گیا تو ساتھ ہی پھولوں کی آرزو بھی افسردہ ہو کر رہ گئی، یہاں تک کہ
اس آرزو کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، گویا اس معاملے میں غلبان کی کوئی
صورت باقی نہ رہی۔

ہر مقصد و نصب العین کے محرکات و عوامل ہوتے ہیں، جن کی بدولت
مقصد کے لیے سعی و کوشش کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے اور آرزو اسی
وقت تک زندہ سمجھی جاتی ہے، جب تک اس کے لیے تحریک کے موجبات
موجود ہوں۔ پھولوں کی آرزو کے لیے باہلی کے سامنے بال و پر واحد محرک
تھے، وہ جب چاہتی، اڑ کر ان کے پاس پہنچ سکتی تھی۔ جب بال و پر ہی نہ

رہے تو اڑنے اور عید و جہد کرنے کا سوال ہی نہ رہا۔ اس طرح آرزو کے گل افروز ہو
جسے جان ہو گئی۔ جب خرگ کا ٹخنہ ہو گیا تو کامل آرام نصیب ہوا۔

۱۔ لغات

کارگاہ و مستی میں لالہ داغ ساماں ہے
کارخانہ یعنی دنیا۔
شرح : خود مرزا
غائب نے ان تینوں کی
شرح اپنے شاگرد مولوی
محمد عبدالرزاق شاکر کو لکھی
تھی وہی یہاں درج کی
جاتی ہے۔

کارگاہ و مستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برق خرمین راحتِ خوں گرم و بقاں ہے
غنچہ تا شگفتن با برگِ عافیت معلوم!
با وجود دلجمعی، خواب گل پریشاں ہے
ہم سے رنج بے تابی کس طرح اٹھایا جائے
داغ پشت و دستِ عجز شدلغش برودناں ہے

”داغ ساماں مثل انجم انجم، وہ شخص کہ داغ جس کا سرمایہ و سامان
ہو، موجودیت لائے کی مختصر نمائش داغ پر ہے اور نہ دنگ تو اور
پھولوں کا بھی لال ہوتا ہے۔ بعد اس کے یہ سمجھ لیجیے کہ پھول
درخت یا غلہ جو کچھ بڑیا جاتا ہے، وہ بقاں کو جوتنے، لہنے، پانی
دینے میں مشقت کرتی پڑتی ہے اور یا صنت میں لو گرم ہو جاتا ہے
مقصود شاعر کا یہ ہے کہ وجود محض رنج و عنا ہے۔ مزارع کا وہ
لو، جو کشت و کار میں گرم ہوا ہے، وہی لائے کی راحت کے خرمین
کے لیے برق ہے۔ حاصل موجودیت داغ، داغ مخالف راحت
اور صورت رنج۔“

مطلب یہ ہے کہ دنیا میں لائے کا سرمایہ و سامان داغ ہے، یعنی مستی

باعثِ رنج ہے۔ دھقان کا جو خونِ محنت و مشقت میں گرم ہوتا ہے، وہی کاشت کردہ شے کے انبارِ راحت کے لیے بکلی بن جاتا ہے۔

۲۔ **شرح :** مرزا فرماتے ہیں۔

”کلی جب نئی نکلے، یہ صورتِ قلبِ صوبری نظر آئے اور جب تک پھول بنے، برگِ عافیت معلوم۔ یہاں معلوم بہ معنی معدوم ہے اور برگِ عافیت بہ معنی مانعِ آرام۔ برگِ اور سروِ برگ بہ معنی سازدِ سامان ہے۔ خوابِ گل بہ اعتبارِ خاموشی و درجا ماندگی پریشانی ظاہر ہے، یعنی ٹھنڈی، وہی پھول کی پیکٹریوں کا کھیرا ہوا ہوتا۔ غنچہ بہ صورتِ دلِ جمیع ہے۔ بادِ صفتِ جمعیتِ دلِ گل کو خواب پریشاں نصیب ہے۔“

کلی جب تک کھلے، اُسے آرام کا کوئی لمحہ نصیب نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ نظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اسے جمعیتِ دل نصیب ہے، لیکن حقیقت پر نظر رکھیں جائے تو اس کا خواب یعنی خاموشی و سنا خواب پریشاں ہے، کیونکہ وہ کھلے گی اور کھلتے ہی ایک ایک پیکٹری الگ الگ ہو جائے گی۔

گل کی حالت میں دلجمعی اور پھول کی حالت میں پریشانی عام مشاہدے کی چیز ہے۔ مقصودِ شاعر کا یہ ہے کہ بظاہر اس دنیا میں، جو آزمائش کا مقام ہے، کسی بھی وجود کے لیے آرام کے اسباب متیاء نہیں۔

۳۔ **لغات :** پشتِ دست : اصل میں پشتِ دست برز میں

نہاؤں ہے، یعنی کسی کی تعظیم کرنا اور اس کے سامنے عجز و انکسار سے پیش آنا۔

خس بدندانِ گرفتار : دانتوں میں تنکا لپٹا۔ زمانہ قدیم کے ہندوؤں میں

یہ طریقہ رائج تھا کہ جب کوئی گروہ کسی سے مغلوب ہو جاتا تھا تو مغلوب گھاس کا تنکا منہ میں لے کر غالب گروہ کے دربار پہنچاتا تھا۔ مقصود یہ ہوتا تھا کہ مغلوب نے گھاس کی صورت پیدا کر لی، جو گھاس کا قاتی تھی۔ ہندوؤں کے نزدیک گھاس کو مارنے

سے بڑھ کر کوئی گناہ نہ تھا۔ اس بنا پر اس گروہ کو جو گناہ کی صورت میں سامنے آتا تھا، معاف کر دیا جاتا تھا۔ یوں جس بدنداں گرفتار یا کاد بدنداں گرفتار سے مراد عاجزی اور مظلومت کا اظہار ہوا۔

شرح : مرزا فرماتے ہیں :

- پشت دست صورت عجز اور خس بدنداں دکاہ بدنداں گرفتار ہیں
اظہار عجز ہے۔ پس جس عالم میں کہ داغ نے پشت دست زمین پر
دکھ دی جو اور شیط نے تنکا دانتوں میں لیا ہو، ہم سے رنج و غم
کا تحمل کس طرح ہو؟

مطلب یہ کہ جب داغ مینا کی کار رنج برداشت نہ کر سکا اور اس نے عاجزی
سے پشت دست زمین پر دکھ دی۔ اسی طرح شیط نے تنکا دانتوں میں لے لیا،
گویا اظہار عجز کر دیا۔ جس رنج کی متحمل یہ سراپا درد چیزیں نہ ہو سکیں، اسے ہم
کیونکر اٹھائیں؟

شرح : اے

غالب ! گھر کے درد و یار

پر سبزہ آگ رہا ہے۔

کیونکہ وہ بے آباد ہے

آگ رہا ہے درد و یار سے سبزہ غالب

ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

اور اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں۔ ہم دشت و بیاباں کی خاک چھان
رہے ہیں اور گھر میں فصل بہار طراوت و شادابی کا سماں پیدا کر رہی ہے۔

اس شعر کی خوبیاں خاص توجہ کی محتاج ہیں، مثلاً :

۱۔ گھر کو چھوڑے ہوئے مدت گزر گئی۔ اس اشار میں کسی نے اس کی دیکھ بھال

نہ کی، یہاں تک کہ وہاں جنگل کا سماں نمودار ہو گیا۔

۲۔ درد و یار پر سبزہ آگ آتا ہے رونقی اور ویرانی کی علامت ہے۔ شاعر

نے اسے بہار کا سماں بتایا۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس سحر کی وہ خاک چھانتا رہا ، وہاں روئیدگی سرے سے نا پیدا ہوتی۔ اور جہاں معمولی سی روئیدگی معلوم ہوتی ، اسے حقیقی حالت سے بے پروا ہو کر بہار قرار دے دیا۔

۲۔ ظاہر ہے کہ جب گھر میں دیرانی کمال پر پہنچ گئی تو شرع کرتا ہے کہ اس حالت میں سحر اگر دی کی کیا ضرورت باقی رہی ؟
۳۔ اس شعر کا طنز کسی تصریح کا محتاج نہیں۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں : ”اس شعر میں بیان و بدیع کی کوئی خوبی نہیں ، لیکن صاف صاف لفظوں میں حالت دیوانگی کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ جواب نہیں۔“

شرح :

یہ حسرت برا بروہی
اور اب تک ہے
کہ ہم اس کی سادگی
پر جان دے دیں
اور گلا کاٹ کر مر
جائیں۔ مصیبت یہ
ہے کہ جب کبھی ہم
نے ایسا ارادہ کیا
اس نے خنجر اٹھا
لیا ، یعنی سادگی
ختم ہو گئی اور ہماری
حسرت دل ہی میں
رہی۔ اب خیال تھا

سادگی پر اس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کعبہ قاتل میں ہے
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے یہ ایں بہرہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے
بس بھوم نا امید ی خاک میں مل جانے گی
یہ جو اک لذت ہمدی سہی بے حاصل میں ہے
رنج رہ کیوں کھینچے؟ واما ندگی سے عشق ہے
اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

علوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل بھی ! کہ یہ نکل جائے گی ،
نقشہ شوریہ قیامت کس کی آب و گل میں ہے ؟ اور مان چوراہا بن گیا
ہے دلِ شوریہ غالبِ مسلم چچ و تاب لیکن اس عالم نے
رحم کر اپنی تمنا پر ، کہ کس مشکل میں ہے پھر خیرِ منجھال یا
سے اور ہم بے بس رہ گئے ہیں ۔

۲۔ **شرح :** خواہہ حالی اس شعر کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

” کسی کے حسنِ بیان کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی کہ جو بات
فائل کے منہ سے نکلے ، وہ سامع کے دل میں اس طرح اتر جائے
کہ اسے شبہ ہو ، یہ بات پہلے ہی سے میرے دل میں تھی ۔“

بیشتر حقائق انسان کے دل میں طبعاً پیوست ہوتے ہیں ، لیکن جب تک ان
کی طرف اشارہ نہ کیا جائے ، اکثر کو ان کا شعور و احساس نہیں ہوتا ۔ جب اشارہ
کر دیا جائے تو یہ خیال نہیں ہوتا کہ کوئی نئی بات سننے میں آئی ۔ یہی سمجھا جاتا
ہے کہ جو بات پہلے سے دل میں موجود تھی ، وہ تازہ کر دی گئی ۔ تقریر کی سب
سے بڑی خوبی یہی ہے کہ انسان کے دل کی باتیں تازہ ہو جائیں ۔ ایسی ہی تقریر
دل پذیر و پُر تاثیر ہوتی ہے ۔ اسی حقیقت کی طرف مرزا غالب نے اشارہ کیا ہے
مرزا کی دقیقہ سنجی کا کمال ملاحظہ ہو کہ یہ نہیں کہا ، وہ بات پہلے سے دل
میں موجود تھی ، یہ کہا ، میں نے جانا ، گویا یہ بھی میرے دل میں تھی ۔

۳۔ **شرح :** اگرچہ محبوب کی محفل میں میرا ذکر انتہائی برائی سے ہو

رہا ہے ، لیکن یہ ذکر مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں پہنچ گیا ہے ، آہ ! میں
نہیں پہنچ سکتا ۔

عاشق کو محبوب برائی سے بھی یاد کرے یا محفل نشینوں کی بدگوئی گوارا
کرے اور ذکرِ درد کے تو عاشق کے لیے یہ بھی ایک دل پسند شے ہے اور

مرزا غالب کا تو فلسفہ ہی یہ ہے کہ دشمنی بھی بہر حال تعلق ہی کا ثبوت ہے ۔
وہ نفسِ ذکر پر خوش ہے ، اس کے لیے اچھے بڑے کا سوال پہلے نہیں ، بعد
میں آتا ہے ۔

۴۔ شرح : اسے نا اُمیدی کے بے پناہ سِل ! ذرا غم جم جائے ۔ اُمید
کا جو براے نام تیرا لگا ہوا ہے ، وہ بھی کٹ نہ جائے ۔ اُسی کی بنا پر ہم رات
دن سنی و کوشش میں لگے ہوئے ہیں ۔ اگرچہ اُس سے حاصل کچھ نہیں ہوتا ،
لیکن ہماری دل لگی کا ایک ذریعہ ضرور ہے ۔ اگر یہ سہارا بھی باقی نہ رہا اور
امید کے پورے غانے پر اندھیرا بھا گیا تو اس کوشش میں دل لگی اور چٹھی
کا جو سامان ہے ، وہ بھی ختم ہو جائے گا ۔

انسان حصولِ مقصد کے لیے جو کوششیں کرتا ہے ، وہ اُمید پر مبنی
ہوتی ہیں ، اگرچہ اس کی حیثیت کچھ ہی ہو ۔ کوششیں کامیاب نہ بھی ہوں تو
جب تک اُمید کا تھوڑا سہارا باقی ہے ، وہ جاری رہیں گی اور ان میں مصروفیت
کے باعث انسان اک گودِ لذتِ عوس کرے گا ۔ اگر نا اُمیدی ایک طوفان کی طرح
ہجوم کر کے آجائے تو غما ہرے کہ رہا سہا سہارا بھی ختم ہو جائے گا اور تہیہِ کامل
ہو جائے ، نیز سنی و کوشش کے تعلق کے سوا کچھ نہ ہو گا ۔

۵۔ شرح : ہم چلنے کی زحمت کیوں برداشت کریں ۔ داناگی اور
بہادری کو ہمارے قدموں سے اس درجہ عشق ہو گیا ہے کہ جو بھی قدم رکھتے
ہیں ، وہ اٹھ نہیں سکتا ۔

مطلب یہ کہ ہمارے لیے داناگی کے باعث چلنا غیر ممکن ہے ۔
مرزا نا طبعاً فانی فرماتے ہیں کہ ”منزل کے ساتھ“ میں ”استعمال ہو تو اس
سے مراد“ راستہ ”ہوتا ہے“ پر ”استعمال ہو تو منزل مقصود سمجھنا چاہیے“ ۔

۶۔ شرح : محبوبِ عاشق سے کتنا ہے کہ تمہارا دل تو جہنم کی آگ
بھڑکنے کا جلوہ دکھاتا رہا ہے ۔ عاشق جواب دیتا ہے کہ جو کچھ آپ نے فرمایا ،

بجاسی، لیکن یہ بھی تو بتائیے کہ شور قیامت کے فتنے سے کس کی سرشت
لبریز ہے ؟

ظاہر ہے کہ عاشق کے دل میں ہمیشہ عشق کی آگ مشتعل رہتی ہے اور
آتشِ دوزخ سے اس کی مناسبت متاثر ہو جاتی نہیں، مگر محبوب بھی تو اپنے
قادرِ خدا زاد اور عشوہ واداک کی بدولت قیامت کے فتنے سے کم نہیں ہوتے۔

۷۔ شرح : غالب کا دل دیوانہ بیچ و تاب کا ایک طلسم ہے جس
میں ہر لحظہ بیتیابی و بقیاری موجزن رہتی ہے۔ اے محبوب ! اسی دل میں تیری
تمنا اور آمد و جاگزین ہے۔

مجھ پر نہ سہی، اپنی تمنا پر تو رحم کر اور دیکھ کہ کن مشکلات میں پڑی ہوئی
ہے ؟ تو ہی اسے ان مشکلات سے ٹھنڈا سکتا ہے۔

شاعروں نے حسنِ طلب کے عجیب و غریب پہلو پیدا کیے ہیں، ان میں سے
ایک غالب کا یہ شعر بھی ہے۔ امیر مثنوی نے کہا ہے۔

دل آپ کا کہ دل میں جو کچھ ہے، سب آپ کا
دل بیجی، مگر میرے ارمان نکال کے

۱۔ شرح : دل اور

جگر دونوں تیرے تیرے نگاہ سے
زخمی ہونے کے آئندہ مند
تھے، چنانچہ وہ تیرے دل کو چیرتا
ہوا جگر میں اُڑ گیا۔ اس ادا
سے دونوں خوش ہو گئے۔
دونوں کی آمد و پوری ہو گئی
اور حسرت باقی نہ رہی۔

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رہنا مند کر گئی
شق ہو گیا ہے سینہ، خوشا لذت فراغ
تکلیف پر وہ داری زخم جگر گئی !
وہ بادۂ شہانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیں بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

۲۔ لغات :

شقی ہونا : پھٹ جانا

فراع : بے فکری

مزاغت ۔

شرح : خدا کا

شکر ہے کہ میرا سینہ پھٹ

گیا اور اس کا بند بند ٹھکل

گیا۔ پیشتر جگر کے زخم کو

پوشیدہ رکھنے میں زحمت ،

الٹانی پڑتی تھی ، اب اس

زحمت کی کوئی مزدورت نہ

رہی ، بڑا ہی اچھا ہوا کہ

بے فکری کی لذت میسر آگئی۔

زخم جگر کی پر پردہ دہی

اسی وقت تک کار آمد بھی

جاسکتی تھی کہ سینہ محفوظ رہتا

جب سینہ پھٹ جانے سے

خود جگر منظر عام پر آ گیا ، تو

پردہ داری کی کیا گنجائش باقی رہی ؟

اڑتی پھرے ہے خاک بری کو سے یار میں

بارے اب اسے ہوا ! ہوس بال و پز گئی

دیکھو تو دل فریبی اندازِ نقش پا

موجِ خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

بہر بواہوس نے حسن پرستی شعار کی

اب آبروے شیوہ اہل نظر گئی

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا

مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

فرود دی کا نقشہ یک بار مٹ گیا

کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں

وہ دلوے کہاں ؟ وہ جوانی کدھر گئی ؟

شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ چھوٹی مصیبت میں ضبط و تحمل کا اہتمام

کرنا پڑتا ہے۔ جب اس سے بڑی مصیبت پیش آجائے۔ تو پیشتر کا ضبط و تحمل

بالکل بے سود رہ جاتا ہے اور بڑی مصیبت میں چھوٹی مصیبت کی الحقیقت

یاد بھی نہیں رہتی۔

۲۔ لغات - بادۂ شبانہ : رات کے وقت شراب پینا۔

شرح : اس شعر میں دراصل عیش و نشاط کی ایک خاص کیفیت پیش کی گئی ہے۔ رندوں کا عام دستور یہ تھا کہ رات رات بھر محفلِ مہاکر شراب پیتے رہتے، راگ رنگ ہوتے رہتے، صبح کو سو جاتے اور نیند کے مزے لیتے۔

میرزا کہتے ہیں، رات کو شراب پینے کی ہمتیاں اب کہاں ؟ وہ تو ختم ہو گئیں۔ جب وہی نہ رہیں تو خواب سحر کی لذت بھی رخصت ہو گئی، کیونکہ وہ لذت تو رات بھر شراب پی کر سیاہ مست ہو جانے پر موقوف تھی۔

مولانا طہطائی فرماتے ہیں کہ شعر کے الفاظ معنی حقیقی پر محمول کریں تو کچھ لطف نہیں، چنانچہ ان کے نزدیک میرزا کو استعارہ مقصود ہے۔ یعنی بادۂ شبانہ سے نشہٴ شباب اور سحر سے پیری کا استعارہ اور اٹھیے کا خطاب نفسِ فانی کی طرف ہے۔

بظاہر مولانا رند نامہ مشغلوں کا ہیک اندازہ نہ فرما سکے۔ اٹھیے کے خطاب سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ بادۂ شبانہ کی سرمستیوں سے خواب سحر کی لذت اٹھانے والا کوئی تو آبِ یار نہیں ہے، جو ایسی سرمستیوں میں انتہاک کا عادی چلا آتا ہے۔ تاہم اگر مولانا کے فرمائے ہوئے استعارے میں نظر رکھتے ہائیں۔ تو مقصود یہ ہوگا کہ شباب کی منزل گزر گئی اور بڑھاپا آ گیا۔ اب خواب سحر میں وہ لذت باقی نہ رہی، کیونکہ وہ تو شراب نوشی کی فراوانی پر موقوف تھی، جو شراب کے ساتھ ہی ختم ہو گئی، لہذا اب کچھ عبادت کر لینی چاہیے۔

۴۔ شرح : میری خاکِ محبوب کے کوچے میں اڑتی پھرتی ہے۔ یہی میرا مقصود تھا، یہی آرزو تھی۔ اے ہوا ! اب مجھے بال و پر کی کیا ضرورت رہ گئی ؟ وہ بھی تو اسی لیے درکار تھی کہ میں کو پڑ محبوب کی فضا میں اڑ سکوں۔ جب میری خاکِ محبوب کو یہ شرف حاصل ہو چکا ہے تو اب بال و پر سے بے نیازی تیسرا آگئی۔

مولانا لمبا لہائی فرماتے ہیں کہ ہوا سے خطاب بظاہر بے مزہ ہے لیکن ہوس کی مناسبت سے مصنف نے صبا کو چھوڑ کر ہوا کو بانڈھا میرے نزدیک لفظ ہوا حصن ہوس کی رعایت ہی سے اختیار نہ کیا گیا، خاک کو اڑانے کے لیے صبا سے کہیں زیادہ ہوا کی ضرورت تھی۔ صبا خوشبو لے جاسکتی ہے خاک نہیں اڑا سکتی۔

۵۔ لغات۔ گل کترنا : کاغذ وغیرہ کے پھول بنانا، گلکاری کرنا عجیب و غریب اور اچھے کام انجام دینا۔ کسی کا کوئی ایسی بات کرنا، جس سے فساد برپا ہو اور وہ الگ رہے۔

شرح : محبوب چلتا ہے تو زمین پر پاؤں رکھنے کے رنگ ڈھنگ صمد جہ دلفریب اور قابل دید ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خرام محبوب کی اہر گل کرتی ہوئی جا رہی ہے۔

گل کترنے سے یہ مفہوم بھی ثابت ہے کہ محبوب چل نہیں رہا، بلکہ گلکاریاں کر رہا ہے۔ یہ مفہوم بھی واضح ہے کہ اس حال سے عاشق میں ایک ہنگامہ فساد برپا ہو رہا ہے اور خود محبوب کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔

۶۔ لغات۔ بوالہوس : ہوس پرست، جھوٹا عاشق۔

اہل نظر : معنویت پر نظر رکھنے والے، سچے عاشق۔

شرح : زمانے کے طور طریقے بدل گئے۔ ہر ہوس پرست اور جھوٹے عاشق نے حسن پرستی کو اپنا مشغلہ بنا لیا ہے۔ گویا یہ رسم عام ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اب سچے عاشقوں کے طور طریقے کی عزت و آبرو جاتی رہی۔

شرک کی آفاقیت محتاج تشریح نہیں۔ زندگی کے ہر دائرے میں اس کا یکساں اطلاق ہو سکتا ہے۔ جب سچے جھوٹے میں امتیاز کا کوئی نشان خاص باقی نہ رہے تو پتھروں کی آبرو کیا باقی رہ سکتی ہے ؟

۷۔ شرح : محبوب کا نظارہ بھائے خود ایک نقاب کی صورت اختیار

کر گیا، کیونکہ جہنگاہ اس کے رنج اند پر پڑی، وہ مست اور از خود رفتہ ہو کر
سہرطون کبھر گئی۔ ہر نگاہ کی حیثیت ایک تار کی تھی۔ بہت سے تاروں نے
اس کے چہرے پر کبھر کبھر کر ایک پروہ تیار کر دیا۔ یعنی نظارہ نبات خود حسن
سے نطف اندوز ہونے کے بہانے محرومی کا باعث بن گیا۔

مولانا لطیف آبادی فرماتے ہیں کہ مصنف نے بہتر کا لفظ یہاں پورا نقاب
بنانے کے لیے صرف کیا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے، تیرا رنج دیکھ کر ایسی
از خود رنگی ہوئی کہ سب دیدار سے محروم رہے۔

۸۔ لغات - فردا : آئندہ کل۔

دی : گزشتہ کل۔

مشرح : خواجہ حالی فرماتے ہیں :

”تھارے جاتے ہی بہ سبب خود رنگی و خود فراموشی کے یہ حالت ہو
گئی کہ آج اور کل کی مطلق تمیز نہیں رہی اور ایسا ہی قیامت کی
منسبت کہا جاتا ہے کہ وہاں ماضی و مستقبل دونوں مبدلی بہ زمانہ حال
ہو جائیں گے۔ پس تم کیا گئے، گو یا ہم پر قیامت گزر گئی۔ قیامت
گزر جانے کے دونوں معنی ہیں، ہنایت سختی کا زمانہ گزرتا اور
خود قیامت کا آجاتا۔“

خطاب محبوب سے ہے۔ فرماتے ہیں : کل تم ہمارے پاس سے رخصت ہوئے
حشر ٹوٹ پڑا۔ آئندہ کل اور گزشتہ کل میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا۔ اس سے
بڑھ کر قیامت کا نشان کیا ہو گا ؟ یوں گزشتہ کل فرماے قیامت بن گئی۔

۹۔ شرح : اے اسد اللہ خاں ! تمہیں زمانے نے تباہ کر ڈالا۔ وہ

جوانی جس پر تم نازاں تھے، کہاں گئی ! وہ ہنگامہ خیز دلو لے گیا جوئے مطلب
یہ کہ جوانی کے ساتھ دلو لے بھی گئے اور پہری آگئی۔ یہ انحطاط زمانے کے
باعث رونما ہوا۔

میرزا کا پورا نام اسدا شد خاں تھا۔ ابتدا میں اسدا تخلص کرتے تھے۔ مولانا طباطبائی نے فرمایا ہے کہ تخلص کے ساتھ پورا نام آجانے سے خوبی پیدا ہوتی۔ اور "خان" سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ کسی زمانے میں قوت و سطوت کے مالک تھے، جسے سپری نے مٹا دیا۔ یعنی عظمت رفتہ کی یاد بجا ہے، بجا نہیں۔

۱۔ شرح :

بگر نظر کے لیے لذت
 ہاں مزا ہم ہو جائے
 تو ہم دل کی تسکین کا
 غم کیوں کریں بہشت
 کی حمد ہی کتنی ہی پاکیزہ
 کیوں نہ ہوں، لیکن
 اسے محبوب! ان میں
 تیری صورت مٹنی چاہیے
 کیوں؟ اس لیے کہ
 نہ تیری صورت کے سوا
 نظر کسی حالت میں حقیقی
 لذت پا سکتی ہے اور
 مدد کی تسکین کا سامان
 فراہم ہو سکتا ہے۔

مشرقی مرزا غالب
 فے بہشت کے متعلق پنا
 نقطہ نگاہ پوری طرح

تسکین کو ہم نہ روئیں، جو ذوقِ نظر سے
 خورانِ غلہ میں تیری صورت، مگر، سے
 اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل
 میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر بے
 ساقی گری کی شرم کرو آج، ورنہ ہم
 ہر شب پایا ہی کرتے ہیں مے جس قدر سے
 تجھ سے تو کچھ کلام نہیں، لیکن اے ندیم!
 میرا سلام کہیو اگر نامہ بر سے
 تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
 فرصت کشاکش غم پہناں سے گزے
 لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
 جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر سے
 اے ساکنانِ کوچہ و لہزار! دیکھنا
 تم کو کہیں جو غالب آشفۃ سر سے

واضح کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ بلاشبہ بہشت میں خود میں ملیں گی، لیکن ہم ان میں اپنا ذوق نظر کہاں پا سکتے ہیں اور ہمیں تسکین کیونکر ہو سکتی ہے؟ اے محبوب حقیقی! دلوں تیرا جلوہ تیسرا آنا چاہیے۔ وہی ذوق نظر کا سراپہ اور وہی تسکین خاطر کا واحد ذریعہ ہے۔

۲۔ شرح : اے محبوب! تو میرے قتل کے بعد مجھے اپنے کوچے میں دفن نہ کر، کیونکہ لوگ میری قبر کا نشان پا کر تیرے گھر کے دروازے پر پہنچے لگیں گے اور میرا عذیبہ رشک اس کا روادار نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ عاشق کو اپنی عظمت و شہرت کا پورا یقین ہے۔ وہ دفن ہو گا تو لوگوں کو عظمت و شہرت کی بنا پر قبر تک آنے کا بہانہ ملتا رہے گا۔ اس طرح انھیں تیرے گھر کا نشان مل جائے گا۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ لوگوں میں مشہور ہو جائے گا، دیکھو فلاں نے فلاں کو قتل کر دیا اور اپنے کوچے ہی میں اس کی قبر بنا دی۔ اس طرح قتل کا بے حد کھل جانے کا اور ممکن ہے، لوگ تجھ سے مواخذے کا سوال اٹھائیں۔

۳۔ شرح : آج تم نے ساقی کا منصب اختیار کر لیا اور شراب پلا رہے ہو۔ خدا کے لیے اپنے اس منصب ہی کا پاس و لحاظ کرو اور جتنی پلا سکتے ہو، پلا دو، ورنہ بہرات ہمیں جتنی ملتی ہے، اپنی لیتے ہیں اور مطمئن ہیں تمہاری ساقی گری کے لیے تو تھوڑی پلانا کچھ باعث عزت نہیں۔

۴۔ شرح : خود مرزا غالب اس شعر کا مفہوم تاضی عبد الجلیل جنوں کو کہتے ہوئے یوں واضح کرتے ہیں۔

”یہ مضمون کچھ آغاز چاہتا ہے۔ یعنی شاعر کو ایک قاصد کی ضرورت ہوئی، مگر کھٹکا ہے کہ قاصد کہیں محبوب پر عاشق نہ ہو جائے ایک دوست اس عاشق کا، ایک شخص کو لایا اور اس نے عاشق سے کہا کہ یہ آدمی و منہ دار اور معتد علیہ ہے۔ میں صاف من ہوں کہ

یہ ایسی حرکت نہ کرے گا۔ خیر اس کے ہاتھ خط بھیجا گیا۔ قننا
 را عاشق کا گمان سچ ہوا۔ قاصد معشوق کو دیکھ کر والدہ شعیفہ
 ہو گیا۔ کیا خط، کیا جواب؟ دیوانہ بن، کپڑے بھاڑ جنگل
 کو چل دیا۔ اب عاشق اس دقوے کے بعد ندیم سے کہتا ہے
 کہ غیب دان تو خدا ہے، کسی کے باطن کی کسی کو کیا خبر؟
 اے ندیم! تجھ سے تو کچھ کلام نہیں۔ لیکن اگر تاجر کہیں مل
 جائے تو اس کو میرا سلام کہیو کہ کیوں صاحب! تم کیا کیا دھوے
 عاشق نہ ہونے کے کر گئے تھے اور انجام کار کیا ہوا؟

”کہیو سلام“ دراصل ایک نہایت لطیف تعریف ہے۔

۵۔ شرح : اگر ہمیں چھپے ہوئے غم کی کھینچ تان سے نجات مل

جائے تو اسے محبوب! ہم تمہیں بھی بتا دیں کہ مجنوں نے کیا کیا تھا۔

”چھپے ہوئے غم“ سے مراد بظاہر یہ ہے کہ اگر مجنوں کی طرح کپڑے بھاڑ
 کہ صحرا میں نکل جائیں تو راز عاشق ناش ہو جائے اور اس میں محبوب کی رسوائی
 کا احتمال ہے۔ ہمارے لیے وہ سب کچھ کر دکھانا بہت سہل ہے جو مجنوں
 نے کیا تھا، لیکن گوناگوں مصیبتیں ہمارے راستے میں حائل ہو رہی ہیں۔

۶۔ شرح : حضرت خضرؑ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ زندہ ہیں اور

بھوے بجکے مسافروں کی رہنمائی فرماتے ہیں کم از کم یہ ادبی مسلمات میں سے
 ضرور ہے۔ مرزا کہتے ہیں کہ ہمارے لیے حضرت خضرؑ کی پیروی لازم نہیں
 البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ راہ سلوک میں ہمیں ایک بزرگ مل گئے، جو ہمارے
 ہم سفر تھے اور ان کا نام خضرؑ تھا۔

مطلب یہ کہ سلوک میں ہمارا مرتبہ خضرؑ سے کچھ کم نہیں کہ انہیں رہنما

مان لینا ہمارے لیے لازم ہو۔

۷۔ شرح : اے محبوب کے کوچے میں بسنے والو! اگر کہیں تمہیں

غالب دیوانہ مل جائے تو دیکھنا اس کا کیا حال ہے، خدا اس کا خیال رکھتا۔

کوئی دن گر زندگانی آؤر ہے اپنے جی میں ہم نے ٹھانی آؤر ہے
آتش دوزخ میں یہ گرمی کہا سوزِ عنہاے نہانی آؤر ہے
بار بار کہی ہیں ان کی رنجشیں پر کچھ اب کے سرگرائی آؤر ہے
دے کے خط منہ دیکھتا ہے ظہر کچھ تو پیغامِ زبانی آؤر ہے
قاطعِ اعمار میں اکثر بخوٹم وہ بلائے آسمانی آؤر ہے
ہو چکیں غالب! بلائیں سب تمام ایک مرگِ ناگمانی آؤر ہے

۱۔ شرح : قاضی عبدالجلیل جوآن نے اس شعر کی شرح خود مرزا غالب سے پوچھی تھی۔ جواب میں فرماتے ہیں :

”اس میں کوئی اشکال نہیں، جو لفظ ہیں، وہی معنی ہیں۔ شاعر اپنا قصد کیوں بتائے کہ میں کیا کروں گا، بہم کہتا ہے، کچھ کروں گا خدا جانے شہر میں یا قراچ شہر میں تکیہ بنا کر فقیر ہو کر بیٹھ رہے یا وٹس چھوڑ کر پردیس چلا جائے۔“

مولانا طہطاہائی فرماتے ہیں :- ہندش کی خوبی اور مہادے کے لطیف نے اس شعر کو سنبھال لیا، ورنہ غالب سا شخص اس بات سے بے خبر نہیں ہے کہ جی کی بات جی میں رکھنا المعنی فی لہن الشاعر کہلاتا ہے۔ اس شعر سے بے سبق لینا چاہیے کہ ہندش کے حسن اور زبان کے مزے کے آگے اساتذہ صنعت معنی کو بھی گوارا کر لیتے ہیں۔“

میرے اعزاز کے مطابق مولانا نے کسی قدر زیادتی فرمائی کسی امر کو شعر میں قدرے مبہم رکھنے کا مطلب لازماً الحسن فی بطن الشاعر نہیں۔ بعض مقامات پر ابہام خواندے کے لیے بدرجہا زیادہ لطف کا باعث ہوتا ہے کیونکہ ہر فرد اپنے خاص حالات کے اعتبار سے شعر کو خاص معنی پر تفہیم لیتا ہے۔ اس طرح ایک شعر مختلف حالتوں پر حاوی ہو جانے سے زیادہ ہمواری و آفاقیت پیدا کر لیتا ہے، جیسا کہ میرزا نے خود فرمایا۔ شاعر نے اس وجہ سے اپنا قصد معین نہیں کیا کہ وہ چاہے فقیر بن جائے، چاہے پرویس چلا جائے چاہے کچھ اور کر گزرے۔

جو کچھ وہ کرنا چاہتا ہے، اس کے لیے فوری اقدام نہ کرنے کا طریقہ پہلے مصرع میں موجود ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر زندگی کے کچھ دن باقی ہیں تو ہم نے جی میں کچھ اور ٹھان رکھی ہے۔ اس سلسلے میں شارحین نے مختلف احتمالات پیدا کیے، مثلاً مرجا نہیں گئے، کسی اور سے محبت کر لیں گے یا محبت سے دست بردار ہو جائیں گے، لیکن مرزا نے ان احتمالات کی طرف خفیف سا بھی اشارہ نہیں کیا، کیونکہ ان میں سے کوئی بھی آداب محبت کے شایاں نہیں ۲۔ **شرح :** دوزخ کی آگ میں اس قدر گرمی کہاں ہو سکتی ہے، چھپے ہوئے عذوب کی جان بالکل جدا گانہ حیثیت رکھتی ہیں، یعنی دوزخ کی آگ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کہاں "استغمام انکار می ہے، گر یا سوال کیا، مگر مقصود نفی ہے۔

۳۔ **لغات :** سرگرائی : سر کا بھاری ہونا، مراد ہے رنجش خفگی۔

شرح : ہم ان کی رنجشیں بار بار دیکھ چکے ہیں اور محالاً عشق میں محبوب کی رنجشوں سے سابقہ پڑتا ہی رہتا ہے، مگر اس مرتبہ ان کی خفگی کا درجہ زیادہ بڑھا ہوا نظر آتا ہے۔

حقیقت زیادہ خفگی ہے یا نہیں، لیکن عاشق کو فوراً محبت میں اتھکاؤ

بے اعتنائی پر بھی اس قسم کے دھم پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

۴۔ **شرح :** میں نے محبوب کو ایک خط نامہ بر کے ساتھ بھیجا تھا۔ اس نے جواب لا کر دے دیا، لیکن میرا منہ تک رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ زبانی بھی کوئی پیغام دیا ہے۔

”ہم نے اپنے جی میں ٹھانی اور ہے“ کی طرح یہاں بھی مرزا نے زبانی پیغام کو مقتدر یا مبہم چھوڑ دیا، کیونکہ اسے معلوم کر لینے کے قویٰ قرینے شعر میں موجود ہیں۔ مثلاً وہ ایسا پیغام ہے، جو معرین تحریر میں لامتناہی سبب سمجھا گیا۔ ظاہر ہے کہ نامہ بر کو بھی ڈانٹا گیا ہوگا اور خط بھیجنے والے کی بھی خوب خبر لی گئی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ نامہ بر اسے دہرانے میں تاخیر کر رہا ہے۔

۵۔ **لغات :** قاطع : قطع کرنے والا، کاٹنے والا۔

اعمار : عمر کی جمع۔

شرح : اکثر ستارے عمروں کا رشتہ کاٹ دینے والے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ زمانہ ستاروں کی گردش کا نام ہے اور زمانے ہی گزرنے سے عمروں کا سلسلہ ختم ہو رہا ہے۔ اس طرح ستارے قاطع اعمار بن گئے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ درست ہے، لیکن وہ بلائے آسانی (محبوب) ان سب سے بڑھی ہوئی ہے۔ ستاروں کی گردش کا نتیجہ موت ہے کہ عمروں کے دن ختم ہو رہے ہیں آخر اسی طرح سب مرجائیں گے۔ مگر میرے محبوب نے ظلم و ستم سے زندگی بالکل ناقابل برداشت اور موت سے بدتر بنا رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ستاروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بیداگر ہے۔

۶۔ **شرح :** اے غالب ! ہمارے لیے جتنی باتیں اور مصیبتیں تھناؤ قدر کی طرف سے مقتدر تھیں، وہ چوری ہو چکیں، بظاہر اب کوئی باقی نہیں، البتہ موت باقی ہے، جو بہر حال ناگہان اور اچانک آنے کی کیونکہ وہ کبھی کسی کو بتا کر نہیں آتی۔

کوئی اُمید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی
 موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
 آگے آتی تھی حالِ دل پہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی
 جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد پر طبیعتِ ادھر نہیں آتی
 ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپٹیں درد نہ کیا بات کر نہیں آتی
 کیوں نہ چھوڑ کر یاد کرتے ہیں میری آواز گر نہیں آتی
 داغِ دل گر نظر نہیں آتا بُو بھی اُسے چارہ گر نہیں آتی
 ہم دہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی
 مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے پر نہیں آتی
 کبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ شرم تم کو مگر نہیں آتی

۱۔ لغات - بر آنا : پورا ہونا۔

شرح : میری کوئی اُمید پوری نہیں ہوتی اور کسی کے پورا ہونے کی صورت بھی نظر نہیں آتی۔ یعنی مایوسی اور نا اُمیدی کی آخری منزل ہے۔ نہ کوئی آرزو بر آتی ہے، نہ کوئی تدبیر بن پڑتی ہے، نہ کوئی ایسی صورت پیش نظر ہے کہ کبھی کوئی مدد پورا ہو جائے گا۔

۲۔ شرح : موت کا دن اور وقت مقرر ہے، اس میں رد و بدل اور پس و پیش ممکن نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ رات خدا نے سونے کے لیے بنائی ہے

و جعلنا نورا مكره سباتا

پھر کیا وجہ ہے کدوات بھرغیر نہیں آتی اور فردا دیر کے لیے بھی آنکھ نہیں جھپکتی ؟ کیا نیند بھی موت بن گئی ہے کہ معین وقت ہی پر آئے گی ؟

۳۔ شرح : پہلے یہ صورت تھی کہ دل کا حال دیکھ کر معنی آجاتی تھی۔ یعنی یہ کس طرح سکون و اطمینان سے بیٹھا ہو عشق کے چکروں میں پڑا اور کس نوبت کو پہنچ گیا۔ اب افسردگی و پژمردگی کا یہ عالم ہے کہ معنی بالکل نامید ہو گئی۔ کسی بات پر شگفتگی کا احساس ہی باقی نہ رہا۔
مولانا مہلباٹائی فرماتے ہیں :

یہ وہ شعر ہے کہ میر کو بھی جس پر رشک کرنا چاہیے۔ افسردگی
خاطر کو کس عنوان سے بیان کر دیا اور کیا خوب شرح کی ہے۔
۴۔ لغات۔ طاعت۔ عبادت

شرح : میں عبادت اور پرہیزگاری کے ثواب سے واقف ہوں،
لیکن کیا کروں، میری طبیعت اس طرف مائل نہیں ہوتی۔

مطلب یہ کہ بندگی اور پرہیزگاری کا ثواب جان لینا کافی نہیں، جب
تک خدا کی رحمت سے دل میں ان کے مطابق عمل کا جذبہ پیدا نہ ہو۔

۵۔ شرح : اس شعر کے پہلے مصرع میں پھر ابہام ہے۔ کہتے ہیں

کوئی ایسی بات پیش آگئی ہے کہ میں چپ بیٹھا ہوں اور لب بند کر رکھے ہیں
وہ نہ کیا یہ سمجھتے ہو کہ میں بات کر نہیں سکتا ؟

پہلے مصرع میں چپ رہنے کی مختلف مصلحتیں ہو سکتی ہیں اور ہر خواندہ
اسے اپنی حالت پر ڈھال سکتا ہے، مثلاً :

۱۔ میرے چپ رہنے میں خاص مصلحت ہے، جو ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔

۲۔ مجھے یہ خوف دامنگیر ہے کہ کچھ کہوں گا تو رازِ عشق فاش ہو جائے گا

اور میرے محبوب کی رسوائی ہو گی۔

۲۔ دل شکوہوں سے لبریز ہے، مٹھ کھٹے گا تو زبان پر شکایتیں آئیں گی اور ممکن ہے، شکایتوں پر محبوب غفا ہو جائے۔

۳۔ اگر شکایتیں بھی کیں تو ان سے محبوب کے دل پر کیا اثر ہوگا، لہذا پاس وضع کا تقاضا یہی ہے کہ چپ رہے۔

۵۔ ممکن ہے، میرے گئے شکوے غیروں کے لیے خوشی کا سامان بن جائیں اور مجھے یہ منظور نہیں۔

عزیز مختلف وجوہ ہو سکتے ہیں۔ مردانے اسے مبہم چھوڑ دیا اور شعر پڑھنے والے کے تخیل کے لیے پرواز کی گنجائش قائم رکھتی۔

۶۔ شرح : میں نالرو و مزایا کیوں نہ کروں ؟ اگر رُکن اور چُپ ہوتا ہوں تو محبوب کہتا ہے : کیا سبب ہے، اس کی آواز کان میں نہیں آتی ؟ کیا وہ مر گیا یا دیس چھوڑ کر پردیس چلا گیا ؟ میری مزایا اسے بھل معلوم ہوتی ہے لہذا میں برابر جھپٹا رہتا ہوں۔

۷۔ شرح : چارہ گر کے عقل و فہم پر حیران ہیں۔ مزاتے ہیں، کہ میں نے مانا، تجھے دل کا داغ نظر نہیں آیا، لیکن اس کی بُو تو سونگھی جاسکتی ہے۔ داغ کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ گوشت جلے اور اس کی بُو آ جائے۔ اندیشہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر داغ اتنا نمایاں نہیں، جسے بیک نظر دیکھا جا سکے تو کم از کم اس کی بُور سے تو چٹا لگایا جاسکتا ہے، لیکن یہ چارہ گر کیسا ہے ؟ داغ دیکھ سکتا ہے نہ بُور سونگھ سکتا ہے۔

۸۔ شرح : ہم عشق میں از خود رفتگی کے اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ ہمیں اپنے حال کی بھی کچھ خبر نہیں ملتی۔

یقیناً بخودی میں ایک مقام ایسا بھی آ جاتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو بھی بالکل بھول جائے۔ اس کا تجربہ ان لوگوں کو بار بار ہوا ہوگا، جو معاملات پر گہرے غور و فکر کے عادی ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کچھ مڑھتا ہوا

باہر نکل جاتا ہے اور خاصاً قاصد اس عالم میں طے کر جاتا ہے کہ اسے اپنی ذات یا گرد و پیش کا کچھ بھی خیال نہیں رہتا۔ ایسی ہی بخود مرزا پرطاری ہوئی جس میں وہ اپنے آپ کو کاملاً فراموش کر بیٹھے۔

۹۔ شرح : پہلا ”مرنا“ مجاز ہے یعنی مرنے کا انتہائی شوق ہے ، دوسرا ”مرنا“ حقیقت ہے ، یعنی موت کی آرزو انتہائی حد پر پہنچی ہوئی ہے عشق میں بہارا جو حال ہو چکا ہے ، اس کے پیش نظر ایک لمحے کے لیے جس جینا گوارا نہیں ، لیکن مصیبت یہ ہے کہ موت کے شوق میں مرے جانے کا وجود موت نہیں آتی۔ اس وجہ سے سخت کشمکش میں مبتلا ہیں۔ ایسی زندگی کو نہ زندگی کہہ سکتے ہیں ، نہ اپنے شوق کے مطابق مر سکتے ہیں۔

۱۰۔ شرح : اسے غالب ! تم نے ساری عمر براہیوں اور گناہوں میں گزاری ہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی تم سے کوئی نیکی نہ ہوئی۔ اب کیجیے جانے کے آرزو مند ہو، لیکن وہاں کیا مندے کر جاؤ گے ؟ کیا تمہیں اس حالت پر شرم نہیں آتی ؟

غالب ! ^۱ یا ^۲ میں بہادر شاہ ظفر نے سچ کا ارادہ کیا تھا اور اسی سلسلے میں میرزا غالب نے یہ آرزو ظاہر کی تھی :

غالب ! اگر اس سفر میں مجھے ساتھ لے لیں
سچ کا ثواب نذر کروں گا حصہ کی

وہیے بھی انہیں حرمین شریفین اور نجف اشرف جانے کی بڑی آرزو تھی۔ وہ خود کھنڈ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :

مقطع سلسلہ شوق نہیں ہے یہ شہر

حرم سیرِ نجف و طوب حرم ہے ہم کو

ساتھ ہی اس خیال نے پریشان کیا کہ پوری زندگی گناہوں کی زائے کے بعد خائفہ خدا میں جاتے ہوئے یقیناً شرم آئے گی۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟ آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟
ہم میں مشتاق اور وہ بیزار یا الٹی یہ ماجرا کیا ہے؟
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے؟
جب کہ تجھ پر نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ لے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ غمزہ و عشوہ دادا کیا ہے؟
ٹھکنِ دلفِ عنبریں کیوں ہیں؟ نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟
ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید جو نہیں جانتے، وفا کیا ہے؟
ہاں بھلا کر، تیرا بھلا ہوگا اور درویش کی صدا کیا ہے؟
جانِ تم پر نثار کرتا ہوں میں نہیں جانتا، دُعا کیا ہے؟
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب! مُفتِ ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے؟

۱۔ شرح : پہلے مصرع میں سوال کا مدعا استفہام نہیں، بلکہ اک گدھ

علامت ہے، یعنی اے دل! جو سوچ بچھ سے بالکل ماری ہو چکا ہے، تو نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے؟ عشق کے جس درد میں تو مبتلا ہے، بنا اس کی کوئی دوا بھی ہو سکتی ہے؟ عشق تو ہمیشہ سے لا دوا مانا گیا ہے۔

اس استفہام سے مختلف پہلو پیدا کرنا شعر کو بے معنی بنا دینے کے مترادف ہے۔ مثلاً یہ مضمون پیش کرنا کہ تجھے ہوا ہی کیا ہے، جس کا علاج کیا جائے؟

یا یہ کہنا کہ اے دل ! تو مرمن کو چھپا کیوں رہا ہے ؟ صاف صاف بتا دے کہ میں تیرے علاج کا انتظام کروں ۔

۲۔ شرح : خواجہ عالی فرماتے ہیں :
 ”گو یا ابھی عشق کے کوچے میں قدم رکھا اور معشوق و عاشق
 میں جو ناز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں ، ان سے ناواقف ہے ،
 اس لیے باوجود اپنے مشتاق ہونے کے (محبوب کے) بیزار
 ہونے پر تعجب کرتا ہے ۔“

مولانا غلامی فرماتے ہیں کہ مرزا نے دوسرا مصرع جس محاورے میں
 کہا ہے ، جو شخص اس کے محل استعمال کو نہ جانتا ہوگا ، اس کی نظر میں شعر
 سست اور مصرعے بے ربط ہوں گے ۔

”محل استعمال اس کا یہ ہے کہ جب کسی کے پھیکے غزروں پر
 استہزاء یا تشنیع یا اظہار لغزت مقصود ہوتا ہے ، جب اس طرح
 کہتے ہیں اور اس مناسبت سے مصنف نے مصرع لگا یا اور
 معشوق پر استہزاء کیا ہے ۔“

بظاہر صحیح معلوم وہی ہے ، جو خواجہ عالی نے پیش کیا ۔ یعنی ابتدائے عشق
 ہے اور ابھی یہ معلوم نہیں کہ محبوب عموماً اظہار نیاز پر از روئے ناز الیہ طریقہ
 اختیار کر لیتے ہیں ، جس سے عاشق بیزاری کا اثر قبول کرے ۔ کبھی معمولی
 بات پر روٹ جاتے ہیں ۔ مقصود یہ ہوتا ہے کہ جانچیں اور پرکھیں ، عاشق کے
 دل میں کتنی لگن ہے ، لہذا ناخبرہ کاری کے باعث عاشق کو تعجب ہوتا
 ہے کہ ہم تو محبوب پر جان دیتے ہیں اور ہمارے شوق کی حد و نہایت ہی
 نہیں ، لیکن محبوب کی روش ایسی ہے ، جیسے ہم سے بالکل بیزار ہو ۔ خدا
 جانے ، یہ کیا معاملہ ہے ! اس پر اظہار استعجاب کیا ہے ۔

۳۔ شرح : ”بھی“ سے ظاہر ہوتا ہے کہ محبوب غیروں سے حال

پوچھ رہا ہے اور مرزا کی طرف متوجہ نہیں۔ فرماتے ہیں۔ میں بے زبان نہیں کہ آپ مجھ سے کچھ پوچھنا نہیں چاہتے۔ عینوں کی طرح میرے بھی منہ میں زبان ہے۔ میرا دل بھی تمناؤں اور ارمانوں سے لبریز ہے۔ کاش! مجھ سے بھی پوچھیکہ تو کیا چاہتا ہے۔

۴۔ ۷۔ شرح : اے خدا! جب تیرے سوا حقیقتہً کوئی موجود

ہیں تو ارد گرد جو ہنگامہ بپا نظر آتا ہے، آخر یہ کیا ہے ؟

کہیں حسین اور دل بھالینے والے محبوب موجود ہیں۔ پھر ان کے غمزدہ تازہ، عشوے انداز میں، جنہیں دیکھ کر انسان بے اختیار مزلفیتہ ہو جاتا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کچھ کیا ہے ؟

پھر مجہولوں کی سیاہ اور غیر بھری زلیخاں اور ان کی سرمئی آنکھوں کی نظریں ان سب کو کیا سمجھیں اور ان کی دلربائی و دلفریبی سے کیونکر بچیں ؟
یہ سبزہ دگل، ہمارے یہ پر لطف منظر، بادلوں کا چھامانا، نہایت خوشگوار ہواؤں کا چلنا، یہ سب کچھ کیا ہے ؟

دنیا میں یہ گونا گوں ہنگامے اتنے دلکش ہیں کہ انسان ان میں الجھنے سے

باز نہیں رہ سکتا۔ بیشک اے خدا! حقیقی وجود صرف تیرا ہے اور ہمیں تیرے سوا کسی سے وابستگی نہ ہونی چاہیے۔ صرف تیری ہی لگن ہمارے دل میں ہونی چاہیے۔ تاہم تو نے ہی دنیا میں ایسی بے شمار چیزیں پیدا کر دی ہیں، جو دلوں کو بے اختیار اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں کہ بقول مولانا علی ہادی سراب کی محویت میں دریا کی طلب سے ہاتھ دھوئے بیٹھے ہیں۔

۸۔ شرح : ہماری سادہ لوحی اور نادانی ملاحظہ فرمائیے کہ ان

مجہولوں سے وفا کی امید لگائے بیٹھے ہیں، جو جانتے ہی نہیں کہ وفا کیا چیز ہوتی ہے۔

۹۔ شرح : دو میٹوں کی صدا اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ ان

بھلا کر، تیرا بھلا ہو گا۔

کتنا سادہ، سلیس اور مؤثر شعر ہے اور حقیقت بیان کی گئی ہے، یہ میں عالم انسانیت کی بہت بڑی سچائیوں میں سے ایک سچائی ہے۔ جو لوگ اسے قفسِ دل کی بنا پر محبوبوں کی طرف لے جاتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ وہ خواہ مخواہ تا مسابقت کے مرتکب ہوتے ہیں۔

۱۰۔ شرح : مجھے معلوم نہیں کہ دعا کسے کہتے ہیں، البتہ اسے محبوب، اہم پر جان قربان کر دینے کے لیے برحق اور سہر لحظہ آمادہ ہوں۔

دعا کا مقصد کیا ہوتا ہے ؟ کہ جس کے لیے دعا کی جائے کہ وہ بہتر سے بہتر حالت میں رہے۔ جو شخص دوسرے پر جان دے دینے کے لیے آمادہ ہو، کون سی دعا ہے۔ جو اس میں شامل نہ ہوگی ؟ کوئی دعا جان نثاری سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی۔ یہی حقیقت مرزا غالب نے اس شعر میں پیش کی ہے۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ دعا غوغاوار الفاظ کا ایک مجموعہ ہوتی ہے جس میں زیادہ سے زیادہ نیک اور خیرِ طلب آرزوؤں کا اظہار کیا جاتا ہے۔ تاہم وہ صرف الفاظ ہوتے ہیں اور مرزا محبوب کے لیے جان دے دینے پر آمادہ ہیں، محض اچھے الفاظ کو دینے پر وہ قناعت کے لیے تیار نہیں۔

۱۱۔ شرح : میں تسلیم کیے لیتا ہوں کہ غالب کی حیثیت کچھ نہیں، تاہم اسے محبوب ! ایک غلامِ مفت آپ کو مل رہا ہے، پھر اسے لے لینے میں مضائقہ کیوں ہو ؟

لطیف کا پہلو یہ ہے کہ بغا ہر اپنے آپ کو مفت محبوب کے حوالے کر رہے ہیں، لیکن عاشق کے لیے اس قبول سے بلند تر مقام اور کیا ہو سکتا ہے ؟

کہتے تو ہوتے سب کہ بُتِ غالبیہ مو آئے
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ تو آئے

۱۔ لغات - غالبیہ :
ایک مرتبہ خوشبو جو ٹنگ

جنہر وغیرہ خوشبویں
 طاکرتیاد کرتے ہیں
 خالیہ خوشبو سے مراد
 ہے ایسا محبوب ،
 جس کی زلفیں اس
 مرتب خوشبو میں ہی
 ہوتی ہوں ۔

شرح :
 اس غزل کے دوسرے
 شعر سے معلوم ہوتا
 ہے کہ آخری وقت
 ہے ۔ نزع کی حالت
 طاری ہے ۔ عاشق
 کو محبوب کا انتظار
 ہے ۔ اسے تسلی دینے
 کے لیے دوست احباب
 کڑے ہیں کہ وہ
 آنے ' وہ آئے ۔
 لیکن عاشق نے ان
 کے چہروں سے
 اندازہ کر لیا کہ محبوب
 کی آمد کوئی معمولی
 چیز نہیں ۔ بادشاہ ہوا

ہوں کشکش نزع میں ، ہاں ، جذب محبت
 کچھ کہ نہ سکوں ، پر وہ میرے پوچھنے کو آئے
 ہے صاعقہ و شعلہ و سیلاب کا عالم
 آنا ہی سمجھ میں ہری آتا نہیں ، گو آئے
 ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں کے نکیرین ؟
 ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے
 جلاؤ سے ڈرتے ہیں ، نہ واعظ سے بھگڑتے
 ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے ، جس بھیس میں جو اس
 ہاں ، اہل طلب ! کون مٹے طعنہ تا یا منت
 دیکھا کہ وہ بلتا نہیں ، اپنے ہی کو کھو آئے
 اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
 اُس درد پر نہیں بار تو کبھے ہی کو ہو آئے
 کی صم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر
 اچھے رہے آپ اس سے ، مگر عجب کو ڈبو آئے
 اس انجن ناز کی کیا بات ہے ، غالب !
 ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

سے بھی بڑھ کر رعب و اب اور ہیبت کی چیز ہے۔ اگر واقعی وہ آ رہا ہو تو دیکھنے والوں کے چہروں پر گھبراہٹ نہ ظاہری ہو جائے، اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ آئے، وہ آئے کہنے سے کیا تسلی ہو سکتی ہے؟ گھبرا کے کہو کہ وہ آئے یعنی محبوب کی واقعی آمد کی خبر وہ ہو سکتی ہے، جب سب پر گھبراہٹ ظاہری ہو۔

۲۔ شرح : میں جان کنی کی کشمکش میں ہوں۔ اسے محبت کی کشش ! محبوب کو کھینچ۔ جانتا ہوں کہ میں بول نہ سکوں گا مجھ سے کچھ کہنا نہ جانتے گا، مگر اتنا تو ہو کہ وہ میرا حال پوچھ لے۔

۳۔ لغات - صاعقہ : گرنے والی بھل۔

شرح : اس شعر میں آنے کی دو مختلف تعبیریں ہو سکتی ہیں۔ اول دنیا میں انسان کی آمد، دوم محبوب کی آمد۔ قرینہ دوسری تعبیر کا موافق ہے، لیکن پہلی تعبیر بھی بے لگت درست مانی جا سکتی ہے۔

پہلی تعبیر کے مطابق مطلب یہ ہوا کہ انسان اس دنیا میں آتا ہے تو اس کی زندگی گرنے والی بھلی یا شعلے کی تپش اور پارے کی تڑپ کی طرح ہوتی ہے، یعنی دیکھا ایک آتا ہے، جتنی مدت یہاں گزارتا ہے، اسے قرار نصیب نہیں ہوتا اور رخصت ہو جاتا ہے۔ ہم نے مانا کہ ہم یہاں دنیا میں آئے، لیکن یہ آنا ہی سمجھ میں نہیں آتا کہ اکثر اتنی تھوڑی مدت کے لیے کیوں آئے اور جتنی بھی مدت تھی، وہ کس لیے بتیابی و بے قراری میں صرف ہوتی ہے۔

دوسری تعبیر کے مطابق معنوم یہ ہوا کہ محبوب نے نوازش تو فرمائی یعنی آ تو گیا، مگر کس رنگ میں جیسے بھلی گری، شعلہ چمکا، پارا توڑا اور وہ چلا گیا۔ لمحہ بھر کے لیے بھی نہ ٹھہرا۔ میں نے تسلیم کر لیا کہ محبوب آیا، مگر سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کیا آیا، کیوں آیا، اس آنے سے کیا حاصل تھا؟ ایسے لطف و کرم سے عاشق کے لیے تسکین کا کیا سامان ہم پہنچ سکتا تھا؟

۴۔ لغات - نکیرین : وہ دھڑکتے ہوئے سے جس میں متانہ رنگ

کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک کو منکر اور دوسرے کو نکیر کہتے ہیں۔
 بادۂ دوشینہ : گزشتہ شب کی پی ہوئی شراب۔

مشرح : خواجہ عاتق فرماتے ہیں :

- بادۂ دوشینہ یعنی رات کی پی ہوئی شراب، جو مرنے سے پہلے پی جاتی
 محض ازراہ شوخی کے کہتا ہے کہ نکیرین کے سوال و جواب سے
 بچنے کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں کہ شراب پی کر مرے تاکہ نکیرین
 اس کی ٹوکراہت سے بغیر سوال جواب کیے چلے جائیں۔

مرزا کو شراب کی ٹوکراہت کے گھبرا کر بھاگ جانے کا اتنا یقین ہے کہ
 ایک مسلم حقیقت کی بنا پر پوچھتے ہیں، ظاہر ہے کہ نکیرین گھبرا کے نہ بھاگیں گے؟
 البتہ شرط یہ ہے کہ شب گزشتہ کی پی ہوئی شراب کی ٹوکراہت سے آئے۔

دیکھیے، نکیرین کے سوال و جواب کا معاملہ ماورائے محسوسات ہے اور
 انسانی عقل و فہم محسوسات پر مبنی ہے۔ یہ معاملہ محسوسات کا نہیں، لیکن مرزا
 پورے معاملے کو محسوسات کے عالم میں لے آئے ہیں۔ جس طرح عام شراب نہ
 پینے والوں کو اس کی ٹوکراہت ہوتی ہے، اسی طرح مرزا فرض کیے بیٹھے
 ہیں کہ فرشتوں کو تقدس و پاکیزگی کی بنا پر بہت زیادہ کراہت ہوگی۔ اگر شراب پی
 کر مرے تو سانس کی آمد و رفت ختم ہو جانے کے باوجود منہ سے مزید بواہے گی
 اور فرشتے سراپا روح ہونے کے باعث اُس کی تاب نہ لاسکیں گے۔ یوں
 سوال و جواب کی منزل بہ خیر و عافیت گزر جائے گی۔

۵۔ - مشرح : خواجہ عاتق فرماتے ہیں ،

اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ رنج اور تکلیف سب خدا کی طرف سے ہے۔

مطلب یہ، ہم جسے بھی دیکھتے ہیں، اسے محبوب سیاقی ابھی جانتے ہیں کہ تو
 ہے۔ جلد قتل کے لیے آتا ہے، ہم اس سے بالکل نہیں ڈرتے، کیونکہ اس کے
 پس پردہ تو کار فرما ہے۔ ہر کچھ بہ تیری رضا اور تیرے حکم سے ہوتا ہے۔ اس

سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے ؟ وہ تو عین ہمارا مقصود ہے ۔ اسی طرح واعظ کچھ بھی کہے ، ہم اس سے جھگڑنے کے روادار نہیں اور کیوں جھگڑیں ؟ اس کے وعظ و نصیحت کا سر حشر بھی ٹو ہے ، گویا تو ہی اس کے اندر سے بول رہا ہے پھر بدلے لیے جھگڑنے کا کون سا مقام ہے ؟

سادہ لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ ایک وجود حقیقی کو بان لینے سے تمام ظاہری امتیازات مٹ گئے اور کوئی وجود کوئی بھیس بدل کر آئے ، ہمارے نزدیک تیرے سوا کوئی نہیں ۔

۶۔ لغات ۔ نایافت : نہ پانا ، حاصل نہ کر سنا ۔

شرح : اے حقیقت کے طلبگارو ! ہم میں اتنی تاب کہاں کہ دوسروں کا طعنہ نہیں ، اس نے حقیقت کو ڈھونڈا اور نہ پایا ۔ جب ہم پروا منج ہو گیا کہ حقیقت ہمیں نہیں ملتی تو تلاش میں اپنے آپ ہی کو فنا دیا ۔

مطلب یہ کہ ہمارے سامنے صرف دو صورتیں ہیں ، مطلوب کو پالینا یا اپنے آپ کو فنا کروینا ، تیسری صورت ہمارے نزدیک کوئی وجود نہیں رکھتی ۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ مطلوب کو ڈھونڈیں ، نہ پائیں ، زندہ رہیں اور لوگوں کے گلے نہیں کہ دیکھو ، اس نے بہت تلاش کی ، لیکن مطلوب تک نہ پہنچ سکا ۔

۷۔ شرح : ہمارا یہ دستور نہیں کہ کہیں آرام سے بیٹھ جائیں ۔ ہم محبوب حقیقی کے دروازے پر پہنچے ۔ جب دیکھا ، وہاں بار نہیں ملتا تو کعبے چلے گئے کہ محبوب کی بارگاہ میں حاضری کا موقع نہیں تو چلو اسی مقدس مقام کی زیارت کر آئیں ، جسے محبوب کا گھر سمجھا جاتا ہے ، یعنی بیت اللہ ۔

اس سلسلے میں دو باتیں قابلِ غور ہیں ، اول اس حقیقت کا اعلان کہ بیت اللہ دراصل عبادت باری تعالیٰ کا ایک ظاہری نشان ہے ۔ اس کا تقدس ذاتِ باری تعالیٰ سے نسبت اور نشانِ عبادت کی حیثیت میں ہے ۔

دوم اپنی تنگ و قداس دائرے سے باہر نہیں ہونے دی، جو مقرر کر دیا گیا، یعنی اصل آرڈو محبوب حقیقی کے حضور میں باریاب ہونے کی ہے۔ اسی کے لیے ٹرپ رہے ہیں۔ لیکن جب تک وہ نصیب نہ ہو، کعبہ کی زیارت میں بھی تاقل نہیں، کیونکہ کعبہ غایت باری تعالیٰ سے خاص نسبت رکھتا ہے۔

۸۔ شرح : دوستوں اور ہم نشینوں نے میری آہ و زاری کے بارے میں محبوب کے پاس نہایت پر تاثیر تقریر کی۔ بہت کہا کہ عاشق درمائدہ کو اس حالت میں رکھنا مناسب نہیں۔ بہر وقت دوتا ہے، بہر لحظہ فریاد کرتا ہے۔ اس پر دم کیجیے لیکن محبوب پر کچھ اثر نہ ہوا اور یوں میری جور ہی سہی حیثیت تھی، وہ بھی ختم ہو گئی۔ مگر عجیب کو ڈبو آئے "کی دو تعبیریں ہو سکتی ہیں اول وہی جو پیش کی جا چکی یعنی محبوب پر کچھ اثر نہ ہوا، دوم یہ کہ اب تک میں خودداری پر قائم تھا اور کبھی محبوب پر کوئی بات ظاہر نہ ہونے دی۔ دوستوں نے جو تقریریں زماں، اس کے نتیجہ کیا نکلا؟ اثر تو ہو ہی نہیں سکتا تھا مگر میری خودداری کا بیڑا بھی غرق کر دیا۔

۹۔ شرح : دوست کہتے ہیں "اے غائب! محبوب کی بزم ناز کی صحیح کیفیت کون پیش کر سکتا ہے؟ وہ ایسی بزم ہے، جس کا پورا نقشہ بیان میں آ ہی نہیں سکتا۔ ہم بھی گئے تھے اور تیری تقدیر کو رو کر کوٹ آئے۔"

تقدیر کو رونے کے دو مفہوم ہیں، اول یہ کہ اس بزم ناز میں تجھے بار میسر نہیں اور حق یہ ہے کہ جسے بار میسر نہ ہو، سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی قسمت بھوٹ گئی اور ایسی سیاہ نصیبی پر بے اختیار دونا آتا ہے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے بزم ناز سے تیری قدوری کا حال محبوب سے کہ دیا۔ گویا تیری کم نصیبی کا ذکر نہایت دردناک الفاظ میں کر دیا۔ تقدیر کو رونے کا مفہوم ہی یہ ہے کہ کسی کی کم نصیبی کی شکایت کی جائے۔

پھر کچھ اک دل کو بقراری ہے سینہ جو یا سے زخم کاری ہے
 پھر جگر کھودنے لگا ناخن آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
 قبلہ مقصدِ نگاہِ نیاز پھر وہی پرودہِ عماری ہے
 چشم، دلالِ جنسِ رسوائی دل، خریدارِ فودقِ خواری ہے
 وہی صد رنگِ نالہ فرسائی وہی صد گونہ اشکباری ہے
 دل، ہوائے خمِ ناز سے پھر محشرِ ستانِ بقراری ہے
 جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے روزِ بازاریِ جانِ پاری ہے
 پھر اُسی بیوفا پہ مرتے ہیں پھر وہی زندگیِ مہاری ہے
 پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز گرم بازارِ فوجدارِی ہے
 ہو رہا ہے جہان میں اندھیر زلف کی پھر سرشتہ داری ہے
 پھر دیا پارہ جگر نے سوال ایک فریادِ آہ و زاری ہے
 پھر بوئے میں گواہِ عشقِ طلب اشکِ باری کا حکم جاری ہے
 دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا آج پھر اُس کی رو بکاری ہے
 بے خودی بے سبب نہیں غالب! کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

۱۔ شرح : پھر دل جلوہ حسن کے لیے بقرار ہو رہا ہے اور سینے کو
 پھر کاری زخم کھانے کی تڑپ ہے، گویا میں پھر کسی کی نگاہِ ناز کا ہدف

بگنے کے لیے مضطرب ہوں۔

۲۔ **شرح :** پھر بہار کی آمد آ رہی ہے۔ لالہ کاری کا سرو سامان چورہ ہے۔ میرے ناخن کبھی جگر کرید کرید کر زخم تازہ کر رہے ہیں، گویا لالہ کاری کا جواب دینا کیا جا رہا ہے۔

۳۔ **لغات :** عماری : ہاتھی کے ہودے کو بھی کہتے ہیں اور اونٹ کے محل کو بھی، جس میں سواریاں بیٹھتی ہیں۔ خصوصاً عورتیں۔ یہاں آخری معنی مراد ہیں۔

شرح : پھر وہی محل میری لگاؤ نیاز کا اصل مقصد بن گیا ہے جس میں محبوب پروردہ نشیں ہے۔

یہاں قبلہ کا لفظ اس بنا پر استعمال کیا کہ عماری کے پردے کو پردہ کعبہ قرار دے لیا۔

۴، ۵۔ **شرح :** پھر عماری آنکھ نے جس رسوائی کی دلال شروع کر دی ہے۔ پھر بہار اول وقت و خواہی کی لذت کا خریدار ہے۔ چنانچہ دل سیکڑوں طریقوں پر فریاد و فغاں کر رہا ہے، جیسے پہلے کرتا تھا اور آنکھ بھی پہلے کی مانند سوسو طرح آنسو بہا رہی ہے۔

آنکھ کے آنسو بہانے اور دل کے فریاد و فغاں کرنے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ رازِ عشق کھل جائے اور میرے لیے وقت و رسوائی کا سامان ہم پہنچے۔

۶۔ **شرح :** پھر دل کو محبوب کے خرام ناز کی آرزو ہے اور اس کے لیے وہ بیقراری کا محشرستان بنا ہوا ہے۔ اتنا بیقرار ہے، گویا سیکڑوں قیامتیں ہر ایک وقت بپا ہو رہی ہیں۔

محبوب کی مجال کو عموماً قیامت بپا ہونے سے تعبیر کرتے ہیں۔ مرزا نے بھی اس شعر میں یہی حقیقت پیش نظر رکھی ہے۔

۷۔ لغات - روزِ بازار : جس زمانے میں مرکزی مقامات سے ضرورت کی چیزیں لانے کے جانے کی سہولتیں نہ تھیں، مختلف مقامات پر بچتے ہیں ایک یا دو مرتبہ بازار گنگ جاتے تھے اور اس پاس کے لوگ اشیائے ضرورت وہاں سے خرید لیتے تھے۔ ان بازاروں کے لیے پہلے سے دن مقرر ہوتے تھے۔ یہی مقرر دن روزِ بازار کہلاتے تھے۔ اس سے مراد ہے گرمی بازار یعنی خرید و فروخت کی کثرت۔

شرح : حسن نے پھر عشوہ و نماز کی غنائش شروع کر دی ہے۔ گویا سمجھ لینا چاہیے، چائیں بچھاؤ کر دینے کا خاص موسم آگیا اور اس کی گرمی بازار شروع ہو گئی۔

مطلب یہ کہ محبوب کے عشوہ و نماز کی خریداری کے لیے سب جانیں دے دینے پر آمادہ ہیں۔

۸۔ شرح : ہم پھر اسی محبوب پر جان دے رہے ہیں جس نے ہم سے کہیں وفانہ کی۔ دوسرے صہرے کے دو مہنوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم نے زندگی کے وہی طریقے اختیار کر لیے ہیں، جو پہلے تھے، دوسرا یہ کہ وہی محبوب پھر ہماری زندگی کا سہارا بن گیا ہے، یعنی اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں۔

بخت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا

اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں، جس کا فریاد نہ بھلے

۹-۱۳۔ شرح : پھر ناز کی عدالت کا دروازہ کھل گیا اور فوجداری کے مقتدرے پر کثرت ہونے لگے۔ دنیا میں اندھیر شروع ہو گیا اور نعلِ محبوب نے پھر سرشتِ داری کا منصب سنبھال لیا۔

زلف کے ساتھ اندھیر، سر اور رشتہ کی مناسبت محتاج بیان نہیں۔

بگر کے ٹکڑے نے پھر نالاش دائر کر دی۔ آہ و زاری اور فریاد کا ہنگامہ

بپا ہے۔

دوسرے معرغ میں لفظ - ایک - نہ عدد کے لیے ہے، نہ تنکیر کے لیے، بلکہ
عمل استعمال کے اعتبار سے کثرت کے معنی دیتا ہے۔
عشق کے گواہ پھر طلب کیے گئے ہیں تاکہ ان سے بیان لیے جائیں۔ بہر طور
آنسو بہ رہے ہیں، حتیٰ کہ گواہ بھی مستثنیٰ ہیں۔

عاشق کے دل اور محبوب کی ملکوں کے درمیان جو مقدمہ چل رہا تھا، آج پھر
اس کی پیشی ہے۔ گویا یہ سارا جنگامہ اس پیشی کے سلسلے میں بپا ہوا۔

۱۴۔ شرح : اسے غالب : تم کسی سبب کے بغیر بخود نہیں ہو۔ ہم
نے سمجھ لیا کہ کچھ نہ کچھ چھپانے اور راز میں رکھنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا
گیا ہے۔ گویا تم بخود بن کر عشق کا بھید چھپانا چاہتے ہو۔

۱۔ لغات:

جنوں تہمت کش تکیں نہ ہو، اگر شادمانی کی
نمک پاش خراشِ دل ہے لذتِ زندگانی کی
کشا کش ہائے مستی سے کرے کیا سعی آزادی
لگائی جائے۔

نمک پاش : نمک

چھڑکنے والا۔

خراش : زخم

شرح :

اگر مجھے تھوڑی دیر کے

لیے خوشی کرتا ہوا پاؤ تو اس سے جیڑی پر آرام و سکون کی تہمت نہ لگنی چاہیے۔
میں جو عارضی خوشی کرتا ہوں، اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آنے والی تکلیف زیادہ
سے زیادہ محسوس ہو، کیونکہ خوشی کے بعد رنج و غم طبعاً زیادہ تکلیف دہ ہوتا

ہے۔ گویا زندگی میں تھوڑی سی لذت محسوس کرنا زخمِ دل پر نمک چھڑکنا ہے تاکہ درد اور بڑھ جائے۔ یہ آرام و سکون کی کوشش نہیں، بلکہ احساسِ رنج کو بڑھانے کی کوشش ہے۔

مولانا طہطاہی کے قول کے مطابق دوسرے مصرع کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان تمام مصیبتوں، پریشانیوں اور تکلیفوں میں ہمارا ذندہ رہنا ہی زخمِ دل پر نمک چھڑکنے کے لیے کافی ہے۔

۲۔ لغات - کشاکش : کھینچ تان، کشاکش۔

مشریح : زندگی کی کھینچ تان اور کشاکش سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کیونکر کامیاب ہو سکتی ہے ؟ دیکھیے، آپ کے سامنے ہر کی مثال ہے، اسے دواں ہونے کا جو موقع ملا، وہی اس کے لیے ایک ذخیرہ بن گیا۔ یعنی اس نے زندگی کی کشاکش سے نکل جانے کی کوشش کی، لیکن وہ کوشش اسے مزید جکڑ لینے کا موجب بن گئی۔

دوا یا سمندر میں لہروں کو دیکھا جائے تو ان کی شکل نہ بخیر سے بالکل بدلتی جلتی نظر آئے گی۔ وہ دواں تو اس لیے ہوئیں کہ زندگی کی الجھنوں سے نجات پالیں، مگر وہی دواں ان کے لیے ذخیرہ بن گئی۔

۳۔ شرح : دیوانہ مرچکا، قبر میں دفن ہو چکا، بلکہ قبر بختہ بھی کر دی گئی، لیکن لڑکے اب تک وہاں پہنچ رہے ہیں اور اسی طرح اینٹ پتھر برسا رہے ہیں، جس طرح دیوانے کی زندگی میں برسا رہے تھے پتھر بختہ قبر پر لگتے ہیں تو رگڑ سے شرابے پیدا ہوتے ہیں۔ دیوانہ یہ سمجھتا ہے کہ یوں اس کی قبر پر پھول چڑھائے جا رہے ہیں۔ اسی اعتبار سے قبر کو زیارت گاہ قرار دیا، نشانہ نہیں بنایا۔

۱۔ لغات :

نکوہش : لغات
سرد زقش۔

خندہ دندان نما :

وہ ہنسی جس میں
دانت نمایاں ہو جائیں

یہ ہنسی طنز و تشکیک
کے لیے استعمال

ہوتی ہے۔

شرح :

جو عاشق محبوب کے

ظلم و ستم کی فریاد

کرے وہ یقیناً نشتر لگ

و لگات کا سزاوار

ہے۔ کچھ دور نہیں

کہ حشر کے دن کی صبح اس کے لیے خندہ دندان نما بن جائے، یعنی اس کی ہنسی

اڑائے، حالانکہ حشر کا دن حق و انصاف کا دن ہے۔ اگر اُس جو ٹٹے عاشق نے

محبوب کے ظلم و جور برداشت کر لیے ہوتے اور فریاد نہ کرتا تو اسے اجر ملتا۔

۲۔ لغات : ریشگی : ریشے کی خاصیت، یعنی آگن، بڑھنا،

پھولنا، پھلنا۔

شرح :

اگر کسان اُس صحرا میں جہاں مجنوں نے زندگی گزاری اور

وہیں مرٹ کر خاک ہو گیا، دانے کی جگہ نشتر کی نوک ہو دے تو اس صحرا کی خاک

نوک نشتر سے میل کی رگ اُگائے اور اسے پھولنے پھلنے کی قوت دے دے۔

نکوہش ہے سزا، فریاد ہی بیداد دلبر کی

مبادا، خندہ دندان نما ہو صبح محشر کی

رگ میل کو خاک دشت مجنوں ریشگی بجھے

اگر ہو دے بجائے دانہ و ہتھکا، نوک نشتر کی

پر پروانہ شاید باد بان کشتی سے تھا

ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دور ساغر کی

کروں بیداد ذوق پر فغانی عرض، کیا قدرت

کہ طاقت اُڑ گئی اُڑنے سے پہلے میرے شہر کی

کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے چیمچے قیامت کے

مری قسمت میں یا رب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

کہ حشر کے دن کی صبح اس کے لیے خندہ دندان نما بن جائے، یعنی اس کی ہنسی

اڑائے، حالانکہ حشر کا دن حق و انصاف کا دن ہے۔ اگر اُس جو ٹٹے عاشق نے

محبوب کے ظلم و جور برداشت کر لیے ہوتے اور فریاد نہ کرتا تو اسے اجر ملتا۔

۲۔ لغات : ریشگی : ریشے کی خاصیت، یعنی آگن، بڑھنا،

پھولنا، پھلنا۔

شرح :

اگر کسان اُس صحرا میں جہاں مجنوں نے زندگی گزاری اور

وہیں مرٹ کر خاک ہو گیا، دانے کی جگہ نشتر کی نوک ہو دے تو اس صحرا کی خاک

نوک نشتر سے میل کی رگ اُگائے اور اسے پھولنے پھلنے کی قوت دے دے۔

اس شعر میں بظاہر عشق و حسن اور عاشق و محبوب کا اتحاد ثابت کیا ہے اور اشارہ اس قصے کی طرف ہے کہ ایک مرتبہ میل کی فصد لی گئی تھی، تو دوست مجبوز کی رگ سے خون جاری ہو گیا تھا۔ اسی پر کسی نے کہا تھا:

لوائی فصد میلی نے رگ مجبوز سے خون آیا

محبت کے لیے لازم ہے اعطایہ اثر ہونا

۳۔ شرح: مجلس گرم ہوئی، جس کے لیے شمع کا جلتا لازم تھا۔ شمع جلی تو پروانے آئے۔ جام شراب کا دور شروع ہو گیا۔ کشتی سے چلنے لگی۔ شاید پروانے کا پتہ اُس کشتی کے لیے بادبان بن گیا۔

شعر کا مضمون یہی ہے، باقی مرزا نے لفظوں کا ایک عجیب و غریب طلسم باندھنے کی کوشش کی ہے، جس میں کوئی حسن نظر نہیں آتا۔ شراب کی کشتی وہ ہوتی ہے، جس میں شراب کی بوتلیں رکھ کر حوض کے اندر چلا دیتے ہیں تاکہ ارد گرد بیٹھے ہوئے تمام میکشوں تک شراب پہنچ جائے۔ کشتی کے لیے بادبان کا ہونا ضروری ہے اور مرزا نے کشتی کے لیے پروانے کا پر کشا کیا۔ مجلس کی گرمی کا ایک لازمی جزو شمع ہے۔ شمع پر پروانوں کا آنا لازم ہے اس طرح مختلف چیزیں جوڑ کر ایک منظر پیدا کر دیا ہے۔

۴۔ لغات - پرفشانی: پتہ پھڑ پھڑانا، اس کے معنی تپوں کا

گر جانا بھی ہیں۔

شرح: پتہ پھڑ پھڑانے کا جو ذوق و شوق ہے، اس کا عظم و جہر بیان کرنے کی قدرت مجھ میں کہاں ہے؟ کوئٹہ اڑنے سے پہلے ہی میرے شہر کی قوت رخصت ہو گئی، یعنی میں ایک معمولی نسبت بھی نہیں کر سکتا۔ دل میں اڑنے کا ذوق یقیناً بے حد ہے۔ لیکن وہ ذوق ساتھ نہیں دیتا اور میں بے بس ہوں، یہی اس کا عظم ہے۔

کسی شے کا ذوق و شوق ہو، مگر طاقت و استطاعت ساتھ نہ دے تو،

صاحبِ فوق کی تکلیف و مصیبت محتاجِ بیان نہیں رہتی۔

۵۔ شرح : میں خیمہِ محبوب کے پچھواڑے میں کب تک رہتا ہوں؟
اسے خدا! کیا میری قسمت میں پتھر کی دیوار نہ تھی کہ اس سے سر پھوڑ لیتا اور
جھگڑا ختم ہو جاتا۔ اب خیمے سے کیونکر سر پھوڑوں؟ وہ تو کپڑے کا ہے۔
مصیبت یہ ہے کہ خیمے کے نیچے کھڑے رو رہے ہیں۔ سامنے ہوتے
تو کم از کم محبوب کے دیدار سے مزور فیضِ یاب ہو جاتے۔

۱۔ لغات:

سبک :

ہلکا۔ بے وقعت۔

شرح :

ہم مختلف مسائل

میں مدد سے تجاوز

کرتے رہے۔ اعتدال

کا کوئی خیال نہ رکھا

نتیجہ یہ نکلا کہ سب

میں بے وقعت ہو

گئے اور ہمارا وقار

کھو گیا۔ دوسرے

لفظوں میں کہہ سکتے

ہیں کہ جتنے آگے

بڑھے تھے، ایسی

بے اعتدالی کے باعث

بے اعتدالیوں سے بگ سب میں ہم ہوئے

جتنے زیادہ ہو گئے، اُتنے ہی کم ہوئے

پہناں تھا دامِ سختِ قریبِ آشیان کے

اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے

یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

سختی کشانِ عشق کی پوچھے بے کیا خبر

وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

نیری وفا سے کیا ہوتا فانی؟ کہ دہریں

تیرے سوا بھی ہم چ بہت سے ستم ہوئے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خورشچکاں
 ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
 اشد رے تیری تندہیِ خو، جس کے بیم سے
 اجزائے نالہ دل میں مرے، رزقِ ہم ہوئے
 اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ ہنر و عشق
 جو پاؤں اُٹھ گئے، وہی اُن کے قلم ہوئے
 نالے عدم میں چند ہمارے سپر و تھے
 جو دواں نہ کھینچ سکے، سو وہ یاں آکے دم ہوئے
 چھوڑی اسد! نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
 سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

مد سے نکل گئے
 تھے، اتنا ہی ہمیں
 کم ہونا اور پیچھے
 ہٹنا پڑا۔
 بے اعتدالی کے
 مقابلے میں دریاوہ
 ہونا اور سبک ہونے
 کے مقابلے میں کم
 ہونا ہے۔

۲۔ شرح۔
 خواجہ جاتی فرماتے
 ہیں۔

”جو مطلب اس
 طریقے سے ادا کیا
 گیا ہے، وہ ہے“

کہ ہم کو ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی مصائب و شدائد نے گھیر
 لیا تھا۔

کہتے ہیں کہ ہمارے آشیانے کے بالکل پاس جاں لگا ہوا تھا، جو ہماری
 نظروں سے پوشیدہ تھا۔ ابھی ہم پر ہی قول رہے تھے، اُڑے نہ گئے کہ
 اُس جاں میں پیش گئے۔

شکاری عموماً جاں ایسے طریقے پر لگاتے ہیں کہ وہ شکار کی نگاہوں سے
 چھپا رہے تاکہ آسانی سے پیش جائے۔ اُڑنے نہ پائے تھے، سے بظاہر
 مراد یہ ہے کہ ابھی آشیانے سے خست کی تھی اور فضا میں بازو پھیلا کر توازن

قائم نہ کر سکے تھے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جال آٹھانے سے آنا قریب تھا۔ گویا کر سکتے ہیں، بالکل ملا جلا تھا، جیسا کہ "سخت قریب" سے ظاہر ہے۔

۳۔ شرح : خود مرزا غالب میرمدی مجروح کو اس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

• پہلے یہ سمجھو، شتم کیا چیز ہے ؟ قد اس کا کتنا لمبا ہے ؟ ہاتھ پاؤں کیسے ہیں ؟ رنگ کیا ہے ؟ جب یہ نہ بتا سکو گے تو ہاتھ لگے کہ شتم جسم و جہانیت میں سے نہیں، ایک اعتبار محض ہے، وجود اس امر کا صرف تعقل میں ہے۔ سیرخ کا سا اس کا وجود ہے، یعنی کہنے کو ہے، دیکھنے کو نہیں۔ میں شاعر کہتا ہے کہ جب ہم آپ اپنی شتم ہو گئے تو گویا اس صورت میں ہمارا ہونا ہمارے فنا ہونے کی دلیل ہے۔

معاذہ یہ ہے کہ فلاں شے ہمارے پاس شتم کھانے کو بھی نہیں، یعنی ہم کو بھی نہیں، کیونکہ اگر اس کا وجود کچھ ہوتا تو شتم کھانے کا ثبوت بن سکتا تھا۔ یہی معاذہ مرزا نے اس شعر میں استعمال کیا ہے۔ فرماتے ہیں، "ہمارا ہونا، ہمارے فنا ہونے کی ایک دلیل ہے۔ ہم شتم شتمے اس حد پر پہنچ گئے گویا اپنی شتم بن گئے ہیں۔ یعنی نام کو بھی ہمارا وجود باقی نہ رہا۔

۴۔ شرح : جن لوگوں نے عشق کی سختیاں جھیلیں، ان کے بارے میں کیا پوچھتے ہو ؟ وہ لوگ رفتہ رفتہ گھٹنے گھٹنے سرا پا رنج و غم رہ گئے۔ جس طرح خارج میں رنج و غم کا کوئی وجود نہیں، اسی طرح عاشقوں کا وجود بھی عشق کی کڑیاں برداشت کرتے کرتے تحلیل ہو گیا۔

۵۔ شرح : اے محبوب ! زمانے میں محض تیری ہی طرف سے ہم پر ظلم و ستم نہیں ہوئے، تیرے علاوہ بھی ہمیں گونا گوں جفا کاروں سے سابقہ چرنا رہا۔ اگر تو گونا گویا کا پابند ہو جائے تو تیرے ظلموں کی تلافی

تو ہو جائے گی، لیکن تیسرے علاوہ جو عظیم ہوئے، ان کی تلافی کیونکر ہوگی ؟

اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اول یہ کہ مجھے جو جہانیں جھیلنی پڑیں، وہ صرف عشق کے باعث نہ ہئیں۔ عشق کے علاوہ، ہنسی، غم، بے شمار رنج و غم پہنچے۔ دوم یہ کہ اپنی پریشاں حالی کو بڑھا چڑھا کر محبوب کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ترس کھا کر غورِ اتلا فی پرستون ہو جائے۔

۶۔ شرح : ہم جنوں دو یونگی کی داستا میں تلم بند کرتے رہے، جو اتنی درد ناک ہئیں، گو یا ان کے لفظ لفظ سے خون ٹپکتا تھا۔ اگرچہ اس مسئلے میں ہمارے ہاتھ کٹ گئے، لیکن ہم نے داستاں طرازی نہ چھوڑی۔

مطلب یہ ہے کہ ہماری دھن کچی اور ہمارا عزم اٹل تھا۔ ہم عشق و شیعگی کی داستا میں مرتب کرتے رہے۔ وہ اتنی درد انگیز ہئیں کہ کار فرماؤں نے اس جرم میں ہمارے ہاتھ کٹا دیے، مگر ہم نے اُس حالت میں بھی پوری عزیمت کے ساتھ اپنا کام جاری رکھیں۔

یہ شعر ان مجاہدین حق کی عزیمت آشکارا کر رہا ہے، جو بلند مقاصد کے لیے، جو جہد شروع کرتے ہیں اور کوئی ظلم و جبر انہیں اس راستے سے ابھراؤ نہ نہیں کر سکتا۔

۷۔ لغات۔ رزقِ ہم : ایک دوسرے کا رزق۔

بشرح : اسے محبوب، تیری شہد مزاجی اور تیز طبی کے بارے میں کیا کہا جائے ؟ اس کے خوف سے میری مزید دفقاں کے اجزاء گھل کر اور تحلیل ہو کر اندر ہی اندر ایک دوسرے کو کھا گئے۔ یعنی مزید اس لیے نہ کہہ سکتا کہ تیری تند فقی کا ڈر تھا۔ نالہ دل سے اٹھتا تھا، پھر جزد جزد ہو کر اندر ہی اندر تحلیل ہو جاتا تھا، اور اس کے مختلف اجزاء ایک دوسرے کو کھا جاتے تھے۔

۸۔ لغات۔ اہل ہوس : جھوٹے عاشق، جو عشق سے نا آشنا ہوں

اور صرف ہوس پوری کرنا چاہتے ہیں۔

نبرد : جنگ ، لڑائی ۔

شرح : جھوٹے عاشقوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ عشق کی جنگ سے الگ ہو جائیں ۔ وہ اس راستے کی سختیاں برداشت نہیں کر سکتے ۔ استقامتوں میں سرخرو نہیں ہو سکتے ۔ ان کے لیے کامیابی کی کوئی صورت نہیں ، صرف اس جنگ کے میدان سے باہر نکل جانا ہی ان کے لیے بہتر ہے ۔ اسی کو انھیں اپنی فتح سمجھنا چاہیے ۔ فتح کا نشان یہ ہوتا ہے کہ جھنڈے بلند کیے جاتے ہیں اور پرچم لہرائے جاتے ہیں ۔ اہل ہوس کا میدان عشق سے الگ ہو جاتا اور پاؤں اٹھا کر چل پڑتا ہی ان کے لیے فتح کا پرچم لہراتا ہے ۔

کنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ اہل ہوس کے لیے میدان عشق سے باہر نکل جانا ہی مناسب ہے ۔ اس کے لیے طریقے خدا تکلف کا اختیار کیا ۔

۹۔ شرح : قدرت نے روزِ اول ہی سے چند نالے ہمارے سپرد کر دیے تھے ۔ جب تک ہم اس دنیا میں نہ آئے ، نالہ کشی میں مشغول رہے جب یہاں آگئے تو انھیں نالوں نے سانسوں کی شکل اختیار کر لی ۔

شعر سے صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ جب سے ہماری ہستی کی بنیاد استوار ہوئی ، مزید وفغان کے سوا ہمارا کوئی کام نہیں ، یہاں تک کہ اس دنیا میں آکر ہم نے جو سانس لیے ، وہ بھی وہ اصل نامے ہی تھے ، جو یہاں آنے سے پیشتر کھینچے نہیں گئے تھے ۔

بعض اصحاب نے اس شعر کا ماخذ عرانی کا مندرجہ ذیل شعر قرار دیا ہے :

نالہ نمی کشم از درد تو گاہے ، لیکن

تا بہ لب می رسد از ضعف نفس می گردو

یعنی اے محبوب ! مجھے تیرا درد و عشق سنا تا ہے تو نالہ سر کرتا ہوں ، لیکن ضعف کا یہ عالم ہے کہ وہ لب تک پہنچتے پہنچتے سانس بن جاتا ہے ۔

نامے کا سانس کی شکل میں تبدیل ہو جاتا بجا ، مگر عرانی اور غالب کے مضمون

بالکل الگ ہیں۔ عرق صرف صنعت کی کیفیت بیان کر رہا ہے جس کی وجہ سے
 نالے سانس بن گئے۔ میرزا غالب اپنی فطری و اذنی دو مندی کا اظہار کر رہے
 ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ازل ہی سے ہم دو مندر ہیں نالہ سر کرتا ہمارا فطری و لطیف قرار
 دے دیا گیا ہے۔ جو نالے ہم عدم میں سر نہ کر سکے، وہی اس حیاتِ مستعار میں
 اگر ہمارے سانس بن گئے۔

۱۰۔ شرح : اے استاد ! ہم نے گدائی اختیار کی تو دل لگی اور عشقِ دوست
 کا مشند اس حالت میں بھی نہ چھوڑا۔ ہم سائل تو بن گئے، لیکن اہل کرم کے
 عاشق ہو گئے۔

مطلب یہ کہ عشق ہماری گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ وہ ہم سے چھوٹ نہیں
 سکتا، یہاں تک کہ کوئی دوسرا پیڑ بھی اختیار کر میں تو عشق کے طور طریقے سے
 ادھر اُدھر ہوں گے۔

۱۔ لغات :

نقدہ : نقدی ،

اشرفی - درویشی -

کین : گھات۔ اگر

بجٹ کا شعر داغ دل کی

نقدی ، یعنی اشرفی

کی نگہبانی نہ کرے اپنی

اسے ہر وقت گرم نہ

رکتے تو بے زبانی

یعنی خاموشی کی گھات

جو نہ نقدِ داغِ دل کی، کرے شعلہ پا سبانی

تو فسرِ دگی نہاں ہے، یہ کین بے زبانی

مجھے اُس سے کیا توقع، یہ زمانہ جوا نی

کبھی کود کی میں جس نے، نہ سُنی میری کہانی

یونہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب، ورنہ کہتا

کہ مرے عدد کو یا رب ملے میری زندگانی

میں افسردہ دلی چھپی بیٹھی ہے، وہ اس داغ کو افسردہ کر دے گی، یعنی یہ داغ اپنی

پیش کھو کر مٹ جائے گا۔

مطلب یہ ہے کہ شعلہ محبت، ہر لحظہ داغِ دل کو گرم رکھتا ہے اور نہ محبوب سے دوری کے باعث جزاِ سرزدگی و پشیمانی چھاتی ہوئی ہے اور جس کے باعث میں خاموش بیٹھا ہوں، داغِ دل کو افسردہ کر ڈالے گی۔

۲۔ شرح : جس محبوب نے لڑکپن میں میری درد بھری کہانی نہ سنی، حالانکہ اس عمر میں گمانیاں سننے کا نام شوق ہوتا ہے، اس سے جوانی کے زمانے میں کیا اُمید رکھ سکتا ہوں؟

۳۔ شرح : کسی کو خواہ مخواہ دکھ دینا اور مصیبت میں ڈالنا اچھا نہیں، اور نہ میں دعا مانگتا کہ یارب! میری زندگی میرے دشمن کو عطا کر دے۔
یعنی میری زندگی اتنی المانک اور درد انگیز ہے کہ دشمن کے لیے بھی ایسی زندگی کی آرزو نہیں کر سکتا۔

داغِ رہے کہ یہ بھی اپنی زندگی غم ناک و رنج افزا ہونے کا ایک اندازہ ہے۔ واقعی مقصود یہ نہیں کہ دشمن کے لیے ایسی دعا مانگی جائے۔

۱۔ شرح :
میرزا خود اس شری
شرح کرتے ہوئے
عبدالرزاق شاکر کو
کہتے ہیں :
اک شمع ہے دلیلِ سوز و غم
یہ خبر ہے۔ پہلا مصرعہ
ظلمت کہے میں شمعِ غم کا جوت
یہ بتا ہے :
ظلمت کہے میں میرے شبِ غم کا جوت ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے
نے مرثوۃ وصال، نہ نفثِ رۃ جمال
تت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے
نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوقِ ایامِ اجازتِ تسلیم ہوش ہے

گوہر کہ عقد گردنِ خواباں میں دیکھنا
 کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے
 دیدار بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست
 بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے
 اسے تازہ واردانِ بساطِ بولے دل
 زہنار اگر تھیں ہوسِ ناوِ فوش ہے
 دیکھو مجھے، جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
 میری منو، جو گوشِ نصیحتِ نیش ہے
 ساقی بہ جلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی
 مطرب بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے
 یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
 دامانِ باغبان و کفِ گلِ فروش ہے
 لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
 یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے
 یا صبح دم جو دیکھیے اگر تو بزم میں
 نے وہ سرود و سوز، نہ جوش و خروش ہے

-شبِ غم کا جوش "یعنی اندھیرا
 ہی اندھیرا۔ غلبتِ غلیظ،
 سحرِ ناچید، گویا خلق ہی نہیں
 ہوتی۔ ہاں، ایک دلیل صبح
 کی بود پر ہے، یعنی بجھی ہوئی
 شمع۔ اس راہ سے کہ شمع و
 چراغ صبح کو بجھ دیا کرتے
 ہیں۔ لطف اس مضمون کا
 یہ ہے کہ جس شے کو دلیلِ بج
 ٹھہرایا ہے، وہ خود ایک
 سبب ہے، منجھد اسبابِ تادی
 کے۔ پس دیکھا چاہیے جس
 گھر میں ملاست صبحِ نوزِ نلست
 ہوگی، وہ گھر کتنا تاریک ہوگا؟
 اس شرح پر شاکر کے
 ایک دوست نے اعتراض
 کیا۔ شاکر نے یہ اعتراض
 مرزا کو لکھ بھیجا۔ جواب میں
 فرماتے ہیں،

-مولوی نظام الدین
 گبنوی علیہ الرحمۃ کا ایک شعر
 طالبِ علموں کے ہاتھ پڑا۔
 انھوں نے اذکر سے قوائدِ نحو

اس میں کلام کرنا شروع کیا
 مولوی کے پاس جب وہ
 کلمات پہنچے تو فرمایا: ”
 کہ یاداں اشعر مرا بہ مدرسہ
 کہ تہذیبہ“
 ”جو صاحب یہ دانتے“
 داغ مزاقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
 اک شمع رہ گئی ہے، سودہ بھی خاموش ہے
 آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
 غالب صریرِ خامہ نوالے سروش ہے

ہیں کہ مجموع پہلا مصرع مبتدا نہیں ہو سکتا، ان سے پوچھا جاوے کہ
 کیا آپ اس پہلے مصرع میں سے ”ظلمت کسے میں میرے“ اس
 کو مبتدا اور شبِ غم کا جوش ہے، ”اس کو خبر ٹھہراتے ہیں ہاں
 اگر یوں ہے تو بھی اتفاقاً حاصل ہے۔ دوسرا مصرع دوسری خبر
 سہی۔ آخر یہ بھی تو مسلمات فنِ سخن میں سے ہے کہ ایک مبتدا کی
 دو بلکہ زیادہ خبریں ہو سکتی ہیں۔

”ہاں ایک قاعدہ اُتر ہے۔ یعنی جملہ فعلیہ کے ماقبل جو عبارت
 ہوتی ہے، اس کو مبتدا نہیں کہتے۔ اس مطلع کا مصرع ثانی جملہ
 اسمیہ ہے۔ اپنے ماقبل مبتدا کو قبول کرنا ہے۔ اگر ہم نے نظر
 اس دستور پر مصرعِ اول کو مبتدا کہا تو بھی قیامت لازم نہیں آتی
 بہر حال جو وہ صاحب اس پہلے مصرع کو قرار دیں، وہ صحیح قبول
 ہے۔ مگر شعر میرا مہمل نہیں۔ زیادہ اس سے کیا لکھوں؟“

میرے اندھیرے گھر میں شبِ غم کے جوش و شہادت کا یہ عالم ہے کہ صبح
 کی علامتیں ناپید ہیں، صرف ایک نشان رہ گیا ہے اور وہ ٹہجی ہوئی شمع ہے۔
 اندھیرے کی شدت واضح کرنے کے لیے جس شے کو صبح کی دلیل ٹھہرایا، یعنی شمع
 کو، وہ خود بھیجی ہوئی ہے، یعنی اندھیرے کے تصور میں اضافہ کرتی ہے۔
 ۲۔ لغات۔ آشتی: صلیح۔

شرح : اب نہ محبوب کی طرف سے وصال کی خوشخبری آتی ہے نہ اس کے حسن و جمال کے نظارے کا کوئی موقع ہے۔ اذنیں و زبانوں پر چشم گوش میں کشمکش رہتی تھی۔ دیدار نصیب ہوتا تو کانوں کو شکایت پیدا ہوتی وصال کی نوید ملتی تو آنکھیں ملکہ کرتیں۔ دونوں باتیں نہ ہونے سے آنکھوں اور کانوں کے درمیان صلح کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ نہ ایک کو شکوے کا موقع باقی نہ دوسرے کو گلے کا۔

۴۔ **شرح :** شراب کے نشے نے اس محبوب کو شرم و حجاب سے بے نیاز کر دیا ہے، جسے ہر لحظہ آرائش کا خیال رہتا ہے۔ اسے شوق ! اس حالت میں ہوش و حواس گم کر دینا اور ضبط و قرار کے بند ٹوٹ جانا بالکل جائز ہے اور اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

۴۔ لغات - عقد : ہار

شرح : گوہر پہنچنے والے نے موتوں سے جو ہار تیار کیا، وہ حسینوں کی گردن میں پڑا تو قابل رشک نظارہ پیدا ہو گیا۔ دیکھیے، گوہر پہنچنے والے کا ستارہ کتنی یلندی پر ہے !

ہندی اس لیے کہا کہ ہار حسینوں کی گردن میں پہنچ گیا جو ہر حال ایک بلند مقام ہے۔ رشک کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ گوہر فروزش نے جو ہار تیار کیا، وہ خود حسینوں کو پھنایا، گویا اس کے ہاتھ ان کی گردنوں میں جاکر ہوئے اور عاشق اس کے لیے ہمیشہ ترستے رہتے ہیں۔

۵۔ **شرح :** محبوب کے تصور کی محفل بھی ایک شراب خانہ ہے، مگر ایسا، جس میں کوئی ہنگامہ اور کوئی ہڈ بٹو نہیں۔ اس شراب خانے میں دیدار کی شراب ملتی ہے، حوصلہ ساقی گری کا کام انجام دیتا ہے اور رنگا ہیں مست رہتی ہیں۔

مطلب یہ کہ تصور میں بھی محبوب کا دیدار نصیب ہوتا ہے، جتنا کسی

کا حوصلہ ہو، اس کے مطابق شراب مل جاتی ہے اور نگاہیں مست رہتی ہیں۔
 یہاں تصور سے مراد مراقبہ بھی ہو سکتا ہے اور شعر محبوب مہاذی کے بجائے
 محبوب حقیقی سے متعلق سمجھ سکتے ہیں۔

۶ - ۱۲۔ لغات : تازہ وارو : نیا نیا آنے والا۔

بساط : بزم کا فرش، یعنی بزم۔

ہوا کے دل : دل کی خواہش۔

زخماں : کلمہ تاکید، جو نفی اور اثبات دونوں کے لیے آتا ہے، یہاں
 اثبات کی تاکید مراد ہے۔

نا و نوش : نئے اور شراب۔

دیدہ عبرت نگاہ : عبرت کی نظر رکھنے والی آنکھ، وہ آنکھ جو عبرت

حاصل کرے۔ عبرت سے مراد ہے خاص حالت میں طبیعت کا غفلت سے آگاہی
 کی طرف آنا، یعنی نصیحت حاصل کرنا۔

گوش نصیحت نبوش : نصیحت سننے والا کان۔

جنگ : ایک ساز، سازگی۔

شور : غوش، شادمانی

مشرع : اسے وہ لوگوں اور دل کی خواہشوں اور آرزوؤں کی محفل میں

نئے نئے آئے ہو اور نئے شراب کی طلب میں اندھے ہوئے ہو رہے ہو،

خبردار !

اگر تمہارے پاس ایسی آنکھ ہے، جو عبرت حاصل کر سکے تو مجھے دیکھو،

مجھ پر نظر ڈالو۔ اگر تمہارے پاس نصیحت سننے والے کان ہیں تو میری بات

سنو۔ میں نا و نوش کا تجربہ کر چکا ہوں اور میری باتیں گھر کے بھیدی کی حیثیت

رکھتی ہیں۔

ساتی جلوہ دکھا کر اور شراب پلا کر عقل و ایمان کو تباہ کر دیتا ہے۔ گانے والا

۔ گاکر اور نغمہ سنا کر ہوش اور وقار و تکسنت کو غارت کر ڈالتا ہے۔ یعنی حسین و جمیل ساقی کے ہاتھ سے شراب پی جائے تو نہ ایمان باقی رہتا ہے، نہ عقل اور گلے زانے کے فتنوں کی لت پڑ جائے تو عزت و وقار بھی ضائع ہو جاتے ہیں اور ہوش دھوکا بھوکا۔

پھر اس عیش و نشاط کی محالت کیا ہے؟ رات کو مجلس آراستہ تھی، تو فرش کا ہر گوشہ باغبان کے واسن اور پھول بیچنے والے کے ہاتھ کی طرح پھولوں سے بھرا ہوا نظر آتا تھا۔

ساقی کی خوش خرامی ایسا پُر لطف نظارہ پیش کرتی تھی، گویا نگاہ کے لیے جنت کا منظر پیدا ہو گیا تھا اور سارنگی کی سُر ملی آواز میں اتنی لذت تھی، گویا کانوں کے لیے فردوس آراستہ ہو گیا تھا۔

یہ تو رات کی کیفیت تھی، لیکن صبح کو دیکھتے ہیں تو محفل میں ذوق سرور و شادابی نظر آتی تھی، نہ وہ جوش و خروش سناٹا دیتا تھا۔

مجلس درہم برہم ہو چکی تھی، اس کی بساط الٹ گئی تھی۔ جو صبح رات بھر جلنے رہی تھی، وہ آگ ہو چکی تھی، گویا رات کی مہنگامہ آرائی سے عروسی کا ایک وارغ بن کر رہ گئی تھی۔

پورے قلمے میں دو منظر پیش کیے گئے ہیں۔ پہلا اس وقت کا، جب مجلس کی رونق عروج پر تھی، دوسرا اس وقت کا، جب ساری رونق اور چہل پہل ختم ہو چکی تھی، شائے اور ہو کا عالم باقی رہ گیا تھا۔ مولانا طباطبائی نے بالکل درست لکھا ہے، آخر کے دو شعرا اس سبب سے زیادہ یلغ ہیں کہ ان کا اثر گر فنگی خاطر ہے اور جو گر فنگل و اشہ کے بعد ہو، اثر قوی رکھتی ہے۔

۱۳۔ لغات - سریر غامدہ : وہ آواز جو کھٹے وقت قلم سے پیدا ہوتی ہے۔ قلم سے مراد کلک ہے، جس سے غالب کے زمانے میں لکھا جاتا تھا۔ انگریزی قلم یا انڈی چنڈنٹ نہیں۔

نوا سے سروش : فرشتے کی صدا۔

تشریح : اسے غالب اتیرے خیال میں غیب سے معنون آتے ہیں اس میں
یہ تمام مطالب غیب سے تجھ پر افقا ہوتے ہیں، گو یا تیرے قلم کی آواز فرشتے
کی صدا ہے۔

آ، کہ میری جان کو قرار نہیں ہے طاقتِ بیدار انتظار نہیں ہے
دیتے ہیں جنتِ حیات دوسرے کچلے نشہ پر اندازہ غماز نہیں ہے
گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو ہاے، کہ رونے پر اختیار نہیں ہے
ہم سے جٹ ہے گمانِ رنجِ خاطر خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے
دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ہاے سمانِ خمیر گل آئینہ بہار نہیں ہے
قتل کا مرے کیا ہے عہدِ تو ہے واسے، اگر عہد استوار نہیں ہے
تو نے قسم میکشی کی کسائی ہے غالب! تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

۱۔ **تشریح :** اسے محبوب! اللہ جلد آ، کیونکہ میری جان کو صبر و قرار نہیں
وہ عہد درجِ بنیاب و مضطرب ہے۔ تیرا انتظار ایک بہت بڑی مصیبت ہے۔
اس مصیبت کی سختیاں اور پریشانیاں برداشت کرنے کی عجز میں طاقت نہیں۔

۲۔ **تشریح :** اس دنیا میں جو غم و رنج اور اندوہ و قلق کا ایک طوفانی
سندر ہے، زندگی گزار چکنے کے بعد جنتِ صلے میں ملے گی، لیکن جنت ان
جنوں اور مصیبتوں کی تقاضی کر سکے گی، جو ہم نئے رو سے زمین پر برداشت کریں؟
جنت کا نقشہ ایسا نہیں، جو دنیوی زندگی کے غماز یعنی نشہ اُترنے کی تکلیفوں اور
اذیتوں کے زخموں کا مرہم بن سکے۔

صرف نئے کا عادی ہی صحیح اندازہ کر سکتا ہے کہ جب نشہ ٹوٹتا ہے تو
جسمانی اور ذہنی اعتبار سے اس پر کیا قیامت گزرتی ہے، جتنا سخت غماز ہو۔

اگر اُسی کے مطابق شکر آب نہ لے تو تکلیفیں دُور نہ ہو سکیں گی۔ یہی حقیقت اس شعر میں پیش کی گئی ہے۔ دراصل کہنا یہ چاہتے ہیں کہ تنہا بہشت و نبوی زندگی کی مصیبتوں کا پورا بدلہ نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ محبوب حقیقی کی پہچان بھی ہونی چاہیے قرنی جنت ہمارے شمار کی تلافی نہ کر سکے گی۔

نارسی میں بھی یہ خیال پیش کیا ہے :

جنت نہ کند چارۂ امردگی دل

تعمیرِ اندازۂ ویرانی ما نیست

میاں ہمیں رنج و کمورت اور دل گرفتگی کے جن اسباب سے سابقہ پڑا رہا۔ ان کی تلافی جنت نہیں کر سکتی۔ ہم میاں جتنی بربادی سے دوچار ہوئے ہیں، تعمیرِ نو کا انتظام اس کے مطابق نظر نہیں آتا، یعنی جنت کی آبادی اس دنیا کی ویرانی کا بدل نہیں بن سکتی۔

۳۔ شرح : اے محبوب ! میں تیری محفل میں پہنچا ہوں تو تیرے متاعِ اودے کے اعتنائی پر بے اختیار آئوہ نکلتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مجھے جبراً نکال دیا جاتا ہے۔ ضبط و صبر پر مجھے اختیار ہوتا تو نہ دوتا۔ افسوس کہ اختیار نہیں ہے۔

رونے پر محفل سے نکالے جانے کی کوئی وجہ مرزا نے بیان نہیں کی، اسے مجسم چھوڑ دیا، کیونکہ ہر فرد کے رونے کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ عیش و نشاط کی بزم میں کسی کا رونا بالکل بے محل ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ رونے سے محبوب کی رسوائی ہوتی ہے۔ تیسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ محبوب رفیقوں پر مہربان ہے اور عاشق صادق سے بے اعتنائی برتا ہے۔

۴۔ شرح : اے محبوب ! ہمارے متعلق یہ گمان بالکل بیجا ہے، کہ ہمارا دل آپ سے کٹ رہا ہو جائے گا، کیونکہ ہم تو سچے عاشق ہیں اور سچے عاشقوں کی مٹی گر و غبار سے بالکل پاک ہوتی ہے۔ پھر ہمارا دل کتدر

ہونے کا کون سا امکان ہے ؟

دوسرا پہلو یہ ہو سکتا ہے کہ خاطر سے مراد خاطر محبوب لی جائے۔ اس مصروفیت میں معنی نہ ہوں گے : ہمارے متعلق یہ گمان صحیح نہیں کہ ہماری کسی بات سے آپ کے دل میں کدتر پیدا ہوگا ، کیونکہ ہماری خاک میں تو غبار ہے ہی نہیں۔ اگر ہوتا تو آپ کا دل میلا ہو جانے کا بھی احتمال باقی رہتا۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ یہاں لفظ ”خاک“ طہینت کی جگہ لایا گیا ہے لیکن خلافت محاورہ ہے۔ موجودہ صورت میں شعر کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم مٹ کر خاک بھی ہو جائیں گے تو اس سے غبار نہ بنے گا ، جو آپ کا دل کدتر ہونے کا باعث ہو۔

۵۔ شرح : اے مخاطب ! تیرے پاس دل ہے تو ہماری معنی آرائیوں کے جلووں سے لطف اٹھا۔ ان جلووں کی حیثیت فصل بہار کی سی ہے اور بہار کا آئینہ پیول کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جس طرح بہار کی حقیقی کیفیت پیول میں نظر آتی ہے ، اسی طرح دل ہمارے کئے ہوئے حقائق سے ٹھیک ٹھیک استفادہ کر سکتا ہے۔

۶۔ شرح : محبوب نے میرے قل کا پختہ وعدہ تو کر لیا ہے۔ افسوس ، اگر یہ وعدہ عمل میں پختہ ثابت نہ ہوا۔ اس طرح محبوب کے نامعلوم قل ہونے کا ارمان دل ہی میں رہ جائے گا ، کیونکہ اس ارمان کا پورا کرنا حمد کی استواری پر موقوف ہے۔

۷۔ شرح : قسم کھانا ، حلف اٹھانا ، کسی چیز کی قسم کھانا ، کسی چیز کا چھوڑ دینے کا عہد کرنا۔

سب مطلب یہ ہے کہ اے غالب ! تو نے شراب چھوڑ دینے کی قسم کھائی ہے ، لیکن تیری قسم کا اعتبار کیا ہے ؟ کون کہہ سکتا ہے کہ کب شراب چھوڑے اور کب پھر بننا شروع کر دے۔

شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اے غالب ! تو نے میکیشی کا حلف اٹھا یا ہے ، پینے یا چھوڑ دینے کا بالمقترح کوئی ذکر نہیں ، جب تیری قسم مختلف

بلکہ متضاد پہلو یہ ہونے ہے تو اس پر اعتبار کیسے ہو سکتا ہے ؟

۱۔ شرح :
غم خیل و زخیل اور
فوج و رفوج اگر ہے
میں اور معلوم ہے کہ
غم کی حالت میں
انسان کا سر بے اختیار
جھک جاتا ہے۔ مرزا
کا سر، جو غم کے باعث اتنا جھکا کہ دامن کے سرے پر پہنچ گیا۔ گویا دامن سے
ٹپکے ہوئے تار اور تار نگاہ میں مزق کرنا مشکل ہو گیا۔

۲۔ شرح :
میں اپنے زخموں کو ٹانگے لگا رہا ہوں۔ میرا دماغ
نہیں کہ زخم بھر جائیں، بلکہ ٹانگے لگانے میں سوئی سے جو زخم ہوں گے، ان کی
لذت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مجھ کو دلوانے کو درد کے مزے
کا کوئی خیال نہیں رہا اور اس سے غافل ہو گیا ہوں۔
یہ مضمون مرزا پہلے بھی باندھ چکے ہیں، مثلاً :

زخم سلوانے سے مجھ پر پارہ جوئی کلبے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

۳۔ شرح : اے غائب ! میرا محبوب جس باغ میں جلوہ فرما ہو وہاں
کلیوں کے چمکنے کو دل کے پھٹنے اور باغ باغ ہونے کی آواز سمجھنا چاہیے

۱۔ شرح:

پا پودا من ہو رہا ہوں، بس کہ میں صحرا لوند
خار پا ہیں جو ہر آئینہ زانو مجھے
دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے بعد
ہے نگاہ آشنا تیرا سر ہر مو مجھے
ہوں سراپا ساز آہنگ شکایت کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھڑے تو مجھے
میں صحرا کے چڑکاٹ
رہا تھا۔ پاؤں میں
اتنے کانٹے چبھے کہ
جے میں ہو کر بیڑ گیا
اور کانٹے نکالنے کے
لیے پاؤں زانو پر
رک گیا، جہاں دامن
پنچا ہوا تھا۔ اگر
زانو کو آئینہ سمجھ لیا

جائے تو میرے پاؤں کے کانٹے اس آئینے میں جو ہر معلوم ہوتے ہیں۔
اس شعر کے سلسلے میں دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں۔ اول صوفیہ کے
نزدیک سر زانو پر مراحے میں رکھا جاتا ہے۔ چونکہ مراحے میں عالم علوی سے فیض
حاصل ہوتا اور دل چلا پاتا ہے اور اس لیے زانو کو اصطلاح صوفیہ میں آئینہ
کہنے لگے۔ دوم کانٹے نکالتے وقت پاؤں زانو پر رکھا جاتا ہے تاکہ تمام کانٹوں
کا پتہ چل جائے اور انہیں نکالنے میں سہولت ہوتی ہے۔ مرزا نے صوفیہ کی اصطلاح
کے مطابق زانو کو آئینے سے تشبیہ دی، پھر کانٹوں کو اس آئینے کے جوہر بنا دیا۔
جیسا کہ پہلے بار اعرض کیا جا چکا ہے، آئینے سے مراد تقوری آئینہ نہیں، بلکہ
فرلادی آئینہ ہے۔

۲۔ شرح: محبوب سے ہم بغل ہونے کے بعد میرے دل کی حالت

دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ محبوب کے جسم کا بال بال مجھے ایسی نگاہ معلوم ہوتا
ہے، جو میری دلی کیفیتوں سے آگاہ ہو۔

ہم آغوشِ نصیب ہونے کا مطلب ہی ہے کہ محبوب کے جسم کا بل بال
نگاہ و آشنا بن جائے۔

۳۔ شرح : میں ایسا ساز ہوں جس میں لگوں اور شکووں کے داگ
بھرے ہوئے ہیں۔ اے محبوب ! میرے بارے میں کچھ نہ پوچھ۔ بہتر یہی ہے کہ
جب لوگ صبح ہوں تو تو مجھے نہ پھیرے۔ پھیرے گا تو ساز بجھنے لگے گا۔ لگوں
اور شکووں کا ایک سیل امنڈ آئے گا۔

۱۔ لغات کا لہجہ :
تغلب، ڈھانچا۔
صورتِ دیوار :
دیوار پر بنی ہوئی تصویر
شرح : اے محبوب !
تو میں مغل میں ناز و لہو
سے پونے لگے اوہاں
تیری جاں بخشوں کے
اعجاز سے ان تصویروں
کے قلاب میں جاں پڑ
جائے جو دیوار پر بنی
ہوئی ہوں۔
یہاں گفتگو محبوب کی
جاں بخش کا انہماق مقصود

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں کا لہجہ صورتِ دیوار میں آوے
سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قیو دکش سے جو گلزار میں آوے
تب ناز گراں مانگی اشک بجا ہے
جب لختِ جگر دیدۂ عوینار میں آوے
وے مجھ کو شکایت کی اہازت کھستگر
کچھ تجھ کو مرزا بھی مرے آزار میں آوے
اس حشیمِ فنوں گر کا اگر پاسے اشارہ
طوطی کی طرح آشنہ گفتار میں آوے

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یا رب
 اک آبلہ پا داوی پڑ خار میں آوے
 مریاؤں نہ کیوں رشک ہے جب وہ تن نازک
 آنکھیں خم حلقہ زقار میں آوے
 غارت گر ناموس نہ ہو گر ہو س زر
 کیوں شاہر گل باغ سے بازار میں آوے
 تب پاک گریباں کا مزا ہے دل تاراں
 جب اک نفس اُلجھا ہوا برتار میں آوے
 آتش کدہ ہے سینہ سرا راڑ نہاں سے
 اے دانے! اگر معرین اظہار میں آوے
 گنجیدہ معنی کا طلسم اُس کو بھیجے
 جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

ہے اور ناز سے گشوار
 میں آنے کا مطلب ہرگز
 یہ نہیں کہ جب محبوب
 ناز و انداز سے گفتگو
 کرے گا تو ایسا ہوگا۔
 مقصود ہے کہ محبوب
 جب بھی ہوتا ہے
 ناز ہی سے ہوتا ہے
 گویا اس کی ایک
 مستقل صفت ہے۔
 اس کی کوئی بات ناز
 سے خالی ہو ہی نہیں
 سکتی۔ اس مستقل صفت
 کے پیش نظر "ناز"
 کا لفظ مشاعر کو مزوری
 معلوم ہوا۔

۲۔ شرح :

اے محبوب! تو دلکش

و دلآویز قامت کے ساتھ باغ میں آجائے تو سرور و صوبر جنہیں اپنی بلند قامت پر
 ناز ہے، اساتے کی طرح ساتھ ساتھ پھرنے لگیں۔

دماغ رہے کہ شاعر نے محبوب کے لیے قدر و دلکش کا لفظ استعمال کیا۔ اس
 سے یہ ظاہر کہ مقصود ہے کہ محض بلند قامت کوئی خوبی نہیں، قدر آتنا ہی
 بلند ہونا چاہیے، جبنا کہ موزونیت کے باعث دل کو بھائے، نری بلند قامت یعنی

ادوات کا زیبا بن جاتی ہے۔

مولانا علیا بٹائی فرماتے ہیں کہ دوسرے مصرع میں سے "کالفظ" مجھب لطف رکھتا ہے اور بڑے محاورے کا لفظ ہے اور مصنف پہلے شخص میں جس نے اس مقام پر سے "استعمال کیا" دوسرے شاعر اس طرح استعمال کیا کرتے ہیں :

۱۔ اس قد کو اگرے کے ٹو گلزار میں آوے

۲۔ لغات - گراں ایگی : بیش بہا ہونا۔

شرح : آنسو کے لیے بیش بہا ہونے کا نعر اسی صورت میں سمجھا جا سکتا ہے، جب جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر لبوہ روتے والی آنکھ سے بہنے لگے، یعنی وہ آنسو کس کام کا، جس میں جگر کا لبوہ نہ ہو۔

مرزا نے ایک آؤر جگہ بھی کہا ہے :

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل

جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لبو کیا ہے

۳۔ شرح : اے ظالم محبوب ! مجھے جگے شکوے کی اہانت دے دے تاکہ تجھے میرے ستانے میں کچھ مزہ بھی آئے۔

مطلب یہ کہ میں شکایت کروں گا، تجھے پتا چلے گا کہ تیرے ہاتھوں دکھ اٹھانے کا معاملہ کہاں تک پہنچ گیا ہے یا کدہ شکوہ سن کر تجھے غصہ آئے گا اور غصے میں مجھ پر سختی کرے گا۔ یہ تادمہ ہے کہ نظم و ستم کا معاملہ اسی وقت، پڑ لطف بنتا ہے، جب ایک طرف شکایت ہو اور دوسری طرف سختیاں کی جائیں۔ اگر سختیوں کو چپ چاپ صبر سے برداشت کر لیا جائے تو کچھ لطف نہ ہوگا۔ اس معاملے میں گرمی اور جنگاہ خیزی صرف جگے شکوے ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔

مولانا علیا بٹائی فرماتے ہیں کہ اس زمین کا حاصل اس شعر میں آگیا۔

۵۔ شرح : اگر محبوب کی جادو بھری آنکھ کا اشارہ پائے تو آئینہ طوطی کی طرح بولنے لگے۔

طوطی آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر بولنے لگتا ہے۔ محبوبوں کی آنکھیں اشاروں میں باتیں کرتی ہیں۔ مرد اکتے میں کہ میرے محبوب کی آنکھ کے اشارے سے آئینہ طوطی بن جائے۔

یہاں چشم منوں گر یعنی جادو بھری آنکھ اس لیے کہا کہ طوطی کی طرح آئینے کا بول اشنا خلافت عادت و اقتد ہے اور یہ جادو کے بغیر ممکن نہیں۔

۶۔ لغات - آبلہ پا : وہ شخص جس کے تلوے چھالوں سے بھرے ہوں۔

شرح : اے اللہ! کانٹوں بھری داوی میں ایک ایک کانٹے کی زبان پیاس کے مارے خشک ہو گئی ہے۔ کسی ایسے شخص کو بھیج جس کے تلوے آبلوں سے لبریز ہوں تاکہ وہ اس میں پھر نکلے اور آبلوں کے پانی سے کانٹوں کی پیاس بجھ سکے۔

اس شعر کی خوبیاں خاص توجہ کی محتاج ہیں، مثلاً :

”کانٹوں کی زبان سوکھ گئی“ کہ کر اُن کی وضع و حیثیت کا نقشہ بہترین انداز میں پیش کر دیا ہے۔ ان کی فزیکس دیکھ کر یہی معلوم ہوتا ہے کہ زبانیں خشک ہو کر نکیلی ہو گئیں۔

۲۔ عام نباتات کو سیراب کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جڑوں میں پانی چھوڑ دیتے ہیں، لیکن کانٹوں کو اس طرح پانی نہیں دیا جاسکتا ہے۔

۲۔ ان کے لیے سیرابی کا انتظام ایسا ہونا چاہیے کہ ٹوکھی ہوئی زبانیں تیز ہو سکیں اور اس کا بہترین طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ جس کے تلووں میں چھلکے ہوں، وہ ان کانٹوں پر پھر نکلے۔

۷۔ شرح : محبوب کا ہڈک جسم زنار کی آغوش میں دیکھا تو مزایا کہ

میں رکھ سکتے کیوں نہ مریاؤں؟ وہ جسم میری آغوش میں آنا چاہیے تھا، مذکر
اُس دھاگے کی آغوش میں، جو گہریا برہمن باندھتے ہیں اور اسے مذہب کا
ایک خاص نشان سمجھتے ہیں۔

”ختمِ حلقہٴ زتار“ کا مطلب ہے زتار کے حلقے کا ختم۔ زتار باندھتے
ہیں تو کندھے پر اسے ختم دیا جاتا ہے، اسی کو ختمِ حلقہ قرار دیا۔

۸۔ لغات۔ زر : یہاں اس کے دو معنی ہیں، اول وہ ذرو سا
ذریعہ، جو پھول کے اندر ہوتا ہے، دوم مال، دولت اور قیمت۔

شرح : اگر مال و دولت کی حرص عزت و ناموس کی بربادی کا باعث
ذہوق تو پھول کا محبوب باغ پھوڑ کر بازار میں کیوں آتا۔

مطلب یہ کہ پھول کے لیے اول زر کی ہوس یوں ظاہر ہوتی ہے کہ
جب وہ کہتا ہے تو اندر سے زیرہ نکل آتا ہے۔ گویا اس نے ہاتھ میں زر
رکھ لیا ہے۔ دوم وہ بکنے کے لیے باغ سے بازار میں جاتا ہے۔ یہ بھی مال
کی ہوس ہے، جو اس کی رسوائی کا باعث بنتی ہے۔ اگر وہ غنچے کی طرح
بند کا بند رہتا تو نہ اس کے اندر کا زیرہ نمایاں ہوتا، نہ بازار میں بکنے کی
نوبت آتی۔ اس سے یہ سبق حاصل ہوا کہ زر کی ہوس انسان کے لیے سزا
کا باعث ہوتی ہے اور اس کی عزت و ناموس برباد کر دیتی ہے۔

۹۔ شرح : اسے بے خبر اور حقیقت ناشناس دل! گریبان تار تار کرنے
کا مزہ اُس وقت آسکتا ہے، جب بہتر میں ایک سانس الہیا ہوا ہو، یعنی
بہتر کے ساتھ سانس کھپا ہوا آئے اور دم نکل جائے۔
تار گریباں اور تارِ نفس کی مناسبت محتاج بیان نہیں۔

۱۰۔ لغات۔ معرض : حاسے عرض یعنی وہ جگہ، جہاں کوئی چیز پیش ہو
معرضِ اظہار سے مراد ہے کہ کسی چیز کا اظہار میں آنا، یعنی ظاہر ہونا۔

شرح : میرے سینے میں ایک ایسا چٹپا ہوا بھید ہے، جس کی گری

سے سینہ آتش کدہ بن گیا ہے، یعنی اس میں سراسر آگ و دھبہ رہی ہے۔ اگر
 یہ مادہ ظاہر ہو جائے تو خدا جانے کہاں کہاں آگ لگے اور کیا قیامت برپا ہو!
 ۱۱۔ شرح: اسے غالب: میرے شعروں میں جو بھی لفظ آتا ہے،
 اسے معنی کے خزانے کا ایک غلم سمجھنا چاہیے۔ یعنی لفظ لفظ میں معنی کے
 خزانے غلم کے ذریعے سے بھر دیے گئے ہیں۔ جب تک کوئی شخص وہ غلم
 توڑ کر اصل خزانے تک نہ پہنچے، میرے اشعار کی حقیقت اس پر واضح نہیں
 ہو سکتی۔

مولانا طیباطبائی فرماتے ہیں:

”گنجینہ اس سبب سے ہے کہ معانی کثیر اس میں ہیں اور غلم
 اس سبب سے ہے کہ پہلو بھی اس میں کئی نکلتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے
 کہ غلم مشکل سے کھٹکا ہے اور حیرت انگیز ہوتا ہے۔ اسی طرح
 کلام میرا مشکل سے حل ہوتا ہے اور معانی سے اس کے حیرت
 پیدا ہوتی ہے۔ غرض لفظ کی تشبیہ غلم سے نہایت چرلچ ہے۔“

۱۔ شرح:

خواہ مال فرماتے ہیں:

”دوسرے مصرع

میں دھوئی متعنت میل

ہے۔ معشوق کو

میرا خود شید جمال اس

یہ کہتا تھا کہ اس کو

باغ کامل پر ترجیح دینے

کی وجہ پیدا ہو جانے

حسن مر گرچہ بہ ہنگام کمال اچھا ہے

اس سے میرا میرا خود شید جمال اچھا ہے

لو پہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ

جی میں کہتے ہیں کہ نہفت آئے تو مال اچھا ہے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

اگرچہ چاند ماہ کا لی یعنی
 بدر بن چائے تو بہت اچھا
 معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میرا
 چاند جس کا حسن و جمال
 سورج کا سا ہے، ہند
 سے بہتر ہے۔

خواجہ جاتی مرزا ہی
 چکے ہیں ۱۰ اپنے محبوب کو
 مہر خورشید جمال اس لیے
 کہا کہ ماہ کا لی پر اس کی
 فوقیت واضح ہو جائے۔
 جس طرح چاند پر سورج
 کی فوقیت واضح ہے۔

۲۔ شرح :
 شعراء عموماً بوسے کو
 دل کی قیمت قرار دیتے ہیں
 مرزا فرماتے ہیں کہ میرے
 محبوب کی نظر میرے دل
 پر جمی ہوئی ہے۔ اسے
 اڑا لینا چاہتا ہے، لیکن
 اس کی قیمت ادا کرنے،

بے طلب دیں تو مرزا اس میں ہوا ملتا ہے
 وہ گدا جس کو نہ ہونوئے سوال اچھا ہے
 ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
 وہ سمجھتے ہیں کہ بہیار کا حال اچھا ہے
 دیکھے پاتے ہیں عشاق تبوں سے کیا فیض
 اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے
 ہم سخن تیشے نے مرزا کو شیریں سے کیا
 جس طرح کا بھی کسی میں ہو کمال اچھا ہے
 قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
 کام اچھا ہے وہ جس کا کہ آل اچھا ہے
 خضر سلطان کو رکھے خالق اکبر سرسبز
 شاہ کسے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے
 ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
 دل کے خوش رکھنے کو غالب خیال اچھا ہے

یعنی بوسہ دینے کے لیے تیار نہیں۔ بظاہر اس نے دل میں یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ
 اگر مفت مل جائے، یعنی بوسہ دے بغیر دل ملتا آ جائے تو اچھا مال ہے اور مرزا

لے لینا چاہیے۔

مولانا طہطائی فرماتے ہیں کہ دل کا بوسے پر کچھ قبضل معنون ہے، لیکن یہاں محاورے کی خوبی اور جدش کی اداسی اس معنون کو تازہ کر دیا۔

۲۔ لغات۔ ساغرِ جم : جمشید کا پیالہ۔ جمشید ایران کا مشہور بادشاہ تھا۔ کہتے ہیں، شراب اسی نے ایجاد کی۔ اس کے ساغر کی ایک خوبی یہ بتائی جاتی ہے کہ اس سے زمانے کی خبریں مل جاتی تھیں۔

جامِ سفال : مٹی کا پیالہ۔

شرح : شعر کی شرح ہے پیشتر، سمجھ لینا چاہیے کہ شاعر کے سامنے چند بدیہی معانی تھے جو کسی ثبوت کے محتاج نہ تھے، مثلاً :

۱۔ اسے معلوم تھا کہ مٹی کا پیالہ ضایت بے حقیقت چیز ہے۔

۲۔ معلوم تھا کہ ساغرِ جم بہت بیش قیمت اور نایاب تھا۔ دنیا میں وہ ایک

ہی پیالہ تھا، عام اوصاف کے علاوہ اس اعتبار سے بھی اس کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

۳۔ معلوم تھا کہ مٹی کے دس ہزار پیالے بھی جمع کر لیے ہائیں تو وہ ساغرِ جم

کی برابر ہی نہیں کر سکتے۔

یہ اہم ہمدردانے مٹی کے پیالے کی برتری کا ایک ایسا پہلو پیدا کر لیا،

جس سے عقل سلیم کو ایک لمحے کے لیے بھی اختلاف نہیں ہو سکتا اور غالباً مرزا

کی اس حقیقت بانی سے پیشتر کسی کو برتری کے اس پہلو کا کوئی احساس بھی نہ

تھا۔ مرزا نے صرف یہ سوچا کہ پیالے سے شراب پنی جاتی ہے اور شراب نوشی

کے لیے ساغرِ جم اور ساغرِ سفال دونوں یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ جامِ سفال ٹوٹ

جائے تو فوراً سب شے بھٹ بازار سے لاسکتا ہے، ساغرِ جم ٹوٹ جائے تو لکڑی کا بدلہ ہی

نہیں مل سکتا، لہذا۔ جامِ سفال۔ ساغرِ جم۔ سے بددعا جاتا ہے۔

پھر مرزا کے نزدیک اصل شے شراب نوشی ہے۔ پیالہ خواہ کیسا ہی ہو۔

وہ خود عاری کی ایک غزل میں فرماتے ہیں :

نشاطِ جم طلب از آسائے نہ شوکتِ جم

قدحِ مباحثِ ذیاقوتِ بادہ گر جنبی ست

یعنی آسائے سے مجھید کی شان و شوکت نہیں، صرف اس کے عیش و نشاط کی آرزو کرنی چاہیے اگر پیالہ یا قوت کا نہیں تو کیا پروا ہے، شراب خاص انگوری ہونی چاہیے۔

بلکہ وہ تو پیالے کے بھی محتاج نہیں اور کہتے ہیں۔

پلادے اوک سے ساتی ! جرم سے نفرت

پیالہ گر نہیں دیتا اندوے، شراب تو دے

۴۔ شرح : جس فقیر کو سوال کی عادت نہ ہو، وہی اچھا ہوتا ہے،

کیونکہ مانگنے بغیر مل جائے تو اس میں مزہ زیادہ آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شانِ کریبی یہی ہے کہ ہر شخص کو بے طلب دیتا ہے۔

سوال کی عادت پڑھانے تو انسان ذاتی شرف کے احساس سے محروم

ہو جاتا ہے اور اس کائنات میں انسان کی اصل مقام وہی شرف ہے، جو ہر چیز پر مقدم رہنا چاہیے۔

۵۔ شرح : خواہ مائی فرماتے ہیں :

۱۰۔ اسی کے قریب قریب سعدی کا بھی ایک شعر ہے :

گفتہ بودم چو بیا بی غم دل با تو بگویم

چہ بگویم کہ غم از دل بود، چوں تو بیا بی

دو وزن سعدی اور غالب کے شعروں کا ماحصل یہ ہے کہ کسی طرح

اپنی تکلیف یا رنجِ معشوق پر ظاہر نہیں کر سکتے، مگر سعدی کے

بیان میں یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ شاید معشوق عاشق کی غمازی

پر محال دیکھ کر سمجھ جائے کہ اس کا دل مفوم ہے، کیونکہ سعدی کے

بیان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ معشوق کے آنے سے غم مٹا رہتا ہے، نہ یہ کہ ظاہری حالت بھی بدل جاتی ہے، مگر مرزا کے بیان میں یہ احتمال باقی نہیں رہتا۔

محبوب کے آنے سے دل کو ایسی خوشی اور بشارت ہوتی ہے کہ رنج و غم کا کوئی اثر چہرے پر باقی نہیں رہتا۔ اس کے برعکس رونق و تازگی آجاتی ہے۔ یہ حالت دیکھ کر محبوب سمجھ لیتا ہے کہ میرے پیارے عشق کا حال اچھا ہے۔

اس سلسلے میں سعدی کا شعر پیش کرنا غالباً مناسب نہیں۔ خواجہ حاکمی نے اس میں جو احتمال بتایا ہے، اس سے مرزا کا شعر پاک ہے۔ اگر کسی مصنف کو کوئی استاد پہلے پیش کر چکا ہے اور اس میں کوئی پہلو تشدد لگایا ہے، بعد کا شاعر اس تشنگی کو بوجہ احسن دہر کر دیتا ہے تو ہمیں الفضل للمقدم کہہ کر اس کی حیثیت کم نہ کرنی چاہیے۔ متقدمین نے بہت سے مصنفوں کا ذکر کیا، لیکن ایسے مصنف ہیں جو ان کے ہاں شیک نہ بندھ سکے۔ متاخرین نے ان مصنفین کے حسن میں بھی امتداد کیا اور ان کی بندش بھی بہتر سے بہتر بنا دی۔ ایسے موقع پر عمری ہی کا قول صحیح ہے۔

اول ربودیں نظم خود ایشان بسپردہ ندر

پس باز نمودیم بہم منزلی ہم را
یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر متاخر بعض تاخر ذاتی کی بناء پر ہر مقدم سے گویا سبقت نہیں لے جاسکتا۔

۶۔ شرح : خواجہ حاکمی فرماتے ہیں۔

گو یا معشوق کی تمنا میں ایسا مستغرق ہے کہ دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں
ہیں تک کہ پنڈت نے جو سال کو اچھا بتا ہے تو اس کے لیے
یہی معنی سمجھتا ہے کہ شاید اس سال معشوق عاشقوں پر مہربان
ہو جائے، نہ یہ کہ اس سال قحط نہیں پڑنے کا یا وہ نہیں آئے گی۔
یا لڑائیاں نہیں ہونگی وغیرہ۔

مشتق کے نزدیک زمانے کی چھانی اور خوشگوار سی کامیاب صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ حاصل کی کون کون سی مرادیں پوری ہوں گی۔

۷۔ شرح : فرآد کو سنگ تراشی کے سوا اور کیا آتا تھا ؟ اسی سنگ کی بدولت اسے شیریں سے بات چیت کا موقع ملا۔ سنگ تراش کا نشان تیشہ تھا۔ گویا تیشہ فرآد و شیریں کے درمیان بات چیت کا ذریعہ بنا۔ اس بنا پر یہ اصول وضع کر دیا کہ کمال کسی بھی فن میں حاصل کیا جائے، وہ بہر حال اچھا ہی ہوتا ہے۔

۸۔ لغات : مال : انجام، نتیجہ۔

شرح : جس کام کا انجام اچھا ہو، وہ بہر حال اچھا ہوتا ہے کیونکہ کام سے مقصود محض کام نہیں، بلکہ خاص نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کی مثال یوں پیش کی کہ قطرہ دریا میں مل جائے تو خود دریا بن جاتا ہے۔ دریا میں مل کر دریا بن جانا، نتیجہ ہے اور ایک قطرے کا دریا بن جانا نتیجہ اور انجام کی اچھائی کا بڑی ثبوت ہے۔

جن اصحاب نے شعر کے پہلے مصرع کو اصل مقصد قرار دے کر دوسرے مصرع کو اس کی دلیل بنایا، میرے نزدیک وہ غلطی میں مبتلا ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مصرع کے ہم معنیوں اشعار دیوان غالب میں دیکھ کر ان کی توجہ راہ راست سے ہٹ گئی۔ پہلا مصرع صرف مثال ہے۔ مقصود شعر دوسرا مصرع ہے۔

۹۔ لغات : خضر سلطان : بہادر شاہ ظفر کا ایک بیٹا،

جسے ظالم ہاؤس نے ۱۸۵۷ء میں شہزادہ مرزا افضل اور شہزادہ مرزا ابوالکر کے ساتھ دہلی دروازے کے باہر گولی سے شہید کر دیا۔ مختار جاوید اور ملک رام صاحب کا بیان ہے کہ شہادت کے وقت پچیس سال کی عمر تھی۔ گویا خضر سلطان ۱۸۳۱ء کے آمل پ:

پیدا ہوا۔

فخر مرزا کی طرح خضر سلطان بھی مرزا غالب کا شاگرد تھا۔
اچھے شاعر تھا۔ مجموعہ کلام شمس کے ہنگامے میں تلف ہو گیا
صرف چند شعر تذکروں میں رہ گئے۔

تازہ نہال : نیا پورا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ غزل خضر
سلطان کی پیدائش پر لکھی گئی تھی۔ چونکہ پہلے مصرع میں خالق اکبر
سے بنظاہر اکبر شاہ ثانی کی طرف بھی اشارہ ہے، جو اس وقت
بادشاہ تھا، اس لیے خیال ہوتا ہے کہ یہ شعر واقعی خضر سلطان
کی پیدائش پر لکھا گیا تھا اور یہ غزل شمس یا اس پاس کی ہوئی
چاہیے۔

اس صورت میں ایک بحث یہ بھی آنے لگی کہ آیا شاہ سے
مقصود بہادر شاہ ظفر ہیں، جو اس زمانے میں ولی عہد تھے اور ان
کی ولیدہ کی خاصی متزلزل چلی آگہ ہی تھی یا شاہ سے مقصود
اکبر شاہ ثانی ہیں ؟

شرح : شعر دعاویہ ہے، یعنی اشد تعالیٰ جو سب سے بڑا ہے، شہزادہ
خضر سلطان کو سرسبز رکھے ! بادشاہ کے باغ میں یہ نیا پورا بہت اچھا ہے۔
خضر، سرسبز، باغ، تازہ اور نہال کی مناسبتیں محتاج تشریح نہیں۔

۱۰۔ شرح : اسے غالب ! جنت کا جو عام تصور ہے، یعنی باغ، انہری
خوری وغیرہ، اس کی حقیقت ہمیں معلوم ہے، البتہ اس قسم کے خیالات دل
خوش رکھنے کے لیے بڑے اچھے ہیں۔

شعر میں مرزا نے جنت کے متعلق صرف عام افکار کا ذکر کرتے ہوئے
ہیں دل خوش رکھنے کا ذریعہ قرار دیا۔

۱۔ شرح : اسے

عجوب ! اگر میرے مرنے سے
تیری تسلی نہیں ہوئی، اس
امتحان میں سے سرخرو نکلا
تیرے لیے تسکین کا سامان
نہیں ہیں مکالمہ مزید کوئی
امتحان باقی رہ گیا ہے تو اس
کا انتظام بھی کرے تاکہ تیرے
اطمینان میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔

جان دے دینے کے
بعد مزید امتحان کیا ہو سکتا
تھا؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ
لاش کو بازاروں میں گھسیٹا
جاتا یا سلا کر خاکستر اڑا دی
جاتی۔ شاعر کا مقصود ہے
کہ موت اس دنیا میں سب
سے بڑا امتحان ہے جو کسی
فرد کو پیش آ سکتا ہے، لیکن

نہ ہوئی گرمی مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحان اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی
خارِ غارِ المِ حسرتِ دیدار تو ہے
شوقِ گلچینِ گلستانِ تسلی نہ سہی
مے پر پستانِ خمِ مے منہ سے لگائے یہ بنے
ایک دن گر نہ ہوا زہم میں ساقی نہ سہی
نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا
گر نہیں شمعِ سیہِ خانہِ یل نہ سہی
ایک مہنگا مے پر موقوف ہے گھر کی رونق
نوحہِ خمِ ہی سہی نغمہِ شادی نہ سہی
نہ تالش کی تمنا نہ صبر کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی
عشرتِ صحبتِ خوباں ہی قیمتِ بھجو
نہ ہوئی غالب ! اگر عمرِ طبعی ، نہ سہی

اگر محبوب کے نزدیک اس کے بعد بھی کوئی امتحان باقی رہ گیا ہو تو پچھے عاشق کو اس میں ایک لمحے کے لیے بھی تامل نہ ہوگا۔

پھر یہ محض خیال نہیں، بلکہ حق پرستی اور انسانیت دوستی کی تاریخ میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ ہاں ہاں نے جانیں دیں، اس کے بعد ان کی لاشوں سے نہایت نازیبا سلوک روا رکھا گیا۔ یہ شعرا ایسے ہی حقائق کا آئینہ ہے۔

مولانا عابدی لکھتے ہیں: اس شعر پر اگر غالب خدا سے سخن ہونے کا دعویٰ کریں تو خدا گواہ ہے کہ دیا ہے۔ پھر دیکھیے تو، نہ فن معانی کی کوئی خوبی ہے، نہ فن بیان کا کچھ حسن ہے، نہ فن بدیع کے تکلفات ہیں۔

۲۔ **شرح:** اگر میرا شوق تیری کے باغ سے پھول نہیں چن سکا تو نہ سہی۔ محبوب کے دیدار کی حسرت کا جو غم ہے، اس کا خار راز تو موجود ہے۔ سادہ لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر شوق کی تسکین کا سامان ہم نہیں پہنچا تو بچے عاشقوں کے لیے حسرت دیدار کا غم تو موجود ہے۔

۳۔ **شرح:** شراب پیئے دالے دوستو! اگر ایک دن مغل میں ساقی نہیں آیا، اجو باد سی ہادی بھرم بھر کر دیتا اور ہم شراب پیتے تو کچھ پیدا نہیں۔ کیوں نہ ہم شراب کے ٹکے ہی کو منہ سے لگا لیں، اس کے بغیر چارہ ہی کیا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ شراب نوشوں کا گزارہ شراب پیئے بغیر ہو ہی نہیں سکتا ساقی موجود ہو تو وہ ترتیب سے ایک ایک کو خاص پیمانے کے مطابق پلائے گا، لیکن اگر ساقی موجود نہیں تو تقسیم کا معاملہ خارج از بحث ہے۔ اس کے سوا چارہ نہیں کہ ٹکے ہی کو منہ لگا لیا جائے، یعنی جتنی شراب کوئی پینا چاہتا ہے، پی لے۔

اس شعر میں خاص پہلو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر مغل اور ہر دارے کی تنظیم مرکزی شخصیت پر موقوف ہوتی ہے۔ شراب کی مغل میں ساقی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ تمام شراب نوش اسی کے لطف و کرم پر نظر رکھیں گے۔ اگر مرکزی

حسیت موجود نہ ہو تو ترتیب و تنظیم ختم ہو جائے گی۔ ہر فرد بے ترتیبی سے جو چاہے گا، کرے گا، مثلاً شراب کی محفل میں پیمانے کے مطابق پینے کا سلسلہ ختم ہو جائے گا، ہر شخص تنگے کو منہ لگانے کے لیے مضطرب رہے گا۔

۴۔ لغات۔ سیاہ خانہ سیلی : سیلی کا سیاہ گھریہ اس لیے کہا کہ عام روایت کے مطابق سیلی کا خیر سیاہ رنگ کا تھا اور خود سیلی نام بھی سیلی سے ماخوذ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا رنگ کا بھی سانپ لانا تھا۔ مولانا روم نے شغزی میں ایک جگہ لکھا ہے کہ خلیفہ نے سیلی کو بلا کر دیکھا تو وہ چنداں خوب صورت نہ نکلی۔ پوچھا : کیا تو ہی وہ سیلی ہے جس کے لیے مجنوں سرگرداں پھر رہا ہے ؟

از ہمد خوباں تو افزوں نیستی

گفت خامش شو تو مجنوں نیستی

(تو تمام حسینوں سے بڑھی ہوئی نہیں۔ سیلی نے کہا : چپ رہ، تو مجنوں نہیں) مشرح : مجنوں کا وجود صحرا کے لیے چشم و چراغ ہے، بین صحرا بیسے بے رونق مقام میں پوری رونق صرف مجنوں کے دم سے ہے۔ اگر سیلی کے سیاہ غیبی اسے شمع کی حیثیت حاصل نہ ہوئی تو نہ ہی۔

مطلب یہ کہ مجنوں کو سیلی کی بزم ناز میں مستقل مابذ ملا تو کچھ پیدا نہیں۔ اس کے دم سے بیابان میں رونق کا ہنگامہ گرم ہے۔

۵۔ مشرح : گھر کی رونق صرف ایک ہنگامے پر موقوف ہے۔ اگر

مسرت و شادمانی کا نغمہ نصیب نہیں تو کیا معنائیں ہے ؟ علم کا نغمہ ہی سہی۔ کوئی شبہ نہیں کہ اس عارضی اور نا پائدار زندگی میں انسانوں کو مختلف حالات پیش آتے ہیں۔ بعض کو یکے بعد دیگرے شادی و غم دونوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ بعض پوری زندگی عیش و نشاط میں گزار دیتے ہیں، بعض کو رنج و غم سے ایک لمحہ کے لیے بھی فراخ نصیب نہیں ہوتا۔ حقیقت پر نظر رکھنے والے عارف ایسی چیزوں سے بالکل بے نیاز ہوتے ہیں۔ وہ شادی و غم دونوں کو بیچ ہانتے

ہیں اس زندگی میں دل لگی کے لیے کسی ایک کا وجود ضروری ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ اگر ہمیں خوشی نصیب نہیں ہو سکتی تو غم ہی سہی۔

یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ گھر میں رونق کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا مسرت کا ہنگامہ بپا ہوا غم کا۔ مسرت و شادمانی پر بھی لوگ جمع ہوں گے۔ غم و الم اور رنج و ماتم کے موقع پر بھی مجدد ہجوم کر کے آئیں گے۔ اس طرح رونق کا انتظام ہو جائے گا۔ اگر دونوں چیزیں نہ ہوں تو کسی کے لیے آنے کا سبب کیا ہو سکتا ہے اور رونق کا انتظام کیونکر ہو گا؟

۶۔ **مشرع :** اگر میرے شرنا فیوں کے نزدیک سنی سے خالی ہیں تو ہوں۔ نہ یہ آرزو ہے کہ کوئی میری تعریف کرے، نہ یہ خیال ہے کہ کہیں سے صلہ ملے۔

اگر کوئی فرد اپنی کسی چیز کے لیے ستائش کی تمتا اور صلے کی پدا سے بے نیاز ہو جائے تو اس امر کی کیا ضرورت باقی رہ سکتی ہے کہ دنیا اس کی چیز کے بارے میں کیا دانستے رکھتی ہے ؟

مولانا شبلی نے بھی اس سلسلے میں ایک نہایت پر معاملہ شعر کہا ہے، یعنی :

ازدوا از قبول تو خارج نشسته ایم

اسے آنگہ خوب ماند شناسی ز ذشت

جو شخص کسی فرد کی اچھائیوں اور برائیوں میں امتیاز نہ کر سکے، اس کے رد یا قبول کی پدا کیوں ہو؟

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد مرحوم نے ”آپ حیات“ میں بعض تنک باہ لوگوں کی داستانیں لکھی ہیں، جن سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ لوگ مرزا کے کلام کو بے سنی سمجھتے تھے۔ خود بھی ستائش ایسے انداز سے کی ہے، جس میں تعریف کا پہلو صاف نمایاں ہے۔ ساتھ ہی لکھا ہے کہ کلام پر ایسے اعتراضات ہوئے، تو اس ملک بے نیازی کے بادشاہ نے کہ اقلیم سخن کا بھی بادشاہ تھا،

اپنی غزال کے ایک شعر سے سب کو جواب دے دیا :

نہ ستائش کی تبتا ، نہ صلہ کی پروا

گر نہیں ہیں میرے اشعار میں معنی ، نہ سہی

۴۔ لغات - عمر طبعی : عمر کا عام پیمانہ ، جو پہلے ایک سو بیس

سال سمجھا جاتا تھا ، اب پچھتر اور اسی کے درمیان مانا جاتا ہے ۔

شرح : اسے غالب ! اگر ہمیں دنیا میں عام پیمانے کے مطابق زندگی

بسر کرنے کی فرصت نہ مل سکی تو کچھ مضائقہ نہیں ۔ اسی کو غنیمت سمجھنا چاہیے کہ

ہمیں حسینوں کی صحبت میں دن گزارنے کی شادمانی نصیب ہوئی ۔

مطلب یہ کہ عمر طبعی کی آرزو نہیں ، اصل آرزو یہ ہے کہ حسینوں کی صحبت

تیر رہے ۔

۱۔ شرح :

ہم اس خوشی

سے جلاؤ کے

آگے آگے جا

دے ہیں کہ سر

کا سایہ پاؤں

سے دو قدم

آگے ہے ۔

خوشی قتل ہونے

کی ہے ۔ اور

آفتاب چلنے والے

کی پشت پر ہو

عجب نشاط سے جلاؤ کے چلے ہیں ہم آگے

کہ اپنے سامنے سے سراپاؤں سے ہے دو قدم آگے

تصانے تھا مجھے چاہا خراب بادہ الفت

فقط ”خراب“ لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے

غم زمانہ نے جھاڑی نشاط عشق کی مستی

وگر نہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

خدا کے واسطے داد اس جنوں شوق کی دینا

کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامربر سے ہم آگے

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے
 تمہارے آیتوں سے طرہ ہائے غم بہ غم آگے
 دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موجِ خوں ہے
 ہم اپنے زخم میں سمجھے ہوئے تھے اسکو دم آگے
 قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غائب
 ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے
 تو اس کا سایہ پاؤں سے آگے رہتا ہے۔
 خضر میں غریب کا ایک پہلو ہے
 کہ قتل میں سرکش ہے
 اور سہری کو پاؤں سے دو قدم آگے
 تیا ہے۔
 بجنوری مرحوم فرماتے ہیں:

”جب آفتاب روبرو کی پشت کی جانب ہوتا ہے تو سایہ سامنے پڑتا ہے۔ مرزا دوپہر کے قریب مقتل میں جانے کے متعلق اپنا شوق یوں بیان کرتے ہیں کہ میرا سر پاؤں سے دو قدم آگے آگے ہے۔ اس کیفیت کو ہر شخص نصف النهار کے بعد خود دیکھ سکتا ہے۔“

۲۔ شرح : قضا و قدر کی مرضی یہ تھی کہ مجھے شراب باوۃ الغت (شراب محبت میں دروست) رکھے۔ صرف ”خراب“ کا لفظ ظلم سے نکلا تھا، آگے کچھ لکھنا نہ گیا۔ یقیناً اس لیے نہ لکھا گیا کہ ”خراب“ لکھنے کے ساتھ ہی قضا و قدر کے ظلم پر بدستنی طاری ہو گئی۔ گو یا مرزا آفتاب خراب باوۃ الغت ہونے کے بہانے صرف خراب، تباہ حال اور بدست ہو کر رہ گئے۔

۳۔ شرح : زمانے نے ہمیں جو رنج و الم پہنچائے، ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ نشاءِ عشق کا نشہ ہی بہرں ہو گیا اور ہم عشق سے جو لطعت اٹھاتے تھے، ویسی باقی نہ رہا۔ جب تک و جزوی مصیبتیں ہم پر نازل نہیں ہوئی تھیں، ہم محبت کے غم سے خوب مزے لیتے تھے۔

اس شعر میں ”آگے“ پر معنی ”میشہ“ استعمال ہوا ہے۔

۴۔ شرح : عشق کی دیوانگی نے ہمارا جو حال کر رکھا ہے، خدا کے لیے اس کی داد دیجیے۔ یہ کتنا عجیب معاملہ ہے کہ محبوب کو خط لکھ کر قاصد کے حوالے کر دیتے ہیں، لیکن بیتابی و اضطراب میں قاصد سے پہلے محبوب کے دوکانے پر پہنچ جاتے ہیں۔

یہ کرشمہ محبت کی دیوانگی کا ہے۔ دیوانگی کا تقاضا ہی یہ ہے کہ جو حرکت ہو وہ عقل و فہم سے عاری ہو۔ اب ظاہر ہے کہ خط لکھ کر نامہ بر کے ہاتھ بھیج دیا تو خود محبوب کے پاس دوڑے جانے کی کیا ضرورت ہے؟ اسے نہ بھولیے، جنونِ شوق ہے اور حق یہ ہے کہ جنون کے جو مظاہر بیان ہو سکیں، وہ مرزا غالب ہی بیان کر سکتے تھے۔

۵۔ لغات - طرۃ ہائے خم بہ خم : پیچ در پیچ زلفیں، تابدار گیسو۔
 "تمہارے آگے آئے" بددعا ہے، "خدا عواما کہتے ہیں" جو کچھ تم نے کیا ہے، وہ تمہارے آگے آئے۔

شرح : اے محبوب کی پیچ در پیچ زلفوں! ہم نے تمہارے لیے عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں، خدا کرے، وہ سب تمہارے آگے آئیں، یعنی تم ہمیشہ پریشان رہو۔

دیکھیے۔ بقا ہر بددعا دی، لیکن زلفِ محبوب کے لیے اس سے بہتر دعا کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ہمیشہ پریشان رہے، کیونکہ پریشانی زلف کی سب سے بڑی خوبی اور سب سے بڑا نقص ہے۔

۶۔ لغات - زعم : گمان۔

شرح : دل اور جگر میں خون کی ایک لہر تپ رہی ہے، جسے ہم پیشتر اپنے گمان میں سانس سمجھے ہوئے تھے۔

مطلب یہ کہ ہمارے سینے میں سانس نہیں، بلکہ خون کی ایک لہر ہے جو اسی طرح پھر رہی ہے، جس طرح پندہ پر پھڑپھڑاتا ہے۔

مولانا علی ہاٹھائی نے فرمایا ہے کہ دل کا تعلق تو سانس سے ہے، مگر جگر میں سانس کہاں؟ سانس پھیپھڑے میں ہوتا ہے، لیکن پھیپھڑا یا اس کا فارسی شش یا عربی - ریئہ - قیضوں غیر فیصیح تھے، لہذا شاعر نے ان کی جگہ - جگر - لکھ دیا کہ بعض اندرونی شے کو بھی جگر کہتے ہیں۔

۴۔ - شرح : اسے غالب! جن لوگوں کو بیشتر مجھ سے اتنی محبت تھی کہ میری جان کی قسم کھاتے تھے، وہ میرے جنازے پر نہ آنے کی قسم کھاتے ہیں، یعنی آنے سے انکار کر رہے ہیں۔

مطلب یہ کہ بیشتر افراد زندگی میں انسان سے انتہائی محبت کے باوجود مرنے کے بعد اس سے یکایک بیزار ہو جاتے ہیں۔ یہ عام تجربہ ہے، خصوصاً ہمارے دور میں، کیونکہ یہ دور سراسر مادہ پرست اور فحش باز ہے چونکہ مرنے کے بعد انسان سے بظاہر کوئی مادی فائدہ اٹھانا ممکن نہیں رہتا، اس لیے بے تعلقی اختیار کر لیتے ہیں۔ مرزا کے زمانے میں بھی عام حالت ایسی ہی تھی۔



۱۔ شرح :

میرا بے ہر محبوب
شکوے کے نام سے
خفا ہوتا ہے۔ وہ
نہیں چاہتا کہ اس
کے ظلم و جور بے انتقامی
اور تغافل کے بارے
میں کچھ زبان پر لایا
جائے۔ اتنی بات
بھی مجھے زبان پر

شکوے کے نام سے بے ہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کیسے تو گلا ہوتا ہے
پڑ ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے
گو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو
شکوہِ جور سے سرگرم جفا ہوتا ہے

نہ لانی چاہیے کیونکہ
یہ بھی گلے ہی کی
ایک صودت ہے۔

۲- میں گلے

شکوے سے اس
طرح بھرا ہوا ہوں

جیسے باجا راگ سے
بھرا ہوتا ہے۔ اُسے

چھوڑتے ہی نئے
بھگنے لگتے ہیں۔ مجھے

بھی ذرا چھوڑ کر تاشا
دیکھیے، گلے شکوے

کیونکر شروع ہو جاتے
ہیں اور شروع ہو

جائیں گے تو اُن کا
سلسلہ ختم ہی نہ

ہوگا۔

یہ مصنوعی مرزا
نے ایک اور شعر

میں بھی لکھا ہے:

اُن مرزا سدا بامنگ شایستہ
ہے ہی بترک و گانہ می نہ میشتہ و بے

عشق کی راہ میں ہے چرخِ کمکوب کی وہ چال

سُست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

کیوں نہ ٹھہریں بہتِ ناکب بیداد کہ ہم

آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ

کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب

لبِ ٹنگ آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

خامہ میرا کہ وہ ہے بار بد یزیم سخن

شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

اے شہنشاہ کو اکب سپہ و مہرِ مسلم!

تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

ساتِ اقلیم کا حاصل جو فزا ہم کیجے

تو وہ لشکر کا ترے نعلِ بہا ہوتا ہے

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے بلال

تیرے مددِ ناصیہ سا ہوتا ہے

میں جو گستاخ ہوں آئیں غزل خوانی میں

یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

رکھیںو غالب ! مجھے اس تلخ نوائی میں معنا

آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

۳۔ لغات :

حسنِ تلافی : جبر

طریق پر بد لا دینا :-

کسی کام کے سر انجام میں

کوئی کمی یا غای رہ جائے

تو اسے بہتر طریق پر پورا

کر دیتا۔

شرح : اگرچہ میرا محبوب کسنی یا ساوگی کے باعث میرے شکووں

اور گلوں کا مقصد نہیں سمجھتا، لیکن حسنِ تلافی ملاحظہ کیجیے کہ میں جب کبھی اس کے غلم و ستم کی شکایت کرتا ہوں تو وہ پہلے سے زیادہ غلم و ستم شروع کر دیتا ہے۔

حسنِ تلافی سے ظاہر ہے کہ عاشق کا مدعا مزید غلم و جور کے سوا کچھ نہیں محبوب اس حقیقت کو نہیں سمجھتا، تاہم جب کبھی شکایتیں سنتا ہے تو مدعا کیے بغیر مزید جور شروع کر دیتا ہے۔

یہ مضمون بھی مرزا غالب نے ایک اور جگہ باندھا ہے :

نالہ تجزِ حسنِ طلب اسے ستم ایجاب ! نہیں

ہے نفاذ سے جفا، شکوہ بیدا نہیں

۴۔ لغات - ملوکب : تاروں بھرا۔

شرح : عشق کے راستے میں ستاروں بھرے آسمان کی چال ایسی

ہے جیسے وہ شخص آہستہ آہستہ چلتا ہے، جس کے پاؤں چھالوں سے بھرے ہوئے ہوں۔

آسمان کو تاروں بھرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تارے آلبوں سے مشابہ

ہوتے ہیں۔ گویا آسمان کے تارے بھی دراصل تارے نہیں، بلکہ اس کے پاؤں کے چھالے ہیں۔

۵۔ لغات - بدوف : نشاء

ناوک : تیر

شرح : ہم ظلم کے تیر کا نشانہ کیوں نہ بنیں ؟ اگر کوئی تیز نشانی پر نہیں جھپٹتا اور غلط ہو جاتا ہے تو ہم خود اسے اٹھلاتے ہیں اور ناوک انداز کے چولے کر دیتے ہیں۔ یوں وہ سمجھ جاتا ہے کہ ہمیں اس کا نشانہ بننے کی انتہائی اُردو ہے۔

۶۔ شرح : ہماری قسمت کے ستارے کی نحوست کا یہ حال ہے کہ ہم بھلا کرنے کے خواہاں رہتے ہیں اور اس سلسلے میں انتہائی کوشش کرتے ہیں، لیکن نتیجہ ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔ گویا ہم جو چاہتے ہیں وہ نہیں ہوتا، بلکہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر کیا اچھا ہوتا کہ ہم شروع ہی سے اپنے بدخواہ بن جاتے۔ چونکہ ہر چیز ہماری خواہش کے خلاف ہوتی ہے، اس بنا پر اپنی بدخواہی یقیناً بھلائی کا سبب بن جاتی۔

۷۔ شرح : پہلے میری مزید وفتاں میں اتنا ندر تھا کہ وہ عرش سے بھی آگے نکل جاتی تھی۔ اب یہ کیفیت ہے کہ کسی مزید میں زیادہ سے زیادہ بھائی کی قوت ہو تو وہ سب تک آتی ہے، ورنہ اکثر آپیں سینے ہی میں رہ جاتی ہیں۔

۸۔ ۱۲۔ لغات : باربد : خسرو پرویز شہنشاہ ایران کا مشہور درباری گویا، جو شیراز کی سمت کارہننے والا تھا۔

کو انکب سپہ : جس کی فوج ستارے ہوں یا شمار میں ستاروں کے برابر فوج والا۔

ہر علم : سورج کے جھنڈے والا یا وہ جس کا جھنڈا یا پرچم سورج جیسا ہو۔

راکرام : عزت، توقیر، بخشش، عطا۔

نعل بہا : فارسی محاورے میں وہ رتم جو کسی حملہ آور کو ملک سے اُپس کرنے کے لیے ادا کی جائے۔ اسے بدیں و بہ نعل بہا کہتے ہیں کہ وہ حملہ آور کے

گھوڑوں کے نعلوں کی قیمت ہوتی ہے۔ نعل بندی کی رقم کو بھی کہہ سکتے ہیں۔
ناصیر سا۔ پیشانی، گھٹنے والا۔

شرح : میرے تلم کو شعر کی محفل میں خسو پرویز کے معنی کی حیثیت حاصل ہے، جس کا نام بار بد تھا۔ اب میرا قلم غزل کو چھوڑ کر بادشاہ کی درج میں یوں نغزدہ ہوتا ہے۔

اے شہنشاہ! جس کی فوج ستارے اور جس کا علم سورج ہے! جس کی فوج ستاروں کے برابر اور جھنڈا سورج جیسا ہے، تو نے جس جس کو عزت و توقیر بخشی اس کا حق کون ادا کر سکتا ہے؟

اگر سات ولایتوں یعنی پوری دنیا کی آمدنی اکٹھی کر لی جائے تو وہ رقم تیرے لشکر کے گھوڑوں کی نعل بندی کی اجرت ہوگی۔

ہر مہینے پورا چاند چل رہا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ تیری ولایت پر پیشانی بگھتا رہتا ہے۔ میں پیشانی گھٹتے گھٹتے چاند کو گولائی رفتہ رفتہ ختم ہوتی رہتی ہے، یہی تیرے کہ وہ صرت چل رہا ہے۔

میں نے غزل کہتے کہتے درج شروع کر دی، گو یا غزل کے دستور کی پابندی نہ کرتے ہوئے گستاخی سرزد ہوئی۔ یہ بھی تیرے ہی لطف و کرم کا کرشمہ ہے، جو مجھ میں درج کا ذوق صعب بڑھاتا رہتا ہے۔

۱۳۔ لغات۔ تلخ قوائی۔ وہ باتیں کتنا جوتلخ ہوں۔ درد بھرے نغمے لالچا

شرح : اے خات! میں درد بھرے نغمے لالچا رہا ہوں۔ لیکن صافی کا خواہشگار ہوں۔ انیس سن کر بے مزہ نہ ہونا۔ کیونکہ مجبور ہوں۔ آج میرا دل بہت دکھی ہے۔



ہر ایک بات پر کہتے ہو تم کہ ”تو کیا ہے“
۱۔ شرح : اے محبوب! میں جو بھی بات زبان پر لاتا
تھیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟

ہوں، اگدینے ہو، تو کون ہے؟
تیری کیا حقیقت ہے؟ خود ہی
فراؤ کہ آخر بات حیت کا یہ کونسا
طریقہ ہے؟

چاہیے یہ کہ بات اعلیٰ
سے سنی جائے، اس پر حوز
کیا جائے۔ اگر اس میں واقعی
کوئی غامی ہو تو کڑ دیا جائے کہ
یوں نہ ہو، لیکن یہ کیا طریقہ
ہے کہ سنتے ہی بول اٹھے، تیری
کیا ہستی ہے؟

۲۔ **مشرع جب**
میں چاہتا ہوں کہ محبوب کو شعلہ
سمجھ لوں تو سوچتا ہوں کہ شعلے
میں تو وہ کرشمے نہیں ہو سکتے
جو اس شعلہ میں ہیں۔ پھر جانتا
ہوں کہ اسے بھل تو رہو دے لوں
مگر بھل میں اس کے سے عشوے
اور اداسی کہاں پائی جاتی ہیں؟
اگر وہ شعلہ تند تو شعلہ نہیں،
بھل نہیں تو خدا کے لینے بتاؤ
وہ ہے کیا؟

۳۔ لغات -

نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شعلہ تند ہو گیا ہے؟
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگر نہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے؟
چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیر امن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے؟
جلا ہے جسم جہاں دل بھی بھل گیا ہو گا
کڑیدتے ہو جواب را کہ حُبِ تنہو کیا ہے؟
رگوں میں دوڑتے پھرتے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے؟
وہ چیز جس کے لیے ہم کو جو بہشت عزیز
سوانے باوہِ گلغامِ دُشکبُو کیا ہے؟
پیوں شراب اگر تخم بھی دیکھ لوں دو چادر
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے؟
رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس اُمید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے؟

جوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
بد آموزی : بری
باتیں سکھانا، غلط راستے
پر ڈالنا۔

شرح : اسے محبوب اتم رقیب سے باتیں کرتے ہو۔ اس بات کا تو کوئی فکر
نہیں کردہ قصیں بُری باتیں سکھا دے گا یا غلط راستے پر ڈال دے گا، کیونکہ تم کسی کے
چلنے میں آہی نہیں سکتے، البتہ یہ رنگ مارے جا رہا ہے کہ اُسے تم سے بات چیت کرنے
کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔

۴۔ م۔ شرح : ہمارا پیرا بہن لو کی بدولت بدن پر چپک گیا۔ اب ہمارے
گریبان کا چاک رفو کرنے کی کو آ، ضرورت نہ رہی۔

جسم سے خون نکل آئے اور اس میں کپڑا تر ہو جھٹے تو وہ خشک ہو کر اس طرح جسم
سے چپک جاتا ہے کہ اسے بمشکل الگ کرتے ہیں۔ اکثر دیکھا ہو گا کہ زخموں پر پتی باندھتے
ہیں تو ابتدا میں وہ بھی لو کی نمی کے باعث زخم سے چپٹ جاتی ہے۔
میرزا نے یہ معنوں فارسی کے ایک شعر میں بھی اندھا ہے :

ہو تن چسپید بازم از خم خوتاہ چیرا ہن
خراش سینہ سطر بخنہ شد چاک گر سیاں را

۵۔ شرح : سوزِ عشق نے جہاں جسم کو جلا دیا وہاں دل بھی جل گیا ہو گا۔
اے محبوب ! اب راکھ گریہ نے سے تمہارا مقصد کیا ہے ؟ اگر دل کی تلاش ہے تو بالکل
غفلت ہے، کیونکہ وہ جسم کے جل جانے کی حالت میں محفوظ کیونکر رہ سکتا ہے ؟
۶۔ شرح : ہم اس لو کے قائل نہیں جو لوگوں میں دوڑتا پھرتا ہے ہمارے
نزدیک تو جو لو آئندہ سے نہ چلے وہ لو کیا ہوا ؟

مرانا طلبا باقی فرماتے ہیں :

- شرار اپنے غم دوست ہونے کا معنوں بہت کہا کرتے ہیں، مصنف نے اسے
نئے پہلو سے کہا اور حسن بندش دے کر لکھی اور انے اور بھی تکلف معافی کا پڑھادیا ہے :

۷۔ **شرح :** جنت میں ہمیں بہت سی نعمتیں ملیں گی۔ ہر قسم کے پھلوں اور دوسری نعمتوں کے علاوہ چار قسم کی ہنروں کا ذکر تو خود قرآن مجید میں ہے، مثلاً پانی کی ہنری، جو بگڑتا نہیں، دودھ کی ہنری، جس کا مزہ نہیں بدلتا، صاف کیے ہوئے مشد کی ہنری اور شراب کی ہنری، جو پیئے والوں کے لیے لذت کا باعث ہوں گی۔ مرزا افرزاتے ہیں کہ بہشت کی عام نعمتوں میں سے جس نعمت کی بدولت ہمیں یہ عزیز ہے، وہ شراب کے سوا کیا ہے، جو پھول کی طرح سرخ ہو اور اس سے مشک کی پٹیں آئیں، لذۃ اللشائین۔

۸۔ **شرح :** میں شراب کے دو حد منگے دیکھ لوں تو پینا شروع کروں۔ یہ صراحتی، پایہ، کوکڑھ اور سبکیا حیثیت رکھتے ہیں ؟ اتنی تنویدی شراب دیکھ کر میرے دل میں پینے کا شوق جوش زن ہو سکتا ہے ؟

۹۔ **شرح :** اذل تو ہم ضعف سے اس حالت کو پہنچ گئے کہ بات کرنے کی تاب و توان ہی نہ رہی اگر کچھ کڑ بھی سکتے ہوں تو کس اُمید پر کہیں کہ ہماری آرزو کیا ہے ؟

گویا محبوب نے عمر بھر تو بات نہ پوچھی، یہاں تک کہ ہماری زندگی کا آخری وقت آگیا اور بولنا بھی مشکل ہو گیا۔ اب بھی حرفِ مطلب زبان پر نہیں تو اُمید کیا ہے کہ وہ توجہ سے سنا جائے گا ؟

مولانا طابعا بائی فرماتے ہیں :

- اُفتِ رے ضبط کہ آرزو میں کام تمام ہو گیا، احاطتِ گفتار تک باقی ۔

نہ رہی، اگر کہیں زبان سے حرفِ شوق نہ نکلا۔ ہائے نا اُمیدی ! جس نے

عزمِ مطلب کا خون کر کے دل کی دل ہی میں رجنے دی ؟

۱۰۔ **شرح :** غالب کو بادشاہ کا مصاحب بنایا گیا ہے اور اس عزت پر وہ اترتا پھرتا ہے، اور نہ خیر میں اسے کون پوچھتا ہے ؟

مولانا طابعا بائی فرماتے ہیں : ”شاعروں کے لیے ذرے کو آفتابِ قطرے کو

دیا اور ادنیٰ کو اعلیٰ بنا دینا ایک متبذل معنوں ہے جسے حبلہ خیرتہ میں لوگ کہا کرتے ہیں۔ مصنف کی انشا پردازی کا نود دیکھیے کہ اس پر اسے معنوں کو حبلہ خیرتہ میں ادا کیا ہے :

میں انہیں چھڑوں اور کچھ نہ کہیں چل نکلتے جوئے پیے ہوتے
 قمر مویا بلا ہوا جو کچھ ہو کاش کے تم میرے لیے ہوتے
 میری قسمت میں غم گر اتنا تھا دل بھی یارب اکئی دیے ہوتے
 آہی جاتا وہ راہ پر غالب کوئی دن اور بھی جیسے ہوتے

۱۔ لغات - چل نکلتا : حد سے بڑھ جانا، تیز ہو جانا۔
 مشرح : تعجب کی بات ہے کہ میں انہیں چھڑوں اور وہ کچھ نہ کہیں۔ اگر وہ نشے کی جاگت میں ہوتے تو مزدور مجھ پر برس پڑتے اور ایک ہنگامہ بپا ہو جاتا۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب شراب کے نشے میں آپسے باہر ہو جاتا ہے۔ اگر نشے کی حالت نہ ہو تو چھڑ چھاڑ کی بھی چنداں پروا نہیں کرتا۔

۲۔ مشرح : میں نے انا کہ تم قمر مویا بلا ہوا آفت جو یا قیامت جو جو کچھ بھی ہو کاش میرے لیے اور صرف میرے لیے ہوتے۔

شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ عاشق نے محبوب سے بات کی اور اپنی دلی آرزوؤں کا اظہار کیا۔ محبوب نے بے پروائی کے انداز میں کہہ دیا کہ تجھ سے عشق تو محبت تو کرتے ہو، لیکن یہ بھی جانتے ہو کہ میں کیا ہوں؟ میں قمر ہوں، بلا ہوں۔ عاشق کہتا ہے کہ جو کچھ بھی ہو، مجھے منظور ہے۔ مگر صرف میرے بنے رہو۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی ایک اسلوب بیان ہے، جن میں ایک طرف محبوب کی تند خوئی، ہنگامہ آرائی اور بے پروائی کی تصویر کھینچی گئی ہے اور دوسری طرف اپنے

انتہائی شوق و حسرت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

۳۔ شرح : شعر کائنات مطلب یہ ہے کہ غم و اہم کی مقدار اتنی بڑھ گئی جسے سنبھالنے کے لیے ایک دل کافی نہ تھا، بلکہ بہت سے دل ہونے چاہیے تھے۔ ایسے موقع پر تشریح اعضا کے سوالات پیدا کرنا بالکل بے محل ہے۔ شاعر اپنا تاثر پیش کر رہا ہے اور اس کے لیے طریقہ ایسا اختیار کیا ہے جو بالکل طبعی اور فطری ہے۔ غموں کا تحمل دل کا کام ہے۔ شاعر کہتا ہے: میرے غموں کی فراوانی کا معاملہ حد سے بڑھ گیا ہے۔ اگر قضا و قدر نے غم کی اتنی بڑی مقدار میرے لیے مقدر کر دی تھی تو کاش مجھے دل بھی زیادہ دے دیتے مگر میں اس مقدار کو خفیت دلوں میں بانٹ دیتا اور ان کی برداشت ممکن ہو جاتی۔ یہ اسلوب ہماری زبان میں بالکل نیا ہے کہ اتنا بدیع اور دلآویز ہے، جس کا نطفہ بیانی نہیں، صرف وجدانی ہے۔ مردہ اس طرح آنکھوں کے لیے بھی ایک جگہ ناکافی ہونے کا اظہار کیا ہے۔

ہے خون جگر جوش میں، دل لکھوں کے دغا

جوتے جو کئی دیدہ خوشنما بہ فشاں اور

۴۔ شرح : اسے غالب ! اگر ہماری زندگی کچھ دن اور ساقد و تھی اور

عجوب کی طلب میں بدستور سرگرم رہتے تو وہ ضرور ہمارا کتنا مان لیتا۔

بظاہر اس شعر میں دو پہلو پیش کیے گئے ہیں اور دونوں متضاد ہیں۔ اول یہ کہ عام زندگی عجوب کو راہ پر لانے کے لیے کافی ثابت نہ ہوئی۔ اس باب میں مزید سہی و کوشش کی ضرورت تھی، جو کچھ مدت اور بچھنے ہی کی بنا پر کی جاسکتی تھی۔ دوم یہ کہ یوں ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ محبوب ایسا نہیں کہ کتنا بالکل نہ مانے، البتہ منت سماجت کے لیے وقت زیادہ صرف کرنا پڑتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاعر نے معاملہ امید و بیم کے درمیان متعلق رکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محبوب کی روش ایسی نہیں، جو بالکل بالیوسی پیدا کر دے۔ اگرچہ ہماری زندگی میں وہ ہم پر ہرمان نہ ہوا۔

غیر نئی محفل میں بوسے جام کے ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے
 خشکی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ جھکنڈے میں چرخ نیلی نام کے
 خط لکھیں گے گرم مطلب کچھ نہ ہو ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
 رات پی زمزم پہ نئے اور صبح دم دھوئے دھبے جامہ احرام کے
 دل کو آنکھوں نے پھنسا یا کیا مگر یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دم کے
 شاہ کی ہے غسلِ صحت کی خبر دیکھیے کب دن پھرں حمام کے
 عشق نے غالب نکمّا کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

۱۔ **مشرح :** محفل سے مراد محبوب کی محفل ہے اور پیغام سے اشارہ پیغام طلب کی طرف ہے۔ یعنی اسے محبوب ! غیر تو تیری محفل میں پساؤ کے بوسے سے ہے میں گویا جامِ مبرہر کر شراب پی رہے ہیں اور ہم پیغام طلب کے لیے بھی تشنہ لب ہیں، یعنی بلاوے کو بھی ترس رہے ہیں۔

۲۔ **لغات :** خشکی : تباہ حالی، خسرو دل، بربادی۔

مشرح : ہم اپنی بربادی و تباہ حالی کا گلا تم سے کیا کریں ؟ یہ تو نیلے رنگ کے آسمان کی حیلہ بازیوں، حیلاریاں اور رستگاریاں ہیں۔ یعنی ہم پر جو مصیبتیں آئیں، وہ ہماری تقدیر میں تھیں۔ اسے محبوب ! تم سے ان کا گلہ کیا ہو سکتا ہے ؟

۳۔ **مشرح :** ہم برابر تمہیں خط لکھتے رہیں گے۔ اگر کہنے کے لیے کوئی نئی بات نہ ہو، کیونکہ جو کچھ کہنا تھا، وہ بہت پہلے کہ چکے ہیں۔ ہمیں خط کے مضمون سے اپنی طرف من نہیں، صرف یہ چاہتے ہیں کہ تمہارا نام یاد رکھیں، کیونکہ ہم اسی کے عاشق ہیں۔

۴۔ لغات - زمزم : کتبہ مکرمہ کا مشہور کنواں، جو کعبے سے صرف چند گز کے فاصلے پر مسجد الحرام کے اندر واقع ہے۔ اس کا پانی پینا مسنون ہے۔ علاوہ بریں صحت کے لیے بے حد مفید ہے۔ لوگ پیسے، ڈبے اور ڈبیاں بھر بھر کر بطور تبرک اطراف عالم میں لے جاتے ہیں۔

جامئہ احرام : احرام کے سنی ہیں اپنے اوپر حرام کر لینا۔ حج اور عمرہ کے موقع پر حرم پاک جانے کے لیے ایک خاص لباس پہنا جاتا ہے، جسے جامئہ احرام یا محض احرام بھی کہتے ہیں۔ یہ صرف دو چادریں ہوتی ہیں، ایک کمر میں باندھنے کے لیے، دوسری اوڑھنے کے لیے۔ ان میں سلاخی بالکل نہیں ہوتی، سرنگار کٹا جاتا ہے۔ مختلف اطراف کے آدمی حج و عمرہ کے لیے جائیں تو ہر طرف خاص مقامات مقرر ہیں، جہاں سے غسل کے بعد یہ لباس پہن لینا چاہیے ساتھ ہی ادا سے حج و عمرہ کے بعد جامئہ احرام اتارنے تک لباس احرام پر خاص پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں اور اس سلسلے میں بعض جائز امور بھی متین وقت کے لیے ترک کر دیے جاتے ہیں۔

شرح : رات بھر ہم زمزم پر بیٹھے شراب پیتے رہے۔ صبح ہوئی تو اسی کے پانی سے جامئہ احرام کے دھجے دھو کر ذرا ترین حرم پاک میں شامل ہو گئے۔ بظاہر اس سے مقصود رندی نہیں، بلکہ یہ بتانا چاہتے ہیں، ہم نے ہر حال میں بے شمار گناہ کیے، لیکن حج کر کے ان گناہوں سے پاک ہو گئے، کیونکہ حج تمام پچھلے گناہ دھو ڈالتا ہے۔

۵۔ لغات - کیا : کیا، کس طرح، کیونکر۔

شرح : دیکھیے، میری آنکھوں نے کس طرح میرے دل کو تمہارے عشق کے حال میں پینسا دیا۔ شاید میری آنکھیں بھی تمہارے حال کے محلقے ہیں۔

مطلب یہ کہ زمیری آنکھیں تھیں دیکھتیں، مژدول تھاری محبت کے چنپے وہی
 میں چنتا۔ آنکھوں کو تھارے ہال کے سلقے اس لیے کتابوں کو اسٹوں نے وہی
 کام انجام دیا، جو تھارا سلقے گیسو انجام دیتا۔

۶۔ مشرح : افواہ ہے کہ بادشاہ نے بیماری سے شفا پائی اور غسل صحت
 کرنے والے ہیں۔ دیکھیے، حاتم کے دن کب بھر ہیں، اس کی منت کب سازگار
 ہو اور اس کی تقدیر کو کب چار چاند لگیں !

بہادر شاہ جو لاٹھی ۵۶۳ھ میں سخت بیمار ہو گئے تھے۔ بیماری نے طول
 کھینچا اور خاصی مدت تک ان کی صحت کے بارے میں پریشانی رہی۔ شفا ہوئی
 تو غسل صحت کا انتظام کیا، مگر ضعف کے باعث غسل ۶۱۔ صفر ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۵ء) میں
 ۵۶۳ھ تک ملتوی رہا۔ بظاہر یہ غزل اگست یا ستمبر ۵۶۳ھ کی ہے۔ یعنی شفا
 اور غسل کی درمیانی مدت کی۔

۷۔ مشرح : اسے غالب ! عشق نے ہمیں کسی کام کا نہ رکھا اور نہ ہم
 چنداں گئے گزرے نہ تھے۔ خود مرزا نے ہر گوپال تفتہ کو ایک خط میں یہ شعر
 لکھتے وقت تھوڑا سا تصرف کر دیا تھا، یعنی :

ضعف نے غالب نکتا کر دیا

رایح الدین اتھو نے "سیر وہی" میں لکھا ہے کہ میں نے یہ شعر مرزا کے

سامنے پڑھا تو فرمایا : "بھئی اچپ رہو، یوں کہو کہ :

ضعف نے غالب نکتا کر دیا

یا

دوسرے غالب نکتا کر دیا

عشق کیسا، عاشق کا وہ زمانہ نہ رہا۔

(احوال غالب ص ۵۵)

پھڑاس انداز سے بہار آئی کہ ہوئے مہر و ماہ تماشا ئی
 دیکھو اے ساکنانِ خطہ پاک! اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
 کہ زمیں ہو گئی ہے سرتاسر روکشِ سطحِ چسرخِ مینائی
 سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی بن گیا روئے آب پر کائی
 سبزہ دگل کے دیکھنے کیلئے چشمِ زرگس کو دی ہے مینائی
 ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادِ نوشی ہے بادِ پیمائی
 کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب شاہِ دیندار نے شفا پائی

۱۔ **شرح :** یہ ایک مستقل نظم ہے جس کے تمام شعر مسلسل چلے جا رہے ہیں۔ پھر بہار ایسے دکاش اور دلاویز انداز میں آئی کہ آسمان پر پاند اور سورج اس کے تماشا ئی بن گئے، یعنی اس سے طعت اٹھانے لگے۔

۲۔ **شرح :** اسے خطہ خاک یعنی زمین کے بننے والو ادنیٰ کی آرائش و زیبائش کہتے ہیں، یعنی بہار نے آکر دنیا کے گوشے گوشے کو آراستہ کر دیا۔

۳۔ **لغات :** روکش : خرمندہ کرنے والا۔

چرخِ مینائی : نیلے رنگ کا آسمان۔

شرح : زمین ایک سرے سے دوسرے سرے تک سبز ہو گئی اور نیلگوں آسمان کی سطح بھی اس کے سامنے شرمسار ہونے لگی۔

۴۔ **شرح :** سبزے کی کثرت کا یہ عالم ہوا کہ جب اس کے پے زمین پر کوئی جگہ باقی نہ رہی تو وہ پانی کی سطح پر کائی بن گیا۔

۵۔ **شرح :** سبزے اور پھولوں کو دیکھنے کے لیے عام آنکھیں تو بقیں ہیں۔

جوش بہار نے زنگس کی آنکھ میں بھی بینائی پیدا کر دی۔

۶۔ لغات : باد و پیمائی : ہوا پھانکنا ، محاورے میں فضول اور عثت کام کرنا۔

مشرح : بہار کے باعث ہوا میں شراب کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے اور شراب نوشی اب ایک فضول کام ہے یا ہوا میں چلیں پھریں تو شراب نوشی کا سوا حاصل ہوتا ہے۔

• باد و پیمائی کے دونوں معنی لیے جا سکتے ہیں۔ اول بہار کی ہوا اس درجہ نشا انگیز ہے کہ بادہ نوشی کی ضرورت نہیں رہی ، کیونکہ ہوا میں شراب کی تاثیر موجود ہے۔ دوم یہ کہ ہوا کھانے کو نکلیں تو یہ بھائے خود بادہ نوشی ہے۔ گویا ہوا کھانا جی شراب پینا ہے۔

۷۔ مشرح : اے غالب ! دنیا کو کیوں خوشی نہ ہو ، بہار سے دیندار بادشاہ کو اللہ نے اپنی رحمت سے شفا بخشی۔

۱۔ لغات :

تغافل دوست : تغافل دوست ہوں میرا دماغ عجز خالی ہے بے توجہی اور بے التفاتی کو پسند کرنے والا۔
پہلو تھی کرنا : اگر پہلو تھی کیجے ، تو جا میری بھی خالی ہے
کنارہ کشی اور علیحدگی
افتقار کرنا ، پرہیز کرنا۔
رہا آباد عالم اہل بہمت کے نہ ہونے سے
بھرے میں جس تعدد جام و سبلو میخانہ خالی ہے

مشرح : میں توجہ کو نہیں ، بے توجہی کو ، تو امتنع کو نہیں ، بے رشی کو پسند کرتا ہوں اور میرے عجز کا دماغ بہت بلند ہے۔ یعنی میری عاجزی اور کرنسی کا پایہ بہت اونچا ہے۔ اگر آپ مجھ سے محفل میں کنارہ کشی کریں اور بے التفاتی

برتن تو میری جگہ میں آپ کے لیے خالی ہو گی۔

مصلحت میں جگہ خالی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تعظیم کے طور پر کسی کے لیے اپنی جگہ خالی کر دی جائے، یعنی آپ بے اتفاقی برتن تو میں بھی جگہ چھوڑ دوں گا۔ شعر کا پورا مضمون ”پہلو تھی“ اور ”ہا خالی“ کرنے پر مبنی ہے۔ مراد یہ ہے کہ میں بے اتفاقی کو اپنے لیے تعظیم و تکریم کا باعث سمجھتا ہوں۔

یہ مضمون فارسی میں بھی ایک جگہ کہا ہے :

در آغوش تغافل عرض گیر گئی تو اوں ویرن

نتی نامی کنی پہلو ۰ ہ ما بنودہ جارا

۲۔ شرح : خواجہ حاتّی فرماتے ہیں :

”یہ خیال شاید کسی اور کے دل میں بھی گزرا ہو، مگر تفصیل نے اس کو بالکل ایک اچھوتا مضمون بنا دیا ہے اور شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں اگر اہل بہت کا وجود ہوتا، جو دنیا کو محض ناچیز سمجھ کر اس کی طرف التفات نہ کرتے تو دنیا ویران ہو جاتی، پس جانتا چاہیئے کہ عالم اسی سبب سے آباد نظر آتا ہے کہ اہل بہت مفقود ہیں۔ یعنی جس طرح میٹانے میں جام و سبو کا شراب سے بھرا رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ میٹانے میں کوئی میٹھا نہیں ہے، اسی طرح عالم کا آباد ہونا دلالت کرتا ہے کہ اس میں اہل بہت مفقود ہیں۔“

اہل بہت سے مقصود ہے دنیا کو ٹھکرانے اور اس سے بے نیاز رہنے والے لوگ! اگر ایسے لوگ موجود ہوں تو دنیا ویران ہو جاتی۔ چونکہ وہ آباد ہے، اس لیے سمجھنا چاہیے کہ اہل بہت ناپید ہیں۔ مثال اس کی یہ ہے کہ اگر شراب خانے میں پیالے اور ٹھکے شراب سے بھرے ہوئے موجود ہوں تو سمجھ لینا چاہیے کہ شراب خانہ میٹھا رہے گا، کیونکہ اگر وہ موجود ہوتے تو جام و سبو

شراب سے بھرے کیونکر رہتے ؟

اور پھر وہ بھی زبانی میری	کب وہ سنتا ہے کہانی میری؟
دیکھ خوں تا بہ نشانی میری	خلش غمزہ غوریز نہ پوچھے !
مگر آشفۃ بیانی میری	کیا بیاں کر کے مراد میں گے یار؟
بھول جانا ہے نشانی میری	ہوں زخوردفۃ بیدائے خیال
رُک گیا دیکھ روانی میری	متقابل ہے مقابل میرا
سخت اسڑاں ہے گرانی میری	قدرِ سنگِ سرور رکھتا ہوں
صرصرِ شوق ہے بانی میری	گرو بادِ رو بے تابی ہوں
کھل گئی ہیچ مدانی میری	دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا
نگب پیری ہے جوانی میری	کر دیا صغف نے عاجز غائب

۱۔ مشرح : محبوب میرے عشق کی دردناک داستان سننے کا روادار کیا ہو سکتا ہے ؟ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ داستان میری زبان سے سُنے۔ جب اس داستان کا کسی کی زبان سے بھی سنتا لیکن نظر نہیں آتا تو خود میری زبان سے سُنے کی امید کیا ہو سکتی ہے ؟

مولانا طہطائی فرماتے ہیں، مرزا غالب نے اس شعر میں سننے کے دو مرتبے پیدا کیے، اول عشق کی کہانی سنتا، دوم عاشق کی زبانی سنتا :

”یہ امر خوبیِ شعر کا باعث ہوا ہے اور مدحی میں ایسی نادرک تفصیل

ہمیشہ لطف دیتی ہے۔ دوم سارے شعر کے الفاظ ایسے دست و پا ہیں کہ معلوم ہوتا ہے، پہلے ہی فکر میں دونوں مصرعے نکل آئے۔

۲۔ شرح : جب میری آنکھوں سے خون بنے کا سلسلہ جاری ہے تو یہ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے کہ غمزہ خوریز کی کھٹک کی کیا کیفیت ہے۔ جب اس کیفیت کی گواہی سامنے موجود ہے تو پوچھنے کا کیا مطلب ؟ یہ سب کچھ تو میری خوفناک نشانی دیکھ کر معلوم کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ شرح : دوست احباب میرے مرجانے کے بعد کون سی خصوصیت یاد کر کے مجھے رڈیں گے ؟ اور تو مجھ میں کوئی خصوصیت ہے نہیں، صرف ایک چیز ہے اور وہ یہ کہ دیوانگی اور پریشانی عالی میں وقتاً فوقتاً اُٹنی سیدھی باتیں کرتا تھا، جن میں نہ کوئی ترتیب تھی اور نہ ان کا کوئی ٹھکانا تھا۔

عام قاعدہ ہے کہ جب کوئی مرجائے تو عزیز اور دوست مرنے والے کے نمایاں وصف یاد کر کے روتے ہیں اور تعزیت کی مجلس میں انہیں اوصاف کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔ شاعر نے یہاں اپنی سب سے بڑی خصوصیت آشفتہ بیانی قرار دی۔

۴۔ لغات - بید : صحرا، جنگل، بیابان۔

شرح : میں خیال کے بیابان میں از خود رفتہ موج چکا ہوں، یعنی اپنے آپ کو گم کر بیٹھا ہوں۔ میرا پتا نشان صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ احباب مجھے بھول جائیں۔

۵۔ لغات - متقابل : متضاد، بالمقابل، باہم مقابلہ کرنے والا۔

شرح : مقابل سے یہاں مراد محبوب ہے، ترک جانے سے مراد ہے چپ ہو جانا، خفا ہو جانا۔ ردائی، لطیفہ گوئی، بزدلہ سخی۔

خود مرزا غالب نے عبدالرزاق شاکر کو اس شعر کی شرح یوں کہی ہے :
تقابل و تضاد کو کون نہ جانے گا ؛ نور و ظلمت، شادی و غم، راحت و کنگ

وجود عدم۔ مقابل اس صفر میں بہ معنی مرجع ہے ایسی طرح
کہ بہ معنی دوست کے بھی مشتمل ہے۔ معنوم شعر یہ کہ ہم اور دوست
ازدوئے خود عادت عند ہم دیگر ہیں۔ وہ میری طبع کی روانی
دیکھ کر رک گیا۔

مطلب یہ ہے کہ میں اور محبوب عند ہم دیگر ہیں۔ میری طبیعت فزوں پر
پڑتی۔ پس درپے لطیف گوئی اور بزلہ سخی سے کام لے رہا تھا۔ محبوب نے یہ
کیفیت دیکھی تو چپ ہو گیا، یعنی بات چیت ترک کر دی۔ سمجھنا چاہیے کہ
اسے میری طبیعت کی روانی پسندیدہ معلوم ہوئی اور ناراض ہو گیا۔

۶۔ لغات۔ گرانی : وزن میں بھاری ہونا، قدر و قیمت میں
بلند پایا ہونا۔

ارزاں : وزن میں ہکا، قدر و قیمت میں بے حقیقت۔
شعر میں دونوں لفظوں کے دونوں معنی شاعر کے پیش نظر ہیں۔
شرح : خواجہ حالی اس شعر کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :
”میری قدر اُس پتھر کی ہے، جو راستے کے سرے پر پڑا ہو اور
ہر شخص اس پر آتے جاتے پاؤں رکھ کر گزرے، یعنی ہوں تو
گراں قدر، مگر اُس پتھر کی طرح بے قدر ہوں۔ پس میری گرانی
کس قدر ارزاں ہے؟“

جو پتھر راستے میں پڑا ہوا ہو، بھاری ہونے کے باوجود سمٹ بے قدر
ہوتا ہے۔ کیونکہ آنے جانے والے سب اسے پامال کرتے ہیں۔ وہی کیفیت
مرزا غالب کی ہے کہ قدر و قیمت میں بڑھا ہوا ہونے کے باوجود بالکل
بے حیثیت سمجھے جاتے ہیں۔

مرزا نے یہ مضمون ایک فارسی شعر میں بھی باندھا ہے :

ناکس زخمی مندی ظاہر نہ شود کس
چوں سنگ سیرہ کہ گراں است و گراں نیت

۷۔ لغات : گرد باد : بگولا۔

صرصر : آندھی۔

شرح : میں بے تابی کے راستے میں بیچ و تاب کھانے والا بگولا ہوں۔
شوق کی آندھی مجھے وجود میں لانے کا موجب بنی۔

مطلب یہ کہ میں بگولے کی طرح بیقرار ہوں، مجھے کسی پہلو بھی سکون نصیب
نہیں ہو سکتا۔ چونکہ آندھی بگولا اٹھانے کا موجب بنی اور آندھی کے زور و قوت
کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا، لہذا میں بھی جب تک موجود ہوں، برابر بیقرار
رہوں گا اور مجھے سکون نصیب نہیں ہوگا۔

۸۔ لغات : پیچیدانی : کچھ نہ جانتا۔

شرح : شاعر عموماً محبوب کے مٹنے اور کمر کو تنگی اور باریکی میں کمال پر
پہنچاتے پہنچاتے بالکل بے وجود بنا گئے، یعنی بیچ اور بے حقیقت۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں نے محبوب کے دہن کا سراغ لگا نا چاہا لیکن
بالکل ناکام رہا۔ اب دنیا پر آشکارا ہو گیا کہ میں کچھ بھی نہیں جانتا۔

اس شعر کا پورا معنوں لفظاً "بیچ" پر مبنی ہے۔ چونکہ دہن "بیچ" ہے اور
میں اس کا سراغ نہ لگا سکا، اس لیے پیچداں بن گیا، یعنی "بیچ نہ جانے والا"۔

۹۔ شرح : اے غالب ! ضعف نے مجھ پر اس درجہ غلبہ پایا اور
مجھے اتنا عاجز کر دیا کہ میری جوانی بڑھاپے کے لیے باعثِ ننگ ہو گئی، یعنی
جوان ہونے کے باوجود اس درجہ ضعیف اور کمزور ہوں کہ بڑھاپے سے بھی اس ضعف
کو اپنے لیے باعثِ ننگ جانیں۔

۱۔ لغات

آغوش کثافی :

کسی سے ہم بغل ہونے
کے لیے دونوں ہاتھ
بھیلاؤ۔

شرح :

اسے محبوبِ اخیڑے
بارغ میں پہنچنے پر کلیں
خوشی سے پھولی نہیں

نچے کھلتے ہیں تو سمجھنا چاہیے کہ تجھ سے ہم بغل ہونے کے شوق میں رہ
جاتے ہیں۔

۲۔ لغات - گنگر : وہ کٹے ہوئے علاقے، جو خوبصورتی کی غرض سے
قلعوں، فصیوں اور دیواروں پر بنادیتے ہیں اور جو انتہائی بلندی پر ہوتے ہیں۔
استغنا : بے نیازی، بے پروائی۔

شرح : ادھر محبوب کی بے نیازی کے بام کا گنگر زیادہ سے زیادہ
بلند ہو گیا رہا ہے، یعنی اس کی بے نیازی برابر بڑھتی جا رہی ہے، ادھر میری
مزید تعلق کو یہ دعویٰ ہے کہ میں ہر بلندی پر پہنچ سکتی ہوں۔
مطلب یہ کہ محبوب تو زیادہ سے زیادہ بے پروا ہوتا جا رہا ہے اور نالے کو
دھونے ہے کہ میں تاثیر پیدا کر رہا ہوں۔

شعر میں لفظ "اٹا" جب انداز سے استعمال ہوا ہے۔

۳۔ لغات - چشم نمائی : آنکھیں دکھانا، گھورنا، غصے سے دیکھنا
تنبیہ۔

شرح : غم عاشق کو صبر و ضبط کی تعلیم دے رہا ہے۔ جو نیا داغ دل
پر پڑتا ہے، سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اس استاد کی طرف سے گھورنے اور تنبیہ کرنے کا
نشان ہے۔

”واج“ کی تشبیہ ”آئینہ“ سے محتاج تشریح نہیں۔

۱۔ لغات - نقش ناز بہت ہٹاؤ بہ آغوشِ رفیب
نقش : تصویر - پائے طاؤس پئے خامہ مانی مانگے

ظنانہ : رمز و کنایہ
میں بات کہنے والا، ناز
سے چلنے والا، شوخ، ہیک۔
مانی : ایک مشور
مصور : جو بال کا بادشہ تھا۔
کمالِ علم و فن کی بنا پر اس

نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ ملک سے نکالا گیا اور ترکستان و چین میں عمر کا بڑا حصہ گزار
کر شاہ پور کے زمانے میں ایران آیا۔ ایک روایت کے مطابق سقز میں پیدا ہوا
اور سقز میں وفات پائی۔

شرح : اگر میرا شوخ اور ہیک محبوب رقیب سے ہم جنس ہو کر ناز و مذا
کرنے لگے اور اس حالت میں اس کی تصویر کھینچی جائے تو مصور کے لیے لازم ہوگا
کہ مور کے پاؤں کو مو قلم بنائے۔

مطلب یہ کہ محبوب کتنا ہی حسین و جمیل کیوں نہ ہو، لیکن جب رقیب کی آغوش
میں پہنچتا ہے تو اس کا حسن و جمال اس قابل رہ جاتا ہے کہ مور کے پاؤں سے جو
حد درجہ کھوہ تو ناز پیدا ہوتا ہے، اس کی تصویر بنائی جائے۔

مور کے پاؤں کو مو قلم بنانے کی طرح یہ ہے کہ مور بال و پر اور کھنٹی کے اعتبار
سے نہایت خوبصورت ہوتا ہے، لیکن اس کے پاؤں بے حد بر صورت ہوتے
ہیں، بلکہ مشور ہے، مور خود پاؤں کو اپنے لیے باعثِ ننگ مانتا ہے۔

۲۔ لغات - تخیّر : حیرانی کی حالت، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان چُپ ہو جاتا ہے اور اس میں بات کرنے کی سکت نہیں رہتی۔

شرح : اسے محبوب ! تیری بدخونی کا یہ عالم ہے کہ میں سراپا حیرت بن کر خاموش ہو جاتا ہوں تو تو اسے ایک دلچپ تماشا سمجھتا ہے اور اس سے لطف اٹھاتا ہے۔ مگر میں عالم حیرت سے نکلا کر اپنے غم کی کہانی تیرے سامنے پیش کروں تو میری پریشاں گوئی کے باعث تو بے مزہ ہو جاتا ہے۔ گویا میرا چُپ رہنا تیرے لیے دلچپ اور میرا غم دل کتنا تیرے لیے باعثِ رنجش و کدورت ہے

۳۔ لغات - ریشہ دوانی : ریشہ دوڑانا۔ جب کوئی دانا یا بیج زمین سے اُگتا ہے تو اس کے دیسے ارد گرد پھیل جاتے ہیں۔ انہیں ریشوں کی بدلت زمین سے اس روئیدگی کو غذا ملتی ہے۔

شرح : مجھے اُس تب عشق کی آرزو ہے کہ پھر شمع کی ٹوکی طرح آگ کا شعلہ جگر کی رگ تک اپنا ریشہ دوڑا دے۔

مطلب یہ کہ جس طرح شمع کی ٹو دعاگے کے ذریعے سے اس کے اندر تک حرارت پہنچا دیتی ہے اور پوری طرح کیسر گرم ہو جاتی ہے، اسی طرح میں بھی عشق کی اس حرارت کا آرزو مند ہوں جو میرے جگر تک آگ کے شعلے دوڑا دے۔

۱۔ شرح : جس زخم کے لیے رفو کی تدبیر ممکن ہو اسے میرے خدا ! اُسے دشمن کی قسمت میں لکھ دیجیے۔ یعنی میں تو اس زخمِ دل کا آرزو مند ہوں جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی؟

بلکہ دیجیو یا رب ! اسے قسمت میں عفو کی اچھا ہے سرانگشتِ حنائی کا تصور دل میں نظر آتی تو ہے اک بوندِ لہو کی

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے جو رُو ہو ہی نہ سکے۔

۲۔ لغات۔

سر انگشت حنائی:
مشدی کی انگلی کا سرا۔

شرح: خواہجہائی
فرماتے ہیں:

”لفظ توڑنے جو دوسرا

مصرع میں ہے، یہ صنی پیدا

کر دیے ہیں کہ آنکھ سے لہو

یاں تو کوئی سُنا نہیں مزید کسو کی

دشنے نے کہیں مُنہ نہ لگایا ہو جگر کو

خجھر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

صد حیف! وہ ناکام کہ اک عمر سے غارت

حسرت میں رہے ایک بُتِ عربہ بُجو کی

دو تے دو تے دل میں خون کا ایک قطرہ باقی نہیں رہا اس لیے دو۔

کے سر انگشت حنائی کے تصور کو غنیمت سمجھتا ہے کہ اس کی دہرے۔

دل میں لہو کی ایک بُوند تو نظر آتی ہے۔

اس شعر کی شرح کے مختلف پہلو مولانا طہطائی نے نہایت اچھے انداز میں

پیش کیے ہیں۔ میں ان کا بیان علامتہ ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

۱۔ سر انگشت کا مشدی سے لال ہو کر لہو کی بُوند ہو جاتا بہت اچھی تشبیہ ہے

تشبیہ سے مشبہ کی اکثر تزیین و تحسین مقصود ہوتی ہے۔ شاعر نے سر انگشت کی

خوب صورتی آنکھ سے دکھا دی۔

۲۔ جس انگلی کی پور لہو کی بُوند برابر ہو، وہ انگلی کس قدر نازک ہو گی۔ کتنا

ہمیشہ تصریح سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔

۳۔ اس شعر میں وجہ شبہ مرکب ہے، یعنی بُوند کی سرخی اور بُوند کی شکل دونوں

سے وجہ شبہ کو ترکیب حاصل ہوئی ہے اور مرکب تشبیہ زیادہ بدیع ہوتی ہے۔

۴۔ یہ نئی تشبیہ ہے، پہلے کسی نے نظم نہیں کی۔

۵۔ اسی تشبیہ سے یہ بات نکالی کہ دل میں ایک بُوند تو لہو کی دکھائی دی۔ پھر

کجا تصور، کجا سو کی بوند، دونوں میں کیسا بونِ بعید ہے اور تباہیِ طرفین سے
تشیبہ میں حسن اور عزابت زیادہ ہو جاتی ہے۔

۶۔ لفظ ”تو“ نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ شعر اس شخص کی زبانی ہے جس

کا ہوسب خشک ہو چکا ہے۔ وہ اپنے دل کو ایک خیالی چیز سے تسکین دے رہا ہے۔

۷۔ بوند کے معنی میں ٹپک پڑنا داخل ہے۔ یہی حال تصور کا خیال سے اُتر

جانے میں ہے، یعنی حرکت و جبرشہ میں داخل ہے، گو طرفین تشبیہ متحرک نہیں۔

۸۔ غرض یہ نہایت غریب و بدیع و تازہ تشبیہ ہے۔

۳۔ شرح : خواہہ حالِ فزاتے ہیں :

”بے حوصلگی یعنی کم ظرفی“۔ ”یاں“ سے مراد دنیا ہے۔ معشوق سے کہتا

ہے، ”تو اس بات سے کیوں ڈرتا ہے کہ ہم عاشق تیرے جو دردِ ظلم

سے تنگ آکر حاکم سے یا خدا سے مزید کریں گے؟ کیونکہ اگر ہم

ایسا کریں بھی تو کوئی کسی کی مزید ہی نہیں سنتا۔“

اَوّل چہ عاشق اتنے کمِ عزّت نہیں کہ محبوب کے ظلم و جبرِ صبر سے برداشت

نہ کرے، لیکن اگر اسے محبوب! تیرے دل میں یہ وسوسہ موجود ہے کہ شاید عشاق

کے گروہ میں سے کوئی بے مہمت نکل آئے اور مزید و نقایا شروع کر دے تو ظالم

ہے کہ اس دنیا میں تو کوئی کسی کی مزید سننے پر آمادہ نہیں، پھر تو کیوں پریشان ہے؟

۴۔ ۵۔ لغات۔ عربہ مجھ : جنگجو۔ لڑاکا۔

شرح : اسے غالب! اس ناکام فرد کے لیے سو مرتبہ امنوس، جو عمر بھر

ایک جنگجو محبوب کی حسرت میں رہا۔ اس محبوب کی کٹار نے کسی گداز مند عاشق کے

بگڑ کو مٹ نہ لگایا اور محبوب کے خنجر نے کسی اس کے گلے کی بات نہ پوچھی۔

جنگجو محبوب کی آرزو اس لیے تھی کہ ملکہ کو کٹار سے چھیدے اور گلا خنجر

سے کاٹے، لیکن عاشق کی عمر حسرت میں گزر گئی اور یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔

۱۔ لغات :

پشت گرمی :

امداد، اجانت ،

پشیمانی ۔

شرح : پارا

شیخ پر حجاب و یا ہائے

تو وہ آئینہ بن جاتا ہے ، گویا پارا آئینے کے لیے پشیمانی کا کام دیتا ہے ، لیکن ہمارا عتاب و بے قرار دل ، جو مثال میں پارے کی حیثیت رکھتا ہے اور جس سے ہمیں بیشِ نظر اصول کی بنا پر امداد کی توقع ہونی چاہیے تھی ، وہ ہماری حیرانی کا باعث بنا ہوا ہے اور اس نے ہمیں سخت غفلت میں ڈال رکھا ہے ۔

۲۔ لغات ۔ وداغ : رخصت ۔

شرح : چول کھلا نہیں ، بلکہ اس نے رخصت کے لیے اپنی آغوش

کھول دی ہے ۔ اسے ٹیکل ! تو بھی چل ، کیونکہ ہمارے دل کا علم ہوا ہے ۔

عام قاعدہ ہے کہ جب لوگ ایک دوسرے سے کچھ ذات کے لیے الگ

ہوتے ہیں تو ہم بغل ہو کر رخصتی ملاقات کرتے ہیں ۔ گویا آغوش کھولنے کا مطلب

رخصت ہونا ہے ۔ اسی طرح چول نے رخصت کے لیے آغوش کھولی ، کیونکہ

ہمارا جا رہی ہے اور بلبیل کو بھی رخصت ہونا چاہیے ، بلکہ خطاب سے معلوم ہوتا

ہے کہ شاعر بھی جا رہا ہے اور ٹیکل کو ساتھ لے جا رہا ہے ۔

۱۔ لغات : تمکین :

دنار سے بیٹھا ، کوئی ایسی

حرکت نہ کرنا ، جس کا رنگ

ہے وصل ، سحرِ عالم تمکین و ضبط میں

مشتوقِ شوخ و عاشق و یوازہ چاہیے

ہذا باقی ہو۔ کیونکہ جذباتی
حرکیتیں عموماً اعتدال سے
اس لب سے بل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو ہاں
شوقِ فضول و جراتِ رندانہ چاہیے
باہر جوتی ہیں۔

شرح : اگر محبوب وصل کی حالت میں وقار و تکنت سے بیٹھا رہے
اور عاشق ضبط و صبر سے کام لے تو اس وصل کو وصلِ نہیں، ہجر سمجھنا چاہیے
وصل کی حالت کا تو تقاضا ہی یہ ہے کہ محبوب کی طرف سے پے در پے شوخیاں
سرزد ہوں اور عاشق پر اک گونزدہ دیوانگی کی کیفیت طاری رہے۔

مرزا نے اس شعر میں وصل و ہجر کے ماحول کی کیفیت و دو لفظوں میں انتہائی
جامعیت کے ساتھ پیش کر دی۔

۲۔ **شرح :** محبوب کے ہوں سے بوسہ ضرور مل جائے گا، خواہ کتنی
ہی دیر لگے، البتہ یہ ضروری ہے کہ شوق کا جوش و خروش جاری رہے، اس میں
کوئی کمی نہ آنے پائے۔ ساتھ ہی نندوں کی سی جرات ہو، لیکن ایسی جرات، جو
کسی سے نہ دے بالکل بیباک ہو۔

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
صحبتِ رنداں سے واجبِ محمد
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے
جاہلے سے اپنے کو کھینچا چاہیے
بارے لب اس سے بھی سمجھا چاہیے
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے
چاکِ مت کر حیبِ بے ایام گل
دوستی کا پردہ ہے بریگانگی
مُنہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے
کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے
دشمنی نے میری کھویا عنبر کو

اپنی رُسوائی میں کیا چلتی ہے سعی یار ہی ہن گامہ آرا چاہیے
 منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید نا اُمیدی اس کی دیکھا چاہیے
 غافل ان مرطلعتوں کے واسطے چاہنے والا بھی اچھا چاہیے
 چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

۱۔ **شرح :** دنیا میں صرف حسین اس امر کے حقدار ہیں کہ انہیں چاہا جائے۔ اتنا چاہا جائے، جو چاہنے کی آخری حد ہے۔ اگر خوش نیسی سے وہ بھی چاہنے لگیں تو اس سے بڑی نفرت کوئی نہیں ہو سکتی۔

۲۔ **لغات :** کھینچنا : پیچھے ہٹنا۔ پرہیز کرنا، بچنا۔ کے ساتھ کھینچنا، میکش کا ترجمہ ہے، جس کا مطلب شراب پینا ہے۔ یہاں مرزا نے کھینچنا شراب کے ساتھ استعمال کیا، لیکن پہلے مصرع سے واضح ہے کہ ان کا مقصود احتراز ہے۔

شرح : رندوں اور شراب نوشوں کی صحبت سے دُور ہی رہنا واجب ہے۔ وہاں جا کر شراب پینے کے بجائے شراب سے پرہیز کرنا چاہیے۔

۳۔ **لغات :** سمجھنا : (پہلے مصرع میں) جاننا، خیال کرنا۔
 سمجھنا : (دوسرے مصرع میں) مزادینا، مزہ چکھنا، باز پرس کرنا۔

شرح : اے محبوب! دل تیری چاہنت کو ایک معمولی سی بات سمجھا تھا، یعنی اس کا خیال یہ تھا کہ یہ کوئی ایسا امر نہیں، جو مشکلات کا باعث بنے، لیکن ایک کاراہم کو معمولی بات سمجھ کر اس نے سنبھال لیا تھا، اب لازم ہے کہ اسے اس حماقت کا مزہ چکھنا یا جلنے۔

۴۔ **شرح :** خواہہ حال فرماتے ہیں :

”پھول کے کھلنے کو چاک گریاں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ کتا ہے کہ

سہرا ایک کام نیچر کی ہدایت سے کرنا چاہیے۔ پس جب تک پھول اپنا گریبان چاک نہ کرے، تو بھی گریبان چاک مت کر۔ اس میں لطف یہ ہے کہ بھنوں کو ہمیشہ بہار میں زیادہ جوش جنوں ہوتا ہے۔

عام قاعدہ ہے کہ بہار آتی ہے تو درختوں میں شگوفے چھوٹتے ہیں، کونچیں نکلتی ہیں، پھول کھلتے ہیں تو بھی موسم بہار کے بغیر اپنا گریبان چاک نہ کر۔ اس کے لیے قدرت کا بھی کوئی اشارہ اودھایا جونا چاہیے۔ یعنی جس طرح فطرت کی دوسری چیزوں کے دامن آمد بہار پر چاک ہوتے ہیں، اسی طرح تیرا دامن بھی بہار کی آمد کے بغیر تار تار نہ ہونا چاہیے۔

۵۔ **شرح :** اے محبوب! آپ مٹ چھپا کر ہم سے بیگانہ بنتے ہیں، حالانکہ یہ پردہ داری تو دوستی کا راز فاش کرنے کی دلیل ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم سے بیگانہ بنے رہیں تو مٹ چھپانا چھوڑ دیجیے۔ اگر آپ ہم سے پردہ داری کرتے رہیں گے تو لوگ حزد بھیں گے کہ دال میں کچھ کالا ہے، گویا اس مذہب سے مرزا حصول مطلب کی تدبیر کر رہے ہیں۔

۶۔ **شرح :** غیر مبرا میرے خلاف لگائی بھائی میں سرگرم رہا، یہیں تک کہ محبوب کا دل بھی اس سے اکتا گیا اور جو وقار اعتماد سے محبوب کے دل حاصل ہوا تھا، وہ خاک میں مل گیا۔ گویا میری دشمنی میں اس سیاہ بھت نے اپنا بھی بیڑا عزق کر لیا۔ دیکھیے، اس کی دشمنی کا دم بھ کہاں پہنچا ہوا ہے۔

جب انسان کسی کے ساتھ دشمنی میں اپنے نقصان کی بھی پروا نہیں کرتا تو یہ دشمنی کی آخری حد مل جاتی ہے، کیونکہ دشمنی میں اپنی ذات کو بھی بھول جاتا ہے۔ یہی حقیقت مرزا نے اس شعر میں پیش کی ہے۔

۷۔ **شرح :** عاشق خود اپنی رسوائی کے لیے کیا کوشش کر سکتا ہے؟ یہ معاملہ تو محبوب کی ہنگامہ آرائی پر موقوف ہے۔ وہ جب چاہے، کسی کو بے صبر اور بیتاب بنا کر رسوائی کے راستے پر لگا دے اور اس کی عزت و وقعت ہر باد

کر ڈالے۔

۸۔ شرح : خواہ حال مڑاتے ہیں :

تا اُمیدی کی غایت اس سے بڑھ کر اور ایسی خوبی کے ساتھ
شاید ہی کسی نے بیان کی ہو۔

جس کی امید کا برا نام مرنے پر موقوف ہو، اس کی ناامیدی دیکھنے کے قابل
ہے۔ یعنی زندگی میں اس کی کسی امید کا پورا ہونا بالکل ناممکن ہو گیا اور مرنے
پر امید پوری بھی ہوئی تو اس سے کیا حاصل ؟ گزری ہوئی عمر تو واپس نہیں
آ سکتی۔

۹۔ ۱۰۔ شرح : اے استاد ! تم حسینوں کو چاہتے ہو ؟ واہ ! ذرا اپنی

صورت تو دیکھو، یہ اس قابل ہے بھی کہ حسینوں کو چاہے۔

اے غافل ! ان چاند جیسے چہروں والے دلرباؤں کو چاہنے کے لیے بھی

آدمی کو خوش وضع اور خوب رو ہونا چاہیے۔

۱۔ شرح :

میری منزل مجھ سے

ہر قدم پر دور ہوتی

جار ہی ہے۔ میں کوشش

کر رہا ہوں کہ جہاں

پہنچتا ہے، پہنچ جاؤں

لیکن مقام مقصود اتنا

ہی بعید ہوتا جارہا

ہے، جتنا میں اس

کے نزدیک پہنچنے کی

سہر قدم دوری منزل ہے نمایاں، مجھ سے

میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں، مجھ سے

درس عنوان تماشا بہ تفافل خوشتر

ہے نگہ رشتہ شیرازہ مژگان، مجھ سے

وحشت آتش دل سے شب تنہائی میں

صورت دور رہا سایہ گریزاں، مجھ سے

کوشش کر رہا ہوں
اس کا سبب یہ ہے
کہ میا بان اُسی رفتار
کے مطابق مجھ سے
بھاگ رہا ہے جس
رفتار سے میں اس
کے قریب پہنچنا چاہتا
ہوں۔

اس شعر میں میرزا
نے نظر کے التباس
اشتباه کا وہ معاملہ
پیش کیا ہے، جس
کا تجربہ اکثر اشخاص
کو ہوتا ہے، لیکن
عموماً اس کا خیال
نہیں رکھتا جاتا، غرض
کیجیے کہ آپ ریل یا
کسی دوسری سواری
میں بیٹھے ہیں۔ وہ جتنی
تیز چلے گی، یہی احساس
ہوگا کہ سواری ٹھہری

غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بستان
کس قدر خاۓ آئینہ ہے ویراں مجھ سے
اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں
صورتِ رشتہ گوہر ہے چراغاں مجھ سے
بے خودی بسترِ تمسیرِ فراغت ہو جو
پُر ہے سائے کی طرح میرا بستان مجھ سے
شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے
ہونگہ مثلِ گلِ شمعِ پریشاں مجھ سے
بے کسی ہائے شبِ ہجر کی دشت ہے ہے!
سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پہناں مجھ سے
گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آئینہ داری یک دیدۂ حیراں مجھ سے
نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے، اسد
ہے چراغاں شمس و خاشاکِ گلستان مجھ سے

ہم کوئی ہے اور اور اگر وہ کی زمین تیزی سے پچھلے کی طرف دوڑی جا رہی ہے۔ تیز
دوڑنے والے شخص کو اسی قسم کا التباس ہوتا ہے۔ چنانچہ مرزا فراتے ہیں کہ میں

جنتا منزل کی طرف دوڑتا ہوں، عام القیاس و اشتباہ کی بنا پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منزل مجھ سے دوڑی جا رہی ہے، لہذا میری تیز رفتاری سے منزل کی دوری کا معاملہ واضح ہے۔

۲۔ لغات۔ تماشا : جلوہ، دیدار، مجازاً اس سے تماشا سے دنیا بھی مراد لی جا سکتی ہے، جو یہاں زیادہ موزوں ہے اور تماشا سے محبوب بھی۔

شرح : دنیا کی کتاب کا پڑھنا تو ممکن ہی نہیں، صرف اس کے حوالوں کا سرسری تماشا ہی تغافل اور بے توجہی ہی سے کرنا چاہیے۔ صرف اچھٹی ہوئی نظر ڈال کر ضروری نتیجہ نکال لینا کافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میری نظر آنکھوں سے باہر نہیں نکلتی، اندر ہی اندر رہتی ہے، گویا وہ میری پلکوں کی بندش کے لیے شیرازہ بن گئی ہے۔

مرزا کہنا یہ چاہتے ہیں کہ دنیا کی چیزوں کو بہ غور دیکھنا شروع کریں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ نگاہیں ان میں الجھ جائیں گی اور حیات انسانی کا جو مقصود ہے، یعنی محبوب حقیقی سے ٹو لگانا، اس کے ممکنات کم ہو جائیں گے۔ تغافل و بے پروائی ہی کا طریقہ اچھا ہے۔

اگر "تماشا" سے تماشا سے محبوب مراد لیں تو مطلب یہ ہوگا، محبوب کو اس حالت میں دیکھنا چاہیے، جس میں خود اسے پتا نہ لگے کہ دیکھ رہے ہیں۔ یہی طریقہ میں نے اختیار کیا اور اس وجہ سے میری نگاہیں آنکھوں کے اندر ہی اندر رہتی ہے، لیکن اعتراف کر لینا چاہیے کہ اس تعبیر کی صودت میں پہلے مصرع کا معنوم واضح کرنے کے لیے تکلف سے کام لینا پڑے گا۔ صحیح مفہوم وہی معلوم ہوتا ہے، جو ابتدا میں پیش کیا گیا۔

۳۔ شرح : محبوب سے جدائی کی رات ہے۔ دل میں آتش شوق بری طرح بھڑک رہی ہے، اس سے وحشت زدہ ہو کر میرا سایہ و حوٹیں کی طرح مجھ سے بھاگ رہا ہے۔

شعر میں خوبی یہ ہے کہ آگ جتنی بھڑکے گی، ادھواں اس سے دُور ہی جائے گا۔ یہ مضمون مرزا ایک اور جگہ بھی ہاندہ چکے ہیں۔

سایہ میرا مجھ سے مثل دُود بھاگے ہے امتد
پاس مجھ آتش بجاں کے کس کے ٹھٹھا جاتے ہے

مہم - شرح : خدا نہ کرے کہ محبوب عاشقوں کے غم میں بناؤ سنگار چھوڑ کر سادگی اختیار کرے۔ میں مر گیا اور میرے غم میں محبوب نے بناؤ سنگار چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آئینہ دیکھنے کی ضرورت نہ رہی ہے، کیونکہ اس کی ضرورت بہر حال بناؤ سنگار ہی کے لیے ہوتی ہے۔ گویا خانہ آئینہ ویران ہو گیا اور اس کا سبب میں بنا۔ اے خدا! اتنی مہربانی کر کہ عاشقوں کا غم محبوبوں کو اس درجہ پریشان نہ کرے۔

۵ - شرح : میرے پاؤں چھالوں سے بھرے ہوئے تھے اور میں نے

صحراے جنوں میں چلنا شروع کر دیا۔ اس کی لگ ڈنڈی میرے چھالوں کے پے دھا کا بن گئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ چھالے موتی ہیں اور لگ ڈنڈی کے بدلے نے انھیں موتیوں کی لڑی بنا دیا ہے۔ پھر موتیوں کے برعکس چھالوں میں تپش اور حرارت ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چراغاں کی طرح جل اٹھے۔ گویا چھالوں نے صحراے جنوں کے راستے کی بدولت رشتہ گوہر کی صدف بھی اختیار کی اور چراغاں کی بھی۔

۶ - لغات - ہو جو : ہو جیو، ہو جائے۔

شرح : خدا کرے، بیخودی میرے لیے فراغت اور راحت و سکون

کی قید کا بستر بنی رہے۔ میرا شبستان سایے کی طرح مجھ سے بھرا ہوا ہے۔

مطلب یہ کہ میں بیخودی کی بدولت اپنی آرام گاہ میں بے حس و حرکت پڑا

ہوں، خدا کرے، میری یہ بیخودی اسی طرح میرے لیے راحت و آسائش کا

سامان بنی رہے! اگر بیخودی نہ ہو تو نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ میں جگہ جگہ

بھاگا دوڑا پھروں اور سرگردانی میں عمر گزار دوں۔

مولانا طلباء بانی فرماتے ہیں :

- تمہید کے لغوی معنی بھیلانے کے ہیں اور یہ بستر کے مناسبات میں سے ہے۔ اصطلاح میں تمہید اسے کہتے ہیں کہ کسی کام سے پہلے کچھ ایسی باتیں کی جائیں، جن پر وہ کام موقوف ہے اور یہی معنی مصنف کو مقصود میں... مزاحمت کے لغوی معنی خالی ہونے کے ہیں اور یہ پُر ہونے کے مناسبات میں سے ہے اور اصطلاح میں راحت کے معنی پر ہے اور یہی معنی یہاں مقصود ہیں۔

۷۔ لغات - گل شمع : شمع کا گل، چراغ کی بتی کا سرا، شعلے کی کو، یہاں دونوں معنی درست ہیں۔ شمع کا گل اس لیے کتر جاتا ہے کہ روشنی ٹھیک رہے، دسم نہ ہونے پائے۔ گل کترتے وقت اس میں سے دھواں نکل کر ارد گرد پھیلتا ہے اور اس کے بعد شعلہ زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔ گویا اس کی روشنی زیادہ پھیل جاتی ہے۔

شرح : اسے محبوب ! اگر تو میری گردن پر حالت شوق دیدار کاٹ دے، یعنی مجھے قتل کر ڈالے تو میری نظر شمع کے گل یا شعلے کی کو کی طرح ہر طرف پھیل جائے گی۔

۸۔ شرح : آہ ! محبوب سے بدوائی کی رات، بیکسی کا عالم، کوئی ساقی نہیں، کوئی رفیق نہیں، کوئی غمخوار نہیں۔ مدیہ ہے کہ میرا سایہ بھی بھاگ کر آفتابِ حشر کے دامن میں چھپ گیا ہے۔

سایہ طبعاً آفتاب سے گریزاں رہتا ہے، لیکن عاشق کی شبِ مزاق اور اس کی بیکسی کے خوف سے اتنا ڈرا، اتنا ڈرا کہ اسے آفتابِ حشر کے سوا کہیں پناہ نہ مل سکی۔

۹۔ شرح : اے محبوب! سیکڑوں رنگین جلوں کا جام تیری بدلت
مغل میں گردش کر رہا ہے اور میں ایک حیرت زدہ آنکھ کا آئینہ دار بنا بیٹھا ہوں۔
مطلب یہ کہ تیری محفل ہر قسم کی رونق، چیل پیل اور جشن و شادمانی سے
معمور ہے۔ میں سراپا حیرت بنا بیٹھا ہوں کہ یہ کیا ہو رہا ہے! تو کس طرح
اپنے سچے عاشق سے بے پروا ہو کر عیش و نشاط میں مست ہے۔

۱۰۔ لغات - راک : ایک کا خنقہ، یہ لفظ بعض اوقات پڑا،
ہنایت اور بہت کے معنی بھی دیتا ہے، مثلاً جان صاحب :

اس کو پیدا نہیں کوئی مر جائے
ایک بیدو یہ سوا ہے عشق

نیز امیر مینائی :

اندھے گرمیاں مرے معشوق کی امیرا
آیا خیال دل میں تو اک آگ لگ گئی

شرح : اے استاد! میری نگاہ گرم سے بے پناہ آگ ٹپک رہی
ہے۔ میں باغ میں پہنچا تو نگاہ پڑتے ہی خس و خاشاک جل اٹھے اور چراغاں
کا منظر پیدا ہو گیا۔

۱۔ لغات :

سنائے نہ بنے :
سنائے کی کوئی صورت
نہیں بنتی۔

بات کا بنتا :

کامیاب ہونا، تدبیر
بہن پڑنا، مراد حاصل ہونا۔

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات، جہاں بات بتائے نہ بنے
میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبہ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے، بھول نہ جائے
 کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے
 غیر پھرتا ہے بے یوں ترے خط کو کہ اگر
 کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے
 اس نزاکت کا بڑا ہو، وہ بھلے میں تو کیا
 ہاتھ آویں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے
 کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
 پروردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے
 موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے
 تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے
 بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے
 کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے
 عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب
 کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

بات بتانا :

بات کو پھر بھیا کر
 اپنا مطلب لگاتا،
 سخن سازی کرتا۔

شرح :

میرا محبوب حدود و
 نکتہ چین ہے، اسے
 غم دل ستانے کی
 کوئی تدبیر ہی نہیں
 پڑتی۔ جہاں میر پھیر
 اور سخن سازی سے
 مطلب لگانا ممکن
 نہ ہو، وہاں مراد
 حاصل کرنے کی کیا
 صورت ہو سکتی ہے۔

اس شعر میں

نہایت اہم لفظ

نکتہ ہیں۔ ہے۔

اگر کوئی فرد نہایت

ضروری معاملہ بیان

کر رہا ہو، خصوصاً

غم و اندوہ کا معاملہ اور سننے والا بات بات پر نکتہ چینی اور اعتراض شروع کر
 دے تو وہ معاملہ اثر کبھی پیدا نہ کر سکے گا، جو اس سے طبعاً پیدا ہونا چاہیے

یہی حقیقت اس شعر کی بنیاد ہے۔ عاشق جب اپنے عشق کی غم انگیز داستان سنانا چاہتا ہے تو محبوب بات بات پر ٹوکتا جاتا ہے۔ کہیں اعتراض کرو یا، کہیں کہہ دیا، یہ غلط ہے۔ کوئی بات کاٹ دی، کسی میں سقم نکال دیا۔ اس طرح تاثیر کی وہ فضا بھی قائم نہیں رہتی، جو ایک دروہجری داستان کے لیے محدود ضروری ہے۔ نیز غم انگیز بیان کے لیے تسلسل لازم ہے، یعنی اس میں مداخلت نہ ہونی چاہیے۔ محبوب کی نکتہ چینی قدم قدم پر مداخلت کا سامان پیدا کرتی ہے، لہذا عزیز عاشق مجبور ہو کر کہتا ہے۔ میں کیا کروں؟ نکتہ چینی کے باعث اسے غم دل سنا نہیں سکتا۔ جہاں بات بنانے کی کوئی صورت نہیں وہاں بات بننے تو کیونکر؟

۲۔ لغات۔ بن جانا : مصیبت میں مبتلا ہو جانا، آفت آنا، مجبور ہو جانا۔

شرح : میں محبوب کو بلاتا تو ہوں، لیکن اس کے آنے کی امید نہیں، البتہ اسے جذبہ دل اٹھو کوئی ایسا اثر دکھا کر وہ بالکل مجبور ہو جائے اور میرے پاس آئے بغیر اس کے لیے چارہ نہ رہے۔
پہلے مصرعہ میں لفظ ”تو“ سے صاف ظاہر ہے کہ محبوب کو بلاتا تو رہے ہیں، مگر اس کے آنے کی امید کوئی نہیں۔

۳۔ شرح : میرے محبوب کے نزدیک عشق و محبت کا معاملہ ایک کھیل ہے کہ جب چاہا، کھیل لیا اور جب چاہا، چھوڑ دیا۔ اسے وہ کوئی ایسا سنجیدہ مشغلہ نہیں جانتا، جس کے ساتھ دل تعلق ہو، لہذا عاشق کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ محبوب اس کھیل کو اسی طرح چھوڑ دے، بھول دے، جس طرح بچے کھیلوں کے متعلق عموماً روش اختیار کر لیتے ہیں۔ اس لیے عاشق آرزو کر رہا ہے کہ کاش، ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ محبوب کو مجھے ستائے بغیر نہیں نہ آئے، یعنی عشق و محبت کے معاملے کو وہ خاص اپنا مشغلہ بنائے رکھتے لھیل

نہ ہے۔

۴۔ شرح : اسے محبوب ! تو نے رقیب کو جو نامہ شوق مکہ دیا ، وہ اسے یوں لیے پھرتا ہے کہ اگر کوئی پوچھ بیٹھے ، یہ کیا ہے تو اسے چھپائے رکھنا ممکن نہ رہے۔

ظاہر ہے کہ جب لوگوں میں چرچا ہوگا ، وہ نامہ شوق آپ کی طرف سے ہے تو آپ کی رسوائی ہوگی۔

۵۔ شرح : بیشک وہ حسین ہیں ، اور ان کا حسن بڑا دلادیز ہے ، مگر دیکھیے ، کتنے نازک ہیں کہ اول تو کسی کے ہاتھ نہیں لگتے اور اگر لگ جائیں تو انھیں چھوڑا نہیں جاسکتا۔ حسن میں کلام نہیں ، لیکن نزاکت نے عاشقوں کے لیے کیسی مصیبت پناہ کر رکھی ہے۔

۶۔ شرح : کون کڑ سکتا ہے کہ کائنات میں کون جلوہ افروز ہے ؟ کس نے اپنے وجود کی شان آشکارا کر رکھی ہے ؟ پوری کائنات پر اسباب کا ایسا پردہ ڈال دیا گیا ہے کہ کسی کو اٹھانے کی تاب نہیں یا اٹھانے کی کوئی تدبیر خیال میں نہیں آسکتی۔

جب پردہ اٹھانا ممکن نہیں تو کیا کیا جاسکتا ہے کہ یہ سب جلوے کس کے ہیں ؟

۷۔ شرح : اس شعر کا مطلب نشی نہی بخش حقیر کو سمجھاتے ہوئے خود مرزا فرماتے ہیں :

”بجائی ! مجھ کو تم سے بڑا تعجب ہے کہ اس بیت کے معنی میں تم کو تامل رہا۔ اس میں دو استفہام آ پڑے ہیں کہ وہ بہ طریق لطف و طعین معشوق سے کہے گئے ہیں : ”موت کی راہ نہ دیکھوں“ ؟ کیوں نہ دیکھوں ؟ میں تو دیکھوں ہی گا کہ ”میں آٹے نہ رہے“ ، کیونکہ موت کی نشان میں سے یہ بات ہے کہ ایک دن آٹے ہی کی انتظار

منافع نہ جانے گا۔ ” تم کو چاہوں ؟ ” کیا خوب ! کیوں چاہوں ؟
کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے۔ ” یعنی اگر تم آپ سے آئے تو آئے
اور اگر نہ آئے تو پھر کیا مجال کہ کوئی تم کو بلا سکے ۔

گویا یہ عاجز معشوق سے کہتا ہے کہ اگر میں تم کو چھوڑ کر اپنی
موت کا عاشق ہو جاؤں ۔ اس میں یہ خوبی ہے کہ بن بلائے بغیر
آئے نہیں رہتی ۔ تم کو کیوں چاہوں ؟ کہ اگر نہ آؤ تو تم کو بلا نہ
سکوں ۔

بات یہ ہے کہ پڑھنے میں ” تم کو چاہوں کہ نہ آؤ ” یہ جملہ طار
ہو ا سمجھ میں آتا ہے تو آدمی حیران ہوتا ہے ، ” تم کو چاہوں ”
الگ ہے ، کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے ، ” یہ جملہ الگ ہے ، تم نے
خود نہ کیا ، ورنہ خود بخود کیفیت اس تعریف اور استفہام کی حاصل
ہو جاتی ۔“

اس تو صیح کے بعد کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں رہتی ۔

۸۔ شرح : میں نے محبت کا بوجھ بے تکلف سر پر اٹھا
لیا ، لیکن وہ اتنا بھاری تھا کہ سنبھال نہ سکا اور سر سے گر پڑا ، اب
اٹھائے اٹھتا نہیں ۔ میں عاجز اور بے بس ہوں ۔ کام ہی ایسا آ پڑا ہے کہ
اسے درست کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ۔

مولانا طیباً طیباً فرماتے ہیں :

” ایک تو معنوں نہایت اچھا ہے ، دوسرے دونوں مصرعوں
کی ترکیب کو قضا بہ کر کے شعر کو اور بھی برجستہ کر دیا ۔“

۹۔ شرح : عشق پر کس کا زور ہے ؟ اے غائب ! یہ تو ایسی آگ
ہے کہ نہ لگائے لگتی ہے ، نہ اسے بھانے کی کوئی تدبیر بن پڑتی ہے ۔

ایک معنوم یہ ہے کہ عشق کی آگ کسی دل میں بھڑک اٹھے تو اسے بھانا

انسان کے بس میں نہیں۔ دوسرا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ یہ آگ لگانا ممکن ہوتا تو ہر عاشق اپنے محبوب کے دل میں لگا لیتا۔ بھانا ممکن ہوتا تو اپنے دل کی لگی بھان کر اطمینان سے بیٹھ جاتا۔

۱۔ شرح : اگر
برہنگی کی حالت میں
جنوں کو یہ خواہش ہو
کہ گریبان چاک کرے
تو صبح کی طرح میرے
دل کا زخم گریبان بن
کر تار تار ہونے کے
لیے تیار ہو جائے۔
مطلب یہ ہے،
چاک گریبان میں ایسی
لذت ہے کہ دل کا
گھاؤ جو پہلے ہی
ایک چاک کی حیثیت
رکھتا ہے، دوبارہ
چاک ہونے کے لیے
گریبان بن سکتا ہے۔

چاک کی خواہش اگر وحشت بہ عریانی کرے
صبح کی مانند، زخم دل گریبان کی کرے
جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گریبے خیال
دیدہ دل کو زیارت گاہ سیرانی کرے
ہے شکستن سے بھی دل نوید، یارب اکب تک
آگینہ کوہ پر عرض گرا سنجانی کرے
میکدہ گرچشم مست ناز سے پاؤے شکست
موے شیشہ، دیدہ ساعز کی مرگانی کرے
خطِ نعارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد
یک قلم منظور ہے، جو کچھ پریشانی کرے

زخم، چاک، وحشت، عریانی، گریبان اور صبح، ان سب کی مناسبت محتاج تفسیر نہیں۔ یعنی چوبہ لفظوں میں سے جیسے جیسے ہیں، جو باہم دست و گریبان ہیں۔
۲۔ شرح : اے محبوب! تیرے جلوے کی کیفیت کیونکر بیان کروں؟ اگر

اس کا تصور بھی کر لیا جائے تو اس سے دل کی آنکھ حیرت کی زیادت گاہ بن جائے ۔
مطلب یہ کہ تیرے جلوے کے تصور ہی سے دل پر سراپا حیرت طاری ہو
جاتی ہے ۔

۳۔ **شرح :** اگرچہ معاملہ ایک سنگدل محبوب سے آپڑا تھا ، لیکن میرا دل
ٹوٹنے سے بھی ناامید ہو گیا ۔ اے خدا ! تو ہی بتا کہ شیشہ کب ہم پہاڑ پر اپنی سختی
کا اظہار کرتا رہے ؟

اس شعر میں محبوب کو سنگ دلی کی بنا پر کوہ اور اپنے دل کو آگینے قرار دیا گیا
ہے ۔ ظاہر ہے کہ پہاڑ کا ایک معمولی سا ٹکڑا بھی ایک آن میں شیشے کو چکنا چود کر
دیتا ہے ، مگر محبوب کی سنگ دلی عاشق کا دل توڑ نہ سکی ، یہاں تک کہ وہ ناامید ہو
گیا ۔ بظاہر شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کی سختیاں برداشت کیں ، مگر عاشق محبوب
سے دل توڑنے اور الگ ہونے پر آمادہ نہ ہوا ۔

۴۔ **لغات ۔** موئے شیشہ : شیشے کے بال یعنی شیشہ ترشح جانے
سے جا بجا کبیریں پڑ جانا ۔

شرح : اگر شراب خانہ محبوب کی مستی نامہ آنکھ سے شکست کھا جائے
تو اس طرح صراحی میں جو بال پڑیں گے ، وہ ساغر کی آنکھ کے لیے پلکیں بن جائیں گے ۔
شاعر محبوب کی آنکھ کو ہمیشہ مست باندھتے ہیں ۔ اس مستی کی بنا پر شاعر کے
دماغ میں میکہ آیا ۔ محبوب کی آنکھ اتنی مست تھی کہ پورا شراب خانہ اس کے مقابلے
میں بیچ رہ گیا ۔ محبوب کے ناز و انداز نے شراب بھری صراحیوں میں بال ڈال دیے ۔
وہ بال ساغر کی آنکھ پر مڑاں بن گئے ۔

۵۔ **شرح :** محبوب کے رخسار پر خط نہیں نکلا ، بلکہ الفت نے اس
طرح زلف کو ایک حمد نامہ لکھ دیا ہے اور اس میں یہ مرقوم ہے کہ پریشانی جو کچھ
بھی کرے ، وہ یک تلم از اول تا آخر منظور ہے ۔

اس شعر میں بھی خط ، عارض ، زلف ، یک تلم ، پریشانی وغیرہ الفاظ کی مناسبت

محتاج تشریح نہیں۔ قلم کو اول لکھنے سے مناسبت ہے، دوسرا خطِ عارض کی بھی تعلیم ہوتی ہیں۔

۱۔ لغات :

پہلے معنی میں خواب
کے معنی سنا اور
دوسرے بصر میں
نمید ہیں۔

مجال : دوڑنے
کی جگہ، جولان گاہ،
قدرت، طاقت،
فرصت، اہانت،
موقع۔

شرح :

محبوب کے خود آنے
کی تو کوئی اُمید نہ
رکھنی چاہیے، البتہ
یہ امکان ہے کہ میں

سو جاؤں، وہ خواب

وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے

وے مجھے تپشِ دلِ مجالِ خواب تو دے

کرے بے قتل لگاؤ میں تیرا رو دیتا

تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو

نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں خواب تو دے

چلا دے ادک سے، ساقیِ اجڑیم سے نفرت ہے

پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے

اسدِ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے

کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤںِ داب تو دے

میں آئے اور میری پریشانی کے لیے تسکین کا سامان ہم پہنچا دے، لیکن مصیبت یہ
ہے کہ میرے دل کی تڑپ اس درجہ بے پناہ ہے، جس کے ہوتے ہوئے نمید ہی
نہیں آتی۔ نمید آجائے تو یہ اُمید پیدا ہو کہ شاید وہ خواب میں آئے اور میرا دل
تسل پائے۔

جناب آستی نے اس سلسلے میں فارسی کا ایک شعر نقل کیا ہے :

گفتی کہ بہ خواب اندر تسکین و مثبت امشب

اما تو کہا آئی، چوں خواب نمی آید

(اے محبوب! تو نے کہا کہ میں آج رات پہنے میں آکر تجھے تسکین دے گا،

لیکن غیب ہی نہیں آتی تو تیرے آنے کی اُمید کیا ہو سکتی ہے)

بلاشبہ یہ شعر ایک مدح مرزا کے شعر سے ملتا جلتا ہے، لیکن دونوں شعروں

میں جو فرق ہے، وہ طویل تشریح کا محتاج نہیں۔ فارسی کے شعر میں اذل محبوب کی

ذہان سے کہا گیا ہے کہ وہ خواب میں آکر تسکین دے گا، مگر یہ بالکل غیر طبعی ہے۔

محبوب اتنا مہربان کہیں نہیں ہو سکتا۔ دوم غیب نہ آنے کی کوئی واضح یا غیر واضح

وجہ بیان نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس مرزا کا شعر بالکل طبعی ہے۔ یعنی محبوب سے

خواب میں آنے کی مہربانی کا امکان یا اُمید تو ہو سکتی ہے، لیکن دل کا اضطراب سونے

ہی نہیں دیتا۔

اصل مصنفوں کسی کا بھی ہوا اسے پیش کرنے کی صحیح صورت وہی تھی، ہو مرزا

نے اختیار کی۔ یہی غالب مرحوم کی دقیقہ بینی کا کمال اور قادر الکلامی کا رتبہ بلند ہے۔

مولانا طہطائی فرماتے ہیں :

”پہلے مصرع میں لفظ ”تو“ امکان کے معنی دیتا ہے، یعنی اس کا خواب میں

آنا ممکن ہے۔ دوسرے مصرع میں خواب کو مستم با نشان کرنے کے

جیسے ”تو“ استعمال کیا گیا۔ یعنی خواب ہی کا آنا بڑی چیز ہے۔“

۲۔ لغات۔ آب : اس کے دو معنی ہیں، اذل پانی جس کا اظہار درد

دینے میں ہوا، دوم تلوار کی چلا، آب و تاب اور باطلہ۔

شرح : اے محبوب! چھڑ چھاڑ اور شکوہ آمیز طریق پر اظہارِ آرزو

میں تیرا رد دنیا مجھے ہرے ڈالتا ہے۔ دنیا میں جتنے حسین ہیں، وہ اور کرشموں میں

کتنا ہی کمال پیدا کر لیں، لیکن تیری طرح نگاہ کی تلوار کو چلا اور آب و تاب دینا

کوئی نہیں جانتا۔

یہ کوئی قیاسی بات نہیں، بلکہ ایسا معاملہ ہے، جو اکثر عشاق کو پیش آ سکتا ہے۔ یعنی کسی وقت محبوب سے محبت کی باتیں کرتے کرتے چھڑ چھڑ کے طور پر کچھ گلا گلوہ بھی کر دیا۔ محبوب کو کوئی جواب نہ سوجھا تو رونے لگا۔ کوئی سچا عاشق محبوب کے اس رو دینے پر جان دے دینے میں دریغ نہیں کر سکتا۔ گویا محبوب کے آنسوؤں کے پانی سے اس کی نگاہ کی تنواری پر باڑھ چڑھ گئی۔

۳۔ شعر کے دوسرے مصرع میں لفظ "تو" دوسرے آ یا ہے۔ مولانا طہطاوی کے نزدیک پہلا "تو" شرط و جزا میں ربط کے لیے اور دوسرا جواب میں اہتمام پیدا کرنے کے لیے ہے۔ "کہیں سے مراد کوئی نہ کوئی ہے۔"

شرح : تجھ سے بوسے کی اُمتید تو ہو ہی نہیں سکتی۔ خیر اگر بوسہ دینا منظور نہیں تو لب ہلا کر صاف صاف انکار ہی کر دے تاکہ ہمارا کام تمام ہو جائے۔ یہ ہڑال تیري طرف سے کوئی نہ کوئی جواب تو ہونا چاہیئے۔

۴۔ لغات۔ اوک : جب پینے کے لیے برتن موجود نہ ہو یا پلانے والا برتن دینا نہ چاہے تو پانی پینے والا دونوں ہاتھ ملا کر گھرائی سی پیدا کر لیتا ہے۔ پلانے والا اس میں پانی میں ڈالتا ہوتا ہے تاکہ پینے والے کی پیاس بجھ جائے۔ بعض اوقات ایک ہاتھ بھی لبوں سے لگا کر اسی طرح پانی پیا جاتا ہے۔ اسے اوک کہتے ہیں۔ یہ سلسلہ عموماً چھوٹ چھوٹ چھات سے پیدا ہوتا۔

شرح : اے ساقی! اگر تجھے ہم سے اتنی نفرت ہے کہ پیالے میں شراب نہیں دینا چاہتا تو مضائقہ نہیں۔ ہم ساعز ہو یا جام، ہر چیز سے بے نیاز ہیں، اوک میں پینے کے لیے تیار ہیں، مگر شراب دینے میں دریغ نہ کر، اس نعمت سے محروم نہ رکھ۔

۵۔ لغات۔ ہاتھ پاؤں ٹھپوٹا۔ ہاتھ پاؤں کا سوج جانے، ہاتھ پاؤں کا

کا کام نہ دینا، ہٹکا ہٹکا، حیران اور حواس باختہ رہ جاتا۔ جب اچانک انتہائی خوشی کی بات انسان سن لے تو اعصاب پر ایسا اثر پڑتا ہے کہ وہ ہتھوڑی دیر کے لیے کام کاج سے رہ جاتے ہیں۔

تشریح : اے استاد! جب محبوب نے کہا کہ ذرا میرے پاؤں خود پاؤں، اس ناگمان خوشخبری سے مجھ پر خوشی کی ایسی حالت طاری ہو گئی کہ میرے ہاتھ پاؤں کام سے رہ گئے۔

۱۔ لغات :

بالیں : بکیے،

چادر بانی کا سر ڈانا۔

تشریح :

میں محبوب سے جدائی

کی حالت میں بستر پر

پڑا ہوا تڑپ رہا ہوں

اس وجہ سے بستر کا تار

تار کشمکش کی مصیبت

میں مبتلا ہے۔ میرا سر

بکیے کے لیے ایذا کا

باعث ہے اور میرا

جسم بستر کے لیے بار

بنا ہوا ہے جو آفت

سے کم نہیں۔

۲۔ لغات :

پیش سے میری، وقف کشمکش بہتر تار بہتر ہے

مراسرہ رنج بالیں ہے، مرا تن باہر بہتر ہے

سر شگب سر بہ صحرا دادہ، نور العین دامن ہے

دل بے دست دیا افتادہ، بہ خود دار بہتر ہے

خوشا اقبال رنجوری اعیادت کو تم آئے ہو

فردغ شمع بالیں، طالع بیدار بہتر ہے

بہ طوفاں گاہ جوش انتظار شام تنہائی

شعاع آفتاب صبح محشر، تار بہتر ہے

ابھی آتی ہے بوبالش سے اس کی زلف مشکیں کی

بہاری دید کو خواب زنیخا، عار بہتر ہے

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے سحرِ یار میں بہ غالب !
 سر پہ صحرا دادہ :
 کہ بتیابی سے ہر اک تار بستر ، غار بستر ہے
 آدابہ اولیادہ

آنسو کا خانہ آنکھ ہے جب وہ اس گھر سے نکلے گا تو اسے آدابہ اولیادہ
 اور سر پہ صحرا دادہ کہا جائے گا۔ اس سے سرگنہ پر مراد نہیں کر آئو
 نکل کر صحرا میں پہنچے اور وہاں سیلاب آگیا۔

نور العین : آنکھ کا نور، آنکھ کا تارا، محدود و محدود۔
 بے دست و پا افتادہ : نافذ پاؤں معطل ہو جانے کے باعث پڑا ہوں۔
 برخوردار : پہلے کھانے والا، زندگی سے چل پانے والا، اقبال مند، عموماً
 انتہائی پیار سے بیٹھے، بیٹی یا قریبی خروں کو کہتے ہیں۔

شرح : آنسو آنکھ سے نکل کر دامن کی آنکھ کا تارا بنا ہوا ہے۔
 دل کی وہی حالت ہے، جیسے کسی کے نافذ پاؤں معطل ہوں اور اس پر بیچارگی کی
 کیفیت ظاہر ہو۔ وہ بستر کا برخوردار بنا ہوا ہے۔ یعنی آنکھوں سے آنسو بہ
 کر دامن تر ہو رہا ہے اور دل کو بے دست و پا کی حالت میں بستر سے خاص اُش
 پیدا ہو گیا ہے۔

۳۔ لغات۔ اقبال : خوش نصیبی۔

رنجوری : بیماری، مرہن۔

شرح : میری بیماری کس دردِ خوش قسمت ہے کہ اسے محبوب ! تم
 بیمار پُرسی کے لیے آئے ہو ! اس کی بدولت میرے سر ہانے جو شمع جل رہی ہے
 اس کی روشنی بستر کا جاگتا ہوا نصیباً بن گئی ہے۔

مطلب یہ کہ میں بیمار ہو کر بستر پر پڑا ہوں۔ محبوب مزاج پُرسی کے لیے آگیا۔
 محض اپنا ہی نصیباً نہ جاگا، بلکہ سر ہانے جلنے والی روشنی بستر کی خوش نصیبی میں
 مبتدل ہو گئی۔

۴۔ **شرح :** محبوب سے جدائی کی شام آئی تو بقراری کے جوش سے ایک طوفان کی صورت اختیار کر لی اور ایسی حالت پیدا ہوئی کہ میرے بستر کا تار صبح قیامت کے سورج کی کرن بن گیا۔ جو بستر آفتاب حشر کی کرنوں سے بنا گیا ہو، اس کے جوش اضطراب کا اندازہ کیا کیا جاسکتا ہے ؟

۵۔ **لغات ۔** بالمش : ہلکیہ، سرانا۔

شرح : زمینا کی طرح محبوب کو خواب میں دیکھنا اور اس کے دیدار سے لذت اخذ ہونا ہمارے بستر کے لیے باعث ننگ ہے۔ یعنی ہم کبھی گوارا نہیں کرتے کہ بستر پر لیٹیں، نیند آئے، پھر خواب میں محبوب جلوہ دکھائے، جس طرح عام روایت کے مطابق زمینا نے حضرت یوسفؑ کا جلوہ خواب میں دیکھا تھا ہمارا محبوب تو خود ہمارے پاس آتا ہی رہتا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ وہ ہمارے پاس تھا۔ اس کی منگ بار ڈلف کی خوشبو ہمارے تکیے سے سونگھی جا سکتی ہے۔

عربی نے بھی ایسا ہی ایک شعر کہا، اگرچہ اس کا موضوع دوسرا ہے :

قانع بہ بوسے دوست نہ گردید شوق ما

ایں جنس را بہ مفلس کنعان منرو ختم

دھارا شوق محبوب کی خوشبو پالینے پر قناعت نہ کر سکا۔ صحن خوشبو

پر خوش ہو جانے کا معاملہ ہم نے حضرت یعقوبؑ کے حوالے کر دیا،

جو ہمارے بالکل تہی دست تھے،

۶۔ **شرح :** اے غالب ! میں کیا جاؤں کہ محبوب کے فراق میں دل

کی حالت کیا ہے ؟ بقراری کا سرسری اندازہ کرنا چاہو تو یہ سمجھ لو کہ میرے بستر کا بستر و کانٹے کی حیثیت رکھتا ہے، جو اس میں چھجا ہوا ہے۔

خطر ہے رشتہ الفت رگ گردن نہ ہو جائے
 ۱۔ شرح: غرور دوستی آفت ہے، تو دشمن نہ ہو جاوے
 خطروں سے کہ الفت کا رشتہ میری
 گردن کی رگ نہ سمجھ اس فصل میں کوتاہی نشو و نما غالب
 بن جائے اور اس اگر گل سر کے قامت پہ پیرا ہن نہ ہو جاوے
 وجہ سے گردن اکڑ

نہ جائے۔ محبوب کی دوستی اور محبت پر معذور ہو جانا ایک آفت ہے۔ ایسا نہ
 ہو کہ اسے محبوب! آج تو دوستی پر مائل ہے تو کل دشمن بن جائے۔
 ۲۔ شرح: اگر فصل بہار میں پھول بڑھ بڑھ کر اور نوا پاپا کر سر کے
 جسم پر لباس نہ بن جائیں تو سمجھ لیا جائے کہ بہار نشو و نما کا کمال نہ دیکھا سکی،
 بلکہ اس کا دھولے کمال اور حد پارہ گیا۔

مطلب یہ ہے، فصل بہار میں نشو و نما کا جوش اس درجہ ہونا چاہیے کہ
 پھولوں کے پودے بڑھ بڑھ کر بند ہوتے جائیں، یہاں تک کہ معلوم ہو، سونے
 پھولوں کا لباس پہن لیا ہے اور اس کا کوئی حصہ اس لباس سے خالی نہیں۔



فریاد کی کوئی نئی نہیں ہے
 کیوں بوتے ہیں باغبان توبہ
 نالہ پابند نے نہیں ہے
 ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے
 گر باغ گداے میں نہیں ہے
 ہاں، کھانیو مت فریب ہستی
 پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے
 ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے
 اُردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے
 شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے

کیوں روّ قدح کرے ہے ذابذاً غے ہے یہ گبس کی قے نہیں ہے
 ہستی ہے مد کچھ عدم ہے غالباً ! آخر تو کیا ہے ؛ اے نہیں ہے !

۱۔ لغات - لے : سُر، دُھن -

شرح : سُراور دُھنیں راگوں اور گیتوں کے لیے ہیں۔ مزایہ و ذناں کے لیے نہ کوئی سُردہ کا ہے، نہ دُھن۔ نہ کسی بھی حالت میں بائسری سے کام لینے کا پابند نہیں، کیونکہ بائسری بچاتے وقت سُروں کا دھیان رکھتا ہوتا ہے اور آواز کی کو سُروں سے کوئی متا بہت نہیں۔

سُرمال، قطع، بناوٹ اور کاریگری نے پیدا کیے۔ مزایہ کے وقت ایسی کسی چیز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ دل سے نکلتی ہے تو طبعی علم انگیزی سے وہ اثر پیدا کرتی ہے، جو مال سُرمال کی محتاج نہیں۔

حق یہ ہے کہ اول مضمون نہایت نادر ہے، پھر اسے پیش کرنے کے لیے جو انداز اختیار کیا گیا ہے، وہ بے مثال ہے۔

۲۔ لغات - تو تبا : ایک قسم کا تلخ کدو جسے اندر سے خال کر کے درویش کشکول یا چھاگل بناتے ہیں۔ جب مٹی کے برتن کم تھے تو تو تبا ہی شراب یا دوسرے سیالات کے لیے استعمال کیے جاتے تھے ان میں یہ خوبی بھی تھی کہ وزن میں ہلکے ہوتے تھے، گرنے سے ٹٹتے نہیں تھے اور انہیں ہر آسانی حاصل کیا جاسکتا تھا۔ صدیوں تک شراب فردشی کے لیے تو تبا ہی استعمال ہوتے رہے۔ چنانچہ خود مرزا غالب فرماتے ہیں :

گر مٹج بہ کدو ریزد، برکت نہ در اہی شو

(اگر شراب فردش کدو یعنی تو تبا میں شراب دے دے تو اسے ہاتھ پر رکھ کر چل دے)

شرح : اگر باغ کو شراب کی بھیک مانگنا مقصود نہیں تو باغبان

تو تجھے کس لیے کاشت کرتے ہیں ؟

چونکہ تو نے درویشوں کے کشکول بھی بنتے ہیں ، اس لیے کہا کہ باغیانہ شراب کی بھیک مانگنے کے لیے تو تجھے ہوتے ہیں ۔

شعر سے یہ بھی ظاہر ہے کہ باغ اور شراب باہم لازم و ملزوم ہیں ۔

۳۔ **شرح :** اے محبوب حقیقی ! بے شک دشبہ کائنات کی ہر شے میں تیرا جلوہ نظر آتا ہے ۔ گویا تو ہر وجود میں چھپا ہوا ہے ، لیکن ساتھ ہی ظاہر ہے کہ تجھ ایسی کوئی چیز نہیں ۔ یہ لیس کشمہ شینا کا تر مہ ہے ۔ نیز تمام اشیا کہ اجسام ہیں اور وہ ذات پاک جہانیت سے بالکل منزہ ہے ۔

۴۔ **شرح :** خبردار ! مہستی کا دھوکا نہ کھاتا ۔ کوئی کتنا ہی کہے کہ خدا کے سوا کسی کا وجود ہے ، ہرگز نہ ماننا ۔ اس کے سوا وجود کوئی نہیں ۔

۵۔ **لغات :** اُردی : مراد ہے اُردی بہشت ، جو ایران میں شمسی سال کا دوسرا مہینا ہے ۔ بہار کا بھی یہ دوسرا ہی مہینا ہے ، جس میں سبز و گل کی بہتات کمال پر پہنچ جاتی ہے ۔

دے : شمسی سال کا دسواں مہینا ، جو بھرپور خزاں کا مہینا ہے ۔

شرح : مرزا غالب کے اس شعر کا بنیادی معنوں ہے ۔

تعرت الاشیاء باضداد ؛ یعنی چیزیں ایک دوسرے کی ضد سے پہنچانی جاتی ہیں ۔ خوشی کا احساس غم کے احساں پر مبنی ہے اور خزاں کا احساس بہار کے احساس پر موقوف ہے ۔

کہتے ہیں ، دل سے مسرت و شادمانی کا احساس محو کر ڈال تا کہ غم کے احساس سے محفوظ ہو جائے ۔ اگر تو بہار کی آمد سے خوش نہ ہوگا تو خزاں کی آمد تیرے لیے رنج و غم کا پیغام نہ بن سکے گی ۔ جو شخص نشاط بہار کا خوگر نہ ہو ، اسے خزاں کی افسردگی چھو بھی نہیں سکتی ۔

۶۔ **لغات :** قدح : شراب کا پیالہ ۔

گس کی تھے : شہد شہد کی کھیاں پہلوں پہلوں سے دس چوستی ہیں اشد بنا کر شہد کے
 راستے چھتیں اگل دیچی ہیں۔ شہد کو زیادہ سے زیادہ کدوہ ظاہر کرنے کے لیے گس کی تھے قرار دیا۔
 شرح : اے زاہد تو شراب کا پیلا کیوں ٹھکراتا ہے ؟ اسے پی لینے سے انگار کیوں کرتا ہے یہ
 شراب ہے کھس کی تھے نہیں جس سے تجھے کراہت آئے ۔

۴۔ لغات : نہیں ہے ، کھ لفظ لیکن اس شعر میں یہ طو اسلم علم استعمال ہوا ہے اس لیے
 اے ۔ اے نہیں ہے ۔ کہ کر خطاب کیا۔

شرح : اے غالب ! نہ تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ تو حقیقتہً موجود ہے اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں
 کہ تو غائب ہے وجود ہے ۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسے وہ شخص جو بار بار "نہیں ہے" "نہیں ہے"
 کہہ رہا ہے اسے تجھے نہیں ہے "موسوم کر لیتا زیبا ہے" تو بتا کہ کھ تو ہے کیا ؟ جس پر نہ خالص ہستی کا
 اطلاق ہو سکتا ہے ، نہ خالص نیستی کا ۔

دو چھ سوڑ مریم جو راحت دل کا کہ اس میں ریزہ الماس جزو عظم
 بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا وہ اک نگہ کہ بہ نظر ہر نگاہ سے کم ہے

۱۔ لغات : الماس : ہیرا ، جو مریم میں ڈال دیا جائے تو زخم
 کو بڑھاتا ہے ، جس طرح نمک اور مشک زخم کی تکلیف میں اضافہ کرتے ہیں
 شرح : زخم دل کے لیے جو مریم موجود ہے ، اس کے اجزاء کی
 تفصیل دو چھ سوڑ مریم اتنا جان لے کہ ہیرے کا ٹکڑا اس کا سب سے بڑا
 جزو ہے ۔

۲۔ شرح : اے محبوب ! تو نے مدت تک میری طرف سے تغافل
 اور بے پروائی اختیار کیے رکھے ۔ اس کے بعد ایسی نگاہ پیدا کی ، جو حقیقتہً
 نگاہ سے کم ہے ۔ یعنی تو نے دیکھنا بھی شروع کیا تو کلکیوں سے ، جس
 کا مطلب یہ ہے کہ کبھی کبھی گوشہ چشم سے مجھ پر نگاہ ڈال لیتا ہے ۔
 مرانا عبا عبا ہی کہتے ہیں ،

” بڑا حسن اس شعر کا یہ ہے کہ محبوب کے تغافل کی تصویر دکھا دی ہے۔ دوسرا لطف یہ ہے کہ ایک نگاہ میں ایسی تفصیل کے نگاہ ہے اور نگاہ سے کم ہے۔ اس کے علاوہ ایک لطیفہ یہ بھی ہے کہ نگہ ”یقیناً نگاہ“ سے کم ہے کہ ”نگاہ“ میں الف ہے اور ”نگہ“ میں نہیں۔“



ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے مرتے ہیں، وے ان کی تمنا نہیں کرتے
 وہ پردہ انھیں غیر سے ہے رابطہ نہانی ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردہ انہیں کرتے
 یہ باعثِ نو میری ارباب ہوں ہے غالب کو بُرا کہتے ہو، اچھا نہیں کرتے

۱۔ شرح : رشک کے باعث ہمیں یہ بھی منظور نہیں کہ محبوب کی تمنا کریں اور اس سے وصال کے طلبگار ہوں۔ ہمیں جان دے دینا منظور ہے، لیکن رشک اپنا بھی گوارا نہیں۔

یہ ویسا ہی مضمون، جیسا مرزا نے دوسری جگہ کہا ہے :
 دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پر رشک آجاتے ہے
 میں اسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جاتا ہے

مولانا طباطبائی نے خوب مزایا : جس طرح انتہائے بخل کا مرتبہ یہ ہے کہ بخیل خود بھی اپنی دولت سے محروم رہتا ہے، وہی حال انتہائے رشک کا ہے کہ تمنا سے وصل کرتے ہوئے اپنے اور آپ رشک آتا ہے۔

۲۔ شرح : محبوب نے پردے پردے میں غیر یعنی رقیب سے پوشیدہ تعلق قائم کر رکھا ہے۔ مجھ پر یہ ظاہر کیا کہ ہم جو غیر سے بے تکلف

جالتے ہیں اور پردہ نہیں کرتے تو دوجہ ہے کہ ہم اسے اجنبی سمجھتے ہیں۔ نیز ہم نہیں چاہتے کہ پردہ کرنے سے لوگ ہمارے تعلق کے بارے میں چہ میگوئیاں کرنے لگیں۔

۳۔ شرح : اے محبوب! تم غائب جیسے سچے عاشق کو بُرا کہتے ہو یہ شینہ اچھا نہیں کیونکہ جب بے حش کی یہ گت بن رہی ہے تو جو لوگ ہوس کے بہاری میں یعنی غیر اور قریب وہ تو بالکل نامہیز اور پامس ہو جائیں گے۔



ا۔ لغات	کرے ہے بادہ اترے ہے کسب رنگ فروغ
کسب :	خطِ پیالہ سرا سر نگاہِ گلچیں ہے
حاصل کرنا۔	کبھی تو اس دلِ شوریدہ کی بھی داد ملے
شرح :	کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالین ہے
اے محبوب!	بجائے، گردِ سُنے نالہ ہائے مُبلبلِ زار
شراب تیرے	کہ گوشِ گل، نغمِ شبنم سے، پنبہ آگیاں ہے
پ لعلیں	اسد ہے نزع میں اچل بے ونا، براے خدا
سے فروغ کا	مقامِ ترکِ حجاب و وداغ تمکیں ہے
رنگ حاصل	یعنی تیرے ب
کر رہی ہے،	کی بدست

اس میں وہ تمام ظاہری و معنوی خوبیاں پیدا ہو رہی ہیں جو شراب کے لیے خاص مافی جاتی ہیں۔ اور پیالے میں پیمائش کے لیے جو خط لگا ہوا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابند اسے انتہا تک پھول چھٹنے والے کی نگاہ بن گیا ہے۔ مطلب یہ کہ پیالہ تیرے لبوں سے چھوتے ہی شراب نے اتنا رنگ حاصل کر لیا، معلوم ہو رہا تھا، پیالے کے اندر پھلواڑی مٹیا ہو گئی ہے اور خطِ پیالہ نے پھول چھٹنے شروع کر دیے۔

۲۔ شرح : میرا دیوانہ دل ایک بہت سے اس حسرت میں مبتلا چلا آتا ہے کہ اے محبوب ! تیرا سر میرے تنکے پر ہو۔ آخر کبھی تو یہ امید پوری کر دیجیے۔ کب تک اسی حسرت میں عمر گزرتی جائے گی ؟

۳۔ لغات - پنہ آگئیں : روٹی سے بھرا ہوا۔

شرح : اگر بھول بھاری ٹبل کی فریاد و فغاں نہ مٹے تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے، کیونکہ اس کی منی نے اس کے کانوں میں روٹی ٹھونس رکھی ہے۔

اوس کے قطروں کو سفیدی کے باعث روٹی سے نشیہ دی اور کان میں پانی جمع ہو جائے تو سماعت میں فرق آ جاتا ہے۔ نم شبنم سے یقیناً پھول میں تری جمع ہوتی اور سورج کی روشنی میں شبنم سفید دکھائی دیتی ہے۔ اس طرح گوبل گل شبنم سے پنہ آگئیں ہو گیا۔

۴۔ شرح : اسد جانگنی کی حالت میں ہے۔ اے بونہا محبوب ! خدا کے لیے چل اور اس کا حال پوچھ۔ یہ وقت ایسا ہے کہ شرع و حجاب چھوڑ دینا چاہئے اور دتار و وقعت کو رخصت کر دینا چاہیے۔



۱۔ شرح : کیوں نہ ہو چشمِ بٹاں محوِ تغافل، کیوں نہ ہو ؟
یعنی اس بے یار کو نظارے سے پرہیز ہے
مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی
و اے ناکامی کہ اس کا فر کا خنجر تیز ہے

۱۔ شرح :
عجبوں کی آنکھ
تغافل سے کیوں
کام نہ لے ؟ وہ
ضرور کام لے گی،
کیونکہ یہ ایسا
بیمار ہے جسے

نظارے سے عارضِ گلِ دیکھ، روئے یار یاد آیا، اسدا!

پد ہیز کی تاکید جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے
کی گئی ہے۔

محبوبوں کی آنکھ کی ایک صفت یہاں بھی ہے، چشمِ بہار، فیثلی آنکھ۔
لفظ ”بہار“ سے خاندہ اٹھاتے ہوئے کہ دیا کہ بہاروں کو عموماً کسی نہ کسی
چیز سے پر ہیز کی تاکید کی جاتی ہے اور چشمِ بہار کے لیے دوسروں کی طرف کھینا
منوع قرار دیا گیا ہے، لہذا ان کے بے تغافل کے بغیر چارہ نہیں۔

۴۔ شرح : اگر خنجر کند ہوتا تو گلا کھٹنے میں کچھ نہ کچھ دیر ضرور لگتی
اور میں محبوب کو دیکھنے کا موقع مل جاتا۔ اب اس نے خنجر خوب تیز کر رکھا
ہے، گویا ایک لمبے بٹ لگا کٹ جائے گا اور مرتے مرتے اسے دیکھ لینے کی
آرڈر جی میں رہ جائے گی۔

۳۔ لغات : اشتیاق انگیز : شوق کو تیز کرنے والا۔

شرح : اے اسدا! پھول کا چہرہ دیکھ کر محبوب کا چہرہ یاد آتا
ہے۔ ہر طرف فصلِ بہار کا جوش ہے اور اس جوش کے باعث دل میں شوق
کی آگ تیز ہو رہی ہے، کیونکہ ہر جانب پھول کھلے ہوئے ہیں اور ہر
پھول روئے یار کی یاد تازہ کر رہا ہے۔



۱۔ شرح : دیا ہے دل اگر اس کو، بشر ہے، کیا کیسے

عاشق نے
محبوب کو خط

ہوا رقیب تو ہو، نامہ بر ہے، کیا کیسے

پہنچانے کے لیے
نامہ بر تلاش کیا

یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے ہن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے، کیا کیسے!

رہے ہیں گے وہ بچے گے کہ کو سے دوست کو اب
 اگر نہ کیسے کہ "دشمن کا گھر ہے" کیا کیسے؟
 نہ بے کر شرم، کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
 کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے، کیا کیسے؟
 سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرستش حال
 کہ یہ کہے کہ "سرِ رہگزر ہے" کیا کیسے؟
 تمہیں نہیں ہے سرِ رشتہ وفا کا خیال
 ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے، مگر ہے کیا؟ کیسے؟
 انہیں سوال پہ نہ غم جنوں ہے، کیوں لڑیے؟
 ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے، کہا کیسے؟
 حدِ سزا سے کمالِ سخن ہے کیا کیسے؟
 ستم ہمارے متاعِ مہر ہے، کیا کیسے؟
 کہا ہے کس نے؟ کہ غالب بُرا نہیں، لیکن
 سوائے اس کے کہ آشفۃ سر ہے، کیا کیسے؟

نہیں سکتا، پھر اسے تصور وار کیوں نظر آیا جائے؟ میں نے تو اسے نامہ بر
 بنا کر بھیجا تھا۔ اگر وہ میرا رقیب بن گیا تو اسے کیا کہہ سکتے ہیں؟

وہ خطے کر
 محبوب کے پاس
 پہنچا تو دیکھتے
 ہیں دل دے
 بیٹھا اور عاشق
 کا رقیب بن گیا۔
 مڑاتے ہیں کہ
 اگر نامہ بر بنے
 محبوب کو دل
 دے دیا اور
 اس پر عاشق
 ہو کر میرا رقیب
 بن گیا تو اسے
 کیوں مکرانِ نام
 دوں؟ آخر
 وہ انسان ہے
 اور کوئی سلیم الخوا
 انسان میرے
 محبوب جیسے
 حسین کو دل
 دے بغیر وہ

پورے شعر کا حاصل یہ ہے کہ کوئی انسان میرے محبوب کو دل دے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔

۲۔ شرح : موت بہر حال آنے گی، لیکن ہم آج اس کے آرزو مند ہیں اور اسے مند ہے کہ آج نہیں، بلکہ مقررہ وقت پر آنے گی۔ آہ! ہم کیا کہیں کہ موت سے ہمیں کس قدر شکایتیں ہیں۔ جب اُسے آنا ہی ہے اور گئے بغیر رہ نہیں سکتی تو آج کیوں نہیں آ جاتی ؟

۳۔ شرح : رقیب کو جب دیکھو وقت بے وقت محبوب کے کوچے میں موجود رہتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کوچے کو رقیب کا گھر نہ کہیں تو کیا کہیں گھر وہی مقام ہے، جہاں انسان عموماً رہتا ہے اور خاص مشاغل کے بغیر وہاں سے باہر نہیں جاتا۔ جب رقیب نے کوئے یار میں رہنے کی ویسی ہی صورت پیدا کر لی ہے تو وہی اس کا گھر بن گیا۔

۴۔ شرح : یہ معشوقانہ ناز و انداز تو دیکھیے کہ جب ہم دل کی بات کہنے کا ارادہ کرتے ہیں تو یہ فزیب سے دیا جاتا ہے کہ ہمیں کہے بغیر ہی سب کچھ معلوم ہے اور تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس طرح وہ دل کی بات بھی نہیں سنتے۔

۵۔ شرح : جب کبھی بازار میں ملاقات ہو جاتی ہے تو خوب سوچ سمجھ کر وہیں حال پوچھنے لگتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ عاشق بازار میں دل کھول کر بات نہیں کر سکے گا۔ وہ پرسش کا فرم ادا کر دیں گے اور جو کچھ انہیں سنانا چاہیے، اس کی نوبت نہ آنے گی۔

شعر کا ایک پہلو یہ ہے کہ شرفاء خاص باتیں بازار میں کرنا اور رکنا آداب کے خلاف سمجھتے تھے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ محبوب صاف درجہ شروع و حجاب ہے جو گرد و پیش دیکھ کر حال پوچھنا ہے تاکہ تفصیل کی نوبت نہ آئے۔

۶۔ شرح : اے محبوب ! تمہیں تنہا نفل کے باعث سرشار شدہ نفا کا

ذرا خیال نہیں۔ یہ دیکھو، ہماری مسٹی میں کچھ ہے، لکڑیا ہے؟ ذرا بتائیے تو؟

مولانا طالعباٹی فرماتے ہیں:

”اس شعر کا اندازِ بندش بھی نیا ہے اور معنوں بھی تازہ ہے۔

سادگی معنوں تو یہ ہے کہ سرِ درشتہ وفا کو ایک محسوس شے

فرزن کر لیا ہے کہ مشوق سے پوچھتے ہیں، بتاؤ، ہماری مسٹی میں

کیا ہے؟ بندش کی بدت یہ ہے کہ پوچھتے بھی ہیں، مسٹی میں کیا

ہے؟ پھر جو ہیز مسٹی میں ہے اس کا نام بھی لے دیا۔“

۷۔ **شرح :** محبوب سے سوال کیا جائے تو فرماتے ہیں، معلوم ہوتا

ہے کہ تم پاگل ہو گئے ہو۔ ہم نے اس ارشاد کا جواب نہ دینے کا فیصلہ کر رکھا

ہے، پھر کیس تو کیا کہیں؟

مولانا طالعباٹی فرماتے ہیں: معنوں خوبی شعر کا سبب نہیں، بلکہ دونوں

مصرعوں کی بندش میں ترکیب کے قشایہ ہونے سے شعر میں سن پیدا کیا۔

۸۔ **شرح :** اگر کوئی شخص سخنوری میں کمال پیدا کرے تو اسے سزا

یہ ملتی ہے کہ لوگ اس سے حسد کرنے لگتے ہیں، یعنی کوئی بلند پایہ سخنور ایسا

نہیں، جو حسد کا تختہ مشق نہ بنا ہو۔ اسی طرح جس شخص کے پاس بہر مندی

کی بیش بہا ستاع موجود ہے، اسے قیمت یہ ملتی ہے کہ اس پر ظلم توڑے جاوے

ہیں۔ گویا اس شعر میں مرزا نے زمانے کی تنگ نظری، خیر و ذوق اور قدر نشاہی

کی تصویر کھینچ دی ہے۔

۹۔ **شرح :** یہ کس نے کہا کہ غالب بُرا نہیں؟ نہیں، عزوہ کیجیے کہ

وہ بُرا ہے، بہت بُرا ہے، لیکن یہ تو سوچیے کہ آخر دیوانے کے سوا اسے

کیا کہا جاسکتا ہے اور ظاہر ہے کہ دیوانے پر اچھائی پرانی کا حکم لگانا اہل

عقائد و انش کا کام نہیں۔

دیکھیے، کس خوبی اور نکتہ نوازی کے ساتھ اپنی برائیوں سے برائی
حاصل کر لی۔

دیکھ کر درپردہ گرم دامن افشانی مجھے
کر گئی وابستہ تن، میری عریانی مجھے
بن گیا تیغ نگاہ یار کا سنگِ فناں

مرحبا میں! کیا مبارک ہے گراختانی مجھے
کیوں نہ ہو بے اتفاقی اس کی خاطر جمع ہے

جانتا ہے عجز پر سستھاے پنہانی مجھے
میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی

لکھ دیا منجملہ اسبابِ ویرانی مجھے
بدگماں ہوتا ہے وہ کافرانہ ہوتا کاشکے

اس قدر فوقِ فو لے مرغِ بستانی مجھے
داسے اواں بھی شعوبہ محشر نے ندم لینے دیا

لے گیا تھا گور میں فوقِ تن آسانی مجھے

۱۔ لغات:

دامن افشانی :
پتہ بھاڑنا، دنیا
چھوڑ دینا۔

شرح :
جب میری برائیوں نے
دیکھا کہ میں خفیہ خفیہ
پتہ بھاڑ کر دنیا کو
چھوڑ دینے میں
سرگرم ہوں تو مجھے
جسم کے ساتھ وابستہ
کر دیا۔

مطلب یہ کہ
دنیا سے بے تعلق
ہو جانا آسان نہیں
جب تک انسان
بدن کے ساتھ وابستہ
ہے یہ نہیں کہا جا
سکتا کہ وہ دنیا سے

وعدہ آنے کا وفاق ہے ، یہ کیا انداز ہے ؟
 تم نے کیوں سوچی ہے ، میرے گھر کی درباری مجھے ؟
 ہاں ، نشاطِ آمدِ فضلِ بہاری ، واہ واہ
 پھر ہوا ہے تازہ سوداے غزلِ خوانی مجھے
 وی مرے بھائی کو حق نے ، از سر نو زندگی
 میرزا یوسف ہے ، نائب ! یوسف ثانی مجھے
 مجرّد تھا ، سہمانیات سے کوئی ملا نہ تھا ۔ جب مجھے سرگرم تنفس دیکھا تو مجرّد
 مجھے وابستہ جسم کر کے رخصت ہو گیا ۔
 ۱۰ ۔ مطلب یہ کہ عالمِ اجسام کی نفس شادی میں مجھے سرگرم دیکھ کر مجرّد
 نے زندانِ بدن میں مجھے چھوڑ دیا اور آپ رخصت ہو گیا ، یعنی جسے واسن
 انشانی کا شوق ہو اُسے مجرّد و عریانی سے کیا واسطہ ؟
 ۱۱ ۔ ”دہ پردہ“ کے لفظ میں یہ رعایت رکھی ہے کہ تنفس بھی حجابِ صدر
 سے تعلق رکھتا ہے ۔“

۱۲ ۔ لغات ۔ سنگِ فساں : وہ پتھر جس پر تلوار ، پھری ،

خنجر وغیرہ تیز کیے جاتے ہیں ۔ سان ۔

گراں بجانی : سخت جانی ، یعنی جان کا بہ مشکل نکلنا ۔

شرح : میری سخت جانی مبارک باد کے قابل ہے ، کیونکہ اس

کی بددست میں محبوب کی تیغِ نگاہ کے لیے سان کا پتھر بن گیا ۔

اس میں مرزا کے پیشِ نظر یہ حقیقت ہے کہ میں سخت جان ہوں اور

مجھے قتل کرنا آسان نہیں ، بلکہ سخت مشکل ہے ۔ محبوب کی نگاہ کے وار بار

بارہ موتے ہیں ، لیکن میری جان نہیں نکلتی اور ہر وار میں محبوب کی تیغ نگاہ میری سخت جانی پر رگڑا کھانے سے تیز تر ہوتی جاتی ہے۔

۳۔ **مشرح :** وہ کیوں نہ مجھ سے بے رُخی برتے ؟ وہ جانتا ہے کہ جی بکھار خواب میں آکر میرا حال پوچھ لیتا ہے اور میں اتنی ہی توجہ پر خوش ہوں۔ اس سے اسے اطمینان ہے اور بے اتفاقی میں کوئی تامل نہیں ہوتا۔

۴۔ **مشرح :** جب قسمت کھنے والے نے میرے سیاہ خانے کی قسمت لکھی تو دیرانی کے دوسرے اسباب کے ساتھ مجھے بھی شامل کر دیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ میں دیرانی کا تختہ مشق بنا ہوا ہوں اور میری قسمت یہی ہے۔

۵۔ **مشرح :** میرے محبوب کے مزاج میں اتنی ہر گانی ہے کہ جب مجھے ببل کے نغمے سنتے ہوئے دیکھتا ہے تو کچھ اور شبہ کرنے لگتا ہے۔ کاش ! مجھے ببلوں کے نغمے سننے کا اتنا ذوق نہ ہوتا تا کہ اسے ہر گانی کا سا نہ ملتا۔

اس سے ملنا جتنا مضمون پہلے بھی کر چکے ہیں۔

کیا ہر گانے سے مجھ سے کہ آئینے میں برے طوطی کا عکس سمجھتا ہے ذنگار دیکھ کر

۶۔ **لغات - تن آسانی :** آرام طلبی۔

مشرح : مجھے آرام طلبی کا ذوق قبر میں سے گیا تھا ، لیکن انوس وہاں بھی قیامت کے شور نے دم نہ بیٹھ دیا اور اٹھایا۔

تن آسانی کا تقاضا یہ تھا کہ خیمہ میں غل کی کوئی صورت پیدا نہ ہوتی۔ شور و محشر نے آکر جگا دیا اور تن آسانی کی آرزو پوری نہ ہو سکی۔

مولانا طہطائی فرماتے ہیں کہ یہ شعر اس زمین میں بیت الغزل ہے۔ خوبی اس میں یہ ہے کہ قبر میں جانے کی توجہ بہت تازہ ہے۔ ذوق تن بہت اس شعر کی جان ہے ، جس نے مضمون مردہ کو زندہ کر دیا اور مصنف کی

معجزہ بانی پر ایک شاہد ہاتھ آیا۔ تن پرستی اور آسائش طلبی کی برائی کیا تھی۔
طرح بیان کی ہے !

۷۔ **مشریح :** محبوب سے خطاب ہے کہ میرے پاس آنے کا ردہ کیا تھا، لیکن آنے نہیں اور میں بیٹھا انتظار کر رہا ہوں۔ گھر سے ادھر ادھر نہیں ہو سکتا، گویا اپنے گھر میں دربان بنا ہوا ہوں۔ یہ کیا انداز ہے ؟

۸۔ **مشریح :** واہ وا ! فضل بہار آئی اور اس سے عیش و شادمانی میں ایسی تازگی پیدا ہوئی کہ غزل سرائی کے جس جنون کو فراموش کیے بیٹھا تھا، وہ عود کر آیا۔

۹۔ **مشریح :** خدا نے میرے بھائی میرزا یوسف کو بیماری سے شفا بخشی اور بنے سر سے زندگی مل گئی۔ اسے غالب ! میرا بھائی میرے لیے یوسف ثانی ہے

میرزا یوسف مرزا غالب سے دہریس چھوٹے تھے، انھیں جوانی ہی میں جنون کا عارضہ ہو گیا تھا، جس سے عارضی طور پر شفا پائی۔ غالباً اسی موقع پر یہ غزل کہی گئی تھی۔ میرزا یوسف پھر بیمار ہو گئے اور شفا میں جب انگریزوں نے دہلی کا محاصرہ کر رکھا تھا ان کا انتقال ہوا اور پاس کی ایک مسجد کے احاطے میں انھیں سپرد خاک کیا گیا۔

یاد ہے شادی میں بھی، ہنگامہ ”یارب“ مجھے
سبحہ زاہد ہوا ہے، خندہ زیر لب مجھے
بے کشاد خاطر و البتہ، در رہن سخن
تھا ظہیم قفلِ ابجد، خاندانِ مکتب مجھے

۱۔ لغات :
یارب :
اسے پروردگار !
ایرانوں نے
اسے دعا اور

دماغی دونوں
معنی میں استمال
کیا۔
تبیخ زیادہ:
زائد کی تبیح
ہیما مراد ہے
کسی عبادت گزار
کا تبیح کرنا، جو
عام طور پر بہتہ
آہستہ کی جاتی ہے اور اصطلاح میں اسے ذکرِ خفی کہتے ہیں۔ اس کی ضد ذکرِ جہر
ہے۔ یعنی بلند آواز سے ذکر کرتا۔

خندہ زیر لب : لبوں میں ہنستا یعنی کھل کر دہنستا، مسکراہٹ ہم
مشرح : مجھے عیش و نشاط میں بھی خدا نہیں جلائے گا لہذا انسان عموماً ایسے
اوقات میں خدا کو بھول جاتے ہیں۔ پس اس حالت میں بھی بدستور یارب !
اے پروردگار ! اے اللہ ! پکارتا رہتا ہوں، یہاں تک کہ لبوں میں ہیری
سہنی یعنی مسکراہٹ بھی ایک پرہیزگار آدمی کا تبیح کرنا ہے۔
۲۔ لغات : کشادہ : کھلتا، کشائش۔

خاطر و البستہ : بندھا ہوا دل، یعنی لول اور رنجیدہ دل۔
در رہن سخن : بات کے پاس گرو، اس سے مراد سجا بات پر موقوف ہونا۔
قفل ابجد : اس کی تشریح پہلے ہو چکی ہے، یعنی ایسا قفل جو مختلف
حروف کو ملا کر ایک لفظ بنا لینے سے کھلتا ہے۔

مشرح : میرے لول اور رنجیدہ دل کا کھلنا اور شادماں ہونا،
بات پر موقوف ہے، یعنی دل اُسی وقت خوش ہوتا ہے جب وہ سنی گئی

میں مصروف ہو۔ میرے لیے درسگاہ بھی نقلِ اجداد کا غلسم، یعنی جب تک مختلف حرمتِ ملا کر صحیح بات نہیں بنتی تھی، قتل نہیں کھتا تھا، شیک اسی طرح بات بننے یا بنانے پر میرے دل کی فرحت و کشت و گی موقوف ہے۔

۳۔ لغات - زندانی : قیدی۔

شرح : اے خدا! اس دیوانگی کی داد کس سے چاہیں کہ جب میں قید میں تھا تو یہ آرزو تھی کہ صحرا نوردی اور دشتِ پیمائی کا موقع ملے۔ اب وہ آرزو پوری ہوئی تو اس امر پر رشک ہو رہا ہے کہ قیدی کتنے آرام میں ہیں۔

دیوانگی یہ کہ نہ پہلی حالت پر اطمینان تھا، نہ دوسری حالت میں سکون کی کوئی صورت پیدا ہوئی، کبھی جنگلوں میں پھرنے کا شوق تھا، اب معلوم ہوا کہ جو لوگ جنگلوں میں پھرتے ہیں، ان کے مقابلے میں وہ لوگ زیادہ آرام سے ہیں، جو جیل خانے میں بند ہیں۔ اتنے زیادہ آرام میں ہیں کہ ان کی حالت پر رشک آتا ہے۔

۴۔ لغات - شکستِ آرزو : آرزو کا ٹوٹنا یعنی پورا نہ ہونا۔

مطلب : اس شعر میں برہمنی مطلوب استعمال ہو رہا ہے۔

شرح : میں کیا کروں، میری فطرت ہی حسرت و نامرادی کی رہی ہے۔ اگر کسی چیز کی آرزو پیدا ہوتی ہے تو میرا مقایہ نہیں ہوتا کہ وہ آرزو پوری ہو جائے، بلکہ اس کے پورا نہ ہونے کا طلب گار رہتا ہوں۔ حسرت و نامرادی کی لذتِ طبیعت کو اس درجہ پسند ہے کہ میں کسی آرزو کے پورا ہونے کا خراہ ہی نہیں۔

۵۔ لغات : آپ بھی : خود بھی۔

میرزا صاحب : غائب، یہاں صاحب کی ج مفتوح رکھی گئی ہے۔ حالانکہ حقیقت کسور ہے۔ دراصل مرزا نے لغت کے بجائے عام بول چال کو

ترجیح دی۔ بول چال میں اسے مفتوح ہی ہوتے ہیں۔

شرح : دیکھیے، غالب دل لگا کر خود بھی مجھ ایسے ہی ہو گئے،
حالانکہ حضرت میرزا صاحب پہلے بڑے کڑوہ کے ساتھ مجھے عشق سے بدلتے
رہتے تھے۔ جب خود ان کے دل پر سنی تو ساری پندہ نصیحت بھول گئے۔

۱۔ شرح :

شر سے ظاہر ہے
کہ یہ غزل جس
مشاعرے میں پڑھی
گئی تھی، وہاں
ہمارے شاہ ظفر
بہ فنی نفس موجود
تھے۔ اہلب ہے
یہ مطلع بادشاہ کے
موجود ہونے کی وجہ
سے موقع پر کہ
یا گیا ہو۔

آج بادشاہ
سلامت کے حضور
سخنوروں کی آزمائش
ہے۔ گویا یہ بزم
مشاعرہ ایک باغ

حضور شاہ میں اہل سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوشنویاں چمن کی آزمائش ہے
قدو گیسو میں قیس و کوہن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے
کریں گے کوہن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز اُس خستہ کے نیروے تن کی آزمائش ہے
نسیم مصر کو کیا پیر کنگاں کی ہوا خواہی
اُسے یوسف کی بوسے پیر بن کی آزمائش ہے
وہ آیا بزم میں، دیکھو نہ کیوں پھر کہ غافل تھے
شکیب و صبر اہل انجن کی آزمائش ہے
رہے گردِ دل میں تیرا اچھا، جگر کے پار ہو بہتر
غرض شہست بہت ناوک نلک کی آزمائش ہے

نہیں کچھ سُجھ و زتا ر کے پھندے میں گیرائی
 وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے
 پڑا رہا، اے دل وابستہ، بتیابی سے کیا حاصل
 مگر پھر تاب زلفِ پُر شکن کی آزمائش ہے
 رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم، تب دیکھیے کیا ہو
 ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے
 وہ آئیں گے ہرے گھر، وعدہ کیا، دیکھنا غالباً
 نئے فتنوں میں اب چرخِ کُن کی آزمائش ہے

۲۔ لغات :

دار و رسن :

سُولی اور رستا ۔

جس سے موت کی

سزا دی جاتی ہے ۔

شرح : مجنوں اور فریاد کا معاملہ میلّی اور شیریں کے قد اور زلفوں
 تک محدود تھا، لیکن جس مقام پر ہم ہیں، وہاں آزمائش کے لیے سُولی اور
 رستا موجود ہے ۔

شعر میں قد کو دار سے اور گیسو کو رسن سے جو تشبیہ دی گئی ہے، وہ
 محتاجِ تشریح نہیں ۔ اصل نکتہ یہ ہے کہ اپنا مرتبہ قیّس اور کو بہن سے بدرجہا
 بلند تر ثابت کیا یعنی ان کی آزمائش صرف ان کے محبوبوں کے قد و گیسو ہی تھی
 ہماری آزمائش دار و رسن میں ہے اور دار و رسن کی منزل قد و گیسو کے مقابلے
 میں ہزار درجہ سخت ہے ۔

۳۔ لغات : نیرو : قوت ، طاقت

شرح : فراد کے حوصلے کا امتحان تو آگے چل کر ہو گا، ابھی تو
 اُس غریب کی قوتِ بدن آزمائی جا رہی ہے ۔

اس شعر میں مزاد کے قصے کی طرف تلمیح ہے، یعنی اسے پہاڑ کاٹنے کا کام دے دینے کا مطلب صرف اتنا تھا کہ اس کے بدن کی قوت آزادی ہائے دیکھا جائے کہ اس کی جسمانی طاقت کتنے پانی میں ہے۔ وہ پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر لاسکتا ہے یا نہیں۔ اس آزمائش میں وہ پورا اُترا۔ پہاڑ کٹ گیا اور جوئے شیر بہ نکلی۔ اس کے بعد اس غریب کے حوصلے کا امتحان یوں کیا گیا کہ ایک بڑھیا کو بھیج کر شیریں کے سر جانے کی خبر پہنچا دی گئی۔ یہ خبر سنتے ہی مزاد کا حوصلہ جواب دے گیا اور اس نے آہ بھر کر تھیش سر پر مارا اور وہ ختم ہو گیا، گویا اس آخری امتحان میں پورا اُترا۔

۴۔ لغات - پیر کنگھاں : کنعان کا بوڑھا، یعنی حضرت یعقوب۔
ہوا خواہی : خیر خواہی۔

مشرح : اس شعر میں حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کے واقعے کی طرف اشارہ ہے، جس کا ذکر قرآن مجید میں یوں آیا ہے : جب حضرت یوسف مصر میں بھائیوں پر ظاہر ہو گئے تو انھوں نے فرمایا :

”اب تم یوں کرو کہ میرا یہ کڑا (بہ طور ملامت کے) اپنے ساتھیے جاؤ اور میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو کہ اس کی آنکھیں روشن ہو جائیں۔ پھر اپنے گھرانے کے تمام آدمیوں کو لے کر میرے پاس آ جاؤ اور جب (کڑا لے کر) قافلے نے مصر کی سرزمین چھوئی تو (اُدھر کنعان میں) ان کا باپ بولا : اگر تم لوگ یہ نہ کہنے لگو کہ بڑھاپے سے اس کی عقل ماری گئی تو میں کہوں گا مجھے یوسف کی ملک آ رہی ہے۔“ (سورۃ یوسف)

مصر سے آنے والی نسیم کو حضرت یعقوب کی خیر خواہی کا کوئی خیال نہیں، اسے تو حضرت یوسف کے کرتے کی ملک آزادی ہے، یعنی یہ دیکھنا ہے کہ کرتے کی ملک مصر سے کنعان پہنچتی ہے یا نہیں۔

۵۰۔ **شرح :** دیکھو، خبردار ہو جاؤ، وہ غارت گر صبر بزم میں آ رہا ہے۔ پھر نہ کہنا کہ آگاہ نہ کیا گیا اور غافل رہے۔ بزم میں جتنے لوگ بیٹھے ہیں، ان کے صبر و ضبط کا امتحان درپیش ہے۔ ابھی معلوم ہو جائے گا کہ کون اس کی غارت گری سے بچتا ہے۔

مولانا طیبائی فرماتے ہیں :

”جیسا مصرع معنیٰ نے یہاں لگایا، ادیب کی نظر میں مردے کو زندہ کر دینے سے کم نہیں۔ معنوں مردہ ہے، فقط مصرع لگا کر اس میں جان ڈال دی۔ یہ وہی معنوی ہے، جو کروڑ وندہ باندھا گیا کہ مشق کے دیکھنے سے صبر و شکیب نہیں باقی رہتا۔ مصرع جو لگایا، اس کے تین ٹکڑے کرو (وہ آیا بزم میں)، جیسے کہتے ہیں وہ چاند تھرا (دیکھو) شاید ہو جاؤ، دلوں کو سنبھال لو، (دیکھو پھر کو غافل تھے) یہ جملہ بھی وہی معنی رکھتا ہے، جو ”دیکھو“ کے ہیں، لیکن یہ پہلے پہلے کی تاکید ہے اور شعر میں حسن اسی تاکید سے بہت پیدا ہو گیا ہے اور ”وہ“ کے اشارے سے۔“

۶۔ **لغات - شست :** نشاندہ۔

نماؤں کے تیر انداز۔

شرح : محبوب کا تیروں میں رہ جائے تو وہ بھی اچھا، جگر کے پار ہو جانے تو اس سے بہتر، بس یہی دو ہوتے ہیں اور اس کی تیر اندازی کی آزمائش درپیش ہے۔

۷۔ **لغات - گیرائی :** گرفت، پکڑ۔

شرح : تسبیح اور زنا کے پسندے میں کون سی پکڑ ہے؟ یہ دعا ہے کسی کو کیونکر گرفت میں رکھ سکتے ہیں؟ اصل چیز تو یہ ہے کہ آزمایا جائے، شیخ اور برہمن کی وفاداری کا کیا حال ہے، یعنی وہ کب تک اپنے اپنے مسلک پر کچے

رہ سکتے ہیں اور اسے نباہ تک پہنچا سکتے ہیں۔

۸۔ **شرح :** اسے قیدی دل اور زلفت کے پھندے میں بری طرح بکڑا ہوا ہے، آرام و اطمینان سے بیٹھارہ، بیتابی اور بےقراری سے کیا ہاتھ آئے گا تو اس پھندے سے آزادی کی کوشش کئی مرتبہ کر چکا ہے، لیکن تجھے رانی نہیں ملی۔ کیا پھر اس غم بہ غم زلفت کی قوت گرفت آزانا چاہتا ہے، جو بار بار آزما کر ناکام رہ چکا ہے ؟

۹۔ **شرح :** بجنوری مرحوم نے لکھا ہے :

” قدس نے قریب قریب جملہ ملک منیات کو تلخ بنایا ہے۔ ہندوستان میں جو زہر زیادہ تر خود کشی کے لیے مستعمل ہیں، وہ تیلیا، سسکیا، دھتورا، انیون اور کھلا ہیں۔ یہ سب تلخ ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے مشکل ان کا مٹنا تک لے جانا ہے۔ زہر کا فعل معدے کے فعل پر منحصر ہے اور دیر غلبہ ہے۔ چنانچہ دوران سرمدیہ اطراف، املا، نسیان، جربان خون، پیاس، ضیق النفس اور انقباض و تشنج، جو موت کی علامتیں ہیں، اس وقت تک شروع نہیں ہوتیں کہ زہر سرایت نہ کر جائے۔ مرزا نے غم اور رنج کے اثر کا مقابلہ زہر سے خوب کیا۔ آغاز میں غم صرف تلخ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن انجام کار ذہن رفتہ گھٹلا کر مار دیتا ہے۔“

زہر غم رگوں اور مشرباؤں میں اترے گا تو دیکھنا چاہیے کہ اس کا اثر کیا ہو گا۔ ابھی تو صرف مٹہ اور حلق کی کڑواہٹ کا معاملہ درپیش ہے۔ ابھی تو یہ دیکھا جا رہا ہے کہ اس تلخ چیز کو کون کون کھانے کی ہمت رکھتا ہے۔

۱۰۔ چربخ کن کی آزمائش سے مراد چربخ کن کی طرف سے آزمائش ہے۔

شرح : کیا وہ میرے گھر آئیں گے ؟ بھلا، ممکن بھی ہے ؟ ہانا کہ انھوں نے وعدہ کر لیا، مگر اسے پورا کرنے کا خیال کب رکھا ؟ اسے غائب !

دیکھنا کہ اب یہ بڑھا آسمان جہیں کس کس نے نئے نئے جتن کرنا ہے اور ہم پر کیا کیا معصیتیں لاتا ہے۔

۱۔ شرح :

اگر میرے بارے
میں محبوب کا دل
کبھی پیسجا میں ہے
اور وہ چاہتا ہے
کہ مجھ پر احسان
کرے تو معصیت
یہ پیش آتی ہے
کہ وہ اپنے پہلے
ظلم و جور یاد کر
کے شرماتا ہے
اور جس منہ
نہیں دکھاتا۔

یہ معنوں
جس ایک شعر
میں باغ و چکے
ہیں :

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفا میں کر کے اپنی یاد، شرم آجائے ہے مجھ سے
خدا یا! جذبہٴ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھینچتا جائے ہے مجھ سے
وہ بد خو اور میری داستانِ عشق طوفانی
عبارت مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے
اُدھر وہ بد گمانی ہے، اُدھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے
سنہلنے دے مجھے، اے ناامیدی! کیا قیامت ہے
کہ دامنِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
تکلفِ برطرت، نظارگی میں بھی سہی، لیکن
وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

ظلم سے باز آئے، پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں، ہم تجھ کو منہ دکھلا دیں کیا

۲۔ شرح : ہوئے ہیں پائو ہی پہلے ، نیردر عشق میں زخمی
 اسے اشد اشد میرے دل کی
 نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے ، نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے
 کشش کا اثر
 قیامت ہے کہ ہووے ، مدحی کا ہم سفر غالب !
 اٹا ہوتا ہے ۔
 وہ کافر ، جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے
 میں جتنا اسے
 اپنی طرف کھینچتا ہوں ، وہ اور بھی زیادہ آزدہ و خفا ہوتا اور مجھ سے دور
 بھاگتا ہے ۔

۳۔ لغات ۔ وہ : مراد ہے محبوب ۔

شرح : : محبوب ہر مزاج اور زور بخ ہے ۔ وہ معمولی بات بھی قہقہے
 سے نہیں سن سکتا اور میرے عشق کی داستان بڑی لمبی ہے ۔ حالت تو یہ ہے
 کہ میں یہ داستان قاصد کے سامنے دھراتا ہوں تو وہ بھی گھبرا اٹھتا ہے ۔ پھر یہ
 کیونکر ممکن ہے کہ میرا زور بخ محبوب اسے اول سے آخر تک ہر اطمینان سن
 لے گا ؟

۴۔ شرح : : محبوب کے دل میں تو بیگانہ بیٹھی ہوئی ہے اور وہ
 میرے دعوے محبت کو جھوٹا سمجھتا ہے ۔ میں حد درجہ ناتوان و کمزور ہو گیا ہوں
 محبوب کچھ پوچھنے کے لیے تیار نہیں اور میں صنعت کے باعث بول نہیں سکتا ۔
 مولانا طباطبائی فرماتے ہیں : ” اس شعر میں ترکیب کے تشابہ اور الفاظ
 کے تقابلی سے بہت حسن پیدا ہو گیا ہے ۔

۵۔ شرح : : اسے ، اُمید ہی خدا کے لیے رہم کر ، یہ کیا قیامت پر پا
 کر رہی ہے ؟ مجھے سختے اور دم لینے دے ، پیہم یورشیں نہ کیے جا ۔ تو نے یہاں
 تک ذہبت پسچا دی کہ میرے ہاتھ سے خیالی یار کا دامن چھوٹا جا رہا ہے ۔ یہ
 چھوٹ گیا تو ہاتی کیا رہا ؟

عمر سمجھا جاتا ہے کہ کس حالت کا نقشہ الفاظ کے بجائے رنگِ روغن کے ذریعے سے بدرجہا بہتر کھینچا جاسکتا ہے، لیکن مرزا نے اس شعر میں لفظوں کے ذریعے سے جو نقشہ پیش کر دیا ہے، اسے غالباً کوئی مصوّر رنگِ روغن کے ذریعے سے پردے پر منتقل نہیں کر سکتا، کیونکہ ”چھوٹا جائے ہے“ کی قدیم بھی حرکت تصویر میں نہیں دکھائی جاسکتی ہے۔

۶۔ لغات : تکلف بر طرف : صاف صاف کہنا، لگی پٹی رکھتے

بغیر کہ دنیا۔

نظارگی : دیکھنے والا۔

شرح : مانا کہ میں بھی اسے دیکھنے والوں میں ہوں، لیکن صاف صاف

اندگی پٹی رکھتے بغیر کہ دیتا ہوں کہ کیا میں یہ نظم دیکھ سکتا ہوں، اس پارے محبوب کو دیکھا جائے، مجھے خود دیکھنا منظور نہیں، اگر یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ دوسرے اسے دیکھیں :

یہ مصنون دوسری جگہ یوں پانڈ جاتا ہے :

دیکھنا قسمت کو آپ اپنے پر رشک آجائے ہے

میں اسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

۷۔ شرح : خواہجہ عالی فرماتے ہیں :

۔ اس شعر میں وجدانی کیفیت کی تمثیل محسوسات کے ساتھ دی گئی ہے

مطلب یہ ہے کہ وہ قوی، جن سے عشق کے ترک کرنے یا اس کے

شدائد پر تحمل کرنے کی قدرت تھی، ابتدائے عشق میں انہیں کو

صدمہ پہنچا ہے، پس اب نہ عشق ترک ہو سکتا ہے، نہ اس پر صبر تحمل

کیا جاسکتا ہے۔

بحجوری مرحوم اس شعر کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”جنگ میں اس سے زیادہ مجبوری کا عالم کوئی نہیں، جب تک گولی

دل یا دماغ میں نہ لگے ، انسان کو لڑنے سے فوراً معطل نہیں کر سکتی ۔ بہا اوقات جدید باریک کلاہ کی گویاں فہم معدہ میں ایک جانب سے دوسری جانب ہلنا تکلف شکم سے پشت کی طرف نکل جاتی ہیں اور سوائے خارجی خفیف زخموں کے کوئی اثر نہیں ہوتا ۔ غشائے معدہ کے سوداخ فرداً خود بخود منڈل ہو جاتے ہیں ۔ پیپسرٹوں میں ، جگر میں گویاں بعض مرتبہ حسوس بھی نہیں ہوتی اور قریب قریب جزو بدن ہو جاتی ہیں ، لیکن پاؤں پر گولی کا لگنا غضب ہے ۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن : مرزا غالب نے میدان عشق میں بے میں ہو جانے کی کیا مثال دی ہے ! ہم عشق کے میدان جنگ میں پیچھے اور مردانگی سے لڑتے کا فیصلہ کر لیا ۔ مصیبت یہ پیش آئی کہ سب سے پہلے پاؤں زخمی ہو گئے ۔ اب نہ جاننے کی طاقت ہے کہ میدان سے نکل جائیں اور نہ جم کر لڑنے کی قوت ہے ۔ ظاہر ہے پاؤں کے زخموں نے اتنا بے بسی کر دیا کہ شاید سر اور سینے کے زخموں کا بھی یہ اثر نہ ہوتا ۔

یہ مضمون بھی ایک اور شعر میں باندھا ہے !

زخمی ہو اے پاسنہ پا سے ثبات کا

نے جھاگنے کی گوں ، نہ اقامت کی تاب ہے

۸ ۔ لغات : مدعی : رقیب ، غیر ، جو عاشق کے مقابلے پر محبت

کا دعویدار ہوتا ہے ۔

شرح : اے غالب ! قیامت ہے کہ ہمارا محبوب ، جسے ہم ،

خدا ناترین ہونے کی بنا پر کافر کہتے ہیں ، غیر کا ہم سفر ہو جائے ، حالانکہ میں

یہ بھی منظور نہیں ، اسے رخصت کرتے وقت " خدا کے حوالے " کہیں ۔

زبسکہ مشق تماشا جنوں سلامت کے کشادہ لبست مژدہ سیلی سلامت ہے
 نہ جانوں کیونکہ مٹے داغ طعنِ بزمی تجھے کہ آئینہ بھی درطہ سلامت ہے
 بیچ و تاب سے بسکب عافیت مت توڑ نگاہِ عجز سرِ رشتہ سلامت ہے
 وفا مقابلِ وعدہ عوایے عشق بے بنیاد جنوں ساختہ فصلِ گلِ قیامت ہے

۱۔ لغات۔ زبسکہ : چونکہ۔

کشادہ لبست : کھولنا اور بند کرنا۔

سیلی : تھپڑ۔ طمانچہ

تشریح : چونکہ دنیا کو دیکھنا اور عبرت نہیں، بلکہ رغبت کی نظر سے
 دیکھنا دیوانگی کا نشان ہے، اس لیے چکوں کا کھولنا اور بند کرنا حقیقت میں پشیمانی
 کا طمانچہ ہے۔

مطلب یہ کہ جو شخص دنیا کو عبرت کی نظر سے دیکھتا ہے، اسے یہاں کی چیزوں
 سے کوئی وابستگی نہیں ہو سکتی۔ وہ سمجھ لے گا کہ سب کچھ عارضی اور فنا ہے اور
 قدم قدم پر اس کی شادی سننے آ رہی ہیں اگر اس کے باوجود کوئی شخص دنیا
 سے رغبت پیدا کرے اور اسے بہ نظر رغبت دیکھے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ پاگل
 ہے اور پاگل کا علاج یہی ہے کہ اسے طمانچے پڑیں۔ وہ جو دیکھنے کی حالت میں
 آنکھیں جھپکاتا ہے، وہی اس کے لیے نظریات کا طمانچہ ہے۔

اس سلسلے میں مرزا بیدل کا ایک شعر غالب کے اس شعر کا ماتخذ بتایا

جاتا ہے۔

دیرہ راکہ بہ نظردہ دلِ مہرم نیست
 مژدہ برہم زدن از دستِ تاسف کم نیست

(جو آنکھ دل کے نظارے سے محرم نہ ہوئی، اس کا پلکیں جھپکنا دراصل افسوس کے ہاتھ کھٹنا ہے)

ظاہر ہے کہ اس مضمون کو مرزا غالب کے مضمون سے کوئی نسبت نہیں۔

۲۔ لغات - ورطہ : بھنور، گرداب، ہلاکت کا مقام۔

شرح : خدا ہی جانے کہ تو نے جو عہد توڑا، اس پر پھٹنے کا دھبا۔ کیونکر ڈھلے گا؟ تو جو بھنے سنورنے کے لیے آئینہ دیکھتا ہے، تیرے لیے تو وہ بھی ملامت کا گرداب ہے۔

مطلب یہ کہ محبوب آئینہ بناؤ سنگار کے لیے دیکھتا ہے اور بناؤ سنگار کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ دوسرے لوگوں پر اپنے حسن کے کرشمے آشکارا کیے جائیں۔ پتے عاشق کے نقطہ نگاہ سے یہ بجائے خود بد عہدی ہے۔ پھر محبوب کے دامن سے بد چھدی کا داغ کیونکر دُور ہو سکتا ہے؟

۳۔ لغات - سلک عافیت : آرام و راحت کا رشتہ۔

شرح : جوس کے چکروں میں پڑ کر راحت و آرام کا رشتہ ٹکڑے ٹکڑے نہ کر، کیونکہ جو شخص جوس میں مبتلا ہو، اس کے لیے آرام سے بیٹھنا غیر ممکن ہو جاتا ہے۔ گونا گوں آذونیں اُسے ہر طرف دوڑانے کے لیے پھریں گی اور عافیت ختم ہو جائے گی۔ عاجزی کی نگاہ ہی سلامتی کی ڈور ہے جو شخص عزیز اختیار کرے گا، وہ جوس سے بالکل پاک ہو گا، لہذا اس کی سلامتی میں کوئی خلل نہ آئے گا۔

۴۔ شرح : محبوب تو دنیا پر آمادہ ہو، لیکن عشق کا دعویٰ محبوب ٹا ہو

جائے تو اس کی مثال ایسی ہے کہ موسم بہار آجائے اور دیوانگی، جو اس موسم میں طبعی ہوتی ہے، بناوٹی رہ جائے۔ یہ منظر قیامت سے کم نہیں۔

۱۔ شرح :

میں آتا ڈبلا اور
گمزدہ ہو گیا ہوں
کہ اے محبوب !
اگر تو اپنی محفل
میں جگہ دے دے
تو میں اس بات
کا فتنہ اٹھاتا ہوں
کہ کون مجھے دیکھ
کر تباہ نہ سکے گا،
میں ہوں۔

شعر میں صرف

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں با، دے مجھے
میرا ذمہ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے
کیا تعجب ہے کہ اُس کو دیکھ کر آجائے رحم
واں تک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے
منہ نہ دکھلاوے، نہ دکھلا، پر یہ اندازِ عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے
یاں تک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زُلفِ گر بن جاؤں تو شانے میں اُلجھا دے مجھے

اپنے منعت اور لاغری کی کیفیت بیان کی ہے۔ یعنی کسی کی آنکھیں مجھے دیکھ
ہی نہیں سکتیں۔ میں کسی کو نظر ہی نہیں آ سکتا۔ ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ
محبوب کی بزم میں بار مل جانے پر رقیب چہ میگوئیاں کرتے تھے اس وجہ سے
بزم میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ مرزا کہتے ہیں کہ مجھے تو کمزوریوں کے باعث
کوئی دیکھ ہی نہیں سکتا۔ پھر چہ میگوئیوں کا کوئی ناموقع ہے ؟

۲۔ شرح : میری حالت اس درجہ غیر ہو چکی ہے کہ ہر دیکھنے
والے کو مجھ پر رحم آجاتا ہے۔ اگر کوئی حقیقی سمجھدو ہے تو مجھے کسی بہانے
سے محبوب کے پاس پہنچا دے۔ کچھ عجب نہیں کہ اسے بھی میری حالت دیکھ کر
رحم آجائے۔

۳۔ لغات : آنکھیں دکھلانا : غصے ہونا۔ بے مروتی دکھانا۔

شرح : اے محبوب ! اگر تو چہرہ نہیں دکھاتا، نہ دکھا، لیکن غصے

آسمان میں پروہ اٹھاتے ہوئے گھوڑی کر دیکھے۔

شہر میں لطف یہ ہے کہ آنکھیں دکھانے کی وجہ سے پورا چہرہ نہیں تو اس کا ایک حصہ مزور نظر آ جاتے گا، کیونکہ نعلی مروت آنکھیں دکھانے سے ظاہر نہیں ہو سکتی، مزوری ہے کہ چہرے کے آس پاس کا حصہ بھی نمایاں ہو۔
 ۴۔ مشرح : مجھے مصیبت میں مبتلا رکھنے پر محبوب اتنا خوش ہوتا ہے کہ اگر میں اس کی ذلت بھی بن جاؤں تو مجھے وہ کنگسی میں الجھا دے گا۔

باز بچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے	ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اور نگ سلیمان مرچہ دیک	اکٹات ہے اعجازِ میما، مرے آگے
جز نام، نہیں صورتِ عالم، مجھے منظور	جز وہم، نہیں بستی اشیاء، مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا، مرے آگے	گستا ہے حبسِ خاک پر دیا مرے آگے
مت پرچہ کہ کیا حال ہے میرا، ترے پیچھے	تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا، مرے آگے
سچ کہتے ہو خود میں و خود آراہوں نہ کیوں	بیٹھا ہے بُتِ آئینہ سیا، مرے آگے
پھر دیکھیے اندازِ گلِ انشائی گفتار	رکھ دے کوئی پیمانہ و صہبانِ مرے آگے
نفرت کا گلاں گزندے ہے میں دشمن گنا	کیوں کر کرو لو نام نہ ان کا، مرے آگے
ایساں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے کفر	کدو مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے
عاشق ہوں، پر معشوقِ فریبی ہے مرا کام	مجنوں کو بُرا کہتی ہے، یلیا، مرے آگے

خوش ہوتیں، پر وصل میں یوں مر نہیں سکتے
 آئی شب بھراں کی تمنا، مرے آگے
 ہے موج زن اک قلمِ مخوں کا شہی ہو
 آتا ہے ابھی دیکھو کیا کیا مرے آگے
 گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
 رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
 ہم پیشہ دم مشرب و ہم راز ہے میرا
 غالب کو بُرا کیوں کہو، اچھا مرے آگے

۱۔ شرح : میری نگاہوں میں دنیا بچوں کا ایک کھیل ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ رات دن ایک قماش میرے سامنے جو رہا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جو واقعات و حادثات یہاں رات دن پیش آ رہے ہیں، میرے دل پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور نہ پتہ جو کھیل کھیلتے ہیں، کسی سلیم عقل انسان پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

۲۔ لغات - اورنگ سلیمان : حضرت سلیمان کا تخت، جس پر سوار ہو کر وہ جزا میں پروا ذکر کرتے تھے۔

اعجازِ مسیحا : حضرت عیسیٰ کا معجزہ جو تم باذن اللہ (اُنھ اللہ کے حکم سے) کڑ کر مردے کو زندہ کر دیتے تھے۔

شرح : حضرت سلیمان کا تخت، جس کے متعلق مشور ہے کہ وہ جزا میں اُڑتا تھا، میرے نزدیک محض ایک کھیل ہے اور حضرت عیسیٰ کے معجزے کو میں محض ایک بات سمجھتا ہوں۔

دوسرے مصرع میں خوبی یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ محض ایک کلمہ یعنی بات کڑ کر مردے کو زندہ کر دیتے تھے۔

۳۔ شرح : میں دنیا کے وجود کو حقیقت کچھ نہیں سمجھتا، محض ایک نام ہے جو اس کے لیے رکھ دیا گیا، مسمیٰ کچھ نہیں اسی طرح اشیاء کا وجود بھی یسویٰ کے لیے وہم سے دیا وہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

مولانا مہاراجا مہاراجا فرماتے ہیں کہ تصوف کے نزدیک اجسام بالذات محسوس نہیں۔ ذات باری تعالیٰ کے سوا کسی شے کو موجود سمجھیں تو یہ موجودات یا تجربات ہوں گے، جیسے نفوس، ملائک وغیرہ یا ہمارے تصور کردہ اجسام ہوں گے۔ ہم نفوس و اجسام کے صرف اعراف دیکھتے ہیں، مثلاً نفوس کا علم و ارادہ، جسم کا رنگ اور شکل۔ تجربات کا نام محسوس ہونا تو ظاہر ہے، رہے اجسام تو ان کے محض احوال محسوس ہوتے ہیں۔ مثلاً پہاڑ ہیں جس شے کو ہم جسم کہہ یا ذات کہتے ہیں، وہ خود دکھائی نہیں دیتی، صرف پہاڑ کا رنگ، اس کی لمبائی چوڑائی اور پھیلاؤ نظر آتا ہے۔ یہ سب اعراف ہیں۔ رنگ کے متعلق بھی فلاسفہ یورپ نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ دراصل روشنی کی ایک نوع ہے اور اس نوع کا خاص توجہ ارتعاش ہیں نظر آتا ہے۔ اسی طرح آواز بھی ہوا کا ایک ارتعاش ہے۔ غرض اجسام کا حقیقی وجود کوئی نہیں اور اعراف ہمارے ادہام کی تخلیق ہیں، لہذا ثابت ہوا کہ جس شے کو عالم کہتے ہیں وہ محض ایک نام ہے اور اشیاء کی ہستی محض ایک وہم ہے۔

بجزوری مرحوم نے لکھا ہے کہ منہدانہ پندوں کی قدیمی تعلیم کا مفہوم غلط سمجھتے ہوئے عالم کو ایک فریب نگاہ اور دشت سراب سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایک خواب ہے، جو چشم کو عالم رویا میں دیکھتی ہے۔ مرزا غالب کی عقل اس مغالطے سے آزاد ہے وہ ہستی کو ہمیشہ مادے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، لیکن وہ مادے کے منکر ہیں۔ اگرچہ عالم اجسام خارجی سے برتر نظر آتا ہے اور نہایت لطیف گیوں سے نہایت بھاری دھاتوں تک ہر شے اس میں موجود ہے، لیکن مادے کا وجود خود محض بالانقابت ہے، بالذات نہیں۔ زندگی کی حیثیت جاگتی، چلتی پھرتی تصویریں، حرکات اصوات، الوان، کوئی وجود نہیں رکھتیں، جب تک ذہن ان کا ادراک نہ کرے۔ تمام مادہ جس میں خود میراجم اور بنی نوع کے اجسام شامل ہیں، بیجان اور بیکار ہے، وہ روح

وہ رواں، وہ خیال، جوان پر عامل ہے، حقیقت ہے۔ غالب کا فلسفہ پنہا
 فزا، ہینگل، برکتے اور فٹے سے ملتا ہے۔ حکمت کے رو سے مرزا کا خیال
 صحیح ہے۔ مادہ سالمات سے مرکب ہے۔ اگر پانی کے ایک قطرے کو کرۂ ارض
 کے برابر خیال کریں۔ تو اس کے سالمات چوگان کے گیند سے بڑے ہوں گے
 یہ خود اجزاء سے مرکب ہیں، جو آبِ لاہ تجرئی خیال نہیں کیے جاتے، بلکہ جو اہر
 سے مرکب مانے جاتے ہیں۔ ہر جز کو اگر ایک کلیسا سے مشابہ خیال کریں تو
 بقول سر آبیور لاج بہ جو اہر کلیسا میں اڑتی ہوئی کستیوں کی مثال ہیں۔ اگر
 ان کی تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایتھر کے حلقوں کی ساخت ہیں۔ اگر
 ان حلقوں کی گرہ کھل جائے تو محض خیال باقی رہ جائے۔ یوں مرزا غالب کا
 یہ شعر از روئے فلسفہ و حکمت بھی درست ثابت ہوگا۔

۴۔ شرح : میں بیا بان میں سیوگر و ش کرتا ہوں تو اتنی خاک اڑاتا
 ہوں کہ پورا بیا بان گرد و غبار میں چھپ جاتا ہے اور دریا کو میرا اتنا احترام
 منظور ہے کہ وہ میرے آگے اپنی پیشانی زمین پر گھٹاتا ہے۔
 یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ میری اشکباری کے مقابلے میں دریا غلج کے
 اظہار پر مجبور ہو جاتا ہے۔

۵۔ شرح : اے محبوب ! نہ پوچھ کہ تیرے عشق میں میرا کیا حال
 ہوا، یہ دیکھ کہ میرے سامنے تیرا کیا رنگ ہے۔

مطلب یہ کہ عاشق کے دہرہ و محبوب کی جو کیفیت ہوگی، اسی سے
 عاشق کی حالت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر محبوب کی نظر التفات عاشق
 پر ہے اور وہ وفاداری سے عشق و محبت کے تقاضے پورے کر رہا ہے
 تو ظاہر ہے کہ عاشق کی حالت بڑے اطمینان کی ہوگی۔ اگر اس کے برعکس
 محبوب کو عاشق کے حال پر کوئی توجہ نہیں، وہ اس سے مسلسل تغافل کرتا
 ہے تو ظاہر ہے کہ عاشق کی حالت زیادہ سے زیادہ خستہ ہوگی۔

فرمن اس شعر کے ذریعے سے مرزا غالب نے عاشق کی حالت معلوم کرنے کا ایک پیمانہ مہیا کر دیا، یعنی عاشق کے سامنے محبوب کا رنگ۔

۶۔ لغات - خود بین : اپنے آپ پر نظر رکھنے والا، مغرور خود پسند۔

خود آرا : اپنے آپ کو بنانے اور سنوارنے والا۔ خود بین و خود آرا دو حقیقہ محبوب کی صفات ہیں کہ اس کی نظر ہر لحظہ اپنے آپ پر رہتی ہے اور وہ اپنے بناؤ سنگار کا خاص خیال رکھتا ہے۔
آئینہ سیماء : آنکھیں جیسی پیشانی والا۔

شرح : محبوب طعنا مرزا کو کہتا ہے کہ تم تو بڑے خود بین و خود آرا ہو۔ مرزا جواب دیتے ہیں کہ کیوں نہ ہوں ؟ آنکھیں جیسی پیشانی والا محبوب میرے سامنے موجود ہے۔

اول بناؤ سنگار اس لیے موزوں و مناسب طعنا کہ محبوب کے چہرے کا آئینہ سامنے ہے، دوم خود بین و خود آرائی کی فوجت اس لیے آئی کہ محبوب پاس موجود ہے اور عاشق کے لیے خوشی کی سرشاری کا اس سے بڑا موقع کوئی نہیں ہو سکتا۔ اسی سرشاری کو محبوب نے خود بین اور خود آرائی قرار دے لیا اور کوئی بھی عاشق کو اس حالت میں دیکھتا تو یہی کہتا۔

۷۔ شرح : کوئی شخص میرے سامنے شراب کا پیالہ رکھ دے۔ پھر دیکھیے، کیونکہ گفتگو سے پھول برستے ہیں، یعنی شراب کا پیالہ دیکھ کر طبیعت پر مستی کی خاص کیفیت ظاہر ہو جائے گی اور گفتگو کا انداز محدود رنگین و دلاؤیز ہو جائے گا۔ اسی رنگین و دلاؤیزی کو گفتگو کی محلّ انشائی سے تعبیر کیا۔

۸۔ شرح : محبوب کے سسلے میں میرے دلک کا یہ حال ہو گیا کہ اس کا نام بھی کسی کی زبان پر آجاتا تو میں کہہ دیتا کہ بس یہ نام نہو۔ میری تو

یہ کیفیت رشک کے باعث غنی، محبوب کے دل میں گمان پیدا ہوا کہ مجھ سے نفرت ہو گئی ہے۔ اور لوگوں کو بھی یہی شہر ہونے لگا۔ فرماتے ہیں کہ بھائی! میں رشک سے دست بردار ہوا۔ آئندہ نہ کہوں گا کہ محبوب کا نام میرے سامنے نہ لو، یعنی رشک لہجہ بجا، لیکن یہ صورت نہ ہونی چاہیے کہ سب کو محبوب سے نفرت کا گمان ہونے لگے۔

۹۔ شرح : ایمان مجھے روک رہا ہے کہ مٹھ جاؤ، کفر کی طرف نہ جاؤ۔ اُدھر کفر مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ عجب کشمکش میں مبتلا ہوں۔ کعبہ میرے پیچھے ہے اور کلیسا میرے آگے ہے گویا ایمان کو چھوڑ کر کفر کی طرف چل پڑے ہیں، ورنہ کلیسا آگے کیوں ہوتا؟

۱۰۔ شرح : بلا شہر میں عاشق ہوں۔ لیکن ایسا عاشق جو دلالتِ کارناموں سے معشوق کو بُھا لیتا ہوں۔ میرے اس کمال کا یہ عالم ہے کہ میں میرے سامنے ہو تو مجھوں کی بُرائی شروع کر دیتی ہے۔

مطلب یہ کہ میں عشق میں ایثار، جان بازی اور فداکاری کے ایسے کوشش دکھاتا ہوں، جو مجھوں، فرزاد اور دوسرے بڑے بڑے عاشقوں کو نصیب نہ ہوے۔ چنانچہ ان کے محبوب میرے کارنامے دیکھتے ہیں تو میری طرف اُٹل ہو جاتے ہیں اور اپنے عاشقوں کی قدر و قیمت ان کی نظروں میں گھٹ جاتی ہے۔

۱۱۔ شرح : بیشک وصل ایسی خوش نصیبی کی تعریف ہے جس پر ہر سچے عاشق کو انتہائی مسرت و شادمانی ہوتی ہے، لیکن شادی مرگ کی نوبت نہیں آتی۔ یہ طریقہ نہیں کہ خوشی اس حد پر پہنچ جائے، جو جان لیوا ثابت ہو۔ مجھے یہی صورت پیش آتی۔ آہ! معلوم ہوتا ہے کہ میں جدائی کی رات جو آرزو کر رہا تھا، وہ وصل کی شب پوری ہو گئی، یعنی زمانہ شہر کی تمنا نے جگام صاف علی لباس پہن لیا۔

مولانا علی ہادی فرماتے ہیں :

یہ شعر اس زمین میں بیت الغزل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شب بچوں میں جو میں نے مرنے کی تمنا کی تھی، آج وہ بڑا بول میرے آگے آیا کہ وصل کی خوشی میں مر گیا۔ وصل کی خوشی میں مرجانا اور لوگ بھی بانہا کرتے ہیں، مگر یہ بات ہی اور ہے اور سادی کرامات محاورے اور زبان کی ہے، جس نے مرنے کے مصنون کو زندہ کر دیا۔ فکرِ غالب کے کارناموں میں یہ شعر بھی شمار کرنا چاہیے۔

۱۲۔ **شرح :** میری آنکھوں سے خون کا دریا بہ نکلا، جو سامنے لہریں لے رہا ہے۔ کاش! اسی پر معاملہ ختم ہو جاتا، مگر بظاہر ایسا کرنے کی اُمید نہیں دیکھی عشق کی راہ میں ابھی کیا کچھ میرے سامنے آنے والا ہے!

۱۳۔ **شرح :** اگرچہ نزع کی حالت ہے اور ہاتھ حرکت کرنے سے رہ گئے ہیں۔ اتنی سکت باقی نہیں کہ صراحی سے شراب پیالے میں اڑھائی لوں اور ہلی باؤں، لیکن آنکھوں میں تو دم ابھی باقی ہے۔ اس لیے ابھی پیالہ اور صراحی اٹھاؤ نہیں، بدستور میرے سامنے رہنے دو۔

اس سے مقصود وہی ایک گونہ بخودی ہے، جس کے آرزو مند مرزا غالب ہمیشہ رہے،

ابو فراس کا ایک شعر ہے کہ اے ساقی! مجھے شراب پلا اور زبان سے بھی کہہ کہ یہ شراب ہے۔ خود ابو فراس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک کاتب کے سامنے سے گزرا۔ استاد نے ایک طاب علم سے پوچھا کہ ابو فراس نے یہ کیوں کہا، زبان سے بھی کہہ کہ یہ شراب ہے؛ طاب علم نے جواب دیا کہ شراب کا پیالہ ہاتھ میں لے کر قوتِ لامر اس سے مستفید ہوگی، شراب دیکھ کر باصرہ لذت حاصل کرے گی، شراب پینے سے ذائقہ شاد کام ہوگا، شراب پینے سے وقت شائد اس کی خوشبو سے مستی حاصل کرے گی، صرت ایک سامعہ باقی رہ گئی تھی۔ جب ساقی زبان سے کہے گا کہ یہ شراب ہے تو اسے بھی ایک خاص راحت ملے گی،

گویا تمام حواس اس خورد و نوش میں شریک ہوں گے اور لذت انتہا پر پہنچ جانے لگی۔

مرزا غالب زندگی کی اس منزل پر پہنچ گئے، جب باصرہ کے ہوا کو ٹی جس کار آمد نہیں رہی۔ وہ چاہتے ہیں کہ جب تک باصرہ باقی ہے، شراب کو دیکھنے سے جتنی لذت حاصل ہو سکتی ہے، وہ ہوتی رہے اور اس کیفیت کا صحیح اندازہ عرق نوش ہی کر سکتے ہیں۔

۱۴۔ لغات - ہم پیشہ : دو یا دو سے زیادہ آدمی، جن کا پیشہ ایک ہو۔ ایک پیشہ اور ایک ہی کام کرنے والے۔

ہم مشرب : دو یا دو سے زیادہ آدمی، جن کا مسلک، مذہب اور طرز طریقہ ایک ہو، نیز جو مل کر شراب پئیں۔

شرح : غالب تو میرا ہم پیشہ، ہم مشرب اور ہمراز ہے۔ وہی کام کرتا ہے، جو میں کرتا ہوں۔ وہ میرا ہم مسلک ہے اور ہم اکٹھے کھاتے پیتے ہیں۔ میرے رازدوں میں بھی وہ شریک ہے، اُسے کیوں بُرا کہتے ہو؟ اچھا اگر تمہیں کہنے پر اصرار ہی ہے تو کم از کم میرے سامنے تو نہ کہو۔

۱۔ شرح :
 اے محبوب! اگر
 میں اپنا حالِ زار
 آپ کے سامنے
 پیش کرتا ہوں تو
 آپ کدیتے ہیں
 یہ طوفانی داستان
 کوں جو حال تو کہتے ہو، ”مَدعا کیے“
 تمہیں کہو کہ جو تم یوں کو تو کیا کیے؟
 نہ کیو طعن سے پھر تم کہ ”ہم ستم گر ہیں“
 مجھے تو خوش ہے کہ جو کچھ کہو، ”بجا“ کہیئے“

سننے کے لیے ہمارے
پاس وقت نہیں ،
مطلب کی بات کہو
اور بتاؤ کیا چاہتے
ہو ؟ بچا پرہ عاشق
اس صورت حال
پر حیران ہو کر عرض
کرتا ہے ، آپ ہی
فرمائیں کہ آپ کے
اس ارشاد کے بعد
کیا کموں اور کیا کر
سکتا ہوں ؟

مطلب یہ کہ
عاشق اپنی حالت
محبوب کے سامنے
اس لیے پیش کرتا
ہے کہ اسے رحم
آجائے اور عاشق
کا دعا جو محبوب پر
پوری طرح داغ
ہوتا ہے ، پورا ہو
جائے ، لیکن محبوب
وہ کیفیت ہی مٹتا

وہ بیشتر سہی ، پر دل میں جب اتر جاوے
نگاہ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کیے
نہیں ذریعہ راحت ، جراحہٴ پریکاں
وہ زخم تیغ ہے ، جس کو کہ دکشا کیے
جو مدعی بنے ، اس کے نہ مدعی بنیے
جو ناسزا کہے ، اس کو نہ ناسزا کیے
کہیں حقیقت جانکا ہی مرض لکھے
کہیں مصیبت ناسازی دوا کیے
کبھی شکایت رنج گراں نشیں کیجے
کبھی حکایت صبر گریز پا کیے
رہے نہ جان تو قاتل کو خونہا دیجے
کٹے زبان ، تو خنجر کو مرحب کیے
نہیں نگار کو الفت ، نہ ہونگار تو ہے
ردائی روش و مستی ادا کیے
نہیں بہار کو فرصت ، نہ ہو ، بہار تو ہے
طراوت چمن و خوبی ہوا کیے

سفینہ جب کہ کنارے پر آ لگا ، غالب ! گوارا نہیں کرتا ،
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخُدا کہنے !
جو اس کے دل میں رحم ، عطیّت اور
نری پیدا کرنے کا موجب سمجھی جاسکتی ہے ۔ تیز حال سننے سے بیزاری یا بے پروائی
کا مطلب ہی یہ ہے کہ محبوب کو عاشق کا کچھ خیال نہیں ۔ اب وہ نہ بچا رہ محبوب ہی
سے پوچھتا ہے کہ آپ کی اس روش کے بعد میں کسوں کو کیا کہوں ؟

۲۔ **شرح :** اے محبوب ! میں آپ کی سنگدل اور بیدردی کی شکایت
کرتا ہوں تو آپ کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا ، جاؤ ، ہم واقعی ظالم اور سنگر ہیں ۔
آپ کو اندوئے طمن بھی یہ نہ کہنا چاہیے ، کیونکہ میری تو عادت ہی یہ ہے کہ آپ
جو کچھ فرمائیں ، میں بجا اور درست کہتا جاؤں ۔ گویا اس طرح بلا ارادہ میری
زبان سے آپ کی ستم گری کی تصدیق ہو جائے گی ۔

۳۔ **شرح :** بلاشبہ محبوب کی نگاہ تاز ایک نشتر ہے ، لیکن جب وہ
نشتر دل میں اتر جائے تو اسے کیوں جانی پہچانی چیز نہ سمجھیں ؟
مطلب یہ ہے کہ دل میں وہی چیز اترتی ہے ، جو محبوب ہو ۔ یقیناً محبوب
کی نگاہ نشتر ہے ۔ مگر دلیشیں ہوتے ہی وہ آشنا بن جاتی ہے ۔

۴۔ اس شعر کی شرح ہم پہلے ”خطوطِ غالب“ سے نقل کر چکے ہیں ۔ ملاحظہ

ہو شرح :

زخمِ حے داد نہ دی تنگی دل کی یا رب

تیر ہی سینہ بھل سے پرِ انشاں نکلا

مطلب یہ کہ نوکِ تیر کا زخمِ دلی راحت کا درد یہ نہیں بن سکتا ، کیوں کہ
نوکِ تیر سے جو زخم گئے گا وہ نہایت معمولی اور چھوٹا سا ہوگا ۔ جس زخم کو
دکشا یعنی دل کھول دینے والا کہہ سکتے ہیں ، وہ تلوار کا زخم ہے ۔

شعر میں لفظ ”دکشا“ کے دو معنی ہیں ۔ اول راحت افزا ، دل شگفتہ کر دینے والا

فرحت انگیز، دھوم دل کو کھول دینے والا یعنی فراخ اور وسیع۔ یہاں دونوں معنی بالکل ٹھیک اُترتے ہیں، یعنی نہ ظلم تیغ فرحت افزا بھی ہے، فراخ اور وسیع بھی۔

۵۔ ۱۰۔ لغات : مدعی : دعوے کرنے والا، تالش کرنے والا حریف، دشمن۔

جان لکا ہی : جان گھٹا، تکلیف کی شدت۔
گراں نشیں : جم کر بیٹھ جانے والا، جسے دُور کرنا مشکل ہو، بھاری۔

گر بڑ پا : بھاگنے والا۔ تا پاندار، تا استوار
خون نہما : خون کی قیمت، جو رتم خون کے بدلے میں مقتول کے وارث کر دی جائے۔

روانی روش : خوش وقاری، خوش خرامی۔
شرح : اگر کوئی حریف اور دشمن بنے تو اس سے دشمنی کا قصد نہ کرنا چاہیے۔ جو شخص ہمارے متعلق نا زیبا باتیں کہے اس کے جواب میں ایسی ہی باتیں نہ کہنی چاہئیں۔

کیس بیادہی کے جان گھٹا دینے کی حقیقت ظلم بند کیجیے، کہیں یہ مصیبت بیان کیجیے کہ دوا موافق نہیں۔

کبھی ایسے رنج کی شکایت کیجیے، جو دل میں اس طرح بیٹھ جائے کہ اُسے دُور کرنا ممکن نہ ہو۔ کبھی اُس صبر کی داستان سنائیے جو بالکل نا پاندار ہے اور ہمیشہ بھاگنے کے ور پے رہتا ہے۔

اگر جان باقی رہے تو قتال کی خدمت میں خود تہا پیش کرنا چاہیے۔ اگر زہاں کٹ جائے تو خنجر کو مر حبا د آفریں کہنی چاہیے۔

اگر محبوب کو عاشق سے محبت نہیں اور اس کا جو ہر غیر الغت سے خالی ہے

تو کچھ پیدا نہیں۔ محبوب تو ہے۔ اس کی رفتار کی دلاویزی اور ناز و انداز کی مستی کا ذکر کرنا چاہیے۔

مطلب یہ کہ اگر محبوب میں الفت نہیں تو نہ اس کی مجبوری زائل ہوتی ہے نہ اس کی خوش خرامی اور ناز و انداز میں کوئی حرق آتا ہے۔ گویا مجبوری بہ طور باقی رہتی ہے۔

اگر بہار صندوقی دیر کے لیے آتی ہے اور جلد رخصت ہو جاتی ہے۔ تو مضائقہ نہیں، بہار تو ہے۔ اس کی وجہ سے بارغ میں ہر طرف طراوت و شادابی پیدا ہو جاتی ہے اور گڑھا میں ایک خاص وکشی آ جاتی ہے۔ یہی بہار کی کم فرمستی کے باعث اس کے یہ بدیہی جو ہر تو ختم نہیں ہو جاتے۔

۱۱۔ لغات - سفینہ : کشتی - ناؤ۔

ناخدا : قبح۔

شرح : اے غالب! جب ناؤ کنارے پہ آگئی تو قبح نے دوران سفر

میں ہم پر جو ظلم و ستم کیے، خدا سے ان کی فریاد کیا کریں ؟

مطلب یہ کہ جب اصل وقت گزر گیا تو کسی کی برائی یاد نہ رکھنی چاہیے، بلکہ اپنی

چاہیے، کیونکہ جو کچھ پیش آ چکا ہے، وہ کسی بھی صورت میں کالعدم نہیں ہو سکتا، پھر اسے یاد رکھنے سے کیا فائدہ ؟

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ عقاب نے چار باتوں میں حکمت اخلاق کو مستحضر کر دیا

ہے، ان میں سے دو یاد رکھنے کی ہیں یعنی موت کا آنا اور خدا کا حاضر و ناظر ہونا اور دو بھول جانے کی ہیں، یعنی کسی پر کچھ احسان کیا ہو یا کسی نے کچھ برائی کی ہو۔

مرزا غالب نے اس شعر میں بھول جانے کی ایک بات کا ذکر نہایت پرتابصر

انداز میں کر دیا۔

۱۔ شرح:

خواجہ نالی فرماتے

ہیں :

”دھویا جانا“

بے شرم دیکھا گیا ہونا

پاک، آزاد یا شہداء

مطلب یہ ہے کہ جب

ملک آنکھ سے آنسو

ضمیں نکلے تھے تو

اس بات کا پاس لٹاؤ

تھا کہ عشق کا راز کسی

پرغلا ہر نہ ہونے پانے

مگر جب رونا ضبط نہ

ہو سکا اور ہر وقت

آنسو جاری رہنے

لگے تو اخفاءِ راز عشق

کا خیال جاتا رہا اور

ایسے بے شرم و بے جا

ہو گئے کہ آزادوں

اور شہدوں کی طرح

کھل کھیلے۔ اس

مطلب کو ان لفظوں میں ادا کرنا کہ رونے سے ایسے دھوئے گئے کہ بالکل پاک

ہو گئے، بلاغت اور حسن بیان کی انتہا ہے۔“

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے

دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

صرف یہاں سے ہوئے آلاتِ میکشی

تھے یہ ہی دو حساب، سویوں پاک ہو گئے

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم

بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

کہتا ہے کون نالہ بلبلیں کو بے اثر؛

ہم روئے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہل شوق کا؛

آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم جگہ

کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

اس رنگ سے گل اس نے اٹھائی، اس کی فنش

دشمن بھی جس کو دیکھ کے غم ناک ہو گئے

مطلب کو ان لفظوں میں ادا کرنا کہ رونے سے ایسے دھوئے گئے کہ بالکل پاک

ہو گئے، بلاغت اور حسن بیان کی انتہا ہے۔“

جب تک اشکباری جاری نہیں ہوئی تھی، یہ خیال تھا کہ عشق کا بھید کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے۔ جب ضبط کے تمام بند ٹوٹ گئے اور گریہ و زاری شروع ہو گئی تو راز چھپانے رکھنے کا معادہ ہی ختم ہو گیا۔ کیونکہ اشکباری سے ہر شخص باہم مرصع عشق میں مبتلا ہیں۔ عام قاعدہ ہے کہ جب تک بھید آشکارا نہ ہو، انسان بڑی احتیاط کرتا ہے، لیکن جب حقیقت بے اختیار واضح ہو جائے تو ضبط کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی اور رفتہ رفتہ رسوائی کا احساس گندہ ہوتے ہوتے ختم ہو جاتا ہے۔ یہی صورت مرزا غالب کو پیش آئی۔ رونے سے ایسے دھوئے گئے کہ پاس دلاناظ کا کوئی قشر لگا نہ رہا۔ بالکل پاک ہو گئے۔ یعنی ضبط و احتیاط سے کام لے کر پورا قی اختیار کر لی۔

۲۔ لغات۔ ہما : قیمت۔

آلاتِ میکشی : شراب نوشی کا سرو سامان۔

شرح : ہمارے لیے دو ہی قیعتے تھے، ایک یہ کہ شراب پیتیں، دوسرا

یہ کہ شراب کے سرو سامان سے فارغ ہو جائیں۔ چنانچہ ہم نے شراب نوشی کا پورا سرو سامان شراب کی قیمت میں دے دیا۔ اس طرح ہمارے دونوں حساب صاف ہو گئے۔ نہ شراب کی قیمت ہمارے ذمے رہی، نہ سرو سامان ساتھ ساتھ اٹھانے پھرنے کی مصیبت سے دوچار ہوئے۔

۳۔ شرح : اگرچہ تم (حبیب)، آوارگی کے باعث دنیا بھر میں رسوا ہو

گئے، لیکن اتنا تو بڑا کہ تمہاری طبیعتوں میں چال کی آگئی۔ ساواگی اور سادہ لوحی باقی نہ رہی۔ اب کوئی تمہیں فریب نہیں دے سکتا۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ طبیعتوں کا چالاک ہونا محاورہ ہے۔ اس مقام پر جمع اور مفرد دونوں طرح ہوتے ہیں، لیکن مصنف پہلے شخص ہیں، جنہوں نے جمع کے ساتھ نظم کیا۔ ۳۔ اذکی لفظ اسی کو کہتے ہیں۔

۴۔ شرح : کون کتنا ہے کہ بیل کی فریاد و غماں ہے اندر ہی یہ جو

بھول کھلتے ہیں، کیا معلوم نہیں کہ ان کے پردے میں لاکھ جگر پاک ہوتے ہیں؟ یہ بیل کی مزایا ہی کا اثر ہے۔ جو مزایا بھول کے پردے میں لاکھوں جگر چر کر دکھ دیتی ہے، اسے بے اثر قرار دینے کی کون سی وجہ ہے؟

۵۔ شرح - اہل شوق کی بقا و فنا کے بارے میں کیا پوچھتے ہو؟ کوئی بیان کرنے کی چیز ہے؟ وہ لوگ تو اپنے عشق کی آگ میں خس و خاشاک کی طرح جل بجھتے۔

کمال یہ ہے کہ اہل شوق اپنی آگ میں خس و خاشاک کی طرح جلتے ہیں، یعنی اُن سوکھے ہوئے تنکوں اور پتوں کی طرح، جنہیں صاف کر کے باغ سے باہر پھینک دیتے ہیں۔ یقیناً عشق کی آگ سب کو اسی طرح جلاتی ہے۔ اس کے نزدیک کسی کی بقا کوئی خاص وزن نہیں رکھتی۔ جو کچھ ذات باری تعالیٰ کے ہوا ہے، وہ کوڑا کرکٹ ہے اور اس کے لیے یہی فریبا ہے کہ آگ کی نذر ہو جائے عشق کی آگ میں کام انجام دیتی ہے۔ اب رہا معاملہ بقا و فنا کا تو انھوں نے عارضی بقا سے نہایت پائی اور حقیقی بقا میں گم ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا نے مشر میں بقا و فنا کا معاملہ واضح نہیں کیا۔

۶۔ شرح : خواجہ عاتق مزارتے ہیں :

”ہم نے اس کے تقاضے سے تنگ آ کر شکایت کی تھی اور اس کی توجہ کے خواستگار ہوئے۔ تھے۔ جب اس نے توجہ کی تو ایک ہی نگاہ میں ہمیں فنا کر دیا“

مطلب یہ کہ محبوب کے جلوے کی تاب کوئی نہیں لاسکتا۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہم سے تقاضے برتا جا رہا ہے۔ یہ شکایت لے کر محبوب کے پاس پہنچے اس نے ایک نگاہ ہم پر ڈالی، نتیجہ یہ ہوا کہ ہم خاک ہو کر رہ گئے۔

محبوب حقیقی کے جلوے کی آمد و ہرول میں موزن ہے، لیکن اس کے اتفاق کو سنبھالنے کی ہمت کسی میں نہیں۔

۷۔ شرح : کل اس نے اسد کی نقش ایسے انداز سے اٹھائی کہ دشمن بھی اسے دیکھ کر رنج و غم کے پیکر بن گئے۔

شاید کسی صاحب کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہو کہ نقش اٹھانے کی کیفیت معین طریق پر بیان نہیں کی گئی تو یہ وسوسہ بجا ہوگا۔ دوسرا مصرع صاف بتا رہا ہے کہ نقش اٹھانے کا طریقہ اتنا بڑا تھا، جسے دیکھ کر دشمنوں کے دل بھی ڈہل گئے اور وہ بھی سچ و غم میں مبتلا ہو گئے۔

نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مستِ طرب

۱۔ لغات

شاداب :

میراب، احد

درجہ ترقی تازہ۔

جو ثبار :

نری۔ ہنر۔

شیشے سے سرو و سبز جو ثبارِ نغمہ ہے

ہم نشین مت کہ کہ تیر ہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست

واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

شرح : نشے نہایت رنگین اور پُر لطف ہیں۔ ساز خوشی میں مست

نظر آتے ہیں۔ شراب کی صراحی نغمے کی ہنر وادوں کے کنارے سبز سرو کی بار دکھا رہی ہے۔

۲۔ شرح : اظہر ہے کہ پورا منظر فصل بہار کا ہے، جب شراب پینے، مست و

رہنے، راگ رنگ سننے کا خاص لطف آتا ہے۔ ایسے ہی وقت میں دل

پر یہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ اگر گیتوں کو ایک ہنر من کر لیا جائے تو اس

ہنر کے کنارے شراب کی صراحی کے سوا سرو کا کام کوئی نہیں دے سکتا۔

عرض شراب اور راگ رنگ کی نہایت موزون بزم کا نقشہ پیش کر دیا ہے۔

۲۔ شرح : اسے مہدم ! تو مجھے یہ کیوں سمجھا تا ہے کہ خراپہ و فنان

بند کر اور محبوب کی بزمِ عیشِ درہم برہم نہ کر؟ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اس بزم میں تو میری فریاد و فغاں کو بھی فغے کی حیثیت حاصل ہے، پھر اس سے اس کی محفلِ عیش کیونکر کتہہ ہو گی؟

دوسرے مصرع کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، اول یہ کہ محبوب میری فریاد و فغاں سے بیحد خوش ہوتا ہے، گویا میرا نالہ بھی فغے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب نالہ فغہ بن گیا تو محفلِ عیش میں خلل کیونکر پیدا ہو گا؟ دوم میرے محبوب کا ماحول اس درجہ مسرت و نشاط افزا ہے کہ باہر سے فریاد و فغاں بھی وہاں پہنچے تو فغے کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ دونوں صورتوں میں محبوب کی بزمِ عیش کے درہم برہم ہونے کا کوئی موقع نہیں۔

ا۔ شرح:
 عرَضِ نازِ شوخی و نِداںِ برائے خندہ ہے
 دعوٰیِ جمعیتِ احباب، جائے خندہ ہے
 ہے عدم میں غنچہ، محوِ عبرتِ انجمِ گل
 یک جہاں زانو تامل، در قفائے خندہ ہے
 کلفتِ افسردگی کو عیشِ بتیابی حرام
 ورنہ ونداںِ دردِ دلِ افشردنِ بناے خندہ ہے
 سوزشِ باطن کے ہیں احبابِ منکر، ورنہ یاں
 دلِ محیطِ گریہِ دلِ آشناے خندہ ہے
 ا۔ شرح:
 بننے کے لیے
 لازم ہے کہ
 دانتوں کی
 شوخی کا کرشمہ
 نمایاں کیا جائے
 دوستوں کی
 جمعیت کا دعویٰ
 ہنسی کا مقام
 ہے۔
 مطلب یہ
 کہ ہنسنے وقت

دانت نمایاں ہوتے ہیں۔ اکٹھے ہونے کے باوجود تمام دانت الگ الگ ہیں اور کبھی یکساں نہیں رہ سکتے۔ یہی کیفیت دو سطروں کے جمع کی ہے۔ جس طرح دانت طبعاً یکے بعد دیگرے نکل جاتے ہیں، اسی طرح احباب کا جمع بھی رفتہ رفتہ بکھیر جائے گا، لہذا ان کے اکٹھے رہنے کا جو دعویٰ کیا جاتا ہے، اس پر تقریباً ہنس دینا بالکل بجا ہے۔

۲۔ لغات۔ ایک جہاں زالنو تامل : مدورہ نکر و تامل۔ زانو کا لفظ اس لیے لائے کہ خور و نکر کے وقت انسان عموماً سر زانو پر رکھ دیتا ہے۔ تقفا : پیچھے۔

شرح : کلی کا منہ بند ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عدم میں بیٹھی ہوئی ہے اور بھول کے انجام سے عبرت حاصل کرنے میں مصروف ہے۔ ہنسی کے بعد مجدد خور و فکر کا مقام ہے۔

مطلب یہ کہ کلی کھلے گی جسے بھول کا ہنسنا قرار دیا۔ خوشبو بکھرے گی پھر بھول کی پنکھڑیاں ایک ایک کر کے گر جائیں گی اور وہ ناپید ہو جائے گا گویا ہنسنے کا انجام عبرت کا مقام ہے اور کلی جب تک بند ہے، اسی سے کسب عبرت کر رہی ہے۔

۳۔ لغات۔ کلفت : تکلیف، کدورت۔

دنداں درد دل افشردن : دانت دل میں گڑو دینا۔ غارسی محاورہ جو تکلیف دہ حالات کو صبر سے برداشت کر لینے کے لیے بولا جاتا ہے۔

شرح : میں امردہ، پڑمردہ اور دل تنگ ہوں۔ اس حالت ک کٹھن کے لیے اضطراب و بے قراری کا عیش حرام ہے۔

مطلب یہ ہے کہ امردگی کا تقاضا ہی انقباض اور دل گرفتگی ہے۔

اے بے تابی اور بے چینی کی قارنغ ایالی کیونکر نصیب ہو سکتی ہے ؟ بے چینی اور بے تابی حرکت و جنبش کی تقاضی ہے۔ ظاہر ہے کہ امردگی

اور دل گرفتگی کے مقابلے میں بیتابی عیش کی حالت ہے اور انسروگی کو عیش نصیب نہیں ہو سکتا، برداشت دل میں گڑو دیتا یعنی ہر قسم کے مکروہات صبر سے برداشت کر لینا ہی منہس کی بنیاد ہے۔

کسنا یہ چاہتے ہیں کہ اس زندگی میں ہزاروں تکلیف وہ صورتیں پیش آتی ہیں۔ بہ ایں ہمہ لوگ مسترت و شادمانی میں بھی مصروف پائے جاتے ہیں۔ سبب یہ ہے کہ وہ مکروہات صبر سے برداشت کر لیتے ہیں۔ یوں ان کے لیے ہستی کا موقع پیدا ہو جاتا ہے، لیکن انسروگی کے لیے بے تابی کا عیش ممکن نہیں۔

۴۔ لغات۔ محیط : احاطہ کرنے والا، فارسی والے اسے بحر بکیراں کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، کیونکہ پانی نے زمین کو سہرط سے گھیر رکھا ہے۔

شرح : میرے دوست اور مہدم اندونی سٹڈش کے قائل نہیں ورنہ ان پر واضح ہو جائے کہ میرا دل گریے کا ایک بکیراں سمندر ہے اور لب بڑی بے تکلفی سے خندہ زنی میں مشغول ہیں۔ یعنی میرے اندونی حالات ظاہر پر اثر انداز نہیں ہوتے اور ظاہری آثار کو میرے اندونی حالات کا نقشہ نہ سمجھنا چاہیے۔ میں اندہ ہی اندر جل رہا ہوں، لیکن کسی پر یہ ساز ظاہر نہیں ہونے دیتا، کیونکہ برابر ہفتا رہتا ہوں اور دل کی کیفیت کسی پر آشکارا نہیں ہوتی۔

۱۔ لغات حسن بے پروا، خریدار متاع جلوہ ہے
آئندہ زانوئے فکر آئندہ زانوئے فکر اختراع جلوہ ہے

تاکجا اے آگہی! رنگ تماشا باغتن
چونکہ غور و فکر کے وقت
انسان عموماً گھٹنے پر سر
رکھ لیتا ہے۔ اس لیے
فارسی والے زانو کو آئینہ بھی کہتے ہیں۔

اختراع : ایجاد

شرح : بلاشبہ حسن بالکل بے پروا اور بے نیاز ہے۔ یہ اس بلوے
جلوہ آرائی کا خاص شوق ہے۔ گویا وہ برابر بلوے کی متاع کا خرمیہ چلا
جاتا ہے۔ وہ زانو پر آئینہ رکھ کر بناؤ سنگار کرتا ہے تو مقصد یہ ہوتا ہے
کہ جلوہ آرائی کے نئے نئے طریقے سوچے۔

۲۔ لغات۔ رنگ باغتن : رنگ شکستن یعنی رنگ کا بدن

اور متغیر ہوتا۔

شرح : اے علم و شعور! تم کب تک عالم امکان کے دیکھنے کا رنگ
بدلتے رہو گے؟ یعنی کب تک مختلف صورتوں میں اس دنیا کی چیزوں پر نظریں
جمائے رکھو گے؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آنکھ ایک مرتبہ کھلتی ہے تو مطلب
یہ ہوتا ہے کہ بلوے نے رخصت کے لیے آغوش کھول دی ہے؟ گویا وہ
اس درجہ آنی و فانی ہے کہ ہر ایک جھپکنے میں رخصت ہوتا چلا جا رہا ہے۔

جب تک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
عالمِ خیالِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیالِ طستِ یلیٰ کرے کوئی

۱۔ شرح :

اے محبوبِ حقیقی!

تجھ سے گفتگو کراتا

اس وقت تک کہنا

مشکل ہے۔ جب

افسردگی نہیں، طرب انشاء التفات
 ہاں، دردِ بین کے دل میں مگر جا کرے کوئی
 رونے سے اسے ندیمِ اِلامت نہ کر مجھے
 آخر کبھی تو عقدِ دل وا کرے کوئی
 چاکِ جگر سے جب رہِ پریش نہ وا ہوئی
 کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی
 لختِ جگر سے ہے رگِ ہرزخار شاخِ گل
 تا چند باغبانی صحرا کرے کوئی
 ناکامی نگاہ ہے، برقِ نظارہ سوز
 تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
 بہرنگ و خشت ہے صدقِ گوہر شکست
 نقصاں نہیں، جنوں سے جو سودا کرے کوئی
 سر بر ہوئی نہ وعدہٴ صبر آزما سے عمر
 فرست کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی
 ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاو، یا کس خیز
 یہ درد وہ نہیں ہے کہ پیدا کرے کوئی

ہمک دل
 پر زخم
 کامنہ نہ
 پیدا کریا
 جائے ۔
 گویا جیب
 تک تیرے
 ساتھ عشق
 کی حقیقی
 تڑپ
 پیدا نہ
 ہو، وہ
 ربط ضبط
 قائم کر
 لینا غیر
 ممکن ہے
 جسے اسطلاح
 میں سادرت
 و محوِ دشت
 کہتے ہیں ۔
 بہر حال ہم
 اس دنیا میں
 باہتِ حیات
 رہیں

بیکاری جنوں کو ہے سر پٹنے کا شغل سے کرتے
 جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی
 حسن مزور غ شیخ سخن دور ہے اس بات چیت
 پہلے دل گداخت پیدا کرے کوئی
 دے سکتا۔ اس کے لیے دل پر عشق کا ایسا چرکا لگنا چاہیے جو منہ کا
 کام دے سکے۔

۲۔ شرح : دنیا پوری کی پوری مہنوں کی دحشت کے ہامٹ
 گرد و غبار بن گئی۔ گویا زمین سے آسمان تک یہی گرد و غبار پوری مٹتا پڑ
 حاوی ہو گیا۔ اب سوچنا چاہیے کہ ایسی کے طرے کو اس سے کیونکر بچایا جائے۔
 مطلب یہ کہ عشق نے یہاں ایسا ہنگامہ بپا کر رکھا ہے کہ اس میں حسن
 کے لیے اپنی آرائش و دیباچہ محفوظ رکھنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ لغات۔ طرب انشا : شادمانی پیدا کرنے والا۔
 شرح : میں جس امزدگی اور دل گرفتگی میں مبتلا ہوں، اس میں محبوب
 کے اتفاقات سے نشاط و شادمانی پیدا نہیں ہو سکتی۔ یعنی محض اس کی توجہ
 سے میری امزدگی کا ختم ہونا محال ہے، البتہ محبوب دروہن کر دل کے اقدار
 جا دینے تو میں سمجھوں کہ حالت بدلنے کی کوئی صورت پیدا ہوئی۔

۴۔ شرح : اے ہمدرد! میں روتا ہوں تو تو مجھے ہامست کیوں کرنے
 لگا؟ آخر تو ہی بتا کہ دل کی گرہ کا نہ کھلنا کوئی کب تک گوارا کرے؟ کچھ نہ کچھ
 تو انتقام ہونا چاہیے۔ کہیں تو اس گرہ کا کھولنا بھی مناسب مان لینا چاہیے۔

۵۔ شرح : جب سارے جگر چیر لینے پر بھی محبوب ہمارے حال
 پر مہینے پر متوجہ نہ ہوا تو خدا کے لیے بتاؤ کہ اب گریبان کو رسوا کرنے کا

کیا فائدہ ہے ؟ بین چاک بگر حبیباً عظیم المقدّر کار نامہ انجام دے چکنے کے بعد
 بھی مدعا حاصل نہ ہوا تو کرتا پھاڑ لینے سے کیا بنے گا ، جو چاک بگر کے مقابلے
 میں بالکل بے حقیقت ہے ؟

اس شعر میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ جو مقصد بڑی بڑی قربانیوں
 سے حاصل نہ ہوا اس کے لیے کس قدر قربانیوں سے کام لینا یقیناً بے سود
 ہے ۔

۶۔ لغات۔ لختِ جگر : جگر کے ٹکڑے ۔

شرح : میں صحرائیں چکر لگا رہا ہوں ۔ وہاں کا ہر کاٹا میرے
 جگر کے ٹکڑوں سے پھول کی شاخ بن گیا ہے ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کب
 تک صحرائیں باغبانی کا فرض انجام دیا جائے ؟ یعنی کب تک اس کے
 کانٹوں کو شاخوں سے گل اور اس کی وسعت کو خیاں بنانے کی کوشش
 کی جائے ۔

یہ خیال نارسا میں بھی ایک جگہ بڑی خوبی سے نظم کیا ہے :

آخستہ ایم ہر سرخار سے بہ خون دل

قانونِ باغبانی صحرا فوشہ ایم

دہم نے ہر کانٹے کو دل کے لہو سے لت پت کر دیا ہے ، یوں ہم
 نے قانون بنا دیا ہے کہ صحرائیں باغبانی کیونکر کی جائے)

۷۔ شرح : اسے حُسنِ حقیقی ! تجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا ، دیکھنے
 والوں کی نگاہیں تو کام چسپتی ہیں اور یہی ناکامی ان کے لیے ایسی بجلی بن
 جاتی ہے جو تپ نگاہ کا مال و متاع جلا کر خاک کر دیتی ہے ۔

۸۔ شرح : جنون کی حالت میں سوداگر لینا نقصان کا باعث

نہیں ہو سکتا ، کیونکہ رٹکے مہنون پر جو اینٹ پتھر پھینکیں گے ان میں
 سے ہر ایک ایسی پیپی بن جائے گا ، جس کے اندر سے شکست کا موتی نکلے ۔

اس شعر کا پہلا مصرع صرف الفاظ کا ہیر پھیر ہے، شکست سے مراد ہے سر کا ٹوٹنا۔ اس ٹوٹنے کو موتی قرار دیا اور ہر رنگ و خشت کو صدف بنا لیا۔ بظاہر اینٹ پتھر کے بھائے موتی بنے، نقصان کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا، لیکن وہ موتی نہیں، جو بادشاہوں کے تاج اور حسینوں کے ہاروں کی زینت ہوتے ہیں، بلکہ سر اور ہاتھ پاؤں ٹوٹنے کے موتی، جو یقیناً نقصان ہے، مگر اس لیے نقصان نہیں سمجھا جاسکتا کہ دیوانے کو اینٹ پتھر ہی مطلوب ہوتے ہیں۔

۹۔ شرح : اے محبوب! تیرا وعدہ اس درجہ صبر آزمائیا تھا کہ عمر اس کے پورا ہونے کا ساتھ نہ دے سکی۔ ظاہر ہے کہ تیری تہذیب زندگی ہی میں کی جاسکتی تھی، اب زندگی گزر جانے کے بعد تمنا کی صورت کیا ہے؟ بہر حال یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ہماری عارضی عمر تیری آرزو کے لیے کافی نہیں۔

۱۰۔ شرح : جدت اور ایچ کی فطرت ہی وحشت ہے مطلب یہ کہ جو لوگ فطرۃً جدت اور ایچ کا جوہر لے کر دنیا میں آتے ہیں، وہ مسئلہ قوام کی پابندی سے ضرور کم و بیش گریز کریں گے۔ اور وحشت کا خاصہ ہی یہ ہے کہ کسی ایک ضابطے کی پابندی نہ کی جائے۔ اگر ایسا کیا جائے تو نئی چیز کیونکر پیدا ہو؟ پھر دنیا نئی چیز ہے آسانی قبول نہیں کرتی، اس سے اک گونہ مایوسی پیدا ہوتی ہے، لیکن جن لوگوں کی فطرت میں اعلیٰ جوہر موجود ہوتے ہیں، وہ دنیا کے قبول و عدم قبول سے بے پروا ہو کر ضرور نئی چیزیں پیدا کرتے ہیں اور ان سے باز نہیں رہ سکتے۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جدت ایک درد ہے، جس سے کوئی عالی دماغ انسان باز نہیں رہ سکتا۔ یہ صورت بھی نکلتی ہے کہ نئی چیز پیدا کر کے اپنے آپ کو مایوسی کا تحفہ مشق بنانا ایک درد اور ایک دکھ ہے، لیکن جو

لوگ خاص جو ہرے کر آتے ہیں، وہ اس قسم کے درد پیدا کرنے میں متاثر نہیں ہوتے۔

۱۱۔ **شرح :** جیون یا صاحب جیون کے لیے اصل شغل یہ ہے کہ لباس تار تار کرے، گھر بار چھوڑے، اعزہ و احباب سے منہ موڑے اور صحرا میں نکل جائے۔ وہاں کوئی کام نہ ہو تو سر پیٹنے کے سوا کیا شغل باقی رہ سکتا ہے؟ تاہم سر پیٹنے کے لیے ہاتھ سلامت ہونے چاہئیں۔ یہ بتاؤ کہ جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو کوئی کیا کرے؟

ظاہر ہے کہ سر پیٹنا کوئی اچھا شغل نہیں، جس سے مفید نتیجہ برآمد ہو سکے، لیکن بچا رگی کا ایسا دور بھی آ سکتا ہے کہ عبت مشغلہ جاری رکھنے کی صورت ہی ناپید ہو جائے۔

۱۲۔ **شرح :** اسے اسدا شغل گوئی اور سخن وری کی شمعیں دلاویز روشنی پیدا کرنا بہت مشکل ہے۔ اس کے لیے طویل فرست درکار ہے، نیز لازم ہے کہ جو شخص ایسی روشنی کا خواہاں ہو، وہ پہلے گھٹلا ہوا دل پیدا کرے۔

ظاہر ہے کہ جب تک دل میں رقت نہ ہوگی، شمعیں سوز و گداز آہی نہیں سکتا۔ پھر یہی مدت تک ریاضت کے بغیر کام نہیں بنتا۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی	میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی	ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
چال جیسے کڑی کمان کا تیر	دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بات پرواں زبان کھتی ہے وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
 بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
 نہ سنا کرے کوئی نہ کہو گر بڑا کرے کوئی
 روک لو گر غلط چلے کوئی بخش دو گر خطا کرے کوئی
 کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند کس کی حاجت روا کرے کوئی
 کیا کیا خضر نے سکندر سے؟ اب کسے رہنا کرے کوئی
 جب توقع ہی اٹھ گئی غالب کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

۱۔ شرح : ابن مریم یعنی حضرت عیسیٰ ہیں تو ہوا کریں۔
 بلاشبہ ان کے اعجاز سے بیمار شفا پاتے تھے اور مردے زندہ ہوتے تھے
 لیکن میرے لیے تو اصل شے اپنا دکھ ہے، اس کی کوئی دوا تجویز کرو
 تو میں جانوں اور مالوں۔

۲۔ شرح : میں نے مانا کہ مقدمے کا فیصلہ شریعت اور قانون
 کے مطابق ہوگا، کیونکہ مدار و انحصار انھیں دو چیزوں پر ہے۔ اسلامی
 حکومت میں شریعت کی بنا پر فیصلہ کیا جائے گا اور غیر اسلامی حکومت میں
 قانون پیش نظر رہے گا، تاہم دونوں میں گواہ لیے جائیں گے۔ آلات قتل
 پیش ہوں گے۔ دیکھا جائے گا کہ مقتول کو کس کس آئے سے کتنی ضربیں
 لگیں، لیکن میرا قاتل تو کسی مادی ہتھیار سے کام ہی نہیں لیتا، بتاؤ اس
 سے کیونکر باز پرس کی جائے گی۔

۳۔ لغات۔ کڑی کمان : وہ کمان، جو سخت ہونے کے باعث

بہت زور لگا کر کھینچی جاتی ہے اور اس کا تیر ہنا بیت تیزی سے بہت دور پہنچ جاتا ہے۔

شرح : میرے محبوب کی چال ایسی ہے، جیسے کڑی کان کا تیر ہو۔ ایسے محبوب کے دل میں جگہ پیدا کرنا کارے دارو۔ اس میں کوئی کامیاب ہو تو دیکھنا چاہیے۔

۴۔ لغات : بات پر زبان کٹنا : بات منہ سے نکلتے ہی سامع کا غصے سے سر ہو جانا۔ اور غاموشی کے سوا چارہ نہ رہنا۔

شرح : وہاں یہ حالت ہے کہ بات بات پر غصے سے سر ہو جاتے ہیں۔ لب کھڑتے ہی جان نکلتی ہے۔ عاقبت اسی میں نظر آتی ہے کہ جو کچھ وہ کہیں، چپ چاپ سنتے جائیں، یہاں تک کہ گالیاں بھی دیں تو کچھ نہ بولیں۔

۵۔ شرح : کچھ نہیں کہہ سکتا کہ جنون کی حالت میں منہ سے کیا کچھ نکل رہا ہے؟ سلیقے کے ساتھ مناسب حال بات کہنا میرے لیے ممکن نہیں یہی دعا کر سکتا ہوں کہ خدا کرے، کوئی کچھ نہ سمجھے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ ”کچھ نہ سمجھنے“ میں دو پہلو نکلتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ غرض یہی ہے کوئی سمجھے اور لغات کرے، مگر اپنے گنہ پر آپ ہی تیشہ کی ہے اور غامبائی بھی معنی مقصود ہیں۔ دوسرے یہ کہ کوئی کچھ نہ سمجھے تاکہ راز فاش نہ ہو۔

۶۔ ۹۔ لغات : خضر و سکندر : مشہور ہے اگرچہ

کوئی مستند تاریخی واقعہ نہیں، کہ سکندر نے خضر کو آپ جیواں کے لیے رہنا بنایا تاکہ دونوں پانی پی لیں اور آپ جیواں کے متعلق عام روایت کے مطابق ہمیشہ کی زندگی پائیں، لیکن خضر نے خود تو آپ جیواں نوش کر لیا اور سکندر محروم رہ گیا۔ اسی

یہ خواجہ حافظ نے کہا ہے :

تمید ستائیں قسمت را چہ سودا ز رہبر کامل
کہ خضرؑ از آب حیات تشنه می آرد سکندر را

شرح : اگر کوئی بڑا کبھے تو اس پر کان دھرنے کی ضرورت نہیں۔

کان دھرو گئے تو دل کندر ہوگا اور جو اب دینے کی آزمائش میں مبتلا ہو جائے گا
اگر کسی سے کوئی برائی سرزد ہو تو اسے جتاؤ نہیں، جتانے سے اس کا دل
بڑا ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ضد میں آکر وہ اس بُرائی کے لیے اور جبری
ہو جائے۔

اگر کوئی شخص غلط راستے پر چلے تو اسے روک لو۔ اگر کسی شخص سے
غلطی ہو جائے تو معاف کر دو۔

مولانا طہطاہی چھٹے اور ساتویں شعر کے متعلق فرماتے ہیں کہ تشابہ ترکیب
سے بندش میں حسن پیدا ہوا ہے اور پہلے شعر میں کہنے کی تکرار بھی لطافت
سے خالی نہیں۔

کون ہے جسے کوئی نہ کوئی حاجت نہ ہو ؟ اگر تم کسی کے پاس کوئی
ضرورت لے جاؤ اور وہ پوری نہ ہو تو شکایت نہ کرو۔ یہ سمجھو کہ ضرورت مند
بہت زیادہ ہیں اور کوئی بھی شخص ان سب کی ضرورت پوری نہیں کر سکتا۔
سکندر نے خضرؑ کو رہنا بنایا تھا، مگر خیر کیا نکلا ؟ وہ خود آپ حیات پی
کر ہمیشہ کی زندگی پا گئے اور سکندر کو ایک گھونٹ بھی نہ پلا یا، چنانچہ وہ تیس
سال ہی کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ یہ مثال سب کے سامنے ہے اب
کوئی کسی کو کس بھروسے پر رہنا بتائے ؟

۱۰۔ شرح : اے غالب ! جب امید ہی باقی نہ رہی تو کسی کا گلہ
شکوہ کرنے سے کیا فائدہ ہے اور کیوں کیا جائے ؟ گلہ شکوہ ہمیشہ اس سے
کیا جاتا ہے جس سے کچھ امید ہو۔ جب بنیادی موجود نہ ہو تو عمارت بنانے

سے کیا مطلب ؟

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :

اس کی تعریف کیا کرے کوئی

ہدایت عالیٰ مضمون ہے ، جس کی تعریف نہیں ہو سکتی ۔ مطلب یہ ہے کہ جس شخص سے امید منتقل ہو گئی ہو ، پھر اس کا گلہ کیوں کریں ؟ قائدہ تو کچھ ہو گا نہیں ، اور لغزت و دشمن پیدا ہو گی ۔

بہت سہی غم گیتی ، شراب کم کیا ہے

۱۔ شرح :

غلام ساقی کوثر ہوں ، مجھ کو غم کیا ہے

زمانے کا غم کتنا ہی

تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے

زیادہ ہو ، میں پوچھتا ہوں ، کیا شراب

رقیب پر ہے اگر لطف تو رستم کیا ہے

کم ہے ؟ اگر غم

سخن میں خامہ غالب کی آتش افشان

نے ستایا تو شراب

یقین ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

پی کر اصفیں بیدانا

فکں ہو گا ۔ میں

ساقی کوثر کا غلام

ہوں ، دنیا میں جتنے بھی غم پیش آئے ، آفاک طرف سے مجھے شراب کوڑے لگ

اور سب غم دھل جائیں گے ، پھر میں غم کیوں کروں ؟

۲۔ شرح : اسے محبوب ! ہم تمہارا طور طریقہ خوب جانتے ہیں ۔ کہتے

ہو کہ مجھ پر ظلم نہیں ہوا ، لیکن کیا یہ صحیح نہیں کہ تم نے رقیب پر ہر باتیں شروع

کر دی ہیں ؟ پھر تاؤ ، ظلم کیا ہوتا ہے ؟

۳۔ شرح : غائب کے قلم سے شعر و سخن کے جو شعلے برستے ہیں ان کا توہیں بھی اعتراض ہے اور یقین کیسے بیٹھے ہیں ، لیکن سوال یہ ہے کہ اب اس بے مثال شاعر میں دم کہاں ہے ؟

باغ ، پا کر خفقانی : یہ ڈراتا ہے مجھے
سایہ شاخ گل افنی نظر آتا ہے مجھے
جو ہر تیغ بہ سر چپہ دیگر معلوم
ہوں میں وہ سبزہ کہ زہر آب اُگاتا ہے مجھے
مدعا محو تماشا ئے شکستِ دل ہے
آئندہ خانے میں کوئی یہ جاتا ہے مجھے
نالہ سرمایہ یک عالم و عالم کفِ خاک
آسماں بیضہ قمری نظر آتا ہے مجھے
زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے
دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے
بہت ہے ۔

شرح : باغ نے جب دیکھا کہ میں خفقان کے مرض میں مبتلا ہوں اور وہم و وسوسہ کی بن پر معمولی چیزیں بھی مجھے خوفناک نظر آتی ہیں تو ڈرانا شروع

۱۔ لغات :
خفقانی : خفقان
کامرغین : خفقان
ایک بیماری ہے ،
جس میں دل کی
دھڑکن تیز ہو جاتی
ہے ، بیدار پر گھبراہٹ
طاری رہتی ہے ۔
خواہ مخواہ اس کے
دل میں وحشت انگیز
توہمات پیدا ہوتے
ہیں ۔ معمولی چیزیں
بھی اس کی نظریں
خوفناک بن جاتی
ہیں اور وہ ڈرتا

کر دیا، یہاں تک کہ پھول کی شاخ کا سایہ بھی مجھے کالا زہریلا سانپ دکھائی دیتا ہے۔

بجنودی مرحوم اس شعر کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

- ہندوستان میں منلوں کے زمانے کے بہت سے باغ ویران اور غیر آباد پڑے ہیں۔ سنگ مرمر اور سنگ رخام کی بارہ دریاں شکستہ و اُتارہ ہیں۔ جہاں شہزادے اور بیگماتے رہتی تھیں، وہاں اب جہازات اور پریوں کا مسکن ہے۔ جن روشوں پر کافوری شمعیں روشن تھیں، وہاں اب جگنو اڑتے ہیں۔ نباتات نے دست انسانی کی قطع و بُرید سے آزادی پا کر ایک عجیب آوارگی اختیار کر لی ہے۔ پانی کے پاس درختوں کے سائے میں جو پوسے ہوتے ہیں، وہ اکثر طویل اور نازک تن ہوتے ہیں، جن کی شاخیں پتلی ہونے کے باعث پھول کے دُزن سے بھی جھک جاتی ہیں، اور ہوا کے ذرا سے جھونکے میں اُدھر سے اُدھر لہرانے لگتی ہیں۔ شام کے وقت ان شاخوں کا عکس سبزے پر بعینہ سانپ کی طرح نظر آتا ہے۔ اگر طبعیت پر مانیہ، وحشت اور ہول کا اثر ہو تو اس امنی سے ڈرنا کوئی عجب نہیں۔“

۲۔ لغات - زہر آب : زہریلا پانی۔

شرح : جس طرح تلوار کو زہر میں بچھانے سے اس کے جوہروں پر سبزی مائل رنگ آ جاتا ہے، اسی طرح میں وہ سبزہ ہوں، جسے زہر ہیرا پانی آگاتا ہے۔

۳۔ بشرح : میرا دل ٹوٹ گیا۔ ایک آئینے کے بے شمار ٹکڑے ہو گئے۔ اب میرے مقصد کا عکس ایک ایک ٹکڑے میں نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مجھے آئینہ خانے میں لیے بارہا ہے۔

۴۔ شرح : دنیا کا سرمایہ فزاید و فتاں ہے اور دنیا خاک کی ایک مٹٹی ہے۔ آسمان مجھے قمری کا انڈا نظر آتا ہے۔

آسمان کو قمری کا انڈا اس لیے کہا کہ قمری کا رنگ خاکستری ہوتا ہے۔ چونکہ دنیا مشیت خاک بن گئی، اس لیے آسمان اپنی ظاہری گولائی کے باعث قمری کا انڈا نظر آنے لگا۔

۵۔ شرح : جب میں جیتا تھا تو محبوب مجھے اپنی مٹل سے نکلا دیتا تھا۔ اب دیکھنا چاہیے کہ مرنے پر مجھے کون اٹھاتا ہے۔

”اٹھاتا ہے“ کے دو معنی ہیں، اول، مٹل سے اٹھانا، دوم جنازہ اٹھانا اسی اسباب سے مراد انے یہاں غائدہ اٹھایا ہے۔

۱۔ لغات۔ کو کہہ :
شاہی مجلس۔
شرح : راتے کی
خاک خوش نصیبی پر کیوں
نہ اترائے ؟ اس پر سے
تو بادشاہ کی سواری بہ
صورت مجلس گزری
ہے۔
۲۔ لغات : نمود :
روندی ہوئی ہے کو کبیرہ شہر یار کی
اترائے کیوں نہ خاک سیر رکھزار کی
جب اُسکے دیکھنے کے لیے آئیں بادشاہ
لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی
بھوکے نہیں ہیں سیر گلستاں کے ہم ولے
کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

نمائش، شہرت، ناموری۔

شرح : جب بادشاہ سلامت بہ نفس نفیس لالہ زار دیکھنے کے لیے آئیں تو وہ کیوں لوگوں میں نمود و نمائش پر آمادہ نہ ہو اور شہرت و ناموری حاصل

ذکر ہے۔

۳۔ شرح : ہم بارغ کی سیر کے بھوکے نہیں ، لیکن بہار کی ہوا ہے جس کی خوشگوار سی میں کلام کی گنجائش نہیں ، پھر کیوں دکھائیں ؟

ا۔ شرح

خواجہ حاکمی

فرماتے ہیں :

”خواہش پر

دم نکلنا مطلب

ہے اس کے

پورا ہونے

کے لیے جلدی

کرنا ، چنانچہ

کہتے ہیں ، کیوں

دم نکلا جاتا ہے

ہاکیوں سے

جاتے ہوا میں

جلدی کرتے ہو

پہلے مصرع میں

پر متعلقہ مقام

یہ الفاظ کہ

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل ؟ کیا رہے گا اس کی گون پر ؟

وہ خون جو چشم تر سے عمر بھریوں دم بدم نکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن

نہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا

اگر اس طرف پڑے چچ و خم کا پیچ و خم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے

ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی

پھر آ یا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
 وہ ہم سے بھی زیادہ خستہ تیغ ستم نکلے
 محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا
 اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کا مزہ دم نکلے
 ذرا کر زور سینے پر کہ تیر پر ستم نکلے
 جو وہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے
 خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ سے اٹھا ظالم
 کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کا فر صنم نکلے
 کہاں مے خانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
 پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے
 حال کے اعتبار سے یہی کہا جاسکتا ہے کہ کم نکلے، کیونکہ جتنے نکلے ان سے
 زیادہ پیدا ہوتے گئے۔

۲۔ شرح : میرا قاتل تلوار چلانے میں ڈر کیوں رہا ہے ؟ اگر میں
 قتل ہو گیا تو اس کی گردن پر کیا رہ جائے گا ؟ وہ خون جو میری آنکھوں سے
 لگا رہتا رہا۔

مقتول کا خون یقیناً قاتل کی گردن پر رہتا ہے۔ مرد ا قتل کے اس پہلو
 کو بے حقیقت ثابت کرنے کے لیے فرماتے ہیں کہ اے قاتل ! اگر میرا خون
 تیری گردن پر رہ گیا تو اس کی حقیقت کیا ہے ؟ عمر بھر تو یہ آنکھوں سے

”دل میں باقی
 ہیں“ مقتدر لکھنے
 چاہئیں :-
 دل میں سزا دل
 خواہشیں امیں
 باقی ہیں، جن
 میں سے ہر
 خواہش کو پورا
 کرنے کے لیے
 دم نکلا جا رہا
 ہے۔ میں نے
 مانا کہ میرے
 بہت سے
 ارمان نکل گئے،
 لیکن حقیقت

ہتار دے۔

۳۔ **تشریح :** خواجہ حالی مزیاتے ہیں :

”دوسرے مصرع میں ”بہت“ کے لفظ پر زور دینا چاہیے تاکہ آدم کی نسبت زیادہ بے آبروئی کے ساتھ نکلنا ثابت ہو۔“
اس شعر میں متعدد خوبیاں ہیں، مثلاً :

۱۔ کوچہ محبوب کو بالواسطہ خلد قرار دے دیا۔

۲۔ حضرت آدم کا بہشت سے نکالنا تا سب کو معلوم ہے، لیکن بے آبروئی کا پہلا اس شعر سے پیشتر ابھرا نہیں تھا۔

۳۔ شعر کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ حضرت آدم کا بہشت سے نکلنا بھی بے آبروئی کا باعث تو ضرور تھا، مگر وہ بے آبروئی ایسی نہ تھی، جیسی ہمیں پیش آئی، کیونکہ صاف معلوم ہوتا ہے، سرزاد کو نکلنے یا نکالے جانے میں جو حالت پیش آئی، اس کے سامنے حضرت آدم کی بے آبروئی بھی معمولی چیز رہ گئی۔

۴۔ **لغات :-** بھرم : اعتبار، ساکھ، عزت، راز۔

تشریح : اسے ستم گراؤ اپنے قد کی درازی پر بہت ناز کر رہا ہے لیکن اگر تیزی پر ہیچ و غم زلفت کے ہیچ و غم نکل جائیں تو ابھی درازئی قد کی ساکھ جاتی رہے اور اعتبار اٹھ جائے۔

مطلب یہ کہ قدر اسی وقت تک کشیدہ نظر آ رہا ہے، جب تک زلفت کے ہیچ و غم نہیں کھٹکے۔ اس سلسلے میں ایک خاص نکتہ قابل غور ہے۔ اگر زلفت کے ہیچ و غم قائم رہیں تو وہ زیادہ سے زیادہ کمر تک پہنچے گی۔ اور درازئی قد پر بہت موزوں نظر آئے گی، لیکن اگر زلفت کے تمام ہیچ و غم کھول دیے جائیں تو وہ کمر سے بھی بہت نیچے آ جائے گی اور قامت محبوب کی درازی اس میں گم ہو جائے گی۔ یہ نظارے کا معاملہ ہے، جس کا تجربہ ہر وقت کیا جاسکتا ہے۔

۵۔ **شرح :** مرزا کو معلوم ہے کہ جس بستی میں ان کا محبوب رہتا ہے اس کے اکثر باشندوں سے محبوب کا نام و پیام ہے۔ یہ حال دیکھ کر مرزا کو خیالی ہوا کہ دیکھنا چاہیے، مختلف لوگ اسے کیا کچھ لکھواتے ہیں چنانچہ مہترمی اور منشی گری کی خدمت بہ طور خود اپنے ذمے لے لی۔ اب طریقہ یہ اختیار کر لیا کہ صبح ہوتے ہی قلم کان پر رکھ کر نکل پڑے اور ہر ایک سے پوچھتے جاتے کہ جسے محبوب کو خط لکھوانا ہو، وہ ہم سے لکھوالے۔

جب تقسیم عام نہ تھی تو ہر بستی میں صرف چند آدمی ہوتے تھے جن سے لوگ خط لکھواتے تھے۔ اُن دنوں آج کل کی طرح انڈی پنڈٹ نہ تھے۔ منشی لوگ قلم بنا کر کان پر رکھ لیتے تھے، جو بندش و ستار کے باعث وہاں بالکل محفوظ رہتی تھی۔ جہاں کسی کو لکھوانے کی ضرورت پڑتی، بیٹھ جاتے اور قلم کان سے کیچنگ کر لکھ دیتے، پھر وہیں ٹھونس لیتے۔ اس میں فائدہ یہ تھا کہ قلم کی سیاہی سے کپڑے خراب نہیں ہوتے تھے۔

۶۔ **لغات ۔** بادہ آشامی : شراب نوشی۔

جامِ حجم : مشور ہے کہ شراب جمشید نے ایجاب کی تھی اس لیے شراب کا پیالہ اسی سے منسوب ہوا، اگرچہ بے معنی امتنان۔

شرح : موجودہ دور میں شراب نوشی کی نسبت مجھ سے کی گئی، گویا مدت و داز کے بعد پھر ایسا زمانہ آیا، جس میں جمشید کے پیالے کا ظہور ہوا۔ مرزا کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جو نسبت شراب کو جمشید سے تھی، وہی نسبت اسے آج مجھ سے ہے۔ زمانہ گزر گیا، لیکن ایسا دور کبھی نہ آیا، لہذا میں ہی ہوں، جس کی بدولت جامِ جمشید کا دور از سر نو تازہ ہو گا۔

۷۔ **شرح :** ہم جن لوگوں سے امید رکھتے تھے کہ وہ ہمارے دل کے زخم دیکھیں گے اور ان کے لیے مرہم کا انتظام کریں گے۔ جب ان کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ تو ہم سے بھی بڑھ کر تیج ستم کے زخمی ہیں۔

مطلب یہ کہ جو لوگ اپنے آپ کو روزگار کے چوکوں سے بچا نہ سکے اور زخم لگ چکنے کے بعد ان سے دواوا بن نہ آیا، ان سے ہمارے زخموں کی دوا کیونکر ملے گی؟

۸۔ شرح : عشق و محبت میں مرنا جینا ایک حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی کھلی ہوئی مثال یہ ہے کہ جس کا فر پر ہم مرتے ہیں، یعنی اس سے انتہائی محبت کرتے ہیں، اسی کا دیدار ہمارے لیے زندگی کا سامان ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اس مقام پر مرنے جینے میں کوئی فرق نہیں۔

۹۔ شرح : اے غائب ! کہاں شراب خانے کا دروازہ اور کہاں واعظ ؟ ان دونوں میں کیا مناسبت ہے ؟ کیا یہ امید ہو سکتی ہے کہ واعظ شراب خانے کے دروازے پر ملے گا ؟ ہمیں صوفیانا معلوم ہے کہ کل ہم نے کتنے توحصرت واعظ بھی اندر داخل ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بھیڑ بچھٹی دیکھی تو میدان خالی پا کر اندر چلے گئے۔ بیشک شراب ایسی ہی شے ہے، جسے کوئی چھوڑ نہیں سکتا۔ کھلم کھلا نہیں پیئے گا تو چھپ چھپا کر مزدور لوش کرے گا۔

۱۔ لغات :
 کوہ کے ہوں بار خاطر گر صدا ہو جائیے
 بے تکلف اسے شرابِ حبتہ کیا ہو جائیے
 بھڑک ہوئی
 بیضہ آسا تنگ بال و پر بنے یہ کنج قفس
 چنگاری۔
 شرح :
 از سر نو زندگی ہو، گر رہا ہو جائیے
 بھڑک ہوئی

چنگاری کو از خود زندگی کے عالم میں دیکھا تو اسی سے پوچھتے ہیں، اگر ہم آواز کی طرح ثابت سبک اور لطیف شے بن جائیں تو پہاڑ جیسا پر وقار وجود ہمیں بار خاطر سمجھ کر ٹوٹا دیتا ہے۔ پھر اسے بھڑکی ہوئی چنگاری! تو ہی بتا کہ ہم کیا بن جائیں؟

پہاڑ کے لیے آواز کا بار خاطر بننا اور ٹوٹنا دنیا مشاہدے کا معاملہ ہے۔ جب پہاڑ میں بلند آواز سے بولیں گے تو آواز ٹیلوں سے ٹکرا کر گونجتی ہوئی گم ہو جائے گی۔ اس سے مراد انے یہ مضمون نکالا کہ صدا جیسی ہلکی چیز بھی پہاڑ جیسے عظیم القدر وجود کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ وہ اسے دل کے لیے بوجھ سمجھتا ہے، اسی وجہ سے واپس کر دیتا ہے۔ اب حیران ہیں کہ کیا بن کر زندگی گزاریں!

۲۔ لغات - بیضہ آسا : انڈے کی طرح

شرح : پخیرے کا گوشہ انڈے کی طرح بال و پر گوارا نہیں کرتا، یعنی بال و پر کو باعثِ تنگ سمجھتا ہے۔ معلوم ہے کہ جو نچے انڈے سے نکلے ہیں، ان کے جس بال و پر نہیں ہوتے۔ اگر مجھے پخیرے سے رہائی مل جائے تو یقیناً نئے سرے سے زندگی پاؤں۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :

”مصنف نے ثابت کیا کہ طائر کی نئی زندگی بیضے سے نکلنے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کٹیج نفس سے مینی بیضہ فلک سے رہا ہونے کے بعد نئی زندگی عالم ارواح میں شروع ہوگی۔“

۱۔ شرح : مستی پر ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے
 ساقی کی اداۓ تغافل
 موجِ شراب یک مژدہ خوابِ ناک ہے
 نے مستی کو بھی چاک
 جز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو
 کر دکھتا ہے شراب
 جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے
 کی لہر پر نظر ڈالی
 جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد
 جابائے تو معلوم ہوتا
 صحرا ہماری آنکھ میں یک مُشتِ خاک ہے
 ہے کہ وہ ایسی پاک
 غلبہ ہے، یعنی اونگھ رہی ہے۔

۲۔ شرح : اب دل میں تیغِ ناز کا زخم کھانے کے سوا کوئی تتر نہیں
 حال یہ ہے کہ میرے خیال کا گریبان بھی تیرے ہاتھوں سے تار تار ہو گیا ہے۔
 ۳۔ شرح : اے اسد! جنوں نے ایسا جوش مارا کہ میں کچھ نظر
 نہیں آتا۔ گویا صحرا خاک کی ایک مٹھی تھی، جو ہماری آنکھ میں جھونک دی
 گئی۔ اس طرح بصیرت داخل ہو گئی۔

لغات : لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گوارہ جنبانی
 گوارہ جنبانی :
 قیامت کشتہ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگین ہے
 پگورا جاتا۔
 لعلِ بتاں : محبوبوں کے لب۔
 سنگین خواب : حد درجہ گہری نیند۔
 شرح : قاصد ہے کہ بچے کو ملانے کے لیے پگورا آہستہ

اہمستہلاتے رہتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ مڑوں کو زندہ کرتے تھے تو قم باذن اللہ کہتے تھے۔ اس طرح ان کے لب بٹتے تھے۔

فرماتے ہیں کہ جو لوگ محبوبوں کے لب کے مار سے ہونے ہیں، وہ ایسی گہری عیند سو گئے ہیں کہ حضرت عیسیٰ انہیں قم باذن اللہ کہتے ہیں تو اس جنبش لب سے ان کا پگورا بٹنے لگتا ہے، گویا سونے والوں کی عیند اور گہری ہو جاتی ہے۔

آدمی سیلاب طوفانِ صدامے آب ہے !
 نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی بادہ سے
 بزمِ مے و دشتِ کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا
 شیشے میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے
 کی صورت اختیار کر لی ہے۔ کیفیت یہ ہے کہ پاؤں کے نشان نے بھی
 پگ ڈنڈی کو انگلی سمجھ کر کان میں رکھ لیا ہے۔

کان میں انگلی رکھ ل جائے تو باہر کی آواز کم ہو جاتی ہے۔ پاؤں کا نشان
 کان سے مشابہ ہوتا ہے۔ اب مرزا صاحب کا کمال دیکھیے کہ سیل آرہا ہے۔
 اس کی آواز سے دشت و جبل گونج رہے ہیں۔ سب پر دھشت طاری ہے۔
 یہاں تک کہ نقشِ پا بھی اس سے فارغ نہیں۔ اسے اور کچھ نہ ملا تو پگ ڈنڈی
 کو انگلی سمجھ کر کان میں رکھ لیا۔

۲۔ شرح : کس محبوب کی مست آنکھوں نے شراب کی مجلس کو
 دھشت کا گھر بنا دیا اور مراجمی میں شراب کی لہر نبضِ پری بن کر چھپ گئی۔

اب اس شرکی مناسبتوں پر حذر فرمائیے، ہزیم ہے، ہشتم مست،
 شیشہ، موج بادہ، پھر وحشت کدہ، پری، شیشہ، کیونکہ پرہاں شیشہ
 ہی میں اتارتے ہیں۔ یعنی، پتہاں، موج بادہ۔

شرح : ہوں میں بھی تماشائی نیرنگ تما

میں بھی تما کی مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی برائے
 نیرنگی کا تماشائی

ہوں، یعنی دیکھ رہا ہوں کہ تما کیا کیا رنگ دکھاتی ہے۔ میرا مقصد ہرگز
 یہ نہیں کہ جو تما حاجی میں ہے، وہ ضرور پورا ہو جائے۔

شرح : سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کا غد پر

جس طرح کوئی مری قسمت میں یوں تصویر ہے شہائے جہراں کی
 چیز بکھتے وقت

کا غد پر سیاہی گر جاتی ہے، اُسی طرح میری تقدیر میں مزارق کی راتوں
 کی تصویر بن گئی۔

مطلب یہ کہ شہائے مزارق کا معاملہ تحریر سے کوئی تعلق نہیں رکھتا،

یعنی یہ نہیں لکھا کہ کتنی دیر تک اور کس کس طرح میں دکھ اٹھاؤں گا اور
 کڑیاں جھیلوں گا۔ ان کی جگہ سیاہی گرا دی اور اسی میں سب کچھ آگیا۔

ہجوم نالہ حیرت عاجزِ عرضِ یک افتاں ہے
 خموشی ریشہ صد نعمتاں سے خشن بدنداں ہے
 تکلف بر طرف ہے جاں ستاں تر، لطفِ بدخویاں
 نگاہِ بے حجابِ ناز تیغ تیزِ عسریاں ہے
 ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی
 کہ صبحِ عیدِ مجھ کو بدتر از چاکِ گریاں ہے
 دل و دیں نقدِ لاساقی سے گر سودا کیا چاہے
 کہ اس بازار میں ساغرِ متاعِ دست گرواں ہے
 غمِ آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
 چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

۱۔ لغات :
 حص بدنداں :
 پہلے مکہ چکے
 ہیں کہ جب وہ
 لشکروں میں سے
 کوئی ایک مغلوب
 ہو جاتا تو وہ
 اظہارِ عجز کے
 لیے تنگے دانتوں
 میں دبا لیتا اس
 سے سمجھا جاتا
 کہ رٹائی ختم
 کرنے اور شکست
 مان لینے کا
 اعلان ہو گیا۔

شرح : مزید وفتاں کا ہجوم ہے، لیکن حیرانی ایک آہ کرنے
 سے بھی عاجز ہے۔ حیرانی کا خاصہ خاموشی ہے، یعنی اس نے سیکڑوں
 نیتانوں کا ریشہ لگا س کے تنگے کی جگہ دانتوں میں دبا لیا ہے۔ ریشہ نیتاں
 اس لیے لائے کہ مزید وفتاں نے ہی کے ذریعے سے ہوتی ہے، گویا وہی
 مزید کی جڑ ہے۔ چونکہ نالوں کا ہجوم تھا، اس لیے جو ریشہ دانتوں میں دبا
 وہ ایک نیتاں کا نہیں، بلکہ سینکڑوں نیتانوں کا تھا۔

۲۔ لغات : جاں ستاں تر : جان لینے میں زیادہ تیز و مبیک۔
 بدخویاں : بری عموماً اسے، یعنی محبوب۔

شرح : پہلی بات یہ ہے کہ مجبوروں کی مہربانی ان کے تغافل سے بھی زیادہ جان لیوا ہے۔ جب وہ بے حجاب ہو کر ننگا و ناز ڈالتے ہیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ تلوار میدان سے نکل آئی اور چلنے لگی۔

۳۔ **شرح :** غم کی اتنی کثرت تھی کہ خوشی کی پوری کیفیت برابر ہو گئی، یہاں تک کہ عید کی صبح بھی میرے بے گریبان تار تار ہونے سے بدتر ہے۔

۴۔ **لغات :** دست گرداں : وہ چیز جو ایک ہاتھ سے قیمت دے کر دوسرے ہاتھ سے لی جائے، یعنی نقد کپکنے والی چیز۔

شرح : اگر تُو ساقی سے شراب کا سودا کرنا چاہتا ہے تو دل اور دین لے آ۔ انھیں حوالے کر دے اور شراب لے لے۔ دنیا کے بازار میں شراب کا پالہ ہی ایسی چیز ہے، جو نقد قیمت دے کر خریداجاتا ہے۔

مولانا طہطائی فرماتے ہیں : ”شاغر کو متاع دست گرداں کہنا ایسا سلطت رکھتا ہے کہ دل و دین نیلِ مصنف کرنا چاہیے۔“

۵۔ **لغات :** قلزمِ صرصر : آندھی کا سمندر۔

مرحبان : موزنگ۔ سرخ رنگ کی ایک جمادات نباتات، جو سمندر میں شاخ و دشاخ دُور و دُور تک پھیل جاتی ہے۔

شرح : غم عاشق کی پرورشِ بلا کی گود میں کرتا ہے۔ یعنی ہر طرف سے بلاؤں کے طوفان اٹھتے ہیں اور ان میں عاشق کی پرورش ہوتی ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھنی چاہیے کہ اگر آنکھیں سمندرِ مریض کر لیا جائے تو اس سمندر میں ہمارا روشن دیا مونگے کی حیثیت رکھتا ہے۔ کنہا یہ چاہتے ہیں کہ آندھی کا کتنا ہی زور ہو، وہ ہمارا چراغ بجھائیں سکتی۔ ہماری تو فطرت ہی یہ ہے کہ بلاؤں میں پرورش پاتے ہیں۔

۱۔ شرح :

خاموشیوں میں ایسی
ادائیں نکلتی ہیں، جو
دیکھنے سے تانی رکھتی
ہیں۔ تیری نگاہ دل
سے نکلتی ہے دوسرے
سے بھری ہوئی آتی
ہے۔

یہاں شاعر نے غامضی

اور دوسرے کی مناسبت پیش نظر رکھی۔ مشہور ہے کہ کوئی شخص سرمہ کھالے
تو اس کا گلہ بیٹھ جاتا ہے۔

۲۔ لغات - فشار : بھیچنا۔

شرح : صبا کبھی پھرتی پھراتی کل کے اندر جا پہنچتی ہے تو جگہ
کی تنگی سے بھیج کر ادس بن جاتی ہے۔ گو یا شبنم کوئی انگ شے نہیں یہی
صبا تھی، جو غیے کی تنگی میں پہنچی تو چاروں طرف سے بھیجی گئی اور اسے
پسینہ آگیا۔ انہیں قطروں کو ہم شبنم کہتے ہیں۔

۳۔ شرح : اُس تیغ نگاہ کی آب و تاب عاشق کے سینے سے کیا
پوچھتے ہو؟ یہ وہی تیغ ہے، جس نے دروازے کے دروزن میں زخم ڈال
ڈیے اور ان سے ہوا نکلنے لگی۔

مطلب یہ کہ محبوب جس دروازے سے جھانکتا ہے، اس میں دروزن
حقیقتہً زخم میں اور زخم بھی ایسے گہرے کہ ان سے ہوا آتی ہے۔ پھر خود
ہی اندازہ کریجیے کہ اس تیغ نگاہ نے سینہ عاشق سے کیا سلوک کیا ہوگا
بجوری مرحوم فرماتے ہیں :

”بھلا اطبا کے سوا کون اس بات سے واقف ہے کہ زخم
خواب ہو جانے کی علامت ہے، اس کے اندر ہوا نفوذ
کرنے لگے۔ جو زخم سانس دینے لگتا ہے، وہ مزور ملک ثابت
ہوتا ہے۔“

۱۔ شرح:

جس جگہ نیم کیو سے
محبوب میں کلھی کر
رہی ہے اور اس
کی بدستی و آراستگی
میں مصروف ہے،
وہاں محارے تانار
کے آہو کا داغ
ناز بن گیا ہے۔

ناخ اس بنجر
خون کو کہتے ہیں جو
آہوٹے غن کے
شکار کے بعد اس
کی ناف میں جم جاتا
ہے۔ عام دستور
یہ ہے کہ شکار کرتے
ہی بہرن کی ناف پکڑ

جس جا نیم شانہ کش زلفِ یار ہے
ناز دماغِ آہوٹے دشتِ تار ہے
کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو؟ لے خدا!
آئینہ مزش ششِ جہتِ انتظار ہے
ہے فذہ فذہ تنگی جا سے غبارِ شوق
گردام یہ ہے وسعتِ صحرِ اشکار ہے
دلِ دمی و دیدہ بنا دعا علیہ
نظارے کا مقدمہ پھر رو بکار ہے
چھڑکے ہے شبنم آئینہ برگ گل پر آب
لے عندلیبِ اوقت و دارج بہار ہے
تیج آپڑی ہے وعدہ دل دار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے یہ یاں انتظار ہے

بے پردہ سوئے دادی مجنوں گزرنہ کر
ہر قدم کے نقاب میں دلِ بیقرار ہے
اے عندلیب یک کفِ خس ہر آشیاں
طوقانِ آمد آمدِ فضل ہمار ہے
دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی
اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے
غفلت کفیل عمر و اسدِ ضامن نشاط
اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے
کہ اس کی نماند کے بجائے دماغ نادر بن گیا۔

کر اس پر ڈور باندھ
دیتے ہیں تاکہ غول
وہاں سے پھینکے نہ
پائے اور یک جا
ہو کر بیت ہو جائے
لیکن جب نسیم نے
زلفِ محبوب میں
شانہ کشی شروع
کی تو وہی خوشبو
لے کر آہوے
دشتِ تارکِ جہنم
پہنچ گئی۔ نتیجہ یہ نکلا

۲۔ شرح : حیرت کس کے جلوے کا کھوج لگا رہی ہے کہ
صورت یہ پیدا ہو گئی ہے، اگر انتظار کو ایک ایسا عالم فریق کریں جس کی
طرفیں عالمِ امکان کی طرح چھ ہوں یعنی پورب، پچیم، اُتار، اوکھن، اور پیچھے
تو اس کے فرش پر آئینہ ہی آئینہ بچھا ہوا ہے، گو یادہ فرش سراسر
آئینہ ہے۔

آئینہ ایک طرف حیرت کا منظر ہے اور دوسری طرف انتظار کا۔
مولانا بجنوری فرماتے ہیں کہ عالم کو دیکھنے ہی سے معلوم ہوتا ہے اسی
کسی چیز کی کمی ہے۔ سش حبت آراستہ ہوئے ہیں اور منظر میں۔
بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس طرح انسانیت کی تکمیل باقی ہے،
اس طرح عالم کی تکمیل کا بھی انتظار ہے۔ اس کی کیفیت لحظہ بہ لحظہ بدل رہی

ہے، جیسا کہ مرزا غالب کہتے ہیں :

دو ہر مشرہ برہم نژادن ایں خلق جہدیر است

نظارہ نگار کہ ہمان است، ہمان نیست

کلّ یوم ہونی شان بھی اسی کی شہادت دے رہا ہے۔

۳۔ شرح : میرے دل میں خاک اڑانے کا جو شوق دلولہ افرود

ہے، صحرا کی تنگی کے باعث پوری طرح ظاہر نہیں ہو سکا اور پتے پتے ذرّہ

ذرّہ ہو گیا ہے۔ اگر میرے شوق کی یہ کیفیت باقی رہی تو ظاہر ہے کہ صحرا

کی وسعت تو اس جال میں آ ہی جائے گی، لیکن میرے شوق کی تسکین کا سامان

کیا ہو گا ؟

ذرّہ ذرّہ جو جانے کو مرزا نے حلقہ ڈٹے دام سے تعبیر کیا۔

۴۔ لغات - روبکار : پیشی۔ مرزا پہلے بھی لکھ چکے ہیں :

دل و دیدہ کا جو مقدمہ تھا

آج پھر اس کی روبکاری ہے

شرح : دل قلمی بن گیا اور آنکھوں کو مدعا علیہ بنا دیا، یعنی دل

نے آنکھوں کے خلاف جو دعوے دائر کر رکھا تھا، اس کی بنا پر نظارے کا

مقدمہ بن۔ اس مقدمے کی آج پھر پیشی ہے۔

۵۔ لغات - آئینے پر پانی چھڑکنا : ایران میں ایک رسم

ہے کہ جب مسافر سفر پر روانہ ہوتا ہے تو اس کی یہ خیر و سلامت واپسی کے

لیے آئینے پر پانی چھڑکتے ہیں۔

شرح : پھول کی پکھڑی کے آئینے پر شبنم پانی چھڑک دیا ہے

اسے بیل ! یہ کیفیت دیکھ اندر سمجھ لے کہ بہار کے رخصت ہونے کا وقت

آ گیا۔

بہار کی رخصت اور خزاں کی آمد عموماً اس وقت شروع ہوتی ہے جب

قد ارمم میں خشکی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اسی وقت شعبہ زیادہ مقدار میں گرنے لگتی ہے۔ ممکن ہے، پہلے مفرغ کے معنوں میں مرزا کے پیش نظر یہ کیفیت بھی ہے۔

۶۔ لغات - بیچ آپڑنا - اپنی بات نبا ہنا اور اس کا پاس کرنا۔

شرح : میرے لیے تو یہ مجبوری پیش آ گئی ہے کہ محبوب نے آنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ میں تو بہر حال اس وعدے کا پاس کروں گا۔ وہ اسے پورا کرے نہ کرے، آنے یا نہ آنے، مجھے تو انتظار کے سوا چارہ نہیں۔ اگر میں اس کی عام بد عادی کے پیش نظر انتظار نہ کروں، اب دھرا دھر ہو جاؤں اور وہ واقعی آ جائے تو مجھ پر یہی الزام عائد کرے گا کہ وعدے کے مطابق نہ انتظار نہ کیا۔ غرض میں انتظار کے لیے مجبور ہوں۔

۷۔ شرح : جس وادی میں مجنوں رہتا تھا، اس کے ہر فردے کے ہارے میں ایک بیتاب و بیقرار دل موجود ہے، لہذا اسے محبوب اداں تجھے بے پردہ نہ جانا چاہیے، ورنہ تمام دل تڑپ اٹھیں گے اور وادی میں قیامت کا منظر رونما ہو جائے گا۔

مولانا طبا طبائی فرماتے ہیں :

” فردے کے جگہ گاتے کو دل کے تھلانے سے تشبیہ تام ہے، غرض یہ ہے کہ وادی مجنوں میں جو فردہ ہے، بیتابی مجنوں کا آئینہ دار ہے۔“

۸۔ شرح : اے بھلی ! کہیں سے گھاس کے تنکوں کی ایک مٹھی جمع کر لے تا کہ آشیانہ بنا لے، ورنہ فصل بہار طوفان کی شکل میں چلی آ رہی ہے۔ تمام سوکھے خشکے برے ہو جائیں گے۔ ہر جگہ بھولی کھل جائیگی اور تجھے تیل تک ڈھونڈنے سے نہ مل سکے گی۔

۹۔ لغات - خبر : یہاں آ گئی اور معرفت کے لیے آیا ہے۔

سیر : اس سے مراد گردش و تفریح بھی مراد ہو سکتی ہے اور وہ سیر بھی سمجھی جا سکتی ہے ، جو اہل سلوک کو روحانی منزلوں میں پیش آتی ہے۔

تمثال دار : تصویروں کا مرتبہ۔

شرح : اسے عقل و شعور سے کام نہ لینے والے ! دل ضائع نہ کر۔ اگر اس کے ذہنیے سے تجھے معرفت کا نور حاصل نہیں ہو سکتا تو مضائقہ نہیں ، اس مرتبہ میں ایسی تصویریں تو موجود ہیں جو تیرے لیے سیر و تفریح کا باعث ہو سکتی ہیں۔

مولانا طہطائی فرماتے ہیں :

”جس دل میں دنیا بھر کی حسرتیں اور آرزوئیں بھری ہوں وہ

آئینہ تصویر ہے اگرچہ اس میں ایسی صفائی نہیں کہ جلوۂ معرفت

حاصل ہو سکے ، لیکن سیر کیا کم ہے ؟“

گویا مولانا طہطائی کے نزدیک تمثال دار آئینے سے مقصود ایسا

دل ہے ، جس میں دنیا کی حسرتیں اور آرزوئیں بھری ہوں اور ہر ایک کا عکس اس میں صاف نظر آئے۔

ان معنی کے پیش نظر بھی یہ خیال ہوتا ہے کہ مرزا دل کو ایک

قیمتی چیز سمجھتے ہیں اور اس کے دو پہلو ہیں ، ایک صوری ، دوسرا معنوی

فرماتے ہیں کہ اگر معنویت اور حقیقت تک پہنچنا ممکن نہیں تو اس کا ظاہر

بھی خالی از منفعہ نہیں سمجھا جا سکتا۔

۱۰۔ لغات - کفیل : کفالت کرنے والا ، ذمہ اٹھانے والا۔

منا من : منافات دینے والا۔

شرح : غفلت اور بے خبری نے یہ ذمہ اٹھایا کہ عمر کا دور کبھی

ختم نہ ہو گا۔ آندیش و نشاط کا منا من بن گیا۔ گویا اس نے یہ مسئلہ

انتخاب کر لیا کہ کھاؤ پیو اور مزے اڑاؤ، کیونکہ زندگی کا حاصل یہی ہے جب کیفیت یہ ہے تو اسے اپنا تک آنے والی موت ! تو کس انتظار میں ہے ؟

مطلب یہ ہے، انتظار کی بڑی سے بڑی وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ غفلت ختم ہو جائے گی اور اسد جان لے گا کہ مرنا لازم ہے، لہذا عمل کی کچھ متاع آئندہ زندگی کے لیے بھی جمع کر لینا چاہیے۔ اسد سے یہ امید ہو سکتی تھی کہ وہ اندازہ کر لے گا، عیش و نشاط ہمیشہ کے لیے نہیں ہو سکتے۔ ایسے اسباب جمع ہی کر لینا غیر ممکن ہے، جو دوائی عشرت و نشاط کے عناصر بن سکیں۔ جب اس حالت میں کوئی فرق نہیں آ سکتا تو نتیجہ سوا اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ اپنا تک موت آئے اور عمر کے ساتھ، عیش و نشاط کا بھی خاتمہ ہو جائے۔

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
حسرت نے لار کھا تری بزم خیال میں
گلدستہ نگاہ سودا کہیں جسے
پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسوس انتظار تماشا کہیں جسے
۱۔ شرح :
اے محبوب ! میں
ایسا حسین کہاں سے
لاؤں، کہ تو بھی قائل
ہو جائے، واقعی یہ
عجب ایسا ہے۔ دے
زمین پر تو ایسا
حسین ملا نہیں۔ اب
میرے لیے اس
کے سوا چارہ نہیں،

تیرے ہاتھ میں آئے
وہے دوں تاکہ تو
اپنے جیسے کا عکس
دیکھ کر حیران رہ
جائے اور یہ حیرانی
دیکھتے والوں کے
لیے ایک تماشا بن
جائے۔
شعرے مقصود
صرف یہ ظاہر کرنا
ہے کہ محبوب کا
ثانی ہے ہی نہیں
ہے تو صرف اسی کا عکس ہے، جو آئینے میں نظر آئے۔

۲۔ محبوب کی بزم خیال سے مراد عاشق کا دل ہے، کیونکہ محبوب ہمیشہ اس میں جلوہ گر رہتا ہے۔

شرح: حسرت نے تری بزم خیال میں نگاہوں کا ایک گلدستہ فراہم کر رکھا ہے۔ اسی گلدستے کو لوگ سویدہ سمجھتے ہیں، یعنی وہ داغ جو دل پر نقش ہوتا ہے۔

سویدہ اکو گلدستہ نگاہ اس لیے کہا کہ اس میں اک گوشت سیاہی ہوتی ہے اور سیاہی شادمانی سے محرومی کی دلیل ہے، یعنی نگاہیں محبوب کی زیارت سے شرف حاصل کرنے کے لیے پیدا ہوتی رہیں، مگر زیارت نہ ہو سکی اور وہ حسرت بنتی گئیں۔ اس طرح حسرت زدہ نگاہوں کا ایک مجموعہ تیار ہو گیا چونکہ اسے بزم میں رکھنا مقصود تھا اور بزم میں گلدستہ رکھنا

جاتا ہے، لہذا انگاہوں کے مجموعے کو گلدستہ قرار دے دیا۔

۳۔ شرح : اسے خدا محبت کے کان میں انتظار کا وہ منتر کس نے پھونک رکھا ہے، جسے تمنا کہا جاتا ہے ؟

تمنا کو انصوب انتظار کہنا ایک ایسا ادبی معجزہ ہے، جو صرف مرزا غالب سے ممکن تھا۔ تمنا کا مطلب ہی یہ ہے کہ انسان آرزو پوری ہونے کے انتظار میں الجھا رہے، لہذا اسے انصوب انتظار کہا، یعنی ایسا منتر، جو انسان کو انتظار پر مہر تن آمادہ کر دیتا ہے اور اس منتر کا اثر اس وقت تک باقی رہتا ہے، جب تک تمنا پوری نہ ہو جائے۔

حقیقی محبت وہ ہے، جو ہر تمنا اور ہر آرزو سے پاک ہو۔ مرزا فرحت علی ہیں کہ محبت کے کان میں تمنا کا منتر کس نے پھونکا؟ جب تمنا آئی، اپنی عزت آئی، حقیقی محبت تاپید ہو گئی۔

۴۔ شرح : غریب الوطنی کے درد نے اس درجو پریشان کر رکھا ہے کہ صحرا کو، جو بہر حال ایک مشت خاک ہے، سر پر ڈال لوں تاکہ نہ صحرا باقی رہے، نہ غریب الوطنی، دونوں دکھ ختم ہو جائیں۔

۵۔ لغات۔ عنان گسیختہ : بگ ٹٹ۔ سرپٹ، بے قابو۔

شرح : محبوب کے دیدار کی حسرت دل میں موجود ہے۔ آنکھوں سے آنسو بہ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہے کہ ان آنکھوں میں شوق کا ایک بگ ٹٹ اور بے قابو طوفان اُٹھ اُٹھ آیا ہے، جسے سمندر کہنا چاہیے۔

مولانا طالعباتی فرماتے ہیں : ”عنان گسیختہ“ اس شعر میں لفظ نہیں، احساس جڑ دیا ہے۔ جب دوسری زبان پر ایسی قدرت ہو، جب کہیں اپنی زبان میں اس کے الفاظ لانا حسن رکھتا ہے اور شوقِ عنان گسیختہ سے مجازاً جوش انگ مفعول ہے، کیونکہ یہاں مستب کے محل پر سبب کو مجازاً استعمال کیا ہے۔

۶۔ شرح : عیش کے پھول کھیلنے پر آمادہ ہیں اور عام پھولوں کی طرح

ان کے کھلنے کے لیے بھی ایک صبح دو کار ہے۔ وہ کیا ہو سکتی ہے ہر صبح بہار جسے شراب کی مراچی کی ڈاٹ کنا چاہئے۔

مطلب یہ کہ عام پھول موسم بہار میں صبح کے وقت کھلتے ہیں، لیکن بیش و نشاط کے پھول کھلنے کے لیے وہ صبح بہار دو کار ہے جسے شراب کی مراچی کہتے ہیں۔ شراب کی مراچی کو بند رکھنے کے لیے گزشتہ زمانے میں روٹی استعمال کرتے تھے۔ روٹی کو ہر لحاظ سفیدی صبح سے تشبیہ دی اور صبح بہار اس لیے لائے کہ شراب پینے کا اصل مزہ موسم بہار ہی میں ہے۔ بہار باغ و رانغ میں پھول کھلائے گی، شراب عیش و نشاط کی کلیوں کو پھول بنائے گی۔

۷۔ شرح : اسے غالب ! اگر واعظ تیری برائی کرتا ہے تو اس پر بُرائی مان۔ دنیا میں کون ہے جسے سب اچھا کہیں؟ اگر تیری زندگی و شراب نشینی کو واعظ نے بُرائی کی دستاویز بنایا ہے تو صرف اس حقیقت پر نظر رکھ کہ دنیا بھر نے آج تک کسی کو کیاں اچھا نہیں سمجھا۔

لوگ کسی کی طرف سے اختلاف رائے کا معمولی اظہار سن کر گڑبٹھٹے ہیں اور رو وکد کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اگر اُس حقیقت پر یقین کر لیا جائے جو مرزا غالب نے اس شعر میں پیش کر دی ہے تو کشمکش کا خاصا بڑا سلسلہ ختم ہو جائے۔ ہے تو یہ بالکل معمولی چیز اور سچائی ہمیشہ معمولی اور پیش پا افتادہ چیز ہوتی ہے، یعنی کوئی ایسا آدمی نکالے جسے ساری دنیا نے اچھا سمجھا ہو۔ جب حقیقت یہ ہے تو ایک دو پانچ دس یا بیس تیس افراد کے بُرا کہنے کو کیوں بُرا مانا جائے؟

شبنم بہ گلی لالہ نہ خالی ز ادا ہے
 داغِ دل بے دردِ نظر گاہِ حیا ہے
 دلِ خوں شدہ کشمکشِ حسرتِ دیدار
 آئینہ بہ دستِ بتِ بدستِ خفا ہے
 شعلے سے نہ ہوتی، ہوسِ شعلہ نے جو کی
 جی کس قدرِ امردِ گئی دل پہ جلا ہے
 تماشِ میں تیری ہے وہ شوخی کہ لبِ ذوق
 آئینہ بہ اندازِ گلِ آغوشِ کشا ہے
 قمری کفِ خاکستر و بلبِ قفسِ رنگ
 لے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے
 ٹوٹنے تری امردہ کیا وحشتِ دل کو
 معشوقِ دے جو مسکی طرفہ بلا ہے
 مجھوری و دعوائے گرفتارِ بنی العنت
 دستِ تہِ سنگِ آبدہ پیمانِ وفا ہے
 معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ
 تیغِ ستم آئینہ تصویرِ نما ہے

۱۔ لغات :
 نظر گاہ : وہ مقام
 جس پر نظر پڑے ۔
 اس سے قابلِ احترام
 مقام بھی مراد ہے ۔
 شرح : لے کے
 چکھڑیوں پر اوس کے
 قطرے پڑے ہوئے
 ہیں اور ان کا دل ہونا
 خالی از عفت نہیں ۔
 یہ ایک خاص مطلب
 ادا کر رہے ہیں ۔ ان
 کے ذریعے سے ایک
 خاص مقصد پورا ہو
 رہا ہے ۔ مقصد یہ ہے
 کہ جس دل میں داغ ہو
 اودہ درد ہو اس پر
 شرم دیا کی نظر پڑتی
 ہے ، یعنی وہ باعثِ
 شرم ہے ۔
 لے میں داغ
 ہوتا ہے ، مگر سوز نہیں
 ہوتا ، یعنی وہ عاشقوں

میں تو شامل ہو گیا ،
 لیکن دردِ عشق سے
 غالی رہا ۔ یہ جو اس
 پر شبنم نظر آتی ہے
 حقیقت میں شبنم نہیں
 بلکہ بے سوز دماغ کی
 بنا پر عرقِ بشرم کے
 قطرے ہیں ۔ گویا وہ
 اپنی دردناک آشنائی پر
 شرمساری کا اظہار کر رہا ہے ۔

۲۔ **شرح :** ایک طرف میرا دل ہے ، جو حسرت و دیدار کی کینچن تان
 میں سراپا خون ہو گیا ۔ دوسری طرف وہ محبوب ہے ، جس نے منہدی لگا کر آئینہ
 ہاتھ میں لے لیا اور بد مستیاں کرنے لگا ۔ یعنی میں تو اپنی آرزوؤں کا خون کیے بیٹھا
 ہوں ، وہ منہدی لگا کر آئینہ ہاتھ میں لیے عشوہ و انداز دکھا رہا ہے ۔
 اب اس شعر کی بنیاد پر غزل فرمایا یہ ، دل ، آئینہ ، خون شدہ ، بدست ،
 کشکش حسرت و دیدار ، آئینہ بدست ۔

۳۔ **لغات :** شعلہ : یہاں اس سے مراد ہے ، سوزِ عشق ۔
 جُوس شعلہ : تھائے سوز ۔

شرح : تھائے سوز نے جو کام انجام دیا ، وہ غالباً سوزِ عشق بھی
 انجام دے سکتا ۔ مجھے برابر یہی آرزو رہی کہ جل مروں ، لیکن دل کی اندر دگی
 اس حد پر پہنچی ہوئی تھی کہ میری آرزو کا ساتھ نہ دے سکی ۔ اس حالت کی ناگہانی
 نے مجھے اتنا غصہ دلایا کہ اس پر جلتا رہا اور یہ جلن یہاں تک پہنچ گئی کہ خود بھی
 ختم ہو گیا ۔

۴۔ شرح : تیری تصویر میں وہ شوخی ہے کہ جب کونے اس پر شیشہ لگانا چاہتا تو اس شیشے نے انتہائی ذوق و شوق سے پہول کی طرح آغوش کھول دی کہ آجا۔

اگر مثال سے عکس مراد لیں اور آئینے سے آئینہ دیدنی تو معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کہا جانے لگا کہ تیرے عکس کے لیے آئینہ پہول کی طرح برص ذوق آغوش کھول دیتا ہے۔

۵۔ شرح : خراج محال فرماتے ہیں :

”میں نے خود اس کے معنی مرزا سے پوچھتے تھے۔ فرمایا اے کی جگہ جز پڑھو، معنی خود بخود سمجھ میں آجائیں گے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ قری جو ایک کٹ خاکستر سے زیادہ اور میل جو ایک قفسِ مرغی سے زیادہ نہیں، ان کے جگر سوختہ یعنی عاشق ہونے کا ثبوت صرف ان کے چمکنے اور بولنے سے ہوتا ہے۔“

”یہاں جن معنی میں مرزا نے ”اے“ کا لفظ استعمال کیا ہے ظاہر ہے، یہ انھیں کا اختراع ہے۔ ایک شخص نے یہ معنی سن کر کہا کہ اگر وہ ”اے“ کی جگہ ”جو“ رکھ دیتے یا دوسرا مصرع اس طرح کہتے:

اے نالہ انشاں تیرے سوا عشق کا کیا ہے

اس شخص کا یہ کٹ بالکل صحیح ہے، مگر مرزا معمولی اسلوب سے متاثر ہو مقذور سمجھتے تھے اور شارح عام پر نہیں چلتا چاہتے تھے۔“

علامہ اقبال نے بھی نکلک مشتری میں مرزا غالب سے ملاقات کی تھی اور دوسرے امور کے علاوہ اس شعر کے معنی بھی مرزا سے پوچھے تھے کہا حقیقت میں یہ حضرت علامہ اقبال کی تشریح ہے، جسے غالب کی زبان سے پیش کیا گیا یہاں اقبال کے شعروں کا ترجمہ دیا جا رہا ہے، جسے اصل دیکھنا ہو وہ ”عبادین نامہ“ صفحہ ۱۲۵ دیکھ لے)

”جو نالہ سوڑ جگر سے اٹھتا ہے، میں نے اس کی تاثیر ہر جگہ جدا جدا دیکھی۔ مرنے والے اس نالے کے اثر سے جل کر خاکستر بن گئی۔ بلی نے اس سے رنگ جمع کر لیے۔ اس کے اندر زندگی کی آغوش میں ایک موت ہے۔ یہاں ایک نفس زندگی ہے اور وہاں موت۔ ایسا رنگ کہ ارڈنگی (رنگوں کی گونا گونی) اسی سے ہے۔ ایسا رنگ کہ بے رنگی اسی سے ہے۔ تو نہیں جانتا۔ یہ رنگ دلو کا مقام ہے اور ہر دل کو اس کی یاد ہونے کے مطابق حقدار ہے۔ یا تو رنگ اختیار کرے یا بے رنگی کو مسلک بنائے تاکہ تو سوڑ جگر سے ایک نشان پائے۔“

۶۔ **مشرح :** اسے محبوب اتیری عادت نے دل کا سارا جوش دھڑکا افسردہ کر ڈالا۔ تو حسین ہے، محبوب ہے، لیکن کتنے تعجب کا مقام ہے کہ طبیعت مدد دے ٹھنڈی پائی ہے۔ نہ ناز، نہ انداز، نہ غمزہ، نہ عشوہ، نہ پھیٹ چھاڑ، نہ جورو ستم، مگر محبت کا ہر معاملہ ختم کر دیا۔ اب تو ہی بنا کلاس عادت میں میرا جوش و خروش کیونکر باقی رہ سکتا تھا؟ آرزوؤں کے سب چراغ گل ہو گئے۔ محبت کے عام دلوے ٹھنڈے پڑ گئے۔ میرے لیے کتنی بڑی معیبت ہے۔

۷۔ **لغات :** دستِ تر رنگ آمدہ : بھاری پتھر کے چنبچے آیا ہوا اٹھ۔

مشرح : ہم محبت کے پھنپھے میں گرفتار ہیں اور مجبوری سے وفا کا پران نباہتے چلے جا رہے ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ہمارا اٹھ ایک بھاری پتھر کے نیچے آگیا ہے۔ کہیں نہیں تو سخت نہیں پا سکتے پتھر کو اٹھانا چاہیں تو اٹھا نہیں سکتے۔ ہر حال اس پران کو آخر تک پہنچائیں گے۔

۸۔ **مشرح :** محبوب کی تیج ستم ایک ایسا آئینہ ہے، جس میں ماضی کی

تصویریں نظر آتی ہیں۔ گویا اس کی حیثیت سینا کے پردے کی ہے، چنانچہ پہلے شہیدوں پر جو کچھ گزری، وہ سب اس میں صاف نظر آ رہی ہے۔

۹۔ شرح : اسے زمانے کو روشن کرنے والے آفتاب کے جلوے! اور بھی توجہ فرما۔ ہم پر سائے کی طرح عجب وقت آپڑا ہے۔

لطف یہ کہ وقت سائے کی طرح آپڑا ہے اور غور شدہ جہانِ تاب کے جلوے سے لطف و رحم کے غلبہ گار ہیں، جس کے بغیر علیہ دور نہیں ہو سکتا۔ مولانا طباطبائی فرماتے ہیں : ”وقت پڑنے کا محاورہ جس محل پر مصنف نے صرف کیا ہے، اس کی خوبی بیان نہیں ہو سکتی“

۱۰۔ لغات - ناگروہ گناہ : جو گناہ ابھی نہیں کیے۔
کروہ گناہ : جو گناہ کیے جا چکے۔

شرح : اس شعر کی مفصل شرح :

مجھ سے مرے گناہ کا حساب آ خدا نہ مانگ

میں بڑھ چکی ہے۔ مختصر یہ کہ اسے خدا! اگر کیے ہوئے گن ہوں کی سزا لازم ہے تو جو گناہ نہ ہو سکے اور حسرت دل میں رہ گئی، ان کا صلہ بھی تو ملنا چاہیے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں : ”اس شعر کی داد کون دے سکتا ہے؟ میر تقی کو بھی حسرت ہوتی ہوگی کہ یہ مضمون مرزا انوشہ کے لیے لکھا رہا۔“

۱۱۔ شرح : اسے غائب! اگر خلقِ خدا نے تجھ سے مُتہ موڑ لیا ہے اور اتنا تعلق توڑ لیا ہے کہ بیگانہ سی بن گئی ہے تو اس پر حوصلہ دار نہ اور بیدل ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ میری جان! اگر مخلوق میں سے کوئی تیرا نہیں بنا تو تیرا خدا تو سر پر موجود ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی کی کیا ضرورت ہے؟
فارسی میں بھی ایک مقام پر فرمایا ہے :

جہانیاں نہ تو برگشتہ اندر غالب

ترا چو بک خدا سے کہ داشتی داری

۱۔ شرح :

تجلی کو یہ منظور تھا کہ ایک نورانی شکل وجود میں آجائے۔

اسے رسول اللہ ﷺ کی ذات پاک، آپ کے مبارک چہرے اور مبارک قامت سے ظہور کی قسمت کھل گئی۔ اگر آپ کا وجود مقدس ظہور میں نہ آتا تو تجلی جس نورانی شکل کی آواز مند تھی، وہ دنیا کے سامنے نہ آتی۔

۲۔ شرح :

تیرے شہیدوں کے پاس ایک کفن کے سوا کچھ نہ تھا، جس میں سے لہو نیک رہا ہے۔ یہاں ہم اس کفن میں ایسا

منظور تھی یہ شکل، تجلی کو نور کی !
 قسمت کھلی تیرے قد و رخ سے ظہور کی
 اک خوشچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
 پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پر خور کی
 واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
 کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی
 لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا
 گویا ابھی سنی نہیں آواز صُور کی
 آمد بہار کی بے جو بلبل ہے فتنہ سنج
 اڑتی سی اک خبر ہے نہ بانی طہور کی
 گواہاں نہیں پرواہاں کے نکالے ہوئے تو ہیں
 کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی
 کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک ساجواب
 آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طہور کی
 گرمی سہی کلام میں، لیکن نہ اس قدر
 کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

غالب اگر سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی
محبت سے دیکھ رہی ہیں۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں: ”یہ شعر بھی ایسا کہا کہ کروڑوں میں ایک آدمہ
ایسا نکلتا ہے۔“

۳۔ شرح: اے واعظ! تمہاری شرابِ طور کی کیا بات ہے! نہ
اے خود پی سکتے ہو، نہ کسی کو پلا سکتے ہو۔ ہماری شراب میں یہ خوبی تو ہے نا
کہ خود بھی پیتے ہیں اور دوسروں کو بھی پلا سکتے ہیں۔

”کیا بات ہے!“ عظمت و خمیں کے لیے آتا ہے، لیکن مرزا غالب نے
اسے ایسے طریقے پر استعمال کیا ہے، جس سے استہزاء بالکل واضح ہے۔۔۔
مولانا طباطبائی فرماتے ہیں: ”ایک شخص سے خطاب کر کے فوراً جمع کی
طرب لغت ہو جاتا نئی صورت التفات کی ہے اور نہایت لطف دیتا ہے۔“

۴۔ لغات۔ صوّر: فرسگا، جو قیامت کے دن پھونکا جائے گا
اور اس سے مردے جی اٹھیں گے۔

شرح: میرا محبوب حشر میں مجھ سے لڑا رہا ہے کہ تو کیوں جی اٹھا ہولم
ہوتا ہے کہ بے نیازی، بے پروائی اور تغافل کے باعث صوبہ اسرافیل کی
آواز اس کے کان تک پہنچی ہی نہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کے گھٹے کو مرنے
اس کی آواز پر اٹھنا چاہیئے۔

۵۔ لغات۔ طیور: طائر کی جمع، پرندے، یہاں مراد ہے میل۔

شرح: بلبلوں نے لٹے لٹے گانے شروع کر دیے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے
کہ بہار آ رہی ہے، ابھی آئی نہیں۔ ہم بھی کوئی یقینی اطلاع نہیں دے سکتے!
البتہ پرندوں یعنی بلبلوں کی زبان ایک اڑتی سی خبر سن کر پیش کر دی۔

مولانا طہطاہانی کے نزدیک تشبیہ نہایت بدیع ہے اور انصاف یہ ہے کہ نئی ہے۔

۶۔ پہلے مصرع میں دونوں جگہ "ہاں" سے مراد کہہ ہے۔

شرح : اگرچہ ثبوت اب کہے میں نہیں، لیکن اس سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ کہیں وہاں تھے اور نکالے گئے۔ گویا انھیں کہے سے ایک نسبت مزور پیدا ہو گئی، اگرچہ وہ مدور کی ہے۔

معلوم ہے کہ قریش نے دین حق سے گمراہی اختیار کی تو روضہ روضہ بت پرست شروع کر دی تھی، بلکہ بہت سے ثبوت کہے کے اندر لے گئے، جن کی تعداد فتح مکہ کے وقت تین سو ساٹھ تک پہنچی ہوئی تھی۔ مرزا غالب نے کہے سے جنوں کی نسبت کے متعلق جو استدلال کیا ہے، ظاہر ہے کہ وہ منطقی نہیں، شاعر ہے اور اسے منطق کی ترانہ میں ڈھونڈنا چاہیے، البتہ شاعرانہ نقطہ نگاہ سے جو نسبت پیدا کی، وہ ہر شخص کے دل کو پسند آتی ہے۔

۷۔ شرح : بلاشبہ حضرت موسیٰ نے رب ارنی (اے پروردگار تو مجھے اپنا جمال دکھا) کہا، جواب ملا، "ن ترانی" (تو مجھے قطعاً نہ دیکھ سکے گا) مرزا فرحت پتے ہیں، کیا یہ لازم ہے کہ سب کو ایک سا جواب ملے۔ اگر حضرت موسیٰ کو جلوہ نہ دکھایا گیا تو مسزوری نہیں کہ ہمیں بھی جواب صاف ملے۔ احتیاج کم از کم تجربہ تو کر لینا چاہیے۔ آئیے اندازہ طور کی سیر کر آئیں اور دیکھیں کہ واقعی وہی جواب ملتا ہے۔

شعر میں خوبی کا ایک پہلو یہ ہے کہ جلوے کی غلبہ تو ہے اور یہ بھی کہ حضرت موسیٰ کو جواب صاف مل جانے کے باوجود پچھلے بیٹھنے کے لیے تیار نہیں۔ پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر خدا انھیں جواب ملا تو کم از کم بکھ طور کی سیر تو ہو جائیگی اس جہاں گاہ کو تو دیکھ آئیں گے، جہاں ایک مرتبہ حضرت موسیٰ کے لیے ہمارے محبوب نے ایک جھلک کا تماشا دکھایا تھا۔

۸۔ **مشرح :** میرا محبوب نہایت تلخ کلام اور تیز مزاج ہے۔ وہ گالی طعن، ہنسی مذاق اور کھنکھہ سی پی کے بغیر بات نہیں کرتا۔ بلیک کلام میں کچھ نہ کچھ تیزی آ ہی جاتی ہے۔ مگر ایسی بھی کیا تیزی کہ جس شخص سے بات کی اسے شکایت ضرور کرنی پڑی۔ ظاہر ہے کہ بھیتیاں سن کر کون شکایت نہ کرے گا؟

۹۔ **مشرح :** اسے غالب! اگر بادشاہ جج کے سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں تو میں یقین دلاتا ہوں کہ جج کا ثواب حضور ہی کی نذر کروں گا۔

خواجہ رحمانی فرماتے ہیں، یہ غزال اس زمانے میں کسی گئی تھی، جب بہادر شاہ مرحوم نے جج کے لیے جانے کا ارادہ کیا تھا، لیکن تعجب ہے کہ خواجہ مرحوم جیسے بالغ نظر اور حقیقت منم انسان نے فرمایا، ”اُدھر سفر جج کا وہ اشتیاق اور ادھر جج کے ثواب کی یہ بے قدری“۔

حالانکہ میر نے صرف انتہائی اشتیاق جج کا اظہار کیا ہے۔ جو شخص جج کرے گا، وہ اداۓ فرماں کا ثواب بہر حال پائے گا، لیکن جس شخص کی وجہ سے اسے یہ سعادت نصیب ہوگی، وہ اپنی جگہ ثواب کا حقدار ہوگا۔ کیونکہ اس نے ایک نیک کام میں اداؤ کی۔ میرزا شاعرانہ طریق پر صرف یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ انہیں ان پاک مقامات کے دیکھنے کی کتنی آرزو ہے، جنہیں ہم حرمین شریفین کہتے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے دل اور روح میں جو بالیدگی پیدا ہوگی، اس کی خاطر وہ جج کا ثواب بھی چھوڑنے کے لیے تیار ہیں۔ مطلب یہ نہیں کہ ان کے چھوڑنے سے ثواب واقعی چھین جائے گا، مطلب صرف یہ ہے کہ اس مقدس سفر کا جو اصل ثواب ہے، وہ بھی کوئی لے لے، لیکن ان کی زیارت کرادے، اسلام کے اس بنیادی فریضے کو ادا کرنے کا موقع ہم پہنچا دے۔ حرمین شریفین کی زیارت کا انتہائی اشتیاق سب از اللہ ثواب جج کی نذر ہے، کاموجب نہیں بن سکتا۔ یہ شاعری ہے۔ اس میں منطق سے کام نہ لینا چاہیے، بہراستہ لال کوہی شاعری ہی کے نقطہ نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔

۱۔ لغات:

بودا:

کمزور و ضعیف

کم بہت۔

تشریح:

میرا دل غم

کھانے میں بہت

کمزور ہے۔

شراب کے

ذریعے سے

اس کمزوری

کی تلافی ایک

صدمہ ہو

سکتی ہے،

لیکن مصیبت

یہ اُڑی ہے

کہ شراب بھی

کم ہے۔ گویا

غم کھانے کے

یہ جو متاع

مزدوری حتیٰ

وہ بھی بہ قدر

غلبہ تیسرے نہیں۔

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام ٹہرتا ہے
یہ رنج کہ کم ہے مٹے گلغام، ٹہرتا ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُروہ تہِ جام بہت ہے
نے تیر کماں میں ہے، نہ صیاد کیوں میں
گوشتے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے
کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گر سپہِ ریا فی
پاداشِ عمل کی طبعِ خام بہت ہے
ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابنگیِ رسم و روئے عام بہت ہے
زمزم ہی پہ چھوڑو، مجھے کیا طوفِ حرم سے؟
آلودہ بہ سے جامۂ احرام بہت ہے
ہے قہر کہ اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو
انکار نہیں اور مجھے ابرام ٹہرتا ہے
خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکانیں، اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے دوسرے مصرع میں تعقید ہے ،
 شاعر تو وہ اچھا ہے پر بد نام بہت ہے ۔ ” رنج “ کا تعلق ۔

” بہت “ سے ہے ۔ ” درمیان “ کہ کم ہے مے گلنام ” خاما لباً حبلہ معترضہ آ
 پڑا ہے ، لیکن مطلع تھا ، دونوں مصرعوں میں قافیہ اور ردیف کی پابندی ناگزیر
 تھی اور نہ بہت ہے ” کا ثبوت الگ الگ دو کار تھا ۱۰ اس لیے مجبوراً یہ طریقہ کرنا
 پڑا ۔

۲۔ لغات ۔ دُرُود : تمیض

شرح : ساقی سے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے اور نہ حق یہ ہے کہ
 مجھے شراب کی ضرورت نہیں ، وہی تمیض کافی ہے ، جو جام شراب کی تہ میں
 فراہم ہو جاتی ہے ۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ شرم کیوں آتی ہے ؟ اس کے مختلف وجوہ ہیں
 میں آتے ہیں ،

۱۔ ساقی مجھے لگا کہ یہ تو بڑا ہی کم ہمت اور بے حوصلہ شراب نوش ہے
 جو صرف تمیض پر گزارہ کر دینا کافی سمجھتا ہے ۔

۲۔ اسے خیال ہو گا کہ یہ کوئی حقیر اور ذلیل شخص ہے ، جسے کسی اچھی مصل
 میں بیٹھنے اور پینے کا موقع بھی نہیں ملا ۔

۳۔ وہ مجھے لگا کہ یہ تنگ ظرف شراب نوش ہے ۔

۴۔ قناعت ، جو سیرجشی و باہمتی کی علامت ہے ، موقع و محل کے اعتبار
 سے تحقیق کا باعث بن جائے گی ۔ محو کیا جائے تو صورتِ حال کے لحاظ سے اور
 بھی وجہیں پیدا ہو سکتی ہیں ۔

۵۔ شرح : جب تک میں آشیانے میں تھا ، ہر لحظہ اندیشہ لگا رہتا
 تھا کہ صیاد کہیں نہ کہیں کمان میں تیر جوڑے گھات میں چھپا بیٹھا ہو گا ۔ اب گرفتار ،

ہو کر مجھے پتھرے میں بند کر دیا گیا تو کم از کم تیرکان یا ستیاد کی کہیں نشینی کا تو کوئی کشکا باقی نہ رہا۔ اس سے تو نجات مل گئی اور آرام کی زندگی بسر ہونے لگی۔

مرزا غالب نے اس شعر میں زندگی کے دونوں رخ پیش کیے ہیں، ایک آزادی کی زندگی کا رخ، دوسرا قید و محکوم کی زندگی کا رخ۔ آزادی کی زندگی میں یقیناً معیبتیں بھی ہیں، تاہم ان کے باوجود انسانی فطرت یہ ہے کہ سب عموماً اسی زندگی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ ایک طبقہ ایسا ہی ہے، جو خطرات کی دہشت برداشت نہیں کر سکتا اور یہی چاہتا ہے کہ سب غلطیوں سے محفوظ ہو کر کسی گڑھے میں بہ آدام بیٹھا رہے، لیکن اس سے زندگی کے عام عزائم پر جو تباہی خیز اثر پڑتا ہے، اس کا اندازہ پیش کرنا مشکل ہے۔ مرزا نے یہاں صرف رخ پیش کر دینے پر قناعت کر لی، کسی ایک رخ کی دعوت نہیں دی اور ضروری نہیں کہ ہر شعر میں کوئی نہ کوئی دعوت دی جائے۔

۴۔ لغات - زہد : عبادت اور پرہیزگاری۔

ریائی : جس میں ریا اور نمائش شامل ہو۔

باداشِ عمل : عمل کا بدلہ

خلعِ خام : ایسی حرص، جس کا پورا ہونا ممکن نہ ہو، نازیبا حرص،

فzul حرص۔

شرح : میں خدا پرستی اور عبادت گزاری کا۔ کیونکہ قائل ہو سکتا ہوں

ماتا کہ وہ ریا و نمائش کے داغ سے پاک ہے، لیکن اس میں کیا شبہ ہے ہر زاہد اور پرہیزگار کے دل میں یہ چیز بیٹی ہے کہ نیکی کے جو کام وہ کر رہا ہے، ان کا بدلہ ملے گا اور یہ ایسی حرص ہے، جو خلص عبادت گزار کے لیے زیبا نہیں۔

عبادت اس لیے کرنی چاہیے کہ بندے کے لیے پروردگار کی بندگی ہی زیبا ہے اس کا بدلہ لینے کی آرزو ایسے بندے کو بالکل فzul معلوم ہوگی، جو صرف اپنی

بندگی کا حق ادا کر رہا ہو۔

۵۔ لغات - اہل خرد : عقل و دانش والے لوگ۔

پابستگی : پابندی۔

شرح : جن لوگوں کو عقل و دانش کا دعویٰ ہے، آخر وہ کس خاص روش پر تازاں ہیں؟ کون سا خاص مسلک ہے، جسے وہ بطور امتیاز اپنا مسلک قرار دے سکتے ہیں۔ جس طرف نگاہ ڈالیے، سب عام راہ و رسم ہی کی پابندی میں معروف نظر آتے ہیں۔

مرزا یہ حقیقت واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اہل عقل و دانش کے لیے عقلی فیوض کا ثبوت کیا ہے؟ کیا انہوں نے عام لوگوں سے الگ ہو کر کوئی طریقہ اختیار کیا؟ آیا انہوں نے عام راہ و رسم کی پابندی چھوڑی؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو وہ فخر کس بات پر کر سکتے ہیں؟ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی باتوں سے پرہیز کیا جائے جو نامعقول ہیں۔ عوام سیکڑوں ایسی باتیں اختیار کیے بیٹھے ہیں۔ اگر ان سے گریز نہیں، بے تعلقی نہیں تو صاحب عقل و دانش جو نامحلاً بیکار ہے۔

۶۔ شرح : بجزوری مرحوم فرماتے ہیں :

”یہ سرمستی اور مدہوشی کم باگی نہیں، بلکہ خمناۃ جاہلید میں داخل ہو کر شراب بے اندازہ پی گئے۔ یہ کیفیت سروری ہے۔ عشق الہی کے نشے میں عرق ہیں۔ کون ایسا ہے، جو اس کیفیت میں سرشار ہو کر ہوشمند رہ سکتا ہے؟“

مجھے چاہو زمزم ہی پر چھوڑ دو۔ میں حرم پاک کے گرد طواف کرنے کے قابل نہیں، کیونکہ میں نے احرام کا جو لباس پہن رکھا ہے، وہ شراب سے بہت آلودہ ہو چکا ہے۔

بیان زمزم پر رہنے اور حرم کے طواف سے احتراز کرنے کا مقصد خود واضح کر دیا، یعنی عامۃ احرام کا ناپاک ہونا۔ زمزم پر رہیں گے تو اس کے مقدس

پانی سے احرام کو پاک کرنے کی کوشش کریں گے اور جب تک لباسِ احرام پاک نہ ہو جائے، کعبے کی عظمت کا اتنا احساس ہے کہ اس کا طواف بھی اپنے لیے مناسب نہیں سمجھتے۔

۷۔ لغات - ابرام : امرارہ - تقمانہ۔

شرح : محبوب کو وصل سے انکار نہیں اور میں اس کے لیے حد درجہ تقاضے کر رہا ہوں۔ غضب اور ظلم ہے کہ اب بھی بات نہ بنے اور میری مراد پوری نہ ہو۔

شعر میں یہ حقیقت ظاہر کی گئی ہے کہ جب عاشق کو وصل پر امرارہ ہو اور محبوب کو اس سے انکار نہ ہو تو اس کی صورت نہ بنتا سراسر ناقابلِ تصور ہے۔

۸۔ شرح : اے موت ! ابھی تک تو میرا کلیبا ہو ہو کر آنکھ سے

نہیں ٹپکا، لہذا میرے ذمے بہت کام باقی ہے اور بہتر یہی ہے کہ مجھے چپکے اور ہیاں رہنے دے تاکہ یہ کام پورا کر لوں۔

شعر میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب ہم پر پے در پے نئی مصیبتیں نازل ہو رہی ہوں، غلب کے باوجود ٹو نہ آئی۔ اب جگر خون ہو رہا ہے اور خون ہو کر آنکھ سے نہیں ٹپکا۔ جب تک یہ کام پورا نہ ہو جائے، میرے عشق کی تکمیل کیونکر ہوگی؟ اب زرا اور مہلت دے دے کہ اسے تو پورا کر لوں۔

۹۔ شرح : ایسا کون ہو گا، جو غالب کو نہیں جانتا۔ وہ دنیا بھر میں مشہور ہے۔ انصاف یہ ہے کہ شاعر بھی بہت اچھا ہے، البتہ جہانم نہ یادہ ہو گیا ہے۔

۱۔ شرح

محبوب کو صاف

بنائے ہوئے

مدت ہو گئی۔

جب وہ پہلی

مرتبہ آیا تھا

اور میرے ہاں

عشر تھا تو

شراب کے

پایوں میں اتنا

جوش پیدا ہو

گیا تھا کہ پوری

بزم نے چراغاں

کی حیثیت

اختیار کر لی

تھی۔

پایوں میں شراب

بذات خود تیز

تھی۔ محبوب

کی آمد سے جلس

کی گرمی بڑھ

گئی اور شراب

شراب آتش

مدت ہوئی ہے یار کو مہاں کیسے ہوئے
جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کیسے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مرثاں کیسے ہوئے
پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاکِ گریباں کیسے ہوئے
پھر گرمِ نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیسے ہوئے
پھر پریش جراحِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکِ داں کیسے ہوئے
پھر بھر رہا ہے خامۂ مرثاں بہ خونِ دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کیسے ہوئے
باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارۂ خیال کا ساماں کیسے ہوئے
دل پھر طوافِ کوٹے ملامت کو باٹے ہے
پندار کا صنم کدہ دیراں کیسے ہوئے

ہی گئی۔ اسے

مرزا غالب

آتش تیاں

کہتے تھے ،

یعنی برعلوہِ مبالغہ

ہستی ہوئی آگ

نظارہ ہے کہ

ایسی حالت

میں شراب

بھرے پیالوں

کو چراغاں

سے تشبیہ دینا

میں مناسب

حال ہے ۔

۲۔ شرح

میں نے پہلے

مرتبہ محبوب

کی دعوت کی

نقصی تو اس

کی پلکوں کے

یہ جگر کو

پارہ پارہ کر

ڈالا تھا ۔

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب

عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال

صد گستاں نگاہ کا سماں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامہٴ دلدار کھونا

جاں نذرِ دلِ فریبی عنوان کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس

ذلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو

سرے سے تیز دشنہٴ مرثاں کیے ہوئے

اک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ

چہرہٴ مزوِ غئے سے گلستاں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں

سرزیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن

بیٹھے رہیں تصویرِ جاناں کیے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیہ طوفاں کیے ہوئے
اب پھر ان
بکھرے ہوئے
لکڑیوں کو جگہ
جگہ سے اٹھا اٹھا کر جمع کر رہا ہوں تاکہ نئی دعوت میں وہ پلکیں پھر ان لکڑیوں
کو چھیدیں اور اپنے لیے آرائش کا سامان بہم پہنچائیں۔

۳۔ شرح : پھر ضبط و احتیاط کے باعث میرا دم الجھنے لگا ہے۔
ایسا کیوں نہ ہو؟ سالہا سال گزر گئے، جب گریں ہمارا تار کیا تھا۔ پھر ایسی نوبت
کبھی نہ آئی اور گریاں ہمارا تار کیے بغیر ضبط و احتیاط کو کیونکر ختم کیا جاسکتا ہے؟
جب تک یہ ختم نہ ہو، سانس کارکن کیونکر زائل ہو سکتا ہے؟

کسنا یہ چاہتے ہیں کہ ہم لوگ ازل سے دیوانے چلے آتے ہیں۔ اہل عقل و
دانش کی طرح ضبط و احتیاط کی زندگی میں اس نہیں آسکتی۔ ہمارا کام ہی یہ
ہے کہ گریاں بچا ڈالیں، اس تار تار کیا اور جودھر جی پا پا، نکل گئے۔

اگر آپ نے تجربہ کیا ہے یا نہیں کیا تو اب کر لیجیے کہ جو خود پابندی کی
زندگی کا عادی نہ ہو، اسے ایسی زندگی میں ڈال دیا جائے تو قدم قدم پر پریشانی
جوگا۔ اس کے فطری جوہروں کی نمود و نمائش ہی ماند پڑ جائے گی۔ یہی حقیقت
مرزا شعر میں بیان کر رہے ہیں۔

ہم۔ لغات۔ تالہ ہائے شرر بار : شعلے برسانے والے تالے۔
شرح : میرے سانس نے پھر انتہائی سرگرمی سے شعلے برسانے لگے
تالے کھینچنے شروع کر دیے ہیں مجھے سیر چراغاں مطلوب تھی۔ دلت سے یہ سیر
دیکھی نہیں تھی، سانس نے بڑی خوبی سے اس کا انتظام کر دیا۔

۵۔ شرح : عشق پھر زخمِ دل کا حال پوچھنے کے لیے چلا ہے اور
اپنے ساتھ لاکھوں نمکدانوں کا سامان کر لیا ہے۔

مطلب یہ کہ یہ تمام نمکدان زخمِ دل پر اڑیل دیے گئے تاکہ اس کی تڑپ

بڑھتے بڑھتے لاتا ہی ہو جائے۔

۶۔ **شرح :** میں پھر اپنی پکوں کا قلم دل کے سو میں ڈبو رہا ہوں۔
قصہ یہ ہے کہ اپنے دامن پر بیل بوڑوں کے گلزار بناؤں اور یہی اس سامان کا اصل مطلب ہے۔

۷۔ **شرح :** میرے دل اور میری آنکھوں کے درمیان پھر کشمکش شروع ہو گئی ہے۔ آنکھیں چاہتی ہیں کہ محبوب کے دیدار کی لذت نصیب ہو۔
دل کی آرزو یہ ہے کہ اس کے خیال ہی میں گمن رہے، یعنی دونوں نے اپنی اپنی ضرورت اور طبیعت کے مطابق سامان تیار کر لیا ہے۔

۸۔ **لغات :** پندار : خیال، عذر، تکبر
شرح : میرا دل پھر ملامت کے کوچے میں سیر و گردش کے لیے جا رہا ہے اور غرور و تکبر کے جس جگہ سے گا وہ پہاڑی تھا، اسے ویران کر چکا ہے۔

مطلب یہ کہ میرے دل کو اپنے حال پر بڑا غرور و تکبر تھا اور وہ کوئی ایسا قدم اٹھانے کے لیے تیار نہ تھا، جو نا ذیبا سمجھا جائے، لیکن آخر وہ دودھ آگیا کہ اسے غرور و تکبر سے دست کش ہو کر طعن و ملامت کے کوچے میں جانا پڑا۔

۹۔ **شرح :** شوق مین عشق پھر کسی خریدار کی تلاش میں ہے۔ عقل، دل اور جان کا سراپہ پیش کر رہا ہے، جو چاہے خرید لے۔

نظا ہر ہے کہ عقل، دل اور جان صرف محبوب خرید سکتا ہے اور مقصود یہی ہے کہ عشق پھر ہمیں اپنا سب کچھ نذر محبوب کرنے پر آمادہ کر رہا ہے۔
۱۰۔ گل و لالہ سے مراد حسین و جمیل لوگ ہیں۔

شرح : خیال پھر حسینوں کی طرف دوڑ رہا ہے اور نگاہ نے سیکڑوں گھٹائوں کا سامان کر لیا ہے گویا جب تک نگاہ سیکڑوں ہاؤز کا سامان نہ کر لے اس وقت تک حسینوں پر خیال دوڑانا مناسب ہی نہیں۔

۱۱۔ شرح : میں پھر محبوب کا خط کھولنا چاہتا ہوں ، ساتھ ہی آندو ہے کہ جان نامے کی دفتر ہی پر قربان کر دوں ۔

۱۲۔ شرح : ہوس کو پھر یہ طلب ہے کہ کوئی حسین لب بام جلوہ گر ہو اور سیاہ زلفیں اس نے چہرے پر بکھیر رکھی ہوں ۔

۱۳۔ شرح : پھر آندو چاہتی ہے کہ سامنے کوئی نگار ہو جس نے پلکوں کے بغیر سرے سے تیز کر رکھے ہوں ۔

۱۴۔ شرح : پھر نگاہ کسی تو بہارِ ناز کو ڈھونڈ رہی ہے ، جس نے چہرہ شراب کے نشے سے گلستان کی طرح سرخ و رنگین بنا رکھا ہو ۔

۱۵۔ شرح : پھر دل میں یہ انگ ہے کہ کسی کے دردِ اذی سے پر پڑے رہیں ، لیکن ظاہر ہے کہ دربان کے احسان کے نیچے سردیے بغیر وہاں جگہ نہیں مل سکتی ، لہذا یہ احسان بھی قبول کر لیں ۔

۱۶۔ شرح : جی پھر وہی فرصت چاہتا ہے کہ وہی ہو یا رات ، محبوب کا تصور کیے بیٹھے رہیں ۔

۱۷۔ شرح : اے غائب ! ہمیں نہ چھپرہ کہ آنسوؤں کے جوش کا یہ عالم ہے ، گو یا ہم طوفانِ پاکر دینے کی تیاری کیے بیٹھے ہیں ۔

نویدرامن ہے بے دردِ دوست ہاں کے لیے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے
بلا سے گر مژہ یار تشنہِ خوٹوں ہے
رکھوں کچھ اپنی ہی مژگانِ خونِ فشاں کے لیے

۱۔ لغات :
نوید :
طو شخبری :
شرح :
محبوب کے
ظلم و جور نے

وہ زندہ ہم میں کہ میں روشناسِ خلق اے خضر!
 نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے
 رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک
 بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لیے
 فلک نہ دُور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
 دراز دستی قاتل کے امتحاں کے لیے
 مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
 کسے قفس میں فزا ہم خسِ آشتیاں کے لیے
 گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت اُٹے
 اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے
 بہ قدرِ شوق نہیں ظنِ تنگنائے عزل
 کچھ اور چاہیئے وسعتِ مرے بیاں کے لیے
 دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے
 بنا ہے عیشِ تجلِ حسینِ خاں کے لیے
 زباں پہ بارِ خدا یا ایہ کس کا نام آیا؟
 کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لیے

جان کے لیے
 اس کی خوشخبری
 حتمی کر دی ،
 کیونکہ ستم انگیزی
 کے جتنے طور
 طریقے تھے ،
 وہ سب کے
 سب محبوب
 نے بہت لیے
 اور آسمان کے
 لیے کوئی طریقہ
 باقی نہ چھوڑا ۔
 مطلب یہ
 کہ ظلم کے جتنے
 طریقے ہو سکتے
 تھے ، وہ تو عمل
 میں آگئے ، اب
 آسمان کوئی منتز
 اٹھانا چاہے گا
 تو انیس طود
 طریقوں میں سے
 کوئی ہوگا ، جن
 کے ہم محبوب

نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملت و ملک
 بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستان کے لیے
 زمانہ عہد میں اس کے ہے عجزِ آرائش
 بنیں گے اور سدرے اب آسمان کے لیے
 کے ہاتھوں مادی جو پکے ہیں۔ یوں
 اس کی خوشخبری متیا ہو گئی، گریا
 آسمان کوئی علم نہ کر سکے گا۔

۲۔ شرح :
 اگر محبوب کی
 چلیں خون کی
 پیاسی میں تو ہوں
 آخر اپنی خون
 برسانے والی
 پلوں کے لیے بھی کچھ نہ کچھ رکھنا مزدوری ہے، سب کچھ اسی کی نذر کیوں
 کر دوں ؟

۳۔ شرح : عام روایت کے مطابق حضرت خضرؑ زندہ ہیں، لیکن
 خاص خوش نصیبوں کے سوا کسی کو نظر نہیں آتے۔ مرزا غالب نے اس سے
 یہ پہلو پیدا کر لیا کہ زندگی سے مراد ہے خلقِ خدا سے روشناسی، میل جول، املا
 ملا۔ اگر یہ چیزیں نہ ہوں تو زندگی کس کام کی ؟ اصل میں دنیوی زندگی کی تعبیر
 ہے ہی یہی اس کے سوا کوئی نہیں۔

فرماتے ہیں کہ اے خضرؑ ! اصل زندگی تو ہماری ہے کہ دنیا ہمیں دیکھتی
 ہے اور ہم دنیا کو دیکھتے ہیں۔ ہم لوگوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں، لوگ ہماری مدد کرتے
 ہیں۔ تمہاری کیا زندگی ہے کہ ہمیشہ زندہ رہنے کے لیے لوگوں کی نگاہوں سے
 چھپ گئے، گویا چور بن گئے، جو کبھی ظاہر نہیں ہوتا، دلویش ہی رہتا ہے اور

وہ بھی اس غرض سے کہ ہمیشہ زندہ رہو۔

۴۔ **شرح :** مجھ پر بلائیں نازل ہوئی رہیں۔ اس حال میں بھی رشک کے عذاب سے میرا چشکارا نہ ہوا۔ سبب یہ تھا کہ تیری ادا سارے جہان کے لیے بلا سے جان ہے، حالانکہ اسے صرف میرے لیے بلائے جان ہوتا ہے۔
مخالف

رشک کا معنوی میرزا غالب نے اس کثرت سے باندھا ہے کہ شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے ہاں اتنی فراوانی ساتھ ہی اتنی بوقلمونی مل سکے، مثلاً اسی سے لیتا جلتا مرزا کا نہایت مشہور شعر ہے :

قہر جو یا بلا ہو، جو کچھ ہو
کاش کہ تم مرے لیے ہوتے

۵۔ **شرح :** اے آسمان ! مجھے قاتل سے دُور نہ رکھ۔ کیا اس کی دوازدستی کے امتحان کے لیے صرف میں ہی رہ گیا ہوں ؟ مطلب یہ ہے کہ مجھے قتل ہونے اور جان دے دینے میں ایک لمحے کے لیے بھی تاقل نہیں لیکن ایسا کیوں ہو کہ میں محبوب کے مزاق میں دُور بیٹھا ہوا گھل گھل کر جان دوں ؟ یہ کیوں نہ ہو کہ میں اس کے پاس پہنچ جاؤں اور وہ مجھے اپنے ہاتھ سے قتل کر ڈالے ؟ فراق کی حالت میں دُور بیٹھ کر موت کا انتظار کرنا اور غم میں گھل گھل کر مرنا غالب کے نزدیک دوازدستی کا امتحان ہے۔ یعنی مقصود یہ ہے کہ محبوب مختلف ذریعوں اور وسیلوں سے کہاں کہاں پہنچ کر سچے عاشقوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا موجب بنتا ہے۔

۶۔ **شرح :** میری کوشش کی حقیقت سمجھنا چاہو تو یہ مثال سامنے رکھ لو کہ ایک پرندہ پتھر سے میں بند ہے اور وہ آشیانے کے لیے تنگے جمع کر رہا ہے۔

یہ صرف مثال ہے، یہ مراد نہیں کہ قفس میں کوئی پرندہ بند ہو تو وہاں اسے

تنگے جمع کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ابھی رملی کی کوئی صورت نہیں۔ گرفتاری کی مصیبت نے سبھا نہیں چھوڑا اور پھرے میں بیٹھے بیٹھے گھونسلے کے لیے تنگے یوں جمع کرنے لگا۔ گویا سب کچھ ملے جو چکا ہے۔ مثال سے ظاہر ہے کہ اصل کوشش بے سود اور بے نتیجہ بھی ہے اور ہر دیکھنے والے کے دل میں اتھانِ رحم بھی پیدا ہوتا ہے۔

۷۔ مشرح : خواجہ عاتق نے اس شعر پر ”یادگار غالب“ میں بھی بحث کی ہے اور ”مقدمہ شعر و شاعری“ میں بھی۔ دونوں جگہ اس کی خوبوں کے جداگانہ پہلو پیش کیے ہیں۔ ”مقدمہ“ میں فرماتے ہیں : مصنون یہ ہے :
 ”میں جو معشوق کے مکان پر پہنچا۔ اول خاموش کھڑا رہا۔ پاسبان نے سائل سمجھ کر کچھ نہ کہا۔ جب محبوب کے دیکھنے کا وعدہ سے زیادہ شوق ہوا اور صبر کی طاقت نہ رہی تو پاسبان کے قدموں پر گر پڑا۔ اب اس نے جاناکہ اس کا مطلب کچھ اور ہے۔
 اس نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا کہ ناگفتہ بہ ہے۔“
 فرماتے ہیں کہ اتنے بڑے مصنون کو مرزا نے صرف دو مصرعوں میں بیان کر دیا ہے۔

”یادگار غالب“ میں لکھتے ہیں : اردو غزل میں ایسے بلیغ اشعار شاید دو ہی چار اور نکلیں گے۔ مولانا آزاد جو مرزا کی طلب کو نام رکھتے تھے، وہ بھی اس شعر کے انداز بیان پر پردہ نہ تھے۔ جو واقعہ مرزا نے اس شعر میں بیان کیا ہے، اس میں دو باتوں کی تصریح کرنی ضروری تھی، ایک یہ کہ پاسبان نے قائل کے ساتھ کیا سلوک کیا، دوسرے یہ کہ قائل پاسبان سے کیا چاہتا تھا، سو یہ دونوں باتیں بہ مراحات بیان نہیں کی گئیں، صرف کتا نے میں ادا کی گئی ہیں، مگر مراحات سے زیادہ و مروح کے ساتھ فوراً سمجھ میں آجاتی

ہیں۔ پہلی بات پر لفظ "شامت" اور دوسری پر "قدم لینا" صاف دلالت کرتا ہے۔ اس کے سوا دوسرے کی نشست اور الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دوسروں میں ایسی خوبی سے ادا کرنا کہ نثر میں بھی اس طرح ادا کرنا مشکل ہے۔ یہ سب باتیں نہایت تحریریت کے قابل ہیں۔

خواجہ عاتق شکر کے تمام پہلو واضح کر چکے ہیں، تاہم نفسِ مطلب کی پوری توضیح کے لیے پھر ایک مرتبہ شعر کو موزوں نثر میں پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مرزا محبوب کے دروازے پر پہنچے۔ وضعِ قطع سے بالکل فقیر اور درویش معلوم ہوتے تھے۔ دروازے کے پاسبان نے دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ کوئی فقیر ہے، جو انگٹے کے لیے آگیا ہے اور فقیر آتے ہی رہتے ہیں۔ چند لمحے ٹھہرے گا اور رخصت ہو جائے گا۔ اس سے کچھ نہ کہا اور بالکل مزاحم نہ ہوا۔ مرزا اپنے ذہن میں سمجھ کہ پہلا مرحلہ تو یہ خیر و خوبی طے ہو گیا۔

پاسبان ہر ماں معلوم ہوتا ہے۔ کیوں نہ اس کی منت سماجت کر کے بار بار کی کوشش کروں؟ چنانچہ کھڑے کھڑے آگے بڑھے اور جتا بانڈ پاسبان کے پاؤں پر گر پڑے۔ اب اسے ہوش آیا اور سمجھا کہ بھیک مانگنے کا یہ تو کوئی طریقہ نہیں۔ یقیناً یہ بھکاری نہیں، بلکہ دوسری عزم سے آیا ہے اور اسے معلوم تھا کہ اس عزم سے اکثر لوگ آتے ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ اس نے وہی سلوک کیا، جو ایسے تمام لوگوں سے کرتا رہا تھا۔ یعنی گردن میں لٹخو دیا اور پھر تختہ رسید کیے، درچار جوتے لگائے اور دھکیلتا ہوا دُور تک لے گیا۔

کمال یہ ہے کہ اس لمبی داستان کو صرف چند الفاظ میں کہنا یہ ایسے طریق پر پیش کر دیا ہے کہ اس کی نظر مشکل سے ملے گی۔ پورے شعر کا معنی صرف چار پانچ لفظوں پر مبنی ہے یعنی "گدا" "چپ" "شامت" "پاسبان" اور "قدم لینا"۔

مولانا طالعباتی تک کو اعتراف کرنا پڑا، اس شعر نے ایسی بندش پا لی

ہے کہ جواب نہیں۔

۸۔ لغات۔ تنگنائے ہنگ بجہ ہنگ کو ہے۔

شرح ۱ میں جو معانی اس زمین میں لانا چاہتا ہوں، انہیں اپنے شوق اور خواہش کے مطابق غزل میں نہیں لاسکتا۔ مطاب کا تقاضا ہے کہ میرے بیان میں کسی قدر وسعت پیدا ہو جائے۔

۹۔ لغات۔ تہمتل حسین خاں : فرخ آباد کے بنگش خانہ ان کا

مشہور امیر جس نے ۱۸ ذی قعدہ ۱۲۱۲ھ (۹۔ ۱۰۱۲ھ) کو وفات پائی۔
نصیر اللہ، معین الملک، ظفر جنگ اس کے خطابات تھے، جن کا ذکر آگے آتا ہے۔ اور نوآبادوں سے علاقہ حکومت انگریزی نے واپس لے لیا تھا اور ایک لاکھ آٹھ ہزار روپے سالانہ نقد مقرر کر دیا، لیکن نوآبادوں کا شاٹھ ایسا تھا کہ بڑے بڑے والیان ریاست ان کے مقابلے میں کمتر نظر آتے تھے، تہمتل حسین خاں کی وفات کے بعد اس کا بھتیجا تہمتل حسین خاں نواب بنا۔ ۱۲۱۲ھ کے ہنگامے میں اس نے انگریزوں کی جانیں بچانے کے لیے کوئی دقیقہ سہی اٹھانہ رکھا، لیکن دوسرے لوگوں کا غلبہ اس قدر بڑھا کہ تہمتل حسین خاں خود بھی ملوث دینے پر مجبور ہو گیا۔ ہنگامے کے خاتمے پر اس کے لیے پھانسی کی سزا تجویز ہوئی پھر یہ قرار پایا کہ حکم چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلا جائے۔ تہمتل حسین خاں نے کٹر مکر میں قیام کا فیصلہ کیا، چنانچہ اسے وہیں بھیج دیا گیا۔ کچھ مدت تنگی میں گذری، پھر نواب شاہجہان بیگم والیہ بھوپال نے اس کے لیے معقول رقم کا انتظام کر دیا جو رباط بھوپال کی رقم کے ساتھ سال بہ سال نواب کو مل جاتی تھی۔ وہیں ۱۲۱۲ھ میں تہمتل حسین خاں نے وفات پائی۔

شرح : عیش و تہمتل کا ساز و سامان خلق کو اس لیے دیا گیا ہے کہ تہمتل حسین خاں کو نظر نہ گئے، ورنہ حقیقت میں یہ ساز و سامان صرف تہمتل حسین خاں کے لیے ہے۔

جب کسی کے پاس کوئی ایسی چیز ہو جس سے دوسرے محروم ہوں تو انڈیشہ رہتا ہے کہ اسے کسی کی نظر لگ جائے گی۔ مثلاً خوب صورت پتوں کو نظر سے محفوظ رکھنے کے لیے سیاہ رنگ کا کوئی منگالکے میں ڈال دیتے ہیں، جسے نظر بچو کہا جاتا ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ دوسروں کو عیش کا بوسا مان دیا گیا ہے اس کی غرض صرف یہ ہے کہ تجل حسین نظر بد کا شکار نہ ہو جائے۔
۱۰۔ لغات - بارِ خدا یا : خدا سے بزرگوار
نطق : گویائی۔

شرح : اسے خدا سے بزرگوار ! زبان پر کس کا نام آیا کہ میری گویائی کے لیے میری زبان کو چوم چوم کیا۔

مرزا غالب نے فارسی میں بھی دوسرے مصرع کا معنون باندھا ہے :
تا نام نئے وساقی کوڑ بہ زبان رفت
صدرہ لیم از مہر جو سید زبان را

آسی نے لکھا ہے کہ زبان چومنے کا معنون سب سے پہلے خاقانی نے باندھا تھا۔ اگر حقیقت یہی ہے تو کوئی معنائتہ نہیں۔ ایسے ایک معنون کے سلسلے میں توارد تسلیم کر لینا زیادہ اچھا ہے۔

۱۱۔ شرح : جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، لفظ التذلل معین الملک تجل حسین خاں کے خطاب کی اجزاء رہے۔ ان کے استعمال کا عام طریقہ یہ تھا : لفظ التذلل والدین اور معین الملک - اسی کو مرزا غالب نے پہلے مصرع میں لے لیا۔ یعنی تجل حسین خاں، جو دین اور مملکت کا باور اور ملت و ملک کا مددگار ہے، بلند آسمان اسی کے آستان کے لیے بنا ہے۔

۱۲۔ شرح : زمانہ اس کے عہد میں ذہنیت و آرائش کے درپے ہے۔ زمین کی سجادت اور کمال پر پہنچ رہی ہے۔ یقین ہے کہ آسمان کے تارے بھی

توڑ کر اسی آرائش میں صرف ہوں گے اور آسمان کے لیے اور ستاروں کی ضرورت پیش آئے گی۔

بعض شارحین نے فرمایا ہے کہ تجمل حسین خاں کے عہد میں آسمان وزین کی آرائش ہو رہی ہے۔ چونکہ آسمان کی آرائش ابھی نہیں ہوئی، اس لیے پہلے ستاروں میں اور ستارے بڑھادیے جائیں گے۔

اس پر اعتراض کی ضرورت نہیں، لیکن تکمیل آرائش کو صرف آسمان تک محدود رکھنا کیونکر مناسب ہے؟ اولین شے تو زمین کی آرائش ہے۔ بظاہر سبھی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس آرائش میں ستارے بھی کھپ جائیں گے اور آسمان کی آرائش بھال رکھنے کے لیے اور ستارے درکار ہوں گے۔

۱۳۔ شرح : کاغذ ختم ہو گیا اور مددوح کی مدح ابھی باقی ہے۔

اس نے کہا کہ سند کے لیے سفینہ درکار ہے۔ "سفینہ" یہاں دو معنی میں استعمال ہوا۔ "اول" و "ثانی"، دوم "کشتی" یا "جہاز"، "کشتی" یا "جہاز" کو "بحر بیکراں" سے مناسبت ہے۔ "دفعہ" کو "کاغذ" سے۔

۱۴۔ شرح : آج غالب نے خاص ادا سے نکتہ سرائی کی ہے،

یعنی خاص رنگ میں شعر کہے ہیں۔ میرے جو دوست اور ہم ہمیشہ نکتہ داں ہیں، یعنی شعر کی باریکیاں سمجھتے ہیں، انھیں عام دعوت دیتا ہوں کہ اس کی پیروی کریں۔

خواجہ سہال فرماتے ہیں :

"غزل کے اخیر میں چند شعر نواب فرخ آباد کی مدح میں لکھے

ہیں۔ جنہوں نے مرزا کو نہایت اشتیاق کے ساتھ فرخ آباد

میں بلایا تھا، مگر غالباً مرزا کا دل ہانا نہیں ہوا؟

قصائد

(۱)

امیر المومنین حضرت علیؑ کی منقبت میں :

سناڑیک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بے کار
 سایہ لالہ بے داغ شوید اٹے بہار
 مستی بادِ مباح سے ہے بعرضِ سبزہ
 ریزہ شیشہ سے جوہرِ تیغِ کسار
 سبز ہے جامِ زمرد کی طرح داغِ پلنگ
 تازہ ہے ریشہ نارنج صفتِ روئے شرار
 مستی ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت
 کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار
 کوہ و صحرا ہمہ معمورِ شوقِ ملبسِ بل
 راہِ خوابیدہ ہوئی خندہ گل سے بیدار
 سوئے ہے فیضِ ہوا صوبتِ مژگانِ قیم
 سرِ نوشتِ دو جہاں ابر بہ یک سطرِ غبار

۱۔ شرح :
 باغ میں فیض
 کا یہ عالم ہے
 کہ کسی بھی ذرہ
 کا وجود بیکار
 نہیں رہا یہاں
 تک کہ بے داغ
 لالے کا سایہ
 بہار کے دل
 کا نقطہ سیاہ
 بن گیا ہے۔
 لالہ و افکار
 ہوتا ہے ۔
 یہاں اسے
 بے داغ اس
 لیے کہا کہ بہار
 کے فیضِ نو

کاٹ کر پھینکیے ناخن تو بہ اندازِ صلال
 قوتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار
 کعبِ ہر خاک بہ گردوں شدہ قمری پرواز
 دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤسِ شکار
 مے کدے میں ہو اگر آرزوئے گل چینی
 بھول جا یک قدحِ بادہ بہ طاقِ گلزار
 موجِ گل ڈھونڈ بہ خلوت کدہ غنچہ باغ
 گم کرے گوشہ مے خانہ میں گر تو دستار
 کھینچے گرانی اندیشہ چمن کی تصویر
 سبز مثلِ خطِ نو خیز ہو خطِ پرکار
 لعل سے کی ہے پے زمزمہ رحمتِ شاہ
 طوطیِ سبز کسار نے پیدا منعقد
 وہ شہنشاہ کہ جس کی پے تعمیرِ سرا
 چشمِ جبریل ہونے قابلِ خشتِ دیوار
 فلکِ العرش، هجومِ خیمِ دوششِ مزدور
 رشتہ فیضِ ازل سازِ مناسبِ معمار

نے اس کا
 داغ بالکل
 مٹا دیا۔ اب
 اس کا موت
 سایہ باقی نہ
 گیا اور وہ
 تہاہر کا سوسیا
 بن گیا۔

۲۔ لغات
 تیغ کسار
 پاؤ کی چوٹی
 شرح
 شاعر نے پاؤ
 کی چوٹی پر
 سبز دیکھا
 تو اسے خیال
 ہوا کہ فی سبزو
 نہیں، بلکہ
 میٹھے شراب
 کی کرچیں ہیں
 جو تیغ کو کہے
 جو ہر جگہ گئی
 ہیں اور یہ

باد صبا کی مستی کا
کرشمہ ہے۔

مطلب یہ ہے
کہ سبز و سر کو بہار
ہمیں تیار ہے
باد صبا نے مستی
کے عالم میں میناے
سے توڑ ڈالا اور
اس کے سبز سبز
دیزے پہاڑ کی
چوٹی پر بکھر گئے،
وہی تیغ کو بہار
کے جوہر بن گئے۔
واضح رہے کہ
میناے سے کی

سبز و سر چمن و یک خطِ پشت لب بام
رفعت بہت مدعاوت و یک ادبِ حصار
واں کے خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرکاش
وہ رہے مروجہ بالِ پری سے۔ میزار
خاک صحرائے بخت، جو ہر سیر عرفا
چشمِ نقشِ قدم، آئینہ بخت بیدار
ذبحہ اس گرد کا، خود شید کو آئینہ ناز
گرد اس دشت کی امید کو احرام بہار
آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستی ناز
عرضِ خیازۃ الحیبا دے ہر موج بہار

مطلع ثانی

کرچوں کا سبز جنا
بہار کا فیضان ہے۔
تیغ کو بہار اصلاً
پہاڑ کی چوٹی کو
کھتے ہیں، لیکن
یہاں شاعر نے

فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار
دل پروانہ چہ راخاں پر ملبس گلزار
شکلِ طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز
ذوق میں جلوے کے تیرے ہوئے دیدار

دوبارہ تیغ کو
حقیقی معنی میں
لے لیا جو ہر
سے مراد اس
کی آب داری
ہے۔

۳۔ لغات
پلنگ:
پیتا جس کے
زرد جسم پر
سیاہ پتیاں
ہوتی ہیں۔

شرح:
ہمارے جوش
اور ضیغ کی
کیفیت بیان
کرتے ہوئے
کہتے ہیں کہ
چیتے کے داغ
یعنی پتیاں نفرو
کے پیالے کی
طرح میں ہو گئی ہیں اور چنگا ہونے میں ویسی ہی تازگی آگئی ہے، جیسی تازگی کے
ریشے میں ہوتی ہے۔

تیری اولاد کے غم سے ہے برونے گردوں
سلک اختر میں مہ نو، مرثہ گوہر بار
ہم عبادت کو ترا نقش قدم، مہر نماز
ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے انتظار
مدح میں تیری نہاں زمزمہ لغتِ نبی
جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار
جو ہز دستِ دعا آئندہ یعنی تاثیر
یک طرفت نازشِ مرثگان و دگر سو غم خوار
مردک سے ہو عزا خانہ اقبال نگاہ
خاکِ درد کی ترے جو چشم نہ ہو آئندہ دار
دشمن آلِ نبی کو بہ طرب خانہ دھر
عرصِ خمیازہ سیلاب ہو طاقِ دیوار
دیدہ تادل اسد آئینہ یک پر تو شوق
فیضِ معنی سے خطِ ساعنہ راقم سرشار
طرح میں ہو گئی ہیں اور چنگا ہونے میں ویسی ہی تازگی آگئی ہے، جیسی تازگی کے
ریشے میں ہوتی ہے۔

۴۔ لغات - فشار : دباؤ

شرح : فضا نے عالم میں گھنٹوں گھنٹا میں چھاری ہیں۔ حسرت ان سے عیش و نشاط کے پھول چیں رہی ہے گھنٹوں کی شدت کا یہ عالم ہے کہ دونوں جہان ان کی آغوش میں بھینچے جاسکتے ہیں۔

شعر کا مطلب ہنسا ہر یہ ہے کہ بادل اتنے زور سے گھر کر آئے ہیں گویا دونوں جہان کی فضا ان کے لیے تنگ معلوم ہوتی ہے اور شاعر جیسا حسرت زدہ آدمی بھی ان سے خوشی کے پھول چیں رہا ہے۔

۵۔ لغات - معموری : آبادی

راہِ خواہیدہ : فطری معنی سویا ہوا راستہ، اصطلاحی معنی وہ راستہ جس پر چلنا پھرنا بہت کم ہو۔

شرح : بہار کے فیض سے ہر جگہ بھول پیدا ہو گئے۔ ان کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ جو راستے ویران پڑے تھے وہ بھی پھولوں سے بھر گئے۔ گویا سونے ہونے والے راستے پھولوں کے بننے یعنی کھلنے کی آواز سے بہار ہو گئے۔ کوہ و صحرا میں ہر طرف پھول ہی پھول نظر آتے ہیں، اس لیے تمام مقامات بلبلوں کے عشق سے آباد ہو گئے ہیں۔

۶۔ لغات - سر نوشت : تقدیر

مژگانِ قیم : اس کی دو خصوصیتیں ہیں، اول خاک آلود ہونا، دوم مسلسل رونے کے باعث نم آلود رہنا۔

دو جہاں ابر : بادلوں کی انتہائی کثرت۔

خبرار : ایک مستمر کا خط، جو دو کاغذوں پر لکھا جاتا ہے اور دونوں کو ملا کر بچھا جاتا ہے، ورنہ خبرار سا معلوم ہوتا ہے۔

شرح : فصلِ بہار کی تری اور سیرابی کا یہ عالم ہے کہ مژگانِ قیم کی طرح خطِ خبرار کی ایک سطر میں دو جہاں ابر کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔

شعر کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہمارے رطوبت اور شادابی کی برکت سے گرد و غبار کی معمولی سی مقدار میں اتنا پانی ہے، گو یا بے شمار بادل برسنے لگے ہیں۔

مڑگانِ قیام کی دونوں خصوصیتیں شعر کے سلسلے میں پیش نظر رہنی چاہئیں۔

۷۔ لغات - قوتِ نامیہ : بڑھنے اور نشوونما پانے کی قوت۔

شرح : اگر ناضج کاٹ کر پھینک دیں تو بڑھنے اور نشوونما پانے کی قوت اسے بھی بیکار نہ چھوڑے گی، بلکہ نودے کر اس جلال کو بدر بنا کر رہے گی۔

۸۔ شرح : خاک کی ہر شئی، جو آسمان کی طرف بلند ہو رہی ہے اس میں ہمارے جوئی خون نے جان ڈال دی ہے، اور وہ قمری کی طرح اڑ رہی ہے۔ اور جس کا غذا کو آگ لگ گئی ہو، وہ ایک جال ہے، جس سے مور پکڑے جاتے ہیں۔

قمری کا رنگ خاکی ہوتا ہے۔ میرزا غالب پہلے بھی اسے خاک اور خاکستر سے تشبیہ دے چکے ہیں۔ یہاں مرثیہ ہوا کہ ہوا سے ہمارے بے جان خاک میں روح پھونک دی اور وہ قمری بن کر اڑنے لگی۔ آتشِ زندہ کا غذا کی تشریح پہلے تفصیل سے کی جا چکی ہے۔ اس کا غذا میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے شعلے سے پیدا ہو جاتے ہیں، جو چند لمحے باقی رہتے ہیں، ان کی صورت بالکل ایسی ہوتی ہے، جیسے جال کا کوئی ٹکڑا ہو۔ وہ کاغذ مور کے پروں سے بھی اک گودہ مشابہت رکھتا ہے، اس لیے اُس جال کو طائوس شکار کہا گیا۔

۹۔ شرح : اگر تجھے یہ تمنا ہو، شراب خانے میں بیٹھ کر بھول چنے تو اس کی سہل ترکیب یہ ہے کہ شراب کا ایک پیالہ باغ کے کسی طاقتے میں رکھ کر بھول جا۔ نشوونما کی قوت اُس ایک پیالے کو اسی طرح نئے شمار پالیے

بنادے گی، جس طرح ایک چھوٹے سے بیج سے کئی پھول پیدا ہو جاتے ہیں۔
یوں چمن میں میکہ پیدا ہو جائے گا اور میکہ سے میں چمن۔ شراب بھی پی اور
پھول بھی چمن۔

۱۰۔ شرح : اگر شراب خانے کے گوشے میں تیری گپڑی گم ہو
جائے تو باغ میں پلا جا اور غنچے کی خلوت گاہ میں موج گل ڈھونڈ لے۔
گویا جو گپڑی میکہ سے میں گم ہوگی، وہ لطیف ہوا سے خوشبو بن کر غنچے کی
خلوت گاہ میں جا بیٹھے گی۔

۱۱۔ لغات۔ مانی : ایک مشہور معبود جس کا وطن بابل تھا، مفصل
حالات پہلے کہے جا چکے ہیں۔

شرح : اگر فکر و خیال کا مانی باغ کی تصویر کھینچے تو طراوت ہوا کے
باعث پرکار کا خط حسینوں کے ننھے ننھے اُگے ہوئے سبزہ منط کی طرح سبز
ہو جائے۔

۱۲۔ لغات : منقار : چونچ۔

شرح : سبزہ کو مبارک کے طوطی نے حضرت علیؑ کی مدح کا زمزمہ
گانے کے لیے لعل کی چونچ پیدا کی ہے۔

میرزا کا مقصود یہ ہے کہ پہاڑ پر سبزہ بھی اُگتا ہے اور اس میں لعل
بھی ہوتے ہیں۔ دونوں نے مل کر ایک ایسے پرندے کی شکل پیدا کی جس
کا رنگ سبز اور چونچ سرخ ہے۔ غرض یہ ہے کہ حضرت علیؑ کی مدح کریں۔
گویا یہ شعر گریکا ہے، اس سے مدح شروع ہو جاتی ہے۔

۱۳۔ شرح : حضرت علیؑ وہ شہنشاہ ہیں، جن کے محل سرائے کی
تعمیر کے لیے اینٹوں کی ضرورت پڑی تو حضرت جبریلؑ نے اپنی آنکھوں کا
بنانے کی غرض سے پیش کی تاکہ اس میں ڈھال ڈھال کراٹھیں تھاپ لی
جائیں۔

۱۴۔ لغات - فلک العرش : وہ آسمان یا بلندی جس پر عرش ہے ۔

ہجومِ ختم : جبکاؤ کی کثرت ۔

طنابِ معمار : وہ رستی جس کے ساتھ ایک وزن لٹکا رہا ہے اور راج معمار اس سے تعمیر کردہ دیوار کی سیدھ اور ٹیڑھ دیکھتے ہیں ۔ جہاں ٹیڑھ ہو، اسے ٹھونک کر درست کر دیتے ہیں ۔

شرح : عرش والا آسمان مزدور کے کندھے کی طرح حد درجہ جھک گیا ہے ۔ یعنی وہ حضرت علیؑ کی محلِ سرائے کی تعمیر میں مزدوری ، تعلیم و احترام کی بنا پر کر رہا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کے اذلی فیض کا رشتہ اس محلِ سرائے کے معمار کی وہ رستی ہے جس سے دیوار کی سیدھ ، ٹیڑھ دیکھی جاتی ہے ۔

۱۵۔ لغات - نژدہ : نواحق

خطِ پشتِ لبِ بام : مکان کی منڈ پر پر جو رنگین خط آرائش کی غرض سے لگایا جاتا ہے ۔

اوجِ حصار : محلِ سرائے کی فصیل کی بلندی جس نے چاروں طرف سے عمارت کو گھیر رکھا ہے ۔

شرح : نژدہ آسمانوں کا سبزہ اس محلِ سرائے کے لبِ بام کی منڈ پر کے رنگ میں مرتب ہو گیا ۔ سیکڑوں خدا شناس لوگوں کی بلند تہمتی اس محلِ سرائے کی بیرونی دیوار کی بلندی کے برابر ہے ۔

عارفوں کی بلند تہمتی اس اعتبار سے کہ ان کی فکر و نظر مقامِ معرفت حاصل کرنے کی غرض سے بہت اونچی جاتی ہے ۔

۱۶۔ لغات - خاشاک : گھاس پھوس ۔

پرکاش : گھاس کا تنکا ۔

مرؤۃ : پکھا ، بارزن

شرح : اس عمل سرائے کے باغ کی گھاس پھوس سے ایک تنکا بھی
نسی کو مل جائے تو وہ پری کے بال و پر کے پکھے سے بھی بیزار رہے۔

پری کے بال و پر کا پکھا ایسی چیز ہے، جو بالکل نایاب ہے، لیکن اس
کی آرزو ہر شخص کو ہوگی تاکہ گرمی میں راحت پہنچے اور کمبھوں سے بچاؤ ہو سکے
لیکن میرزا کہتے ہیں کہ جس شخص کو حضرت علیؑ کے باغ سے گھاس کا ایک
تنگا مل جائے، وہ پری کے پکھے سے ہمیشہ بیزار رہے اور اسے ہر گاہ کی
بھی وقعت نہ دے گا۔

۱۷۔ لغات۔ نجف : کوڑے تین چار میل پر مغرب جانب ایک

شہر، جہاں حضرت علیؑ کا مزار ہے۔

سیر : رومانی سلوک کے مراتب طے کرنا

عرفا : عارف کی جمع، خدا شناس لوگ، اصحاب معرفت۔

شرح : نجف اشرف کے صحرا کی خاک خدا شناس لوگوں کے عرفان

سلوک کا جو سہرا یعنی مدح و مداں ہے اور اس صحرا کی خاک پر نقش پاکی آگے
ہلکتے ہوئے نیچے کا آئینہ ہے۔

مطلب یہ کہ نجف کے صحرا میں پھر ناطر خان حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور

وہاں جس کا نقش قدم پڑ جائے اسے سمجھنا چاہیے کہ نصیب باگ اٹھا۔

۱۸۔ شرح : اس صحرا کی گرد کا ذرہ سو بج کے لیے نغز و ناز کا آئینہ

ہے اس صحرا کی گرد اُمید کے لیے بہار کا جامہ احرام ہے۔

مطلب یہ ہے کہ صحرائے نجف کا ذرہ سو بج کے لیے مایہ ناز ہے

اور وہاں کی گرد اُمید کے لیے بہار کا سامان ہے۔

۱۹۔ شرح : آفریش : پیدائش، تخلیق، کائنات۔

خمیارہ : انگڑائی۔

شرح : تخلیق و پیدائش کو اس صحرا سے مستی ناز کی طلب ہے۔ یعنی پوری کائنات سراپا طلب بنی ہوئی ہے کہ نجف کی خاک پاک سے اسے مستی ناز حاصل ہو اور صحرا سے نجف سے عبار کی جو لہرائے رہی ہے، وہ پیدائش کی انگڑائیاں پیش کر رہی ہے۔

مطلب یہ کہ جب نشہ اترتا ہے اور پیئے والے پر غماز طاری ہوتا ہے تو جسم ٹوٹتا ہے اور انگڑائیاں آتی ہیں۔ کائنات ہمیشہ مستی ناز صحرا سے نجف کی خاک سے طلب کرتی رہی۔ یہ طلب اب بھی باقی ہے اور اس کا نشہ اتر جانے کی انگڑائیاں موج غبار کی شکل میں پیش ہو رہی ہیں۔

مطلع ثانی

۲۰۔ لغات - شبستان : رات بسر کرنے کی جگہ۔

شرح : اے حضرت! آپ ہی ہمارے شبستان کی شمع ہیں اور آپ ہی کے فیق سے پروانے کا دل چراغاں اور بیل کے بال پر گلزار ہو رہے ہیں۔ پروانہ شمع کا عاشق و طالب ہوتا ہے، اس کا دل چراغاں بن گیا، گویا جو کچھ مطلوب تھا، اسے مل گیا۔ بیل کو بیل کی آرزو رہتی ہے، اس کے بال پر چمن زار بن گئے، گویا وہ بھی سراد کو پہنچ گئی۔ شاعر کا مقصد یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کا مطلوب حضرت علی کے فیض حاصل ہوتا ہے۔

۲۱۔ **شرح :** اے حضرت! آپ کے جلوے کے ذوق اور آپ کے دیدار کے شوق میں آئینہ خانہ بھی مور کی طرح اڑنے لگے۔

آئینہ خانے کی پرواز کو مود سے تشبیہ اس لیے دی کہ اس کے پروں کے نقش و نگار آئینے کی طرح ہوتے ہیں، جب وہ اٹھتا ہے تو دیکھنے والے کو معلوم ہوتا ہے، بہت سے آئینے اڑے جا رہے ہیں، گویا آئینہ خانے کے پرواز

کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

۲۲۔ **شرح :** اے حضرات! آپ کی اولاد کے علم میں آسمان پر جاں

ستاروں کی لڑی میں پیدا ہوا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسی مشہور ہے جس سے موتی برس رہے ہیں۔ ماو لاکو مشہور گوہر بار اس لیے کہا کہ وہ روتا ہے۔ چونکہ حضرت مٹی کی اولاد کے علم میں روتا ہے، اس لیے آنسو موتی بنتے جاتے ہیں اور انہیں موتیوں سے ستاروں کی لڑیاں پروئی گئیں۔

۲۳۔ **لغات :** مُرغاز : وہ چیز جو سجدے کے مقام پر رکھ لی جاتی ہے اور عموماً خاک کر ہلکی لکھیا جاتی ہے۔

ہجم : دواؤں مصرعوں میں اس کے معنی ہیں نیز، بھی۔

ریاضت : زہد، پرہیزگاری، روحانی منزلیں طے کرنے کے لیے

ذکر و فکر میں انہماک، عام معنی درخش اور گہمت بھی ہیں۔

استظہار : پشیمانی، پشت پناہی، امداد۔

شرح : اے حضرت! آپ کا نقش قدم عبادت میں مُرغاز ہے یعنی

اسی پر سجدہ کیا جاتا ہے اور ریاضت کی پشیمانی بھی آپ کی حوصلہ افزائی سے ہوتی ہے۔

آپ کی ذات بابرکات کو دیکھ کر یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے، کہ ریاضت

کی جائے۔

۲۴۔ **شرح :** اے حضرت! آپ کی مدح میں رسول اللہ (صلعم)

کی نعمت کا ترانہ چھپکا ہوا ہے اور آپ ہی کے جامِ ضیغ سے پوشیدہ بھیدوں کی شراب اُبلتی ہے۔

مطلب یہ کہ آپ کی منفیت بجا تھے خود رسول اللہ (صلعم) کی نعمت

ہے، کیونکہ آپ حضور کے وصی اور محبوب ہیں اور آپ کے ضیغ کا پالہ اُس

شراب سے بھرا ہوا ہے، جو روحانیت کے پوشیدہ بھید آشکارا کرتی ہے۔

۲۵۔ شرح : پہلے مصرع میں "جو ہر دست دعا آئندہ" دراصل "جو ہر آئندہ دست دعا" تھا، جسے مصرع میں لانے کی غرض سے یہ تدبیر اختیار کی گئی کہ "آئندہ" دو مہینوں سے اٹھا کر آخر میں ڈال دیا گیا۔

شرح : دست دعا کے آئینے کا جو ہر تاثیر ہے، یعنی جو دعا کی باقی ہے، وہ قبول ہوتی ہے، کیونکہ اثر رکھتی ہے۔ دعا خلوص سے کی جائے تو انسان بے اختیار رونے لگتا ہے، لیکن یہ رونا مسرگام کے لیے باعث ناز ہوتا ہے۔ اس لیے کہ بارگاہِ باری تعالیٰ میں مشرف قبول حاصل کرتا ہے۔ پھر یہی اثر ہے، جو حسرت و پریشانی کے کانٹوں کا علم دل سے نکال دیتا ہے۔ کیونکہ دعا کا شرف قبول پانا ہی حسرت و پریشانی کو ناکس کر دیتا ہے۔

۲۶۔ لغات - عزرا خانہ : ماتم کرنے کی جگہ۔

شرح : اسے حضرت ابو آئندہ آپ کی خاک و رکو آئینہ بنا کر سامنے نہ رکھتے، اس کی نگاہ آنکھ کی پتلی سے اقبال کا ماتم کدہ بن جائے۔

مطلب یہ ہے کہ وہ نگاہ سعادت و اقبال سے محروم ہو جائے۔ آنکھ کی پتلی سیاہ ہوتی ہے، اس لیے اسے ماتم کا گھر بنا دیا۔ آئینہ دار کے معنی خادم کے بھی ہوتے ہیں، یعنی وہ خادم، جو آقا کے سامنے آئینہ رکھتا ہے، یہ مطلب بھی یہاں درست ہے، لیکن آئینہ بنا کر سامنے رکھنا زیادہ موزوں ہے۔

۲۷۔ شرح : جو شخص اہل بیت کا دشمن ہو، خدا کرے، اس دنیا کے عشرت کدے میں اس کے لیے دیوار کا ہر طاق سیلاب کی انگڑائی کی تصویر بن جائے۔

مطلب یہ کہ ہر طاق دیوار سے سیلاب اٹھے اور اس کے عشرت کدے کی اینٹ سے اینٹ بھاوے۔

۲۸۔ لغات - راقم : لکھنے والا۔ یعنی اسد یا غالب

سرشار : لبریز جب کوئی پیادہ وحیزہ اتنا بھر جائے کہ کناروں سے

بنے گئے تو اسے سرشار کہتے ہیں۔

شرح : استمداد اللہ اللہ سے دل تک پر تو شوق کا ایک آئینہ بنا ہوا ہے، یعنی دیدہ و دلجو و ناز انگیز شوق میں جیاب ہیں اور حقیقت کی شراب سے میرا پیالہ آخری نقطہ تک باب بھر اٹھا ہے۔

(۲)

امیر المؤمنین حضرت علیؑ کی منتقبت میں !

وہر جز جلوة یتانی معشوق نہیں
 ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود ہیں
 بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ فوق
 بے کسی ہائے تماشا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
 ہرزہ ہے نغمہ زیر و بم ہستی و عدم
 لغو ہے آئینہ فرقی جنوں و تمکیں !
 نقش معنی ہمہ نغیازہ عرض صورت
 سخن حق ہمہ پیمانہ ذوقی تخسیں

۱۔ شرح :
 کائنات اس کے
 سوا کیا ہے کہ
 محبوب حقیقی کی
 یتانی دیگانگی
 کا ایک پر تو
 ہے ؟ اگر اس
 کے حسن میں خودی
 کی آرزو نہ ہوتی
 تو ہم کیونکر وجود
 پاتے ؟ یعنی محبوب

حقیقی نے اپنے
کمالِ حسن کی نشانی
کے لیے یہ کائنات
پیدا کی اور یہ
آئینہ ہے جس
میں اس کا عکس
پڑ رہا ہے۔

ایک مشہور
قول ہے، جو بطور
حدیث پیش کیا
جاتا ہے، اُنھن
کنزاً مغنیاً صاحب
عن اعراف خلقت
الخلق بکل اعراف
میں ایک پوشیدہ
خزانہ تھا۔ میں
نے پسند کیا کہ اس
کی معرفت و
شنا سائی ہو، یعنی
اسے پہچانا جائے
چنانچہ میں نے
مخلوق پیدا کی،
ہیماں تک کہ

لاب وانش خلط و نفع عبادت معلوم
فردیک سازِ خلقت ہے چہ دنیا و چہ دیں
مثلِ مضمونِ وفا باد بہ دستِ تسلیم
صورتِ نقشِ قدمِ خاک بہ فرقِ تمکین
عشقِ بے ربطی شیرازہ اجزائے حواس
وصلِ زنگارِ رُخ آئینہ حسنِ یقین
کرہ کن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بے ستوں آئینہ خوابِ گرانِ شیریں
کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتشِ خیز؟
کس نے پایا اثرِ نالہ دل ہائے حزیں؟
سامعِ زمزمہ اہلِ جہاں ہوں لیکن
نہ سردِ برگِ ستائش نہ دماغِ نفیس
کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذُ ابالہ
یک قلمِ خارجِ آدابِ وقار و تمکین
نقشِ لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر
یا علی عرض کر اے فطرتِ وسواسِ قوس؟

منظرِ فیضِ خدا جانِ دہلی ختمِ رسل
 قبلہ آلِ نبی کعبۂ ایبادِ یقین
 ہو وہ سرمایہٴ ایبادِ جہاں گرمِ خرام
 ہر کعبہ خاک ہے وہاں گردہٴ تصویرِ زمیں
 جلوہ پرواز ہو نقشِ قدم اس کا جس جا
 وہ کعبہ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی ایں
 نسبت نام سے اس کی ہے یہ رتبہ کہ رہے
 ابد اُپشتِ فلک عم شدہٴ نازِ زمین
 فیضِ خلق اس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا
 بوئے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگین
 برشِ تیغ کا اس کی ہے جہاں میں چرچا
 قطع ہو جائے نہ سرِ رشتہٴ ایبادِ کہیں
 کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
 زنگِ ماسق کی طرح رونقِ بت خانہٴ چیں
 جہاں پناہ! اولِ وہاں فیضِ رسا نا! شاہ!
 وصی ختمِ رسل تو ہے یہ فتوائے یقین

میں پہچان گیا
 شہر میں ہی معجز
 باغیا گیا ہے۔
 مولانا طہطائی
 فرماتے ہیں: تصوف
 کا ایک مسئلہ بھی
 ہے کہ حقائقِ ملکوت
 کو ذاتِ واجب
 الوجود سے وہی
 تعلق ہے، جو
 آفتاب کو اجسام
 سے ہے۔ ہر جسم
 میں جیسی قابلیت
 ہوتی ہے، اسی
 کے مطابق آفتاب
 کا نور اس میں
 پہنچتا اور منعکس ہوتا
 ہے۔ مثلاً سپاہ
 پتھر میں نور کا فیضان
 بہت کم پہنچتا ہے
 اور آئینے میں پورا
 آفتاب اثر آتا
 ہے۔ اسی طرح

جہم اظہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر
 نامِ نامی کو ترے ناصیہ عرشِ نگین
 کس سے ممکن ہے تیری مدح بغیر از واجب
 شدہ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں
 آستان پر ہے ترے جوہرِ آئینہ سنگ
 رقم بندگی حضرتِ جبریلِ امین
 تیرے در کے لیے اسبابِ نثار آمادہ
 خاک یوں کو جو خدا نے دینے جانِ دل و دین
 تیری مدحت کے لیے میں دل و جان کام و زباں
 تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبین
 کس سے ہو سکتی ہے مداحیِ ممدوحِ خدا!
 کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں!
 جنسِ بازارِ معاصی اسد الشداصد
 کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں
 شوخیِ عرصِ مطالب میں ہے گستاخِ طلب
 ہے تیرے حوصلہ فضل پر از بس کہ یقین

ممکنات میں بھی
 وجود واجب کا
 جلوہ پہنچ رہا ہے
 اور پوری کائنات
 اسی وجود کا پر تو
 ہے اگر اس وجود
 کو اپنا پر تو دیکھنا
 نہ ہوتا تو ہماری
 تخلیق کیوں ہوتی
 سمجھنا یہ چاہیئے
 کہ دنیا کی ہر شے
 قدرتِ باری تعالیٰ
 کا مظہر ہے اور
 یوں پوری کائنات
 کو اس کی خود بینی
 کا آئینہ قرار دیا
 جاسکتا ہے۔

۲۔ شرح
 ہم نے کائنات کا
 نظارہ انتہائی بیدل
 سے کیا۔ نتیجہ یہ
 نکلا کہ اس
 نظام سے

وے دعا کو مری وہ مرتبہ حسن قبول
 کہ ابابت کہے ہر حرف پر سو بار آمین
 غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز
 کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں
 طبع کو الفتِ دلدل میں یہ سرگرمی شوق
 کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ جیسے
 دل الفتِ نسب و سیدہ تو حیدِ فضا
 نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں
 صرف اعدا اثرِ شعہ دودِ دوزخ
 وقفِ احباب گل و سنبلِ فردوس بریں

کوئی حقیقت حاصل
 کیا نہ کوئی نصبت
 پائی اور نہ کچھ لطفت
 اٹھایا۔ اسی طرح
 ہماری کتاب سے
 دوسرے بکس اور
 لاچار رہی کہ نہ اس
 نے دنیا حاصل کی،
 نہ دین کا فیض اٹھایا،
 اگر عبرت حاصل
 کرتے تو دنیا دار
 بن جاتے۔ اگر لطفت
 اٹھاتے تو دنیا ل
 جاتی، لیکن ہم دونوں
 سے محروم رہے۔

شاعر کا مقصد یہ ہے کہ اگر انسان کائنات پر طبیعت حاصل کرنے کی غرض
 سے نظر ڈالے تو اس نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ آبی اعدائی ہے۔ اس میں کوئی ثبات
 استقلال نہیں۔ اس میں ہر لمحہ تغیر جاری ہے اور تغیر بے ثباتی کی دلیل ہے،
 لہذا انسان کو چاہیے کہ کائنات کے بجائے محبوبِ حقیقی سے ٹو دگائے۔ یہی
 دین حق ہے۔ اگر کائنات کو محض لطفت و لذت حاصل کرنے کی غرض سے دیکھا
 جائے تو یہاں اس کے لیے بھی ہر طرف سامانِ پھیلے ہوئے ہیں۔ انسان جتنا لطفت
 چاہے، اٹھائے، مگر وہ اپنے مقصد سے قائل ہو جائے گا اور انسانی شرف
 کھو بیٹھے گا۔ ہر حال میں نظارے میں نہ عبرت ہو، نہ ذوق، وہ بیدار کی دلیل

ہے۔ جس تئیں دنیا باندھ آئے، وہ دین، اس کے بے سرو پا ہونے میں
کے کام ہو سکتا ہے ؟

۳۔ لغات : ہرزہ : فعل، بیکار، بے سود

ذیر و بزم : بچا اور ادبچا ستر۔

تیکین : جھاڑ، بھڑاڑ، ہوشیاری۔

شرح : وجہ، باری تعالیٰ کے سوا کسی اور کی ہستی یا نیستی کے اونچے

نکالنا بالکل بے سود اور بیکار ہے۔ ذکرِ باری تعالیٰ کے سوا دیوانگی اور ہوشیاری
میں فرق و امتیاز کا آئینہ دکھانا سراسر لغو ہے۔ یعنی کائنات کی ہستی اور نیستی
کاملاً اس لائق ہی نہیں کہ کوئی اس میں وقت صرف کرے، کیونکہ امر حقیقی ذات
باری تعالیٰ ہے اور میں۔

مطلب : کہ باری تعالیٰ کا ذکر نہ ہو تو یہاں جو کچھ ہے، اس کی دیوانگی اور

ہوشیاری میں امتیاز کی کون سی وجہ ہے ؟ جو ذکر سے غافل ہے، وہ سراسر دیوانہ
ہے اور جو ذکر سے غافل نہیں، صرف اسے ہشیار سمجھا جا سکتا ہے۔ گویا، اس
بارے میں امتیاز کا پیمانہ صرف ذکر ہے۔

۴۔ لغات : خمیازہ : انگڑائی۔

شرح : جو لوگ معنی شناسی کے مدعی ہیں، وہ صرف ظاہر داری میں الجھے

ہوتے ہیں گویا ان کی معنی شناسی سراسر ظاہری ناقص کی ایک انگڑائی ہے۔ اس
طرح جو لوگ حق گو ہیں، انہیں بھی تخمین و اڑن کا ذوق ہے، یعنی وہ بھی یکے
اسی ذوق کا پیانہ بنے ہوئے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ اچھی باتیں وہی کہی جا سکتی ہیں، جو تحریر و تقریر میں نمود

، یہ کے لوٹ سے پاک ہوں۔ حقیقی معنی شناسی وہی ہے، جس میں ظاہر داری

کا کوئی نشانہ نہ ہو اور حق گوئی وہی ہو سکتی ہے، جس کے لیے کسی سے مدح و ستائش
کی منتظر نہ رہیں اور دل ایسی تماشے بالکل خالی ہو۔

۴۔ لغات : دُردو : تلخیص

شرح : جو بھی دنیا کے معاملات میں عقل و دانش کا دعویٰ کرتا ہے، اسے سراسر غلط سمجھنا چاہیے اور جو بھی عبادت سے غافلہ کی امید رکھتا ہے، وہ بھی بیچ ہے۔ دنیا جو یارین، ہم نے دونوں کو غفلت کے پیالے کی تلخیص بتا دیا ہے۔

تلخیص کوئی نہیں مینا، بلکہ وہ پھینک دی جاتی ہے۔ گو یا ہماری دنیا جو یا دین، دونوں ہمارے ہاتھوں خراب ہیں، کیونکہ نہ ہمیں حقیقتِ معاملات دنیا کا صحیح شعور ہے اور نہ ہماری عبادت کا وہ رنگ ہے، جو پیدا کرنا لازم ہے۔

۶۔ لغات - باد بدست : خالی ہاتھ

تسلیم : رضا - بندگی۔

شرح : جس طرح فساداری سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، اسی طرح رسی رضا و بندگی بھی انسان کو خالی ہاتھ رکھتی ہے۔ نقیض قدم کو پاؤں دار و استوار مانا جاتا ہے، لیکن اس کی حیثیت اس کے سوا کیا ہے کہ پامال ہوتا ہے، ذلت اٹھاتا ہے اور اس کی پاؤں داری کے سر پر خاک پڑتی ہے۔

۷۔ شرح : ہمارے زمانے میں اہل ہوش و خرد کے نزدیک عشق

اس کا نام ہے کہ اجزائے حواس کا شیرازہ درہم برہم ہو جائے، انی انسان ہوش و حواس کو بیٹھے۔ محبوب کا وصل حسن یقین کے آئینے پر رنگار کی حیثیت رکھتا ہے۔

دوسرے صرح کا مطلب یہ ہے، دل میں حسن یقین موجود ہو تو اپنے آئینے میں ایسی چمک دمک پیدا کر لیتا ہے کہ محبوب کا جلوہ بے تکلف نظر آئے۔ اگر وصل حاصل ہو جائے تو وہ اس آئینے کے لیے رنگ بن جاتا ہے اور اس کی آب و تاب زائل ہو جاتی ہے۔

۸۔ لغات : گرُسٹ : مجھو کا۔

بے ستون : ایران کا وہ پہاڑ جس کے متعلق مشہور ہے کہ فرزاد نے باغ شیریں کے لیے دودھ کی ہنر لانے کی غرض سے کاٹا تھا۔

شرح : ہم فرزاد کے دعوے عشق کے قائل نہیں۔ وہ تو ایک مزدور تھا، جو روزی کی خاطر اپنے رقیب یعنی خسرو پرویز کی عشرت گاہ کے لیے عنت مشقت کرتا، اور اس کی محبوبہ شیریں کی غفلت و بے پروائی کا یہ عالم کہ بے ستون پہاڑ گرایا اس کی گہری نیند کا ایک آئینہ تھا۔

پورا شعر اس مشہور قصے پر مبنی ہے کہ فرزاد خسرو پرویز شہنشاہ ایران کی محبوبہ تغتازی بیوی شیریں پر عاشق ہو گیا تھا۔ اسے دوسری طرف مائل کرنے کی غرض سے یہ منصوبہ تیار کیا گیا کہ فرزاد سے کہا جائے، اگر وہ پہاڑ کاٹ کر شیریں کے باغ کے لیے ہنر لے آئے تو شیریں اسے مل جائے گی۔ یہ باغ خسرو پرویز کا تھا۔ عام روایت کے مطابق فرزاد نے پہاڑ کاٹ کر ہنر باغ تک پہنچا دی۔ گویا اس کی طرف سے شرط پوری ہو گئی۔ اب اس سے نجات حاصل کرنے کی تدبیر یہ سوچی گئی کہ ایک بڑھیا کی زبانی کہلا بھیجا، شیریں مر گئی یہ سنتے ہی فرزاد بھی سر پر تمیہ مار کر ختم ہو گیا۔

مرزا کہتے ہیں، بھلا یہ عشق کی کون سی صورت ہے کہ رقیب کی عشرت گاہ کے لیے مزدوری کی جائے اور اس طرح بھوک مٹائی جائے؟ دوسری طرف شیریں کی غفلت کا یہ عالم کہ اسے کچھ خبر ہی نہیں۔ گویا گہری نیند میں سوئی چلی ہے اور نیند بھی ایسی، جو بے ستون پہاڑ کی طرح ٹوٹنے نہ پائے۔

۹۔ شرح : خوب حیران ہیں کرو اور دیکھو کہ اہل وقایہ سے کوئی شخص ایسا ہے، جس کے سامنے یا آہ سے آگ بھڑکتی ہو، کیا کسی نے غلگیں دلوں کی مزید وفتان میں اثر پایا ہے؟

گویا اہل وفاق ہیں سب رتے ہیں اور ان سے کسی کے دل میں آگ نہیں لگتی۔ غم کے مارے ہوئے فرزاد کرتے ہیں اور اس کا اثر کسی پر نہیں ہوتا۔

۱۰۔ لغات - سامع : سنے والا۔

شرح : میں دنیا والوں کے ذمے سنتا ہوں، لیکن نہ کسی کے لیے میرے پاس مدح و ستائش کا سامان ہے، نہ کسی کے خلاف اظہارِ نفرت کی زحمت اٹھا سکتا ہوں۔

۱۱۔ لغات - سہرہ سرا : ہیروہ گو، بے سرو پا باتیں کرنے والا۔

عیاذاً باللہ : خدا کی پناہ۔

یہ شعر گریز کا ہے۔

شرح : پناہ بخدا، میں کس قدر بے سرو پا باتیں کر رہا ہوں، جو عزت و تمکنت کے آداب سے بالکل خارج ہیں ! لہذا اب اُس امر کی طرف پلٹنا چاہیے جو حقیقتاً ذکر کے لائق ہے۔

۱۲۔ لغات : نقش : تعویذ۔

تبدیلیاں تحریر : بے جوڑ باتیں لکھنے والا۔

وسواسِ قریب : جو دوسووں کے نزدیک ہو۔

شرح : اسے بے جوڑ باتیں تحریر کرنے والے تلم الا حول کا تعویذ لکھو اور اسے فطرتِ جو دوسووں کے دائرے میں پہنچی ہوئی ہے یا اعلیٰ کر۔
لا حول کا خاصہ ہی یہ ہے کہ شیطانی دوسووں کو ذرا نکل کر دے اور یہی خاصہ غالب کے نزدیک یا علی کا ہے۔

۱۳۔ شرح : وہ علیؑ، جو فیضِ خدا کے منظر ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کا

فیض ان کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جو رسولوں کے خاتم رسول اللہ (صلعم) کے جان و دل یعنی عزیز ہیں۔ وہ علیؑ جو آلِ رسول کا قبہ ہیں، یعنی گیارہ امام انہیں کی نسل سے ہیں۔ وہ علیؑ، جو یقین کی ایجاہ کا کعبہ ہیں یعنی کعبہ یقین ہیں۔

کعبہ یقین میں غالباً یہ روایت پیش نظر رکھی : لو کشف العطاء لما ازددت یقیناً اگر صحابہ میری آنکھوں کے سامنے سے اٹھا دیے عایشؓ تو فواتِ باری تعالیٰ

پر میرے یقین میں نہ بھر سکتا نہ ہوگا، یعنی میرے یقین اب بھی ایسا ہی ہے جیسا چھوٹے جاننے والے اور بے حسد و حسد

دیندے مشرف ہونے پر ہو سکتا ہے۔

۱۴۔ لغات : ایجاد : تخلیق کائنات، جہاں کا پیدا کرنا۔

گردہ : خاک، جو مسطور تیار کر لیتے ہیں، پھر اس میں رنگ بھر کر تصویر بنا لیتے ہیں۔

شرح : حضرت علیؑ کا مقدس وجود اس جہاں کا سرمایہ ہے۔ وہ جہاں بھی گرم خرام ہو، وہاں خاک کی ہر مٹی ایک نئی زمین کی تصویر کا خاک بنتی جائے گی۔

۱۵۔ شرح : حضرت علیؑ کا نقش قدم جس جگہ جلوہ دکھائے، خاک کی وہ مٹی دونوں جہانوں کی عزت کی امین بن جائے۔

۱۶۔ لغات : ابداً : ہمیشہ کے لیے۔

شرح : حضرت علیؑ کے نام کی نسبت سے زمین کو یہ رتبہ ملا کہ اس کے ناز اٹھانے کی غرض سے آسمان ہمیشہ کے لیے جھک گیا۔ گویا آسمان کے جھکاؤ کا مقصد یہ ہے کہ زمین کے ناز اٹھائے، کیونکہ اس نے حضرت علیؑ کے نام سے نسبت پائی۔

یہ اشارہ حضرت علیؑ کی مشہور کنیت ”ابو تراب“ کی طرف ہے، ابو تراب اور تراب، خاک۔

مطلب یہ کہ حضرت علیؑ کی کنیت ”ابو تراب“ ہوئی تو زمین کا رتبہ اتنا بلند ہو گیا کہ آسمان اس کے ناز اٹھانے کی خاطر ہمیشہ کے لیے جھک گیا۔

۱۷۔ لغات : عطر آگئیں : عطر سے بھرا ہوا، معطر۔

شرح : حضرت علیؑ ہی کے فیض خلق کا یہ اثر ہے کہ صبح کی ہوا پھولوں کی خوشبو سے معطر ہوتی ہے۔

۱۸۔ لغات : برش : کاٹ۔

شرح :- دنیا میں حضرت علیؑ کی تلوار یعنی ذوالفقار کی کاٹ کا چرچا

عام ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس دنیا کا سررشتہ حیات ہی کٹ جائے۔

۱۹۔ **شرح :** حضرت علیؑ کا جلوہ اس طرح کفر کو ہلا کر رکھ دیتا ہے کہ اگر اس کا پر تو پین کے بُت خانے پر پڑے تو اس کی رونق اور چہل پہل عاشق کے رنگ کی طرح زائل ہو جائے۔

معلوم ہے کہ عاشقوں کا رنگ ہمیشہ اڑا رہتا ہے۔ اسی طرح چین کے بُت خانے کی رونق بھی اڑ جائے گی۔

۲۰۔ **لغات :** وصی : حضرت علیؑ کا مشہور لقب، جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے لیے رسول اللہ (صلعم) نے خاص وصیت فرمائی۔

شرح : اے جان کی پناہ گاہ ! اے دل و جان کو ضیق پہنچانے والے ! اے شاہ ابلیس آپ یقین کے فتوے کی بنا پر خاتم الانبیاء یعنی رسول اللہ (صلعم) کے وصی ہیں۔

۲۱۔ **شرح :** شعر میں اس روایت کی طرف اشارہ ہے کہ فوج مکہ کے بعد رسول اللہ (صلعم) خانہ کعبہ میں تشریف لائے تو حضرت علیؑ کو مکہ دیا کہ جو بُت اونچے رکھے ہوئے ہیں، وہ میرے کندھوں پر چڑھ کر توڑ ڈالو۔

شرح : اے حضرت ! آپ کے پاک جسم کے لیے رسول اللہ (صلعم) کا دو عجل مبارک منبر بنا اور آپ کے نام نامی کے لیے عرش کی پیشانی بن گئی۔ یعنی عرش کی پیشانی پر یہ نام کندہ ہے۔

۲۲۔ **لغات :** واجب : باری تعالیٰ۔

آئین باندھنا : آئین بستن کا ترجمہ ہے جس کے معنی ہیں زیب و زینت پہنا۔

شرح : اے حضرت ! آپ کی مدح صرف باری تعالیٰ ہی سے ممکن

ہے۔ سچ ہے، شمع کا شعلہ ہی شمع کے لیے زیب و زینت اور فروغ کا باعث ہوتا ہے۔

شعلے سے مراد ذات باری تعالیٰ ہے اور شمع حضرت علیؑ۔ شمع شعلے کے

بغیر روشن نہیں ہو سکتی۔ باری تعالیٰ کے شعلے نے اسے روشن کیا اور وہی شعلہ شمع کے لیے ذیبت و زینت کا باعث ہے۔

پہلے مصرع میں ”مکن“ کی رعایت سے ”مواجب“ لایا گیا، ورنہ اس کی اور صورتیں بھی ہو سکتی تھیں۔

۲۴۔ شرح : اے حضرت! آپ کی چوکت پر جو پتھر لگا ہوا ہے اسے آئینہ فرما کر دیا جائے تو اس کے جوہر حضرت جبریل امینؑ کی فرمانبرداری کی تحریریں ہیں۔

ہر آئینے میں جوہر ہوتے ہیں۔ حضرت علیؑ کے سنگِ آستان کا جو آئینہ ہے، اس میں جوہروں کے بجائے یہ تحریریں درج ہیں کہ حضرت جبریلؑ حضرت علیؑ کے فرمانبردار اور اطاعت گزار ہیں۔

۲۴۔ شرح : اے حضرت! دوئے زمین پر بلند والے النافذ کو خدا نے جو جان و دل و دین عطا کیے، وہ ہر لحظہ آپ کے دروازے پر بجا رہے ہوئے کے لیے آزاد ہیں۔

۲۵۔ شرح : اے حضرت! دل، جان، منہ اور زبان صرف آپ کی مدح سرائی کے لیے ہیں۔ تختی اور قلم، ہاتھ اور پیشانی کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو سلام کرتے رہیں۔

دوسرے مصرع کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ لوح و قلم آپ کے سلام کے لیے ہاتھ اور پیشانی بن گئے ہیں۔ اس صورت میں قلم کو ہاتھ اور لوح کو پیشانی قرار دیا۔ گویا یہ لفظ و نشر غیر مرقب ہے۔

آخری مفہوم کے مطابق لوح سے مراد لوح محفوظ اور قلم سے مراد قلم قدر ہے یعنی تعاضد قدر۔

۲۶۔ شرح : جس کی تائش خدا نے کی ہو، اس کی تائش کس سے ہو سکتی ہے؟ کیا فردوسِ بری کی آرائش بھی کوئی کر سکتا ہے؟

مطلب یہ کہ فروس برس آرائش اور زیبائش کی آخری منزل ہے پھر اس میں کوئی نئی آرائش کیا کرے گا ؟ اسی طرح حدودِ خدا کی حد میں کوئی کیا کرے گا ؟

۲۷۔ لغات - معاصی : معصیت کی جمع۔ گناہ۔

شرح : اسد اللہ اسد گناہوں کے بازدار کی جنس ہے۔ اے حضرت ! وہ اس درجہ ناچیز ہے کہ آپ کے سوا اس کا کوئی گناہک اور کوئی پوچھنے والا نہیں یعنی آپ ہی کے وسیلے سے اس کے گناہ مہات ہو سکتے ہیں۔

۲۸۔ شرح : اے حضرت ! میں (اسد) اپنے مطالب شوخی کے ساتھ پیش کرتا ہوں طلب میں جسارت سے کام لے رہا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ مجھے آپ کے لطف و کرم کی وسعت پر پورا بھروسہ ہے۔

۲۹۔ لغات - اجابت : قبول

شرح : اے حضرت ! میری دعا کو حسن قبول کا وہ مرتبہ عطا فرمائیے کہ اس کے سرخوش پر خود قبول سو مرتبہ آئیں سکے۔

۳۰۔ شرح : حضرت امام حسینؑ کا غم میرے سینے میں اس قدر بھرا رہے کہ خوبی و برکت میری آنکھیں ہمیشہ رنگین رہیں۔

۳۱۔ لغات - دُلْدُل : ایک چکر کا نام تھا، اسکو سکندریہ کے حاکم نے رسول اللہ (صلعم) کو بطور ہدیہ بھیجا تھا اور آپ نے حضرت علیؑ کو عطا فرما دیا۔

شرح : میری طبیعت پر دلدل کی محبت میں شوق کی سرگرمی کہ یہ کیفیت طاری ہے کہ جہاں تک وہ پہنچا جائے اس کا قدم جو اور میری پیشانی یعنی اس کا ہر قدم میری پیشانی پر پڑے۔

۳۲۔ لغات - دَلَّی الْفَتْلُ نَسَبٌ : وہ دل جسے الفت سے

نسبت ہو۔

سینہ توحید قضا : وہ سینہ جس کی نفا توحید ہو ، یعنی توحید سے

لبریز ہو۔

صدق گز بس ۔ سچائی اختیار کرنے والا۔

شرح : دوزخ کی آگ اور اس کا دھواں دشمنوں پر صرف ہو ، فردوس

بریں کے پھول اور سنبل دوستوں کے جھٹے میں آئیں۔

اس شعر میں صنعت ، تقابلی کمال پر پہنچا دی ہے ۔ دیکھیے ، صرف کے مقابلے

میں وقت ، اعداد کے مقابلے میں احباب ، شعلے کے مقابلے میں لگی ، دوزخ کے

مقابلے میں سنبل ، دوزخ کے مقابلے میں فردوس بریں۔

(۳)

بہادر شاہ کی مدح میں

ہاں مہ نورسین ہم اس کا نام جس کو توحک کے کر رہا ہے سلام

دودن آیا ہے تو نظر دم صبح یہی انداز اور یہی اندام

بارے دودن کہاں رہا غائب؟ بندہ عاجز ہے گردشِ ایتام

اڑکے جاتا کہاں کہ تاروں کا آسماں نے بچھا رکھا تھام

مرحبا اے سرودِ خاص خواہی! جذبا اے نشاطِ عام عوام

عذر میں تین دن نہ آنے کے
 اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا
 ایک میں گیا کہ سب نے جان لیا
 رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے
 جانتا ہوں کہ آج دنیا میں
 میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
 جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو
 مہرِ تاباں کو ہو تو ہوا اے ماہ !
 لے کے آیا ہے عید کا پیغام
 صبح جو جائے اور آئے شام
 تیرا آواز اور تیرا اعجاز
 مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں تمام
 ایک ہی ہے امید گاہِ انام
 غالب اس کا مگر نہیں ہے غلام
 تب کہا ہے بہ طرزِ استغنام
 قرب ہر روزہ برسبیلِ دوام

ق

تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا
 جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو
 ماہ بن ، ماہ تاب بن ، میں کون ؟
 میرا اپنا جدا معاملہ ہے
 ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص
 جز بہ تقریبِ عید ماہِ صیام
 پھر بتا چاہتا ہے ماہ تمام
 مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام
 اور کے لین دین سے کیا کام
 گر تجھے ہے امید رحمتِ عام

جو کہ بخشے گا تجھ کو فرّ و فروغ کیا نہ دے گا مجھے مئے گلنار؟
 جب کہ چودہ منازلِ فلکی کہ چکی قطع تیری تیزی گام
 تیرے پر تو سے ہوں فروغ پذیر کوئے و مشکوئے و صحن و منظر و بام
 دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز اپنی صورت کا اک بلوریں جام
 پھر غزل کی روش پر چل نکلا تو سن طبع چاہتا تھا لگام

غزل

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام؟
 مے ہی پھر کیوں نہ میں پیئے عبادوں غم سے جب ہو گئی ہے زلیّتِ جام
 بوسہ کیسا؟ یہی غنیمت ہے کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ و شام
 کبھی میں جا بجائیں گے ناقوس اب تو باندھا ہے دیر میں احرام
 اس قدح کا ہے دورِ محبہ کو نقد چرخ نے لی ہے جس کے گوشِ ام
 بوسہ دینے میں ان کو ہے انکار دل کے لینے میں جن کو ہے ابرام

چھڑتا ہوں کہ ان کو غصہ آئے

کیوں رکھوں ورنہ غالب اپنا نام

کہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ
 کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
 تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن
 قبلہ چشمِ دل بہار شاہ
 شہسوارِ طریقہٗ انصاف
 جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز
 بزم میں میزبانِ قیصر و جم
 اے ترا لطفِ زندگی افزا
 چشمِ بدود! خسروانہ شکوہ
 جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ دم
 وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے
 زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے
 مرجاؤ شگافیِ نادک
 تیر کو تیرے تیرِ غیر بدت

اے پری چہرہ! پیکِ تیز خرام!
 ہیں مہم و مہر و زہرہ و بہرام!
 نامِ شاہنشہ بلند مقام
 مظہرِ ذوالجلال والا کرام
 نو بہارِ حدیقہٗ اسلام
 جس کا ہر قول معنیِ الہام
 رزم میں اوستا و رستم و سام
 اے ترا عہدِ فرخی فرجام
 لوحِ اشد! عارفانہ کلام
 جڑِ خواہوں میں تیرے مرشدِ جام
 ایرج و تور و خسرو و بہرام
 گیو و گودرز و بیزن و دہام
 آفریں آبِ دارِ نئی مصام
 تیغ کو تیری تیغِ خصمِ نیام

ق

رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند
برق کو دسے رہا ہے کیا الزام
تیرے فیل گراں حبد کی صدا
تیرے رخس بک عناں کا خرام

ق

فرق صورت گرمی میں تیرا گرز
اس کے معزوب کے سرو تن سے
جب ازل میں رقم پذیر ہوئے
اور اُن اوراق میں بہ کلب قضا
لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کش
آسمان کو کہا گیا کہ کہیں
حکم ناطق لکھا گیا کہ لکھیں
آتش و آب و باد و خاک نے لی
مہر رخشاں کا نام خسر و روز
تیری توفیق سلطنت کو بھی
کاتب حکم نے بموجب حکم
گر نہ رکھتا ہو دستگاہ تمام
کیوں نمایاں ہو صورت ادغام؟
صفحہ ہائے بیانی و ایام
مجلد مندرج ہوئے احکام
لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام
گنبد تیز گرد نیل و نام
خال کو دانہ اور زلف کو دام
وضیع سوز و غم و رم و آرام
ماوِ تاباں کا اسم شمع شام
دی بدستور صورت ارقام
اس رقم کو دیا طرازِ دوام

ہے ازل سے روانی آغاز
ہو ابد تک رسائی انجام !

(۲)

بہادر شاہ کی مدح میں

۱- تشریح : ۱۵، عید کے نئے چاند ! اُس کا نام بھی تو بتا دے مجھے
تو جبک جبک کر سلام کر رہا ہے ۔

نئے چاند میں ختم ہوتا ہے اور کوئی جبک کر سلام کرے تو اس کی صورت
ہلال جیسی ہو جاتی ہے ۔ اس لیے کہا ہلال جبک کر سلام کر رہا ہے ۔

۲-۳-۴- تشریح : تو دودن صبح کے وقت نظر آیا ۔ تیرا ہی انداز
تھا اور ایسا ہی نازک اور باریک تھا ، لیکن دودن کہاں غائب رہا ہے ہلال
جواب دیتا ہے کہ میں گردشِ ایام کی وجہ سے مجبور تھا ۔ اڑ کر کہاں چلا جاتا ،
آسمان نے تو تاروں کا جال بچھا رکھا تھا اور میرے لیے اڑنے کی گنجائش
ہی نہ تھی ۔

رمضان یا ہر قمری مہینے کی چھبیس تاریخ کو جمع کے وقت چاند دیکھتے
ہیں ۔ اگر نظر آجائے تو گمانِ غائب ہو جاتا ہے کہ اُنہیں کا چاند ہو گا ۔ اگر
تاریخوں کی تاریخ کو بھی نظر آجائے تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ مہینا تیس کا ہے اور
تیسوں کو نیا چاند طلوع ہو گا ۔ گویا نئے مہینے کا چاند دودن صبح کو بہت باریک
نظر آتا ہے اور دودن بالکل نظر نہیں آتا ۔ یہی معنوں میں رانے ان شعروں
میں پیش نظر رکھا ہے ۔ چاند نے بتا دیا کہ میں اُڑ کر تو کہیں جا نہیں سکتا تھا ، کیونکہ

تاروں کا جال موجود تھا، لیکن زمانے کی گردش کا طریق یہی ہے کہ نئے مجھے کے آغاز سے دور روزِ پیشتر صبح کو نظر آؤں اور اس سے دو دن پہلے ہلال کی شکل میں نظر آؤں۔

۵۔ ۸۔ لغات : حَبَّذَا : واہ وا۔

شرح : واہ وا اے خاص لوگوں کی خاص شادمانی، واہ وا اے عام لوگوں کی عام خوشی ! تین دن نظر آ یا اور اس غیر حاضری کے مدار میں عید کا پیغام لے کر آیا۔ بیگ جو صبح بائے اور شام آئے، اسے بھولا نہ کتنا چاہیے۔ تنہا مجھ پر موقوف نہیں، تیرا آغاز اور انجام سب پر روشن ہو گیا۔

ساتویں شعر کے متعلق مولانا طلبا طباطبائی فرماتے ہیں کہ کس لطف سے اس مثل کو موزوں کیا ہے کہ صبح کا بھولا شام کو آئے تو اسے بھولا نہیں کتے اور کس محل پر صرت کیا ہے۔ چھبویں یا تیشویں کی صبح کو چاند نکل کر صبر اتیشویں یا تیشویں کی شام کو دکھائی دیتا ہے۔ اس سے لطفِ کلام ظاہر ہے۔

۹۔ لغات - تمام : چٹخوڑ۔

شرح : اے ہلال ! تو اپنے دل کا بھید مجھ سے کیوں چھپاتا ہے؟ کیا مجھے چٹخوڑ سمجھ دیا ہے کہ تیری پیٹھ پیچھے وہ بھید ہر ایک سے کتنا چھروں گا؟

۱۰۔ لغات : انام : لوگ۔

شرح : میں جانتا ہوں کہ آج دنیا میں صرت ایک وجود ہے جس سے لوگوں کی امیدیں وابستہ ہیں۔

یہ شعر پہلے شعر کا جواب ہے، جس میں چاند سے پوچھا گیا تھا کہ تُو جس وجود کو حبیبِ حبیب کہہ سلام کر رہا ہے، اس کا نام کیا ہے؟ اسی کے متعلق چاند سے پوچھا تھا کہ دل کا بھید مجھے بتا دے، میں کوئی چٹخوڑ ہوں؟ آگے

پہل کر یہ حقیقت خود واضح کر دی ہے۔

۱۱۔ شرح : میں نے انا کو قرآن کے ایک وجود کا حلقہ نیلازکان میں ڈال رکھا ہے، لیکن کیا غالب اسی کا غلام نہیں؟ یہاں ہلال کو حلقے سے تشبیہ کر دی ہے۔

۱۲۔ لغات - برطرز استغنام : وہ سوال جو کسی بات کو سمجھنے کی غرض سے کیا جائے۔

شرح : میں جانتا ہوں، تو اس حقیقت سے واقف ہے کہ تیرا آقا اور میرا آقا ایک ہے، جیسی میں نے تجھ سے یہ سوال کیا، لیکن یہاں استغنام کو انکار ہی دیکھنا چاہیے، یعنی سوال سے مقصود اصل شے کا اثبات ہے، نہ کہ نفی۔

۱۳۔ لغات : برسیل دوام، ہمیشہ کے لیے۔

شرح : اے چاند! بادشاہ کی بارگاہ میں ہمیشہ کے لیے روشن آفتاب کو بار ہو تو ہو، مجھے اور تجھے تو یہ مرتبہ حاصل نہیں۔

۱۴۔ ۱۵۔ شرح : عبدالعزیز کی تقریب کے سوا حضور پر نور سے روشناس ہونے کا موقع کب ملتا ہے اور تجھے یہ منصب کہاں حاصل ہے؟ میں اتنا جانتا ہوں کہ تو بادشاہ سے فیض یاب ہو کر پورا چاند یعنی بدر بن جانا چاہتا ہے۔ تو چاند بن، چاند بن، میں پوچھنے والا کون ہوں؟ کیا تو جو انعام پانے کا اور بانٹ کر مجھے دے دے گا؟ میرا اپنا معاملہ الگ ہے، کسی اور کے عین دین سے مجھے کیا کام ہے؟

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ سارے قصیدے میں عموماً اور شہرۂ میں خصوصاً میرزا نے اردو زبان اور حسن بیان کی عجیب شان دکھائی ہے ایک مصرع میں :
تین جملے، جس کے مصنفوں سے رشک ٹپک رہا ہے۔ دوسرا مصرع طنز سے
صراحتاً ہے۔ چاروں جملوں میں حسن انشاء، پھر خوبی نظم اور بے تکلفی ادا !

۱۸۔ شرح : اگر تجھے عام لطف و کرم کی اُمید ہے تو مجھے خاص بخشش کی تمنا ہے ، یعنی ایسی بخشش جو میرے لیے خاص ہو اور اس سے تمام اُمیدیں بر آئیں۔

۱۹۔ لغات - قرۃ : شان ، شوکت ، روشنی

شرح : جو مبارک وجود تجھے دنیا کو منور کر دینے والی روشنی عطا کرے گی کیا وہ میرے لیے پھول کے سے رنگ کی شراب کا انتظام ذکر دے گا۔
۲۰۔ ۲۲۔ لغات : منازلِ فلکی : آسمانی منزلیں۔
مشکوے : شاہی محل۔

منظر : دریچہ۔

شرح : جب تو تیز رفتاری سے کام لے کر آسمان کی چودہ منزلیں طے کر جائے ، یعنی ماہِ کامل بن جائے اور تیرے نور سے کوہِ شاہی محل صحن ، دریا ، چھتیں جگہ نے لگیں تو دیکھنا میرے ہاتھ میں بھی شراب سے لبریز بطوریں پالہ ہو گا ، جس کی صورت تیری صورت جیسی ہو گی۔

۲۳۔ شرح : دیکھیے میری طبیعت کے گھوڑے کو لگام چاہیے تھی وہ ہے نہیں ، لہذا یہ جو صحر چاہتا ہے ، چل نکلتا ہے ، اب اس نے غزل کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔

غزل

۲۴۔ شرح : علم کا دہر میرے جسم میں اس پیمانے پر اثر کر چکا تھا کہ بچنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی ، لیکن اسے محبوب ! تو مجھے اس حالت میں قتل کر کے کیوں بدنام ہوا ، تجھے کس نے کہا تھا کہ یہ مفت کا الزام اپنے ذمے لے لے۔

۲۵۔ شرح : جب غم سے زندگی حرام ہو گئی ہو تو پھر شراب ہی کیوں نہ پیے گاؤں تاکہ غم غلط ہو جائے ؟
مطلب یہ ہے کہ شراب یقیناً حرام ہے ، لیکن غم کے باعث زندگی بھی تو حرام ہو گئی ہے ۔ کیوں نہ وہ حرام ہیں لوں ، جو دوسرے حرام کو ملیا کر ڈالے ؟

۲۶۔ شرح : بوسے کی کیا اُمید ہو سکتی ہے ؟ اسی کو نفی میں سمجھنا چاہیے کہ محبوب و دشنام کی لذت سے آگاہ نہ ہو ۔
محبوب گالیاں دیتا ہے اور ہمیں مزہ آتا ہے ۔ اگر اس پر دامن ہو جائے کہ اس کا گالیاں دینا ہماری لذت حاصل کرنے کا باعث ہے تو ہماری منہ سے گالیاں دینا چھوڑ دے ۔ بوسے کی تنہا نہ رکھنی چاہیے ۔ یہی کافی ہے کہ وہ گالیاں دے جاتا ہے اور ہمیں جانتا کہ ہم ان سے لطف اٹھاتے ہیں ۔
ظاہر ہے کہ جہاں بات بات پر گالیاں دی جاتی ہوں ، وہاں یہ ممکن ہی نہیں کہ عاشق کے دل میں بوسے کا خیال آ سکے ۔

۲۷۔ لغات : ناقوس : بہت بڑی کوڑی ، سینگ ، گھنٹی اور گھنٹا ، جو منہ بند مندوں میں ، آتش پرست آتش کدوں میں اور عیسائی گرجوں میں اسی غرض سے بجاتے ہیں کہ ہم مذہبوں کو وقت عبادت کے متعلق خبردار کر دیں ۔

احرام : وہ دو بے ہن پادریں ، جو عمرہ اور حج ادا کرنے والے لوگ خاص مقامات سے باز رکھ لیتے ہیں اور حج یا عمرہ ادا ہو جائے تو اتارتے ہیں ۔

شرح : ہم نے ثبوت خانے میں جوتے ہوئے احرام باندھ دیا ، حالانکہ یہ کہنے کی زیارت کے لیے باندھا جاتا ہے ۔ جب ایک اٹا کام کیا تو دوسرا اٹا کام یہ کریں گے کہ کہنے میں ناقوس بجانے لگیں گے ، حالانکہ وہ اذان کا مقام ہے ۔

۲۸۔ لغات - قدح : پیالہ ، شراب کا پیالہ -
 نقد : روپیہ ، پیسا ، سہراہ ، اٹھار کی ضد ، یعنی فی الحال -
 وام : قرض ، اٹھار -

شرح : مجھے ساغر معرفت کا دور فی الحال تیسرے ہے - یہ وہی شراب ہے ، جس سے آسمان نے گردشِ قرمن لی ہے ، یعنی میری محفل میں اس شراب کا دور چل رہا ہے ، جسے پی کر آسمان روزِ اول سے گردش کر رہا ہے اور اب تک اسی طرح گردش میں رہے گا - اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ میری کیفیت کیا ہوگی -

گردشِ آسمان کم از کم ادبیات میں مسلم جلی آتی تھی ، اس کا مطلب ، گردشِ زمانہ سمجھنا چاہیے - یہ نہیں کہ زمین کی جگہ آسمان گردش کرنے لگا -

۲۹۔ لغات : ابرام : اصرار ، ضد -

شرح : محبوب بوسہ دینے سے انکار کر رہا ہے ، حالانکہ دل لے لینے پر تیار بیٹھا ہے -

۳۰۔ شرح : میں ہر حال میں محبوب کو چھوڑتا رہتا ہوں تاکہ وہ خفا ہو ، مجھے بے لفظ سنانے اور میں مٹتے اٹھاؤں ، یہاں تک کہ غالب نام بھی صرف چھوڑنے کی غرض سے استعمال کیا -

غالب کا مطلب ہے وہ شخص ، جسے سب پر غلبہ حاصل ہو ، جو سب پر فوقیت رکھتا ہو - ظاہر ہے کہ محبوب یہ سن کر بھی غصے میں آئے گا -
 غزل کے بعد پھر مرج کی طرف آتے ہیں اور بتائی ہے اذ سرِ نو خطاب شروع ہوتا ہے -

۳۱۔ لغات - یک تیز خرام : چیز رفتارِ قاصد -

شرح : مجھے تو جو کچھ کنا تھا ، کڑھکا ، اسے پری جیسے چہرے والے تیز رفتار قاصد اب تو بول ادا ہوتا -

۳۲ - لغات - ناہیدہ سا : پشانی رکھنے والا ، سجدہ کرنے والا -
 ڈہبرہ : مشہور سیارہ -

بہرام : مریخ کا فارسی نام ، جلتا فلک -
 مشرح : وہ کون ہے ، جس کے دروازے پر چاند سورج ، ڈہبرہ اور
 مریخ پشائیاں لکھ دیے ہیں - یعنی سجدہ کر رہے ہیں - ظاہر ہے اس سے
 مراد بہادر شاہ ہے ، جیسا کہ خود کہتے ہیں -

۳۳ - ۳۴ لغات : منظر : ظاہر ہونے کا مقام -
 فدا لجلال : صاحب عظمت و بزرگی -

اکرام : رتبہ بلند -
 یہ دونوں نام اسماء الہی میں سے ہیں ، مراد ہے اللہ تعالیٰ -

حدیقہ : وہ باغ ، جس کے گرد چار دیواری ہو -
 سام : رستم کا دادا ، زال کا باپ -

مشرح : اسے بلال ! تو نہیں جانتا تو اس بلند رتبہ شہنشاہ کا نام مجھ
 سے سن - وہ بہادر شاہ ہے ، جو دل اور آکھ کے قبلہ گاہ ہے - دنیا میں اللہ
 تعالیٰ کی عظمت اور رتبہ اعلیٰ کا مظہر ہے -

وہ بہادر شاہ ، جو انصاف کے راستے کا شہسوار ہے ، وہ بہادر شاہ ، جو
 باغ اسلام کی توبہ ہے -

اس کا سر عمل اعجاز کی مانند ہے ، اس کی ہر بات گویا الہامی ہے -
 محفل نشاط آراستہ ہو تو اس میں تیسر اور جمشید جیسے بادشاہ مہمانوں
 کے طور پر شامل ہوتے ہیں - اگر جنگ کا معاملہ پیش آ جائے تو رستم اور سام
 جیسے پہلوان بہادر شاہ سے لڑائی کے فزون کیجھتے ہیں -

۳۵ - ۳۶ - لغات - فرجام : انجام -
 لوحش اللہ : اصل میں لا ادحشہ اللہ تعالیٰ ، یعنی خدا اسے وحشت دے -

محنت کر کے لوحِ اشد بولنے لگے۔ تعلیم، تبحر اور استغناء کے لیے بولتے ہیں۔ مہنوم ہے ماشاء اللہ، سبحان اللہ۔

جرمِ خوار: جرم، گورث، خوار، پینے والا۔ یہاں جرمِ خوار سے مراد ہے فیض حاصل کرنے والا۔

مرشدِ جام: اس سے اشارہ ہدایتِ شیخ احمد جام ثناء پیل کی طرف ہے۔ شیخ موصوف ملائم جام (ولایت ہرات) کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے ۱۰۴۹ھ - ۱۰۵۰ھ اور پچانوے سال کی عمر پا کر ۱۰۴۹ھ - ۱۰۵۰ھ میں وفات پائی۔

اہل اولیاء میں شمار ہوتے ہیں۔ جن مقام پر مزار ہے، اس کا نام ہی شیخ جام مشہور ہو گیا۔

ایرج و تور: فریدوں کے دو بیٹے۔

شہر و: اشارہ ہے گیسرو کی طرف، جو کیا فی خاندان کا جلیل القدر بادشاہ تھا۔

بہرام: اس سے مراد بہرام گور ہے، جو ساسانیوں میں ایک مشہور بادشاہ تھا۔

گیو: ایران کا مشہور پہلوان، جو گیسرو کو ترکستان سے ایران لایا تھا۔

گورز: گیو کا باپ۔

بیزن: گیو کا بیٹا اور ستم کا مہیا تھا۔ مشہور پہلوان۔ دخترِ افراسیاب سے بیزن کے عشق کی داستان۔ شہنامہ کا ایک اہم جزو ہے۔

گرم: اصل میں گرم، یہ تخفیف دے ہوئے ہے، لیکن شعرا نے "کو" مشدود بانڈھتے ہیں۔ یہ بھی پہلوان تھا اور گورز کا بیٹا تھا۔

موشگافی: بال چیرنا۔ بال کی کمال زکات۔

مصصام: وہ تلوار، جو نہ مڑے، نہ جکے۔

شرح : اب براہ راست بادشاہ سے خطاب شروع ہو گیا۔ کہتے ہیں اسے بادشاہ اتیرا لطف و کرم زندگی بڑھانے والا ہے اور تیرا عہد حکومت ایسا ہے، جو انجام تک سراپا برکت ہے۔

تیری شان و شوکت دیکھ کر بے اختیار زبان پر کلمہ چلے گا جو دوسری جہاد ہو جاتا ہے، یعنی خدا نظر بد سے بچانے اور تیرا معرفت سے بھرا ہوا کلمہ ہے کہ انسان پکارا اٹھتا ہے: سبحان اللہ، ماشاء اللہ۔

روم کا شہنشاہ تیرے جان نثاروں میں شمار ہوتا ہے اور شیخ احمد ہمام زندہ پہلے تجھ سے فیض پانے والوں میں شامل ہیں۔

ایرج، تور، خسرو اور ہرام جیسے زبردست فرما زدا تجھی کو ملک کا حقیقی وارث جانتے ہیں۔

گیو، گورد، بیزن اور رام جیسے پہلوان تیرے زور بازو کا لوہا نہ لیتے ہیں۔

تیرے تیر کی مویشی گانی کا کیا کہنا اور تیری تلوار کی آب و تاب، باعث صد آفریں ہے۔

تیرے تیر نے دشمن کے تیر کو نشاء مہمرا لیا ہے اور تیری تلوار نے تیرے مقابل کی تلوار کو اپنا میان سمجھ لیا ہے۔

۴۵ - ۴۶ - لغات - گراں حید : بجاری جبرک جسم والا۔
سبک عنال : تیز رفتار، یعنی وہ گھوڑا، جو ہلکے کے اشارے پر بھاڑا ہو جائے۔

شرح : تیرے بجاری جسم والے ہاتھی کی چنگھاڑ سن کر دعد کا دم لگ رہا ہے۔ تیرے تیز رفتار گھوڑے کی چال بھلی کو سست رفتاری کا غم مہمرا رہی ہے۔ یعنی تیرے ہاتھی کی چنگھاڑ کو دعد پر اور گھوڑے کی رفتار کو بھلی پر فوقیت حاصل ہے۔

۴۷ - ۴۸ - لغات : مصزوب : جس پر مزب لگائی جانے ،

مراد دشمن ۔

ادغام : کسی لفظ کے دو ہم جنس حروف کو تشدید سے ایک کر دینا مثلاً
رتاقص ، شتاد ۔

شرح : تیرے گرز کو مصزوبی میں قدرتِ کاملہ حاصل نہ ہوتی تو
مزب خوردہ دشمن پر پڑتے ہی اس کا سراود بدن ایک دوسرے میں پیوست
کیوں ہو جاتے ؟

مطلب یہ ہے کہ تیرا گرز دشمن پر پڑا تو اس کا سراود بدن میں دھنس گیا اور
پہلی صورت بگڑ کر ایک نئی صورت پیدا ہو گئی ۔

۴۹ - ۵۰ - لغات - لیالی : یل کی جمع ، راتیں

دشمن کام : اپنی خواہش اور مراد کا دشمن ۔ عاشقوں کی خصلت ہی

یہ ہے کہ وہ مقصد تک نہیں پہنچتے ، برباد و تباہ حال رہتے ہیں ۔

حکم ناطق : وہ حکم جو نطق سے ، قلمی حکم ۔

شحنہ : کو تو ال ، یہاں مراد ہے وہ امن و جرات کو آبادی کی نگرانی کیجے ۔

توقیع : مزاج ۔

صورتِ ارتقام : تحریر کی صورت ۔

طرازِ دوام : ہمیشگی کا نقش ۔

شرح : اذل میں راتوں اور دنوں کے صفوں پر پیش آنے والے

واقعات کی تحریریں ثبت ہوئیں تو تغنا و تقد کے قلم نے ان صفوں پر اختصار

سے حکم درج کر دیے ۔ یعنی لکھ دیا کہ غلاماں دن اور غلاماں رات یہ یہ واقعات

پیش آئیں گے ۔

مجبوروں کے متعلق واضح کر دیا کہ وہ عاشقوں کو قتل کرتے رہیں گے ۔

عاشقوں کے بارے میں لکھ دیا کہ ان کی مرادیں برنہ آئیں گی اور وہ تباہ و خستہ حال

میں گئے۔

آسمان کی نسبت حکم دے دیا کہ اسے ایک تیز رفتار گنبد کہیں، جس کا رنگ نیلا سا ہے۔

یہ قطعی فیصلہ بھی کر دیا گیا کہ محبوبوں کے رُکن کو داغ اور زلف کو جال کہیں۔

آگ نے جلن پائی، پانی نے نمی لے لی، ہوا نے تیز موی سنبھال لی اور خاک نے آرام و سکون اختیار کر لیا۔

روشن سورج کا نام دن کا بادشاہ قرار پایا۔ چمکیلے چاند کا نام شام کا کوتوال تجویز ہوا۔

ابے بادشاہ! حسب دستور تیری سلطنت کے لیے بھی تغافل قدر نے فرماں لکھ دیا۔ حکم کے مطابق حکم لکھنے والے نے تحریر کر دیا کہ یہ سلطنت ہمیشہ کے لیے باعثِ عزت رہنی چاہیے۔

۵۸۔ لغات : روانی : جاری ہونا۔

شرح : تیری سلطنت کا آغاز دل سے جاری ہے۔ خدا کے یہ

ابد تک اسی طرح انجام کو پہنچے، یعنی کبھی ختم نہ ہو۔

مولانا خبائلی فرماتے ہیں کہ میری نظر میں :

”یہ قصیدہ خصوصاً اس کی تشبیب ایک کارنامہ ہے مصنفِ عظم

کے کمال کا اور زیور ہے اردو شاعری کے لیے۔ اس زبان

میں جب سے مقیدہ گوئی شروع ہوئی ہے، اس طرح کی تشبیب

کم لکھی گئی ہے۔“

معنی یہی نہیں، یہ قصیدہ خصوصیت سے غالب کی قادر الکلامی کا ایک ایسا

مرقع ہے، جس کی نظیر پوری اردو شاعری میں نہیں مل سکتی۔ فارسی میں بھی

ایسا چیزیں بہت کم ملیں گی۔ دیکھیے، چھوٹی سی بحر ہے اور کس طرح شعرو کی

میں سچ پر سچ پہلا بار ہوا ہے، اس بے تکلفی سے خیالات گہرے غلطی کی طرح
صفر قرعہ اس پر متحرک معلوم ہوتے ہیں، پھر یہ خیالی دنیا، ہر اسلوب اچھوتا
بعض اشعار ایسے ہیں، جن کے پہلے مصرع میں چار چیزیں بیان کیں اور دوسرے
میں چاروں کی خصوصیات الگ الگ واضح کر دیں۔

مولانا غالب بانی فرماتے ہیں کہ ایسی تشبیہ اردو میں کم کسی گئی ہیں، لیکن
ہمیں تو تصائد کے اس دفتر میں، جسے خواجہ حالی ناپاک قرار دیتے ہیں، ایک ہی
تشبیہ ایسی نظر نہیں آتی، جس میں اس قصیدے کے حسن و خوبی کا پرتو ہو۔

صبح و دم درواژہ خاور کھلا	مہرِ عالم تاب کا منظر کھلا
خسرو انجم کے آیا صرت میں	شب کو تھا گنجینہ گوہر کھلا
وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود	صبح کو رازِ مرہ و اختر کھلا
میں کو اک کچھ نظر آتے ہیں کچھ	دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا
سلی گروں پر پڑ امتحانات کو	موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر	اک نگارِ آتشیں رخ، سر کھلا
تھی نظر بندی کیا جب ردِ سحر	بادِ گل رنگ کا ساعز کھلا
لاکے ساتی نے صبو حی کے لیے	رکھ دیا ہے ایک جام زر کھلا
بزمِ سلطان ہوئی آراستہ	کعبہ امن و اماں کا در کھلا

تاجِ زرّیں بہرتا باں سے سوا
خسرو آفاق کے مُنہ پر کھلا
شاہِ روشن دل بہادر شہ کہ ہے
راہِ مہتی اس پہ سر تاسر کھلا
وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں
مقصدِ نہ چرخ و بہت اختر کھلا
وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے
عقدِ احکام پیغمبر کھلا
پہلے دارا کا نکل آیا ہے تام
اس کے سر منگول کا جب دفتر کھلا
روشناسوں کی جہاں فرست ہے
واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا

قطعہ

توسنِ شہ میں وہ خوبی ہے کہ جب
تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا
نقشِ پاکی صورتیں وہ دلفریب
ٹوکے بتِ خائے آذر کھلا
مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے
منصبِ مہر و مہر و غور کھلا
لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن بہتر
میری حد و سع سے باہر کھلا
تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید
کس نے کھولا؟ کب کھلا؟ کیونکر کھلا
باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار
مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا
ہو جہاں گرم غزلِ خوانِ نفس
لوگ جا نہیں طبلہٴ عنبر کھلا

غزل

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پرکھلا کاشکے ہوتا قفس کا درکھلا
ہم پکاریں اور کھلے، یوں کون جاے؟ یار کا درد ازلہ پائیں گر کھلا
ہم کو ہے اس راز داری پر گھمنڈ دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا
واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ زخم کین داغ سے بہتر کھلا
ہاتھ سے دکھ دی کب اڑنے کماں کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا
مُفت کا کس کو بُرا ہے بدرقہ؟ رہروی میں پردہ رہ ہمبر کھلا
سوزِ دل کا کیا کرے بارِ ابرِ اشک؟ آگ بھڑکنِ مینہ اگر دم بھر کھلا
نامے کے ساتھ آگیا پیغام مرگ رہ گیا خط میری چپاتی پر کھلا

دیکھیو، غالب سے گرا بھا کوئی

ہے ولی پوشیدہ اور کا فر کھلا

پھر تُو راحت طرازی کا خیال پھر مددِ غورِ شید کا دفتر کھلا
غلے نے پائی طبیعت سے مدد بادِ باں کے اٹھتے ہی نگر کھلا
روح سے مددِ روح کی دیکھی شکوہ یاں عرضِ سہِ رتبہ جو ہر کھلا
ہر کانپا چرخ چکر کھ گیا بادشہ کا رایتِ شکر کھلا

بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب اب علوی پایہ منبر کھلا
 سکڑشہ کا ہوا ہے روشناس اب عیار آبرو تھے زر کھلا
 شاہ کے آگے دھرا ہے آئندہ اب نالی سہی اسکندر کھلا
 ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے اب فریب طغزل و سحر کھلا
 ہو سکے کیا مدح ہاں اک نام ہے دفتر مدح جہاں داور کھلا
 فکر اچھی پرستاشش ناتمام عجز اعجازِ ستاشش گر کھلا
 جانتا ہوں ہے خطِ لوحِ ازل تم پر اسے خاقانِ نام آور کھلا

تم کرو صاحبقرانی جب تک
 ہے ظہیم روز و شب کا در کھلا

(۴)

بہادر شاہ کی مدح میں

۱۔ لغات - خاور : مشرق -

منظر : دیدہ - جہر دکا -

شرح : صبح کے وقت مشرق کا دروازہ کھل گیا، گویا ساری دنیا کو
 روشن کر دینے والے آفتاب کا دیدہ چھا ہو گیا -

مطلب یہ کہ صبح ہو گئی اور سورج نکلنے والا ہے اور اسے ساری دنیا

دیکھے گی۔

۲۔ لغات۔ خسرو انجم : ستاروں کا بادشاہ، یعنی سورج۔

شرح : رات کو موتیوں کا خزانہ بکھرا ہوا تھا، یعنی ستارے آسمان پر جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ وہ خزانہ ستاروں کے بادشاہ نے خرچ کر ڈالا۔

مراویہ کہ سورج کے روشن ہوتے ہی ستارے غائب ہو گئے، یعنی ان کی روشنی باقی نہ رہی۔

۳۔ لغات۔ سمیا : ایک علم جس سے روح کو ایک جسم سے نکال کر دوسرے میں منتقل کر دیتے تھے اور موبوم چیزیں سامنے لے آتے تھے، اصل میں ان کا کوئی وجود نہ تھا۔

شرح : رات کو چاند اور ستاروں کا جو نظارہ آنکھوں کے سامنے تھا، صبح کو اس کا بھید کھل گیا اور معلوم ہوا کہ وہ سب کچھ تو سمیا کا کرشمہ تھا، یعنی ان کا وجود کوئی نہ تھا، لیکن ہمارے دہم نے دھوکا کھا کر انہیں حقیقت سمجھ لیا۔

۴۔ لغات۔ کوکب : کوکب کی جمع، ستارے۔

شرح : اب ہم پر آشکارا ہو گیا کہ ستارے اصل میں کچھ ہیں، اور نظر کچھ آتے ہیں۔ گویا یہ باذکر اور بیان متی ہیں جو ہمیں دھوکا دے رہے ہیں۔

شعر کی خوبی یہ ہے کہ ستارے واقعی ویسے نہیں، جیسے ہمیں نظر آتے ہیں، مثلاً اکثر بے نور ہیں اور ہمیں نورانی دکھائی دیتے ہیں۔ تمام ستارے بہت ہلکے ہیں، مگر ہمیں چھوٹے چھوٹے نظر آتے ہیں۔ متحرک ہیں، لیکن ہمیں ساکن معلوم ہوتے ہیں۔

۵۔ شرح : رات کو ایسا معلوم ہوا تھا کہ موتیوں کا کوئی زلیخہ

۱۱ - ۱۵ - لغات : تکوین : تخلیق ، پیدا کرنا ، وجود میں لانا ۔

تاویل : شرح ، بیان ، اسلیت واضح کرنا ۔

دارا : ایران کا مشہور بادشاہ دارا گشتاسپ ۔

سرسنگ : فوج کا امیر ، کوتوال ۔

چہرہ : علیہ ۔ پہلے بھی یہ دستور تھا (اور اب بھی ہے) کہ جب کوئی شخص فوج میں لازم رکھا جاتا ہے تو اس کا علیہ تفصیل سے لکھتے تھے ، اسے چہرہ لکھنا کہا جاتا تھا ۔

قبضہ : روس کا بادشاہ ۔ یہ لفظ سیزر کا مترتب ہے ۔ سیزر ہی کا لفظ جرمنی میں کیزر (KAISER) اور روس میں زار (CZAR) بنا اسی نے ایران میں کسریٰ کی شکل اختیار کی ۔

شرح : کون بادشاہ ؟ روشن دل بہادر شاہ ، جس پر زندگی کا جید پورا پورا کھل گیا ہے ۔ وہ بہادر شاہ جسے وجود میں لے آنے سے تو آسانوں اور ساتھیوں کا مقصد واضح ہو گیا ۔ وہ بہادر شاہ ، جس کی تشریح اور حقیقت بیانی سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حکموں میں سے جو باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں ، وہ آسان و روشن ہو گئیں ۔

وہ بہادر شاہ ، جس کے فوجی امیروں کا دفتر دیکھا گیا تو سب سے پہلے دارا گشتاسپ کا نام نکلا ۔ یعنی شارمین نے اسے دارا سوم سمجھا ہے ، جو کیا نیوں کا آخری بادشاہ تھا اور جس نے سکندر سے شکست کھائی وہ بہت معمولی بادشاہ تھا ، غالب کا اشارہ اس کی طرف نہیں ہو سکتا ۔ اسی غلط مفروضے کی بنا پر بعض اصحاب نے لکھا کہ اگلے شعر میں سکندر ہونا چاہیے تھا تاکہ دارا اور سکندر کی مناسبت واضح ہو جاتی ۔ ظاہر ہے کہ یہ خیالی شعر کی غلط تعبیر کا نتیجہ ہے ۔ دارا گشتاسپ کو سکندر سے کوئی مناسبت نہ تھی ۔

تھا جس کی لڑیاں ٹوٹ گئیں اور ان کے موتی آسمان کی سطح پر بکھر گئے ۔

۶۔ ۷۔ ۸۔ لغات : نگار : محبوب ۔

آتشیں رُخ : جس کے رخسار آگ کی مانند دھبے رہے ہوں ،
یعنی بنایت حسین ۔

رقیہ سحر : جادو کا اثر زائل کر دینا ۔

صبوحی : صبح کو پینے کی چیز ، جس سے رات کی پی ہوئی شراب کا
خمار زائل ہو جائے ۔

تشریح : صبح کے وقت مشرق کی جانب نظر اٹھی تو آفتاب نظر
آیا ۔ ایسا معلوم ہوا کہ ایک بنایت خوب صورت محبوب ہے ، جس کا سر
کھلا ہوا ہے ، یعنی اس نے کوئی چیز سر پر اوڑھ نہیں رکھی ۔

لیکن یہ تو اس وقت کی کیفیت ہے ، جب نگاہوں پر سیما کے جادو
کا اثر تھا ۔ جادو کا یہ اثر زائل کیا تو معلوم ہوا کہ یہ نگار آتشیں رخ نہیں
بلکہ پھول کے سے رنگ کی شراب کا بھرا ہوا پیالہ ہے ۔

ساقی نے ایک سنہری پیالہ لاکر سامنے رکھ دیا ہے تاکہ صبح کے خود نوش
کا انتظام ہو جائے ۔

۹۔ تشریح : شاہی محفل آراستہ ہو گئی ، یعنی دربار سج گیا اور اس دامن
کے کعبے کا دروازہ کھل گیا ۔

ظاہر ہے کہ اس سے پیشتر کے تمام اشعار محض تمہید کے طور پر کہے
گئے ۔

۱۰۔ لغات : خسرو آفاق : زمانے کا بادشاہ یعنی بہادر شاہ ظفر ۔

مُنہ پر کھلا : زیب و زینت کا باعث ہوا ۔

تشریح : زمانے کے بادشاہ نے سنہری تاج سر پر رکھا تو وہ روشن
سودج سے بھی بڑھ کر زیب و زینت کا باعث ہو گیا ۔

جہاں اس کے دشمنوں کی فہرست درج ہے، وہاں قیصر کا علیہ بھی تفصیل سے لکھ رکھا ہے۔

۱۶- لغات : توسن : گھوڑا۔

تھان : گھوڑا باندھنے کی جگہ۔

آذر : حضرت ابراہیمؑ کا والد یا چچا، جو مشاق بت تراش اور پتکا بٹ پرست تھا۔

مشرع : بادشاہ کے گھوڑے کی خوبیاں کیا بیان کروں، تیز رفتاری میں آدھی کو بھی اس پر رشک آتا ہے۔ جب اسے اصطبل سے کھولا جاتا ہے تو جہاں جہاں اس کے پاؤں کا نقش پڑتا ہے، ایسی دلغریب صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ دیکھنے والا سمجھے، آذر کے بٹ خانے کا دوازدہ کھول دیا گیا، جہاں ہر طرف نہایت خوب صورت بٹ رکھے ہوئے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ گھوڑا چلتا ہے تو جہاں جہاں اس کا پاؤں پڑتا ہے، ایسی خوب صورت شکلیں بنتی جاتی ہیں، جنہیں خوب صورت بنوں پر بھی فوقیت حاصل ہے۔

۱۸- لغات : منصب : وظیفہ، کام

محور : وہ منہ خط، جس پر زمین گردش کر رہی ہے اور ہر ستارے کے دائرہ گردش کو محور ہی کہتے ہیں۔

مشرع : بادشاہ نے تعلیم و تربیت کے فیض سے مجھ میں صلاحیت پیدا کر دی کہ میں سورج، چاند اور سیاروں کے گھومنے کے خط کی حیثیت، وظیفہ اور کام سے آگاہ ہو گیا، یعنی مجھ پر ان چیزوں کے وظائف کی حقیقت کھل گئی۔

۱۹- ۲۰- لغات : وسع : طاقت، مقدور، استطاعت۔ وستر

دل وابستہ، متعین، یعنی جس پر انقباض طاری ہو، ناخوش۔

شرح : میرے دل میں لاکھوں گرمیوں پڑی ہوئی تھیں، لیکن ہرگز کھل گئی۔ اور اس پرانے پر کھل کر میرے لیے اسے یوں کھون کھن نہ تھا یہ بات میری دسترس سے باہر تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ میرا دل اس طرح متعین، بھتیجا ہوا، سکڑا ہوا اور ناخوش تھا کہ اسے ایسا نقل کر سکتے ہیں، جس کی کوئی کہنی نہ تھی۔ اب یہ کھل گیا۔ کس نے کھولا؟ کب کھولا؟ کیونکر کھولا؟

مقصود یہ ہے کہ بادشاہ نے حسن تربیت سے کھول دیا۔

یہ استفہام سوال کی غرض سے نہیں، تعجب اور خوشی کی غرض ہے۔

۲۱۔ لغات - کھلا : توجہ کی، التفات کیا۔

شرح : اگر سفید بادشاہ نے مجھے توجہ سے نوازا تو میں معنی کے بارغ کی بہار دکھاؤں گا، یعنی ایسے شعر کہوں گا کہ سننے اور پڑھنے والے کو یقین ہو جائے، بارغ معنی میں بہار آگئی۔

۲۲۔ لغات : طبلہ : ڈبّا، صندوق۔

عنبر : ایک خوشبودار چیز، جو سمندر سے نکلتی ہے۔

شرح : جہاں میرا سانس غزل پڑھنے میں مشغول ہو، یعنی غزل خوان شروع کرے، لوگ سمجھیں کہ عنبر کا ڈبّا کھل گیا ہے، جس کی خوشبو سے فنا ملک اٹھتی ہے۔

غزل

۲۳۔ لغات - گنج : گوش، بیاں قفس کا گوشہ مراد ہے۔

شرح : اکتنے افسوس کا مقام ہے کہ میں قفس کے گوشے میں یوں بیٹھا رہوں اور پرکھتے ہوئے ہوں۔ کاش قفس کا دریچہ کھلا جوتا اور میں بارغ کی فضا میں اڑنے کا مطلق اٹھاتا۔

۲۴۔ **شرح :** اس شعر کے دو معنوم ہو سکتے ہیں، اگرچہ کسی تقدیر تکلف سے کام لینا پڑتا ہے۔

۱۔ اگر محبوب کا دروازہ کھلا پائیں تو جا سکتے ہیں، لیکن ہم دیکھ رہے ہیں، گویا التجا کریں، پھر دروازہ کھلے، یوں جانتا ہم کیونکر گوارا کر سکتے ہیں؟ اس معنوم سے ملتا جلتا شعر میرزا پہلے بھی کہ چکے ہیں۔

بندگی میں بھی وہ آزدہ و خود میں ہیں کہ ہم
اٹھے پھر آنے، دیکھو اگر داند ہوا

۲۔ دوسرا معنوم زیادہ قریب قیاس ہے۔ کہتے ہیں، محبوب کا دروازہ کھلا پائیں تو ہم کیونکر داخل ہو سکتے ہیں؟ یہ تو بارِ عام ہوا، اس میں ہمارے کیے تخصیص کا کون سا پہلو ہے؟ ہم تو اس وقت جائیں گے کہ وہاں پہنچیں، آواز دیں، پھر خاص ہمارے لیے دروازہ کھلے۔

۲۵۔ **شرح :** ہم اپنی سادہ لوحی سے اس پر فخر کر رہے ہیں کہ دوست کا راز دل میں چھپا رکھا ہے اور کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ اُدھر یہ حال ہے کہ دوست کا راز دشمن پر آشکارا ہو چکا ہے، یعنی خود دوست نے سب کچھ رقیب پر ظاہر کر دیا ہے۔ پھر ہمارے لیے راز داری پر فخر کا کون سا موقع ہے؟

۲۶۔ **لغات :** کھلا : باعثِ ذہنیت ہوا۔

شرح : یقیناً محبت کا داغ دل پر بہت اچھا لگتا تھا، لیکن محبت کا زخم دل کے لیے اور بھی ذہنیت کا باعث بن گیا، یعنی زخم کو داغ پر فوقیت حاصل ہے۔

۲۷۔ **شرح :** میرا محبوب اس درجہ سنگڑ ہے کہ اس نے ابد کی کات کبھی ہاتھ سے نہیں رگھی اور غم سے کی کمر سے خنجر کبھی نہیں کھولا۔ گویا اس کے ابد اور غم سے بدستور تیرا انداز و خنجر ذی میں سرگرم ہیں۔

ہولناک لمبا طباہی فرماتے ہیں : ”ابد کو کات اور غم سے کو خنجر سے تشبیہ دیا

کرتے ہیں۔ لیکن ابرو کو گمان دار اور غریبے کو خنجر گزار کنا نہ یادہ لطف دے گیا۔

۲۸۔ لغات - بدرقہ : سفر میں مسافر کی حفاظت کرنے والا

نگہبان، رہنما۔

شرح : جو بدرقہ ساتھ لے لیا تھا، راستہ چلنے میں اس کے علم و تجربہ کی حقیقت کھل گئی۔ پردہ فاش ہو گیا اور پتا چلا کہ جو خود راستہ نہیں جانتا، وہ کسی کی رہنمائی کیا کرے گا؟ لیکن صفت کا بدرقہ تھا، اس کی اجرت کچھ نہ تھی۔ ایسے شخص کو بطور رفیق سفر ساتھ رکھنے میں کیا برائی ہے؟

۲۹۔ شرح : آنسوؤں کی بارش دل کی جلن کا کیا علاج کر سکتی ہے۔ حالت یہ ہے کہ اگر تھوڑی دیر کے لیے تھمتی ہے تو آگ بھڑک اٹتی ہے۔ گویا آنسو دل کی لگی بجھا نہیں سکتے۔

۳۰۔ شرح : محبوب کا خط آ گیا، جس کا رت سے انتظار تھا اس سے اتنی خوشی ہوئی کہ موت آ گئی۔ گویا نامہ محبوب کی انتہائی مسرت نے شادی مرگ کا سماں پیدا کر دیا، نامہ کھول کر پڑھنا چاہتا تھا، پڑھ نہ سکا اور دم نکل گیا۔ یوں نامہ پینے پر کھلا کا کھلا رہ گیا۔

۳۱۔ شرح : دیکھو، خبردار رہو، غائب سے الجھنے کی کوشش نہ کرنا۔ وہ دیکھنے کو کافر ہے، لیکن حقیقت میں اسے دل کا رتبہ حاصل ہے۔ اگر اس نے بد دعا کی تو ہر الجھنے والے کو خاک کر کے رکھ دے گا۔

۳۲۔ لغات - مدحت طرازی : تعریف کرنا، مدح کرنا۔

شرح : غزل سے فارغ ہو کر پھر قصیدہ گوئی شروع ہو گئی۔ بادشاہ کی قصیدہ گوئی کی حیثیت وہی ہے، جیسے چاند اور سورج کے دفتر کھل جائیں۔ گویا بادشاہ کی مدح اصل میں چاند اور سورج کے دفتر کھلنے کے ہم معنی ہے۔

۳۳۔ شرح : قلم کو شاعر کی طبیعت سے مدد ملی، یعنی قلم اٹھایا تو

طبیعت کے سانچے سے شعر و صُل حاصل کر نکلنے شروع ہو گئے۔ وہی کیفیت پیدا ہوئی کہ جہاز چلنے کے لیے بادبان کھلتے ہیں تو نگر بھی اٹھتا ہے۔

۳۴۔ لغات۔ تشکوہ : جاہ و جلال۔ رتبہ۔

عَرَض : وہ چیز جو قیام کے لیے دوسری چیز کی محتاج ہو جیسے کپڑے کے لیے رنگ۔

جوسہر : جو بالذات قائم ہو۔ شعر میں ”مرح“ ”عرض“ ہے اور ”جوسہر“ ”ممدوح“ یعنی بادشاہ۔

شرح : ”مرح“ سے بادشاہ کا جاہ و جلال نمایاں ہو گیا، یعنی ”عرض“ سے یہ کھل گیا کہ جوسہر کا رتبہ کتنا بلند ہے۔

۳۵۔ لغات۔ رايت : جھنڈا۔ غلم۔

شرح : جب بادشاہ کے لشکر کا غلم اٹھا اور پرچم کھلا تو سورج کا پٹ اٹھا اور آسمان چکرا گیا۔

شعر میں ایک خوں یہ بھی ہے کہ چرخ بہ ہر حال چکرتا رہتا ہے اور سورج صبح کو نکلتا ہے تو کانپتا ہوا معلوم ہوتا ہے، اس لیے فارسی میں صبح کے سورج کو رزاں کہتے ہیں۔

۳۶۔ لغات۔ مُلَو : بلند۔

شرح : خطیب نے خطبے میں بادشاہ کا نام لیا تو ملتا ہر ہو گیا کہ منبر کا پایہ کیوں بلند ہے۔ اس لیے بلند ہے کہ منبر پر کھڑا ہو کر خطیب بادشاہ کا نام لیتا ہے۔

۳۷۔ لغات۔ عیار : کسوٹی، کھرا کھوٹا پن دیکھنا، پیمانہ۔

شرح : اب یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ سونے کی عزت و آبرو کا پیمانہ کیا ہے۔ یہ ہے کہ بادشاہ کے سکتے سے اسے روشناسی حاصل ہوئی، یعنی بادشاہ نے اسے اپنا سکتہ بنایا۔

سکتے کے لیے روشناسی مدد و رہنمائی ہے، کیونکہ عموماً سکوت پر بادشاہ کے چہرے کی تصویر ہوتی ہے۔ اسی لیے مدپے کو چہرہ شاہی کہتے تھے۔
۳۸۔ لغات - نال : انجام۔

آئینے سے سکندر کی نسبت کا معاملہ اصلاً صرف اتنا ہے کہ اس نے سکندریہ میں جہازوں کی رہنمائی کے لیے ایک اونچا برج تعمیر کر کے چاروں طرف آئینے لگا دیے تھے اور ان کے اندر روشنی کا انتظام کر دیا تاکہ تاریکی میں جہاز دانوں کو ہندو گاہ کا پتہ چل سکے۔ پھر شعر و ادب میں اس واقعے نے یہ صورت اختیار کر لی گویا آئینہ سکندر نے بنایا اور اس سے آئندہ کا حال معلوم ہو جاتا تھا، جیسے ہام مجید ہے۔

شرح : ۱۔ شاہ کے آگے آئینہ رکھا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ سکندر نے آئینہ سازئی میں جو محنت و مشقت اٹھائی تھی، اس کی عرض و غایت کیا تھی۔ یہ تھی کہ بہادر شاہ آئینہ دیکھے۔

۳۹۔ لغات - طغرل : سلجوق سلطنت کا بانی۔ وہ خود لاؤلد تھا اور اپنے بیٹے رکن الدین ابوطالب طغرل بیگ (۶۳۰ھ - ۶۶۳ھ) عہد الدین ابوشجاع، الپ ارسلان (۶۶۳ھ - ۶۷۲ھ) کو ولی عہد بنایا تھا۔
سنجر : مؤخر الدین سنجر جو الپ ارسلان کا پوتا اور بلال الدین ابوالفتح ملک شاہ کا بیٹا تھا (۶۷۲ھ - ۶۸۵ھ) یہ سلجوق سلطنت کا آٹھواں اور آخری بادشاہ تھا۔

شرح : طغرل اور سنجر مزید سے ملک کے وارث بنے رہے اب خلق خدا کو معلوم ہوا کہ ملک کا اصل وارث تو بہادر شاہ تھا۔

۴۰۔ لغات : جہاں داور : بادشاہ عالم، فرماؤ اسے جہاں۔
ستائش گر : مزاج - درج کرنے والا۔

شرح : بادشاہ عالم کی درج کیا ہو سکتی ہے : ہاں کہہ سکتے ہیں کہ اس

کی طرح کا دفتر کھل گیا ہے ۔

مرح کے سلسلے میں جو خیالات پیش کیے گئے ، وہ تو یقیناً اچھے تھے لیکن یہ ادھوری رہی ، پوری نہ ہو سکی ۔ اگرچہ مرح کرنے والا نہایت مجربان تھا ۔ لیکن اس کا عجیب سا سر ہو گیا ، یعنی وہ مرح کا حق ادا نہ کر سکا ۔
۴۲ - ۴۳ - لغات : خاقان و بڑا بادشاہ ۔

خط لوح ازل : وہ تحریر جو دنیا کے شروع ہوتے وقت تختی پر لکھ دی گئی ، یعنی خط تقدیر ۔

صاحب قرانی : صاحب قرآن اسے کہتے ہیں ، جس کی پیدائش کے وقت دو نیک ستارے ایک برج میں ہوں ۔ ایسا آدمی بڑا اقبال مند سمجھا جاتا ہے ۔ صاحب قرآن کا مطلب ہوا وہ حکومت ، جس کی ہانگ ٹنڈ صاحب قرآن کے اہل میں ہو ۔

مشرح : اسے نامور شہنشاہ : میں جانتا ہوں کہ آپ پر لوح ازل کی تحریر روشن ہے ۔ آپ اس وقت تک صاحب قرآن کریں ، جب تک رات دن کے ظلم کا دروازہ کھلا ہوا ہے ، یعنی جب تک دنیا قائم ہے ۔

سہرا

نوش ہوا ہے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا	تمہید :
باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پر سہرا	ہباد شاہ
کیا ہی اس چاند سے کھڑے پہ بھلا لگتا ہے	کے فرزند
ہے ترے حن دل اندرز کا زیور سہرا	میرزا جواں
	بخت
	جو یکم ذی قعدہ

سر پہ چڑھنا تجھے چیتا ہے پر اے طرفِ کلاہ !
 مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے تیرا لبر سہرا
 تاؤ بھر کر ہی پروٹے گئے ہوں گے موتی
 ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں دگا کر سہرا
 سات دریا کے فراہم کیے ہونگے موتی
 تب بنا ہو گا اس انداز کا گز بھر سہرا
 رخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینہ پڑکا
 ہے رگ ابر گہر بار سراسر سہرا
 یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
 رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا
 جی میں اترا میں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چمیز
 چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا
 جب کہ اپنے میں ساریں نہ خوشی کے مارے
 گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا
 رخ روشن کی دمک گوہر غلطاں کی چمک
 کیوں دکھلائے فروغ مہ و اختر سہرا

کے بلن
 سے تھا۔
 کی
 شادی کے
 موقع پر
 یہ سہرا
 خود بیگم
 کی فرمائش
 پر لکھا گیا
 تھا۔ مولانا
 عرش نے
 دیوانِ غالب
 کے ساتھ
 جو حواشی
 شائع کیے
 ہیں ان
 سے معلوم
 ہوا کہ یہ
 سہرا
 ۲۸ مارچ
 ۱۸۵۲ء
 کے دہلی
 اردو اخبارات

یہ اس تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگ ابر بہار
 قصید کے لائے گا تاب گراں باری گوہر سہرا
 ساتھ شائع ہم سخن منہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
 ہوا تھا: دیکھیں کہہ دے کوئی اس سرے سے بڑھک سہرا

محسب الکلم حضرت سلطان غلام احمد ملکہ جو جناب لڑا ب نجم الدولہ
 اسد اللہ خان غالب اور جناب خاقانی جند ملک الشعراء شیخ
 محمد ابراہیم شاہ قزوینی بہ تقریب شادی میرزا جواں بہشت بہادر
 مرشد زاوۃ آفاق کے کچھ اشارہ بہ سبیل مبارک با دی سہرا اس
 سبقت میں حضور سلطانی میں سرور بار گزارنے تھے، مع چند اشارہ
 علاوہ اس کے جو خاص نجم الدولہ بہادر نے پھر گزارنے واسطے
 حفظ کیفیت اپنے ناظرین، اہل بصیرت و باہرین و واقفین
 مباحث و بلاغت کے بموجب ترتیب در پیش ہونے کے
 ہم بھی درج اخبار کرتے ہیں۔

صحیح یہ ہے کہ فرمائش بادشاہ کی نہیں، بلکہ کی جاتی اور اس سلسلے میں
 واسطہ حکیم احسن اللہ خاں تھے۔ بعض نے لکھا ہے کہ یہ سہرا سنہری کشتی
 میں رکھ کر بہتے تکلف سے گزارنا گیا تھا۔ میرزا کے لیے تو یہ اہتمام ممکن
 نہ تھا۔ غالباً سہرا باندھتے وقت سنہری کشتی میں لگا کر لائے تھے۔

”سہرا“ کی روایت کے ساتھ میرزا غالب سے پیشتر کسی کوئی نظم نہیں
 کہی گئی تھی، اگر یا اس صنف کے موجد وہی ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کے تیسرے
 دیوان میں دو سرے ہیں اور ان کی روایت ”سہرا“ ہے۔

فضی امیر احمد صاحب علوی نے اپنی کتاب ”بہادر شاہ ظفر“ میں مرث
 ایک سرے کا ذکر کیا ہے۔ ساتھ ہی فرمایا ہے کہ یہ سہرا شہزادہ جہانگیر یا
 شہزادہ سلیم (فرزدان اکبر شاہ ثانی) کی شادی کے موقع پر کہا گیا تھا۔ یہ

جمع نہیں، دونوں سہرے میرزا جواں بخت کی شادی پر کبے گئے تھے اور اس کی ایک سے زیادہ شہادتیں خود سہروں میں موجود ہیں۔ یہ دونوں غالبہ ذوق کے سہروں کے بعد کہے گئے۔

میرزا کے مقطع سے بادشاہ کو خیال ہوا کہ یہ ذوق پر چوٹ ہے اس لیے ذوق سے بھی سہرا لکھوایا گیا، جس کے بعد اشعار کی کیفیت شرح کے سلسلے میں واضح ہوگی۔ میرزا کا مقطع جیسا کہ انھوں نے معذرت کے قطعے میں بیان کیا، واقعی سن گسترانہ تھا، یعنی شعراء جس طرح عموماً مقطع میں یکتائی کا دعویٰ کیا کرتے ہیں۔ میرزا نے ویسے ہی کہہ دیا کہ اس سے بہتر سہرا کوئی کیا کہے گا؟ ذوق نے اسے چیلنج سمجھ کر جواب دیا اور مقطع میں اس کا اظہار بھی کر دیا۔ میرزا کے لیے کسی بھی حالت میں ذوق کو برا مقابل سمجھ لینا ممکن نہ تھا، لیکن مسالہ استادشاہ کا آپڑا تھا اور میرزا شاہی ملازم تھے اس لیے انھیں معذرت ہی مناسب معلوم ہوئی۔

”دہلی اردو اخبار“ کی تحریر سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ سہرا مارچ ۱۸۵۲ء کے آخری ہفتے میں گزرانا تھا۔ اور ذوق کے جوابی سہرے کے فوراً بعد میرزا غالب نے قطعہ معذرت پیش کر دیا۔

یہاں میرزا اور ذوق کے سہروں کا تقابل مقصود نہیں، لیکن شرح کرتے وقت سرسری طور پر جو باتیں سامنے آئیں گی، وہی بیان ہوتی رہیں گی۔

۱۔ لغات - سہرا ہونا: کسی کام کی درستی اور سرانجام کا کسی پر موقوف ہونا۔ کسی پر کسی کام کا انحصار ہونا یا اس کے سرانجام کی عزت پانا۔

شرح: اسے نصیبِ اخروش رہو کہ آج ایک اہم کام کے سرانجام کی عزت تیرے حصے میں آئی۔ اس لیے اٹھو اور شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا باندھ دے۔

۲۔ شرح : سبحان اللہ شہزادے کے چاند سے کھڑے پر سہرا
کتنا چہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سہرا شہزادے کے دل افروز حسن کا
ذیور ہے۔

شہزادہ حسین تو تھا ہی، جسے دیکھ کر لوگوں کے دل روشن ہو جاتے
تھے۔ جب اس کے سہرا بندھا تو حسن کی شان کو چار چاند لگ گئے۔
فدوق نے اس کے جواب میں تین شعر کہے۔ مولانا طباطبائی فرماتے
ہیں کہ غالب نے بے مثل شعر کہا تھا۔ فدوق نے جواب دیا اور خوب جواب
دیا، لیکن ذیور کا قافیہ غالب ہی کے حصے میں آ گیا۔

۳۔ لغات - لمبر : نمبر، درجہ۔ بقول طباطبائی : لمبر ہی کتنا
ٹھیک ہے، نمبر غلط ہے۔

۱۔ شرح : اسے گوشہ کلاہ ! تجھے سر پر جگہ ملی اور یقیناً تیرے لیے
یہ جگہ زیبا ہے۔ سہرا بھی سر پر باندھا گیا۔ لیکن اسے گوشہ کلاہ ! مجھے اب
یہ ڈر پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں سہرا تیری آن بان اور شان کا درجہ نہ چھین لے۔
۴۔ لغات - کشتی : وہ کشتی غاظرٹ، جس میں کوئی چیز رکھ کر
لاتے ہیں، مثلاً قیمتی ذیور، پوشاک وغیرہ۔

۵۔ شرح : اگر ناؤ بھر کر موتی سہرے میں نہیں پودے گئے تو اسے
کشتی میں سجا کر کیوں لائے ہیں ؟

سیر ذائقے اس شعر میں ناؤ اور کشتی کی رعایت پیش نظر رکھتی اور دلیل
یہ دی کہ سہرا کشتی میں رکھ کر لائے ہیں۔ اس سے خیال ہو سکتا ہے کہ ناؤ
بھر کر موتی رکھ لیے ہوں گے اور ان سے چن چن کر سہرا بنا دیا۔

شیخ ابہا یم فدوق نے اس شعر کے جواب میں فرمایا :

آج وہ دن ہے کہ لائے ڈیرا نجم سے فلک
کشتی دہر میں مہ نو کی لگا کر سہرا

کناہ پہ جاتے تھے، آج آسمان کے لیے ڈیبا ہے کہ ستاروں کے موتی
چن چن کر سہرا گوندھے۔ پھر اسے ہلال کی ذریں کشتی میں سجا کر لائے۔ اس
میں وہی تعقید نمایاں ہے، جو اصطلاح میں تعقید قیج ہے۔

۵۔ شرح : سہرا گوندھنے کے خیال سے ساتوں سمندروں کے
موتی اکٹھے کر لیے ہوں گے۔ پھر ان میں سے نہایت خوب صورت اور سٹول
موتی چن چن کر گز بھر سہرا تیار کیا ہو گا۔

ذوق نے اس کے جواب میں فرمایا :

اک گہر بھی نہیں سدکان گہر میں چھوڑا

تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

میرزا نے ساتوں سمندروں کے موتی جمع کیے تھے، لیکن یہ خیال رکھا
کہ سارے موتی سہرے میں گوندھے نہیں جا سکتے، اس لیے گز بھر کی قید
لگا کر دامنخ کر دیا کہ ان میں سے چن چن کر بہترین موتی لے لیے، باقی
چھوڑ دیے، مگر ذوق نے سات کا جواب سو سے دیا، یعنی سینکڑوں کانٹوں
کے گوہر اکٹھے کر لیے گئے اور وہ تمام کے تمام سہرے کی نذر کر دیے۔ یہ
خیال نہ رکھا کہ سہرے میں یہ تمام گوہر کیونکر سمائیں گے؟ بس مبالغے پر
اغصاء فرمایا، گویا تم نے "سات" کے تھے، ہم "سو" کہتے ہیں۔

۶۔ شرح : دو ہلکے چہرے پر گری سے پینا آگیا اور قطرے
پکینے لگے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سہرا تک تک موتی برسانے والے بادل کی رگ
بن گیا ہے۔ مین سہرے کے تار دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ بادل مسلسل
موتی برسا رہا ہے۔

ذوق نے اس کے جواب میں دو شعر کہے :

دو تھے فترج پہ جو ہی تیرے پرستے انوار

تار و بارش سے بنا ایک سہرا سر سہرا

یعنی اسے جواں بخت، تیرے چہرہ فرخ پر انوار برس رہے ہیں اور ان کی برسات کے تاروں سے سہرا تیار ہو گیا۔

پہلے مصرع کی سستی بندش کے علاوہ میرزا غالب ہی کا مضمون لے کر دوسری شکل میں با محو دیا، البتہ پینے کی جگہ انوار برساتے۔ گویا ایک ”دقویٰ“ چیز کو ”تغیر دقویٰ“ بنا دیا۔

۲ تابش حسن سے مانند شمع غور شد
رخ پر گوند ہے تیرے منور سہرا

کنا یہ چاہتے ہیں کہ تیرے سر پر سہرا بندھا اور تیرے رخ پر گوند کی تابش حسن سے سہرے کی لڑیاں سورج کی کرنوں کی مانند منور ہو گئیں۔ شعر کی بندش میں جو الجھاؤ ہے، وہ تشریح کا محتاج نہیں۔

۳۔ شرح : سہرے کا تبا سے آگے بڑھ جانا خلافت ادب تھا اس لیے دامن کے برابر پہنچتے ہی وہ رک گیا۔

مطلب یہ کہ سہرا زیادہ لمبا نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ دامن سے آگے بڑھنا تو یہ امر بے ادبی کا باعث بنتا۔ شعر کی خوبی یہ ہے کہ میرزا نے حقیقت پیش نظر رکھی۔ سہرے زیادہ لمبے بنائے جائیں تو انھیں سنبھالنا مشکل ہو جائے۔ وہ خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتے جاتے۔ میرزا نے اس سے ایک پہلو پیدا کر دیا ہے کہ آگے بڑھنا خلافت ادب تھا۔

۸۔ لغات۔ مقرر : لازم، مزدی۔

شرح : کہیں موتی یہ سمجھ کر غمزہ کرنے لگیں کہ ہستی ہے تو صرف ہماری ہے، کیونکہ ہمیں سے سہرا آوندھا گیا۔ لازم ہے کہ بھوہوں کا بھی ایک سہرا تیار کر دیا جائے تاکہ موتیوں کے لیے اترانے کی گنجائش درجہ۔ شہزادے کے لیے سہرا صرف موتیوں سے تیار کیا گیا تھا، بھوہوں کا سہرا تھا ہی نہیں، لہذا حقیقت کے پیش نظر میرزا نے یہ نہیں کہا کہ بھوہوں

کا سہرا موجود ہے، صرف یہ کہا، ہونا چاہیے تاکہ موتیوں کا اترانا ختم ہو جائے۔
اس کے جواب میں ذوق نے خلاف واقع پھولوں کا سہرا تیار کر دیا اور
فرمایا :

چرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی باد بہار
اٹھ اٹھ رہے پھولوں کا معطر سہرا

پہلے مصرع میں تنقید کے علاوہ پھولوں کے سہرے کا ذکر خلاف واقع
ہے۔ عام لوگ پھولوں کا سہرا باندھتے ہیں، شہزادے نہیں۔ ان کے
لیے صرف موتیوں سے سہرے تیار ہوتے ہیں۔

۹۔ **شرح :** میرزا نے اس سے پہلے شعر میں پھولوں کا سہرا فروغ
بتایا تھا، چونکہ وہ موجود نہ تھا، اس لیے اس کی وجہ یہ قرار دی کہ جب پھول
خوشی کے مارے اپنے آپ میں سماتے ہی نہیں تو ان کا سہرا کوئی کیونکر گنڈھے؟
کتنی عمدہ توجیہ ہے۔ بتا دیا کہ کیوں پھولوں کا سہرا تیار نہیں ہوا۔ اس وجہ
کو موقع اور محل سے خاص مناسبت ہے۔

۱۰۔ **لغات۔** گوہر غلطاں : وہ بے مثال موقی، جو وضع کے
حسن اور سڈول پن کے باعث کسی ہموار سطح پر پھٹ کر سکے اور لڑھکتے ہیں۔

شرح : ایک طرف شہزادے کا رنج روشن دمک رہا ہے۔ اس
پر سہرے کی لڑیاں ہیں، جن میں اعلیٰ درجے کے موقی چمک رہے ہیں۔ پھر
کیوں سہرا چاند اور تاروں کی بہار نہ دکھائے؟ شہزادے کے چہرے کو چاند
سے اور سہرے کے موتیوں کو ستاروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔

اس کے جواب میں ذوق نے کہا :

دونائی میں تجھے دے مرد و خورشید فلک

کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا

دوسرے مصرع میں "منہ" کی تکرار حدودِ جہ نامناسب ہے اور یہاں :

”مثنیٰ کے لیے ”کھول دے“ کا لفظ ذوق جیسے مشتاق استاد سے تعجب انگیز ہے، جس کے بدیہی معنی دہن و اگر دینے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ میں وہی، مبالغے پر زور کہ میرزا نے مددِ اختر کہا تو ہم مددِ غور شید کہیں گے۔

۱۱۔ شرح : یہ ریشم کے تار نہیں، جن میں موتی پروئے گئے ہوں یہ تو ابرہہ کی رگ ہے، جس کا خاصہ ہی یہ ہے کہ تراوش کرتی اور موتی برساتی رہے۔ گویا مسلسل موتی برستے پلے جا رہے ہیں۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ آیا سہرا موتیوں کے اس باہر گراں کی تاب لا سکے گا؟ یعنی موتیوں کی مسلسل بارش کا متحمل ہو سکے گا؟

۱۲۔ شرح : ہم شعر کی روح کو سمجھتے ہیں۔ غالب کی طرف ادبی نہیں کرتے۔ دیکھیے اس سہرے سے بہتر سہرا بھی کوئی کہہ سکتا ہے؟ جیسا کہ خود میرزا نے کہا، یہ محض سخن گسترانہ بات تھی، لیکن ذوق نے اسے دعوتِ مقابلہ سمجھا اور سہرا کہہ کر بڑے دعوے سے فرمایا:

جن کو دعویٰ ہو سخن کا، یہ سادو آن کو
دیکھو، اس طرح سے کہتے ہیں سخنور بہرا

یہاں بحث یہ نہیں کہ سخنوری کا بلند تر مقام ذوق کو حاصل ہے یا غالب کو، لیکن حقائق پیش کیے جاتے ہیں، جن کی بنا پر دونوں سہروں کے درمیان موازنے میں سہولت ہوگی :

۱۔ ذوق نے غالب کا سہرا سامنے رکھ کر سہرا کہا اور زیادہ تر مضامین انھیں کے لئے کر خفیف سے تغیر یا مبالغے میں اضافے کے ساتھ پیش کر دیے اور مبالغے میں حقیقت کو موداً نظر انداز کیے رکھا۔

۲۔ غالب کے شعر صرف گیارہ ہیں، ان میں شاعری کے تمام محاسن موجود ہیں اور کوئی شعر غلامیہ واقع نہیں۔ ذوق نے جواب میں پندرہ شعر کہے، مگر کترا شمار مطابق واقع ہیں۔

۳۔ ذوق کے اکثر شعروں یا مصرعوں کی بندش تعقید یا الجھاؤ کا ایسا نقشہ پیش کر رہی ہے جو ذوق جیسے مشاق استاد کے لئے یقیناً صل تعجب ہے۔

۴۔ تاہم وہ کور ذوق کا دور تھا اور اکثر لوگ یا تو شعر کی حقیقت سمجھتے ہی نہیں تھے یا بہادر شاہ ظفر کی رضا جوئی میں اسی پر واہ وا کہنے لگتے تھے، جس پر خود ظفر خوش ہوتا تھا۔

۵۔ میرزا نے جو قطعہ معذرت میں کہا، اس کا مطلب ہرگز یہ نہ تھا کہ ذوق کا سہرا میرزا کے سہرے سے بڑھ گیا تھا یا انہیں اپنے شاعرانہ وقار میں کمی آجانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ قطعہ صرف اس لیے کتا پڑا کہ قلعہ معلیٰ میں دقت کی مصطلحتوں کا آغا تھا یہی تھا۔

۶۔ مولانا محمد حسین آزاد مرحوم نے فرمایا: ”اریاب نشاط حضور میں طالع تمہیں

مثنوی

آموں کی تعریف میں

ہاں دلِ درد مند زمزمہ ساز
کیوں نہ کھولے درِ خزمینہ سرا
نکا صفحہ پر رواں ہوتا
شاخِ گل کا ہے گلستاں ہوتا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا کہیے؟
نکتہ ہائے خرد منہ زانکیے
بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
غامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مردِ میداں سے؟
ثمر و شاخ گوے و چوگاں سے
تاک کہے جی میں کیوں رے ابراہاں
آم کے آگے پیش جانے خاک
پھوڑتا ہے چلے پھپھولے تاک
نہ چلا جب کسی طرح مقدور
بادۂ تاب بن گیا انگور!
یہ بھی ناچار جی کا کھوتا ہے
شرم سے پانی پانی ہوتا ہے
مجھ سے پوچھو نہیں خبر کیا ہے
آم کے آگے نیشکر کیا ہے
نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ بار
جب خزاں ہو تب آئے اس کی بہار
اور دوڑا بیٹھے قیاس کہاں؟
جان میں ہوتی گر یہ شیرینی
جان شیریں میں یہ مٹاس کہاں
کود کن باوجودِ غم گینے

جان دینے میں اس کو کیتا جان
 نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر
 آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام
 یا یہ ہو گا کہ فرطِ رافت سے
 انگلیں کے ہر حکم ربِّ الناس
 با آخِ غرنے شاخِ نبات
 تب ہوا ہے ثمرِ فشاں یہ نخل
 تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس
 آم کو دیکھتا اگر اک بار
 رونقِ کارِ گاہِ برگ و نوا
 رہو درِ راہِ خلد کا توشہ
 صاحبِ شاخِ برگ و بار ہے آم
 خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو
 وہ کہ ہے دائی ولایتِ حمد
 فخرِ دیں عزِ شان و جادِ جلال
 کارِ فرمائے دین و دولت و بخت
 سایہ اس کا ہما کا سایہ ہے

پروہ یوں سہل دے نہ سکتا جان
 کہ دواِ حادثِ ازل میں مگر
 شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام
 باغبانوں نے باغِ جنت سے
 بھر کے بیجھے میں سر پہ ٹہر گلاس
 مدتوں تک دیا ہے تجھے آپکے حیات
 ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل
 رنگ کا زر و پر کہاں بُو باس
 پھینک دیتا طلائے دستِ انشار
 تازہ و دودمانِ آب و ہوا
 طوبیٰ و سدہ کا جگر گوشہ
 تازہ پروردہ بہار ہے آم
 نو برِ نخلِ باغِ سلطان ہو
 عدل سے اُسکے ہے حمایتِ حمد
 زینتِ طینت و جمالِ کمال
 چہرہ آرائے تاج و مند و تخت
 خلقِ پروہ خدا کا سایہ ہے

لے مٹیفیض وجود سایہ و لہ
 جب تک ہے نمونہ سایہ و لہ
 اس خداوند بندہ پرور کو
 وارث گنج و تخت و انسر کو
 شاد و دل شاد و شاد ماں رکھو!
 اور غالب پہ نہر ماں رکھو!

آموں کی تعریف میں

تمہید :- یہ ثنوی، جیسا کہ آخر میں بتایا گیا ہے، میرزا غلام فتح الدین فتح الملک کے لیے کہی گئی تھی، جسے شہزادہ دارا بخت کی وفات کے بعد ولیعهد مانا گیا تھا۔ سلسلہ میں اس کی ولیعهدی انگریزی حکومت نے منظور کی اور شہزادہ میں اس نے وفات پائی۔ مہاراجا کا یہ دوسرا ولیعهد میرزا غالب کا شاگرد تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ثنوی سلسلہ اور سلسلہ کے درمیان کہی گئی، کیونکہ شہزادہ کو والی ولایت عہدہ کہا گیا ہے۔

۱۔ شرح : خبردار جو جاؤ، میرا درد مند اور زمرے گانے والا دل کس لیے راز کے خزانے کا دروازہ نہ کھولے ؟
 اس شعر کے سلسلے میں یہ بحث چھیڑی گئی ہے کہ شعر خطا یہ ہے اور دوسرے مصرع سے پہلے ”تو“ محذوف رکھا گیا ہے۔ یہ ظاہر اسے خطا یہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں۔ میرزا ویسے ہی کہتے ہیں کہ میرا درد مند دل کیوں نہ خزانہ راز کا دروازہ کھولے۔

۲۔ شرح : کاغذ کے صفحے پر علم کا دیا ہونا ایسا ہی ہے، جیسے شاخ گل سے پھول جھرنے لگیں۔

۳۔ شرح : اے علم! تو مجھ سے کیا پوچھتا ہے کہ کیا کھانا چاہیے؟ میں کیا بتاؤں؟ لیکن موقع اور محل کا اتفاق ہے کہ ایسے بھکتے لکھے جائیں، جن سے عقل و ہوش کی روشنی تیز تر ہو۔

۴۔ لغات - رطب فشاں : خرے لپکانے والا۔

مشرح : غرض آموں کی کچھ کیفیت بیان ہو جانی چاہیے اور انداز بیان ایسا ہو کہ لوگ سمجھیں، قلم خرے کا درخت ہے اور خرے ٹپکارا ہوا ہے۔

۵۔ لغات - گوڑے دو چوگان : گیند، بٹا۔ اصل کھیل کا نام بھی چوگان ہی ہے اور یہ گھوڑے پر سوار ہو کر کھیلتے ہیں۔ بٹا بہت لمبا ہوتا ہے اور سوار اس سے گیند آگے بڑھاتا ہے اور انگریزی میں اسی کو پو کہتے ہیں۔

مشرح : آم کے میدان کا مرد کوئل ہو سکتا ہے، آم کے درخت کی شاخ بٹا اور اس کا پھل گیند ہے۔ گویا چوگان کے اس کھیل میں کوئل دوسرا پھل آم سے باڈی نہیں لے جاسکتا۔

میدان اور مرد گوڑے دو چوگان کی مناسبت سے لائے ہیں۔ آم کو گوڑے سے اور شاخ کو چوگان سے تشبیہ دی ہے۔

۶۔ لغات - تاک : انگور کی جلیں، انگور۔

مشرح : انگور کے دل میں مقابلے کا ارمان سے تو آنے اور ارمان نکال لے۔ یہ گیند ہے اور یہ میدان۔

گیند سے پھر یہاں مراد آم ہے اور میدان سے میدان مقابلہ مفقود ہے۔ یعنی آم سامنے پڑا ہے۔ میدان مقابلہ آراستہ ہے۔ انگور کو حوصلہ ہے تو آنے اور قوت آزمائی کر لے۔

۷۔ لغات - جلے پھپھو لے پھوڑتا : شکایت بھری باتوں سے

دل کا خراب نکالنا۔ یہ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب کسی کے سامنے کچھ پیش نہ کیا سکے۔

مشرح : انگور آم کا مقابلہ خاک کر سکتا ہے، اس لیے سمجھ لیجئے کہ جلے

پھپھو لے پھوڑتا ہے اور خوار، خوار و شنی کا اظہار کرتا ہے، جس سے ہنسنے حاصل نہیں۔

۸۔ ۹۔ شرح : جب آم کے مقابلے میں انگور کچھ نہ کر سکا تو اس نے خاص شراب کی شکل اختیار کر لی۔ مگر اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ اپنی ہستی ختم کر دی، وجود مٹا دیا اور شراب سے پانی پانی ہو گیا۔

شراب اُسی صورت میں بنتی ہے کہ انگور بالکل ٹپکلا جائے اور اس کی ہستی مٹ جائے اسی کے جیسے جی کا کھونا اور شراب سے پانی پانی ہونا کھا گیا اور وہ بھی تیار ہو کر، یعنی بھری ہوئی ہے، کیونکہ اصل حالت میں آم کا مقابلہ نہ کر سکا۔ ہست بدلی اور دوسری شکل اختیار کر لی۔

۱۰۔ ۱۱۔ شرح : آپ کو کیا خبر ہے؟ مجھ سے پوچھیے کہ آم کے سامنے گتے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ دیکھیے، نہ آم کی طرح گتے میں پھول آتا ہے نہ اس کی شاخیں ہوتی ہیں، نہ آم جیسے پتے ہوتے ہیں، نہ ویسا پھل، پھر مٹتے ہیں کہ جب غزاں کا موسم آتا ہے تو اس کی بہار شروع ہوتی ہے۔

آخری مصرع کا مطلب یہ ہے کہ گنا اکتوبر میں پکتا ہے اور اس وقت غزاں کا موسم شروع ہو جاتا ہے۔ معلوم ہے کہ سردیوں ہی میں اسے پھل کر س نکالتے ہیں اور گڑ، شکر، چینی وغیرہ بناتے ہیں۔ اسی موسم میں یہ چوسا جاتا ہے یا اس کی گٹھیریاں کھاتے ہیں یا رس پیتے ہیں۔

۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ شرح : اور کہاں تھیں دوڑائیں؟ جان کو سب لوگ شیریں کہتے ہیں، لیکن اس میں ایسے مٹھاس کہاں، جیسی عام میں ہوتی ہے۔ اگر جان میں آم کے برابر شیرینی ہوتی تو کوکبن ایسی آسانی سے کیونکر جان دے دیتا مگر اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا اور جان دے دینے میں اسے کینائی حاصل تھی، پھر ہی وہ آم جیسی بیٹھی جان دے دینے پر بے تکلف آمادہ نہ ہو جاتا۔

۱۵۔ ۲۰۔ لغات - قوام : شیر۔ چاشنی۔

رافت : ہربانی۔

انگبیس : شہد۔

ربط الناس : انسانوں کا پروردگار

شرح : مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ازل کے دواخانے میں پھولوں کی آگ پر کھانڈ کا شیر تیار کیا گیا۔ اس شیرے کے تار کا نام ریشہ رکھا۔ مطلب یہ کہ یہ آم نہیں، بلکہ کھانڈ کو پھولوں کی آگ پر پکا کر چاشنی تیار کی گئی۔ وہی آم ہے اور اس چاشنی کے تار کو ریشہ سمجھ لو۔ اس میں خربہ یہ ہے کہ آم اور اس کے تار کی اصل ایک ہے اور وہ کھانڈ کا شیر ہے، لیکن آم شیرہ نہیں، بلکہ وہ جو پھولوں کی آگ پر تیار کیا گیا، یعنی منایت لطیف و دکاویز۔

یا ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ بہشت کے باغبانوں نے انتہائی مہربانی سے پروردگار کے حکم کے مطابق گلاس شہد سے بھرے اور ان پر مہری لگا کر دنیا میں بھیج دیے۔

چونکہ آم کو شہد بھرے گلاس سے تشبیہ دی اور گلاس کا منہ کھلا ہوتا ہے، اس لیے تشبیہ کو تمام بنانے کی غرض سے اسے سر بہ ہر گلاس قرار دیا۔ یا سمجھنا چاہیے کہ حضرت خضرؑ نے کوزہ مصری کی ایک شاخ لگائی اور مدت تک اسے آب حیات سے سینچتے رہے، یہاں تک کہ وہ شاخ درخت بنی۔ پھر اس میں پھل لگا، ورنہ آم نہیں کیونکہ نصیب ہوتے؟ ان شعروں میں بتایا گیا ہے کہ شاخ نبات مدت تک آب حیات سے سینچی جاتی رہی، جب کہیں آم تیار ہوئے۔

۲۱- ۲۲۔ لغات : ترنج زہ : سونے کا میوہ۔

خسرو : اس سے مراد ہے ایران کا مشہور بادشاہ خسرو پرویز جسے خسرو دوم بھی کہتے ہیں۔ یہ خسرو اول یعنی نوشیروان کا پوتا تھا۔ روایت ہے کہ اس کے پاس سونا تھا، جو روم کی طرح ملاحم تھا اور اسے ہاتھ سے ربا کر جو چیز چاہتے تھے، بنا لیتے تھے۔ خسرو نے اس کا میوہ بنوایا، جو اس کے دسترخوان

پر رکھا رہتا تھا۔ اسے ترخ زرد اور طلا سے دست افشار بھی کہتے تھے۔ طلائے دست انشاء کے معنی ہیں۔ سونا جو اُنھ سے بھیجا جا سکے۔

مشرح : خسرو پودین کے پاس سونے کا جو ایک لمبوتر تھا اور اسے ایک نادر چیز سمجھا جاتا تھا، لیکن میرے نزدیک تو اس میں کوئی خوبی نہ تھی۔ رنگ اس کا پیلا تھا اور خوشبو مٹتی ہی نہیں۔ اگر خسرو آم دیکھ پاتا تو یہ ہاتھ سے دب جانے والا سونا اٹھا کر پھینک دیتا۔

رنگ زرد اس لیے کہا کہ سونے کا رنگ واقعی زرد ہوتا ہے، لیکن غالب کا اشارہ سونے کی طرف نہیں، بلکہ ترخ زرد کی تحقیر کی طرف ہے، کیونکہ عام حالات میں رنگ کی زردی ضعیف یا بیماری کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ جو اس کی نفی کر کے ترخ زرد پر آم کی فوقیت ثابت کر دے، کیونکہ اس کا رنگ بھی پک جانے پر عموماً زرد ہو جاتا ہے۔ اور اس میں خوشبو بھی ہوتی ہے۔

۲۳۔ لغات۔ برگ و نوا : سرو سامان، لیکن یہاں بظاہر برگ سے مراد پتے اور نوا سے مراد مرنان چمن کی ترانہ دیزیاں ہیں، مگر یا کار کا وہ برگ و نوا سے مراد باغ ہیں۔

دو دمان : خاندان۔

مشرح : آم وہ پھل ہے، جسے چمن زاروں کی رونق قرار دینا چاہیے جو درخت اور پودے پانی اور ہوا سے تربیت کے محتاج ہیں، ان کے پورے سلسلے میں آم باعثِ فخر و تازہ ہے۔

۲۴۔ لغات۔ طوئی : بہشت کا ایک درخت۔

سدرہ : لفظی معنی سیری، لیکن اس سے مراد صدرة المنتہی ہے، جو ایسا اونچا مقام ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سوا کوئی اس سے آگے نہیں جاسکا اور حضورؐ معراج کی رات اس مقام سے آگے گئے تھے۔

جگر گوشہ : کیلجے کا ٹکڑا۔

شرح : آم بہشت کے راستے پر چلنے والے مسافر کا بازار ہے۔
طوبیٰ اور سدہ کے کیچے کا ٹکڑا ہے۔

پہلے مصرع کا مطلب : مجوز صاحب نے یہ قرار دیا ہے کہ اگر کوئی شخص
آم کھاتے کھاتے مر بھی جائے تو سیدہ جنت میں جائے گا۔

۲۵ - ۲۶ - **شرح :** آم کا درخت خوب پھولا پھولا اور پتوں سے
لدا چنوا رہتا ہے۔ گویا بہار نے اس درخت کو خاص ناز و نعمت سے پالا ہے۔
آم میں پھل تو خاص وقت ہی پر آتا ہے لیکن بلاشبہ خزاں میں بھی یہ پتوں
سے خالی نہیں ہوتا۔ پتے یقیناً مچھڑتے ہیں، لیکن اس طرح کہ ساتھ ساتھ پتے
نکلنے آتے ہیں اور شاخیں بدستور سبز رہتی ہیں۔

خصوصاً وہ آم جو آسانی سے ہاتھ نہیں آ سکتا اور بازار میں نہیں بکتا۔ وہ
سلطان یعنی شہزادے کے باغ کا نیا پھل ہے۔ سلطان سے مراد شہزادہ
ولی عہد ہے اور بادشاہ وقت کے تمام شہزادے "سلطان" ہی کہلاتے تھے،
جس طرح عام شہزادے "سلاطین" کہلاتے تھے۔

۲۷ - ۲۸ - **شرح :** وہ جو ولایتِ عہد کا وائی، یعنی سلطنت کا
ولی عہد ہے اور جس کے عدل و انصاف سے زمانے کی حمایت ہو رہی ہے۔ وہ
شہزادہ فخر الدین، حسن سے جاہ و جلال کی عزت، و شان قائم ہے۔ وہ شہزادہ
جو حضرت کی نوبت اور کمال کا حسن و جمال ہے۔

فخر دین سے یہاں دین کا فخر بھی مراد لیا جاسکتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے،
کہ یہ غالب کے مدوح شہزادہ فخر الملک، عورت مرزا فخر کا اصل نام تھا، یعنی
غلام فخر الدین، اس لیے یہاں وہی مراد ہے۔

کہتے ہیں کہ غلام فخر الدین سے جاہ و جلال نے عزت، اور شان پائی۔ اسی
سے طبیعت کو زینت حاصل ہوئی، اسی سے کمال کو نور ملا۔

وہی دین، سلطنت اور نصیب کا کارمزا ہے، یعنی تینوں کے معاملات اسی

کے ذریعے سے طے پاتے ہیں اور وہی تاج، تخت اور گدھی کے لیے وقت اور آرائش کا باعث ہے۔ یعنی یہ تینوں چیزیں اس شہزادے کی وجہ سے خوب صورت اور دلآویز معلوم ہوتی ہیں۔ وہ شہزادہ، جس کا سایہ ہلاکتی طرح مبارک سایہ ہے۔ وہ شہزادہ، جو خدا کے بندوں پر خدا کا سایہ ہے۔

۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ یہ تینوں شعر دعا تیر ہیں۔

لغات : معین : فیض پہنچانے والا، فیض رساں۔

مشرح : اے سائے اور نور کے وجود کو فیض پہنچانے والے خدا

بزرگ ! جب تک اس دنیا میں سائے اور نور کا وجود باقی ہے، میرے اس آقا کو جو اپنے غلاموں کی پرورش کر رہا ہے، خوانے، تاج اور تخت کے لڑتے کو، یعنی جس کی دلی عہدی کا فرمان خود بادشاہ دے چکا ہے، خوش، خوش دل اور خوش خوش رکھنا اور تیری بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ غالب پر ہمیشہ مہربان رہے

اسی وقت، انہیں رذوق کا سہرا ملا اور مشرکی بھی گئی، کوپے کوپے میں چین کیا۔ میزرا بڑے اداس بن گئے۔ سمجھے کہ کیا تھا کچھ اور، ہو گیا کچھ اور، اسی وقت قطعہ لکھ کر حضور میں گزانا۔ سب طرف تعریفیں ہوئیں۔ ”مولانا کا یہ بیان بھی ان کے اکثر بیانیوں کی طرح کمتر حقیقت اور زیادہ تر سخن آرائی ہے۔“

قطعات

۱۔ بہ حضورِ شاہ

اے شہنشاہِ فلک منظر و بے مثل و نظیر
 اے جہاندارِ کرم شیوہ و بے شبہ و عدیل
 ہاتھ سے تیرے لئے فرقِ ارادت، اورنگ
 فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت، اکلیل
 ترا اندازِ سخن، شاہِ زلفِ الباسم
 تری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبِ ریشم
 تجھ سے عالم پہ کھلا رابطہٴ قربِ کلیم
 تجھ سے دنیا میں بچھا ماندہٴ بذلِ خلیل
 بہ سخن اورجِ دو مرتبہٴ معنی و لفظ
 بہ کرم، داغِ نہِ ناصیہٴ قلزم و نیل
 تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر
 تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقیل
 ماہ نے چھوڑ دیا، ثور سے جانا باہر
 زہرہ نے ترک کیا، ثوت سے کرنا تحویل

۱۔ لغات

فلک منظر:

جس کا جھڑکا آسمان پر

شبہ:

نظیر، مشابہ

عدیل: برابر، مثال

شرح

اے شہنشاہ! جس

کے لیے آسمان جھڑکا

بنا ہوا ہے اور جس کا کوئی

مثیل و نظیر نہیں اور اسے

جہلی کے سلطان، جس کا

طریقہ ہی یہ ہے کہ لوگوں

پر نوازش کرے اور جس

کا کوئی ثانی اور کوئی بدل نہیں۔

۲۔ لغات

فرق: سرِ جہتی۔

اورنگ: تخت۔

کسب: حاصل کرنا

اکمیل : تاج

شرح

تخت اپنے سر کی چوٹی
حیرے پائے مہلک سے
نہ ہوا چاند خیر سے سر کی
چوٹی سے تاج سعادت و
یک تختی حاصل کر رہا ہے ۔

شعر کی غرضی صحت
تشریح نہیں ۔ تخت پر بیٹھنے
والے کے پاؤں بہر حال
تخت کے سر پہ ہوں گے ۔
اور تاج تاجدار کے سر پہ
رہے گا ۔ تخت بادشاہ کی
اطاعت و فرمانبرداری کا
ظہار عاجزانہ کر رہا ہے اور
تمام بادشاہ کی تربیت کے
بے سر پہ نہیں آیا ، بلکہ اپنے
بے حمول سعادت کا سر پہ
بجھ کر سر پہ کیا ہے ۔

۳۔ لغات :

بال جبریل :

حضرت جبریل کے بال پر

شرح :-

تری دانش ، مری اصلاحِ مفاسد کی رہن
تری بخشش ، مرے انجارج مقاصد کی کفیل
ترا اقبالِ ترحم ، مرے جینے کی نوید
ترا اندازِ تغافل ، مرے مرنے کی دلیل
بخشت ناساز نے چاہا کہ نہوے مجھ کو اماں
چرخِ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل
پیچھے ڈالی ہے سرِ شستہ اوقات میں گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے بُنِ ناخن تدبیر میں کیل
تپشِ دل نہیں بے رابطہ خوفِ عظیم
کششِ دم نہیں بے ضابطہ رجزِ ثقیل
دُرِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی داڑھی
غم گیتی سے مرا سینہ عمرو کی زنبیل
فکر میری گھراںدوزِ اشاراتِ کثیر
کلمک میری رقمِ آموزِ عباراتِ تحلیل
مرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
مرے اجمال سے کرتی ہے تراوشِ تفصیل

نیک ہوتی مری حالت، تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر، تو نہ کرتا تعجیل
قبلہ کون و مکان! خستہ نوازی میں یہ دیر
کعبہ امن و امان! عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

تیرا انداز گفتار ایسا ہے،
جس سے الہام کی نون میں
کلمی جوتی جاتی ہے، یعنی
اسے سفوراجا ہے اور تیرے
قلم کی رفتار ایسی ہے جیسے
جبریل کے بال و پر ہوتے ہیں

۴۔ لغات۔ رابطہ: تعلق

قرب: کلیم: حضرت موسیٰ کا قرب

ماندہ: دسترخوان

بذل: سخاوت و نوازش

تخلیل: حضرت ابراہیمؑ، جنہیں تخلیل اللہ کہتے ہیں۔

شرح۔ حضرت ابراہیمؑ کی ایک بڑی خصوصیت مہمانداری تھی اور حضرت موسیٰؑ کی ایک بڑی خصوصیت اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونا جس کی وجہ سے کلیم اللہ خطاب پایا۔ تیرے دم سے اس خاصہ میں دنیا پر یہ آشکار ہوا کہ حضرت کلیم اللہؑ کو ذات باری سے کتنا قرب تھا۔ تیرے ہی دم سے رو سے زمین پر حضرت ابراہیمؑ کا دسترخوانِ نعمت بچھا۔

مطلب یہ کہ حضرت کلیم اللہؑ کا قرب اور حضرت ابراہیمؑ کا بذل، دونوں جوہروں کا پر تو،

تیرے اندر موجود ہے۔

۵۔ لغات۔ سخن: گفتگو، شعروخی۔

اوج قہ: بندگی دینے والا۔

ناصیر: پیشانی

شرح۔ بادشاہ گفتگو اور شعرو سخن کے ذریعے سے معنی و مفاد کے درجے کو بندگی

دینے والا ہے اور اس کا شیوہ کرم ایسا ہے، جو نیک جیسے دریا اور قزم جیسے سمندر کی پیشانی پر

بھی داغ لگا دیتا ہے۔

۷۔ لغات۔ توفیر: زیادتی، افراط۔

تقلیل: کم کرنا، کمی، بقیت۔

ثور: مراد ہے برج ثور جس کی شکل بیل سی تجرہ کی گئی ہے۔

حوت: مراد ہے برج حوت جس کی شکل مچھلی کی سی تجرہ کی گئی ہے۔

تحويل: پھرنا، عداے کرنا۔

بیت دانوں کے نزدیک چاند برج ثور میں ہو تو عیش و طرب کی دلیل ہے اور زہرہ برج

حوت میں ہو تو رنج و غم میں کمی آجاتی ہے۔

شرح۔ چاند نے برج ثور سے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ زہرہ نے برج حوت میں پہنچ کر

پھر تازہ کر دیا۔ یہ اس لیے کیا کہ اسے شہنشاہ: تیسرے وقت میں عیش و طرب بہت زیادہ۔

ہو جائے اور حیرے عہد کے اندر رنج و غم میں کمی آجائے۔

۸۔ لغات۔ مفاسد: مفسدہ کی جمع، خرابیاں اور غلطیاں۔

رجین: گیند، مٹھن۔

انجاء: پروا ہونا۔

کیفیل: ذمہ داری اٹھانے والا۔

شرح۔ اسے بادشاہ: حیرتی عقل و دانش میری خرابیوں اور کوتاہیوں کو دور سے

کرنے کی خاموشی ہے اور حیرتی بخشش میرے مقاصد پر دے کرنے کی نادمہ داری ہوئی ہے۔

۹۔ لغات۔ اقبال: قوت، رخ، انکسار۔

شرح۔ تیسرے دم و دم کی بدولت مجھے بیچنے کی خوشخبری ملی رہی ہے، اگر تو کھانا اختیار

کے تو وہ میرے مرنے کی دلیل بن جائے گا، یہی تیسرے دم و دم پر زندہ ہوں اور تو

بے پروائی اختیار کرے تو مر جاؤں گا۔

۱۰۔ ۱۱۔ شرح۔ میں نیچے کو مجھ سے موافقت نہیں، اس کی خواہش تھی کہ مجھے امن و امان

حاصل نہ ہو نیز میری چال چلنے والے آسمان نے مجھے ذلیل کرنے میں کوئی گستاخانہ نہ رکھی۔

پچھلے میرے ناخن تیرے کی جڑ میں کھنکھار دی، پھر اوقات کے دھماکے میں گانٹھ ٹوٹ گئی

مطلب یہ کہ اوقات کے دھانکے کی گائندہ تدبیر کے ناخن ہی سے کھولی جاسکتی تھی، لیکن جب ناخن تدبیر کو بیکار کر دیا گیا تو اس گائندہ کے کھولنے کی کون سی صورت باقی رہی؟

۱۲۔ لغات - بحر الثقیل : لغوی معنی، بھاری چیزوں کو کھینچنا۔ وہ علم یا اگر جس کے ذریعے سے بھاری چیزیں بہ آسانی اُدھر کھینچی جاتی ہیں۔ آج کل ریڈیوں اور بیوں کے لیے اس قسم کے اُسے بکثرت استعمال ہوتے ہیں

شرح - دل میں جو تپش واضطراب ہے وہ ایک جھوٹے خوف سے بے تعلق نہیں۔ یعنی اس خوف ہی کا نتیجہ ہے۔ میرے لیے سانس لینا یا کھینچنا علم بحر الثقیل کے قاصد کے کام لیے بغیر ممکن نہیں، گویا میرے لیے سانس لینا بوجھ شکل ہے۔

۱۳۔ لغات - لغات : داستان امیر حمزہؑ کے ایک مشہور کردار جس کی ٹاڑھی میں موتی، پروئے، بہتے تھے۔

غمر : مولانا طباطبائی نے یہ نام آخر لکھا ہے اور فرماتے ہیں کہ غمر غالب نے یونہی لکھا تھا تاہم حضرت غمرؑ سے انقباس نہ ہو۔ عرضی صاحب نے اپنے دیوان میں غمر (جس انقباس لکھا ہے۔ داستان امیر حمزہؑ سرتاپا افسانہ ہے، لیکن اس کے بعض کرداروں کے نام ایسے رکھے گئے ہیں جو حقیقتاً موجود تھے۔ حنفی غمر بن ابیہ زمری، جبکہ داستان گروہوں نے غمر بیار بنا دیا۔

زنہیل : چری جھولی کہا جاتا ہے کہ غمر کی زنہیل ایسی تھی جس میں سب

کچھ بھرا ہوا تھا۔

شرح - معانی کے موتیوں سے میرے کاف کا صفحہ حاکی ٹاڑھی معلوم ہوتا ہے، یعنی جس طرح حاکی ٹاڑھی میں موتی پر دئے بہتے تھے، اسی طرح میں جو شعر کہتا ہوں، وہ موتیوں کی لڑیاں ہوتی ہیں۔

زمانے کے دغ و دام سے میرا سینہ غمر کی چری جھولی بنا ہوا ہے، مطلب یہ کہ ساری دنیا کے غم میرے سینے میں جمع ہیں

۱۴۔ لغات - گہرا اندوز : موتی جمع کرنے والا، موتی روئے والا۔

شرح - میری فکر بہت سے اشعاروں کے موٹی رو متی ہے اور میرا نظم مختصر،
عبارتیں گھٹنا سکھاتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ میں سوچتا ہوں تو کثیر اشعار سے موتیوں کی شکل میں میرے سامنے آ جاتے
ہیں، لیکن گھٹنا ہوں تو کم الفاظ میں مطلب پیش کر دیتا ہوں۔ کثیر اشعاروں سے آپ پر رمی،
کیسے سمجھ سکتے ہیں

۱۰۔ لغات - ابہام : اس طرح بیان کرنا کہ وضاحت و جو فقرہ الفاظ میں،
غیر واضح طریق پر بات کہنا۔

ایکمال : اختصار۔

تراوش : چکاؤ، چلنا۔

شرح - میں کئی سول طریق پر بھی بات ایسے انداز میں کرتا ہوں، جس پر وضاحت قربانی
ہوتی ہے میرے اختصار سے تفصیل خود بخود ملتی ہے۔ یعنی میں سرسری طور پر بھی کہے کہ دونوں کو وضاحت
ہے اس میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ میں اختصار سے بھی بات کروں، تو جتنی تفصیل حقیقتہً،
مطلب ہے وہ اس میں آ جاتی ہے۔

۱۱۔ لغات - تعجیل : جلدی، جلدی کرنا۔

شرح - اگر میری حالت اچھی ہوتی تو حضورؐ کو تکلیف دینا گوارا نہ کرتا۔ اگر میری
ظاہر میں برائی تو جلدی نہ کرتا۔

حقیقت یہ ہے کہ حالت نہایت خواب ہے اور تکلیف دینا ناگزیر ہو گیا۔ سخت پریشان
ہوں اس لیے جلدی کرنی پڑی۔

۱۲۔ لغات - خستہ نوازی : بد حال پر نوازش۔

شرح - اسے کولہ و مکان کی قبل گاہ ! خستہ و بد حال پر لطف و نوازش میں اتنی دہرا
یہ تو مناسب نہیں۔

اسے اسن و امان کے کعبے ! مشکل آسان کرنے میں اتنی توجہ؟

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں، عقوہ کھائی سے ڈھیل دینے کو اس فقرہ مناسب ہے کہ

تعمین نہیں ہو سکتی۔ یہ سچ ہے کہ بے ذہیل دیے گرو نہیں کھل سکتی لیکن اس قدر ذہیل
کوئی دیتا ہے ؟

۲۔ بہ حضورِ شاہ

اے شہنشاہ آسماں اور نگ	اے جاندارِ آفتابِ آثار؛
تھامیں اک بے نواے گوشہ نشین	تھامیں اک درومندِ سینہ نگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی	ہوئی میری وہ گرمی بازار
کہ ہوا مجھ سا فزہ ناچیز	روشناسِ ثوابت و ستار
گر چہ از روئے ننگِ بے بہری	ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ اگر اپنے کو کہوں خاکی	جانتا ہوں کہ آتے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں	بادشہ کا غلامِ کار گزار
خانہ زاد اور مرید اور مداح	تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہو گیا، صد شکر	نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں

مدعاۓ ضروری الاظہار

پیر و مرشد! اگرچہ مجھ کو نہیں فوقِ آرائشِ سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر تانہ دے باز مہرِ آزار
 کیوں نہ درکار ہو مجھے پوش؟ جسم رکھتا ہوں، ہے اگرچہ نزار
 کچھ خریدنا نہیں ہے اب کمال کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
 رات کو آگ اور دن کو دھوپ بھاڑ میں جاتیں ایسے یل و نہار
 آگ تا پے کہاں تک انسان دھوپ کھائے کہاں تک جاندار

دھوپ کی تابش، آگ کی گرمی

وقتنا دینا عذاب النار

مری تنخواہ جو مقرر ہے اُس کے ملنے کا ہے عجب بخار
 رزم ہے مُردے کی چھ ماہی لیک خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
 مجھ کو دیکھو تو ہوں بے قید حیات اور چھ ماہی ہو سال میں دوبار
 بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض اور رہتی ہے سود کی تکرار

مری تنخواہ میں تھائی کا

ہو گیا ہے شریک سا ہو کار

آج مجھ سا نہیں زمانے میں شاعرِ لغز گوے خوش گفتار
 رزم کی داستان گر سنیے ہے زباں میری، تیغ جو سہوار

بزم کا التزام گر کیجئے ہے قلم میری، ابریہ گوہر بار

ظلم ہے، اگر نہ دوسخن کی داد

قہر ہے، اگر نہ مجھ کو پیار

آپ کا بندہ اور چھروں ننگا؟ آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھاڑ

میری تنخواہ کیجئے ماہ بہ ماہ تانہ ہو مجھ کو زندگی دُشوار

ختم کرتا ہوں اب دُعا پہ کلام شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

تمہید۔ - آٹھ سے مرزا کا سلسلہ ملازمت ختم ہونے کے وسط میں شروع ہوا تھا اور

تاریخ نگاری کی خدمت سپرد ہوئی تھی۔ ملازمین نقد کو چھ چھ بیٹے کی تنخواہیں اکٹھی ملتی تھیں مرزا، اپنے ایک خط (مرقوم ۲۔ جنوری ۱۹۵۷ء) میں منشی نجی بخش فقیر کو لکھتے ہیں۔

اب چھ بیٹے پارے ہو چکے، ۲۔ جولائی سے دبیر

مستحقک، اب میں دیکھوں کہ شش ماہ مجھے

کب ملتا ہے۔ بعد اس کے مٹنے کے اگر آئندہ

ماہ بہ ماہ کروں گے تو میں لکھوں گا، ورنہ اس

خدمت کو میرا سلام ہے۔ ابھی باہر کا حال حضور

میں نہیں جیسا، کی سورت تمام ہوا ہے صاف ہوا

ہے۔ اب صاف کر کر دے دوں گا اور ماہ بہ ماہ

کی استدعا کروں گا۔ چہاں ہی باخبر ہونے کو متھی

اس واسطے متوجہ ہو کر میں نے اس کو تمام کیا

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لشکر کے احوال میں یہ قطعاً باخبر کے حالات کے ساتھ
یا چند روز آگے پہنچے پیش ہوا ہوگا اور یقین ہے کہ بادشاہ نے مرزا کی درخواست منظور کرتے
ہوئے خزانہ باہ بہاد اور ہونے کا حکم دے دیا۔ اسی سے مرزا نے تاریخ نگاری کا کام
جاری رکھا اور مزید شکایت کا کوئی سرعہ نہیں بنا۔

۱۔ لغات - اورنگ : تخت۔

شرح - اے بادشاہ ! جس کے تخت کو آسمان کی سی بندی حاصل ہے۔ اور
اے جہاں کا انتظام کرنے والے ہوا آفتاب کے سے نشان رکھنے والا ہے !

۲۔ ۳۔ ۴۔ لغات - روشناس : صورت پہچاننے والا ، واقف۔

ثابت و ستیار : پرانے ہیئت و انوں نے ستاروں کی دو قسمیں
کی تھیں ، ایک ثابت ، یعنی ٹھہرے ہوئے ، دوسرے ستیار ، یعنی پھنے اور نیوگردش کرنے والے
شرح - میں ایک بے سرو سامان گوشہ نشین تھا۔ ایسا دروند تھا جس کا سینہ
زخمی تھا۔ آپ نے میری آبرو بڑھائی اس سے میری زندگی میں ایسی رونق ہوئی اور میں نے
وہ عزت و شہرت پائی کہ مجھ ایسے عزیز آدمے کو آسمان کے ٹھہرے ہوئے اور گردش کرنے والے
ستاروں سے بھی جان پہچان ہو گئی

۵۔ ۱۔ لغات - مشتق : تفتیش کیا گیا ، تفتیش ہونے لگا

شرح - اگرچہ میں بالکل بے خبر ہوں اور اس ننگ کے باعث خود اپنی نعروں
میں اتنا ذلیل و خوار ہوں کہ اگر میں اپنے آپ کو غلامی کہوں تو جانتا ہوں کہ خاک اس نسبت کو اپنے
پے باعث ننگ سمجھے۔ تاہم دل میں خوش ہوں کہ مجھے بادشاہ کا کارگرد غلام ہونے کا فخر حاصل
ہے۔ درخواست گزار میں جیسے سے غلام زاد غلام ، مرید اور تاج پہا کرتا تھا۔ اب لشکر کا تمام
سہہ کو کر رہی ہو گیا۔ اس طرح چار نسبتیں مسلم ہو گئیں۔ یعنی غلام زاد ، مرید ، تاج اور لوکر۔ اب
آپ فرمائیں کہ میں مقصد کا اظہار ضروری ہو ، وہ آپ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں ؟

۱۱۔ ۱۔ لغات۔ باوزمریہ : نہایت سرد ہوا۔

وقتا رہتا عذاب النار : اسے ہمارے پروردگار ! ہمیں آگ

کے عذاب سے بچا۔

شرح۔ پیر و مرشد ! اگر مجھے سر پر دستار پہنانے کا کوئی ذوق نہیں، یعنی میں کمالات نہیں چاہتا، لیکن جانے کا موسم ہے، آخر کوئی مذکوئی چیز تو ہونی چاہیے، مجھے حدود پر سوار ہوا کے ڈکھ پہنچانے سے بچانگے۔ اگرچہ میرا جسم بہت دھڑکا اور خفت ہے۔ لیکن غور فرمائیے کر کیا اسے لباسِ درکار نہیں؟ اس سال کچھ نہیں خریدنا اور اب کے کوئی کپڑا نہیں بنایا۔ حالت یہ ہے کہ رات کو آگ تاپتا ہوں، دن کو دھوپ کھاتا ہوں۔ ایسے رات دن کو آگ لگے۔ غور سوچئے کہ انسان کہاں تک آگ تاپ کر گزارہ کرے اور جاندار کب تک دھوپ کھائے؟ دھوپ کی تیزی اور آگ کی گرمی دیکھ کر بے اختیار یہ کلام زبان پر جاری ہو جاتا ہے۔ اسے ہمارے پروردگار ! ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔

۱۸۔ ۲۲۔ لغات۔ ہنہار : طریقہ، تاعہ، روش۔ شیوہ۔

چھہماہی : فاتح اور کھانا جو کس کے مرنے کے بعد چھٹے،

ہینے ہوتا ہے۔

تکرار : دہراتا، بحث، جھگڑا، یہاں مراد سود و در سود سے

ہے، یعنی سود بار بار ڈگنا ہوتا رہتا ہے۔

شرح۔ میری تنخواہ، جو حضور نے مقرر فرمائی ہے، اس کے ملنے کا طریق بڑا عجیب ہے۔ چھ ہینے کے بعد مڑے کی رسم ادا کی جاتی ہے اور لوگوں نے اس رسم کو اپنا دستور بنایا ہے۔ اب مجھ پر نظر ڈالیے میں زندگی کی قید میں ہوں، کھانے پینے اور دوسری ضرورتوں کے لیے خرچ چاہیے۔ چھ ماہی سال میں دو مرتبہ جرتی ہے۔ مائدہ خرچ کیونکر پورا ہو؟ حیات کے ساتھ حمید کے لفظ سے واضح کر دیا کہ زندگی میری مرضی اور غرضی کے مطابق نہیں گزر رہی۔ یہ سمجھنا چاہیے کہ میں اس کی قید میں ہوں اور چار و ناچار مجھے بغیر چارہ سنوں۔

ہرینے مجھے قرض لے کر گزارہ کرنا پڑتا ہے اور قرض پر سود برابر بڑھتا رہتا ہے ۔
 کیونکہ ساہوکار ہرینے سود و سود پر مل کر رہا ہے ۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ چھوٹے میں سود و سود
 کے باعث تنخواہ کی تنہائی رقم سود میں دینی پڑتی ہے گویا میری تنخواہ میں ایک تنہائی کا ،
 حق دار ساہوکار رہ گیا ۔

۲۳-۲۵۔ لغات ۔ نغز گو : نہایت شگفتہ و دلآویز شعر کہنے والا ۔

اتزام : لازم بنانا ، اجتام ۔

شرح ۔ آج اس دور میں ایسا شاعر موجود نہیں جو میری طرح شگفتہ و دلآویز
 شعر کہ سکے اور شیریں بیانی سے کام لے سکے ۔ ذمہ گی کے مشاغل کی دو جڑی تقسیم
 کی گئی ہیں : رزم اور بزم ، یعنی لڑائیاں اور محفل آزمائی ۔ آپ رزم کی داستانیں سنیں تو میری
 زبان پر ہر وار تموار کا لام دے گی اور میدان جنگ کے حالات اس غزل سے بیان کرے گی کہ اس
 سے بہتر ممکن نہ ہو ۔ اگر بزم کا ذکر لازم کر لیا جائے تو میرا قلم موتی برسانے والا بادل ہی بجائے
 گا اور چشم نشاط کا سماں باندھ دے گا ۔

۲۶-۲۸۔ شرح ۔ اگر میری شعر گوئی کی داد ذریعہ تو یہ طریقہ انصاف سے بعید ہوگا
 اور اگر مجھ سے بہتر ذکر کریں تو اسے قہر گھٹانا چاہیے ۔ میں آپ کا غلام ہو کر یوں شگاہوں
 اور آپ کا نوکر ہو کر اذعار کھاؤں ؟ حکم دیجیے کہ میری تنخواہ ہر مہینے ادا ہوتی ہے تاکہ زندگی
 میرے لیے دشوار نہ رہے ۔

۲۹-۳۰۔ شرح ۔ اب میں یہ قطعہ دعا پر ختم کرتا ہوں ۔ اس بارے میں مجھے شعر گوئی
 سے کچھ سروکار نہیں ، صرف اپنا حال تار و ناخ کرنا چاہتا ہوں ۔ آپ ہزار برس
 سلامت رہیں اور برس بھی ایسے کہ ہر ایک کے دل تین سو بیسٹھ کے بجائے
 پچاس ہزار ہوں ۔

۳۔ مدح شاہ

اے شاہِ جہانگیر جہاں بخش جہاں دار ۱۔ شرح :

اے بادشاہ ! جو
جہاں کو فتح کر بیٹھ والا،
جہاں بخش دینے والا
اور جہاں کا انتظام کرنے
والا ہے، تیرے لیے
ہر لحاظِ غیب سے سزا
نور و شہزادیاں ہیں۔

گر لب کو نہ دے چشمہٴ حیاں سے طہارت ۲۔ شرح :

آصف کو سلیمان کی وزارت سے شرفِ مہتا
ہے فخرِ سلیمان جو کرے تیری وزارت
ہے نقشِ مریدی ترا، فرمانِ الہی
ہے داغِ غلامی ترا، توقیعِ امارت
کوں کر رکھ دے۔

تو آب سے گر سلب کرے، طاقتِ سیلاب ۳۔ شرح :

کیا یہ ممکن ہے کہ حضرت
خضرؑ سکندے سے تیرا
تذکرہ کریں جب تک
ہوں کو آبِ حیات،

تو آگ سے گر رنج کرے، تابِ شرارت
ڈھونڈے نہ ملے موجِ دریا میں روانی
باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت

سے دھوکہ پاک نہ ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں تو غسل

کریں! مینی تیرا نام ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت
ہوں کو پاک کیجے بغیر کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دُعا پر
نہیں کیا جاسکتا۔

۳۔ لغات : قاصر ہے تالش میں تری، میری عبارت
آصف :

حضرت سیما کا ذکر۔ نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہونے میں

شرح : نگار کی صنعتِ حق اہل بصارت
ہفت کو حضرت پیدا

کی وزارت سے بڑی تجھ کو شرفِ مہر جہاں تابِ مبارک

لی اور اس نے رتہ
علی پایا۔ اسے یاد شاد

جو فرد تیری طرف سے وزارت پر مامور ہو، وہ فرمایاں ہی جائے گا۔

موصوع کے ایک صفحہ پر بھی جو لکھتے کہ حضرت سیما کی تیری وزارت کریں تو یہ
ان کیلئے فخر کا باعث ہو۔ ہمارے شاعر مدح و ستائش میں عموماً حدود کا خیال نہیں رکھتے۔

۵۔ لغات : نقش : مہر، قرع۔ نقشِ مریدی کا مطلب ہے جسے کہ منل

بادشاہوں نے پیری مریدی سلسلہ بھی جاری کر دیا تھا، اسی لیے بادشاہ کو پیر و مرشد
بھی کہا جاتا تھا اور لوگ باقاعدہ ان کے مرید ہوتے تھے۔

توثیق : وہ کاغذ جس پر شاہی دستخط ہوں، فرمان

شرح : جس شخص کے پاس تیری مریدی کی قرع ہو، سمجھنا چاہیے کہ اسے

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے حکم مل گیا، یعنی تُو دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نائب و خلیفہ ہے کسی
فرد کی پیشانی پر تیری غلی کے داغ کو امیری اور حکمرانی کا درجہ حاصل ہے۔

۶۔ لغات : سلب : چھیننا، کھینچ لینا، نکل کر دینا۔

سیلان : بہنا ، روان

شرارت : شطرنج ہونا ، بھڑکانا۔

شرح : اگر تو پانی سے بہاؤ کی قوت چھینے اور آگ سے بھڑکنے کی

فعلت نائل کر دے تو دوریا کی موجوں میں بہاؤ ڈھونڈنے سے نہ بے اور جیتی ہوئی
آگ میں حرارت پائی نہ رہے۔

۸-۹۔ لغات : تَوَفُّعٌ : اٹھنا ، دھنسنے ، مضبوطی۔

قاصر : قصور دار ، عاجز۔

شرح : اگرچہ نکتے بیان کرنے میں مجھے کمال اٹھنا ہے اور جادو بیانی میں

پردہ مہارت دکھانا ہوں ، لیکن اسے بادشاہ امیراؤ وغیرہ الفاظ تیری تفسیر کا حق ادا
نہیں کر سکتا ، اس لیے کیلائے میں مدح کو دعا پر ختم کرتوں ؟

۱۰۔ لغات : نظارگی : دیکھنے والا ، حاشائی۔

شرح :۔ آج نذر دہ ہے اور یہ ایسا دن ہے کہ آنکھوں والے خدا کی کار سانیوں

کا نظارہ کر رہے ہیں۔

نوروز : یہ تقریب آفتاب کے برج حمل میں داخل ہونے

پر منائی جاتی تھی اور خود مرزا نے اس بارے میں لکھا کہ کوئی بات یہ ہے ، یہ داخلہ
۲۲ مارچ کو ہوتا ہے اور کہیں ۲۱ مارچ اور ۲۳ کو کہیں اس سے تباہ اور نہیں۔

۱۱۔ لغات : معتبر : آستانہ ، دبیر۔

شرح :- برج حمل میں آفتاب کے داخلے ہی کی بنا پر کہا کہ اسے بادشاہ !

تجے دنیا کو مددشنہ کر دینے والے سورج کی سہا بندی و برتری حاصل ہو اور غائب کر
تیرے اونچے آستانے کی زیارت کا شرف نصیب رہے۔

۴۔ تقریب چہار شنبہ صفر

تفسیر:-
 ماہ صفر شہ جہ کے
 آخری چہار شنبہ کو
 حضرت رسول اکرم
 (معلم) بیمار ہوئے
 تھے۔ مسلمانوں نے
 یہ دن دعا و استغفار
 اور صدقہ و خیرات
 کے لیے مقرر کر
 لیا۔ پہلے جس دن
 وعظ ہونے لگے،
 پھر دوسری زمینیں
 شروع ہو گئیں۔ لال
 تلو میں اس روز
 سونے چاندی کے چھلے بٹنے لگے۔

ہے چار شنبہ، آخر ماہ صفر چلو
 رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مشکبو کی ناند
 جو آئے جام بھر کے پئے اور بہو کے مست
 سبزے کو روند تا پھرے، پھولوں کو جائے پھاند
 غالب! یہ کیا بیاں ہے، بجز مدح بادشاہ
 بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت و خواند
 بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلے حصوڑ میں
 ہے جن کے آگے سیم وزیر، مہر و ماہ ماند
 یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے
 لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند
 سونے چاندی کے چھلے بٹنے لگے۔

عناصر شکاف نے بھی یہ تقریب دیکھی تھی۔ وہ اپنے روزنامے میں اس
 کی کیفیت یوں بیان کرتا ہے: بادشاہ باغ حیات بخش میں گئے۔ ایک ہنڈیا میں اشرفی
 ڈالی اور اسے پاؤں کے رباؤ سے توڑا۔ پھر گھاس کو روندنا۔ بعد ازاں دیوانہ
 میں دوبارہ کا سامان ہوا۔ ہر شاخ شاہی سے کٹی میں چھتے آگے۔ بادشاہ نے پانچ

خود پہنے ، پندرہ بیگم زینت محل کو دیے ، پانچ پانچ دوسری بیگمات کو ، سات گورنر جنرل کو ، پانچ اس کی میم کو ، چھ مفت گورنر آگرہ کو ، ایکٹ کو پانچ ایکٹس کے اور پانچ خطاب فرزندئ کے ، کپتان قلعہ کو پانچ کپتانی کے اور چار سکریٹری شپ کے ، ایک سورج نرائی کو اور ایک حکیم حسن اللہ خاں کو۔

غرض یہ تقریب اسی طرح ہر سال منائی جاتی تھی۔ اسی پر کسی وقت یہ شعر کہے گئے جن میں ریم کے بعد بیہوش کا ذکر بھی آگیا ہے۔

۱۔ لغات ہو۔ ناند ؛ بہت بڑا کوٹھا ، مٹی کا بہت بڑا برتن۔

شرح ؛ اہ منہ کا آخری بدھ ہے۔ پلو ، ایک بڑا برتن مثلاً بھیس ، خوشبو والی حشراب سے بھر کر باغ میں رکھ دیں۔

۲۔ شرح ؛ تاکر بھی آئے ، ہام بھر بھر کر پیئے اور مست ہو کر بنرے کو دفن کیا پھرے۔ چوہوں کو لالک جاتے ، یعنی ان پر پاؤں نہ پڑنے دے۔

۳۔ شرح ؛ اسے غائب ، تو یہ کیا کہتا ہے ، اب تو مجھے بادشاہ کی مدح کے سوا کوئی کھنا چھٹا ہند ہی نہیں آتا۔

۴۔ شرح ؛ دیکھ ؛ بادشاہ کے حضور میں سونے چاندی کے چھلے جلتے ہیں ، اچھی کی چمک دیک کے سامنے سورج کی چاندی اور چاند کا سونا بھی لاند ہے۔

۵۔ شرح ؛ یوں سمجھنا چاہیئے کہ یہ چھتے نہیں ، بلکہ لاکھوں سورج اور بیسٹار چاند درمیان سے غالی کر دیے گئے ہیں۔

۵۔ مدح نصرت الملک

نصرت الملک بہادر ! مجھے بتلا کہ مجھے ؛ ۱۔ شرح ؛
تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے
۱۔ نصرت الملک
بہادر ! مجھے یہ

بتا کر تیرے ساتھ ہے گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے
 جو اس قدر اداوت ہے رونق بزم مہ و مہر تری ذات سے ہے
 تو کس دہرے سے؟ مطلب یہ کہ اور میں وہ ہوں کہ گرجی میں کبھی غور کروں
 محض افہام و اکرام سے تو ایسے دل اور غیری کیا، خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے
 روحانی اداوت پیدا نہیں ہو سکتی، یقیناً اس کا سبب ذاتی
 محبت و عقیدت تھا ہاتھ میں تیرے رہے تو سن دولت کی عناں
 جو سرا سرا غلام پر یہ دعا شام و سحر قاضی حاجات سے ہے
 مبنی ہے۔
 مولانا بلبل خانؒ تو سکندر ہے، مرا فخر ہے، ملنا تیرا
 بالکل بجا فرماتے ہیں گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے
 کہ اس مقام پر استفہام و استنباط میں غنایت اس پر گزرتے نہ گماں ریو و ریا کا زہن سار
 بوجھت ہے، جس سے ایسے معانی غالب خاک نشیں، اہل خرابات سے ہے
 جلیل پیدا ہوئے، یعنی محض سوال ہی سے یہ واضح کر دیا گیا کہ اس اداوت کا تعلق
 دل اور روح سے ہے۔

۲-۳۔ لغات : اوقات : دوسرے معانی کے علاوہ حیثیت، بہاؤ
 و شہادت یا مقدر۔

شرح : حقیقت یہ ہے کہ اگر ٹوہنگامہ پیا کرے اور جاہ و جلال دکھائے

تو سارے جہاں پر روشنی ہو جائے کہ چاند سورج کی مثل یعنی پوری کائنات میں رونق
عزت تیری بدولت ہے اور میں وہ ہوں کہ دل میں سورج تو فیروز ایک طرف رہا ،
خود مجھے اپنی ہیئت و بساط سے عزت پیدا ہوتی ہے ۔

مطلب یہ تو اتنا علی مقام ہے کہ چاند سورج بھی اپنی بزم کی رونق کے
یہ تیرے محتاج ہیں اور میں اتنا حقیر ہوں کہ اپنی ذات سے بھی عزت ہوتی ہے ۔
سم ۔ لغات : سبر و دست : اس وقت ، فی الحال ۔

شرح : اگرچہ تو چاند سورج کی انجمن کے لیے رونق افزا ہے اور
میں بالکل بے حقیقت ہوں ، لیکن غفلت کا مہلا ہو ، جس کے سبب سے میرے دل
کو تیرے ہاتھ کے ساتھ ایک گوند نسبت پیدا ہو گئی ہے ۔

اس نسبت کے مختلف پہلو ہو ۔ کہتے ہیں ، مثلاً :

۱۔ جو ہاتھ دشمنوں کا خون بہاتا ہے ۔ وہی غمخواروں کے لیے سرم کا
سامان کر دیتا ہے ۔

۲۔ غمخواروں پر نوازش میں ہاتھ کا کام ہے ، اس سے نسبت پیدا ہو جاتا
کسی تشریح کا محتاج نہیں ۔

۳۔ سمجھا جاتا ہے کہ مدوح کا ایک ہاتھ دشمنی تھا ، اسی لیے مرزا نے ،
اپنے غمخواروں اور مدوح کے خشن ہاتھ کے درمیان نسبت پیدا کی اور اس سلسلے
میں تلکث سے لفظ سبر و دست لائے

چونکہ مدوح کی شخصیت اس وقت تک پوری طرح واضح نہیں ہو سکی ، اس
لیے آخری مطلب کے متعلق یقینی طور پر کہہ کرنا مشکل ہے بعض اوقات خیال ہوتا
ہے کہ شاید یہ صاحب فخر آباد کے نوابوں میں سے کوئی ہے ۔

۵۔ لغات : توسن : گھوڑا

تقاضی حاجات : ضرورتیں پوری کرنے والا

خدا سے قادر و توانا ۔

شرح : میں صبح و شام خدا سے تہجد و توانا سے دعا کرتا رہتا ہوں
کر مملکت کے گمراہوں کی پاک تیرے ہاتھ میں رہے۔

۶۔ **شرح :** میں تجھے اپنا سکندہ ماننے بیٹھا ہوں اور تجھ سے ہٹنے کو
باعثِ فخر سمجھتا ہوں، اگرچہ مجھے حضور کی طاقات سے بھی شرف حاصل ہے۔

مطلب یہ کہ میرا بھی فوقی علم و عرفان کے پیکر حضرت خضرؑ سے بھی امتیاز
کرتا رہتا ہے۔ تو خیریت و برتری میں میرے لیے سکندہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

۷۔ **لغات :** ریلوے : کمرو فریب

ریا : دکھاوا، نمود، نمائش

اہل خرابات : لفظی معنی شراب خانے کے رہنے والے

ہمازی معنی وہ لوگ، جن کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا ہے، راست باز، اہل صلاح و تقویٰ۔

شرح : اگرچہ غالب خاک نشین یعنی عاجز و مسکین ہے، تاہم اس کا

ظاہر و باطن ایک ہے، لہذا اس پر کمرو فریب یا ریا کاری کا گمان نہ ہونا چاہیے

یعنی اس نے جو کچھ کہا ہے وہ عین خلوص اور دلی ارادت پر مبنی ہے۔

۶۔ بیانِ مصنف

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی	اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے پیشہ آبا گری	کچھ شاعری و دلیرِ عزت نہیں مجھے
آزادہ رو ہوں اور مرا مسکلت کھیل	ہر گز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں	انا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
استادِ شہ سے ہو مجھے پر غاش کا خیال	یہ تابِ یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

جام جہاں نما ہے شہنشاہ کا خمیر سو گند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
 میں کون اور رنجیتہ ہاں اس سے دعا جز انبساطِ خاطر حضرت نہیں مجھے
 سہرا لکھا گیا، زندہ امتثالِ امر دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے
 مقطع میں آپڑی تھی سخن گستراد مقصود اُس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
 روئے سخن کسی کی طرف ہوا تو سیاہ سودا نہیں اجنوں نہیں دشت نہیں مجھے
 قسمتِ تیری سہی پہ طبیعتِ بری یہاں ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالبِ خدا گواہ

کبتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

ذوقی نے خود بادشاہ کے ایما پر سرے کے معاملے میں حریفانہ انداز
 اختیار کیا تو مرزا نے یہ قطع بطورِ مسندت پیش کر دیا۔

اس سلسلے میں ایک ضروری گزارش اور ہے۔ بعض رعایتوں میں بتایا گیا ہے
 کہ دینت مل بیگم نے اہل دربار کو تاکید کر دی تھی، ذوقی کا سراپا بٹھا جائے تو کسی شعر
 کی داد نہ دیں۔ چنانچہ چارپاچے شرمشکر درباری خاموش رہے۔ جب بادشاہ نے
 ستائشِ شریع کی تو درباری بھی خاموش نہ رہ سکے۔

یہ افسانہ سراسر بے بنیاد ہے۔ بیگم کو ایسی تاکید کی ضرورت تھی، نہ موقع
 اور نہ اس کا تقاضا تھا۔ اگر بیگم اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانا چاہتی تو وہ بادشاہ
 ہی سے کہہ سکتی تھی ابو بیگم کے زیر اثر تھا اور جس نے بیگم کے اصرار پر میرزا جوں
 بہنت کی ولی عدوی کے جیسے کوشش کے سلسلے میں جڑے بیٹوں کے مسئلہ حقوق
 سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ایسے افسانے صرف ذوقی کی پاسداری میں تیار

کے گئے۔

خود مرزا کا کہنا ہے کہ میرزا کا دم بخود نہ ذوق کے قصیدہ ملا کے سہلے میں فرمایا ہے کہ مرزا عالی عرض گچی کے آدمی نے بتایا، بیگم صاحبہ کا حکم پہنچا ہے کہ اس قصیدہ سنائیے تو دربار میں کوئی ان کے شعروں پر تفسیر نہ کرے۔ ذوقی نے دم گرم بھر کر فرمایا۔ اس بیگم کو کیا ہو گیا ہے غنائی کے مزہ بند کرتی ہے۔ میں جب قصیدہ پڑھوں گا تو دیوان خاص کے دو دیوار واہ والوں کا۔ چنانچہ دوسرے دن تعین پڑھنے لگے تو تمام دربار دم بخود۔ بادشاہ کے ذوق کو پاس ٹاکر لگا لیا پھر کہا ہوں (یعنی پڑھو) پھر جو پڑھنے لگے تو سب کے دہی بند کھل گئے۔
(دیوان ذوق ص ۳۰۱)

۱۔ شرح : میں یہاں حقیقی حالات شیک عظیم عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے حسب طبیعت کی تفصیل میں نہیں پڑنا چاہتا۔

مطلب یہ کہ یہ قطب مرت وہ حالات عرض کرنے کے لیے لکھا گیا ہے، جو پیش آئے، اپنی طبیعت کے محاسن بیان کرنا نہیں چاہتا۔

۲۔ شرح : زمانہ تھرم سے میرے آباؤ اجداد سپاہیہ خدمات میں مصروف رہے ہیں اور شاعری میرے لیے عزت کا ذریعہ نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جو خاندان پشتا پشت سے شیشیزن چلا آتا ہے اور مستر طور پر اہل سیف میں شمار ہوتا ہے، اس کے کسی فرد کے لیے اپنی قلم بن جانا یا شعروں میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنا کچھ عزت کا باعث نہیں۔ میرزا نے یہاں اہل سیف کو اہل قلم پر ترجیح ہی نہیں دی، بلکہ پہلو بطور خاص اٹھارہ ہے کہ میں ناکروں کو، پشتا پشت کے آبائی پیشے پر کیوں ناکروں؟ اس پیشے میں میرے لیے کیا خاص جاہلیت ہو سکتی ہے، جو خود میں نے شروع کیا!

۳۔ شرح : میری روش آزاد اور میرا دل سب کے لیے کھلا ہوا ہے۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ سب سے صلح کا ہر تاؤ جاری رکھا جائے۔ مجھے کسی

کے ہرگز دشمن پیدا نہیں ہوئی

مولانا طباطبائی نے کیا خوب فرمایا ہے کہ دوسرے مصرع میں صراحت کی نفی کے لیے عین تاکیدیں لائے

۱۔ لفظ ”ہرگز“ معنی تاکید ہے۔

۲۔ لفظ ”کبھی“ میں ہر زمانہ شامل کر دیا گیا ہے۔

۳۔ لفظ ”کسی“ میں ہر فرد شامل ہے۔

۴۔ شرح : میں نے مانا کہ نہ مجھے اونچا درجہ حاصل ہے ، نہ میں کسی اعلیٰ عہدے پر نامزد ہوں ، نہ میرے پاس دولت ہے یہ ایں ہر کیا میرے لیے اعزاز و اکرام کا یہ پہلو کھ ہے کہ میں بہادر شاہ ظفر کا غلام ہوں ؟

مطلب یہ ہے کہ بادشاہ کے دوسرے غلاموں کو جاہ و منصب بھی حاصل ہے اور دولت بھی ، مجھے ان میں سے کوئی بھی چیز حاصل نہیں۔ تاہم میں اسی کو بڑی بات سمجھتا ہوں کہ غلاموں میں شامل ہوں۔

۵۔ لغات : پر خاش : رنج و کاوش

شرح : میں بادشاہ کے استاد سے رنج و کاوش کا خیال کروں ؟
مجموع میں نہ یہ تاب ہے ، نہ ہمال ہے ، نہ طاقت ہے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں۔

”اس قلمی میں جس جس پہلو سے معنی اشتقاق

کو مصنف نے ہائے حاشیہ اقبال اس کے

ہے کہ اہل قلم اس سے استفادہ کریں۔

ایسے پہلو شاعر کے سوا کسی کو نہیں سوجھتے۔

یہ عرش کے خزانے سے نکلتے ہیں اور اس

کی کئی شاعروں کے سوا کسی کے پاس نہیں

لیکن بشر کی سبھی کو ضرورت ہے اور جس میں

مضمون پر شار کو قلم اٹھانا پڑتا ہے ، ان
مضامین کی ترمیمیں و تئیں شاعروں کی غرض
پہنچی کے بغیر نہیں ہو سکتی ۔

۶۔ لغات : جام جہاں نما : اسے جام جم اور جام مجید بھی کہتے ہیں
بیان کیا جاتا ہے کہ یہ جام مجید شاہ ایران کے بے یونانی حکمران نے قواعد نجوم ،
پیش نظر رکھ کر بنایا تھا اور اس سے دنیا کے حالات معلوم ہو جاتے تھے
شرح : بادشاہ کا ضیاء جام ہے ، جس سے زمانے کے حالات
معلوم ہو جاتے ہیں ۔ اس بارے میں نہ بچے قسم کھانے کی ضرورت ہے ، نہ گواہ
پیش کرنے کی اور نہ گواہ پیش کرنا ضروری ہے ۔

مطلب یہ کہ جس قلب روشن کو ہر چیز کا علم ہے ، کیونکہ اس کی حیثیت ،
جام جہاں نما کی ہے ۔ اسے سو گند اور گواہ کی حاجت ہی کیا ہے ؟
۷۔ شرح : کہاں میں اور کہاں اردو شعر گوئی ؟ بچے اس سے کیا واسطہ ؟
ہاں اگر اردو شعر کہتا ہوں تو صرف اس لیے کہ حضور کا دل خوش کرنا منظور ہے ۔ یعنی
اپنی خوشی سے اردو شعر سنیں کہتا ، صرف آپ کی خوشی کے لیے کہتا ہوں ۔
میرزا کو خاصی مدت تک یہی خیال رہا کہ ان کے شاعرانہ کمالات کا مظہر فارسی
کلیات ہے ، نہ کہ اردو زبان ۔ چنانچہ ایک مرتبہ پہلے بھی ذرا سی کو مخاطب کرتے
ہوئے کہا تھا :-

اے کہ در بزم شمشاد و سنبل دس ! گفتہ
کے یہ پڑ گوئی فلاں در شعر ہم رنگ من است
راست گفتی ، ایک ہی دانی کہ نبود جائے حسن
کتر از باغ و گل گر نغمہ چنگ من است
فارسی ہیں تا بہ ہنسی ۔ نقش اسے رنگ رنگ
بگنرا ز جھوٹ اردو کہ ہے رنگ من است

ماست می گویم من و از ماست سر توں کشید

پرچہ زد گفتا و فرقت ، آن رنگ من است

لیکن دیکھیے وہی اردو دیوان ، جسے وہ قلمی رنگ قرار دے رہے تھے ۔

ان کی غفلت کے لیے دستاویز بنا اور غلامی شاعری کے کلمات سے شناسائی اب تک بہت محدود ہے ۔

۸۔ لغات : زرد و اقبال اسر : حکم بجالانے کی غرض سے ۔

شرح : میں نے سہرا کھٹا تو صرف اس لیے کہ حکم بجالانے کا تقاضا یہی تھا اور مجھ پر واضح ہو چکا تھا کہ اس حکم کو ماننے بغیر چارہ نہیں

جیسا کہ پہلے مرثیہ کیا جا چکا ہے ، یہ حکم زینت مل بیگم نے غالباً حکیم احسن اللہ خاں کے ذریعے سے دیا تھا ۔

۹۔ لغات : سخن گسترانہ : شاعرانہ ۔ گستر دن سے مراد ہے

پھیلا نا ، سخن گستری بات یا شعر کا پھیلاؤ ، جس کے بہت سے اطراف ہوتے ہیں ۔ مطلب یہ کہ شاعر شعر گوئی کے جوش میں اپنی تائش کے متعلق ایسی باتیں کر جاتا ہے ، جو فی الحقیقت مقصود نہیں ہوتیں اور انھیں محض شاعری سمجھنا چاہیے ۔ سخن گستری سے مراد محض سامعین کی تفریح و خوش دلی ہوتی ہے ۔

شرح : سہرے کے مقطع میں میں نے سخن گستری سے کام لیا تھا ۔

اس کا مطلب ہرگز یہ نہ تھا کہ کسی کو چیلنج دوں یا کسی سے محبت کا رشتہ توڑ ڈالوں

۱۰۔ شرح : اس میں یعنی مقطع میں کسی کی طرف اشارہ یا کنایہ ہو تو خدا کرنے ، میرا منہ سیاہ ہو جائے ۔ بھلا میں دروانہ ، سودائی اور وحشت زدہ تھا کہ بادشاہ کے استاد کی طرف اشارہ کرتا ؟

۱۱۔ شرح : انا کہ میری قسمت بُری ہے ، لیکن طبیعت بُری نہیں ۔

میں اس اسر کا اشارہ کرتا ہوں کہ کہہ سکتا ہوں کہ کونئی وجہ نہیں ۔

مطلب یہ کہ میری قدر دینی نہ ہوئی ، جیسی ہوئی چاہیے تھی اور زندگی میں

سکون و اطمینان میسر نہ ہوا، مگر میری فطرت و طبیعت بڑی منہیں۔ یا شعر گوئی کے کلمات کے لیے کسی سے اختلافات کی گنجائش نہیں۔ یہ ایسے ہر جو کچھ ہوا، میں اس پر تامل نہ ہوں اور شکر کا مقام ہے کہ کسی سے شکایت نہیں۔ میری قیمت ہی میں یہ لکھا تھا کہ کلمات کے باوجود زندگی اسی صورت سے گزرے۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں :-

میر طغر مستغف کی بلاغت کی سند اور استاد سی کی دستاویز ہے۔ جو لوگ محض غزل میں قافیہ بازی کیا کرتے ہیں، ان کی فکر کو ان مضامین عالیہ کی طرف رسائی ممکن نہیں۔ جس راہ پر وہ گئے ہوئے ہیں، وہ اس میدان سے کوسوں دور ہے۔ شیخ الرئیس لکھتا ہے کہ شعر کبھی فقط حیرت و تعجب پیدا کرنے کے لیے کہتے ہیں کبھی اعراض و معاطات کے لیے شعرا سے غزل گو کی شاعری پہلی قسم کی ہے کہ موسیقی و مصوری کی طرح ہی کفایت بھی محض حظ نفس و تخریر روح کے سوا اور کچھ ہو نہیں سکتی، لیکن دوسری قسم البتہ اتمام و احسان کے قابل ہے۔ ہر ادیب دانی قلم اس کا محتاج ہے۔

۱۲۔ - شرح : اسے غالب ! میں نے جو باتیں اور پرکھی ہیں، خدا گواہ ہے کہ ان میں سچا اور راستا باز ہوں۔ میں سچ کہتا ہوں اور جھوٹ کی کچھ عادت نہیں یا سچ کہتا ہوں، کیوں کہ مجھے جھوٹ کی عادت نہیں۔

مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ دوسرے مصرع میں کہ ”یا بیان کے واسطے ہے یا توجہ و تخیل کے واسطے۔ یا توجہ مطلب ہے کہ جو کچھ کہتا ہوں، سچ کہتا ہوں جھوٹ کی جگہ عادت نہیں یا یہ بات سچ کہتا ہوں اور اس کی وجہ و علت یہ ہے کہ جھوٹ کی جگہ عادت نہیں :-

مگو حاصل دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے۔ لیکن اتنا فرق ہے کہ پہلی صورت میں بہ التزام مطلب حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ پھیر کا راستہ

ہے یعنی جوبات کر کے کہتا ہوں ، وہ یہ ہے کہ جھوٹ کی عادت نہیں اور جب یہ بات سچ ہوئی تو لازم آیا کہ جو کچھ کہہ رہے ہیں۔ جھوٹ نہیں۔ جب معلوم ہوا کہ جھوٹ نہیں تو لازم آیا کہ سچ ہے۔ دوسری صورت میں بالسلطانت مطلب حاصل ہو جاتا ہے ، یعنی جو کچھ میں گڑبڑوں اس کی وجہ بیان کی کہ جھوٹ کی جیسے عادت نہیں ہے۔

۷۔ چکنی ڈلی

ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ چکنی ڈلی تمہید :-

زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے مرزا غالب نے
خامہ انگشت بہ دندان کہ اسے کیا کہیے حاتم علی بیگ تھر کے
ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے نام ایک خط میں لکھا
مہر مکتوب عزیزانِ گرامی کہیے ہے :-
حرز بازوئے شکر خانِ نحو آرا کہیے ” جو فلاحی فلاحی
مسی آلودہ سر انگشتِ حسیناں کہیے فلاحی فلاحی بھر جا
داغِ طرفِ جگر عاشقِ شیدا کہیے اس میں میرا ایک نفلہ
خاتم دستِ سلیمان کے مشابہ کہیے ہے کہ وہ میں نے کلکتہ
سرستانِ پری زاد سے مانا کہیے میں کہا تھا۔ تقریباً
پاکیزہ اور بے ریش کہیے کہ مولوی کرم حسین بیگ
میرے دوست تھے کہیے انھوں نے مجس میں
ایک چکنی ڈلی بہت کہیے

اپنے کف دست پر اختر سوختہ تیس سے نسبت دیجے
 رکھ کر بوسے کہا کہ
 اس کی کہہ تطبیات نعم
 کیے ہیں نے جٹے
 حجر الاسود دیوارِ حرم کیجیے فرض
 نافہ، آہوے بیابانِ ختن کا ، کہیے
 قطعہ کہہ کر ان کو دیا
 سے میں وہ ڈل ادا
 سے لے
 چہ شر اس
 قطعے سے نقل کرنے
 کے بعد فرماتے ہیں
 مغمض کہ ہیں
 بائیں پھتیاں ہیں۔
 اشار سب کب یاد
 آتے ہیں۔
 خواجہ عالی ،
 نے یادگار غالب
 میں لکھا ہے :-
 نکلے میں جبکہ نواب
 ضیا الدین احمد خان
 مرحوم کلکتہ گئے ہوئے
 تھے مولوی محمد عالم
 مرحوم نے جو کلکتہ
 اور اس چکنی سپاری کو سُویدا کہیے

کے ایک ورینہ سال غافل تھے، نواب صاحب سے بیان کیا کہ جس،
 رہنے میں مرزا صاحب یہاں آئے جڑے تھے، ایک مجلس میں جہاں
 مرزا بھی موجود تھے اور میں بھی حاضر تھا۔ شعراد کا ذکر جو رہا تھا۔ اثنائے
 گفتگو میں ایک صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی۔ مرزانے کہا کہ،
 فیضی کو جیسا لوگ سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے۔ اس پر بات چلی۔ اس
 نے کہا کہ فیضی جیب پی جی بار اکبر کے رو برد گیا تھا، اس نے
 ڈھائی سو شعر کا قصیدہ اسی وقت ارتفاق کر چڑھا تھا۔ مرزا بولے،
 اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ دو چار سو نہیں تو دو چار
 شعر تو ہر موقع پر جابجا کر سکتے ہیں۔ غائب نے جیب سے ایک
 چکنی ٹولی نکالی کہ حقیقی پر رکھ لی اور مرزا سے درخواست کی کہ اس
 ٹولی پر کچھ ارشاد جو۔ مرزانے گیارہ شعر کا قطع اسی وقت موزوں
 کر کے پڑھ دیا۔

دونوں اقتباسوں کے سلسلے میں چند امور عرض کر دینا ضروری ہے۔

۱۔ مطبوع قطع تیرہ شعر کا ہے، گیارہ شعر کا نہیں، جیسا کہ یادگار غالب میں

مذکور ہے، نہ تو دس شعر کا، جیسا کہ مرزا غالب نے لکھا ہے۔

۲۔ پہلے اقتباس میں مولوی کرم حسین کا نام آیا ہے۔ یہ بگرام کے رہنے

والے تھے اور دہلی اور دودھ کی طرف سے گلگتہ میں سفارت کے منصب پر مامور

تھے۔ شمس العلامہ سید علی بگرامی اور نواب عارف الملک سید حسین بگرامی انھیں مولوی

کرم حسین کے پوتے تھے۔

۱۔ لغات : کتب دست : حقیقی۔

چکنی ٹولی : ایک قسم کی چھایا، جو دودھ میں پکا

کر خشک کر لی جاتی ہے اور نہایت نفیس و لذیذ ہوتی ہے۔

تشریح : آپ کی حقیقی پر جو چکنی ٹولی رکھی ہے، اس کی تعریف جس

قدر بھی کی جائے ، بالکل بھادو نہ رہا ہوگی ۔

۲۔ لغات : انگشت بدستوں : دانتوں میں انگلی سے ہوئے ، نہایت حیران ۔

ناطقہ : بات کرنے کی قوت ، گویائی ۔

سر پہ گریبان : گریبان میں سر ڈالے ہوئے یعنی

خود دھکر میں ڈوبا ہوا ۔

شرح : قلم حیران ہے کہ اس ڈلی کے بارے میں کیا لکھا جائے ۔ گویائی خود میں ڈوبی ہوئی ہے کہ اسے کیا کہا جائے ۔

۳۔ لغات : حیرت : پناہ کی جگہ ، بھارا تعویذ ۔

شکر خان خود آرا : بن سنوار کر رہنے والے حسین ۔

شرح : اسے عالی قدر عزیزوں کے خط کلمہ لکھا جائے یا بہتے

سنوارنے والے حسینوں کے بازو کا تعویذ کہا جائے ۔

۴۔ لغات : سر انگشت : انگلی کا سرا ۔ پور ۔ اٹھ ہیں

پانچ انگلیاں ہیں ، اول انگوٹھا ، دوم انگشت شہادت ، سوم بیچ کی انگلی ، چہارم

اس کے ساتھ کی انگلی ، پنجم چھٹی ۔ چھٹلی اور بیچ کی انگلی کے درمیان جو انگلی ہے

اسے چوتھیں مہی کی انگلی کہتی ہیں ، کیونکہ اس سے عورتا مہی لگانے کا ستور ہے ۔

ظہوت : گوشہ

شرح : آیا اسے حسینوں کی وہ انگلی قرار دیجیے ، جس کے پور کو

مہی لگی ہوئی ہو یا وہ داغ کیجیے ، جو عاشق شیدا کے گوشہ بھر میں ہوتا ہے ۔

۵۔ لغات : خاتم : انگوٹھی ، مہر ۔

مانا : مشابہ ، اخذ ۔

شرح : اسے حضرت سلیمان کے اٹھ کی انگوٹھی سے تشبیہ

دیجیے یا کیجیے کہ وہ کسی پر نژاد کے سر پستان کی مانند ہے ۔

۷۔ شرح : اسے مجنوں کی قسمت کے بدلے ہوئے ستارے ہے ، نسبت دیکھیے یا بلبل کے دلاور رخسار کا مشک جیسا تل دیکھیے ۔

۸۔ لغات : حجر الاسود : وہ مقدس سیاہ پتھر جو کعبے کے ایک گوشے میں نصب ہے اسی سے کعبے کے گرد طواف کے آغاز و انجام کا حساب کیا جاتا ہے ۔

تافہ : مشک واسے ہرن کی نات ، جو عام ہرنوں کی نات سے بڑی ہوتی ہے اور اس میں خون جمع رہتا ہے ۔ ہرنی نوع کرتے ، وقت اسے کس کر باندھ بیٹھتے ہیں تاکہ خون ٹوٹنے نہ پائے ۔ وہی خون کچھ سر سے میں خشک ہو کر چھوٹی چھوٹی ڈھیروں کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ یہی نانے بکتے ہیں ، جنھیں کاٹ کر مشک نکالا جاتا ہے ۔

خُشَن : چینی ترکستان کا ایک علاقہ ، جو اسی نام کے دریا سے سیراب ہوتا ہے ۔ یہ یارقند سے تقریباً دو سو میل جنوب میں ہے ۔ زاد ماضی میں بحیرہ روم سے چین تک کا بری راستہ خُشَن ہی سے گزرتا تھا پاکستان کی طرف گردا گرد کراکرم کے راستے وہاں جاتے ہیں ۔ قابیل ، ریشی کپڑے اور مشک یہاں کی خاص چیزیں تھیں ۔

شرح : آیا اسے کعبے کی دیوار کا حجر الاسود فرض کر لیا جائے یا بیابان خُشَن کے ہرن کا ناذ کہا جائے ؟

۸۔ شرح : اس کی وضع قطع پر نظر ڈالیے تو اسے تریاق کا ”ق“ تسلیم کیا جاسکتا ہے ۔ رنگ دیکھیے تو یہ کتنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میساکے چہرے پر خط نیا نیا نکلا ہے ۔

۹۔ لغات : صومعہ : گرجا ، مطلق عبادت گاہ کے لیے بھی مستعمل ہے ۔ مہر نماز : سجدہ گاہ ، کلڑی یا کر بلائے مٹلی کی ، خاک کا ٹکڑا ، جسے شیعہ حضرات سجدے کی جگہ رکھ پڑھتے ہیں ۔

خشتِ خم صبا : شراب کے شے کی اینٹ۔ شے میں انگوڑ کا رس بھر کر اس پر اینٹ رکھ دیتے ہیں اور مٹہ بند کر دیتے ہیں تاکہ رس جوش میں آجائے۔ پھر اسے صاف کر کے بوتلوں میں بھر دیتے ہیں۔ اس سے وہ اینٹ بھی مراد لے سکتے ہیں، جو شراب کے شے کو بٹھرا کر رکھنے کے لیے پہلے کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

شرح : اگر اس چکنی ڈلی کو عبادت گاہ میں مٹہ نماز بٹھرایں تو شراب خانے میں شے کے اوپر کی اینٹ کہنا چاہیے۔ اگر شے کو سہارا دینے والی اینٹ فرض کیا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ شراب کے شے کی وہ اینٹ، جو رندوں کی سجدہ گاہ ہوتی ہے۔

۱۰۔ لغات : پرکار : دائرہ کھینچنے کا آلہ۔

شرح : اس چکنی ڈلی کو خزانہ محبت کے دروازے کا قفل کیوں لکھا جائے؟ اسے آرزو کی پرکار کا مرکز کیوں کہا جائے۔

۱۱۔ شرح : اسے کیوں ایسا موقی تصور کریں، جو کہیں پایا نہ جاتا ہو؟ اسے کیوں چٹم غنا کی بجلی کہیں؟

۱۲۔ لغات : سلمیٰ : عرب کی ایک مشہور محبوبہ۔

شرح : کیوں اسے سلمیٰ کے پیراجن کی گھنٹی کہیں؟ کیوں اسے سلمیٰ کے ناتے کا نقش پائیں؟

۱۳۔ شرح : مناسب یہ ہے کہ حضور کی بتیلی کو دل فرم کر میں اور اس چکنی ڈلی کو اس دل کا سیاہ نقطہ قرار دے لیں۔

۸۔ کلکتہ

۱۔ شرح : کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں! اسے ہدم! تو نے اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبزہ زار ہائے مٹرا کہ ہے غضب کلکتہ کا جو ذکر کیا تو
 وہ نازنین بتان خود آرا کہ ہائے ہائے بھر پر وہ کیفیت تھالی
 ہوئی، جیسے ایک تیر میرے سینے میں آ
 صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حُف نظر لگا، میں تڑپ اٹھاؤ
 طاقت رُبا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے قریاد و لقاں شروع
 وہ میوہ ہائے تازہ شیریں کہ واہ ! واہ ! کر دی

وہ بادہ ہا۔۔۔ تے تاب گوارا کہ ہائے ہائے ۲۔ لغات :
 مٹرا : ترقانہ رشاد

شرح : کلکتہ کی یاد تازہ ہوتے ہی میری چشم تصور کے سامنے
 وہ ہرے بھرے، ترق تازہ اور شاداب سبزہ زار آگئے، جن سے دُور رہنا غضب
 اور تم ہے۔ پھر وہ نرم و نازک محبوب، جو ہر وقت اپنے ٹھٹھے دہتے ہیں۔ ہرے
 ہرے ! میں کیا کہوں !

۳۔ لغات : صبر آزما : صبر کا امتحان لینے والا
 حُف نظر : چشم بد دُور، دعائیہ کلمہ ہے۔ مولانا طیبائی کے نزدیک
 ”جہن“ ہندی لفظ معلوم ہوتا ہے ”فرہنگِ آصفیہ“ میں ”حُف“ دعا، جھٹی ہی سے
 دوست قرار دیا گیا ہے۔ خواجہ حاتمی نے اسے ”اے ہرے ہرے“ کے مترادف لکھا ہے۔

ہوا عجم دیں جس سے تاراج سارا

وہ ہے ہُف نظر عجم انشا ہمارا

یہ ترکیب غریبوں کے لیے استعمال ہوتی ہے، بعض اوقات طنزِ اِبرائیل
 کے لیے بھی آتے ہیں، مثلاً خواجہ حاتمی کا مندرجہ بالا شعر۔

طاقت رُبا : طاقت چھین لینے والا۔

شرح : چشم بد دُور ! اُن نازنینوں کی وہ نگاہیں، جو صبر کا امتحان

لیتی ہیں اور جانچتی ہیں کہ دیکھنے والا کتنے پانی میں ہے۔ پھر ان کا ایک ایک اشارہ ہمارے پاسے میں کیا کموں، کس طرح برداشت کی تاب و طاقت چھین لے جاتا ہے۔

۴۔ شرح : کلکتہ کے وہ تازہ، میٹھے اور مزیدار میوے کہ دیکھتے ہی زبان واہ واہ پکار اٹھتی ہے۔ دلوں کی وہ خالص، خوشگوار اور طبیعت کے عین موافق شراہیں ! ہمارے ہمارے : کلکتہ کے ذکر نے ان تمام چیزوں کی یاد تازہ کر دی۔

۹۔ یسینی روٹی

دلچسپ اس کی حقیقت، حضور والا نے

مجھے جو بھیجی ہے، یسین کی روغنی روٹی
دکھاتے گیہوں، نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرت آدم یہ۔ یسینی روٹی
تمہید :- خواجہ حاتمی نے لکھا ہے :-

جب بادشاہ کوئی عمدہ چیز پکوانے تھے تو اکثر معاصمین اور اہل دربار کے لیے بہ طور ادولش کے بھیجا کرتے تھے۔ اس کے شکر تھے میں کبھی کبھی مرزا کوئی قطار یا راہلی بادشاہ کے حضور میں گزارتے تھے۔ یہ قطار بھی اسی قبل کا ہے۔

خواجہ صاحب نے ساتھ ہی ایک لطیفہ لکھا ہے :-

جس وقت چر ہزار شاہی یہ ادولش لے کر آیا، باہر کا رہنے والا ایک
طالب علم، جو مرزا سے کچھ پڑھا کرتا تھا، موجود تھا جو ہزار کے چلے
جانے کے بعد اس نے مرزا سے شہوت ہو کر پوچھا۔ ”یہ یسینی روٹی
ایسی کیا نامہ چیز ہے کہ بادشاہ کی سرکار سے بہ طور ادولش کے تقسیم ہوتی

ہے ؟ مرزا نے کہا : ”اے الحق ! چناؤ وہ چیز ہے ، اس خط یکہ
 وفد جناب اٹلی میں قریب کی تھی کہ دنیا میں مجھ پر جسے ظلم ہوتے ہیں ۔
 مجھے دہلتے ہیں ، پیٹتے ہیں ، بھونکتے ہیں ، پکاتے ہیں اور مجھ سے سیکڑوں
 چیزیں بنا کر کھاتے ہیں ۔ بسا مجھ پر ظلم ہوتا ہے ، ایسا کسی پر نہیں
 ہوتا ۔ وہاں سے حکم ہوا کہ اسے چھنے ! تیری خیر اسی میں ہے کہ
 ہمارے سامنے سے چلا جائے ، ورنہ ہمارا بھی یہی چاہتا ہے کہ
 تجھ کو کھا جائیں ۔“

- ۱۔ شرح : حضور والا نے مجھے بسین کی جو روغنی روٹی بھیجی ہے ، اس
 کی حقیقت مجھ سے نہ پوچھ ۔
- ۲۔ شرح : اگر حضرت آدمؑ کیوں نہ کھاتے اور یہ بیسی روٹی کھا جیتے
 تو بہشت سے باہر نکلنے کی نوبت نہ آتی ۔

۱۰۔ غیروں کی وفاداری

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
 کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے
 بس اب بگڑے یہ کیا شرمندگی جانے دو مل جاؤ
 قسم لو ہم سے ، گر یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کھتے تھے

شرح : وہ دن گزر گئے ، جب تم حقیقت جانے ہو مجھے بغیر غیروں
 کی وفاداری نہ رشور سے بیان کرتے تھے اور ہم چپ رہتے تھے ۔ اب اُن سے بگاڑ
 ہو گیا تو اس میں ہمارا کوئی قصور ہے ؟ اور تم اتنے کیوں شرمندہ ہوئے کہ ہم سے ملنا
 بچنا چھوڑ دیا شرمندگی جانے دو ، ہم سے ملو اور قسم لے لو ، کہیں یہ نہ کہیں گے کہ ہم
 حقیقت حال تم سے صاف صاف نہیں کہتے تھے ؟

محبوب کو غیروں کی وفاداری پر جڑا مبرور سا تھا اور آزمائش کہیں کی نہیں تھی

لیتی ہیں اور جانچتی ہیں کہ دیکھنے والا کتنے پانی میں ہے۔ پھر ان کا ایک / ایک اشارہ ہمارے ہمارے میں کیا کموں / کس طرح برداشت کی تاب طاقت چھینے جاتا ہے ۔

۴۔ شرح : کھلتے کے وہ تازہ ، میٹھے اور مزیدار میوے کہ / دیکھتے ہی زبان واہ واہ پکار اٹھتی ہے ۔ دلوں کی وہ خالص خوشگوار اور طہیت کے عین موافق شراہیں ! ہمارے ہمارے ! کھلتے کے ذکر نے ان تمام چیزوں کی یاد تازہ کر دی ۔

۹۔ مینسی روٹی

نہ پوچھو اس کی حقیقت ، حضور والا نے

مجھے جو بھیجی ہے ، مین کی روغنی روٹی

نہ کھانے گیسوں ، نہ کھلتے نہ خلد سے باہر

جو کھاتے حضرت آدم یہ ۔ مینسی روٹی

تمہید :- خواجہ عاتق نے لکھا ہے :-

جب بادشاہ کوئی عمدہ چیز پکواتے تھے تو اکثر معاجین اور اہل

دربار کے لیے بہ طور اولوش کے بھیجا کرتے تھے ۔ اس کے شکوے

میں کبھی کبھی مرزا کوئی قلعہ یا رہائی بادشاہ کے حضور میں گزرا کرتے

تھے ۔ یہ قلعہ بھی اسی قبل کا ہے ۔

خواجہ صاحب نے ساتھ ہی ایک لطیفہ لکھا ہے :-

جس وقت چوہدر شاہی یہ اولوش لے کر آیا ، باہر کا رہنے والا ایک

طالب علم ، جو مرزا سے کچھ پڑھا کرتا تھا ، موجود تھا ۔ چوہدر کے چلے

جانے کے بعد اس نے مرزا سے شہرت چوہدر کو پوچھا ۔ ” یہ مینسی روٹی

ایسی کیا نادر چیز ہے کہ بادشاہ کی سرکار سے بہ طور اولوش کے تفریح ہوتی

ہے؟ مرزا نے کہا: ”اے امق! چناوہ چیز ہے، اس نے ایک دفعہ جناب الہی میں قربان کی تھی کہ دنیا میں مجھ پر بڑے ظلم ہوتے ہیں۔ مجھے دلتے ہیں، پٹتے ہیں، بھونکتے ہیں، پکاتے ہیں اور مجھ سے سیکڑوں چیزیں بنا کر کھاتے ہیں۔ بیباک مجھ پر ظلم ہوتا ہے، ایسا کسی پر نہیں ہوتا۔ وہاں سے حکم ہوا کہ اسے چھنے! قیری خیرا سی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے چلا جائے، ورنہ ہمارا بھی یہی چاہتا ہے کہ تجھ کو کھا جائیں۔“

- ۱۔ شرح : حضور والا نے مجھے مبین کی جو روغنی روٹی بھیجی ہے اس کی حقیقت مجھ سے نہ پوچھ۔
- ۲۔ شرح : اگر حضرت آدمؑ کیوں نہ کھاتے اور یہ بیسی روٹی کھا لیتے تو بہشت سے باہر نکلنے کی نوبت نہ آتی۔

۱۰۔ غیروں کی وفاداری

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے بس اب بگڑے یہ کیا شرمندگی، جانے دو مل جاؤ قسم لو ہم سے، گر یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کہتے تھے

شرح : وہ دن گزر گئے، جب تم حقیقت جانے بوجے بغیر غیروں

کی وفاداری زور شور سے بیان کرتے تھے اور ہم چپ رہتے تھے۔ اب اُن سے بگاڑ ہو گیا تو اس میں ہمارا کوئی قصور ہے؟ اور تم اتنے کیوں شرمندہ ہوئے کہ ہم سے ملنا نہ جھکا چھوڑ دیا شرمندگی جانے دو، ہم سے یو اور قسم سے لو، تمہیں یہ نہ کہیں گے کہ تم حقیقت حال تم سے صاف صاف نہیں کہتے تھے؟

محبوب کو غیروں کی وفاداری پر بڑا مہروسا تھا اور آزمائش کبھی کی نہیں تھی

تم ان کی وفاداری کے متعلق بڑی تقریریں کرتے تھے اور ہم دانت کچھ عرض کرتے
سے باز رہتے تھے۔ پھر غیروں کی حقیقت کھلی تو ان سے تعلقات ختم ہوئے۔ محبوب
کو اپنے پیچھے دعووں پر اتنی شرمندگی ہوئی کہ عاشق سے بھی ملنا جتنا چھوڑ دیا
عاشق مناتا ہے: ”یقین رکھو، میں کوئی بات تمہارے خلاف نہیں کہوں گا
لیکن شرمندگی کے باعث مجھے دیدار سے محروم نہ رکھو۔“

۱۱۔ شریکِ غالب

سیہ گلیم ہوں، لازم ہے، میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہو نہ غلبہ میتسر کبھی کسی پہ مجھے
کہ جو شریک ہو میرا، ”شریکِ غالب“ ہے

۱۔ لغات : ”سیہ گلیم“ : ”بہارِ غم“ میں بتایا گیا ہے کہ سیہ گلیم کو
معنی سیاہ روزگار ہیں، یعنی بد نصیب، سیاہ بخت۔

شرح : میں سیاہ روزگار اور سیاہ بخت ہوں۔ دنیا میں جو کوئی فتح
پانے اور مراد مند ہونے کا خواہاں ہے، اس کے لیے لازم ہے کہ میرا نام زبان
پر نہ لائے۔

۲۔ شرح : مجھے کبھی کسی پر غلبہ نصیب نہ ہوا۔ جو بھی میرا شریک
اور ساتھی بنا، وہ شریکِ غالب بن گیا۔

”شریکِ غالب“ کے دو معنی ہیں، اول شخصِ غالب کا شریک، دوم وہ
ساتھی، جو حصہ دار بن کر غلبہ پالے اور دوسرے حصہ دار کو کچھ نہ لینے دے۔

۱۲۔ روزہ داری

افطار صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو ،
اس شخص کو ضرور ہے ، روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے ؟

تمہید :- اس قطع کے سلسلے میں خود مرزا نے منشی نبی بخش حقیر کو
ایک خط میں لکھا (مرقومہ ۳۷ جون ۱۸۵۵ء)

”مگر چہ تاب نمید میں روزہ رکھنے کی کہاں مگر بجز روزہ داروں سے
ہوں۔ روزہ داروں کو کیا کہوں ، کیا حال ہے۔ میرے چار خدمت گزار
ہیں ، چاروں روزہ دار۔ آخر روزہ مجھ میں نظر آتا ہے کہ چار مرگے
بچر رہے ہیں۔ یہ پریشانی اور یہ بے سامانی۔ نہ خفاہ ، نہ برغاب۔
”آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں؟“ الخ افطار صوم کی جیسے کچھ دستگاہ
ہو؟ الخ یہ رباعی اور یہ قطع کل حضور میں پڑھا تھا۔ بہت ہنسے اور
خوش ہوئے۔“

اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ رباعی اور قطع ۳ جون ۱۸۵۵ء کو شاہی دربار
میں پڑھے گئے۔ اس دن رمضان شریف کی ساتویں تاریخ تھی (۱۲۷۱ھ)۔

۱۔ لغات : افطار صوم : روزہ کھونا

دستگاہ : توفیق ، سرو سامان ،

شرح : جس شخص کے پاس روزہ کھولنے کے لیے کچھ سرو سامان

نہو ، اس کے لیے لازم ہے کہ روزہ باقاعدہ رکھے اور کوئی روزہ نہ چھوڑے لیکن

میں کے پاس روزہ کھول کر کھانے کو کچھ نہ ہو، وہ روزہ نہ کھائے، یعنی ذرکھے
تو آخر کیا کرے؟

مولانا طبا طبائی فرماتے ہیں کہ اس قطعہ میں ”ناچار“ کا لفظ مفلس و بے نوا
کے معنی بھی دیتا ہے اور اس سے مجبور ہو کر روزہ نہ رکھنے کے معنی بھی نکلتے ہیں

۱۳۔ رخصت کی عرضداشت

سہل تھا سہل، بولے یہ سخت مشکل آپڑی
مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر ہوئے
تین دن سہل سے پہلے، تین دن سہل کے بعد
تین سہل، تین تبریدی، یہ سب کئے دن ہوئے

۱-۲۔ لغات : سہل : جلاب

تبرید : وہ ٹھنڈائی، جو سردی سے جلاب کی گرمی دور کرنے کے لیے
پی جاتی ہے۔

شرح : جلاب سے لیتا آسان تھا، لیکن سخت مشکل یہ آپڑی کہ اتنے
دن دربار شاہی میں حاضر ہوئے بغیر گھر پر کیا گزرے گی۔ پھر دنوں کی تفصیل بتا رہی
اور گنتی غماض پر پھوڑ دی۔ فرماتے ہیں : تین دن تو جلاب سے پہلے ضروری ہیں
تاکہ منضج پیاجا کے، یعنی وہ دوا جو طبیب بیماروں کو جلاب سے پہلے اس لیے،
پلاتے ہیں کہ اندر کے فاسد مادے پاک جائیں تاکہ جلاب میں بے آسانی خارج ہو سکیں
”تین دن جلاب کے بعد طبیعوں کے نزدیک ایسے ہوتے ہیں کہ چلتا پھرتا چاہئے
تین جلاب لینے بخئے اور ہر جلاب کے بعد ایک ایک دن تبرید یعنی سہی۔ یہ کہتے
ہوئے؟ تین جلاب تین جلاب تین جلاب، کل بارہ دن ہو گئے۔ گویا یہ ایک درخت

ہے، اور غیر ماضی کے عذر میں بادشاہ کے حضور پیش نہ گئی۔
خواجہ جاکے فرماتے ہیں کہ سبیل کے ان تمام دونوں کی تفصیل وجہ میں حکیم چننے
پھرنے سے منع کرتے ہیں۔ کس عمدگی سے بیان کی ہے۔

۱۴۔ درباری

گو ایک بادشاہ کے سب خاص زاد ہیں
دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام
اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

۲۔ لغات : سلام کے لیے کانوں پر ہاتھ دھرنا : دربار
مظہر میں دستور تھا کہ بادشاہ کے سامنے درباری ایک دوسرے کو سلام کرتے
تھے تو ماتھے پر نہیں، کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے، ماتھے پر ہاتھ صرف بادشاہ
کے لیے مخصوص تھا اور ویسا ہی سلام بادشاہ کے روبرو کسی دوسرے کو کرتا
خلاف ادب تھا۔

محض کانوں پر ہاتھ دھرنے کا مطلب ہے۔ ناوقت اور ناآشنا ہونے کا
ذکر کرنا۔ مرزا نے اردو کے اس محاورے اور شاہی دربار میں دستور سلام سے
ایک چٹھٹ مضمون پیدا کر دیا۔ فرماتے ہیں۔

شرح : اگرچہ سب لوگ ایک بادشاہ کے گھر میں پے ہوئے ہیں،
لیکن درباری لوگ ایک دوسرے سے آشنا نہیں۔ دلیل یہ ہے کہ وہ سلام کرتے
وقت کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ ہم ایک دوسرے
کو نہیں جانتے۔

خواجہ حاکمی نے لکھا ہے :-

”بادشاہ کے دربار کا طریقہ متفاکراپس میں ایک دوسرے کو سلام کرتے وقت دایاں ہاتھ دائیں کان پر رکھ دیتے تھے۔“

۱۵۔ میرزا جعفر کی شادی

نجستہ انجمن طوے میرزا جعفر
کہ جس کے دیکھے سے سبکا ہوا ہے جی محفوظ
ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالب
نہ کیوں ہو مادۂ سال عیسوی محفوظ

۱۔ لغات : نجستہ : مبارک ۔

طوے : ترکی میں شادی کو کہتے ہیں

شرح : میرزا جعفر کی شادی کی محفل ایسی مبارک ہے ، جسے

دیکھ کر دل بہت خوش ہوا ۔

یہ شادی مبارک سال میں ہوئی ہے ، پھر اسے غالب ! اس
کے سال عیسوی کا مادۂ لفظ ”محفوظ“ کیوں نہ ہو ، لفظ ”محفوظ“
سے منسلک و متاریخ نکلتی ہے ۔

(۱۶)

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی
ہوا بزمِ طرب میں رقصِ تابید

کہا غالب سے ! تاریخ اس کی کیا ہے
تو بولا : انشراحِ جشنِ جمشید

۱-۲۔ لغات : ناہید : زہرہ ستارہ جسے ناچ گانے کی دیوی
مانا جاتا ہے۔

انشراح : لغوی معنی کھلنا ، یہاں خوشی اور انبساط مراد ہے۔

منشرح : جب میرزا جعفر کی شادی ہوئی تو شادمانی کی محفل میں
زہرہ نے رقص کیا۔ غالب سے اس شادی کی تاریخ پوچھی گئی تو اس نے کہا !
انشراحِ جشنِ جمشید ، یعنی جمشید کے جشن کی خوشی اور انبساط۔

یہ سنہ ہجری کی تاریخ ہے اور اس کے عدد ہیں ۱۲۷۰۔

رباعیات



بعد از اتمام بزم عید اطفال
ایام جوانی رہے ساغر کش سال
آپہنچے ہیں تا سوادِ تسلیمِ عدم
اے عمر گزشتہ ! یک قدم استقبال

لغات : اتمام : پورا کرنا ، انجام کو پہنچانا ۔
ساغر کش : پیالہ پینے والا یعنی جامِ شراب ۔

سواد : سیاہی ، مہاز احوالی زمین یا زمین بھی مراد لیتے ہیں ۔ سمندر کا
سفر کرتے ہوئے زمین آتی ہے تو دور سے سیاہی کا ایک خط معلوم ہوتی ہے ۔
اس طرح یہ منی ہو گئے ۔ حوالی شہر ، حوالی تسلیم ۔

استقبال : آگے بڑھا ، پیشوائی ، پیش روی ، زماۃ آئندہ ۔

شرح : جب بچپن کی زندگی پوری ہو چکی اور ظاہر ہے کہ بچپن کی زندگی
کی بہترین تعبیر ہی ہو سکتی تھی کہ اسے لوگوں کی بزمِ عید کہا جاتا تو جوانی کا دور آگیا ۔ جو
حالات پیش آتے رہے ، ان کے مطابق زندگی بسر کرتے چلے گئے ۔

مطلب یہ کہ حال ہی میں محو رہے ۔ ماضی یعنی گزشتہ کا کچھ خیال آیا ، نہ مستقبل
یعنی آئندہ کے لیے کچھ سوچا ۔ اسی طرح چلتے چلتے ملکِ عدم کے آس پاس پہنچے ہیں ،
یعنی بوڑھے ہو گئے ہیں اور اب اس دنیا سے کوچ کا وقت قریب آگیا ہے ۔

اے گزری ہوئی عمر ! ایک قدم آگے بڑھ ۔

مطلب یہ کہ گزری ہوئی عمر واپس مل جائے ، ہوا متیہ بحث ہے تو جوانی کی زندگی
کے بہارِ آخر میں دن پھر نوٹ آئیں



شب، زلف و رخِ عرقِ فشاں کا غم تھا
کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
ہو یا میں ہزار آنکھ سے صبح تک
سرِ قطرہ اشک، دیدہ پڑ نم تھا

لغات : رخِ عرقِ فشاں : وہ چہرہ جس سے پسینہ ٹپک رہا ہو۔
طرفہ تر : عجیب تر۔

شرح : رات محبوب کی زلف اور پسینے سے تر چہرے کا تم کتنا برا
میں کیا بتاؤں کہ میرا حال کس درجہ عجیب تھا۔

ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں ہزار آنکھوں سے صبح تک روتا رہا۔ اور اس
طرح جو آنسو بہاؤں، ان میں سے ہر قطرہ بجائے خود ایک آنسو بھری آنکھ تھا۔
”رات“ کی مناسبت ”زلف“ سے اور ”رخِ عرقِ فشاں“ کی مناسبت ”پسینے“
سے اور رونا بھی بطریقِ مبالغہ ظاہر ہے۔

ہزار آنکھ سے آنسو بہے روئے کہ رخِ محبوب پر پسینے کے قطرے
پے در پے آ رہے تھے۔ ہر قطرے گر بھی رہے تھے، اس لیے آنسو کا ہر قطرہ
اشک بھری آنکھ بن گیا۔



آتش بازی ہے جیسے شغلِ اطفال
ہے سوزِ جگر کا بھی اُسی طور کا حال

تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی
لوگوں کے لیے گیا ہے کیا کھیل نکال

لغات : موجد : ایجاد کرنے والا، نئی چیز بنانے والا۔

شرح : جیسے آتش بازی لوگوں کا کھیل ہوتی ہے، ہجر کے سوز اور جان کی کیفیت کا بھی یہی طور معلوم ہوتا ہے۔

عشق ایجاد کرنے والا بھی قیامت کا پتلا تھا، جو حسین و جمیل لوگوں کے لیے
ایک کھیل نکال گیا۔

مطلب یہ کہ جس طرح بچے آتش بازی پھوڑ کر خوش ہوتے ہیں اور اسے محض
کھیل سمجھتے ہیں، اسی طرح یہ حسین و جمیل لوگ بھی محض کھیل تماشے کی غرض سے
عاشقوں کے ہجر بلانے ہیں، شے اٹھتے ہیں تو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔



دل تھا کہ جو جانِ درد تمہید سی
بے تابی رشک و حسرت وید سی
ہم اور فسر دن اے تجلی ! افسوس
تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

لغات : جانِ درد تمہید : وہ جان، جس کی تمہید، یعنی

ایقتدا ہی درد سے ہوتی ہو۔

فسر دن : افسوس ہونا۔

تکرار : بار بار آنا۔

تجدید پر : سازہ کرنا۔

مشرع : ہمارا دل ایسا تھا جس کی جان کا آغاز ہی دروے ہوا تھا۔
یعنی ہر زندگی کے ہر دور کو جمیل چکا تھا۔ ہمیں رشک کی پیمانی اور دیدار کی حسرت ہے
تو ہوا کرے۔

لیکن اسے محبوب کے جلوے ! ہمارے کیف ہو جانا باعث صدافسوں ہے۔
ہمیں پھر پہلے سے سوز و گداز کی آمد ہے۔ اگر حیرا دوبارہ کرشمہ دکھانا جائز نہیں تو
یہ کھلے اور ٹھاس میں پہلا ساسوز و گداز از سر نو پیدا کر رہا ہے۔

مراد یہ کہ جو چیز گزرتی تھی، اگر وہ معدوم ہو گئی، اگر وہ دوبارہ نہیں آ سکتی تو تیرا جو پہلی
سی کیفیت نئے سرے سے پیدا کر سکتا ہے



ہے خلقِ حسد قماشِ لڑنے کے لیے

وحشتِ کدۂ تلاشِ لڑنے کے لیے

یعنی ہر بار صورتِ کاغذِ باد

ملتے ہیں بے یار و معاشِ لڑنے کے لیے

لغات : حسد قماش : جن کا مانا ہوا حسد سے بنا ہوا، یعنی

صورتِ حسد کرنے والے۔

وحشتِ کدۂ تلاش : تلاش کا وحشت خانہ، یعنی دنیا، جہاں ہر شخص

سراسر دار و تلاشِ معاش میں سرگرم ہے۔

کاغذِ باد : بوائے کاغذ، یعنی پتنگ، کھٹکڑ۔

بد معاش : جن کا روزی حاصل کرنے کا طریقہ بُرا ہو۔

شرح : مخلوق ٹوٹنے کی غرض سے سراپا حسد بنی ہوئی ہے ، گویا حسد کو اس نے بطور لباس پہن لیا ہے تماشائی یہ وحشت غائب ہے دنیا کہتے ہیں پلورے کا پلورہ لڑائی کا میدان بنا ہوا ہے ۔

یعنی دو آدمی جب کھینچتے ہیں تو لکڑیوں کی شکل میں ملتے ہیں ، جن کا مقصد جہاں ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے لڑیں ۔ اسی لیے کہنا پڑتا ہے کہ ان لوگوں کا طریق معاش بھی تنہایت بُرا ہے ، کیونکہ جتنے بھی ہیں تو ٹوٹنے کی غرض سے ۔



دل سخت نثرند ہو گیا ہے ، گویا
اُس سے جگمگ منہ ہو گیا ہے ، گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں
غالب ! منہ بند ہو گیا ہے ، گویا

لغات : نثرند : غلین و حزی ۔

شرح : دل سخت غلین اور افسردہ ہو گیا ، گویا اسے محبوب سے ، شکایتیں پیدا ہو گئی ہیں ۔ جب محبوب کے سامنے شکایتیں پیش نہیں کر سکتے ۔ تو ان شکایتوں کا فائدہ کیا ؟

اسے غائب ! ہماری حالت تو یہ ہے گویا منہ بند ہو گیا ہے ۔



دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے ، غالب
دل ، رک کر بند ہو گیا ہے غالب

واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
ما، سو گند ہو گیا ہے ، غالب !

لغات : سونا سو گند ہونا : نیند آنا قسم ہو جانا یعنی بالکل نہ آنا۔
شرح : اسے غالب ! میرے دل کو دکھ بہت پسندیدہ معلوم ہوتا
ہے اور دکھ کی وجہ سے دل کی حرکت نہ کتے نہ کتے بالکل ختم ہو گئی۔
خدا کی قسم ، رات کو نیند آتی ہی نہیں۔ یہ سمجھنا چاہیے کہ سونا میرے لیے قسم
کے برابر ہو گیا ہے



مشکل ہے زبں کلام میرا ، اسے دل
سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل

شرح : اسے دل ! کوئی شہر نہیں کہ میرا کلام بہت مشکل ہے۔ اسے
سن سن کر وہ شاعر جو کہاں کے جڑی ہیں ، فروغش کرتے ہیں۔
کہ آسان کہا کرو ، اب میں کہوں تو مشکل ، نہ کہوں تو مشکل۔
ایک مفہوم یہ ہے کہ اگر میں آسان شعر کہنے کی کوشش کروں تو اسے میری طبیعت
گوارا نہیں کرتی۔ اگر آسان نہ کہوں تو شاعر بنا مانتے ہیں۔ گویا کہتا بھی مشکل سے اور نہ
کہتا بھی مشکل۔

فردوسِ حنائی کے نزدیک۔ اس سے دوسرے لطیف معنی بھی پیدا ہوتے ہیں یعنی

صاف صاف بات کہتا ہوں تو سنو راجہ کال کی ٹافہیں اور کٹھڑی کا ہر کرنی چلتی ہے۔
اگر صاف صاف نہ کہوں تو خود مرزم ٹھہرتا ہوں۔ یہ دونوں طرح مشکل ہے۔



بھیجی ہے جو مجھے کو شاہِ جہاں نے، دال
ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پر دال
یہ شاہِ پسند دال، بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

لغات : شاہِ جہاں : وہ بادشاہ، جسے جمشید کا ہاتھ جلال حاصل ہے
دال : پہلے مصرع کے آخر میں اس کے معنی اُس دال کے ہیں، جو کھائی
جاتی ہے، دوسرے مصرع کے آخر میں جو دال ہے، اس کے معنی ہیں ولایت
کرنے والا، چوتھے مصرع کے آخر میں دال سے مراد حرفِ دال ہے۔
مشائ پسند یا بادشاہِ پسند : مولگ کی دال شاہی مطبخ میں ایک خاص طریق پر
پختی ہوتی، اس کا نام شاہِ پسند یا بادشاہِ پسند سمجھا گیا تھا، کیونکہ وہ بہادر شاہ کو
بھی بہت مرغوب تھی۔

یہی دال بادشاہ و تآؤفا بہ طور عطیہ مختلف مصاحبوں کو بھیجا کرتے تھے۔
مرزا کو بھیجی گئی تو مضمون نے شکریے میں یہ رباعی کہی۔ اور بادشاہ کی خدمت
میں پیش کی۔

شرح : جمشید جیسے جہاں و جلال واسے بادشاہ نے مجھے دال
بھیجی ہے۔ یہ شہنشاہ کے لطف و کرم اور نوازش و عنایات پر ولایت کرتی ہے،
یعنی اس سے پتا چل جاتا ہے کہ حضور والا مجھ پر کس قدر لطف و عنایت فرماتے ہیں

یہ شاہ پسند وال وہ حرفہ وال ہے، جو دولت، دین، دانش اور دار میں استعمال ہوا۔ مگر یا اس کے اندر محکمت و دین، عقل و خرد اور عدل و انصاف کے جوہر آگئے۔ میری یہ دعویٰ نہ بکٹ کار و دار ہے، نہ بھگڑے کا، یعنی کسی کو اس سے اختلاف کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔



ہیں شہ میں صفاتِ قوا الجلالی باہم
آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں سائل و عالی باہم
بہاب کے شبِ قدر و دوالی باہم

لغات : صفاتِ قوا الجلالی : اللہ تعالیٰ کے صفات، جو جلال والا ہے۔

آثارِ جلالی و جمالی : اہل علم نے صفاتِ باری تعالیٰ کی دو قسمیں کی ہیں، ایک جمالی صفات، جن میں حسن و خوبی، جاذبیت و محبت، شفقت و رحمت اور ایسی تمام صفات شامل ہیں۔ دوسری قسم جلالی صفات کی ہے، جیسے تاسر، جبار و غیرہ۔ کائنات کے نظم میں جلال و جمال دونوں ضروری ہیں۔ اسی طرح بادشاہ میں بھی جلالی و جمالی دونوں قسم کی صفات کے نشان پائے جاتے ہیں۔ اس پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، رسول اللہ صلیم کا ارشاد ہے :-

تخلّقو! باخلاق اللہ اپنے اندر خدائی صفات پیدا کروں۔ انسانیت کا سب سے اعلیٰ درجہ یہی ہے کہ انسان میں خدا کے صفات کا پرتو زیادہ سے زیادہ پیدا ہو جائے۔
سائل : ادنیٰ درجے کے لوگ، یعنی عوام -

عالی : ہنسنا یہ لوگ ، پیچھے اونچا منصب رکھنے والے یا دوست مندر یا

اور باب مجاہد حشمت ۔

شبِ تقدہ : قرآن مجید میں اس رات کو کہا گیا ہے ، جس میں قرآن کا نزول شروع ہوا ، اتنا انزلنا فی ایلاۃ القدر (جہنم نے قرآن کو شبِ تقدہ میں آما را) ۔ اس رات کے تعین میں اختلاف ہے ۔ ۲۱ سے اور آخر رمضان تک ہر ایک رات کے حق میں روایتیں ملتی ہیں ، لیکن عام عقیدہ ۲۷ رمضان کی رات کے متعلق ہے ۔

تقدہ کے معنی ہیں اندازہ ، نیز عزت و منزلت ۔ اس سے مراد دونوں ہی چیزیں لی جاسکتی ہیں ، یعنی اندازہ کی رات ، جب قرآن مجید انسانوں کو دے کر اللہ تعالیٰ نے خیر و شر کا ایک آخری اندازہ مقرر کر دیا ۔ چوں کہ یہ رات بہت مقدس مانی جاتی ہے ، اس لیے تقدہ و منزلت والی رات بھی کہہ سکتے ہیں ۔

دوای اور دیوالی : ہندوؤں کا ایک تہوار ، جس میں چرائی جلائے جاتے ہیں ۔ مشہور ہے کہ چراغاں کا انتظام بن باس سے رام چندر جی کی واپسی پر کیا گیا تھا اب تک اس یادگار کا سلسلہ جاری ہے ۔

شرح : بادشاہ میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا پرتو موجود ہے ۔ اس کی جلالت اور جمالی دونوں صفتوں کا عکس آگیا ہے ۔

چھوٹے بڑے ، اوقی اعلیٰ کیوں ، یکساں خوش ہوں ؛ اب کے تقدہ کی رات اور دیوالی دونوں تقریبیں اکٹھی آئی ہیں ۔ ۱۱ میں سے شبِ تقدہ صفاتِ جلالت کی مظہر ہے اور اس کا تعلق عالم فیزی سے ہے ، اس لیے یہ عالی ، کہ اس کے لیے مندرجہ بھنا چاہئے دیوالی صفاتِ جمالی کی مظہر جو کہتی ہے اور اس کا تعلق عالم سفلی سے ہے ، یعنی دنیا سے ۔

○
حقِ شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے
تماشاہ شیوع دانش و داد کرے

یہ دی جو گئی ہے رشتہ عمر میں گانٹھ
ہے صفر کہ افزائش اعداد کرے

لغات : شیوع : شائع کرنا ، پھیلانا ، رواج دینا۔
شرح : ظاہر ہے کہ یہ رباعی بادشاہ کی سالگرہ کے موقع پر کہی گئی
تھی۔ فرماتے ہیں ، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ بادشاہ سلامت رہیں ، اس کی عمر بیس ہو
اور مخلوق شادمان رہے۔ ملاحظہ ہے کہ بادشاہ کی بدولت عقل و دانش اور عدل و انصاف
رواج پاتے جائیں۔ گویا بادشاہ کے بیس بیس عمر کی ضرورت اس لیے ہے کہ دانش و دلو
کی اشاعت اور پھیلاؤ کی یہ ایک تعبیر ہے۔

اب بادشاہ کے رشتہ عمر میں ایک گانٹھ اور لگائی گئی ہے۔ یہ گانٹھ بیس ، اہل
میں صفر ہے اور صفر بھی ایسا ، ہر اعداد سے پہلے لگا دیا جائے تو ان کی مقدار میں اضافہ
ہو جاتا ہے۔ مثلاً ۱۰ سے پہلے صفر لگائیں تو ۱۰ بن جائے گا اور ۱۰۰ سے پہلے صفر
لگائیں تو ۱۰۰ بن جائیں گے۔

گانٹھ کی تشبیہ صفر سے کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ رشتہ عمر میں گانٹھ سال گرہ کا رواج ہے۔



اس رشتے میں لاکھ تار ہوں ، بلکہ سوا
اتنے ہی برس شمار ہوں ، بلکہ سوا
ہر سیکڑے کو ایک گرہ فرض کریں
ایسی گرہیں ہزار ہوں ، بلکہ سوا

شرح : یہ رباعی بھی پہلی رباعی سے متعلق ہے ، فرماتے

ہیں، سال گرہ کے رشتے میں لاکھزار، بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوں اور
 بستے تار ہوں، استے ہی برس شمار کیے جائیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ -
 اگر سو سال کی مدت کو ایک گڑا فرض کریں تو خدا کرے، ایسی ہزار گڑھیں
 لگائی جائیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ -

ظاہر ہے کہ اس طرح حساب کرنا خاص حساب و ان کا کام ہے۔ مرزا غائب نے ایک
 قسط کے آخر میں بادشاہ کو خطاب کرتے ہوئے لکھا ہے

تم سلامت و جو ہزار برس ۴ برس کے ہوں و دہ پچاس ہزار
 پچھتے کی طرح حساب کا یہ معاملہ بھی خاصے خوردگار کا محتاج ہے اور نارسائی کی ایک شہری
 میں تو مرزا نے حساب کا معاملہ ہی ختم کر دیا۔ لکھتے ہیں :

بر دماغے شہر سخن کو تار باد تا خدا باشد بہادر شاہ باد



کہتے ہیں کہ ”اب وہ مردم آزار نہیں
 عشاق کی پریشانی سے اسے عارف نہیں
 جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہو گا
 کیوں کر مانوں کہ اُس میں تلوار نہیں

لغات : مردم آزار : لوگوں کو دکھ دینے والا -
 ہاتھ اٹھانا : کسی چیز سے دست بردار ہو جانا اور ہاتھ کے
 لیے بھی ہاتھ اٹھایا جاتا ہے، گویا اس کے متفقہ و معنی ہیں اور مرزا نے دونوں
 معنی سے فائدہ اٹھا کر یہ رباعی لکھی -

شرح : کہا جاتا ہے کہ ہمارا محبوب اب لوگوں کو دکھ نہیں

دیتا، بلکہ عاشقوں کا حال دریافت کر چکنے میں بھی اسے عار نہیں آتی اور یہ محبوب کی مہربانی اور لطافت و کرم کی سب سے بڑی شہادت ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ میں تو اس دعوے کو صحیح نہیں سمجھتا۔ جو ائمہ ظلم سے اٹھایا ہوگا، کیونکہ تسلیم کریں کہ اس میں تو کوارینہیں؟

ظاہر ہے کہ ائمہ اٹھانے کے دونوں معنی پیش نظر رکھتے ہیں۔ اگر یہ مابین کو ظلم کی طرف سے اٹھا اٹھایا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ائمہ میں صلوات ہے۔ اگر یہ مابین کو اس نے ظلم ترک کر دیا ہے تو صلوات اس حالت میں بھی پاس ہوگی۔



ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے
کرتے ہیں درنگ، کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے۔ اللہ اللہ
وہ آپ میں صبح و شام کرنے والے

لغات : سلام کرنے والے : یہ ان اہل مقدمات کا کام ہے جو روزانہ ہمارے مشیوں، معتقدوں کو سلام کراتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح ان کا کام بن جائے گا۔

درنگ : توقف، تاخیر، در۔

صبح و شام کرنا : اس میں بھی ایسا ہی ہے۔ اول نظم کائنات کے مزار مطلق کی حیثیت میں صبح کو شام اور شام کو صبح کرنا، اودھ پس و پیش کرنا، صبح کو کوئی آئے تو شام کے وعدے پر مثال دینا، شام کو آئے تو صبح کے وعدے پر مثال دینا۔

شرح : ہم نے مشیوں، معتقدوں اور کام پر ہمارے پیشے کے فوجداروں کو سلام

کرنے میں کوئی گسراٹھانہ رکھتی، لیکن وہ مولکام میں دیر کیجے جاتے ہیں۔
 ہمیں بتاتے ہیں کہ یاد، خدا سے کہو، اللہ اللہ! خدا سے کیا کہیں، اور تو آپ صبح و شام کرغٹھیں
 اس مصرع میں جو لکھتے ہیں، اس کی تشریح اللہ میں کرو گی لکھی۔



سامانِ خورو خواب کہاں سے لاؤں
 آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
 روزہ، میرا ایمان ہے، غالب! لیکن
 غصہ خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

نکات : غصہ خانہ : امیر و غصہ کی بیٹیوں سے گھر کے اندر ایک
 چار دیواری سے بنائیتے ہیں۔ اللہ پر بڑا برپائی چھڑکا جاتا ہے اور گرمی محسوس نہیں ہوتی۔ روزہ
 رکھ کر آرام سے اس میں سو جاتے ہیں۔

برفاب : برت و الہیاتی، جو روزہ انظار کرتے وقت استعمال کیا جاتا ہے۔

شرح : اسے غالب! روزہ پر میرا ایمان صد درجہ بخت ہے۔ میں خدا
 کی طرف سے اسے ایک ایسا قرآن سمجھتا ہوں، جو ہر حال میں چڑھا جونا چاہیے، لیکن مصیبت
 یہ ہے کہ کھانے پینے اور بہ آرام سونے کا سامان کہاں سے لاؤں؟ روزہ کے لیے آسانی
 کے جو اسباب درکار ہیں، وہ کہاں سے آتے آئیں؟ شاخِ غصہ خانہ کہاں سے ملے برفاب کہاں
 سے دستیاب ہو؟

مطلب یہ کہ روزہ وہی رنگ برہمینان رکھ سکتے ہیں، جنہیں انہی فراخی میسر ہے کہ
 رمضانِ آرام سے گزارنے کے سامان جمع کریں۔ مسکین اور عزیز آدمی ہوں، کھانے پینے ہی
 کا گزارہ نہیں ہوتا، سامان کہاں سے لاؤں؟

خواجه عاتقی فرماتے ہیں کہ یہ رباعی بھی اس قلعے کے ساتھ دربار میں پیش کی گئی تھی۔ جو روزے کے متعلق تعلقات میں درج ہو چکا ہے۔



ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے
 بھیجے ہیں جو ارمنیاں شرِ والانے
 گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار
 فیروزے کی تسبیح کے میں یہ دلنے

لغات : سیم : خواجہ عاتقی فرماتے ہیں، جو فیروزہ بیضی شکل کا ہوتا ہے، وہ سیم سے بڑے بہت مشابہ ہے۔ بیجوں کا سامن پکایا جاتا تھا بادشاہ نے ایک مرتبہ مرزا کے لیے یہی سامن بھیجا تھا جس کے شکریہ میں یہ رباعی بھی گئی۔
 ارمنیان : تحفہ، سوغات۔

شرح : سیم کے ان بیجوں کی حقیقت کسی کو کیا معلوم ہو سکتی ہے، جو عالی قدر بادشاہ نے سوغات کے طور پر بھیجے ہیں۔

ہم ایک ایک بیج کو سو سو بار گن کر دعائیں دیں گے۔ یہ سیم کے بیج نہیں فیروزے کی تسبیح کے دلنے ہیں۔ چونکہ سیم کا بیج فیروزے سے مشابہ ہوتا ہے اس لیے ان بیجوں کو فیروزے کی تسبیح کہتے اور تسبیح کی مناسبت محتاج تشریح نہیں۔

ضمیمہ اول

یہ ضمیمہ ان غزلوں، قصیدوں، قطعوں یا دوسرے
اشعار پر مشتمل ہے، جو کسی دھرم سے دیوان میں
شامل نہ ہو سکے۔ مصنف کا ذکر باب کھجواشی
میں درج ہے۔



دیکھنے میں ہیں گرچہ دو پر ہیں یہ دونوں یار ایک
 وضع میں گو ہوتی وہ سز تیغ ہے ذوالفقار ایک
 ہم سخن اور ہم زبان حضرت قاسم و تپس
 ایک تپش کا جب نشیں دند کی یادگار ایک
 نقد سخن کے واسطے ایک عیار اگلی
 شعر کے فن کے واسطے، مایہ اعتبار ایک
 ایک وفا و مہر میں تازگی بساط و ہر
 لطف و کرم کے باب میں، زینت روزگار ایک
 گلکدہ تلاش کو، ایک ہے رنگ، ایک بو
 ریختے کے قماش کو، پوچھے ایک تار ایک
 مملکت کمال میں ایک امید نامور
 عرصہ قیل و قال میں، خسرو نامدار ایک
 گلشن اتفاق میں، ایک بہار بے غزاں
 میکدہ وفاق میں، بادۂ بے نغمہ ایک
 زندہ شوق شعر کو، ایک چراغ انجمن
 کشتہ ذوق شعر کو، شمع سہ مزار ایک

قاسم و تپس

قہید :- یہ شعر
 جن کی علامت
 صورت غزل کی
 ہے۔ میرزا غالب
 نے گلکدہ میں اپنے
 دو عزیز دوستوں
 شہزادہ میرزا
 ابوالقاسم خاں قاسم
 اور میرزا احمد بیگ
 خاں تپس کے لیے
 کہے تھے۔ انہیں
 ۱۸۲۸ء تا ۱۸۲۹ء
 کا کلام سمجھنا چاہیے
 میرزا
 ابوالقاسم خاں قاسم
 تیموری خاندان
 کے شہزادے تھے
 بعض اصحاب نے
 لکھا ہے کہ وہ
 میں اپنے خاندان
 کی قدر و منزلت

دونوں کے دل حق آشنا، دونوں رسول پر فدا
 کار و آل دیکھ کر
 ایک محبت چار بار، عاشقِ بشت و چار ایک
 دل برداشتہ چو
 جان و فنا پرست کو، ایک شمیم نو بہار
 اور وطن چھوڑ کر
 فرقِ ستیزہ مست کو، ابرنگرگ بار ایک
 گلستا چلے گئے۔
 لایا ہے کر کے یہ غزلِ شاہدِ ریا سے دور
 وہیں گوشِ نشینی
 اختیار کر لی اور
 باقی عمر گزار دی

میرزا غالب
 کر کے دل و زبان کو، غالبِ خاکسار ایک
 کی چند تحریرات

سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض انگریز حاکموں سے قاسم کے تعلقات بہت گہرے تھے
 سید مسعود حسن رضوی نے یہ اشعار پہلے پہل دسمبر ۱۹۳۲ء کے ”الناظر“
 میں چھپوائے تھے۔ ”الناظر“ کے حوالے سے روزنامہ ”انقلاب“ نے انہیں شائع کیا۔
 بعد ازاں سید موصوف نے انہیں ”متفرقات غالب“ پر چھاپ دیا۔ ساتھ ہی میرزا کے
 بہت سے فارسی خطوط شائع کئے۔ جن میں سے نو میرزا تپاں کے نام تھے اور جن میں
 میرزا قاسم کے نام۔ موصوف نے ان کے مکاتیب قیامِ گلستا کے دوران میں لکھے گئے تھے، جن
 سے معلوم ہوتا ہے کہ قاسم وقتاً فوقتاً کھانے کے خواں یا دوسرے شخص میرزا غالب
 کے پاس بھیجتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ قاسم بیمار ہوئے تو میرزا غالب نے جو باقائدہ
 طب کی تعلیم پا چکے تھے۔ مسل کا نسخہ تجویز کیا جو بے حد مؤثر ثابت ہوا۔ چنانچہ قاسم
 نے پانچ شعر کا ایک قطعہ میرزا غالب کے پاس بھیجا، جس میں لکھا:

می سزدگر بگویمت بقراط و در غلاطوں بخوانمت زیباست
 زان محل دور شد مرض بالکل گر بگویم توئی میخِ حبیب است

میرزا غالب نے اس کے جواب میں دو طویل فارسی قطعے لکھے۔ قاسم کے مزید
 حالات معلوم نہ ہو سکے، البتہ میرزا غالب کے خطوط اور قطعات سے اندازہ ہوتا

ہے کہ وہ مذہبِ شیعہ تھے۔ ایک خط میں، جو دہلی سے لکھا گیا تھا، یہ واضح ہوتا ہے کہ تھم کے فرزند محمد میرزا کا انتقال ہو گیا تھا اور میرزا غالب اس کی تاریخِ کفن کی فکر میں تھے میرزا احمد بیگ چچاں نواب عطاء اللہ خاں کے فرزند اور دہلی کے باشندے تھے۔ بلکہ تھم ہار صدر دیوانی میں مختار بن گئے تھے۔ اور غالب کچھ مدت مرشد آباد میں گزری تھی۔ وہ میرزا محمد اسماعیل معروف بہ مرزا جان تپش کے شاگرد تھے۔ خواجہ نور نواب احمد بخش خاں اور نواب الہی بخش خاں معروف کے خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ میرزا غالب کے بعض خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ چچاں تپش کے مقصد میں نواب شمس الدین احمد خاں کے طرفدار تھے۔ جن کے خلاف میرزا غالب نے دعویٰ کیا تھا۔ چچاں نے ۱۸۳۳ء میں ہتھام لکھتے ہی میں وفات پائی، جیسا کہ ناسخ کے تذکرہ ”معین شرارت“ میں بتایا گیا ہے۔ چچاں اور ان کے استاد تپش دونوں اپنے تعلق ”عائے لکھتے تھے لیکن دونوں صحیح ت ہی سے ہیں۔

۱۔ لغات - دوسرے دو دھاری والی

مشرح۔ اگرچہ یہ دونوں دوست، یعنی قاسم و چچاں دیکھنے میں دو نظر آتے ہیں، مگر ان کے درمیان محبت و رفاقتی کا ایک ایسا رشتہ موجود ہے کہ حقیقتاً دونوں ایک ہیں۔ مثال یہ سمجھنے کہ اگرچہ حضرت علیؑ کی تلوار ذوالفقار کی دھاریں دو تھیں۔ لیکن تلوار ایک ہی تھی۔

۲۔ شرح۔ جناب قاسم اور جناب چچاں دونوں ہم سخن اور ہم زبان ہیں۔ یعنی دونوں شاعر ہیں۔ ان میں سے ایک تپش کا جانشین ہے۔ یعنی احمد بیگ چچاں جو مرزا جان تپش کے شاگرد تھے۔ دوسرا خواجہ میر درد کی یادگار ہے، یعنی قاسم کا سلسلہ تلمذ خواجہ میر درد سے ملتا ہے۔

تلاش کے باوجود چچاں نہ مل سکا۔ کس ذریعے سے خواجہ میر درد کے ساتھ تعلق قائم ہو گیا۔ بظاہر خواجہ سے براہِ راست استفادہ مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ ناممکن نہیں۔ کیونکہ خواجہ مرحوم کا انتقال ۱۱۹۹ھ ۱۷۸۴ء میں ہوا۔ بہر حال یہ واضح ہے

کو قائم بجا واسطہ یا بالواسطہ خواہر میر و نہ ہی سے وابستہ تھے ۔

۳۲۔ لغات - حیار، کسوٹی

آگہی : علم و شعور

شرح : ان دونوں میں سے ایک نقد شعر کے لئے علم و شعور کی کسوٹی ہے اور دوسرا اس فن کے لیے عز و وقار کا سراپ ہے ۔

۳۳۔ لغات - بساط : فرش

شرح - دونوں میں سے ایک محبت و وفا میں نہانے کے لیے تازگی و شادابی کا سردسماں ہے اور دوسرا لطف و کرم کے اعتبار سے روزگار کی زیب و زینت ہے ۔

۵۔ لغات - تلاش : وضع ، ڈھنگ ، ایک ریشمی کپڑا ، یہاں آخری معنی مراد ہیں ۔

پنڈ : بانا ۔

تار : تانا ۔

تار و پور : تانا بانا +

شرح - اگر تلاش کو ایک بانغ فرض کر لیں ، جو پھولوں سے پٹا پڑا ہو تو اس کے لئے قائم و تپان میں سے ایک رنگ ہے اور دوسرا خوشبو ، یعنی تلاش کے بانغ میں جتنے بھی پھول ہیں ۔ ان دونوں کے ملنے سے بنے ہیں ۔ گویا انہیں مضامین کی تلاش میں کہاں حاصل ہے ۔ اسی طرح اردو شعر گوئی کو ریشمی کپڑا سمجھیں تو اس کپڑے کے لئے دونوں میں سے ایک بانا ہے ، دوسرا تانا ۔ مطلب یہ کہ دیکھنے کا انحصار انہیں پر ہے ۶۔ لغات - سرحسہ قیل و قال : گفت گو کی سرزمین ۔

شرح - کہاں کی سلطنت میں ایک کو نامور امیر کا منصب حاصل ہے ۔ دوسرے کو گفت گو کی سرزمین میں نام آور بادشاہ سمجھنا چاہیئے ۔

۷۔ لغات - وفاق : موافقت ، یک جہتی ، محبت ، ہم آہنگی ، مل جل

کر رہنا۔

شرح۔ اتفاق کے باعث میں ایک دوست ایسی بہا ہے۔ جس پر کبھی غصہ نہیں آ سکتی۔ محبت و یک جہتی کے شراب خانے میں دوسرا دوست ایسی شراب ہے، جس کا نشہ کبھی نہیں اترتا اور خمار کی کیفیت کبھی رونما نہیں ہوتی۔

۸۔ **شرح**۔ جو شخص شعر کے شوق میں زندگی گزار رہا ہے۔ اس کے لیے دونوں دوستوں میں سے ایک کو چراغِ محفل کی حیثیت حاصل ہے۔ جس شخص نے شعر کے ذوق میں جان دے دی، دوسرا دوست اس کے مزار کے لیے شمع ہے۔

مطلب یہ کہ شعر کا شوق رکھنے والے یقیناً محفل آراستہ کریں گے تاکہ ایک دوست کو شرفِ نہیں اور محفوظ ہوں۔ ایسی محفل کے لیے دونوں دوستوں میں سے ایک چراغ ہے اسی چراغ جو شخص مر جائے، اس کے مزار کی رونق اس شمع ہی سے ہوتی ہے جو وہاں روشن کی جاتی ہے۔ ذوقِ شعر میں مرنے والے مزار کی رونق دوسرا دوست ہے۔

۹۔ **لغات**۔ **محب** چار یار۔ رسول اللہ (صلعم) کے چار ممتاز صحابیوں (حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ) سے محبت رکھنے والا۔ یہ اہل سنت کی خصوصیت ہے۔

عاشقِ بہشت و چار بہشت و چار بارہ مراد ہے بارہ آدمہ کرام (حضرت علیؓ سے ہم مدنی ملک) آدمہ کرام کے عاشق سے مراد ہے شیعوں۔

شرح۔ دونوں دوستوں کے دلوں میں خدا کی محبت ہے۔ دونوں رسول اللہ (صلعم) کے والد و شیفۃ ہیں۔ ان میں سے ایک چار یار سے محبت رکھنے والا (یعنی سنی ہے)، دوسرا بارہ اماموں کا عاشق یعنی شیعوں ہے۔ سنی سے مراد میرزا احمد یگ خاں تپاس ہیں اور شیعوں سے مراد۔ میرزا ابوالقاسم خاں قاسم، جیسا کہ میرزا غالب کے بعض خطوط سے بھی واضح ہوتا ہے۔

۱۰۔ **لغات**۔ **فرق**، سر

ستیزہ مست : لڑائی کا دلدادہ۔

مگر گ بار :- اولے پر سانے والا - ڈالہ بار

شرح - جو جان وفاق کی شیدائی ہو۔ اس کے لیے دونوں میں سے ایک دوست
نوبہار کی خوشبو ہے اور جو سرزانی کا دلدارہ ہو۔ اس کے لیے دوسرا دوست اولے بھاتا
دلہا دل کی حیثیت رکھتا ہے -

۱۱ - لغات - شانیدہ : آمیزش ، ملاوٹ -

شرح - خاک و رقابت دل و زبان کو ایک کر کے یعنی خلوس سے یہ نزل کہ
کر لایا ہے اور یہ دیا و نمائش کی ملاوٹ سے بالکل پاک ہے یعنی جس کچھ کہا گیا ہے
اس کی حیثیت دکھاوے کی نہیں ، بلکہ جو کچھ دل میں موجزن تھا ، وہی زبان پر جاری
ہوا - اس طرح دل اور زبان ایک ہو گئے -

۱ - لغات
آرمیدہ :-
آرام پایا ہوا ،
مطلوبہ -
شرح :-
میرے لیے
بیوے سے
بھی اطمینان و
آرام کے ساتھ
شہر چانا ممکن
نہیں - میں غم
ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشتِ غم میں آہوئے صیادویدہ ہوں
ہوں دردمند جبر مویا اختیار ہو
گناہ کشیدہ ، گناہ چلبند ہوں
جاں لب پہ آئی ، تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
از بس کہ تمنی غم جس چشیدہ ہوں
نے سحر سے علاقہ ، نہ سحر سے واسطہ
میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں

ہوں خاکسار، پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ
 نے دانہ فتاوہ ہوں نے دام چسیدہ ہوں
 جو چاہیئے، نہیں وہ مری فتدرو منزلت
 میں یوسف بہ قیمتِ اولِ حسدِ ہوں
 ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
 ہوں میں کلامِ نغز، دے ناشنیدہ ہوں
 اہلِ دُعا کے حلقے میں ہر چند ہوں ذلیل
 پر عاصیوں کے دُمرے میں، میں برگزیدہ ہوں
 پانی سے لگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
 دُرتا ہوں آتے سے کہ مردم گزیدہ ہوں !

۲۔ لغات :- جبر :- ظلم، زبردستی۔ ایک عقیدہ، جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے۔ اسے کسی قسم کا اختیار حاصل نہیں۔
 اختیار :- جبر کے برعکس، یعنی انسان اپنے افعال میں مختار و آزاد ہے۔

شرح :- مجھے جبر کا قائل سمجھا جائے یا اختیار کا۔ مجبور قرار دیا جائے یا مختار
 لیکن میری دردمندی اور غمیگی میں قطعاً کوئی شبہ نہیں۔ اگر اختیار کا معاملہ ہو تو میری
 حالت اس آہ و فغاں کی سی ہے، جو درد کی حالت میں کھینچی یا کی نہائے۔ اگر مجبور
 ! نہیں تو میری حالت اس آنسو کی سی ہے، جو بے اختیار ٹپکتا رہتا ہے۔

جبر و اختیار کی کتنی عمدہ مثالیں پیش کیں اور دونوں درونم کی مثالیں ہیں۔ نادر
کھینچ اختیار کی فصل ہے۔ وہ بھی رنج و غم کا نشان ہے۔ آنسو کا چلنا اضطراری فعل ہے
وہ بھی اندوہ و غم کی دلیل ہے۔

۳۔ شرح۔ جان ہوں پر آگنی۔ چونکہ وہ شیریں ہوتی ہے، اس لئے یہی
ہونا چاہیے تھا کہ منہ میں ہر طرف مٹھاس کی لذت پھیل جاتے۔ یہ نہیں ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ
میں نے غم فراق میں بے حد تکلیف اٹھائی ہے۔ اس تکلیف نے کام دوہن میں اس قدر کڑواہٹ
پیدا کر دی کہ جان کی شیرینی بھی ذائقہ نہیں بدل سکی۔

۴۔ لغات۔ معرض مثال :- مثال عرض کرنے یعنی پیش ہونے کی جگہ۔
مطلب ہے یہ طور مثال۔

شرح۔ نہ مجھے تبیح سے کوئی صلاح ہے کہ عبادت گزار بندہ بن جاؤں،
نہ جام شراب سے کوئی واسطہ ہے کہ زندگی کر سکوں۔ آپ میری کیفیت بطور مثال بتانا
چاہیں تو سمجھ لیں کہ میرے ہاتھ کٹ چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کے ہاتھ کٹ جائیں
وہ نہ تبیح پکڑ سکتا ہے، نہ پیالہ اٹھا سکتا ہے۔

۵۔ بشرح۔ میں یقیناً خاک پر پڑا ہوا ہوں، لیکن خاک پر پڑی ہوئی چیزوں میں سے
ایسی بھی ہیں، جو دوسروں سے دشمنی رکھتی ہیں۔ مثلاً پھیلا ہوا جال اور اس پر ڈال
ہوا داغ دونوں زمین پر ہوتے ہیں۔ لیکن مقصود یہ ہوتا ہے کہ پرندوں کو کچڑ لیا
جاتے۔ میں وہ مسکین اور خاکسار ہوں کہ مجھے کسی سے بھی دشمنی نہیں۔ نہ میں دانا ہوں
کہ پرندہ مجھے پگنے کے لیے آئے، نہ جال ہوں جس میں کسی کو پھانس لیا جائے۔

۶۔ شرح۔ میں جس عزت اور قدر و منزلت کا مستحق ہوں، وہ مجھے
نصیب نہیں۔ میں یوسف تو ہوں۔ مگر اس حال میں ہوں، جب وہ پہلی مرتبہ
بچے تھے۔

بھائی حضرت یوسف کو کنوئیں میں پھینک کر چلے گئے تو قرآن مجید کا بیان
ہے کہ قافلہ آیا۔ سقے نے پانی بھرنے کے لیے ڈول ڈکایا، اس بھگت یوسفؑ

نکل آئے۔

”سقا پکارا تھا: کیا خوشی کی بات ہے، یہ تو ایک لڑکا ہے، پھر قافلے والوں نے اسے سرہانہ تہارت سمجھ کر چھپا رکھا دک کوئی دھوئے دار نہ نکل آئے، اور وہ جو کچھ کر رہے تھے، اللہ کے علم سے پوشیدہ نہ تھا اور انہوں نے یوسفؑ کو بہت کم دامنوں پر کر گنتی کے چند درجہ تھے: فردخت کر دیا۔“

یہ بہ قیمتِ اولِ خزیدہ کا ثبوت ہے یعنی چند درجہ۔ میرزا کہتے ہیں کہ میری قدر و منزلت بہت اونچی ہے، لیکن ہوتی نہیں۔ گویا میں یوسفؑ تو ہوں مگر پہلی مرتبہ ہکاسوں۔ آگے چل کر میرے پورے جو سر کھلیں گے۔

۷۔ لغات۔ کلامِ تغز: نہایت عمدہ اور اعلیٰ کلام۔

شرح:۔ افسوس مجھے کسی کے بھی دل میں جگہ نصیب نہیں ہوئی۔ میں

نہایت عمدہ اور اعلیٰ کلام ہوں۔ لیکن ابھی تک کسی نے مجھے نہیں سنا۔

کلام اسی وقت دل میں جگہ پاسکتا ہے، جب سنا یا پڑھا جائے۔ جس کلام

نے کانوں تک رسائی نہ پائی، وہ دل تک کیونکر پہنچ سکتا ہے؟

۸۔ لغات۔ ورج:۔ پرہیزگاری۔ اہل لغت کے نزدیک ”مفتوح

بھی درست ہے اور ساکن بھی، اسی لئے یہ مصرع دونوں طرح دیکھا گیا: اول

اہل ورج کے حلقے..... الخ، دوم ہر چند اہل ورج کے حلقے.... الخ

برگزیدہ:۔ چنا ہوا، نہایت عالی پایہ۔

شرح۔ اگرچہ میں پرہیزگاروں کے حلقے میں بہت پست و ذلیل ہوں

اور میری حیثیت بہت نیچی ہے، لیکن گنہگاروں کے زمرے میں اگر دیکھیں، میرا

پایہ بہت بلند ہے۔

مطلب یہ کہ میں نے پرہیزگاری کا کام کوئی نہ کیا، گناہوں میں برابر سرگرم

رہا۔ اس لئے جہاں اونچا رتبہ حاصل کرنا ضروری تھا۔ وہاں بہت نیچا رہا۔ اور

جہاں سب سے نیچا رہنا چاہیے تھا، وہاں بہت اونچا ہو گیا۔

اس سلسلے میں عرقی کا ایک شعر قابل ملاحظہ ہے یعنی :

گھر کر غیبت گنہگار قرمز میں عرقی کرایں حدیث گراں ایہ لف کیا تھی ات

یعنی اسے عرقی یہ ذکر کہ مجھ سے زیادہ گنہگار کوئی نہیں، کیونکہ ایسی بڑی بات

منہ سے نکالنے کا مطلب یہ ہو گا کہ تو کسی نہ کسی واسطے میں رنگا نہ دیکھتا ہے۔ یہ بھی تو کوئی اچھی بات نہیں۔

۹۔ لغات : سگ گزیدہ : جسے دیوانے کہتے تھے کاٹ لیا ہو۔ اسے

شخص کے جسم میں دیوانے کہتے کا زہر سراپت کر جہٹے تو وہ پانی سے بہت ڈرتا ہے، کیونکہ پانی دیکھتے ہی اس پر تشنگی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور مگ پٹھے کھینچنے لگتے ہیں۔

مردم گزیدہ : جسے آدمیوں سے حد درجہ آزار اور دکھ پہنچا ہو۔

شرح :- اسے اسد! جس طرح دیوانے کہتے کا کاٹا ہوا پانی سے

ڈرتا ہے۔ اسی طرح میں آئینے سے دُور بھاگتا ہوں۔ کیونکہ مجھے میرے ہم جنسوں نے سخت دکھ اور آزار پہنچایا ہے، یعنی وہ ہمیشہ مجھے کاٹ کھانے کے ورپے رہے۔ آئینہ دیکھنے سے ہم جنس اور ان کی تمام ایذا رسانیاں تازہ ہو جائیں گی۔

اپنا احوال دل زار کہوں یا نہ کہوں بے حیاءانہ اظہار کہوں یا نہ کہوں

نہیں کرنے کا میں تقریر ادب سے باہر میں بھی ہوں اقباسر کہوں یا نہ کہوں

ٹھکوا سمجھو اسے یا کوئی شکایت سمجھو اپنی ہستی سے ہوں میزار کہوں یا نہ کہوں

اپنے دل ہی سے میں احوال گرفتاریں جب نہ پاؤں کوئی غمخوار کہوں یا نہ کہوں

دل کے ہاتھوں سے کہے دشمن عالی پنا ہوں اک آفت میں گرفتار کہوں یا نہ کہوں

میں تو دیوانہ ہوں اور ایک جہاں سے نکلتا ہوں گوش ہیں درمیں دیوار کہوں یا نہ کہوں

آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے تو استاد!

حسب حال اپنے پھر اشارہ کہوں یا نہ کہوں؟

۱۔ شرح - اے خراب و خستہ حال دل! میں اپنی کیفیت بیان کروں یا نہ کروں؟ بیان کرنے سے شرم منع کرتی ہے۔ تو بتا کہ کچھ کہوں یا کہوں؟

۲۔ شرح - اے محبوب! میں بھی آپ کے تمام بھیدوں سے واقف ہوں۔ فرمائیے، بیان کروں یا نہ کروں؟ اتنا بتاتے دیتا ہوں کہ میری تقریر ادب کے دائرے سے باہر کبھی نہ ہوگی۔ یعنی میں کچھ بھید زبان پر لے آؤں گا تو وہ بھی اسی طرح بیان کروں گا، جس طرح کرنے چاہئیں۔

۳۔ بغا ہر خطاب باری تعالیٰ ہے۔

شرح - کہتے ہیں، میں اپنی ہستی سے بیزار ہوں۔ اب اس کا اظہار کروں یا نہ کروں؟ آپ چاہیں تو اسے شکر سمجھ لیں، چاہیں شکایت قرار دے لیں۔

۴۔ شرح - میں دل کے رنج و غم اور گرفتگی کا حال بیان کرنا چاہتا ہوں لیکن غم خوار کوئی نہیں ملتا۔ اب آپ ہی فرمائیں کہ یہ سب کچھ اپنے دل ہی سے کہہ لوں یا نہ کہوں؟

۵۔ شرح - دل میرا جانی دشمن ہے اور اس کے ہاتھوں میں پھنس گیا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ یہ بات کہوں یا نہ کہوں؟

۶۔ لغات - نغماز، چغل خور

شرح - میں تو دیوانہ ہوں۔ جو کچھ جی میں آتا ہے۔ کہے جانا میرا خاصہ ہے۔ نہانہ چغل خور ہے۔ ہر دیوار کے ساتھ کان لگے ہوئے ہیں۔ عجب عیبست میں مبتلا ہوں، کچھ کہوں یا نہ کہوں؟

۷۔ شرح - اے استاد! میرا محبوب آپ سے میرا حال نہ پوچھے تو

جتائیے، اپنے حسبِ حال شعر کہوں یا نہ کہوں تاکہ کسی طرح میرا حال محبوب
 تک پہنچ جائے ؟
 یہ غزل دیوانِ معروف و نواب الہی بخش خاں مرحوم، جو میرزا کے خسر تھے،
 میں جمع ہوئی۔ کیونکہ معروف نے فی پشلی لکھا تھا۔ گویا یہ ۱۸۳۱ء (تاریخ وفات معلوم
 سے پیشتر کا کلام ہے۔

- ۱۔ شرح
 وصل کی ذات
 تکیہ میرا غم خوار
 بن گیا اور وہی
 میرے جان و
 تن کے لیے
 آرام کا موجب
 ہوا۔
- ۲۔ لغات
 جعد پر شکن؛
 پیچ در پیچ زلف
 شرح :-
 میرا تکیہ پیچ در
 پیچ زلف کا غم
 بن گیا ہے اس
 سے میری حیثیت
 اتنی بلند ہو گئی
- شبِ وصال میں مونس گیا ہے بن تکیہ
 ہوا ہے موجب آرامِ جان و تن تکیہ
 خراجِ بادشہ ہمیں سے کیوں نہ مانگوں آج ؟
 کہ بن گیا ہے غمِ جعد پر شکن تکیہ
 بنا ہے تختہ، گلہائے یاسمین، بستر
 ہوا ہے دستہ رنسرین و نستر تکیہ
 فروغِ حسن سے روشن ہے خواب گاہ تمام
 جو رختِ خواب ہے پردیں تو ہے پر تن تکیہ
 مزا ملے، کہو کیا خاک ساتھ سونے کا ؟
 مکے جو بیچ میں وہ شوخِ سیم تن تکیہ
 اگر چہ تھا یہ ارادہ، مگر خدا کا شکر
 اٹھا سکا نہ نزاکت سے گلِ بدن تکیہ

ہوا ہے کاٹ کے چادر کو ناگہاں غالب :
 اگرچہ زانو سے تل پر رکھے دمن تکیہ
 بہ ضرب تیشہ وہ اس واسطے ہلاک ہوا
 کہ ضرب تیشہ پہ رکھتا تھا کوہ کن تکیہ
 یہ رات بھر کا ہے ہنگامہ صبح ہونے تک
 رکھو نہ شمع پڑاے اہل انجمن تکیہ

اگرچہ پھینک دیا تم نے دُور سے، لیکن
 اٹھائے کیونکہ یہ رنجور خستہ تن تکیہ
 غش آگیا جو پس از قتل، میرے قاتل کو
 ہوئی ہے اُس کو مری نعش بے کفن تکیہ
 شب فراق میں یہ حال ہے اذیت کا
 کہ سانپ فرش ہے اور سانپ کے ہے من تکیہ
 روارکھو نہ رکھو، تھا جو لفظ ”تکیہ کلام“
 اب اُس کو کہتے ہیں اہل سخن ”سخن تکیہ“

ہمم اور تم فلک پیر جس کو کہنے ہیں
 فقیر غالب مسکین کا ہے کمن نگہ

ہے کہ بادشاہ چین
 سے خراج وصول
 کرنے کو جی چاہتا
 ہے ۔

بادشاہ چین ہے
 خراج مانگنے کے ظالم
 دو سبب معلوم ہوتے
 ہیں اول برہمن سبب
 یہ کہ یوب کی سیاہ ،
 فداوار اور مہنر نہیں
 ملک مانگے کے لیے
 اسی رشتہ ہوتا ہے
 اور مانگے کا سب سے
 بڑا مرکز چین ہے کیونکہ
 خفا اور غش دو نوا چین
 کے علاقے تھے

ایک یہودی بھی
 ہے کہ ”چین“ کے
 معنی ”شکن“ ہوتے
 ہیں اور تکیہ جس پر شکن
 بن گیا تو کئی چین ۳۳
 میں آگئے، لہذا فرمایا
 کہ اب تو چین کے بادشاہ

سے خارج نہ سکتا ہوں۔

۳۔ شرح : بستر چنبیلی کے پہروں کا تختہ بن گیا ہے اور نیچے کے باسے میں یہ کڑکتے ہیں کہ نرسیں دسترن کے پھول پٹن بنیں کہ اکٹھے کیے گئے اور ایک گلرستہ بنادیا گیا۔

۴۔ لغات : پُردِ روین و پُترن : ستاروں کے دو مجرمت۔
شرح : خن کی جلا سے میرے سونے کا کرو سارے کا سار و دش ہو گیا۔ بستر پردین بن گیا اور نیچے خن پُترن کی شکل اختیار کر لی۔

واخ رہے کہ ان چاروں شعروں میں شب وصال کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

۵۔ شرح : بھلا سوچیے کہ جب ہمارا شوخ دیمین محبوب درمیان بکیر رکھ دیتا ہے تو ہم غول کا کیا ملت آئے؟

۶۔ شرح : اگرچہ پھول جیسے بدن واسے محبوب کا ارادہ یہی تھا کہ بکیر اٹھا کر ایک طرف رکھ دے، مگر خدا کا شکر ہے کہ نزاکت کے باعث وہ اُسے اٹھا نہ سکا۔

۷۔ لغات : نقل اور دمن : ہندوستان کے مشہور عاشق و معشوق۔
نقل مابا تھا، دمن اس کی محبوبہ تھی۔ ان کی داستان عشق فیضی نے اپنی مشہور حریں مشنوی نقل دمن میں بیان کی ہے۔

شرح : اگر دمن نقل کے زانو پر بکیر رکھتے اور سہارا دینا چاہے تو وہ چادر کو کاٹ کر اچانک غائب ہو جائے۔

۸۔ اس شعر میں بکیر کے معنی تسلیم ہیں۔

شرح : چونکہ فریاد کا سہارا تیشے کی ضرب پہ تھا۔ اس لیے وہ تیشے ہی کی ضرب سے چلاک ہو گیا۔

مطلب یہ کہ فریاد نے تیشے کے بل پر کوہ بے ستوں کا ٹھنڈے کا ارادہ کیا اور اسے کاٹ کر بھی رکھ دیا، لیکن افسر سہارا نہ رکھا۔ اپنی قوت سے تیشے کی ضرب لگانے ہی کو معمولی مقصد کا ذریعہ سمجھتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آخر خود ہی سر پہ تیشہ مار کر مر گیا۔

۹۔ میاں بھی نکلیے کے معنی سمجھا رہے ہیں۔

شرح : اسے اہل فعل ؛ شیخ پر عبور و سادہ انداز سے یہ صبح ہونے تک پہنچ جانے کی۔ گویا شیخ کے سہارے بزم میں جو جنگا مسافر تھے وہ صوفی رات بھر کیے ہیں۔ صبح ہوتے ہی شیخ گل ہو جانے کی۔ ساتھ ہی جنگا کے کی بلا بھی پیشی جانے کی۔

۱۰۔ لغات : رنجور خستہ تن : وہ بیمار ، جس کا بدن زخموں سے پتھر پتھر ہو۔

شرح : میں بیمار ہوں ، زخموں سے میرا بدن پتھر پتھر ہے ۔ میں نے ٹکڑے ٹکڑے تم نے دور سے پھینک دیا ، جو تھک نہ پہنچ سکا۔ اب تمہیں سوچو کہ میں وہ ٹکڑے کیونکر بچاؤں !

۱۱۔ **شرح :** میرے محبوب نے مجھے قتل کر ڈالا۔ میں گر گیا تو اسے یہ کیفیت دیکھ کر غش آگیا۔ چنانچہ وہ بھی گرا اور اس حال میں میری بے کفن لاش اس کے پاس ٹکیے بن گئی۔

۱۲۔ **لغات :** من : وہ مٹ رہا ، جو سانپ کے منہ میں رہتا ہے اور عام خیال یہ ہے کہ اندھیری رات میں سانپ اسے اٹھ لی دیتا ہے تو وہ شعلے کی طرح روغن ہو جاتا ہے۔

شرح : محبوب سے جدائی کی رات میں جو اذیت پہنچی رہی ہے اس کا حال کیا بتاؤں ؟ بس یہ سمجھ لیے کہ بستر سانپ بن گیا ہے اور ٹکڑے اس کا منہ ہے۔

۱۳۔ **شرح :** آپ جائز سمجھیں یا نہ سمجھیں ، لیکن یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ پہلے جس چیز کو ٹکڑے کلام کہتے تھے ، اب اہل حق اسے ”حق ٹکڑے“ کہتے ہیں۔

”ٹکڑے کلام“ سے مراد ہے وہ لفظ یا جملہ جسے کوئی شخص دورانہ گفتگو میں بار بار دہرائے۔ لغت کے لحاظ سے ”حق ٹکڑے“ کے بھی وہی معنی ہیں۔ میرزا کہتے ہیں کہ بلاشبہ ٹکڑے کلام ایک مسلم عارف ہی کا ہے ، لیکن اب غوروں نے ٹکڑے کلام کی جڑ تو نکلی ہے۔

کہنا شروع کر دیا ہے۔ آپ اسے ہائز نہیں سمجھتے تو نہ سہی۔

پوری غزل خصوصیت سے آخری اشعار میں میرزا نے قادر الکلامی کے جوہر ہر دکھائے ہیں، ان کی مثال مشکل سے ملے گی۔

۱۳۔ شرح : ہم اور آپ آسمان کو غلبہ دینے پہنچ پوڑھا آسمان کو رہے ہیں۔
وہی غائب بھیے عاجز فقیر کا پھرا نا سنا ہے۔

یہ غزل مولانا ابوالکلام آزاد و مرحوم قزاق سعید الدین احمد خاں غائب کی بیاض سے حاصل کر کے ”ابطل“، نکلتے سورہ ۲۲ جولائی ۱۹۳۲ء میں شائع کی تھی، پھر یہ ”بندہ“ نامی میں شائع ہوئی۔



تمہید :-
یہ غزل، جیسا کہ متعلق سے ظاہر ہے، قزاق علاؤ الدین احمد خاں علائی نے باسرا لکھا، تھی اور میرزا غائب نے ۲۶ جولائی ۱۹۳۲ء کے مکتوب میں، علائی کے پاس نوادر بھیجی دی تھی۔ یہ اس لیے دریاں میں شامل نہ ہو سکی کہ میرزا کا کوئی، دریاں ۱۹۳۲ء کے بعد نہ لکھنا تھے نہ ہوا۔ بعد

میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی
غیر کی مرگ کا غم کس لیے، اے غیرتِ ماہ
ہیں ہوس پیشہ بہت، وہ نہ ہوا، اور سہی
تم ہو بُت، پھر تمہیں پندارِ خدائی کیوں ہے
تم خداوند ہی کہلاؤ، خدا اور سہی
خُش میں خور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کہی
آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی
تیرے کوچے کا ہے مائل دلِ مضطر میرا
کعبہ اک اور سہی، قبلہ نما اور سہی

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یا رب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں
زہر کچھ اور سہی، آپ بقا اور سہی
مجھ سے، غالب! یہ علانی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گیر رنج فزا اور سہی
سے زیادہ کرو، میں ہرگز ب شکایت داد کروں گا۔

۲۔ لغات : ہوس پیشہ : جو تنہا عاشق نہ ہو اور محض ہوا دوس کا بندہ ہو۔

شرح : اسے چاند کے بیسے باغیچہ رشک محبوب : غیر مرگیا ہے
تو اس کا تم کیوں کرتے ہو؟ ایسے بندگان ہوا دوس بہت ہیں۔ جو مر گیا ہے، اس
کے سوا کسی کو اپنا بیسے۔ اگر آپ کو ہوا دوس کے بندے ہی مطلوب ہیں تو وہ
ایسے نایاب نہیں کہ مل نہ سکیں۔

شاعر کا اصل مقصد یہ ہے کہ میرے سوا جتنے بھی لوگ محبوب کے پاس
جائیں گے۔ سچے عاشق نہ ہوں گے۔ حقیقی عشق صرف میری ذات تک محدود ہے۔
۳۔ لغات : پندار : خیال، ضرور، بخت، تصور۔

شرح : تم بُت ہو (اور محبوبوں کو اکثر بُت ہی کہا جاتا ہے)، پھر تم
میں خدائی کا ضرور کچھ کیوں پیدا ہو گیا، یعنی تم خدا کیوں بن رہے ہو؟ میری بات مانو۔
خدا کو الگ رہنے دو، صرف خداوند، یعنی مالک و آقا ہی کہلانا تمہارے لیے
مناسب ہے۔

انہاں سے شامل دیو سی
کرتے کسی کو نیاں
ہی نہ آیا۔

۱۔ شرح :
میں خود جفا پسند کرتا
ہوں، مگر اسے محبوب
مجھ پر اور جفا کرتا ہو۔
تمہیں ظلم و جبر پسند ہے
تو جفا کر رہے ہو اس

۴۔ **شرح :** اسے محبوب ! آپ کا طرزِ طریق، طرزِ اور ادا کتنی ہی عجیب و غریب کیوں نہ ہو، لیکن آپ جن میں خود پر برتری حاصل نہیں کر سکتے۔

یہ کسی ایسے موقع کا معاملہ معلوم ہوتا ہے، جب محبوب سے باتیں جو۔ جو، تھیں اور وہ اپنے انعام و ادا پر غرور میں آپ سے باہر ہو رہا تھا۔ ماتِ حیات کے دوران میں عاشق نے تعریفاً وہ بات بھی کر دی، جو اس کی زبان پر نہیں آنی چاہیے تھی اور مقصود یہ تھا کہ محبوب کو غصہ آئے اور وہ مزیدِ ظلم و جور کرے عاشق پہلے ہی کہہ چکا ہے کہ میں مشتاق ہونا ہوں۔

۵۔ **شرح :** میں مانتا ہوں کہ کبرِ نہایت مقدس مقام ہے۔ قبلہ نما سے بھی بگے انکار نہیں، لیکن میں کیا کروں، اسے محبوب ! میرا دل تو اضطراب کی حالت میں صرف تیرے ہی کوچے کی طرف میلان رکھتا ہے۔ کہے اور قبلہ نما کی طرف اسے کوئی رغبت نہیں۔

بلا ہر اس شکر کا مطلب یہ ہے کہ میرے نزدیک کبر اور قبلہ نما اصل تو جبر کی چیزیں نہیں، دل کا تعلق صرف محبوب حقیقی سے ہونا چاہیے۔

۶۔ **شرح :** اسے واعظ ! کیا دنیا میں کوئی باغ اور کوئی چمن ناز نہیں؟ بہشت بھی، ہر حال باغ ہی ہے، ہم نے مانا کہ اس کی آب و ہوا یہاں کے باغوں سے کسی قدر مختلف ہوگی۔ پھر کیا دوسرے کر آپ وہ خط فرماتے ہیں تو اسی کی، ترغیب دیتے ہیں؟

۷۔ **شرح :** اے خدا ! بہشت میں دوزخ کو بھی کیوں نہ دھایا جائے؟ اس طرح سیر و تفریح کے لیے تھوڑی سی شئی فدا پیدا ہو جائے گی۔

اس شعر میں بھی وہی مضمون پیش کیا گیا ہے، جو میرزا غالب پہلے بیان کر چکے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک بہشت ایک ایسا مقام ہے، جو محبوب حقیقی کی عبادت کے لیے بطورِ ترغیب پیش کیا جاتا ہے اور میرزا نہیں چاہتے کہ اس سطح میں کسی ترغیب سے سابقہ پڑے۔ وہ صرف خدا کے لیے خدا کی عبادت

کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جنت اور دوزخ میں کوئی تیز قائم نہیں رکھی۔ وہ نہ اس امر کے قائل ہیں کہ عبادت کے لیے انعام کا لالچ ہو، نہ یہ پسند کرتے ہیں کہ انہیں ڈرنا کہ بندگی پر آمادہ کیا جائے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دونوں چیزیں غلوں کے متافی ہیں، لہذا دونوں کو ایک وجہ میں رکھ دیا۔ مقصود حقیقی بہشت و دوزخ کی بحث نہیں، مقصود صرف غلوں فی العبادت ہے۔ یہ مضمون میرزا نے مختلف اشعار میں بہ انداز مختلف پیش کیا ہے مثلاً،

طاقت میرا ہے نہ سدا نکلیں کی لاگ دوزخ میں ڈال دو کوئی نے کو بہشت کو
منور ملکات بہ غلو و ستر آویخت خدائی عطا شد ز گل باز نہ دانست

۸۔ شرح : مجھے وہ چیز دے دیجیے، جسے کھا کر پانی مانگنے کی پس گوشت نہ آئے اور مریاؤں نہ مجھے زہر کی ضرورت سمجھے کھاؤں۔ بدن تشکی سے چمکنے لگے، پانی مانگوں اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دوں۔ نہ میں آبِ حیات کا خواہاں ہوں کہ چہوں اور غم عشق کے ساتھ ہمیشہ کے لیے درد بھری زندگی بسر کروں۔

۹۔ شرح : اے غائب ! یہ غزل مجھ سے علامہ اقریبی احمد خان علائی نے ہے اسرار کھوائی۔ پہلے ہی رنج برہانے والے ظالم خاصی تعداد میں موجود تھے، اب میں ایک اور کا احاطہ قبول کر دو۔



آپ نے ”مسنی الضّر“ کہا ہے تو سہی تمہید :-
یہ بھی اے حضرت ایوب ! گلا ہے تو سہی مجھے اس غزل کا علم
رنج طاقت سے سوا ہو، تو نہ پیٹوں کیوں کر سب سے پہلے
ذہن میں خوبی تسلیم و رضا ہے تو سہی مولانا ابوالکلام آزاد
مروجہ و منظور کے

ذریعے سے ہوا متبادلہ
 انھوں نے اس کی نقل
 نواب سید الدین احمد غل
 طالب کی ریاض سے مال
 کی تھی۔ مجھے اس کی نقل
 وہی کے ایک تلمیذ دیوان
 سے لی جو نواب شہاب
 الدین احمد کی حکایت تھا۔
 ۱۔ لغات :
 مستنی النظر : میں
 ڈکھ میں ڈال دیا گیا ہوں
 قرآن مجید میں حضرت ابراہیم
 کا قول ہے ۔ اس میں کہیں
 ذاتِ باری تعالیٰ سے لگہ
 موجود نہیں۔ یہ نہیں کہا کہ
 اسے اللہ اُتارنے لگے ڈکھ میں ڈال دیا ، کیونکہ وہ تو کسی کو بھی ڈکھ میں نہیں ڈالتا اس نے جو کچھ
 بخشا ہے ، سراسر شکر اور ماحبت ہی ہے۔ جو یہی حالت ہمارے لیے ڈکھ بن جاتی ہے
 وہ خود جاری صورت حال کا نتیجہ بنتی ہے۔

میرزا غالب یقیناً اس حقیقت سے ناواقف نہ ہوں گے تاہم ان کے من خود اپنی
 صورت حال بیان کرنا بھی گہر ہی ہے ، خواہ اسلوب کوئی ہو۔

شرح : اسے حضرت ابراہیمؑ کا کلمہ آپ نے اپنی کیفیت بیان کرنے
 کے لیے مستی النظر کا کلمہ قرار شاد فرمایا۔ یہ بھی تو ایک تلم کا گہر شکوہ ہی ہے۔ حقیقی سرور
 شکیب کا اتفاق تھا کہ اپنی حالت درد و غم کسی بھی شکل میں بیان نہ کی جاتی۔ ذاتِ باری تعالیٰ

سے کون سی چیزیں جوئی تھیں کہ آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت پیش آئی۔ مطلب یہ کہ وہ سے سخن خدا کی طرف نہ تھیں، مگر اپنی دردناک حالت بیان کرنا بھی قراک گونہ شکوہ ہی ہے۔

۲- **شرح :** یقیناً میں تسلیم و رضا کی خوبیوں کا قائل ہوں اور خوب سمجھتا ہوں کہ صحیح مسلک و طریقہ یہی ہے جو کچھ پیش آئے، اسے خدا کی طرف سے سمجھا جائے اور اس پر کوئی جبراع فزع یا قاطع نہ کیا جائے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ میرے حصے میں جو رنج و غم آئے، وہ میری طاقت برداشت سے بہت زیادہ ہیں۔ پھر سر کیوں نہ پیٹوں ؟

۳- **شرح :** غنیمت سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جزا کا دن مقرر کر رکھا ہے اور ہم اس امید پر زندگی بسر کریں گے کہ آخر ایک دن صاحب کتاب ہوگا اور ہم نے جو مصیبتیں برداشت کیں، ان کا بھی صلہ ملے گا۔ فرض کرو کہ اس زندگی کی طرح دوسرا دن بھی ہم کوئی صلہ نہ پائیں، مگر روز جزا کی امید پر زندگی تو بسر ہو جائے گی۔

۴- **شرح :** کوئی ایسا دوست ہی موجود نہیں، جو ہمارے دل و جگر کے زخموں کی مرہم بنی کرے۔ خیر، دوست نہیں تو نہ سہی، لیکن دعا دار و اور مرہم بنی کرے کہ آند تو موجود ہے۔

۵- **شرح :** دیکھیے، ہمارے محبوب نے غیر سے کتنا اچھا بھاہ کیا ! اس سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ اس میں وفا کی فصاحت موجود ہے، ہم سے وفا کا ہر تاؤ نہیں کیا تو دسویں کسی سے کیا تو ہے۔

۶- **شرح :** اے کاتبِ تقدیر ! تو نے ازل کے روز جو کچھ میرے لیے لکھ دیا، اسے برابر اپنے نامہ اعمال میں نقل کرتا چلا جا رہا ہوں۔

گویا یہاں جبریوں کا عقیدہ واضح کیا، یعنی یہ کہ انسان مختار نہیں، مجبور ہے۔ جو کچھ اس کے مقتدر میں روز ازل سے لکھ دیا گیا ہے، وہی کرتا رہتا ہے۔

بیان کا کمال یہ ہے کہ یہ نہیں کہا، جو کچھ لکھا گیا ہے، وہی کرنا ہوں بلکہ کہا :

روزِ نازل کا لکھا ہوا نقل کرتا چلا جا رہا ہوں۔

۷۔ شرح : اسے غالب ! شمشیرِ قضا کی تیز می تو بہت مشہور ہے۔ تم موت کے لیے اتنی جلدی کیوں کرتے ہو؟ یہ ہر حال آکر ہی رہے گی۔ جس تلوار کی تیزی شہرۂ آفاق ہے، وہ آخر حیرانِ حیات کاٹنے میں تاقی نہ کرے گی۔



تمہید :- لطفِ نظارۂ قاتل دمِ بسمل آئے
 غزل اُس زمانے میں کہن گئی تھی، جب میرزا غالب نوابِ کلب علی خاں والی رام پور کے جشِ منہ نشینی میں شرکت کے لیے گئے تھے
 ۱۔ راکو پور ۱۸۵۷ء کو دہلی سے چل کر ۱۲ کو رام پور پہنچے اور اٹا خورہ میرکا وہیں رہے۔ رخصت ہو کر پانچ روزہ دہرہ عیالات مراد آباد شہر سے ۸ اور ۸ جنوری ۱۸۵۷ء کو دہلی پہنچ گئے غزل کے شائع میں نواب سے اشارہ کلب علی خاں

جہاں جاتے تو بلا سے، پہ کہیں دل آئے
 اُن کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گزری
 دوست جو ساتھ میرے تالپِ ساحل آئے
 وہ نہیں ہم کہ چلے جائیں حرم کو اے شیخ
 ساتھ حجاج کے اکثر کئی منزل آئے
 آئیں جس بزم میں وہ، لوگ پکاراٹھتے ہیں
 تو، وہ برہم زن ہنگامہٗ محفل آئے
 دیدہ خونبار ہے مدت سے، ولے آج ندیم
 دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے مقابل آئے
 سامنا حور و پری نے نہ کیا ہے، نہ کریں
 عکس تیرا ہی مگر تیرے مقابل آئے

اب ہے دلی کی طرف کوچ ہمارا غالب ! کی طرف ہے جہان کا
 آج ہم حضرت نواب سے بھی بل آئے
 سے خصیعت ملاقات کے بعد کسی گئی تھی۔

۱۔ شرح : اگر کسی پر دل آہائے ، یعنی کسی سے محبت ہو جائے تو
 اسے دیکھنے کا لطف اُس وقت خوب آئے ، جب وہ اپنے ہاتھ سے عاشق کو ذرا
 کرنے لگے ۔ بلاشبہ اس طرح عاشق کی جان جائے گی ، لیکن بلا سے ، اس کی کیا پڑوا
 ہے ؟ وہ لطف جان سے بدرجہا زیادہ عزیز ہے ، لیکن شرط میں ہے کہ کسی سے
 عشق ہو جائے ۔

۲۔ شرح : جو دوست ، عزیز اور رفیق مجھے کشتی پر سوار کرانے کے
 لیے ساحل تک ساتھ آئے اور واپس چلے گئے ، انہیں کیا معلوم کر دیا میں روانگی
 کے بعد میری کشتی پر کیا کیا آفتیں اور مصیبتیں نازل ہوئیں ۔

مطلب یہ کہ حق و صداقت کی پاسداری اور ادا سے قرائن میں جن مصیبتوں
 سے سابقہ پڑتا ہے ، ان کا صحیح اندازہ وہ لوگ نہیں کر سکتے جو انگ بیٹھے ہوئے
 صرف اس راستے تک چھوڑ آتے ہیں اور اصل منزل میں ساتھ نہیں دیتے ۔ بلکہ
 ہاں گزشتہ دور میں ہزاروں واقعات پیش آئے کہ کسی شخص کو قید یا جلا وطنی کی
 سزا ملی اس کے دوست اور رفیق نعرے لگاتے ہوئے جیل خانے کے دروازے
 تک ساتھ گئے ، مگر انہیں اس شخص کی تکلیفوں کا صحیح اندازہ کیا ہو سکتا تھا ، جس نے
 خود کو کئی سال تنہائی کی قید میں گر لے ۔

۳۔ لغات : عجاج : حاج کی جمع ، حاجی لوگ ۔

شرح : اے شیخ ! ہم حاجیوں کے قافلے کے ساتھ غوثا کوئی
 کوئی منزل چلے جاتے ہیں ، لیکن حرم تک نہیں پہنچے اور جہیں اس مقدس مقام تک
 سفر میں ہو منزل راستہ ۱۰ سے وہاں پہنچی کر ختم نہیں کر پاتا ہوتے ، لہذا چنبچو ۔

کے چہرے ہی پلٹ آتے ہیں۔

بتانا یہ چاہتے ہیں کہ کسی بیش بہا اور محبوب شے کے لیے سعی و کوشش میں جو لطف ہے، وہ اس شے تک پہنچ کر باقی نہیں رہتا، کیونکہ ایک حد تک شوق کی تکلیف جو جاتی ہے، میرزا اس تکلیف کے روادار نہیں ہو سکتے، راستے ہی میں گھومتے رہیں گے۔ اسی میں انہیں وہ مزہ مل رہا ہے، جو دلوں پہنچ کر نہیں مل سکتا۔

۴۔ **شرح :** میرا محبوب جس بزم میں آتا ہے، لوگ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ نو بھئی ! وہ آگیا، جو محفل کا ہنگامہ درجہ بدرجہ کر ڈالتا ہے۔ یعنی محبوب کی آمد پر بزم کا کوئی آدمی اپنی طبعی حالت میں نہیں رہتا۔ اس پر اضطراب و بیتابی کی کوئی نہ کوئی کیفیت ظاہر ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ جہی ہوئی محفل تذبذبا ہو جائے۔

۵۔ **شرح :** اے دوست ! ہماری آنکھیں تو لذت سے خون کے دیا بہا رہی ہیں، لیکن آج معاملہ زیادہ نازک صورت اختیار کر گیا، کیونکہ دل کے بھی کوئی محو سے خون کے ساتھ بہ کر باہر نکل آئے۔

۶۔ **شرح :** اے محبوب ! نہ لڑ تیرے سامنے آنے کی تاب لا سکتی ہے، نہ پرہیز، حالانکہ غم میں انہیں عالمگیر شہرت حاصل ہے۔ شاید تیرا عکس ہی تیرے مقابل آ سکتا ہے۔

کوئی شخص آئینہ دیکھے گا تو عکس دیکھتا، اس کے سامنے آئے گا۔ اس سے کسی بھی صورت مفر نہیں۔ میرزا کہتے ہیں کہ محبوب کا عکس ہی اس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس پرہیز کا ثبات میں اور کوئی نہیں، جو سامنے آنے کا حوصلہ کر سکے۔

۷۔ **شرح :** اے غائب ! اب ہم دہلی کی طرف روانہ ہونے والے ہیں اور حضرت نواب یعنی کلب علی خاں سے جن کا شخص بھی نواب تھا دعاوی ملاقات بھی کر آئے۔



بھولے سے کاش وہ ادھر آئیں تو شام ہو غزل نگار صاحب
 کیا لطف ہو جو ابلق بھی رام ہو ایم اسے نے رسالہ
 "بہا یوں" لاہور راجت
 تا گردش فلک سے یونہی صبح و شام ہو، پہلے قسط سے حاصل
 ساقی کی چشم مست ہو اور دورِ جام ہو کی۔ مجھے غائب سے
 بے تاب ہوں بلا سے، کن آنکھیوں سے دیکھیں حقیقت معلوم نہیں۔
 اے خوش نصیب! کاش قصا کا پیام ہو صرف اس سے مجھے
 کیا شرم ہے؟ حریم ہے، محرم ہے راز دار کہ اہل ذوق کا ایک حلقہ
 میں سر بہ کف ہوں، تیغ ادا بے نیام ہو اسے غائب کی غزل
 میں چھیڑنے کو کاش اسے گھوڑ لوں کہیں ا۔ لغات :
 پھر شوخ دیدہ بر سرِ صد انتقام ہو ابلق : گھوڑا،
 وہ دن کہاں کہ حرفِ تمنا، مولب شناس سیاہ و سفید ہو۔
 ناکام بدنصیب کبھی شاد کام ہو دوران : زمانہ،
 اسے ابلق سے تشبیہ
 گھس پل کے چشم شوق قدم بوس ہی سہی اس لیے دی کہ دن
 وہ بزمِ غیر ہی میں ہوں، پر ازدحام ہو اور مات سیاہ و سفید
 جوتے ہیں اور ابلق

سے بالکل مشابہ۔ اتنی پیوں کہ حشر میں سرشار ہی اٹھوں

شرح : مجھے پر جو چشمِ ساقی بیتِ المحرام ہو
کاش میرا محبوب
بھول کر میری طرف پیرانہ سالِ غالب میکش کرے گا کیا
آجائے تو شام کا وقت
ہو ناکراتِ غریب بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو
خانے میں سماں رچا اگر زمانے کا اپنی یوں میری مرضی کے مطابق چلے تو خوب
لطف آئے۔

۲۔ شرح : جب تک آسمان کی گردش سے صبح و شام ہوتی رہے ،
آرزو یہ ہے کہ میرے سامنے ساقی کی مست آنکھیں ہوں اور شراب کا دُور
پہتا رہے۔

شعر میں گردشِ فلک کو دُورِ جام سے اور صبح و شام کو ساقی کی چشمِ مست
سے تشبیہ دی ہے۔

۳۔ لغات : کن آنکھیوں سے دیکھنا : کوڑا چشم سے دیکھنا۔
ترجمی نگاہ سے دیکھنا۔ اس کا اعلیٰ لکھیوں" بھی ہے، جو تامل کے عین مطابق ہے۔
شرح : میں نہایت پریشانی ہوں۔ کاش میرا محبوب ترجمانی نگاہ سے
دیکھ لے۔ اگر یہ دیکھتا سوت کہ پیغام ہی جائے تو جا ہے، میں اپنے آپ کو خوش نصیب
بھی سمجھوں گا۔

۴۔ شرح : ہم گھر کے اندر ہیں اور جو شخص موجود ہے وہ بازوؤں کی
خوب حفاظت کرتا ہے۔ میں مرنے کے لیے تیار ہوں۔ پھر اسے محبوب !
آپ شرم کس بات کی کر رہے ہیں۔ تیغِ ادا میاں سے نکالنے اور میرا غائر کر دیکھ
۵۔ شرح : اگر مرضِ پھیرنے کی غرض سے اسے ذرا گھوڑوں یعنی
فلکی باندھ کر بہت کی فکر سے دیکھوں تو وہ شوخ چشمِ سیکڑوں بدلے لینے کے

یہ تیار ہو جائے۔

۷۔ شرح : وہ وقت ہی کہاں ہے کہ آرزو میرے لبوں تک پہنچے اور بڑ نصیب عمر بھر ناکام رہا، اس کے لیے کبھی خوشی کا موقع بھی آجائے ؟
۷۔ لغات : گھس مل کر : دھکا پیل سے جگر پیدا کر کے۔
ازدحام : ہجوم، بھیڑ۔

شرح : بیشک میرا محبوب غیر ہی کی مثل میں ہو، لیکن وہاں بھیڑ ہونی چاہیے تاکہ میری بھی چشم شوق گھس مل کر قدم بوسی کا موقع مل جائے۔
اگر بھیڑ نہ ہوگی تو قدم بوسی کی کوشش محبوب پر آشکار ہو جائے گی اور مراد بر نہ آئے گی۔ اس کی صورت یہی ہے کہ بھیڑ ہو۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ میری نگاہ شوق قدم بوس ہو رہی ہے، یہی سمجھا جائے کہ بھیڑ کے باعث میں نگاہ شوق اس کے قدموں پر ڈالنے کے لیے مجبور ہو گیا ہوں۔

۸۔ لغات : ساقی بیت الحلم : حرم کعبہ کا ساقی یعنی رسول اللہ صلیم۔

شرح : اگر کعبہ مقدس کے ساقی، یعنی رسول اللہ صلیم کی چشم عنایت مجھ پر ہو تو اتنی پیوں کہ مشربک قبر میں مست پڑا رہوں اور انکھوں تو مست ہی انکھوں۔ اس شراب سے مقصود شراب حُب رسول صلیم اور شراب حُب باری تعالیٰ ہے۔

۹۔ شرح : اگر بھوپال میں بوڑھا غائب دو روز آؤد مٹھرا رہے تو اس جڑھا پے میں وہ شراب کا عادی کرے گا کیا ؟

مقطع سے بالکل واضح ہے کہ یہ غزل بڑھا پے میں لکھی گئی، لیکن کلام صاف تار باسہ کہ جو کچھ کہا گیا ہے، یہ مشق کی پختگی کے دور کا ہے۔ اسی لیے غائب سے اس کا اتنا سب مل نظر سمجھتا ہوں، اگرچہ اس کے بعض اشعار میں غائب ہی کا رنگ ہے۔

یہ غزلیں مولوی، بتائیں ہم تمہارے عارض و کاکل کو کیا سمجھے
عبدالباری آسی کی اسے ہم سانپ سمجھے اور اسے من سانپ کا سمجھے
کتاب سے منقول ہیں یہ کیا تشبیہ یہود ہے، کیوں موزی سے نسبت دیں
لیکن اہل نظر مجھو، اسی میں شافی شدہ ہما عارض کو اور کاکل کو ہم ظلی ہما سمجھے
پورے غیر مطبوعہ غلط ہی ہو گئی تشبیہ، یہ تو ایک طائر ہے
کلام کا انتخاب صحیح
نہیں سمجھتے۔ اسے برگِ سمن اور اُس کو سنبل کو جٹا سمجھے

۱- شرح : نباتاتِ زمیں سے ان کو کیا نسبت؟ معاذ اللہ
اسے محبوب! ہم
بتائیں کہ تمہارے اسے برق اور اُسے ہم کالی سادون کی گھٹا سمجھے
رخسار اور زلف کو کیا گھٹا اور برق سے کیوں کر گھٹا کر ان کو نسبت دیں
سمجھتے ہیں۔ نوسنہ،
ہم زلف کو سانپ اسے ظلمات، اُسے ہم چشمہ آب بقا سمجھے
اور رخساروں کو سناپ جو کہیے یہ، فقط مقصود تھا خضر و سکندر سے
کا من سمجھتے ہیں۔

۲- شرح : یدِ بیضا اسے اور اس کو موٹی کا عصا سمجھے
یہ بالکل یہودہ
تشیہ ہے : بھلا
کیونکہ صبح ہے اسے وقتِ نمازِ صبح اور اُس کو عشا سمجھے
کہ ہم زلف کو سانپ

جو یہ نسبت پسند خاطر والا نہ ہو تو پھر جیسے موذی سے اسے قندیل کعبہ اس کو کعبے کی زد سمجھے نسبت دینا! یہ ہے کہ ہم رخسار استادان ساری تشبیہوں کو دھو کر کے یہ کہتا ہے کہ ہمارا زلف سویرا اس کو سمجھے اُس کو ہم نورِ خدا سمجھے میں۔ مشہور ہے کہ ہمارا سایہ جیسے زلفِ محبوب پر پڑ جائے، وہ نہایت خوش نصیب ہوتا ہے اور عاشقِ زلفِ محبوب کے سایے سے بڑھ کر خوش نصیب کیا ہو سکتی ہے؟

۳۔ شرح : یہ تشبیہ بھی غلط ہی ہو گئی، کیونکہ ہمارا ایک پرندہ ہے اور پرندے سے محبوب کی کسی چیز کو تشبیہ دینا کچھ مناسب نہیں۔ صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ رخسار کو تنہا کے پھول کی شکوٹھی اور زلف کو سنبل کے تاروں کا مجموعہ سمجھیں۔

۴۔ شرح : تو بہ تو بہ! یہ محبوب کے عارض و زلف کو زمین سے اُگنے والی نباتات کے ساتھ کیا تشبیہ دے دے؟ مناسب یہ ہے کہ رخسار کو بھلی اور زلف کو سادوں کی کالی گٹھا سمجھیں۔

۵۔ شرح : لیکن گٹھا اور بھلی سے زلف و رخسار کو نسبت دینا ہرگز مناسب نہیں، اس طرح ان کا رتبہ کم ہو جاتا ہے۔ کیوں نہ زلف کو ظلمات اور رخسار کو آبِ حیات کا چشمہ قرار دیں؟ معلوم ہے کہ آبِ حیات ظلمات ہی میں ہے۔

۶۔ شرح : اگر یہ تشبیہ قبول کر لی جائے تو ماننا پڑے گا کہ ظلمات میں سے گزرتے ہوئے آبِ حیات پر پہنچنا خطر اور سکندر کا مقصود تھا تو اس طرح بھی زلف و رخسار کی قدر و منزلت کم ہو جاتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ رخسار کو عیدِ بیاض اور زلف کو حضرت موسیٰ کا عصا قرار دیں۔

۷۔ شرح : اگر یہ تشبیہ بھی زلف و رخسار کے لیے مناسب معلوم نہ ہو تو چلیے ، رخسار کو صبح کی تمازا اور زلف کو عشا کی نماز سمجھ لیتے ہیں۔

۸۔ شرح : اگر یہ تشبیہ بھی آپ کے دل کو پسند نہ آئے تو رخسار کو کبجے کی قندیل اور زلف کو کبجے کا غلاف مان لیتے ہیں۔

۹۔ شرح : لیکن اسدا ان تمام تشبیہوں کو رد کر کے کہتا ہے کہ زلف سویدہ ہے اور رخسار اشد تھلے کا نور ہے۔



یہ غزل بھی جموعہ
آسی ہی سے لی
گئی ہے اور عرش
صاحب نے بھی
اسے اپنے جموعے
میں شامل کر لیا
ہے۔

نسیم صبح جب کنگاں میں بُوے پیر بہن لائی
پٹھے یعقوب ساتھ اپنے نویدِ جان و تن لائی
وقار ماتم شب زندہ دارِ حبر رکھنا تھا
سپیدی صبح غم کی دوش پر رکھ کر کفن لائی
شہیدِ شیوہ منصور ہے اندازِ رُسوائی

۱۔ شرح :
صبح کی نسیم نے
حضرت یوسفؑ کو
پیر بہن کی غزل
کنگن میں پہنچائی
تو یہ خوشبو حضرت یعقوبؑ کے جم و جان و دنوں کے لیے خوش خبری بنا کر آئی۔

۲۔ لغات : شب زندہ دارِ حبر : فراق کی راتوں
میں جا گئے والا۔

شرح : جس شخص نے فراق کی مانیں جاگ کر کانیں اور دیکھا اس کے ماتم کی عزت وہ قسمت قائم رکھتا ضروری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صبحِ علم کی سیرگ اپنے نذ سے پر امن رکھ کر لائی تاکہ اسے احترام سے دفن کر دیا جائے۔

۳۔ شرح : ہمارے رسوا ہونے کا انداز ایسا ہے گویا ہم منصور کے طور طریقوں پر مشتمل ہوئے ہیں۔ یعنی ہم رسوائی میں منصور کے طریقے پر عمل کرتے چاہتے ہیں۔ ہمارا مقصد یقیناً مصیبت کو پسند کرتا ہے بلکہ اس نے مصیبت کو پیشہ بنایا ہے وہ ہمارے لیے ٹولی اور رستائے آیا ہے۔ گویا ہم بھی منصور کی طرح ٹولی پر مرنے کے آمزدہ مند ہیں۔

۴۔ لغات : نرہست گاہ : سیرگاہ، پُر نضا مقام۔

غریب : بے وطنی، اہمیت۔

شرح : اے غالب ! وفا داری ہی ہستی کے پاس کا درس لے لینی ہے۔ وہی ہمیں پردیس کی سیرگاہ سے گینچ کر وطن کی مسجد سے آئی۔



۱۔ شرح : وفا جفا کی طلب گار ہوتی آتی ہے

باوفا عاشق برابر جفا کے ہب گار رہے ہیں۔ اے دوست! رو بہ نازل سے یہی طریقہ جاری ہے۔

۲۔ شرح : ازل کے دن سے یہ اے یار ہوتی آتی ہے

جواب جنتِ بزمِ نشاطِ جاناں ہے

بری نگاہ جو خوشبار ہوتی آتی ہے

نصیبہ جوشِ جنوں و حشیو! مبارک باد

نہار مدیہ انتظار ہوتی آتی ہے

میری نگاہ جو خون

برساقی آرہی ہے۔ دل و دماغ و فاعل پیشگاہ کی خیر نہیں
یہ واصل میرے۔

محبوب کی بزم نشاط جگر سے آہ شرر بار ہوتی آتی ہے

کے فردوس کا جواب ہے، یعنی محبوب کی بزم نشاط کو جنت سے تشبیہ
اور اس کا جواب چشم ثور ہارنے مہیا کیا۔ محبوب ہمیشہ و نشاط میں مشغول ہے
اور غریب عاشق آنکھوں سے خون برسا رہا ہے۔

۳۔ لغات : بدیہہ انظار : نگاہوں کے لیے تھم۔

مشرع : اے وحشیو ! جو جنوں میں مبتلا ہو، تمہیں مبارک
ہو، اب جو جنوں خوب تر تھی کرے گا، کیونکہ بہار آگئی ہے اور نگاہوں
کے لیے ایک تھم بن کر آئی ہے۔

۴۔ شرح : اب با وفا عاشقوں کے دل و دماغ کی خیر نہیں، کیونکہ
آہ جگر سے چنگاریاں چھوڑتی ہوئی نکلی ہے۔
یہ منزل بھی آتی اور عرس تہی دونوں کے جموعوں میں شامل ہے۔



۱۔ شرح : یونہی افزائش وحشت کے جو ساماں ہوں گے
اگر وحشت میں دل کے سب زخم بھی ہم شکل گریباں ہوں گے
ترقی کے ایسے ہی
سامان جمع ہوتے وہ جبر مایوسی عاشق ہے تغافل اُن کا
ہے تو دل میں نہ کبھی قتل کریں گے، نہ پشیمان ہوں گے
جتنے زخم ہیں وہ
سب گریبان دل سلامت ہے تو صدموں کی کمی کیا ہم کو
کی صورت لے شک اُن سے تو بہت جان کے خواہاں ہونگے

منتشر ہو کے بھی دل جمع رکھیں گے ، یعنی اختیار کر لیں گے۔

۲۔ شرح : ہم بھی اب پیرو گیسو سے پریشاں ہوں گے

محبوب کا تعلق یعنی انجان بننے جتنا عاشق

لیکن اب بھی ہر گوشہ دل میں کئی ارماں ہوں گے

کے لیے نا امید کی باعث ہے ابھی نوحوں سے فقط گرمی ہنگامہ اشک وہ انجان بنا ہوا ہے

تو یہ آئندہ کیونکر کہی ہو یہ حالت ہے ، تو نالے شررا فشاں ہوں گے

جاسکتی ہے کہ کبھی باندھ کر حمد و ثنا تنقیر ؟ ہے ہے !! عاشق کو قتل بھی کرے

تجھ سے بے مہر کم اسے عمر گریزاں ! ہوں گے گا تو اس کے بے

اس قدر بھی دل سوزاں کونہ جان افسردہ

پشیمانی کا موقع کیونکر آئے گا۔

ابھی کچھ داغ تو اسے شمع ! فروزاں ہوں گے

عہد میں تیرے کہاں گرمی ہنگامہ عیش

کالا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نہ

موت پھر زلیلت نہ ہو جائے ، یہ ڈر ہے غالب ! کے لیے یابوسی کا باعث ہے۔

وہ مری نعش پہ انگشت بردنداں ہوں گے

اس میں میرزا نے قنائل کی شکایت کر رہے ہیں اور معلوم ہے کہ ان کے نزدیک جان کر قنائل کرنے کا بھی ایک مقام ہے۔ مثلاً :-

ہاں کر کیجے قنائل کہ کچھ امید بھی ہو یہ نگاہ غلط انداز تو ہے ہم کو

۳- **شرح :** اگر دانا سلامت ہے تو اس دنیا میں صدیوں کی کمی نہیں ہو سکتی، کیونکہ ہمارے محبوب جیسے تو بہت سے لوگ ہیں، جو جان کے خواہاں ہوں گے۔

مطلب یہ کہ جب تک دل انسان کے پہلو میں ہے، وہ احساس سے محروم نہیں ہو سکتا، اور احساس ہی خوشگوار واقعات پر فرخی اور ناخوشگوار واقعات پر صدمے کا باعث بنتا ہے۔ میرزا یہی کہنا چاہتے ہیں کہ جب تک دل پہلو میں ہے، ہمارے جان کے خواہاں سیکڑوں پیدا ہو جائیں گے۔

۴- **شرح :** ہم پریشان ہو کر بھی اپنا دل سنبھالے رہیں گے اور جمعیت خاطر کو اپنے سے بدویں گے۔ گویا ہم محبوب کی زلف پریشاں کے پیرو بن جائیں گے، جو پریشانی کے باوجود یکساں رہتی ہے۔

۵- **شرح :** ہمیں فیصے کی گردش نے ناامید کر رکھا ہے۔ یہ ایں جہد دل کے کوششے گوشے میں اب بھی بہت سے ارمان موجود ہوں گے۔

۶- **شرح :** ابھی تک تو جسم میں خون ہے اور اس کی وجہ سے آنسوؤں کا ہنگامہ گرم نظر آتا ہے، لیکن یہی حالت جلدی رہی تو جسم کا خون آنسوؤں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ پھر نہانے والے سے اٹھیں گے تو ہر شے شعلے برساتیں گے، یعنی آگے چل کر ان کی وجہ سے گرمی ہنگامہ قائم رہے گی۔

۷- **لغات :** متغیر، نفرت۔

عمر گریزاں : بھاگ جانے والی عمر یعنی چند روزہ عمر۔

شرح : اسے عمر، جواب گریزاں ہے، اٹھنے والے ہم سے عید وفا یا نہ عید تھا اور اس دنیا میں لائی تھی، اب ہم سے اتنی نفرت ہو گئی کہ ساتھ

چھوڑے جا رہی ہے۔ اشد اشد! تجھ ایسے بے مروت بھی کم ہی ہوں گے۔

۸- شرح : اے شمع : ہمارے جتنے ہوئے دل کو تو نے کیوں اس قدر افسردہ سمجھ دیا ہے، ابھی تو اُس میں بہت سے دغ و خشن ہوں گے۔

۹- شرح : اے محبوب ! تیرے عہد میں میرے لیے ہنگامہ پیش گرم کرنا ممکن ہی نہیں۔ میری قسمت اس درجہ پست ہو چکی ہے کہ پھول بھی اس کی ہنسی اُٹھائیں گے۔

۱۰- شرح : اے محبوب ! جو لوگ تجھ پر فریفتہ ہو کر بد نصیبی کا تختہ شق بن چکے ہیں، ان کے لیے تو سہل سے سہل کام بھی حد درجہ دشوار ہیں۔

۱۱- شرح : اے غالب ! اب مجھے فرت یہ ہے کہ جو بد میری نفس پر آئے گا تو سچ و غم سے انگلی دانتوں میں دبائے گا۔ میں اُس کی یہ کیفیت برداشت نہ کر سکوں گا۔ اُس دقت چاہوں گا کہ میری موت پھر زندگی سے بدن جائے۔ یہی ڈر مجھے پریشان کیسے کر رہا ہے۔



نمائش پر وہ وارِ طرزِ بیدارِ تغافل ہے ، ۱- شرح :

تسلی جانِ ببل کے لیے خندِ دینِ گل ہے ببل کی جانِ مروت

نمودِ عالمِ اسباب کیا ہے ؛ لفظِ بے معنی یہ دیکھ کر مطمئن ہے

کہ ہستی کی طرح مجھ کو عدم میں بھی تامل ہے یعنی کھلے ہوا ہے

نہ رکھ پابندِ استغنا کو قیدی رسمِ عالم کا حال کہ یہ ہنسی محض

ترا دستِ دعا بھی رخصتِ اندازِ تو کل ہے مقصد یہ ہے کہ بھول

نے تفائل کو سنگِ داند

طریقہ اختیار کر رکھا نہ چھوڑا قید میں بھی وحشیوں کو یا درگاشن نے
 ہے اس پر پرہیز یہ چاک پیر بن گویا جواب خندہ گل ہے
 پڑا رہے۔

۲۔ شرح : ابھی دیوانگی کا باز کہہ سکتے ہیں ناصح سے
 عالم اسباب یعنی دنیا ابھی کچھ وقت ہے، غالب ! ابھی فصل گل و گل ہے
 کی جو نمود و نمائش ہے، اس کی حقیقت کیونوں۔ وجود تو رہا ایک طرف بلکہ
 تو عدم میں ہی کلام ہے، میں تو عدم کو بھی تسلیم نہیں کرتا۔

جب وجود و عدم دونوں کو ختم کر یا تو قصہ پاک ہو گیا۔ کتنا یہ پاس تھے ہیں کہ
 عالم اسباب کی محض نمود ہی باطل نہیں، بلکہ اس کا عدم بھی باطل ہے۔ نہ وجود کا
 اطلاق جائز ہے، نہ عدم کا۔

۳۔ لغات : استغناء : بے نیازی، بے پردائی۔

شرح : دعا مانگنا دنیا کی عام رسم ہے، لیکن جو شخص بے نیازی
 اور بے پردائی پر استوار ہو، اسے کیوں رسم دعا کا قیدی رکھا جائے؟ اس کے لیے
 کیوں اس رسم کی پابندی ضروری ہو؟ بے نیازی اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسے سے
 پیدا ہوتی ہے اور جسے اللہ پر پورا بھروسہ ہو، اس کے لیے عام انداز سے دعا کرنا
 بھی تو کھل میں غلط کا باعث ہے۔

مطلب یہ کہ ہم تو صرف اللہ کی رضا پر قائم ہیں، دنیا کی کسی چیز سے ہمیں
 کوئی وابستگی نہیں اور سب سے بے پردا ہیں۔ خوشی ہو یا سگی، جو کچھ خدا کی طرف
 سے آئے، وہ ہمارے لیے عین نعمت ہے۔ اسی کو ہم تو کھل سمجھتے ہیں۔ ظاہر
 ہے کہ جب عام لوگوں کے انداز میں دعا کریں گے تو ہماری رضا میں غلط پیدا ہو
 گا اور یہ عمل تو کھل کے خلاف ہلکے گا۔

فارسی کے ایک شعر میں کہتے ہیں !

منور مکافات بہ جلد و مقرر آویخت

مشتاق عطا شعلہ رنگ باز نداشت

جوں لوگوں کو اپنے اعمال کی جزا پر فخر ہے، وہ بہشت اور دوزخ کے جہانوں میں پٹے کھٹے ہیں۔ بہشت میں جانا چاہتے ہیں اور دوزخ سے بچتے ہیں، لیکن جس شخص کو وجود باری تعالیٰ کی عطا کا عشق ہے، اس کے لیے خطے اور پھوس، بہشت اور دوزخ میں تمیز کی کوئی وجہ نہیں۔

۴۔ شرح : اگرچہ دیوانے قید کر دیئے گئے، لیکن وہاں بھی بارش کی یاد اُن کے دافن سے عورت ہو سکی۔ وہاں بھی انھوں نے اپنے پیروں چاک کر ڈالے۔ یوں پھوس کے کھٹنے کا جواب متیا کر دیا۔

کنا یہ چاہتے ہیں کہ دیوانوں کا گریباں پہنا لیا اور دامن چاک کرنا پھولوں کی یاد کا ثبوت ہے، وہ بھی تو اپنے دامن چاک کرتے ہیں۔

۵۔ شرح : اسے غائب ! ابھی بہار کا موسم ہے، جس میں پھول کھلتے ہیں اور شراب پی جاتی ہے۔ اس موسم کے رخصت ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی ہے۔ نصیحت کرنے والا چاہے تو ہم بتا سکتے ہیں کہ بہار سے دیوانہ ہونے کا اصل بھید کیا ہے۔

مطلب یہ کہ دیوانگی کا راز فیصل بہار ہی میں کہا جاسکتا ہے۔ یہ فصل گزر جائے گی تو اس راز کے چہرے سے پردہ کو ہٹا دیا جائے گا۔
یہ غزل بھی آہستی اور عرش و دوزخ کے مجموعے میں شامل ہے۔

۵

خود جان دے کے روح کو آزاد کیجیے
تاکے خیالِ خاطر جب آزاد کیجیے

۱۔ شرح :

چاہے کون

لوگوں انھوں،

محببتوں سے نجات
دلائیے، بلکہ کچھوں
کا خیال کب تک کرتے
رہیں گے۔

۲- شرح :
جو غم دل سے نکلے ہو
چکے ہیں یا اب باقی نہیں
رہے، انہیں یاد کر لینا
چاہیے۔ پھر محبوب کے
سامنے جا کر ظلم کی شکایت
کرنا مناسب ہو گا۔
جب تک تمام رنج
اور غم صبر و استقامت سے
میں تازہ نہ ہوں، محبوب
سے شکایت کریں بھی
تو کیا کریں گے

۳- شرح :
صورت حال یہ ہے کہ

بھولے ہوئے جو غم ہیں، انہیں یاد کیجیے
تب جا کے اُن سے شکوہ بیداد کیجیے
حالانکہ اب زباں میں نہیں طاقتِ فغان

پہرہ دل پر چاہتا ہے کہ فریاد کیجیے
بس ہے دلوں کے واسطے اک سنجشِ نگاہ
اُبڑے ہوئے گھروں کو پھر آباد کیجیے
کچھ درد مند منتظرِ انقلاب ہیں
جو شاد ہو چکے، انہیں نا شاد کیجیے
شاید کہ یاس باعثِ افشائے راز ہو
لطف و کرم بھی شاہِ بیداد کیجیے
بیگانہ رسومِ جہاں ہے مذاقِ عشق
طرزِ جدیدِ ظلم کچھ ایجاد کیجیے

زبان میں آہ و نالہ کرنے کی طاقت ہی نہیں رہی، نگاہِ دل کی کیفیت ایسی ہے۔ وہ
یہی چاہتا ہے کہ فریاد پر فریاد کرتے جائے۔

۴- شرح :
دونوں کے بیچ صرف محبوب کی نگاہ اتر جانا کافی
ہے۔ اُبڑے ہوئے گھر ایک نگاہ ہی سے از سر نو آباد ہو جائیں گے۔

۵- شرح :
کہہ دیکھی اور ظلم کے بارے میں نئے حالات کی تدوین

کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ اسے محبوب : جو آپ کی عنایت سے خوش اور مسرور ہو چکے ہیں، اے عین بھی قرار بخ و غم کا مزہ چکھا بیٹے۔ دکھی لوگوں کے لیے شادمانی کی مسرت کو نہیں پیدا ہو سکتی ہے کہ انقلاب آئے اور خوشی کی بہار دیکھ چکے ہیں، وہ قرار بخ کا ذور بھی دیکھ لیں۔

۶۔ شرح : اگر عاشقوں پر ظلم و جور ہی ہوتا رہے گا تو یوں ہوجائیں گے اور ان کے عشق کا مہر کھل جائے گا۔ مناسب یہ ہے کہ ظلم و جور کے ساتھ ساتھ مہربانی اور عنایت کا سلسلہ بھی جاری رہے، اگر عاشقوں کو مایوسی سے سنبھلے نہ پڑے۔

۷۔ شرح : عشق کا فوق دنیا کی رسموں سے بالکل نا آشنا ہے۔ آپ، ظلم کا کوئی نیا طریقہ ایجاد کریں اپنا طریقہ تو کارگر معلوم نہیں ہوتا



ہم سے خوبان جہاں پہلو نہیں کرتے رہے ا۔ شرح :
 ہم ہمیشہ مشق از خود رفتگی کرتے رہے دنیا کے حسین ہمیشہ
 کثرت آرائی خیالی ماسوا کی و حسم تھی اس کو عشق میں رہے کہ ہم سے میل جول پیدا
 مرگ پر غافل گمان زندگی کرتے رہے ذکر میں اور بالکل الگ
 داغوائے دل چراغ خاشہ تاریک تھے کھوپے کھوپے سے قطع رہیں ہم برابر
 تماک قبر پیدا روشنی کرتے رہے رہنے کی مشق کرنے رہے۔
 شور نیزنگ بہار گلشن ہستی، نہ کوچھ مطلب یہ معلوم
 ہم خوشی اکثر رہیں ناخوشی کرتے رہے ہوتا ہے کہ جاسوس

یہ تو عشق کا مقصد و رخصت اسے تمکینِ آزارِ فراقِ ہجران
 مدد ہی یہ تھا کہ اپنے ہو سکا جب تک غم و اماندگی کرتے رہے
 آپ کو فراموش کر دیتے اسی فراموشی میں مست و دھند رہے۔ جیہٹوں نے بھریا کر ہم دیوانے ہیں، لہذا
 ہم سے دُور بھاگتے رہے۔

۲۔ لغات : کثرتِ آرائی : "کثرت"، "جمعیت" کی ضد ہے،
 جسے صوفیہ توحید کے منافی سمجھتے ہیں۔ کثرتِ آرائی سے مراد ہے ایک وجود حقیقی
 کے سوا بہت سے وجود تسلیم کر لینا۔

ماسوا : برودہ شے، جو وجودِ باری تعالیٰ کے براد ہو۔

شرح : ماسوا کے خیال میں مبتلا ہو کر وجودوں کی جو کثرت پیدا ہوئی
 وہ دراصل ایک وحیم حق اس کی مثال یوں بھیجے کہ حقیقتِ ناشناس نوا، موت پر
 زندگی کا گمان کرتے رہے۔

مطلب یہ کہ ماسوا کے چکروں میں پڑ کر خدا کے سوا بہت سے وجود تسلیم کر
 لینا ایسا ہے، ایسے مردوں کو زندہ سمجھ لیا جائے یا موت کو زندگی قرار دے
 لیا جائے۔

۳۔ لغات : مفاک : گڑھا۔

شرح : دل میں عشق کے جو داغ تھے، وہ اس میں میرے
 اندھیرے گھر کے چراغ تھے اور قبر کے گڑھے تک ان سے میرا سینہ روشنی ملا۔

۴۔ لغات : مدحین : گہرو۔

شرح : باغِ حق کی بہار میں رات دن جو نصیرات ہوتے بھٹتے
 ہیں اور یہ بہار ہیں جو نصیرنگیاں و کھاتی رہتی ہے، ان کے بارے میں کچھ نہ سمجھو۔
 حالت یہ ہے کہ ہم جن چیزوں کو غمناک و غشی اور مسرت کا سامان سمجھتے رہے، انہیں
 بھی اکثر رنج و غم کے پاس گہرو رکھنا پڑا۔ یعنی یہاں کی خوشیاں مسرتاں گم و غم ہی کا

موجب بنتی رہیں۔

۵۔ لغات : دامنہ کی : پیچھے رہ جانا، بکھڑ جانا۔

شرح : اسے سفر کے ساتھیوں کی جدائی کے دکھ ! تو کب تک دل پر پتھر بن کر بیٹھا رہے گا ؟ اب رخصت ہو جا۔ ہم تک ہم میں پیچھے رہ جانے کا غم کرنے کی سکت تھی، کرتے رہے، اب اس سے نجات چاہتے ہیں



۱۔ شرح :

علاج دل کے دکھ درد کا کیا جاسکتا ہے۔

جب تو دل ہی درد

ہن جانے تو کوئی کیا

کرے ؟ دیکھو،

چند ناظرین، مطلب

کس ساوکی سے بیان

کر دیا گیا ہے اور کتنی

بڑی حقیقت پرستی

ہے ! بیماری کا علاج

کیا جاتا ہے، جب

وجود ہی بیماری بن

جانے تو کوئی کیا

کرے گا ؟

۲۔ شرح :

یہ دیکھ کر ہم فریاد

درد ہو دل میں تو دوا کیجئے

دل ہی جب درد ہو تو کیا کیجئے

ہم کو فریاد کرنی آتی ہے

آپ سنتے نہیں تو کیا کیجئے

ان بتوں کو خدا سے کیا مطلب

توبہ توبہ، خدا خدا، کیجئے

رنج اٹھانے سے بھی خوشی ہوگی

پہلے دل درد آشنا کیجئے

عرض شوخی، نشاطِ عالم ہے

حسن کو اور خود نما کیجئے

نہیں کر سکتے یا
 اس کا طریقہ ہمیں
 معلوم نہیں یہی صفت
 یہ ہے کہ آپ سنتے
 نہیں۔ پھر ہمارے
 فریاد کرنے سے کیا
 حاصل؟ آپ ہی بتائیے کہ ہم کیا کریں؟

۳۔ شرح : بھلا یہ سنگ دل حسین بھی خدا کو راستے میں اتو بہ تو بہ! خدا خدا کیجیے! ان کے انداز و اطوار ہی سے ظاہر ہے کہ نہ یہ خدا کے قائل ہیں اور نہ ان سے خدا ترسی کی امید رکھنی چاہیے

۴۔ شرح : اگر دل کو درد کا زور بنا دیا جائے تو جو سچ پہنچے گا، وہ خود بخود خوشی کا باعث بن جائے گا۔ یہ وہی مضمون ہے، جو دوسری جگہ یوں کہا گیا ہے!

روح سے زور ہوا انسان تو موت جاتا ہے سچ
 مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یہ کوئی خیالی بات نہیں، حقیقت ہے۔ انسان کے تمام احساسات اس کی عادت پر موقوف ہیں۔ اگر وہ خوشی کا عادی ہے تو روح پہنچنے پر بخیرہ ہوگا، اگر روح کا زور ہے تو اسے غم سے کوئی آزار نہ پہنچے گا، بلکہ خوش ہوگی، جو کچھ خوش آ رہا ہے، عین عادت کے مطابق ہے۔

۵۔ شرح : اے محبوب! آپ کی طرف سے شونی کا اظہار ہو تو پوری کائنات میٹھا دھانی کی لہریں دوڑ جاتی ہیں۔ شونی سن کی خود غائی کا کرشمہ ہے۔ نشا طو عالم کی خاطر اسے اور خود غا کیجیے۔

۶۔ شرح : ہمارے دنا دہری کی جتنی بساط مٹھی، اس کے موافق تو

اپ دشمنی کر چکے ، اب دوستی کا حق بھی تو ادا ہونا چاہیے ۔

مطلب یہ کہ آپ نے دشمنی کے جاری دغا داری کا امتحان تو کر لیا اور اس امتحان کا کوئی پہلو مفاد ورکتا ۔ اب دوستی کا بھی تو کوئی سلسلہ ہونا چاہیے یا سامی عمر آزمائش ہی میں گزر جائے گی ؟

۷۔ شرح : اسے غائب : مسخ و غم سے بھری ہوئی زندگی کا افسوس کب تک کریں ، کہیں یوں بھی موت آتا ہے ، وہ تو بہر حال وقت سے پرکھے گی ، لہذا رنج و غم کا قصہ ختم کرو ۔



۱۔ شرح :

بے زبانی : حال ہی میں
کوشش کا طریقہ یہی
تھ کہ ان کا خاموش
تھ یہیں بے زبانی
کا انداز بہت خوب صورت
تھ یہی ہوتا تھا جو
کا کہلاتے ہیں خوشی کا
راز نگہا ہوا ہے ۔

مطلب یہ معلوم
ہوتا ہے کہ ہم سب
درویش ، آزاد ، انیسویں
شعبہ میں رہ سکتے ، وہ
یہی چاہیے یہ بلا کسی

سکوت و خاموشی اظہار حال بے زبانی ہے
کمین دروہیں پوشیدہ راز شادمانی ہے
عیاں ہیں حال و حال شیخ سے انداز دلچسپی
مگر نقد قدح کش کا ابھی دور جوانی ہے
ثبات چند روزہ ، کار فرما سے غم و حسرت
اجل سرا یہ دار و در عیش و کامرانی ہے
گداز داغ دل شمع بساط خانہ ویرانی
تپش گاہ محبت میں فروغ جاودانی ہے
و فرخود نمائی رہن ذوق جلوہ آرائی
برہم کامرانی جذب دل کی شادمانی ہے

غرض عارے دل کی
لینیت بقیہ، شیب
واضح ہو سکتی ہے،
دل حرام تقب کی داد دے لے چرخ بے پروا؛
بر عادت داد و نخت و متاع کا مرانی ہے۔

لیکن اتنا جانتے ہیں، کرفوشی و رومی کے پردے میں چھپا ہوا ہے۔

۲۔ شرح : شیخ کی کینیت، وضع و باس، طور طریق اور گفتگو کا انداز
بڑا دلچسپانہ والا ہے۔ بلے اختیار کیا جاتا ہے۔ کہ ان حضرت کی فیصلہ ست نہیں
اوصاف میں، کا طور طریق اختیار کر لیں، لیکن کیا کیا جائے، ابھی شراب نوشی رند کی
توانی کا عالم ہے اور اس عالم میں، شیخ کی بیرونی کرینیا بالکل مناسب نہیں۔

۳۔ شرح : چند روزہ زندگی میں غم و حسرت کی کلام فراموشی کے سوا
کچھ نظر نہیں آتا، اور موت بھش و کامرانی کے دور کی سرمایہ دار ہے۔ یعنی زندگی
سوار غم ہے اور موت سراسر عیش و کامیابی۔

۴۔ شرح : وارث دل، گھل، گھل کر گھری، برادری کے پے چلنا دنیا
کڑا ہے، حقیقت، کے نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو محبت کی تپش گاہ میں، زبان
کے پے وائیں جانے کا سامان ہے۔

محبت ہوئی تو دل پر وارث ہو گا۔ وارث کی جلوہ روشنی کا سامان بہم پہنچائے گی
ذرا محبت ہی، انسان کے اندر میر و دل میں وہ ضیا پیدا کرتی ہے جو کہیں اندر
نہیں پرتی

۵۔ شرح : ہمارے محبوب کو خود خالی کے شوق کی فراوانی نے
بلوہ آزمائی پر آدھ کر رکھا ہے۔ ہمارے وارث، شہساز، پرغوش ہے کہ اس کا
مقصود حاصل ہو رہا ہے، حالانکہ یہ سراسر دہم ہے۔

مطلب یہ کہ محبوب کی تمام بلوہ آزمائیاں اس کے فوقی خود خالی کا نتیجہ ہیں۔
ہمارے جذب و دل میں اس سے کوئی تعلق نہیں مگر ہم دہم میں مبتلا ہو کر اسے اپنی
کامیابی سمجھ کر بھڑے نہیں سماتے۔

۴۔ لغات : حیراں لقب : وہ ۔ ہتے غرومی و نامراد می ۲
 لقب ل گیا ہو، یعنی سراپا غرومی و نامراد می۔

شرح : اے سچے پروا آسان ! ہمارے اُس بادل کی
 توفاد دے، جو سراپا غرومی و نامراد می بن گیا ہے اور کامراں کی کار و سلاں
 بالکل لٹ بیٹھا ہے۔



کس کی برقِ شوخی رفتار کا دلدادہ ہے
 فترہ فترہ اس جہاں کا اضطرابِ آمادہ ہے
 ہے غرورِ سرکشی صورتِ نمائے عجز بھی
 منقلب ہو کر بساں نقشِ پا افتادہ ہے
 خانہ ویراں سازیِ عشقِ جفا پیشہ نہ پوچھ
 نامرادوں کا خطِ تقدیر تک بھی سادہ ہے
 خود نشاط و سرخوشی ہے آمدِ فصلِ بہار
 آج ہر سیلِ رواں عالم میں موجِ بادہ ہے
 زندگانی رہبرِ راہِ فنا ہے اے اسد !
 بہر نفس ہستی سے تاملِ عدم اک جادہ ہے

۱۔ لغات :
 اضطرابِ آمادہ
 آمادہ اضطراب
 بیکہ رومنتظر۔

شرح : اس
 دنیا ۲ فترہ فترہ جو
 سراپا اضطراب بنا
 بڑا ہے تو یہ کس کی
 شوخی رفتار کی بجا ہے
 فرشتہ ہے :

مطلب یہ کہ
 دنیا کے فترے فترے
 میں جو بے چارہ ٹپ
 پائی جاتی ہے، وہ
 ضرور کسی کی شوخی رفتار
 کی بجلی کا کرشمہ ہے،

لیکن وہ کون ہے ؟ ظاہر ہے کہ یہاں اشارہ محبوب حقیقی کی طرف ہے۔

۲- **شرح :** سرکشی کا خرد عاجزی کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے۔ جب وہ پاشا ہے تو نقش قدم کی طرح زمین پر گر جاتا ہے۔

۳- **لغات :** خانہ ویراں سازی : گھر برباد کر دینا۔

شرح : عشق بھی نظم و ستم میں کسی سے کم نہیں۔ اس کی کیفیت کچھ نہ پوچھیے۔ اس نے ہزاروں گھر ویراں کر ڈالے۔ حد یہ کہ تارادوں کی قیمت کا خط بھی بالکل سادہ ہے، یعنی اس میں کوئی رنجاہ، کوئی دلکشی اور کوئی جانی نہ نکلتا۔

۴- **شرح :** فصل بہار کا آنا بجا سے خود عیش و مستی کا پیغام ہے۔

بہار کی آمد پر دنیا میں جہاں کوئی سیل بننا نظر آنے لگا، سمجھ لیتا جاسیے کہ وہ شراب کی لہر ہے۔ یعنی بہار و ترسے درتے میں نشاط و سرخوشی پیدا کر دیتی ہے، یہاں تک کہ شیل بھی، جو بربادی کا ایک عامل ہے، شراب میں جاتا ہے۔

۵- **شرح :** اسے اسد : زندگی فنا کے راستے پر مسافر کی

طرح چلی جا رہی ہے اور انسان جو سانس لیتا ہے، وہ ہستی کے عدم تک ایک راستہ ہے۔

ہر سانس کو عدم کی طرف راستہ قرار دینا اس اعتبار سے صحیح ہے کہ اسی طرح سانس لیتا ہوا انسان فنا کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ سانس ختم ہوتے ہی آخری منزل آجاتی ہے۔



۱- **شرح :** اس جو رجحان پر بھی، بدظن نہیں ہم تجھ سے

ہم پر انتہائی جو دردِ نظم ہو رہے ہیں، لیکن

کیا طرفہ تمنا ہے، امیدِ کرم تجھ سے

چرخے تعلق دل میں کوئی بڑا گمان پیدا نہیں

امیدِ نوازش میں، کیوں جیتے ہیں ہم آخر

ہتے ہی نہیں کوئی جب دردِ عالم تجھ سے

وارفتگی دل ہے، یا دست تصرف ہے

ہوا اور تجھ سے لطف و
کرم کی امید بدستور باہر
ہے۔ مقام حیرت
ہے کہ یہ کتنی عجیب
تھا ہے !

ہیں اپنے تخیل میں، دن رات ہم تجھ سے

یہ جو روح جفا سہنا، پھر ترک وفا کرنا

اے ہرزہ پڑو ہی بس، عاجز ہوئے ہم تجھ سے

غالب کی وفاکیشی اور تیری ستم رانی

مطلب یہ کہ
زندگی میں کبھی ایک
لمحے کے لیے بھی موت
فیض نہ ہوئی۔ یہاں

مشہور زمانہ ہے، اب کیا کہیں ہم تجھ سے

ہم یہی کہتے رہے کہ جو کچھ ہے، ہمارے اپنے اعمال کی سزا ہے۔ تیری طرف
سے کبھی کوئی بدگمانی پیانا نہ ہوئی اگرچہ تجھ سے لطف و کرم کی امید عجیب سی معلوم
ہوتی ہے، لیکن بدستور قائم ہے۔

۲- شرح : خود ہی سوال کرتے ہیں کہ اسے خدا! جب ہم تیری طرف
سے کوئی رنج و غم ہی برداشت نہیں کرتے تو اظہر تجھ سے لطف و کرم کی امید پر
کیوں زندگی بسر کر رہے ہیں؟ لطف کی امید تو اسی کو ہو سکتی، جو عظم ہے۔

۳- شرح : ہم اپنے خیال میں رات دن تجھ سے ملے رہتے ہیں۔
معلوم نہیں، یہ ہمارے دل کی وارفتگی اور دیوانگی ہے یا یہ سب کچھ کسی قوت
کے تصرف کا نتیجہ ہے۔

۴- لغات : ہرزہ پڑو ہی : یہودہ جستجو، لغو خیال۔

شرح : اتنے ظلم و جور نہ ہے، پھر وفا کے راستے سے

ہٹ جانے کی فکر ہوئی۔ اسے یہودہ فکر! الگ ہو، ہم تیرے انتہائی عاجز آگئے۔
مطلب یہ کہ جو روح جفا برداشت کو بچکنے کے بعد وفا سے دست بردار ہونا
سراسر لغو خیال ہے۔

۵۔ شرح : غائب و غافار ہے اور کون نے ظلم و جور میں کبھی نہیں کی۔ دونوں باتیں زمانہ ہجر میں مشہور ہیں۔ ہمارے لیے اس باب میں کچھ کہنے کی کیا ضرورت ہے ؟



۱۔ شرح : نامے دل کھول کے دو چار کروں یا نہ کروں
یہ بھی اسے چرخ شنگار ! کروں یا نہ کروں
مجھ کو یہ وہم کہ انکار نہ ہو جائے کہیں
ان کو یہ فکر کہ اقرار کروں یا نہ کروں ؟
لطف جب ہو کہ کروں غیر کو بھی میں بدنام
یا نہیں ؟

۲۔ شرح : کہیے کیا حکم ہے سرکار ! کروں یا نہ کروں
میں۔ نئے عہد پ سے وصل کا سوال کر دیا ، ساتھ ہی دل پر یہ وہم سوار ہو گیا کہ
کہیں انکار نہ کروں۔ وہ اس نگر میں پڑ گئے کہ اس سوال کے جواب میں اقرار
کروں یا نہ کروں ؟

۳۔ شرح : مجھ سے تو آپ کو راہ و رسم پسند نہیں اور غیر سے صلہ و
جاری ہے۔ مزہ اسی وقت آئے ، جب میں آپ کے ساتھ غیر کو بھی بڑا کم نہ
فرمانیے سرکار ! کیا حکم دیتے ہیں ، ایسا کروں یا نہ کروں ؟



۱۔ شرح : نہ پوچھ حال اس انداز ، اس عتاب کے ساتھ
ابوب اتو
نعتہ ہجرے انداز
ایوں پر جان بھی آجائے گی جواب کے ساتھ

مجھے بھی تاکہ تمنا سے ہو نہ مایوسی

مورِ رقیب سے، لیکن ذرا حجاب کے ساتھ

نہ ہو بہ ہرزہ روا دایرِ سعی . یہودہ

کہ دورِ عیش ہے مانا خیال و خواب کے ساتھ

بہرِ غمِ دل باعثِ مسرت ہے

نمویِ حیرتِ دل ہے ترے شباب کے ساتھ

.

سکونِ دل کو تعلق ہے اضطراب کے ساتھ

لگاؤ اس کا ہے باعثِ قیامِ ہستی کا

ہوا کو لاگ بھی ہے کچھ مگر حباب کے ساتھ

ہزارِ حیف کہ اتنا نہیں کوئی غالب !

کہ جاگنے کو ملا دیوے آ کے خواب کے ساتھ

میں میرا حال نہ بدھیجھ

اگر جواب دوں تو اس

کے ساتھ جان بھی

ہوں پرا جائے گی۔

۲۔ شرح :

اگر تم رقیب سے غم

پر غمے بیٹھے سو تو ہتر

تھے رہو، لیکن ذرا مجاہد

اختیار کرو تاکہ میں

بالکل ہی مایوس نہ ہو

جاؤں، یہاں تک کہ

تمہارے ہی تناسخ بھی

انقذو ہو بیٹھوں۔

۳۔ شرح :

ایک یہودہ اور

راگنوں کو شش میں

بے قائمہ مصروف

رہنے سے کیا حاصل !

یہ حقیقت ہے کہ عیش کا دامنہ خیال یا خواب سے مشابہ ہے۔ یعنی اس دنیا میں عیش

کے لیے خیال و خواب کی طرح کوئی ثبات و قیام نہیں۔

۴۔ لغات : یہ ہر غمط : ہر صورت میں، ہر طرح۔

شرح : غمِ دل کے لیے ہر حال میں باعثِ راحت ہے، کیونکہ

جیسے جیسے شہابِ تنقیر رہا ہے، ویسے ویسے میرے دل کی حسرت

بڑھ رہی ہے۔

۵۔ شرح : پہلا مصرع چڑھا نہیں گیا، دوسرے مصرع کا مطلب ہے کہ دل کے سکون کو اضطراب و پریشانی سے تعلق ہے۔

۶۔ شرح : ہوا کا لگاؤ ہی تجلے کے لیے زندگی کا باعث ہے۔ یعنی ہوا ہی کی بدولت بجلی پیدا ہوتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ لگاؤ کے ساتھ ہوا کو تجلے سے۔ لگ بھی یعنی دشمنی بھی ہے، کیونکہ ہوا ہی اسے توڑ بھی دیتی ہے۔

۷۔ شرح : اے غائب ! ہزار افسوس کہ اس دنیا میں کوئی ایسا وجود فطرۃً آیا، جو جاننے کو سونے کے ساتھ ملا دے۔

مطلب یہ کہ شبِ فراق میں عاشق کو غیند نہیں آتی۔ ذرات ختم ہوتی ہے، نہ دن کو قرار آتا ہے، نہ نیند کا جاو چلتا ہے۔ اس حالت میں پریشان ہو کر کہتا ہے، کاش کوئی ایسا دھند حکیم ہوتا، جو میری بیداری کو غیند سے ملا دیتا، یعنی میں سو جاتا تاکہ کچھ مدت کے لیے پریشانیوں سے نجات پاتا۔

وضع نیرنگی آفاق نے مارا ہم کو
ہو گئے سب ستم و بخور گوارا ہم کو
دشت و حشت میں نہ پایا کسی صورتِ گمراہ
گرد و جولاں جنوں تک نے پکارا ہم کو
عجز ہی اصل میں تھا حاملِ صد رنگ و عروج
ذوقِ پستی مصیبت نے ابھارا ہم کو

۱۔ شرح :
ہیں دنیا کے بغیرات
کی کیفیت نے مار
ڈالا۔ اب ختم کے
عظم و بخور ہیں گوارا ہیں
اور ہم انہیں خوشی
خوشی برداشت کرنے
کے لیے تیار ہیں۔
جب تک یہ

ضعف مشغول ہے بیکار بر سعی بیجا
 کر چکا جوش جنوں اب تو اشارا ہم کو
 صورِ محشر کی صدا میں ہے فسونِ اُمید
 خواہشِ زیست ہوئی آج دوبار اہم کو
 تختہ گورِ سفینے کے مماثل ہے، اسد!
 بحرِ غم کا نظر آتا ہے کنار اہم کو
 اندازہ نہ تھا کہ دنیا
 کی کسی چیز کو ثبات
 نہیں تو ہر کیفیت وہ
 واقعے پر پریشان
 ہوتے تھے۔ اب
 ہم پر روشنی ہو چکا
 ہے کہ یہاں کی کسی
 بھی حالت کو قرار
 نہیں۔ زمانہ گردش
 میں ہے اور برابر رنگ بدلتا چلا رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے سچ و غم کو
 بھی ایک عام چیز مان لیا اور بے تکلف سب کچھ برداشت کرتے چلے جا رہے
 ہیں۔ اقبال کیا خوب کہ گئے ہیں۔

سکونِ محال ہے قدرت کے کارِ ظہیر
 ثبات ایک اقلید کو ہے زمانے میں

۲۔ شرح : ہم بجز ہو کر یا باہن جنوں میں پہنچ گئے اور ایسے کم ہونے
 کہ نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ بخود ہی کے عالم میں چلتے چلتے ہو گزر ہم نے اڑائی
 تھی، وہ بھی پھارتی رہی، مگر کوئی جواب نہ ملا اور ہمارا کچھ پتا نہ چلا۔

۳۔ شرح : ہمارا غم و نیاز ہی اصل میں ہماری ہر قسم کی برتری کا
 ذریعہ اور وسیلہ تھا۔ مصیبتوں نے ہم میں ہستی کا جو ذوق پیدا کر دیا تھا، وہی ہمارے
 ابھرنے کا سہارا بن گیا اور ترقی کرتے کرتے ہم کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔

۴۔ شرح : بیشک ہم ضعیف ہیں، لیکن جوشِ جنوں کا اشارہ پاتے
 ہی سحرِ گردش کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ اب ضعف، یہیں روکنے کی جو بھی کوشش
 کرے گا، وہ بالکل بے سود اور بے حاصل ہوگی۔

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا وجود ذاتی مختلف و طاقت پر موقوف نہیں، بلکہ اس کی ہر سرگرمی و حوش و جذبہ کا نتیجہ ہے۔ گویا جاری و غلابی حقیقت پر نہ جانا چاہیے، مصنوعی قوت پر نظر رکھنا چاہیے۔

۵۔ **شرح :** قیامت کے دن مشرے پھونکا گیا تو میں بھی قبر سے دوبارہ زندگی کی امید سے کراٹھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تصور کی آواز میں آئندہ کا کوئی جاؤ و بھڑا تھا، جس نے میری وہ بالوں اور فسر و گی بالکل ختم کر دی، بھڑ بھڑ کے مصیبت خیز حوادث و تجربات کا نتیجہ تھی۔

۶۔ **نغات :** مماثل : مانعہ، مشابہ۔

شرح : اے اسد! قبر میں چوتھے لگائے جاتے ہیں، وہ کشنی سے ملتے جلتے نظر آتے ہیں، جس میں بیٹھتے ہی غم کے دریا کا کنارہ نظر آگیا۔

مطلب یہ کہ موت ہی پر اس دُنیا میں غم ختم ہوتے ہیں، جیسے کہ

وہ نہ ہو۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

۱۔ **شرح :** حزن بے پروا گرفتار خود آرائی نہ ہو
حُسنِ بالکل بے نیاز ہے، پھر بھی ہر وقت
گر کہیں گاہِ نظر میں دل تاشائی نہ ہو
آمائش میں مصروف ہے، یہ آمائش ہر گز
بیچ ہے تاخیرِ عالم گیری تاز و ادا
نہ ہوتی، اگر نعر کے
فوقِ عاشق گرا سیرِ دام گیر اتی نہ ہو

خود گدازِ شمع، آغازِ فروغِ شمع ہے
سوزشِ غم در پئے ذوقِ شکیبائی نہ ہو
تارِ تبارِ پیرِ بہن ہے اکِ رگِ جانِ جنوں
عقلِ غیرتِ پیشہ حیرت سے تماشائی نہ ہو
بزمِ کثرت، عالمِ وحدت ہے، دنیا کے لیے
بے نیازِ عشق، اسیرِ زورِ تنہائی نہ ہو
ہے محبتِ رہزنِ ناموسِ انساں اے اسدا
قامتِ عاشق پر کیوں بلبوسِ رسوائی نہ ہو

ساتھ دل گھات میں
پیٹھ کر حسن کا نظارہ
دکرتا۔

مطلب یہ کہ
حسن کو نہ یادہ سنے یاد
آہستہ ہونے اور
بٹنے ٹٹنے کی ضرورت
اس سے پیش آتی
ہے کہ عشقِ یوں یاد
ہے، اگر چہ کھل کر
سلطنتِ نہیں آتا اور
نظر کی گھات میں پیٹھ

کر دیکھتا ہے۔ اس شعر میں بھی وہی مشہور قول پیشِ نظر رہا، جو بہ طورِ حدیث بیان
کیا جاتا ہے کہ میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ دل چاہا کہ مجھے پہچانا جائے۔ یوں عشق
پیدا ہوا کہ حسن کی معرفتِ کمال پر پہنچا گئے۔ یہ حسن کی خود آرائی تھی اور کمالِ یوم ہونی
شان سے بھی یہی واضح رہتا ہے کہ خود آرائی بدستور جاری ہے۔

۲۔ لغات : گیرائی : گرفت۔

شرح : حسن کے ناز و ادا نے زمانہ بھر پر اپنی قوت کا سکہ
بٹھا رکھا ہے، لیکن اگر عشق کا ذوق اس حال کی گرفت میں آنے کے لیے تیار نہ ہو
تو ناز و ادا کی عالمگیری بالکل ہیچ رہ جائے گی۔

مطلب یہ کہ حسن کی جانِ بیت اور کشفِ ظرفِ عشق کی بدولت ہے، اگر کوئی
حسن کے دہم میں پہنچتا ہے تو اسے گونہ پر چمکے گا اور اس کے
ناز و ادا کی تہذیبِ خفیت کیا رہ جائے گی ؟

۳۔ لغات : شکیبائی : صبر، ضبط۔

شرح : غم کا سوز کیوں صبر و شکیب کا ذوق پیدا کرنا چاہتا ہے ؟ یعنی اسے کیوں صبر کی اُردو ہو ؟ کیا یہ حقیقت معلوم نہیں کہ شمع کا پگھلنا ہی اس کے لیے روشنی کا سر و سامان ہے ؟ جب گداز کے بغیر روشنی نصیب نہیں ہو سکتی تو غم کی سوزش کیوں صبر کی طرف مائل ہو ؟ سوزش بدستور جاری رہنی چاہیے تاکہ ہمیں بھی شمع کی طرح روشنی مل جائے اور ہم بھی مغرب تک پہنچ جائیں۔

۴۔ شرح : ہمارے لباس کا ایک ایک تار جنوں کے لیے رگِ جان کی حیثیت رکھتا ہے، یعنی جنوں زندہ ہی اس طرح رہ سکتا ہے کہ لباس تار تار رہے۔ یہ منظر دیکھ کر عقل کو بڑی غیرت آتی ہوگی اور وہ اس پر سراپا حیرت ہے، لیکن یہ کام اُس سے ہی نہیں آ سکتا، اس لیے حیرانی ہے دیکھنے کی اسے کوئی ضرورت نہیں۔

۵۔ شرح : اگر کسی کے پاس حقیقت کو دیکھنے والی آنکھ ہو تو کثرت کی محفل یعنی کائنات بہ، وحدت کی دنیا ہے، یعنی حقیقت میں کوہِ ہجر۔ وحدت ہی وحدت نظر آتی ہے۔ جسے عشق کی بے نیازی مل گئی ہے۔ اسے خلوت کے گوشے میں بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہ جلوت میں بھی ہر طرف وحدت ہی دیکھ رہا ہے۔

۶۔ شرح : اسے اسد ! محبت انسان کے نام و رنگ اور عزت کے لیے تفریق کا حکم رکھتی ہے۔ یعنی محبت ہو جائے تو ناموں و رنگ کا کوئی خیال نہیں رہتا۔ چہرہ کیا وجہ ہے کہ عاشق کے دریاں پر رسوائی کا لباس نہ ہو ؟ رنگ و ناموں ختم ہوئے تو رسوائی کے سوا کیا باقی رہ جاتا ہے ؟

خزینہ دار محبت ہوئی ہو اسے چمن

بنائے خندہ عشرت ہے، بر بنائے چمن

بر ہرزہ سخی گلہیں، نہ کھا فریبِ نظر

ترے خیال کی وسعت میں ہے فضا بچمن

یہ نغمہ سخی بلبل متاعِ زحمت ہے

کہ گوشِ گل کو نہ راس آئے گی صدا چمن

صداے خندہ گل تا قفس پہنچتی ہے

نسیم صبح سے سنتا ہوں ماجرائے چمن

گل ایک کاسہ در یوزہ مسرت ہے

کہ عند لبِ نوا سنج ہے گدائے چمن

حریفِ نالہ پرورد ہے، تو ہو، پھر بھی

ہے اک بتسم نہاں ترا بہائے چمن

بہارِ راہرو جادۂ فنا ہے، اسدا

گل شگفتہ ہیں گو با کہ نقشِ پائے چمن

ترافے ہیں، پھول کے کان کو راس نہ آئیں گی۔

مطلب یہ کہ بلبل گلے سے میں کتنی ہی شقیں اٹھائے، مگر اس کا لانا پھول کو گوارا نہ ہوگا۔ عاشقوں کا حال ہر جگہ یہی ہے۔

۱۔ شرح :

بارغ کی ہوا اپنے دامن

میں محبت کا خزانہ

لیے ہوئے ہے۔

عیش و عشرت کی شادمانی

کی دنیا و بارغ ہی کی بنیاد

پر رکھی گئی ہے۔

۲۔ لغات :

ہرزہ سخی : بیہودہ

گوئی اور محبت کا رمی۔

شرح :

تو گلچیں کی بیہودگی دھوکا

نہ کھا۔ تیرے خیال

کی وسعت میں چمن

کی فضا میں سوئی ہے۔

۳۔ شرح :

بلبل خواہ مخواہ ترافے

کا گاکر مشقت اٹھا

رہی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ چمن سے جو صدا میں اٹھتی ہیں اور وہ بلبل ہی کے

ترافے ہیں، پھول کے کان کو راس نہ آئیں گی۔

مطلب یہ کہ بلبل گلے سے میں کتنی ہی شقیں اٹھائے، مگر اس کا لانا پھول کو گوارا نہ ہوگا۔ عاشقوں کا حال ہر جگہ یہی ہے۔

۴۔ لغات : در پوزرہ : بھیک۔

شرح : پھول اصل میں خوشی کی بھیک مانگنے کا ایک کاسہ ہے اور گانے والی ببل چین میں بھکاری بن کر آتی۔

۵۔ شرح : اسے محبوب نامکس ہے، عاشق کا درد بھرا حال تیری پوشیدہ سکراہٹ کا حریف بن سکے، لیکن اس میں کیا شہرہ ہے کہ اس پوشیدہ سکراہٹ کے بدلے میں پورا باغ بہ طور قیمت نقد کیا جا سکتا ہے۔

۶۔ شرح : اسے اسد ! بہارِ فنا کے راستے پر چلی جا رہی ہے۔ یہ جو کھلے ہوئے پھول ہیں، انہیں باغ کے پاؤں کا نقش سمجھنا چاہیے۔

۱۔ شرح : کرم ہی کچھ سببِ لطف و التفات نہیں

صرف لطف و کرم ہی محبوب کے،
انتہات کا نشان نہیں۔ وہ نوازشوں
سے عاشق کو ہنسا لیتا ہے، پھر آنا فانا
علم دستم دھا کر ملا بھی دیتا ہے۔

غرض کہ دل کی کسی شے کو بھی شایستگی نہیں
کہاں سے لاکے دکھائے گی عمرِ کم مایہ

سیہ نصیب کو وہ دن کہ جس میں رات نہیں
زبانِ حمد کی خوگر ہوتی تو کیا حاصل

کہ تیری ذات میں شامل تری صفات نہیں
خوشی، خوشی کو نہ کہ غم کو غم نہ جان، اسد!

قرارِ داخل اجزائے کائنات نہیں۔

شعرا ناقص
نقل ہوا ہے، لہذا
شرح نہیں ہو سکتی۔

۲۔ شرح :
عمر کا سراپہ تو بہت

ہی کم ہے۔ مجھ پر نصیب کو وہ مالیا دن کہاں سے لا کر دکھائے گی، جس کے ساتھ
مات مذہب ۲

مطلب یہ کہ اس دنیا کی کوئی خوشی پائدار نہیں جس طرح ہر دن کے ساتھ
رات ہے، اُسی طرح ہر خوشی کے ساتھ غم لگا ہوا ہے۔

۴۔ شرح : بیشک میری زبان حمد کی عادی ہو گئی ہے۔ اے باری
تعالیٰ ! میں ہمیشہ تیری حمد و ثنا کرتا رہتا ہوں، لیکن ایک چیز عرض کروں کہ صرف ذات
کی حمد کرتا ہوں، اصناف کو ذات میں شامل نہیں سمجھتا۔

اس شعر میں توحید کا ایک اعلیٰ تصور پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مگر خاص
ذات کی حمد ہو ہی نہیں سکتی۔ حمد ہوگی تو صفات ہی کی ہوگی۔ بعض الحمد للہ کہے
جانے سے بات نہیں بنتی، یہ بھی کہنا ہوگا کہ وہ جہانوں کا پروردگار ہے، بخوان و
رحیم ہے، یوم جزا کا مالک ہے۔ اس اعتبار سے عبادات اُس کی صحت کمال ہے۔
یہی مال باقی صفات کا ہے۔

۵۔ شرح : اے استاد ! خوشی کو خوشی ذکر، غم کو غم نہ جان، یہ کہہ کر
اے میں سے کسی بھی شے کو پائدار ہی نہیں، یہ سب بدلتی چلی چلتی ہی ہیں۔
حق یہ ہے کہ کائنات کے اجزاء میں آؤر کچھ بھی ہو، مگر غنات شامل نہیں، یعنی
یہاں کوئی بھی چیز قائم و باقی نہیں۔

یہ وہی حقیقت ہے، جو شیعے نے اپنی نظم ”تغیر“ میں بیان کی اور اقبال چرنے
اسی خیال کو یہ لباس پہنایا،

سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثاب ایک تغیر کو ہے زمانے میں

۱۔ شرح :
ہم شمع کی طرح دغا
کے سوختہ سا لہجہ

جوں شمع ہم اک سوختہ سامانِ وفا ہیں
اور اس کے بسوا کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہیں

اک سرحدِ معدوم میں ہستی ہے ہماری
 سازِ دل بشکستہ کی بے کار صدا ہیں
 جس رُخ پہ ہوں ہم سجدہ اسی رُخ پہ ہے واجب
 گو قبلہ نہیں ہیں مگر اک قبلہ نما ہیں
 مت ہو جو واسے سیلِ فنا! ان سے مقابل
 جانِ بازِ الم نقش بہ دامنِ بقا ہیں
 پاٹی ہے جگہ ناصیہ بادِ صبا پر
 خاکستری پروانہ جانِ بازِ وفا ہیں
 ہر حال میں ہیں مرضیِ صیاد کے تابع
 ہم طائرِ پر سوختہ رشتہ بپا ہیں
 اے وہم طرازِ مجازی و حقیقی
 عشاقِ فریبِ حق و باطل سے جدا ہیں
 ہم بے خودی شوق میں کر لیتے ہیں سجدے
 یہ ہم سے نہ پوچھو کہ کہاں ناصیہ سا ہیں
 اب منتظرِ شوقِ قیامت نہیں، غالب
 دنیا کے ہر اک ذرے میں سو حشرِ بپا ہیں

ہیں، یعنی شمعِ روشنی
 کے لیے اپنے آپ
 کو جلا رہی ہے اور
 ہم وفا کے راستے
 میں اپنا ہر سامان
 غدا آتش کر چکے ہیں۔
 بس اس کے سوا کچھ
 معلوم نہیں کہ ہم کیا
 ہیں۔

۶۔ لغات :
 معدوم :
 گم شدہ ۔

شرح :
 ہماری ہستی اگر ہے
 تو ایسے مقام پر ہے
 جو گم ہو۔ ہم ٹٹے بھٹے
 دل کے ساز کی صدا
 ہیں اور بالکل بیکار
 ہیں۔

مطلب یہ کہ
 ٹٹے بھٹے ساز
 سے جو صدا نکلتی ہے
 اس میں کوئی نئے
 اور کوئی سرِ جوہی

نہیں سکتا، لہذا اسے بالکل بیکار سمجھنا چاہیئے۔

۲۔ **شرح :** ہم جس طرف بھی منہ کیے بیٹھے ہوں، اسی طرف ہمارے لیے سجدہ واجب ہے۔ بیشک ہم قبلہ نہیں کر چاہری طرف سجدہ کیا جائے، لیکن قبلہ حاضر و رہیں، یعنی قبلے کا پتا ہمیں سے مل سکتا ہے، اس لیے جس طرف ہمارا رخ ہو، اسی طرف سجدہ کرنا چاہیئے۔

۳۔ **شرح :** اسے فنا کے سیل! اُن لوگوں کے رو بہِ ذن آنا، جو محبوب کے غمِ دالم میں جان کی بازی لگا چکے ہیں۔ یاد رہے کہ وہ بھاکے دامن پر نقش کی طرح قائم ہو گئے ہیں، یعنی انھیں کوئی مٹا نہیں سکتا۔ وہ ہمیشہ اپنی جگہ استوار رہیں گے اور سیل اُن کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔

۵۔ **شرح :** ہم چہ دانے کی راکھ ہیں، جس نے وفا میں جان دے دی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس راکھ کو بادِ صبا کی پیشانی پر جگہ ملی۔
پیشانی پر جگہ ملنا، استغاثی عظمت کا نشان ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ہوا پہلے تو سب سے پہلے راکھ ہی کراڑا سے گی۔

۶۔ **شرح :** ہم لوگ ہر حال میں صیاد کی مرضی کے پابند ہیں۔ ہم ایسے پرندے ہیں، جن کے پر جلا دیئے گئے اور پاؤں میں دھواگیا باندھ دیا گیا۔ گریا دھاؤں سکتے ہیں، مگر صر اور دھرا جاسکتے ہیں۔
میرزا کے نزدیک یہ زندگی کا نقشہ ہے۔

۷۔ **شرح :** اسے مجاز اور حقیقت کے ادغام کی آرائش کرنے والا، تم حق اور باطل کا فریب کما سکتے ہو، عاشق اس فریب سے بالکل ادگ تھلگ ہیں۔ وہ حق اور باطل، نیک اور بد کے جھگڑے میں نہیں پڑتے، اُن کے نزدیک مجاز و حقیقت میں امتیاز کی کوئی وجہ نہیں۔

۸۔ **شرح :** ہمیں عشق نے مجبور کر رکھا ہے، اپنے آپ کی خبر نہیں۔ اسی بخود ہی میں سجدے بھی کر بیٹھیں، ایسا ہم سے یہ نہ ہو جتنا چاہیے کہ گہاں۔

سجدے کرتے ہیں، کس مقام پر پیشانی گھسکتے ہیں۔

۹- شرح : اب غائب کو طور قیامت کا کوئی انتظار نہیں رہا، کیونکہ اسی دنیا کے درے درے میں سیکڑوں محشر ہوا ہیں۔ راستہ دن ان محشروں کے منظر دیکھنے کے بعد قیامت کے انتظار کی کون سی صورت باقی رہ گئی؟

۱- لغات :

آفت، آہنگ :

جس کی ہر صدا آفت

ڈھانے کا باعث ہو۔

شرح :

بیل کی آہ و فغان کی

ڈھار ہی ہے، اس

یلے پھول کھل کر نہیں

ہنس سکتا۔ مگر بیل کی

آہ و فغان نہ بھڑکی تو بھڑ

میں پھول اتنا ہنستا،

اتنا ہنستا کہ دم ٹوڑ

دیتا۔

مطلب یہ کہ

زندگی کا کوئی حادثہ

اور کوئی طوفان ایسا نہیں

جس میں خوشی کے

ساتھ رنج اور غم اور

آفت آہنگ ہے کچھ تالہ بلبل، ورنہ

پھول ہنس ہنس کے گلستاں میں فنا ہو جاتا

کاش! ناقدِ رنہ ہوتا ترا اندازِ خرام

میں غبارِ سرورِ امانِ فنا ہو جاتا

یک شے فرصت ہستی ہے اک آئینہ غم

رنگ گل کا حق! گلستاں کی ہوا ہو جاتا

منتقل مرکزِ غم پر ہی نہیں تھے، ورنہ

ہم کو اندازہ آئینِ فنا ہو جاتا

دستِ قدرت ہے مرا خشتِ نیر دیوارِ فنا

گر فنا بھی نہ میں ہوتا تو فنا ہو جاتا

حیرت اندہ ہی اربابِ حقیقت مت پوچھ

جلوہ لک بیغہ تو آئینہ ہنس ہو جان

کے ساتھ لال نہ ہو۔ اس کائنات کا توازن اسی طرح قائم رہتا ہے کہ نہ صرف خوشی ہو، نہ صرف رنج ہو۔ دونوں میں سے کوئی ایک چیز بھی ہوتی تو اس حد پر پہنچ جاتی کہ زندگی قائم نہ رہ سکتی۔ دن کے ساتھ رات، اگر اس کے ساتھ سرما توازن کے لیے ہے۔ اسی طرح خندہ گل کے ساتھ ناز و بیل رکھتا تاکہ توازن میں خلل پیدا نہ ہو۔

۲۔ شرح : اے محبوب ! اگر تیری رفتار ناز کا طور طریق عاشق کی ناقدری ذکر تا تو وہ اب تک کبھی کاغذ پر نہ کر دیا مگر دانا کے ساتھ لگ جانا، یعنی فنا ہو جانا۔ مصیبت یہ ہے کہ تیرے انداز خیرام نے اس کی تندہ پہچانی اور وہ اب تک اسی امید پر زندہ ہے کہ کبھی نہ کبھی اسے تیرے خیرام کی بدولت فنا کی منزل نصیب ہو ہی جائے گی۔

۳۔ شرح : پھول کے لیے زندگی کی مہلت صرف رات بھر کی ہے، یعنی شام کو کھلا اور صبح کو تازگی اور شادابی کی بہار دکھا کر رفتہ رفتہ بکھر گیا۔ یہ زندگی کی مہلت نہیں، بلکہ غم کا ایندھن ہے، کیونکہ رات بھر کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے، اب دل میں یہ آرزو پیدا ہو رہی ہے، کاش پھول کا رنگ باغ کی ہوا میں جانا، کیونکہ باغ کو پھول کی مہلت ہستی کے مقابلے میں زیادہ پائیداری حاصل ہے۔

۴۔ شرح : ہم غم کے مرکز پر پڑ رہی طرح استوار ہی نہیں تھے، یعنی اس مرکز سے بھی ادھر ادھر ہٹتے رہے۔ اگر اس بجائے رہتے تو ہمیں یہ اندازہ تو ہو جاتا کہ دنیا کا طریقہ کیا ہے۔ گویا دنیا داری کا طریقہ وہی بناہکتا ہے، جو غم کے مرکز پر مستحکم قائم رہ سکے۔

۵۔ شرح : میرا دوست جنوں دیوار فنا کی ایک اینٹ ہے۔ اگر میں خود فنا نہ ہوتا تو اس حالت میں بھی لازم تھا کہ رفتہ رفتہ مٹ جاتا اور فنا کے گھاٹ اتر جاتا۔

فنا کی ایک صورت یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو مٹا دے۔ دوسری صورت

یہ سچہ کرفنا کی دیوار چٹنی جا رہی ہے، اس میں اینٹ بن بن کر گلتا چلائے۔ جب دیوار مکمل ہو جائے گی تو فنا کا سفر بھی اختتام کو پہنچ جائے گا۔ یہی معنیوں فارسی کے ایک شعر میں کسی نے بیان کیا ہے :

جان بہ جاناں وہ و گرد از تو بیستاند ابل
خود تو منصف باش اسے جل! ایں کہن یا آن کہن

۴۔ شرح : حقیقت شناس لوگ حیرت پر حیرت جمع کرتے جا رہے ہیں، یعنی ان پر برابر حیرت کی کیفیت طاری ہے۔ کاش محبوب کا جلوہ کسی نہ کسی دن انھیں آئینہ دکھا دیتا۔

مطلب یہ کہ جب تک محبوب کا جلوہ نظر نہ آئے، وہ حیرت ہی میں رہیں گے۔

۱۔ شرح :

خزاں کے موسم میں
باغ کا صحن دیرانے
سے بھی زیادہ بے رونق
ہو گیا ہے اور بیل کا
گھر بھول کی ہنسی کے
بغیر ہے چراغ معلوم
ہوتا ہے۔

بدتر از ویرانہ ہے فصل خزاں میں صحن باغ
خاتم ببل بغیر از خندہ گل بے چراغ
پتا پتا اب چمن کا انقلاب آلودہ ہے
نغمہ مرغ چمن زرا ہے صدائے بوم و زاغ
ہاں بغیر از خواب مرگ آسودگی ممکن نہیں
رخت ہستی باندھ تا حاصل ہو دنیا سے فراغ
شور طوفان بکلا ہے خندہ بے اختیار
کیا ہے گل کی بے زبانی کیا ہے لالے کا داغ

ظاہر ہے کہ
باغ ویران ہو گا تو نہ
کلیاں نمودار ہوں گی،
نہ بھول کھلیں گے،

پیشم پر غم رہا ، زمانہ منقلب ہے اے استاد
 کوئی لمحہ نصیب ہو گا۔
 اب یہی ہے بس مے شادی سے پڑھونا ایلاخ
 اس کے گھر کی رونق
 پھولوں سے ہے۔
 پھول نہ ہے تو گھر
 کی رونق نہ رہی۔

۲- شرح : باغ کا پتہ پتہ انقلاب کے بھرا ہوا ہے۔ یعنی زور شور
 سے اس کی حالت بدل رہی ہے۔ معلوم ہے کہ خنداں میں پتہ بھڑ شروع
 ہو جاتی ہے اور بہتر پتہ رفتہ رفتہ زور ہو ہو کر نہیں پرگرتے جاتے ہیں۔
 میں وہ ہے کہ اس کیفیت کے لیے انقلاب آلودہ کی ترکیب ایجاد کی گئی۔
 جو پرندہ سحر میں پیدا ہوئے اور جن ہی کے ترانے گاتے رہے ،
 خواں میں ان کا گانا ویسا ہی گمراہ معلوم ہوتا ہے ، جیسے آواز کوئے کی آواز
 ہو۔ یہ بھی انقلاب احوال ہی کی کیفیت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بخش و طرب کی جتنی چیزیں ہیں ، ان کی رونق اور دلاویزی
 خاص قسم کی فضا پر موقوف ہے۔ مثلاً باغ میں سبزہ ہو، پھول ہوں ، درخت
 ہرے بھرے ہوں تو ہر پرندے کا نغمہ خوشگوار معلوم ہو گا۔ یہ سب چیزیں
 ختم ہو جائیں اور بے رونق چھا جائے تو بہتر سے بہتر نغمہ بھی دلاویزی کھر بیٹھ
 گا اور ناگوار معلوم ہو گا۔

میرزا نے غم درنج اور افسردگی کی حالت میں خوشگوار چیزوں کے ناگوار
 ہونے کا ذکر اور بلکہ بھی کیا ہے ، مثلاً :

غم قراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو
 مجھے دماغ نہیں خندہ لائے بیجا کا

۳- شرح : جب تک انسان موت کی فیندہ نہ سوجائے ، اس

کے لیے راحت پانا اور اسودہ رہنا بالکل غیر ممکن ہے۔ اگر تو دنیا کے جنات سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے تو تجھے چاہیے کہ زندگی کا سرور سامان باندھ کر یہیں سے رخصت ہو جائے۔

یہ بھی وہی بات ہے، جو پہلے کہی مرتبہ کہی جا چکی ہے، مثلاً :

قیدِ حیات و بندِ علم اصل میں دونوں ایک ہیں

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کھوں

۴۔ شرح : پھول اپنی خوشی اور اختیار سے نہیں ہنتے۔ یعنی اُن کا کیلنا خود اُن کے اختیار میں نہیں، بلکہ وہ کسی کے حکم اور کسی کے اشارے کے تابع ہیں۔ یہ کیلنا اور یہ ہنسا اصل میں طوفانِ بلا کا شور ہے، جس نے پھول کو پکھڑیوں کی زبانوں کے باوجود بے زبان اور دم بخود بنا رکھا ہے اور اسے کے سینے میں داغ پڑا ہوا ہے۔

۵۔ لغات : منقلب : اُٹ پٹ، دو بالا۔

ایاخ : پیار، شراب کا پیار۔

شرح : اسے اسد ! زمانہ دو بالا ہو رہا ہے، تو اپنی آنکھ پر نم رکھ، یعنی اشکبار رہ۔ آج اس دنیا میں خوشی کی شراب سے پیار بریز رہے کتنے کا مطلب یہ ہے کہ آنکھیں آنسوؤں سے بھری رہیں۔ کیوں بھری رہیں ؟ اس لیے کہ زمانہ ہر لحظہ تغیر میں چمچر چیز انتہائی تیزی سے بدلتی جا رہی ہے :

ہر شے مسافر، ہر چیز راہی

قصائد

(۱)

میکلوڈ صاحب کی خدمت میں

کرتا ہے چرخ روز بہ صد گونہ احترام
فرماں روا نے کشورِ پنجاب کو سلام
حق گو و حق پرست و حق اندیش و حق شناس
نواب مستطاب، امیرِ شہِ احتشام
بحم رتبہ میکلوڈ بہادر کہ وقتِ رزم
نرب فلک کے ہاتھ سے وہ چھین لیں جام
جس بزم میں کہ ہوا مٹھیں آئینِ میکشی
والِ آسمان شیشہ بنے آفتاب جام
چاہا تھا میں نے تم کو مہ چار وہ کہوں
دل نے کہا کہ یہ بھی ہے تیرا خیالِ خام
دورات میں تمام ہے ہنگامہ ماہ کا
حضرت کا عز و جاہ رہے گا علی الدوام

تمہید :-

۱۳ رجسٹر می ۱۸۸۹ء کو
پنجاب کے گورنر،
ڈونلڈ میکلوڈ نے ریل
کے افتتاح کے لیے
دہلی میں ایک دربار منعقد
کیا تھا۔ میرزا بھی اس میں
شریک ہوئے تھے۔
اس وقت صحت بہت
کمزور ہو چکی تھی۔
ماستر بیسے والا شوبہ
بڑا لگے چل کر لٹے بہادر
ہوئے، چلتے میں میرزا
کو سہارا دے رہے تھے۔
محمود شاہی دیکھ کر کہہ اے "کابیان
بھ کر میکلوڈ صاحب
نے میرزا سے پوچھا
یہ کپ کا بیٹا ہے ؟

سچ ہے تم آفتاب ہو جس کے فروغ سے
 دریا سے نور ہے فلک آگینے نام
 میری سنو، کہ آج تم اس سرزمین پر
 حق کے تفضلات سے ہو مرجع انام
 اخبار لودھیانہ میں، میری نظر پڑی
 تحریر ایک جس سے ہوا بندہ تلخ کام
 ٹکڑے ہوا ہے دیکھ کے تحریر کو جگر
 کاتب کی آستیں ہے مگر تیغ بے نیام
 وہ فرو جس میں نام ہے میرا غلط لکھا
 جب یاد آگئی ہے، کلیجا بیا ہے تمام
 سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک فلم
 لمبر رہا، نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام
 ستورس کی عمر میں یہ داغ جاں گداز
 جس نے جلا کے راکھ مجھے کر دیا تمام
 عقی جنوری جہینے کی تاریخ تیرھویں
 استادہ ہو گئے لب دریا پہ جب خیام

کسا: بیٹا نہیں، مگر بیٹے
 سے زیادہ ہے۔
 معلوم ہوتا ہے
 کراہی میں جس نے ان
 کے وقار و احترام کا پورا
 خیال نہ رکھا اور پہلے
 دستور کے مطابق نشست
 بھی نہ لی۔ لدھیانہ کے
 ایک اخبار میں جو رواد
 شائع ہوئی اس میں میٹر
 کا نام تک غلط لکھا گیا۔
 اس پر تقریب کے بعد
 میرزا نے یہ قصیدہ میکلیوڈ
 کی خدمت میں پیش کیا۔
 یہ بھی سب سے پہلے
 "السلام" "دعوتِ جنوری" میں
 ہی میں شائع ہوا تھا۔
 قصیدے میں گورنر کا نام
 میکلیوڈ چھپا ہے، "السلام"
 میں نام منکھوڑ تھا۔ غلابا
 بیاض میں میں مدح ہو۔
 میرے نزدیک شعر میں
 میکلیوڈ آسکتا ہے۔

اُس بزمِ پُر فردخ میں اس تیرہ بخت کو
 لمبر ملا نشیب میں از روئے اہتمام
 سمجھا اُسے گراب، ہوا پاش پاش دل
 دربار میں جو مجھ پہ چلی چشمکِ عوام
 عزت پہ اہل نام کی ہستی کی ہے بناء
 عزت جہاں گئی تو نہ ہستی رہی، نہ نام
 تھا ایک گونہ ناز جو اپنے کمال پر
 اس ناز کا فلک نے یا مجھ سے انتقام
 آیا تھا وقت ریل کے کھلنے کا بھی قریب
 تھا بارگاہِ خاص میں خلقت کا ازدحام
 اس کشمکش میں آپ کا مداح درد مند
 آقائے نامور سے نہ کچھ کر سکا کلام
 جو داں نہ کہ سکا تھا وہ لکھا حضور کو
 دیں آپ میری داد کہ ہوں فائز المرام
 ملک دسپہ نہ ہو تو نہ ہو، کچھ ضرر نہیں
 سلطانِ بڑو بھر کے در کا ہوں میں غلام

اغلب ہے، غالب
 نے سین کھٹا ہوا نقل میں
 غلطی ہو گئی۔

۱۔ شرح :
 ولایتِ پنجاب کے حکمران
 کو آسمان پر روزِ احترام
 کے میزوں پر طریقوں
 سے سلام کرتا ہے۔

۲۔ لغات :
 مستطاب :

خوش، نیک، بزرگ۔
 شرح : وہ

حکمران، جو بڑا ہے،
 بچے کا پابند ہے، بچہ

سوچتا، بچہ پہناتا ہے۔
 وہ بزرگ قوت ہے

اور اگر چہ امیر ہے، لیکن
 اسے بادشاہ جیسی

شان و شوکت حاصل
 ہے۔

۳۔ لغات :
 ترکِ ملک :
 مریخ۔

۷۔ لغات : آگینہ فرام : کالج کے رنگ کا۔

شرح : اسے گورنر، برگزیدہ نہیں کہ آپ سورج ہیں جس کی
منیا سے کالج کے رنگ کا آسمان میرا سے نور بنا ہوا ہے۔

۸۔ لغات : تفضلات : تفضل کی جمع، لطف و کرم۔

مرجع انام : لوگوں کے لیے جانے رجوع۔

شرح : میری گزارش بیٹھے اور آج آپ اس سرزمین پر خدا کے
لطف و کرم سے عام لوگوں کے لیے جانے رجوع ہیں، یعنی سب اپنی ضرورتوں کے
لیے آپ کے پاس آ رہے ہیں۔

۹۔ شرح : ادھیاتھ کے اخبار میں ایک ایسی تحریر میری نظر سے
گزری، جس سے مجھے بہت رنج پہنچا۔

۱۰۔ شرح : وہ تحریر دیکھ کر کھپا ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ شاید کھینے
وانے کی آستیں، آستیں نہ تھی، بلکہ تھوڑا کھیا تھا۔

مطلب یہ کہ کاتب نے آستیں میں غنیمت چھپا رکھا تھا، اس سے جگر پارہ
پارہ ہو گیا۔

۱۱۔ شرح : وہ ورق، جس میں نام تک میرا غلط لکھا ہے، جب
مجھے یاد آئی، لکھا تھا۔

۱۲۔ شرح : تمام حالات یکایک بالکل بدل گئے۔ میرا درجہ باقی رہا،
مذہب کا سلسلہ قائم رہ سکا، خدمت کا انتظام نظر آتا ہے۔

۱۳۔ شرح : ستر برس کی عمر ہو گئی اور یہ جان کو گھٹا دینے والا درخ
میرے سینے پر لگا، جس نے مجھے جلا کر بالکل داگہ کر دیا۔

۱۴۔ اب دربار کی کیفیتوں کی بیان کرتے ہیں :

لغات : خیم : خیمے کی جمع۔

شرح : جنوری ۱۸۹۹ء کی تیرہویں تاریخ تھی، جب میرا

کنارے خیسے کھڑے ہو گئے۔

۱۵۔ شرح : وہاں چشمن کی جو نقل آراستہ ہوئی، اس میں بھوسیا بہشت کو انتظام کے مطابق نشست کا درجہ نشیب میں ملا۔ یعنی میرا درجہ منصب کے مقابلے میں نیچے تھا۔

۱۶۔ لغات : گِراب : یہ انگریزی لفظ گرپ (Grave) کو فارسی اور اردو کا لباس پہنایا گیا ہے۔ مراد ہے توپ کا وہ گولا، جس میں پھڑے گویاں اور مال سمیر کر پڑتے ہیں۔ وہ پیشانی ہے تو شدید نقصان نہیں کرتا، لیکن نقصان کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔

چشمکِ عوام : عام لوگوں کے طنز پر اشارے۔
شرح : اپنے اصل درجے سے کم درجے میں نشست ملی تو میں نے سبھا کر بھنگرا ب پھینکا گیا۔ دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، کیونکہ وہ باریں لوگوں نے آنکھوں سے طنز پر اشارے شروع کر دیئے۔

۱۷۔ شرح : نامور لوگوں کی ہنسی کی بنیاد عزت ہے۔ جہاں عزت گئی، وہاں نہ ہنسنی رہی، نہ نام رہا۔

۱۸۔ شرح : مجھے شاعری میں درجہ کمال پر ایک مستحکم ناز تھا۔ اب آسمان نے مجھ سے اس ناز کا بدلہ لیا۔

۱۹۔ شرح : ریل کے افتتاح کا وقت بھی بہت قریب آ گیا تھا اور آپ کی خاص بارگاہ میں بے شمار خلقت جمع تھی۔

۲۰۔ شرح : اس کینچی تان میں آپ کا یہ درود مندرجہ نامور آقا سے کوئی بات نہ کر سکا۔

۲۱۔ لغات : فائز المرام : مقصد کو پہنچنے والا کامیاب۔
شرح : جو کچھ وہاں عرض نہ کر سکا، وہ اب حضور کو لکھ رہا ہوں
آپ داد رسی فرمائیں تاکہ میں مقصد پاؤں۔

۲۲- شرح : اگر میرے پاس ملک یا قلعہ نہیں تو ذرا سہی، اس سے کیا نقصان پہنچتا ہے؟ میں تو سمندر میں اور خشکیوں کے فرمانروا کے دروازے کا غلام ہوں۔

۲۳- لغات : وام : قرض
شرح : کون فرمانروا؟ وکٹوریا، وہ وکٹوریا کے زمانے میں اس کی تہذیب کرنے والا ہو، لازم ہے کہ وقت کے بادشاہ عزت اس سے اُدھار لیں۔ مطلب یہ کہ عزت اسی کے پاس ہوگی، شاہانِ مصر جو کچھ لیں گے، وہ اس سے اُدھار لیں گے۔

۲۴- لغات : تدارک : تلافی۔
شرح : حکومت کے لیے لازم ہے کہ کچھ پر جو زیادتی ہوتی ہے، اس کی تلافی کر دے۔ جس شخص کا نام غالب ہے، آخر وہ کیوں بے وجہ ذلیل ہو۔
۲۵- شرح : میں کسی نئی بات کے لیے سوال نہیں کر رہا، لیکن پہلے سے جو قاعدہ چلا آ رہا ہے، وہ تو قائم رہنا چاہیے۔

۲۶- لغات : اعادہ : لوٹانا، بحال کرنا۔
شرح : میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ میری عزت بحال کی جائے۔ حضور چاہیں تو یہ کام ہرگز مشکل نہیں۔

۲۷- شرح : فنِ شعر کا طریقہ چھپے سے یہی چلا آتا ہے کہ مدح کو دعا پر ختم کرتے ہیں۔

۲۸- شرح : لہذا میری یہ دعا ہے کہ جندار سندھ سے روم اور شام تک ملک آپ کے زیرِ نگیں رہیں۔

والی اور کی سالگرہ پر

تمہید :-

یہ قصیدہ مہاراجا شیروان سنگھ کی مدح میں اس کی سالگرہ کے موقع پر کہا گیا تھا۔

میرزا کے کلیات میں فارسی کا ایک قصیدہ بھی موجود ہے، سالگرہ واسے قصیدے سے

کچھ مدت پیشتر کہا گیا تھا۔ اس میں وہ اپنی عمر تریسٹھ سال بتاتے ہیں اور کہتے ہیں،

ابھی دن سال سے میں آپ کا صلہ بخش چلا آتا ہوں، کیونکہ

پانچ سال کی عمر میں آپ کا ملازم ہو گیا تھا۔

گنتی ہیں سال کے رشتے میں بیس بار گرہ ابھی حساب میں باقی ہیں، سو ہزار گرہ گرہ کی ہے یہی گنتی کہ تا بہ روز شمار ہوا کرے گی ہر اک سال، پیش کار گرہ یقین جان، برس گانٹھ کا جو ہے تا گا یہ کہکشاں ہے کہ ہیں اس میں بے شمار گرہ گرہ سے اور گرہ کی امید کیوں نہ پڑے کہ ہر گرہ کی گرہ میں ہیں تین چار گرہ دکھا کے رشتہ کسی ہوتشی سے پوچھا تھا کہ دیکھو کتنی اٹھا لائے گا یہ تار گرہ کہا کہ چرخ پہ ہم نے گنتی ہیں نو گرہیں جو یاں گنیں گے تو پاویں گے نو ہزار گرہ

خود آساں ہے ہمارا راؤ را جا پر صد تھے
 کرے گا سیکڑوں، اس تار پر نثار، گرہ
 وہ راؤ را جا بہادر کہ حکم سے جن کے
 ہواں ہوں تار پہ فی الفور دانہ وار، گرہ
 انہیں کی ساگرہ کے لیے ہے سال بہ سال
 کہ لائے غیب سے غنچوں کی نو بہار، گرہ
 انہیں کی ساگرہ کے لیے بناتا ہے
 ہوا میں بوند کو، ابر تگرگ بار، گرہ
 انہیں کی ساگرہ کی یہ شادمانی ہے
 کہ ہو گئے ہیں گہرے شاہوار، گرہ
 انہیں کی ساگرہ کے لیے ہے یہ توقیر
 کہ بن گئے ہیں ثمرے شاخسار، گرہ
 سن 'اے ندیم! برس گانٹھ کے یہ تاگے نے
 مجھے بتاؤں کہ کیوں کی ہے اختیار، گرہ
 چسپوے بقلے جناب فیض مآب
 لگے گی اس میں ثوابت کی، استوار، گرہ

ندیم کی لکشت گوہر میں دو جہانہ شمع
 ندیم کی لکشت شہید، میں بہ کار نثار
 دو سو سال دی شدہ ام پکار غنچہ
 دہم یہ گوشِ حلقہ نہ بچاؤ غنچہ نثار
 انہوں کو غرضت دہ سال است و شل
 لکٹی بود مشاہدہ شاہ قمرود نیست
 دو خاک دانہ کوہ بدام لارود و مزار

شیوران سنگھ کی
 بیوی سنگھ پرانڈو
 کا قصیدہ پیش کیا گیا تھا۔
 شیوران سنگھ کے والد
 رہا بیٹی سنگھ ۱۸۷۵ء
 میں مرے تھے اس
 وقت شیوران سنگھ کی
 عمر تیرہ برس کی تھی۔
 خیر ۱۸۷۵ء میں بیٹا کو
 پہنچا کر اختیار ہوئے۔
 غالباً اسی تقریب پر یہ
 قصیدہ پیش کیا گیا۔

ہزار فائدہ کی تسبیح چاہتا ہے یہی
 بلا مبالغہ درکار ہے ہزار گرہ
 عطا کیا ہے خدا نے یہ جاذبہ اس کو
 کہ چھوڑتا ہی نہیں، رشتہ از مینار گرہ
 کشادہ رخ و پھرے کیوں، جب اس زمانے میں
 بچے نہ اپنے بند نقاب یار، گرہ
 متاع عیش کا ہے قافلہ چلا آتا
 کہ جادہ رشتہ ہے اور ہے شتر قطار گرہ
 خدا نے دی ہے وہ غالب کو، دست گاہ سخن
 کر دڑا، ڈھونڈ کے لاتا ہے خاکسار، گرہ
 کہاں مجال سخن؟ سانس لے نہیں سکتا
 پڑی ہے، دل میں مرے غم کی پیچ دار گرہ
 گرہ کا نام لیا، پر نہ کر سکا کچھ بات
 زباں تک آئے، ہوئی اود استوار گرہ
 کھلے یہ گانٹھ تو البتہ دم نکل جاوے
 بری طرح سے ہوئی ہے گلے کا بار، گرہ

۱- شرح :
 سال کے رشتے میں
 میں گرہیں تو گنتی کئی
 ہیں، لیکن یہی حساب
 میں ایکہ کہ گرہیں باقی
 ہیں، گویا مدارج سے
 سو سو سال میں قدم
 رکھ لیا، ابھی وہ ایک
 لاکھ سال میں ہے۔

۲- شرح :
 سالگرہ کی گنتی اس طرح
 ہوتی ہے کہ قیامت /
 تک ہر سال کے شروع
 میں گرہ لگا کرے گی۔

۳- شرح :
 تو یقین کرے کہ سالگرہ
 کا جو دھاگر ہے، وہ
 دھاگر نہیں، کبکشان
 ہے اور اس میں پتھر
 گرہیں پڑی ہوئی ہیں۔

۴- شرح :
 ایک گرہ سے دوسری
 گرہوں کی امید کیوں

ادھر نہ ہوگی تو توجہ حضور کی جب تک
کبھی کسی سے کھلے گی نہ زمینہار، گرہ

نہ ہو، جب ہر گز کی
گانش میں تیں چاند گرہیں
موجود ہیں۔

دعا ہے یہ کہ مخالف کے دل میں از رہِ بغض

۵-۴- :

جو تیشی : جو تیش کا

علم جانے والا، بخوبی۔

پڑی ہے یہ جو بہت سخت نابکار گرہ

دل اس کا پھوٹ کے نکلے، بہ شکل پھوٹے کی

شرح :

ساگرہ کا رشتہ کسی بخوبی

کو دیکھا کر پوچھا تھا کو دیکھ

خدا کرے کہ کرے اس طرح آبشار گرہ

جلاؤ، یہ تار کتنی گرہیں اٹھا دے گا؟ اس نے جواب دیا کہ ہم نے آسمان پر لڑ کر ہیں گئی
ہیں۔ اگر زمین پر گئیں گے تو نو ہزار گرہیں پائیں گے۔

۷- شرح : خود آسمان مداراؤ راجا پر قربان ہو رہا ہے۔ وہ اس تار پر
سیکڑوں گرہیں تار کر دے گا۔

۸- شرح : میری مراد اس مداراؤ راجا سے ہے جس کے حکم سے دھلکے
پر دانوں کی طرح فی النور گرہیں چلنے لگیں۔

۹- شرح : وہی مداراؤ راجا بہادر ہیں، جن کی ساگرہ کے بیٹے فعل بہادر
ہر سال غیب سے کلیوں کی گرہیں لاتی ہے۔

۱۰- شرح : وہی مداراؤ راجا، جن کی ساگرہ کے بیٹے اوئے برسانے
والا بادل ہوا میں ہر لونڈ کو گرہ بنادے گا۔

۱۱- شرح : وہی مداراؤ راجا، جن کی ساگرہ کی خوشی میں اعلیٰ درجہ کے
موتی گرہیں بن گئے ہیں۔

۱۲- شرح : اُن کی ساگرہ کی ایسی عزت ہے کہ شایوں کے پھل گرہوں
کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔

۱۳-۱۴۔ لغات : ثوابت : ثابث کی جمع۔ وہ ستارے جن کے متعلق خیال تھا کہ گردش نہیں کرتے اور اپنی جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان کے مقابلے میں ستارے ہیں جو گردش کر رہے ہیں۔

شرح : اے دوست! تم بتاؤں کہ سالگرہ کے دھاگے نے گرہ کیوں اختیار کی؟ مقصد یہ تھا کہ اُس وجود کی زندگی کے بیٹے، جو فیض کا سرچشمہ ہے، دُعا مقصود ہے اور اس دھاگے میں دُعا کے بیٹے گردش نہ کرنے والے ستاروں کی پختہ گرہ لگ جائے گی۔

۱۵۔ شرح : وہ دھاگا اپنے لیے ہزار دانے کی تسبیح کا آمز و مند ہے اور مقصد یہ ہے کہ اس میں بلا مبالغہ ہزار گریں دھکا رہیں۔

۱۶۔ لغات : مجاذبہ : کشش کی قوت۔

شرح : خدا نے سالگرہ کے رشتے کو کشش کی وہ قوت عطا کی ہے کہ وہ گرہ کو اپنی طرف کھینچے لیے آتا ہے اور چھوڑتا ہی نہیں۔

۱۷۔ شرح : ہمارے زمانے میں محبوب کے بند و نقاب کے لیے بھی کوئی گرہ باقی نہیں رہی۔ پھر کیوں نہ وہ چہرہ کھولے پھرے؟

۱۸۔ شرح : سالگرہ کا جو دھاگا ہے، اسے راستہ فرض کریں اور گرہوں کو اونٹنوں کی قطار قرار دے لیں تو سمجھنا چاہیے کہ ایک تافہ عیش و نشاط کا مال متاع لیے آتا ہے۔

۱۹، ۲۰۔ شرح : اللہ تعالیٰ نے غالب کو شہر و سخن پر وہ قدرت عطا کی ہے کہ یہ خاکسار کردار گرہیں ڈھونڈ کر لاتا، مگر بات کہنے کی مجال ہی کہیں ہے؟ میں تو سانس بھی نہیں لے سکتا، کیونکہ میرے دل میں غم کی نہایت سیلاب پیدا کر چڑھ گئی ہے۔

۲۱۔ شرح : میں نے گرہ کا نام لیا، لیکن کوئی بات نہ کر سکا۔ زبان تک اگر گرہ اور بکلی ہو گئی

۲۲- شرح : اگر یہ گرہ کٹ جائے تو بلا شہر دم نکل جائے۔ آہ ! یہ گرہ بہت بڑی طرح کے کار ہو گئی ہے۔

۲۳- شرح : جب تک حضور کی توجہ اس طرف نہ ہو گی یہ گرہ کہیں کس سے کٹ نہ سکے گی۔

۲۴، ۲۵- شرح : دکھایا ہے کہ مخالفت کے دل میں بغض کی وجہ سے جو بہت ہی نابکار ملعون گرہ چڑ گئی ہے، خدا کرے، وہ گرہ ایسی ابھرے کہ اس کا دل پھوڑ کر پھوڑے کی طرح باہر نکل آئے۔

(۲)

تو اب یوسف علی خاں

مرحبا! سالِ فرخی آئیں عیدِ شوال و ماہِ فروریں

شبِ دروزہ افتخارِ ایل نہاد مہِ سالِ اشرفِ شہور و سنیں

گرچہ ہے بعدِ عید کے نوروز یکیش از سہ ہفتہ بعدِ سنیں

سوا اس آئیں دن میں ہولی کی بابجا مجلسیں ہر میں رنگیں

شہر میں کوہِ کوہِ جیر و گلزار باغ میں سو بہ شوگل و نسریں

شہر، گویا نمونہٴ گلزار باغ، گویا نگار خانہٴ چہیں

تین تہوار اور ایسے خوب جمع ہر گز ہوئے نہ ہونگے کہیں

پھر ہوئی ہے اسی جینے میں
 محفلِ غسلِ صحتِ نواب
 رزمگہ میں، امیر شاہِ نشاں
 جن کی مسند کا آسماں گوشہ
 جن کی دیوارِ قصر کے نیچے
 دہر میں اس طرح کی زرمِ سو
 انجمن چرخ، گوہرِ اگیں فرش
 راجا اندر کا ہوا کھاڑا ہے
 وہ نظر گاہِ اہلِ دہم و خیال
 داں کہاں یہ عطا و بدل و کرم
 ہاں زمین پر نظر جہاں تک چاہے
 نغمہِ مطربانِ زہرہ نوا
 اہل کھاڑے میں جو کہ بے غفلتوں
 سرورِ مہر فر ہوا جو سوار
 سب نے جانا کہ ہے پری تون
 نقشِ ستمِ سمندر سے، یکسر

منعقد محفلِ نشاطِ قریں
 رونق افزا کے مسندِ تمکین
 رزمگہ میں، حریفِ شیرِ کیں
 جن کی خاتم کا آفتابِ نگین
 آسماں ہے گدے سایہ نشین
 نہ ہوئی ہو کبھی بدو سے زمیں
 نور، مے، ماہ، ساغرِ سیہیں
 ہے وہ بالائے سطحِ چرخِ بریں
 یہ ضیا بخش چشمِ اہلِ یقین
 کہ جہاں گو یہ گر کا نام نہیں
 ڈالہ آسا، بچھے ہیں درِ شبن
 جلوۂ لولیانِ ماہِ جبیں
 یاں وہ دیکھا بہ چشمِ صورتِ میں
 بہ کمالِ تجل و تزیین
 اور بالِ پری ہے دامنِ زیریں
 بن گیا دشت، دامنِ گلچیں

فوج کی گردِ راہ، مشکِ فشاں رہبروں کے شامِ عطر آگئیں
 بسکہ بخشی ہے فوج کو عزت فوج کا ہر سیاہ ہے فرزیں
 موکشِ خاص یوں زمین پر تھا جس طرح ہے پہرہِ یزیدیں
 چھوڑ دیتا تھا گور کو بہرام ران پر داغِ تازہ دیکھے وہیں
 اور داغِ آپ کی غلامی کا خاص بہرام کا ہے زیبِ سیر
 بندہ پر دشا طرازی سے مدعا عرضِ فریقِ شعر نہیں
 آپ کی مدح اور میرِ اُمنہ گر کہوں بھی تو اُسے کس کو یقین
 اور پھر اب کہ منعفِ پیری سے ہو گیا ہوں نزا و ناز و جزیں
 پیری و مستی، خدا کی پناہ دستِ خالی و خاطرِ غمگین
 صرف اظہار ہے ارادت کا ہے قلم کی جو سجدہ ریز جبیں
 مدح گستر نہیں، دعا گو ہے غالب عاجز نیاز آگئیں

ہے دعا بھی یہی کہ دنیا میں
 تم رہو زندہ جاوواں! آئیں

تمہید :- نواب یوسف علی خاں دہلی رام پور بہت بیمار ہو گئے۔ بیماری
 دور ہوتی تو غسلِ ممات کی تقریب پر رام پور کے ”بارغِ بنظر“ میں جشن منایا گیا۔ یہ
 قصیدہ اسی موقع کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ غالب یہ رمضان ۱۲۸۱ھ (جنوری ۱۸۶۹ء)

میں کہا گیا تھا، کیونکہ بیش شوال میں منایا گیا اور عجیب بات یہ ہے کہ اس موقع پر چند روز کے تقدم و تاخر سے خوشی کی چار تقریریں جمع ہو گئیں، یعنی عید شوال، عید نوروز، ہولی اور عید چٹن۔ قصیدے میں ان کا ذکر موجود ہے۔

افسوس کہ چٹن صحت کے بعد تقریباً ایک مہینے کے اندر اندر نواب موصوف کا انتقال ہو گیا۔

۱۔ لغات : قرخی آئین : مبارک دستور کا، بابرکت۔

فروردین : پارسیوں کا پہلا مہینا، ہوا ایران میں بہار کا موسم ہوتا ہے۔

شرح : مرحبا، یہ سال کتنا بابرکت ہے ! شوال کی عید آگنی، بہار کا

مہینا ہے، جس میں نوروز کی عید ہوتی ہے۔

۲۔ لغات : شہور : شہر کی جمع، جیسے۔

سین : سڑکی جمع، سال۔

شرح : اس سال کے سات دن عام راتوں اور دنوں کے لیے باعث

فرز ہیں۔ یہ مہینا اور یہ برس تمام مہینوں اور برسوں سے برتر ہیں۔

۳۔ شرح : اگرچہ نوروز عید کے بعد آئے گا، لیکن اس کی آمد میں تین ہفتے سے زیادہ مدت نہیں لگے گی۔

۴۔ شرح : تین ہفتے یا کچھ دن کی اس مدت میں ہولی آئی اور اس کے لیے رنگیں مٹلیں ہا، بجا منقذ کی گئیں۔

۵۔ شرح : شہر کے کوچے کوچے میں میرو گلاب پھڑکے گئے۔ باغ میں ہر طرف گلاب اور سرسبز کے پھول نظر آ رہے ہیں۔

۶۔ شرح : شہر باغ کا خود ہی گیا۔ باغ پھل کا نگار غامض معلوم ہونے لگا۔

۷۔ شرح : یوں تین تیرا اور ایسے اچھے تیرا جمع ہو گئے۔ یہ کبھی جمع نہ ہوئے اور نہ کہیں جمع ہوں گے۔

۸۔ شرح : پھر اسی جیسے میں اس محل کا اہتمام ہوا، جو نشاط و شادمانی

سے بھری ہوئی تھی۔

۹- شرح : یعنی نواب کے فضلِ محنت کی فصل۔ وہ نواب، جو غزوہ قندار کی گدھی کے لیے رونق بڑھانے کا موجب ہے۔

۱۰- شرح : وہ نواب، جو بزم میں تشریف فرما ہو تو ایسا امیر ہے، جس کے پاس بادشاہ کا نشان ہو، یعنی جو بادشاہ جیسا ہو۔ وہ نواب، جو میدانِ جنگ کے اندر شیر کی طرح گھات میں یہ شیشے والا حرکت یعنی شیر دل حرکت ہے۔

۱۱- شرح : وہ نواب، جس کی مستِ آسمان کا ایک گوشہ ہے، یعنی آسمان کی طرح بلند ہے۔ وہ نواب، جس کی انگشتی میں سورج کا گینہ جڑا ہوا ہے

۱۲- شرح : وہ نواب، جس کے گل کی دیوار کے نیچے آسمان ایسا فیر ہے، جو سایہ میں آیتھا ہو۔

۱۳- شرح : زمانے میں غرضی اور شادمانی کی ایسی فصل کہیں روئے نہیں پر سہائی نہیں گئی۔

۱۴- شرح : تاروں بھرا آسمان موتیوں کا بڑا ڈھرش ہے۔ چاندنی شراب ہے اور چاند نقرئی پیار ہے۔

۱۵- لغات : اندر کا اکھاڑا : ہندوؤں کی دیو مالا کا ایک ہلکا جس کی فصل میں پریاں ناچتی تھیں۔

شرح : بیچک ماہاندر کا اکھاڑا مشہور ہے۔ لیکن وہ زمین پر نہیں آسمان کی بالائی سطح پر ہے۔ اس پر آن لوگوں کی نظریں پڑ سکتی ہیں، جو وہم و خیال میں مبتلا ہوں۔ اس کے برعکس نواب یوسف علی خاں بہادر کے فضلِ محنت پر جو بزمِ نشاط آرا ستہ ہوئی، وہ اہلِ یقین کی آنکھوں کے لیے روشنی کا سراپہ ہے۔

۱۸۱۷- لغات : گدیہ گر : بھکاری، مانگنے والا۔

دُرّ ثبین : بیش قیمت موتی۔

شرح : بھلا اندر کے اکھاڑے میں عطا، بخشش اور کرم کا کیا موقع،

جہاں بھکاری ہی نام کو بھی موجود نہیں۔ یہاں یہ کیفیت ہے کہ جہاں تک نظر جاتی ہے نہایت پیش رہا موقوف اولوں کی مانند زمین پر نیچے ہو گئے ہیں۔

۱۹-۲۰۔ لغات : ٹولیاں : ٹولی کی جمع۔ تلپے گانے والیاں
مظنون : گمان کیا گیا، خیالی۔

شرح : ہر طرف ایسے گوتوں کے غنوں سے فضا بھر رہی ہے ہونہرو کی طرح گاتے ہیں۔ ہر سمت اُن ناچنے گانے والیوں کے جلوے ہیں، جن کی پیشانیاں چاند سی ہیں۔ اندر کے اکھاڑے سے متعلق جو کچھ وہم و گمان میں آتا ہے، وہ ہونے نواب کی مثل ہیں آنکھوں سے دیکھا، جو ہر شے کو صرف ظاہری شکل و صورت میں دیکھ سکتی ہیں۔

۲۱-۲۲۔ لغات : میر فر : آفتاب جیسی شان و شکوہ والا۔
شرح : وہ آتا، جسے آفتاب جیسی شان و شکوہ حاصل ہے، جنت کے ساتھ خوب ہی ستور کر سوار تھا۔ سب نے سمجھ لیا کہ گھوڑا پر سی ہے اور زمین کا دامن پر سی کا بازو ہے۔

۲۲۔ لغات : سمند : باوامی رنگ کا گھوٹا، عام گھوڑے کے لیے بھی مستقل ہے۔

شرح : گھوڑے کے ٹھوں کے جو نشان بگتے گئے، اُن سے پورا میدان بھول چُھنے والے کا دامن بن گیا۔

اس شعر میں گھوڑے کے ٹھوں کے نقش کو بھولوں سے تشبیہ دی ہے جہاں جہاں نقش پڑے، بھول بگتے گئے اور اس کثرت سے بنے، جیسے بھول چُھنے والے کی بھولی میں کثرت سے جمع ہو جاتے ہیں۔

۲۳۔ لغات : مشام : توت شام کی بجگہ۔ دماغ۔

شرح : فوج کے چلنے سے جو گرد اُڑتی ہے، وہ مشک بھیڑتی ہے، یعنی اُس سے مشک کی خوشبو آتی ہے اور راستہ چلنے والوں کے دماغ عطر میں بگتے

پچھے ہاتے ہیں۔

۲۵۔ لغات : فرزین : وزیر۔ پیادہ اور فرزین شطرنج کے ہرے بھیڑی
شرح : فوج کو اتنا اونچا درجہ دے دیا کیلئے، گویا اسے وزیر کا منصب
حاصل ہے۔

۲۶۔ لغات : موکب : دھواں، جو کسی جڑے آدمی کی جھوٹ میں پھٹتے ہیں۔
شرح : نواب کی خاص سواری ٹنگی تو زمین پر وہی منظر پیش کر دیا، جو
آسمان پر پردہ شام سے پیدا کر دیتے ہیں۔

۲۷۔ لغات : گور : گورخ، ایک جانور، جس کا شکار کرتے ہیں۔
بہرام : مشہور ساسانی بادشاہ، جسے گورخ کے شکار کا آنا حقوق تھا کہ اس
کا لقب ہی بہرام گور پڑ گیا تھا۔ اس کا دستور یہ تھا کہ گورخ پکڑنا اور اس کی ران پر داغ
لگا کر چھوڑ دیتا۔

سُرمیں : پشت۔ پیٹھ۔

شرح : بہرام گور کا دستور تھا کہ گورخ کی ران پر تازہ داغ لگا کر چھوڑ
دیتا تاکہ پتہ چل جائے، یہ بہرام کا شکار ہو چکا ہے، لیکن اسے نواب کی جناب! آپ
کی غلامی کا داغ بہرام نے اپنی پیٹھ کے لیے زینت کا باعث سمجھ لیا ہے۔

۲۹۔ شرح : اسے فرمانبرداروں کے پرورش کرنے والے! میں نے جو
درجہ و نشانی کرائش کی، اس کا مقصد یہ نہیں کہ فنی شعر کا کمال پیش کروں۔

۳۰۔ شرح : آپ کی تعریف اور میرامنہ! اگر دعویٰ بھی کروں تو کسے دشمن
آئے گا! یعنی میرامنہ اس قابل نہیں کہ آپ کی تعریف کر سکے۔

۳۱۔ شرح : اور تعریف، کا قصد بھی کرتا تو اب بڑھاپے کے ضعف میں
کوئی سا مکان تھا، جب میں بالکل دہلا پڑا تھا، پریشان حال اور غمگین ہوں۔

۳۲۔ شرح : بڑھاپا اور کمال ضعف کہ مرنے کے قریب پہنچا ہوا ہوں، خوا
کی پناہ! اتنا غم ہے اور دل غم سے بھرا ہوا ہے

۲۳- شرح : کلم، جو زمین پر مجروح ہو رہا ہے، یہ صرف آپ سے عقیدت اور
براہوت کا اظہار کر رہا ہے۔

۲۴- شرح : غالب، جو عاجز اور نیاز مند ہے، مدح نہیں کہتا، صرف
دعا کر رہا ہے۔

۲۵- شرح : دعا بھی یہی ہے کہ آپ دنیا میں ہمیشہ زندہ رہیں، خدا
کرے ایسا ہی ہوا



ایلین براؤن

تمہید :-

یہ قصیدہ غالب نے

اپنے شاگرد شونواری

آرام کی فرمائش پر ۱۸۵۵ء

میں کہا تھا۔ آرام اگر

کے ایک ممتاز دانشمند

گھرانے کے چچا پرانا

تھے اور ان کے دادا

منشی بیس وصر غالب

سجے، خواہر غلام حسین

ذ سے خاص دوست

نوتوں میں سے

ملاؤ کشور و لشکر، پناہ شہر و سپاہ

جناب عالی ایلین براؤن والا جاہ

بلند رتبہ وہ حاکم، وہ سرفراز امیر

کہ باج تاج سے لیتا ہے جس کا طرف کلاہ

وہ محض رحمت و رافت کہ بہر اہل جہاں

نیابت دم عیسیٰ کرے ہے جس کی نگاہ

وہ عین عدل کہ دہشت سے جس کی پریش کی

بنے ہے شعلہ آتش، انیس پڑے گاہ

زمیں سے سودہ گوہراٹھے بجائے غبار
 جہاں ہوتو سنِ حشمت کا اس کے ہوللاں گاہ
 وہ مہرباں ہوتو انجسم کہیں؟ الہی شکر
 وہ خشکیاں ہوتو گردوں کہے خدا کی پناہ
 یہ اس کے عدل سے، امتداد کو ہے آمیزش
 کہ دشت و کوہ کے اطراف میں، بہر سرِ راہ
 ہنر بڑ بچے سے، لیتا ہے کام شانے کا
 کبھی جو ہوتی ہے الجھی ہوتی دمِ رواہ
 نہ آفتاب، ولے آفتاب کا ہم چشم
 نہ بادشاہ، ولے مرتبہ میں ہمسر شاہ
 خدا نے اس کو دیا ایک خوب و مرز ند
 ستارہ جیسے چمکتا جوا بہ پہلو سے ماہ
 زہے ستارہ روشن کہ جو اُسے دیکھے
 شعاع ہر دختاں ہو اس کا تار نگاہ
 خدا سے ہے یہ توقع کہ عہدِ طفلی میں
 بنے گا شرق سے تا غرب اس کا بازی گاہ

تھے۔ آرام نہ آگرو
 میں مفید غلات کس نام
 سے ایک مطیع قائم
 کرایا تھا اور اخبار بھی
 نکالتے تھے۔ اگر
 میونسپل کیش کے کٹوری
 بن گئے تھے۔ غالب
 کی کتاب موسیقی پہلی
 مرتبہ مطبع مفید غلات
 ہی میں چھپی تھی۔ یہ
 قصیدائیں براؤن نام
 ایک انگریز افسر کے
 بچے جو نے پر کیا تھا۔
 میرزا کے خط سے معلوم
 ہوتا ہے کہ یہ کیتس شعر
 رات بھر میں کر کر بھیج
 دیے گئے تھے۔

۱۔ لغات :

ملاذ : چاہے پناہ۔

شرح :

ملک اور شکر کا نام

اور شہر و سپاہ کی پناہ

کون، جناب عالی

جوان ہو کے کرے گایہ، وہ جہان سبانی
 کہ تابع اس کے ہوں روز و شب سپید و سپاہ
 کہے گی خلق اسے "داورِ سپہر شکوہ"
 لکھیں گے لوگ اسے "خسرو ستارہ سپاہ"
 عطا کرے گا خداوندِ کار ساز اسے
 روانِ روشن و خوش و دلِ آگاہ
 ملے گی اس کو وہ عقلِ نہفتہ داں کہ اسے
 پڑے نہ قطعِ خصومت میں احتیاج گواہ
 یہ ترکناز سے برہم کرے گا کشورِ روس
 یہ لے گا، بادشہ چیں سے چھین تخت و کلاہ
 سینِ عیسوی، اٹھارہ سو اور اٹھارون
 یہ چاہتے ہیں جہاں آفریں سے شام و بنگاہ
 یہ جتنے سیکڑے ہیں سب ہزار ہو جادیں
 و داز اس کی ہو عمر اس قدر، سخن کوتاہ
 امیدوارِ عنایات، "شیونارائن"
 کہ آپ کا ہے ملکِ خوار اور دولت خواہ

ایمن براؤن، جمن کا
 درجہ بہت اونچا ہے۔
 ۲۔ لغات :
 یاج : خراج -
 شرح :
 وہ بلند مرتبہ حاکم، وہ
 ممتاز امیر، جس کا گوشہ
 کوہِ تاج سے خراج
 وصول کرتا ہے۔
 ۳۔ لغات :
 رافت : مہربانی۔
 نیابت : قائم مقامی
 شرح :
 وہ امیر، جو سرِ امانت
 اور مہربانی ہے اور جس
 کی نگاہ اہل دنیا کے
 لیے دم عینی کی قائم مقام
 ہے۔
 ۴۔ لغات :
 پرہ کاہ : گھاس
 کاٹکا۔
 شرح :
 وہ سراپا عدل امیر

یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں عز و جاہ کے ساتھ جس کی پوجہ کچھ سے
ڈر کر ناگ کا شعلہ لگاس
تصہیں اور اس کو سلامت رکھے سدا اللہ کے تنکے کا رفیق بن

گیا ہے اور اس سے محبت کرنے لگا ہے۔ وہ دیکھتا رہتا ہے کہ کوئی کسی پر ظلم نہ
کرتے پائے۔ ہر ایک کو خوف ہے کہ کہیں پوجہ کچھ کی نوبت نہ آ جائے شعلہ لگاس
کے تنکے کو ایک ٹکے میں بھونڈا رہتا ہے، مگر این بڑا ڈن کی پکڑش کے خوف سے
شعلے نے یہ کام چھوڑ دیا اور تنکے سے محبت شروع کر دی۔

۵۔ لغات : سُودہ گوہر : مویوں کا سفوف۔

توسن حشمت : جاہ و حشم کا گھوڑا۔

مشریح : جہاں اس کے جاہ و حشم کا گھوڑا دوڑتا ہو، وہاں زمین سے
گرد و غبار کی جگہ موتیوں کا سفوف اُڑتا ہے۔

۶۔ شرح : وہ مہربان ہو جائے تو تارے کہیں! اشد تیرا شکر ہے۔

وہ غصے میں آ جائے تو آسمان پکار اٹھے : خدا کی پناہ، یعنی آسمان کو خدا کے سوا
کہیں پناہ نہ ہے۔

۸، ۷۔ لغات : اضداد : وہ چیزیں، جو ایک دوسری کی ضد ہوں،
ایک دوسرے کے دشمن۔

ہزبر : شیر ہزبر۔

شرح : این بڑا ڈن کے عدل کے باعث ایک دوسرے کے دشمن
بھی اس طرح مل گئے ہیں کہ جنگلوں اور پہاڑوں کے اطراف میں اور ہر راستے پر
لوٹری کی ٹوم ہیں، الجھاڑ پیدا ہو جائے تو ہزبر شیر اس الجھاڑ کو ڈور کرنے کے لیے
اپنے پنجے سے کنگھی کا کام لیتا ہے۔

۹۔ شرح : وہ سورج نہیں، لیکن اس کا ہم رعبہ ضرور ہے۔ وہ بادشاہ
نہیں، مگر درجے میں بادشاہ کے برابر ہے۔

۱۰۔ شرح : خدا نے اسے ایک خوب صورت بیٹا عطا کیا ہے۔ کو بیٹا ؛
جیسے پاندے کے بیٹوں ستارہ ہلک رہا ہو۔

۱۱۔ شرح : وہ ایسا روشن ستارہ ہے کہ جس کی بھی آنکھ اس پر پڑ جائے ،
اس کی نگاہ کا تاریک روشن سورج کی شمع بن جائے۔

۱۲۔ شرح : خدا سے امید ہے کہ لوگوں ہی میں مشرق سے مغرب تک
کی سرزمینیں اس کے پیسے کیل کا میدان بن جائیں گی۔

۱۳۔ شرح : جب وہ جہان ہو جائے گا تو دنیا کا انتظام اس طرح کرے گا
کہ سفید اور سیاہ کے دن اور رات اس کے فرمانبردار ہوں گے۔

روز و شب سپید و سیاہ کو ظہور و شمر قبہ سمجھا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ سفید
کے دن اور سیاہ کی راتیں اس کے تابع ہوں گی۔ اگر سپید و سیاہ کو جامعیت کے لیے
ایک شے مان لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ اس کے دن اور رات اس کے فرمانبردار
ہوں گے۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شب اور سپید کے درمیان اضافت
کے بجائے وا و عطف رکھی جائے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ دن اور رات
بھی اس کے تابع ہوں گے اور سفید و سیاہ بھی۔

۱۴۔ شرح : خلیق خدا کے گی کہ یہ ہمارا ایسا حاکم ہے جسے آسمان کی سب کچھ
حاصل ہے۔ ساتھ ہی لکھیں گے ، یہ ایسا بادشاہ ہے ، جس کے پاس ستاروں
جیسی سیاہ ہے۔

۱۵۔ شرح : کار ساز بارہی تعالیٰ اس بچے کو روشن روح ، اچھی طبیعت
اور حقیقتوں کو سمجھنے والا دل عطا کرے گا۔

۱۶۔ لغات : شہنشاہ دہان : پوشیدہ چیزوں کو جاننے والا۔
خصوصیت : جگڑا۔

شرح : اسے وہ پوشیدہ باتیں جاننے والی عقل نصیب ہوگی ، جسے
جگڑے کا فیصلہ کرنے کے لیے گواہیاں لینے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ چونکہ وہ

ہر لڑ شہید بات عقل سے جان لے گا۔ اس لیے گواہوں کے بغیر ہی صحیح فیصلے کرتا جائے گا۔

۱۷- شرح : یہ پھر جوان ہو کر ایسی یورش کرے گا کہ سلطنت روس کا نظام درہم برہم ہو جائے گا، نیز یہ چین کے بادشاہ سے تخت و تاج چھین لے گا۔
۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱- یہ سب رعایا دشمن ہیں۔

لغات : پگاہ : جمع ۔

شرح : ^{۱۸۵۸} مسلمانوں کے عیسوی سال جمع و شام اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ اس بچے کی عمر لمبی ہو، اتنی لمبی کہ ہمارے سیکڑے سب کے سب ہزار ہو جائیں۔ اسے ایلن براؤن صاحب! شونارٹن آپ کی غایت کا امیدوار ہے آپ کا شک کھاتا ہے اور دولت خواہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے اس کی آرزو یہ ہے کہ خدا ہمیشہ آپ کو اس بچے کو عزت سے رکھے اور بلند رتبہ عطا کرے !

قطعات

(۱)

نواب کلب علی خاں

ہند میں اہل تسنن کی ہیں دو سلطنتیں
 حیدر آباد دکن، رشک گلستانِ ارم
 رام پور، اہل نظر کی ہے نظر میں وہ شہر
 کہ جہاں بہشت بہشت آکے ہوئے ہیں باہم
 حیدر آباد بہت دور ہے اس ملک کے لوگ
 اس طرف کو نہیں جاتے ہیں، جو جاتے ہیں تو کم
 رام پور آج ہے وہ بقعہ محمود کہ ہے
 مرجع و مجمع اشرافِ نژادِ آدم
 رام پور ایک بڑا باغ ہے از روئے مثال
 و کش و تازہ و شاداب و وسیع و خرم

۱۔ شرح :
 ہندوستان میں اہل
 سنت کی دو سلطنتیں
 ہیں، ایک حیدر آباد
 دکن، جو باغ بہشت
 کے لیے باعثِ رشک
 ہے۔

۲۔ شرح :
 دوسری سلطنت
 رام پور کی ہے اور
 رام پور اہل نظر کی،
 نگاہوں میں وہ شہر
 ہے، جہاں آنکھوں
 بہشت آکر اکٹھے
 ہو گئے ہیں۔

جس طرح باغ میں سادن کی گشتائیں برسیں
 ہے اسی طور پہ یاں دجلہ نشاں دستِ کرم
 ابرِ دستِ کرم کلب علی خاں سے مدام
 قوتِ شہوار ہیں، جو گرتے ہیں قطرے پیہم
 صبح دم باغ میں آجائے جسے ہونہ یقین
 سبز و برگ گل و لالہ پہ دیکھے شبنم
 حبذا باغِ ہمایونِ تقدس آثار
 کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالانِ حرم
 مسکِ شرع کے ہیں راہِ در راہ شناس
 مختصر بھی یاں اگر آجائے تو لے ان کے قدم
 مدح کے بعد دعا چاہیے اور اہل سخن
 اس کو کرتے ہیں بہت بڑھکے باغراقِ قم
 حق سے کیا مانگیے ان کے لیے جب ہو موجود
 ملک و گنجینہ و خیل و سپہ و کوس و علم
 ہم نہ تبلیغ کے مانل، نہ غلو کے قائل
 دودعا میں ہیں کہ دیتے ہیں وہ ثواب کو ہم

۲۔ شرح :

حمید آباد بہت
 دور ہے شمالی ہند
 کے لوگ اس طرف
 نہیں جاتے اور جو
 جاتے ہیں، اچ کی تعلقہ
 کہ ہے۔

۳۔ لغات :

بقوتِ معیور :
 آباد گزرا۔

مرجع : مجمع
 کی جگہ۔

مجمع : جمع
 ہونے کی جگہ۔

نثر اور : نسل،
 اولاد۔

شرح :

آج رام پور وہ
 آباد خطہ ہے جہاں
 اولادِ آدم میں سے
 بڑے بڑے لوگ
 پہنچتے اور جمع ہوتے
 رہتے ہیں۔

۵۔ شرح : یا خدا! غالب عاصی کے خداوند کو دے
 رام پور کو ایک
 بڑا باغ سمجھ لیا،
 جائے تو وہ دلکش
 تروتازہ، شاداب
 بہت دینے ہے۔
 ثانیاً دولت دیدار شہنشاہ امم

اور اس پر ہر طرف شادمانی برس رہی ہے۔

۶۔ شرح : باغ میں جس طرح ساون کی گشائیں برستی ہیں، اسی
 طرح رام پور میں سخاوت کا قطرہ دریا بہلے جا رہا ہے۔
 ۷۔ شرح : نواب کلب علی خاں کے دست کرم کے بادل سے
 جو قطرے پے رہے کر رہے ہیں، وہ ایسے موتی ہیں، جو بادشاہوں
 کے لائق ہیں۔

۸۔ شرح : جسے اس بات کا یقین نہ ہو، وہ صبح کے قریب
 باغ میں آجائے اور سہرے، نیز لالہ گل کی پنکھڑیوں پہاوس کے قطرے
 دیکھ لے۔

۹۔ لغات : حبتا : واہ وا، مرہا۔

قدس آثار : پاکیزگی کے نشانوں والا، پاکیزہ۔

غزالان حرم : حرم پاک کے ہرن۔

شرح : واہ وا : وہ باغ ہمایوں، جو پاکیزگی کے نشانوں
 سے بھرا ہوا ہے اور جہاں حرم پاک کے ہرن چرنے کی غرض سے آتے ہوں۔

۱۰۔ لغات : قدم لینا : پاؤں چومنا، استقبال کرنا۔

شرح : نواب کلب علی خاں شریعت کے راستے پر چلتے
 ہیں اور راستہ پہنچتے ہیں۔ خضر بھی یہاں آجائیں تو نواب کے استقبال

کے لیے اُنھیں۔

۱۱۔ لغات : اغراق : بہت زیادہ ۔ مبالغہ۔

شرح : مدح میں جو کچھ گنا تھا۔ کچھ بچے، اب دعا کرنی چاہیے اور شاعر لوگ دعا پڑھا شاعر کھتے وقت بہت مبالغے سے کام لیتے ہیں۔

۱۲۔ شرح : خدے نواب صاحب کے لیے کیا مانگیں ؟ ان کے لیے تو ہر چیز پہلے ہی ہے موجود ہے۔ ملک ہے، خزانہ ہے، مصاحبوں کی جماعت ہے، لشکر ہے، نقارہ ہے، جھنڈا ہے۔

۱۳۔ لغات : تبلیغ : مبالغہ کرنا

غلو : مبالغہ کی ایک قسم، بہت زیادہ مبالغہ۔

شرح : ہمارے میاں مبالغے کی طرف نہیں اور ہم غلو کئے بھی

قائل نہیں۔ دودھائیں، جو ہم نواب کو دیتے ہیں۔

۱۴۔ شرح : لہذا کہتے ہیں کہ اسے خدا ! غائب گناہگار کے آقا کو دوا ایسی چیزیں عطا کر، جن کی طلب ساری دنیا کو ہے۔

۱۵۔ لغات : شہنشاہِ اُمم : اُمّتوں کا شہنشاہ مراد رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

شرح : اول انھیں طبعی عمر نصیب ہو اور اقبال ہمیشہ قائم رہے،

دوم خدا انھیں رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دیدار کی دولت عطا کرے۔

(۲)

ایضاً

تمہید :-

یہ قطعہ ۱۱ اراکت

۱۱۷۷ کے مکتوب

مقام شکر ہے اے ساکنانِ خطّہ خاک

رہا ہے نور سے ابرستارہ بار برس

کہاں ہے ساقی مہوش، کہاں ہے ابرِ مطیر
 بیار، لامے گلنار گوں، بیار، برس
 خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی
 درِ حضور پہ اسے ابر! بار بار برس
 ہر ایک قطرے کے ساتھ آئے جو ملک کہے
 امیرِ کلب علی خاں جین ہزار برس
 فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں
 کئی ہزار برس، بلکہ صد ہزار برس
 جناب قبلہ حاجات! اس بلا کش نے
 بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس
 شفا ہو آپ کو، غالب کو بندِ غم سے نجات
 خدا کرے کہ یہ ایسا ہو سازگار برس

میں نواب کلب
 علی خاں کے پاس
 بھیجا گیا تھا کہ توب
 میں میرزا نکلتے ہیں۔
 اگرچہ یہاں
 (دہلی میں) عینہ اس
 قدر برسا ہے کہ جس
 کے پانی سے زمیندار
 حاصل زمین سے ہاتھ
 دھو لیں، مگر چونکہ یہ
 فرمانِ انہی میرے
 رزق کی ہدایت آپ
 پر ہے اور آپ کے
 ملک میں بارشِ خوب
 ہوئی ہے، ابرِ رحمت
 کے شکریتے میں ایک
 قطعہ ملفوظ اس مہرِ حق
 کے بھیجتا ہوں۔“

۱۔ شرح : اسے خطہ و خاک کے دہنے والا! یعنی زمین پر بسنے والا
 شکر ادا کرنے کا موقع ہے کہ تبارے برسانے والا بادلِ خوبِ نور سے برس رہا ہے۔
 ۲۔ لغات : مطیر : برسنے والا۔

شرح : چاند جیسا ساقی کہاں ہے، جیسے کہا جائے، ”پیار“ (لا)؟
 گلنار سی شراب!۔ برسنے والا بادل کہ صر ہے، جیسے کہا جائے، ”پیار“، یعنی خوب برس؟

۳۔ شرح : اسے بادل : خدائے تجھے موتی برسانے کی غصہ صفت عطا کر دی ہے، لہذا حضور نواب کے دردِ دل سے پر بار بار پھینتا رہا اور موتی برساتا رہا۔

۴۔ شرح : بارش کی ہر قطرہ کے ساتھ جو فرشتہ آئے، اس کی زبان پر ہے اختیار یہ دعا ہمارے ہو جائے کہ تو آپ کلب علی خاں ہزار برس جیئیں !

اس شعر میں ہر قطرے کے ساتھ ایک فرشتہ آنے کا ذکر کیا گیا ہے، وہ تمام کے اس تصور پر مبنی ہے چونکہ بارش کا ہر قطرہ رحمت لاتا ہے، اس لیے خدا کی طرف سے ایک فرشتہ اس کے ساتھ زمین پر آتا ہے اور رحمت فرشتوں کے ذریعہ سے زمین پر آتی ہے۔

۵۔ شرح : پچھنے کی جو توجہ کی گئی ہے، وہ ہزار برس تک محدود نہیں، مطلب ہے، کئی ہزار برس بلکہ سو ہزار برس یعنی لاکھ برس جیئیں۔

۶۔ لغات : قبلہ حاجات : دوسروں کی ضرورتیں پوری کرنے والا۔ بلاکش : بلائیں بھیجنے اور مصیبتیں برداشت کرنے والا۔

شرح : اسے دوسروں کی ضرورتیں پوری کرنے والی بارگاہ کے مالک : اس بلائیں بھیجنے اور مصیبتیں برداشت کرنے والے یعنی غالب نے پانچ چار برس بڑے عذاب سے کاٹے ہیں اور بہت ڈکھا دکھائے ہیں۔

اس شعر میں میرزا غالب نے فسادِ خون اور احتراق کے اس مرض کا ذکر کیا ہے، جو ۱۸۵۲ء میں شروع ہوا اور تقریباً ۱۸۵۵ء تک جاری رہا۔ اس دور کے تمام مکاتیب میں اس مرض کا ذکر تفصیل سے موجود ہے اور ہر مکتوب الیہ کو شایہ درد کا انداز میں مصیبت کی داستان سناتے ہیں۔ وہ پوری تفصیل اس شعر کے ہیچاز اور تاثیر پر قیاس ہے۔ حق یہ ہے کہ جس شخص کو الفاظ کی معنویت اور پیش نظر مطلب کے عین مطابق تجربیت پر غالب کے برابر عبور حاصل نہ ہو، وہ ایسا شعر نہیں کہہ سکتا۔ ایسے اشعار، اشعار نہیں، ادبی مہر سے ہوتے ہیں اور غالب کے سوا ایسا ادبی مہر سے شاید ہی کہیں لی سکیں۔

۷۔ شرح : معلوم ہوتا ہے، نواب صاحب کی طبیعت میں ناسازمندی،
اس لیے انہیں دعا دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ شافی مطلق آپ کو شفا عطا کرے
اور غالب کو بندِ غم یعنی زندگی سے نجات دل جائے۔

غالب کے نزدیک بندِ غم اور زندگی ایک شے ہیں، جیسا کہ وہ کہتے ہیں:
قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں،
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

(۲)

۱۸۵۷ء

بسکہ فغاں مایرید ہے آج
ہر لشکر انگشتاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آبِ انساں کا
چوک جس کو کہیں، وہ قتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرہ ذرہ خاک
تشہِ غول ہے، ہر مسداں کا

تمہید :- ۱۸۵۷ء
میں دہلی کے اندر انگریزی
فوج کے ظلم و جور کا جو منظر
میرزا غالب نے دیکھا،
یہ اس کے تاثرات کا ایک
سرسری خاکہ ہے۔ صاف
معلوم ہوتا ہے کہ ان اشعار
کا لفظ لفظ غول، مگر میں
ڈوب کر نکلا ہے۔ یہ
علاء الدین احمد خان علائی
کے پاس ایک خط میں
بھیجا گیا تھا۔

کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک
 آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
 میں نے مانا کہ بل گئے، پھر کیا
 وہی رونا تن و دل و جاں کا
 گاہ بل کر کیا کیے شکوہ
 سوزِ داغ سے پنہاں کا
 گاہ رو کر کہا کیے باہم
 ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
 اس طرح کے وصال سے یارب
 کیا مٹے داغ دل سے جہاں کا

۱۔ لغات :

قتالِ مائید :
 سورۃ بروج کی ایک آیت
 ہے جس کا ترجمہ ہے : کہ
 گزرنے والا، بڑھ چکا،
 ہے۔

مستشور : استواستعال
 کرنے والا، سپاہی۔

شرح : آج
 انگلستان کے ہر سپاہی
 نے وہ حیثیت حاصل کر لی
 ہے کہ جو کچھ چاہتا ہے، کر
 گزرتا ہے۔

۲۔ شرح :

گھر سے بازار میں نکلتا اس
 سود پر مشکل ہو گیا ہے کہ باہر

نکلیں تو گرد و پیش کے مناظر دیکھ کر پتا پانی پانی ہوتا ہے۔

۳۔ لغات : چوک : اس سے مراد ہے چاندنی چوک، ہوشاہی
 کی دہلی کا بہترین بازار تھا اور تین صدی تک دنیا کے کسی شہر کا کوئی بازار اس کا مقابلہ
 نہیں کر سکتا تھا۔ دونوں طرف آنے جانے کی سڑکیں تھیں، درمیان مشرقی تھی،
 جس پر غروب صورت درخت لگے ہوئے تھے اور جا بجا پس نماں تھے۔

شرح : جسے چوک کہتے ہیں، وہ آج قتل گاہ بنا ہوا ہے اور گھرنے
 قید خانے کی صورت اختیار کر لی ہے۔

مطلب یہ کہ باہر نکلو تو پچاسی ملتی ہے، گھر میں بیٹھو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قید خانے کی کسی تاریک کوٹھڑی میں بند ہیں۔

۴۔ شرح : دہلی کی خاک کا ذرہ ذرہ ہر مسلمان کے غم کا پیرا سا ہے۔ فتح دہلی کے بعد انگریزوں نے وہاں جو کیفیت پیدا کر دی تھی، اس کا زیادہ سے زیادہ صحیح نقشہ یہی ہے۔

۵۔ شرح : کوئی فرو دہاں سے یہاں نہیں آ سکتا، اور کوئی فرو یہاں سے وہاں نہیں جاسکتا۔

مطلب یہ کہ دوستوں اور عزیزوں کے درمیان آمد و رفت بالکل بند ہے، بلکہ ڈر چاکر کو بھی باہر بھیجنے کا کوئی امکان نہیں۔

۶۔ شرح : مانا کہ دوست احباب کے لیے باہم ملاقات کا موقع پیدا ہو گیا، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ میں گئے تو جسم، دل اور جان کو رونے کے سوا کیا کریں گے؟

۷۔ شرح : کہیں جلی کر پینے کے چھپے ہوئے داغوں کی جلیں کا شکوہ ایک دوسرے سے کریں گے۔

۸۔ شرح : کبھی باہم رور و کراہک بار آنکھوں کا ناجرا ایک دوسرے سے کریں گے۔

۹۔ شرح : یا اللہ! اس طرح کے میل ملاپ کی کوئی صورت پیدا بھی ہو تو دل سے جہاد کا داغ کیونکر مٹے گا؟

مطلب یہ کہ وصال تو وہی مطلوب ہے، جب مٹنے والے مسرور و شادمان ہوں، باہم خوشی کی باتیں کریں۔ جب رونے اور دل کی جلیں کے شکوے کرنے کے سوا کوئی کام نہیں تو اس وصال کو فراق سے کس بنا پر بہتر قرار دے سکتے

تمہیں سید :- یہ قطعہ
غالباً لوہار دہانے سے
معدنہ سے بکے طود پر لکھا
گیا تھا۔

خوشی ہے یہ آنے کی برسات کے
پسین بادۂ تاب اور آم کھائیں

۱- شرح : برسات
کے آنے کی خوشی اس لیے
ہے کہ شراب پیئیں گے
اور آم کھائیں گے۔

سیر آغازِ موسم میں ، اندھے ہیں ہم
کہ دلی کو چھوڑیں ، لوہار کو جاہیں
سواناچ کے جو ہے مقلوب جاں

۲- شرح : کیا
ہم اندھے ہیں کہ اس موسم
کے عین آغاز پر دلی سے
نکلیں اور لوہار و چلے جائیں؟

نہ واں آم پائیں ، نہ انگور پائیں
ہوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں
ابھی جا کے پوچھو کہ کل کیا پکائیں

۳- شرح : ناچ
(ناچ) کے سوا، جو جان
کا لٹ ہے ، وہاں ہے
کیا ؟ بڑے آم ملتے ہیں نہ انگور

وہ کھٹے کہاں پائیں اِلی کے پھول
وہ کڑوے کر لیے کہاں سے منگائیں

۴- شرح :
باورچیوں کو حکم ہوا کرا بھی
پوچھو ، کل کیا پکائیں ؟

فقط گوشت سو بھیڑ کا ، ریشہ دار
کہو اس کو کیا کھا کے ہم حظ اٹھائیں

۵- شرح : اِلی کے کتھے پھول کہاں ہیں ؟ کوٹھے کیسے کس جگہ
سے منگائیں ؟

۶- شرح : بھیڑ کا گوشت موجود ہے ، جو ریشہ دار جڑنا ہے ۔ بتاؤ
کھا کر کیا لطف اٹھائیں ؟

(۵)

اس کتاب طرب نصاب نے جب

۱۔ لغات :

آب و تاب انطباع کی یائی

طرب نصاب :

فکر تاریخ سال میں مجھے کو

شرح :

ایک صورت نئی نظر آئی

جب اس کتاب نے جو خوشی اور نشاط کی سرایت

ہند سے پہلے سات سات کے دو

چھ چھپائی کی آب و تاب پائی۔

دیے ناگاہ مجھ کو دکھلائی

۲۔ شرح :

اور پھر ہندسہ تھا بارہ کا

تو مجھے چھپائی کے سال

باہزاراں ہزار زیبائی

کی تاریخ سوچنی پڑی اور اس کے لیے ایک نئی صورت

سال ہجری تو ہو گیا معلوم

ظہن میں آئی۔

بے شمول عبارت آرائی

۳۔ شرح :

مگر اب ذوق بذلہ سنجی کو

پہلے مجھے اچانک سات سات کے دو ہندسے دکھائی

ہے جداگانہ کار فرمائی

۴۔ شرح :

سات اور سات ہوتے ہیں چودہ

ان کے بعد بارہ کا ہندسہ

بہ امید سعادت افزائی

تھا جو عدد و ہر زیبا معلوم ہوتا تھا۔

۵- شرح :

یوں عبارت آرائی سے
کام لے بغیر تاریخ کا بھری
سال تو معلوم ہو گیا یعنی ۱۲۸۷ھ۔

۶- شرح :

لیکن لطیف گوئی کا ذوق آپ
نامک کارفرمائی پاتا ہے۔

۷- شرح :

وہ کہتا ہے کہ سات جمع

غرض اس سے ہیں چارہ معصوم
جس سے ہے چشمِ جاں کو زیبائی

اور بارہ امام ہیں بارہ

جس سے ایماں کو ہے توانائی

ان کو غالب یہ سال اچھا ہے

جو آئمتہ کے ہیں تُو لائی

ساحلِ چودہ ہوتے ہیں۔ اس جمع سے ساریت میں اضافہ ہونے کی امید ہے۔

۸- شرح : چودہ کے چودہ سے چودہ معصوم مراد ہیں۔ جن سے جان
کی آنکھ کو آرائش ملتی ہے۔

۹- شرح : اور بارہ کا ہندسہ بارہ اماموں کی طرف اشارہ ہے جن سے
ایمان قوی ہوتا ہے۔

۱۰- لغات : تُو لائی : محبت کرنے والا۔

شرح : اسے غالب ! یہ سال ان لوگوں کے لیے بہت اچھا ہے جنہیں
اماموں سے محبت کا دعویٰ ہے۔

(۷۱)

قطعہ تاریخ تکشف الحکمہ

تہجید :-

طلب کے شوق سے

کتاب حکیم سلیم خان صاحب

سلیم خاں کہ وہ ہے نورِ چشمِ واصلِ خاں

حکیمِ حاذق و دانایا ہے وہ لطیفِ کلام

حکیم، اصل خاں کی
تصنیف تھی، یہی کہ
میرزا نے قلمے میں
داخل کر دیا ہے۔

۱۔ شرح :
سلیم خاں واصل خاں
کافر مشتم ہے۔ وہ بڑا
ماہر اور دانشمند طیب
سچا و داس کی باتیں
بھی نہایت پُر لطف
ہوتی ہیں۔

۲۔ شرح :
زمانہ بھر میں اس کا
مطب مشہور ہے۔
لوگ علاج کے لیے
اسی کے ہاں جاتے
ہیں اور لقمان حکیم کا نام
بھی کسی کو یاد نہیں رہا۔
۳۔ مرقم۔ لغات :
مبدعِ عالم، دنیا
کا آغاز۔

تمام دہریہ اس کے مطب کا چرچا ہے
کسی کو یاد بھی لقمان کا نہیں ہے نام
اُسے فضائلِ علم و ہنر کی افشائش
ہوتی ہے مبدعِ عالم سے، اس قدر انعام
کہ سب سے علم میں، اطفالِ ابجدی اس کے
ہزار بار قلاطوں کو دے چکے الزام
عجیب نسخہ نادر لکھا ہے ایک اس نے
کہ جس میں حکمتِ طب ہی کے مسئلے میں تمام
نہیں کتاب ہے اک منبع نکات بدیع
نہیں کتاب ہے اک معدن جو اہر کام
کل اس کتاب کے سال تمام میں جو مجھے
کمالِ فکر میں دیکھا خرد نے بے آرام
کہا یہ جلد کہ تو اس میں سوچتا کیا ہے؟
"لکھا ہے نسخہ تحفہ"، یہی ہے سال تمام

اطفالِ ابجدی : ابجد پڑھنے والے بڑے۔

شرح : جب سے دنیا کا آغاز ہوا ہے، اُسے اللہ تعالیٰ نے غم ہیز

بڑھانے کی ایسی توفیق عطا فرمائی ہے کہ اس کے لہجہ لڑکے ایسی ابتدائی درس دیتے ہیں، وہ لاطنون کو کثرت میں ہزار مرتبہ پہنچاتے ہیں۔

۵۔ شرح : اس نے ایک عجیب نادر فن لکھا ہے جس میں اول سے آخر تک طلب کے تمام مسئلے بیان کر دیئے گئے ہیں۔

۶۔ لغات : منبع : سرچشمہ۔

نکات بدیع : نئے نئے نکات۔

معدن جواہر کام : گوہر بھری کان۔

شرح : یہ کتاب نہیں، بلکہ نئے نئے نادر نکاتوں کا سرچشمہ ہے۔ یہ کتاب

میں بدایک کان ہے جو گوہروں سے بھر پور ہے۔

۸۔ ۷۔ شرح : کل عقل نے مجھے اس کتاب کے پورا ہونے کی تاریخ

میرے سامنے مضطرب و متعذب پایا تو فرمایا کہ اس پر تحقیق کیا سوچتا ہے؟ لکھا ہے
”نہ تو فرما“، پس اسی سے اس کے پورا ہونے کا سال نکلا ہے۔

(۷)

۱۔ لغات : اٹھا اک دن گولسا جو کچھ میں جوش و خروش میں

آئیم سر :

پریشان حال۔

شرح :

ایک دن بیابان میں

گولسا اٹھا اور میں

وحشت کے جوش میں

پریشان حال تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ

بیابان میں پھرتے

پھرتے دل گہرا گیا

تھا۔

پھر آئیم سر گہرا گیا تھا جی بیابان سے

نظر آیا مجھے اک طائر مجروح پر تشنہ

ٹپکتا تھا سر شوریدہ دیوار گلستاں سے

کہا میں نے کہ او گنام، آخر ماجرا کیا ہے

پڑا ہے کام تجھ کو کس سنگر آفت جاں سے

ہنساکچھ کھلکھلا کر پہلے، پھر مجھ کو جو پہچانا

تو یہ رویا کہ جو سے خوں بھی پلکوں کے امال سے

۲- شرح : کہا میں صید ہوں اس کا کہ جس کے ذمہ گیہوں
 واپس آیا تو مجھے ایک
 پرندہ دکھائی دیا، جو
 زخمی تھا اور اس کے
 پتھر بندھے ہوئے تھے
 وہ باغ کی دیوار سے،
 دیوار کے وار سے شکستہ
 تھا۔

۳- شرح : کہ جل کر ہو گیا یوں خاک مری آہ سوزاں سے
 میں نے اس سے پوچھا کہ اوگنام پرندے! تھو پر کیا گزری! تجھے کس جہان بیوا سنگد
 سے کام پڑ گیا!

۴- شرح : میری بات سنتے ہی وہ پہلے تو کھٹکھٹا کر ہنسا۔ پھر مجھے
 پہچان لیا تو اتنا رونا کہ لگوں کے دامن سے خون کی ندی بہ نکلی۔

۵- شرح : مہر کہا : میں اُس ظلم کا شکار ہوں، جس کی زلفوں کے جال
 میں باغ رضواں (مہشت) کے پرندے آکر مہینا کرتے ہیں۔

۶- شرح : مجھے صبح و شام اُس کی زلفت اور چہرے کا تصور بندھا رہتا
 ہے، نہ مجھے کفر سے کوئی غرض اور نہ ایمان سے کچھ کام۔

۷- شرح : جب میں نے فزا تو جو سے دیکھا تو وہ میرا ہی طائرِ دل
 تھا، جو میری شعلوں بھری آہ سے جل کر دکھ ہو گیا تھا۔

(۸)

۱- شرح : کیا ان دنوں بسر ہو ساری فراخ میں
 آج کل جارہے ہیں
 کچھ تفرقہ رہا نہ دل و درو داغ میں
 فراغت، آرام اور

آسودگی سے زندگی
بیکھنے لگاں ہی سہی
ہو سکتی ہے بیکر دل
ورد اور دماغ میں جہانی
باقی ہیں نہیں رہی۔

انسان کا طبع

عاطراس وقت مائل ہو جاتا ہے۔ جب ورد شروع ہو جائے یا دل پر کوئی دماغ لگ جائے۔ جس حالت میں ورد و دماغ دل کے مستقل، رفیق ہو جائیں تو طبعانی سے دل گزارنا ممکن ہی نہیں رہتا۔

۲۔ شرح : حضرت موسیٰ جو جلوہ شوق کی آنکھوں سے کوہ طور پر دیکھنے کے آرزو مند تھے۔ وہ پچیس روزانہ ہر چراغ میں نظر آتا ہے۔
۳۔ لغات : مکنت : قدرت، طاقت، توانائی۔

وقار : اصل لفظ بہا متع ہے یعنی وقار لیکن فارسی ولے خدا جانتے کیوں باکسر ہونے لگے (وقار) یہ معنی علم و تسکین، بعض اوقات جاہ و جلال کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔
وحشت : کئی معنی ہیں۔ مثلاً لغزت، گہراہٹ، بے ہمتی، آوازی، اُڑنے سے طور اختیار کرنا۔ میرانیوس حرکتوں کا صادر ہونا۔ غلائی سے مراد نواب علی احمد خان، امیر خان، امین الدین احمد خان، ولی نواب بدین، جو میرزا کے عزیز بھی تھے یعنی خدایہ گیم علی گدو اللہ کی پچھری بھی تھی غلائی کے والد امیر بخش خان اور بیگم غلاب کے والد امیر بخش خان تھے بھائی تھے۔ غلائی زیادہ تر مولود ہیں، دہشتے تھے ان میں اور میرزا غالب میں چیمبر چھاڑ اور لطیف بازی کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ غلائی نے خط لکھنے میں دیر کی۔ چپ چاپ اپنے کام میں مصروف رہے۔ لہذا میرزا نے یہ قطع انہیں لکھا جس کے آخری شعر کا مطلب یہ ہے کہ جسے آرام اور آسودگی سے بیٹھے ہو۔ امیر سیدھی حرکتیں کر رہے ہو۔ یعنی تم سے دماغ میں شورش ہے۔

(۹)

۱۔ لغات : مجلس شمع عذراں میں سجا آجاتا ہوں
 شمع عذراں : شمع
 جیسے رخساروں والا کیوکر
 غامسی میں عذراں پر مسن
 رخسار ہے ۔ مطلب
 ہے روشنی چہرے والے
 یعنی محبوب ۔ مسیون۔

شرح :
 میں جیب میں ہوں جس گزرگاہ میں، میں آبلہ پا جاتا ہوں
 اور معشوقوں کی مجلس میں آجاتا ہوں تو شمع کی طرح دامن مہیا کی اوٹ جا پھرتا ہے۔
 کاہرہ ہے کہ شمع کو ہوا کے جوتکے سے پکانے دیکھنے کے لیے۔ بے کر نکلتے ہیں
 قہارے دامن سے ڈھانک پیتے ہیں۔

۲۔ لغات : سرگراں : اٹول / رنجیدہ۔
 سبک زد : تیز پلٹنے والا۔

شرح : مجھ سے تیز رو کے نہ پہننے سے طول و رنجیدہ نہ ہو۔ میں تو اتنی چیز
 سے جاتا ہوں جیسے ہوں کے چلنے سے اٹھ جاتی ہے

۳۔ شرح : میرے پاؤں میں پھاٹے ہیں۔ میں جس گزرگاہ میں قدم رکھتا ہوں ہر
 قدم پر راستہ وہی شکل اختیار کر لیتا ہے جو موتیوں میں دھماکے کی ہوتی ہے۔ راستے کو رشتے
 اور پیمانوں کو موتیوں کے تشبیہ دی ہے۔

(۱۰)

۱۔ لغات :
 تاک جھانک : دوزخ
 پیری میں بھی کمی نہ ہوئی تاک جھانک کی
 لوزن کی طرح دید کا آزار رہ گیا
 نظروں سے دیکھنا

وہ مرغ ہے خزاں کی صخبوت سے بے خبر
کیندہ سال تک جو گرفتار رہ گیا
میں اچھپوں سے تھا
کنا۔ گوشہ چشم سے نظر
ڈالنا۔ اسے جھانکنا

بھی کہتے ہیں۔ مطلب ہے حسینوں کو دیکھنا۔

دورانی : روشنی دان۔ جو مکانوں میں بندھی پر روشنی کی عرض سے دکھائی دیتی ہے
شرح : بڑھاپے میں بھی تاک جھانک کی عادت نہ گئی۔ گویا نظارہ ہادی ایک
روگ ہے۔ ایک پکا ہے جو ساتھ ساتھ پھلا جا رہا ہے اور بڑھاپے میں بھی اس کے اندر
کئی مٹیں آئی۔ جس طرح مکانوں کی دیواروں میں بندھی پر روشنی دان ہوتے ہیں۔ وہی حالت
نظارہ ہادی کے اس اندر کی ہے۔ یہ ختم نہیں ہوتا۔

۲۔ لغات : صوبیت : دشواری، وقت، مصیبت۔

شرح : جو پرندہ موسم بہار میں پکڑا گیا اور آئندہ سال تک قفس میں پڑا رہا۔

اسے کیا خبر جو کہتی ہے کہ موسم خزاں میں کیا کیا مصیبتیں اور مشکلیں آتی ہیں ؟ وہ مصیبتوں کا اندازہ
تو اسی کو ہو سکتا ہے جو پت جوڑ کے موسم کا رخ کے اندر رہا ہو اور اس نے پریشانیوں دیکھی ہوں
دکھ سے ہوں۔ قفس کے گوشے میں بیٹھے ہوئے پرندے کے لیے بہار و خزاں کی کیفیت
کیساں ہے۔

(۱۱)

۱۔ شرح :
سکڑا ہٹ کی بجلی چمکی یعنی
محبوب مسکایا یکینیت
دیکھتے ہی دل بے قرار
ہو گیا۔ آنکھیں جم عشق
میں پہلے ہی مد رہی تھیں

دیکھو۔ برق تبسم، بسکہ دل بیتاب ہے
دیدہ گریاں مرا فوارۂ سیما ہے
کھول کر دروازہ میخانے کا بولا میفروش
اب شکست تو بر میخواروں کو فتح الباب ہے

اب وہ پار سے کا فوارہ ہی گئیں۔ یعنی ایسا فوارہ جس سے پانی کے بجائے پارہ اچھل اچھل

کر باہر آ رہا ہو۔ یہ دل کی بچہ تابی کا کرشمہ ہے۔ جس کی وجہ سے آنکھوں سے پینے والا پانی سیلاب بن گیا۔

۲۔ لغات : فتح البلب : دروازے کا کھٹنا۔

بشرح : شراب پیچنے والے نے شراب خانے کا دروازہ کھٹا اور پکار کر کہا کہ اب شراب نوشوں کے لیے موقع ہے کہ توبہ توڑ ڈالیں۔ چلے آئیں اور اپنا شوق پورا کریں۔ شراب خانے کا دروازہ کھٹا ان کے لیے باب مراد کا کھٹنا ہے۔

(۱۲)

۱۔ شرح : اک آہ گرم کی تو ہزاروں کے گھر جلے
 جہاں بھر عشق کی آگ
 میں بن چکا ہے۔ حالت
 یہ ہے کہ ہم ایک گرم
 آہ کو دیں تو ہزاروں
 گھروں میں آگ بھڑک
 اٹھے اور سب کچھ جل جائے۔

۲۔ شرح : اسد، میرزا غالب کا ابتدائی قصص، جسے بعد میں کہیں کہیں استعمال کرتے رہے۔

اسد اسد شمع شام سے بیچ تک ہر وقت جلتی ہے۔ جس میں معلوم ہے اس کا سبب کیا ہے؟ یہ پروانے کے غم کا اثر ہے۔ گر ایسا نہ ہوتا تو اس بیچاری کو کیا پڑی تھی کہ ہر وقت جاتا ہے بیچ تک بل بل کر گھسی رہتی۔

(۱۳)

۱۔ شرح : گورنگانویں کی ہے جتنی رحمت وہ یک قلم
 پیار سے لال آشوب
 عاشق ہے اپنے مالکِ عادل کے نام کی
 میرزا غالب کے عزیز

ننگر و ننگے ہاتھوں نے

پہننے والی کالج میں تعلیم

پائی تھی۔ پھر ملکہ تعلیم

میں ملازمت اختیار کر لی۔ بلند عہدے پر پہنچے اور اس کے بہادر کا خطاب پایا جس سے میں پیش لی۔

متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ مثلاً رسوم ہند، قصص ہند، قصا دل و حوم۔ وغیرہ۔ لالہ سرس رام مصنف غلام بہادر، اس کے بہادر موصوف کے بھتیجے تھے۔

پیارے لالہ کچھ دست گوڑ گاؤں کے سکول میں ہیڈ ماسٹر رہے۔ وہاں مشرکوں کا مشت کھڑ تھے ان کا تہالہ ہوا تو اہل گوڑ گاؤں نے چاندی کا ایک ٹھکانہ بطور یادگار ان کی خدمت میں پیش کرنے کا انتظام کیا۔ اس پر ایک موزوں شعر کہہ کر انا منظور تھا۔ اس غرض سے پیارے لالہ اپنے خلیفہ دوست کے ہمراہ میرزا غالب کی خدمت میں پہنچے۔ دعا بیان کیا۔ میرزا نے مزید فرمایا قطعہ ان کے حوالے کر دیا۔ اسی وقت سے میرزا کے ساتھ آغوش کے تعلق کی ابتدا ہوئی پھر والد بہت بڑھ گئے۔

- ۱۔ شرح : گوڑ گاؤں کی بہن رعایا ہے وہ پوری کی پوری اپنے عمل دوست اور مصنف مزاج حاکم کے نام کی عاشق ہے۔ حکم سے مراد مشرکوں کی ہیں۔
- ۲۔ شرح : اس محبت کی یادگار کے طور پر رعایا۔ یہ نظموں کو روشن کرنے والا ٹھکانہ مشرکوں کی نذر کر رہی ہے۔ جی کا مقام بلند ہے۔

(۱۳)

ہم نشین تارے ہیں اور چاند شہاب الدین خان

بزم شادی ہے فلک، کاکشاں ہے سہرا

ان کو لڑیاں نہ کہو، بحر کی موجیں سمجھو

ہے تو کشتی میں، ولے بحرِ رواں ہے سہرا

۱۔ شرح :

شہاب العرج خان چاند

ہے اور اس کے دوست

احباب تارے ہیں۔

آسمان کو شادی سمجھو

سمجھیں تو کاکشاں کو

سہرا قرار دے لیتا نہیلا ہے

نظارہ ہے کہ یہ سہرا شہاب الدین احمد ملّاں، ناٹک میں لکھا گیا ہے، احمد ملّاں قیصر کی شادی پر کہا گیا تھا اور اس کے صرف دو شعر نہ ہوں گے، لیکن باقی شعر مل نہ سکے۔

۲- مخرج : سہرے کی لڑیوں کو لڑیاں نہ کہو، یہ مسند کی لہریں ہیں۔ مگر یہ سہرا کشتی میں لگا کر لٹائے ہیں۔ لیکن خود سہرا لہریں لیتا ہوا مسند پر ہے۔

۱- لغات :

چرخ تک دھوم ہے کس دھوم سے آیا سہرا
داڑھہ بالظنی کی نم ہو۔
چاند کا داڑھہ لے، زہرہ نے گایا سہرا
ایک سار، جن کی ایک
رشک سے لڑتی ہیں آپس میں الجھ کر لڑیاں
عرف منہ می ہوئی اور
دوسری کھل ہوئی ہے۔

شرح :
سہرا اس دھوم سے آیا کہ آسان تک دھوم مچ گئی۔ زہرہ نے چاند کی ڈنکی ہاتھ میں لے کر سہرا لگانا شروع کر دیا۔

۲- مخرج : جب سہرا سر پہ باندھنے کے لیے اٹھایا تو اس کی لڑیاں رشک کے باعث باہم الجھ کر لڑنے لگیں۔

(۱۵)

۱-۲- شرح :
ایک اہل درد نے سنان جو دیکھا قفس
ایک دودھ مند نے
یوں کہا : آتی نہیں کیوں اب صدائے عذیب
چنجرے کو سنان دیکھا
بال و پر دو چار دکھلا کر کہا صیاد نے
تو کہا کہ بیل کی آواز
یہ نشان رہ گئی ہے اب بجائے عذیب
کیوں نہیں آتی ؟
جواب میں صیاد نے
دو چار پڑ اٹھا کر دیکھا دیکھا اور کہا : بیل کی جگہ اس کی یہ نشان باقی رہ گئی ہے۔

تہذیب :-

(۱۴)

مسند حضرت ذیل دو قطعے
۱۔ جولائی ۱۹۷۷ء کے
مکتوب میں سیف الحق
میاں داد غلام سیاح کو
لکھے گئے تھے سیاح
نے غالباً میر غلام بابا
رغیس سوانہ کی شادی

جب کہ سید غلام بابا نے
مسند عیش پر جگہ پائی
ایسی رونق ہوئی برات کی رات
کہ کو اکب ہوئے تماشا شافی
(۱۴)

کی تعریف پر تادیب کی
فرمانکش کی تھی۔ میرزا
فرماتے ہیں : میں نے
تاریخ گوئی و متاعے
بیگناہ محض ہوں جناب
سے میرا بیگناہ ہے
اور مجھ کو جوڑ لگاتا نہیں آتا۔ سیاح نے لکھا تھا کہ سید غلام بابا کسی کسر میں جنہیں آنا فرماتے

ہزار شکر کہ سید غلام بابا نے
فراز مسند عیش و طرب جگہ پائی
زمین پر ایسا تماشا ہوا برات کی رات
کہ آسمان پر کو اکب بنے تماشا شافی
اور مجھ کو جوڑ لگاتا نہیں آتا۔

ہیں، کیوں نہیں آتا۔ اور یہ دو قطعے لکھ بھیجے۔

۲-۱۔ لغات : کو اکب : کوکب کی جمع، تارے۔

شرح : جب سید غلام بابا عیش کی مسند پر تعریف فرما ہوئے تو برات کی رات
اتنی رونق ہوئی کہ آسمان پر تارے بھی اس رونق کو لگاؤ شوق سے دیکھنے لگے۔

۲-۱۔ شرح : ہزار شکر کا مقام ہے کہ سید غلام بابا عیش و طرب کی مسند پر تعریف
فرما ہوئے۔ برات کی رات زمین پر ایسی محفل لطیف آراستہ ہوئی کہ آسمان پر تارے بھی شوق
کی نگاہوں سے نظارے میں مصروف ہو گئے۔

خمسہ بر غزل ابو ظفر بہادر شاہ

تمہید :-
خمس بہادر شاہ غفر
کی غزل پر کہا گیا ۔ اور
یقیناً بادشاہ کی فرمائش
کا نتیجہ بھی ہو گا ۔

۱۔ شرح :-
میرے پیرتے پیرتے
پاؤں کی زنجیریں گھس
گھس کر آدھی رہ گئی ۔ ہم
گئے ۔ لیکن قبر کی تعمیر
پوری نہ کی ۔ آدھی ہی
رہ گئی ۔ کاش میں تکمیل
پوری کی پوری پڑھتا ،
گرچہ میں ہی جھوٹی
پڑھی ۔ اسے قاتل !
جب تیری تلوار کچ کر
آدھی رہ گئی ۔ تو نتیجہ
ہوا کہ غلیں عاشق کی ہاں
میں غم کے باعث آدھی
رہ گئی ۔

گھتے گھتے پاؤں میں زنجیر آدھی رہ گئی
مرگئے پر قبر میں تعمیر آدھی رہ گئی
سب ہی پڑھتا ، کاش ! کیوں تکمیل آدھی رہ گئی ۔
لکھنچ کے قاتل ! جب تری شمشیر آدھی رہ گئی
غم سے جان عاشق دلیگیر آدھی رہ گئی ۔
بیٹھ رہتا لے کے چشم پر غم اُس کے روبرو
کیوں کہا تو نے کہ کہہ دل کا غم اُس کے روبرو
بات کرنے میں نکلتا ہے دم اس کے روبرو
”کہہ کے ساری حقیقت کب ہم اس کے روبرو
ہم نشیں ! آدھی ہوئی تقریر ، آدھی رہ گئی ۔“
تو نے دیکھا ، مجھ پہ کیسی بن گئی اسے راز دار
خواب و بیداری پر کب ہے آدمی کو اختیار

مثلاً زخم آنکھوں کو سی دیتا، سو جوتا ہو شیار
 ”کھینچتا تھارات کو میں خواب میں، تصویر بایر
 جاگ اٹھا، جو کھینچنی تصویر آدھی رہ گئی۔“
 غم نے جب گھیرا تو چاہم نے یوں اے دلفناز
 مستی چشم سید سے چل کے ہوویں چارہ ساز
 تو صد اے پاسے جاگا تھا جو محو خواب ناز
 ”دیکھتے ہی اے سنگر! تیری چشم نیم باز
 کی تھی پوری ہم نے جو تدبیر آدھی رہ گئی۔“
 اس بہت مغرور کو کیا ہو کسی پر التفات
 جس کے حسن روز افزوں کی یہ ایک لائقِ سببات
 ماہ نو لکے پگڑی ہوں گی راتیں پان سات
 ”اس رخ روشن کے آگے ماہ یک ہفتہ کی رات
 تابشِ خود شید پر تنویر، آدھی رہ گئی۔“
 تا مجھے پہنچائے کابش، بخت بد ہے گھات میں
 ہاں فراوانی اگر کچھ ہے تو ہے آفات میں

۲۔ شرح

کاش میں اپنی پر غم
 آنکھیں لے کر محبوب
 کے سامنے بیٹھ رہتا
 اور منہ سے کچھ نہ کہتا
 اسے جھٹیل، تو نے
 کیوں یہ مشورہ دیا کہ
 دل کا غم اس کے دہرو
 بیان کرو سے حالت
 یہ ہے کہ اس کے سامنے
 بات کرنے میں جان
 نکلتی ہے۔ بھلا ہم
 کب پوری حقیقت
 اس سے کر سکے؟
 ہماری کیفیت نصف
 بیان ہوئی تھی نصف
 باقی رہ گئی۔

۳۔ شرح :

اسے رازدار، تو نے
 دیکھا کہ مجھ پر کیا ہوا
 گئی؟ بھلا سو فائدہ
 جاننے پر آدمی کو اختیار
 کب ہے؟ اگر میں

جز غم داغ و الم گھٹاتا ہے ہر اک بات میں
 ”کم نصیبی اس کو کہتے ہیں کہ میرے بات میں
 آتے ہی خاصیت اکسیر، آدمی رہ گئی“
 سب سے یہ گوشہ کنار ہے، گلے لگ جاوے
 آدمی کو کیوں پکارے ہے، گلے لگ جاوے
 سر سے گر چا در آتا رہے ہے، گلے لگ جاوے
 ”مانگ کیا بیٹا سنو ارے ہے، گلے لگ جاوے
 وصل کی شب اے بت بے پیر آدمی رہ گئی“

میں یہ کیا جانوں کہ وہ کس واسطے ہوں پھر گئے
 پر نصیب اپنا انھیں جاتے سنا، جوں پھر گئے
 دیکھنا قسمت، وہ آئے اور پھر یوں پھر گئے
 ”آکے آدمی دُور میرے گھر سے وہ کیوں پھر گئے
 کیا کشش میں دل کی اب تاثیر، آدمی رہ گئی“
 ناگہاں یاد آگئی ہے مجھ کو یارب کب کی بات
 کچھ نہیں کہتا کسی سے، سن رہا ہوں سب کی بات

اپنے آپ میں جوتا
 تو آنکھوں کو دُغم قرار
 دے کر ہی ڈھٹا تاکہ
 وہ کہیں نہ نکلتیں، اب
 مصیبت یہ پیش آئی
 کہ میں رات سوتے میں
 محبوب کی تصویر کھینچ
 رہا تھا۔ آدمی کبھی حتی
 کر یکایک آنکھ کھل گئی
 اور آدمی باقی رہ گئی۔
 ہم - شرح :
 اسے دلنواز محبوب !
 جب غم نے ہمیں ،
 چاروں طرف سے گھیر
 لیا تو دل میں خیال پیدا
 ہوا یہی چشم سیاہ کی مستی
 سے غم کا علاج کریں۔
 ہم ہرے قریب پہنچے
 تو پاؤں کی آہٹ پا کر
 تو خواب ناز سے جاگ

اظہار - اسے عالمِ حیرت کدھی
 کھلی آنکھیں دیکھتے ہیں
 ہماری سوچیں بھی بڑی

عمر بزرگم پر ہم ہر دم ہو گئی۔
 پوری عمر ہو سکی، آدمی
 میں رہ گئی، مگر باہر
 ہے تیرا وہی لکھو کلاس
 کا تہہ خیز ہونا۔ پورا جو
 پر موت غم۔

۵۔ شرح :
 ہمارا مفرد محبوب کسی
 پر کب اتفاق کر سکتا
 ہے، جس کے حسن کا
 ہر روز بڑھے ہمارا مہمل
 بات ہے۔ نئے چاند کو
 لکھ پان سات، دانیس
 گزری جوں گی۔ ایک
 جتنے کے چاند کی رات
 ہمارے محبوب کا رنج
 روشن نمایاں ہوا تو اس
 کے سامنے پُر نور سوچ
 کی چمک ایک بھی ماند
 پڑ کر آدمی رہ گئی۔

کس لیے تجھ سے چھپاؤں؟ ہاں وہ پرسوں شب کی بات
 "نامہ بر جلدی میں تیری، وہ جو تھی مطلب کی بات
 خط میں آدمی ہو سکی تحریر، آدمی رہ گئی،"

ہو تھلی برق کی صورت میں، یہ بھی ہے غضب
 پانچ چھ گھنٹے تو ہوتی فرصت عیش و طرب
 شام سے آتے تو کیا اچھی گزرتی رات سب
 "پاس میرے وہ جو آئے بھی تو بعد از نصف شب
 نکلی آدمی حسرت لے تقدیر، آدمی رہ گئی،"

تم جو فرماتے ہو دیکھ اسے غالب آشفتمر
 ہم نہ تجھ کو منع کرتے تھے، کیا کیوں اس کے گھر
 جان کی پاؤں اماں، باتیں یہ سب سچ ہیں، مگر
 "دل نے کی ساری خرابی، لے گیا مجھ کو، ظفر!
 واں کے جانے میں مری تو قیر، آدمی رہ گئی،"
 ۶۔ لغات : کابش : گٹاؤ، لاغری، کمزوری۔

شرح : بد نصیبی گمات میں بیٹھ ہے۔ ہا ہا جی ہے کہ بے کمزور کرے اور
 نقصان پہنچائے۔ میرے لیے کثرت و فراوانی ہے تو آفتوں میں ہے۔ یعنی آفتیں مجھ

پر بہت زیادہ نازل ہوتی ہیں۔ رنج، غم اور الم ہی کی زیادتی ہے۔ ان کے سوا ہر بات میں کمی ہے۔ کم نصیبی اسی کو کہتے ہیں کہ اکیر، جو میں غام کو بھی کنڈی بنا دیتی ہے، میرے ہاتھ میں پہنچی تو اس کا اثر آدھا رہ گیا، شاعر کا دل دیکھیے کہ بے نصیبی دکھا دلا کر یہ احتیاج تیری بے نصیبی ہی تھی۔ کم نصیبی اس سے کہہ کر اکیر ہاتھ تو آگئی، مگر اس کی خامصیت آدمی رہ گئی۔

۷۔ شرح : یہ گوشہ سب سے الگ تنگ ہے۔ یہاں آس پاس کوئی نہیں۔ اسے محبوب یا آ اور میرے گے لگ جا۔ تو غلام کو کیوں جا رہا ہے؟ میرے گے لگ جا۔ اگر سر سے پادری اتار رہا ہے تو میرے گے لگ جا۔ اسے بے میر تبت! بیٹھا ہوا لگ کیا ستار رہا ہے؟ میرے گے لگ جا۔ تو نہیں دیکھتا کہ وصل کی رات آدمی گورہ کی ہے۔ اور آدمی باقی رہ گئی ہے؟ دیکھیے جزئیات پر شاعر کی فکر کتنی گہری ہے۔ لگ ستار ہی نہیں جاسکتی جب لگ پادریا دوپٹا سر سے اتار دیا جائے۔

۸۔ شرح : بھلا مجھے کیا معلوم کہ وہ (محبوب) کہتے آتے کیوں ٹوٹ گئے؟ لیکن احتیاج تھا ہوں کہ جب ان کے ٹوٹنے کا شاک تو میں نے جانا کہ جس طرح میرا نصیب پیرا ہوا ہے۔ اسی طرح وہ بھی پہلے گئے۔ قسمت تو دیکھو کہ وہ آئے اور یوں ٹوٹ گئے۔ اپنے گھر سے نکلے میرے گھر کا رخ کر لیا۔ لیکن جب میرا گھر آدمی دُور رہ گیا تو مجھ میں دُکایا کہ انہیں ٹوٹ جانے کا خیال کیوں ہوا؟ کیا میں یہ سمجھوں کہ میرے دل کی کشش میں تاثیر آدمی رہ گئی تھی کہ اپنے مکان لگ انہیں نہ کھینچ سکا۔

۹۔ شرح : دیکھو، اچانک مجھے کب کی بات یاد آگئی۔ سب کی باتیں سن رہا ہوں، کسی سے کچھ کہتا نہیں، لیکن اسے نام نہورا تجھ سے پرسوں رات کی بات کیوں چھاؤں؟ تو خط لے کر جاتے ہیں جلدی کر رہا تھا اور جو مطلب کی بات تھی، آدمی کھسی گئی۔ اور آدمی باقی رہ گئی۔

۱۰۔ شرح : اگر محبوب بالکل کی طرح بک کر جلوہ دکھائے تو یہ بھی غضب کی بات ہے۔ یعنی اس سے دل کی تسلی کیونکر ہو سکتی ہے۔ کہ جلوہ دکھائے اور غائب ہو جائے۔ آخر پانچ پھر گئے کی فرصت تو یونی پادری تھی تاکہ خوب خوشیاں منا لیجئے۔ اگر غلام ہی سے آجاتے تو

ساری رات کتنی ابھی گزرتی ؛ لیکن وہ میرے پاس آئے ہیں تو آدمی رات گزر جانے کے بعد آئے۔ گو یاد دل کی حسرت آدمی نکل اور اسے تقریر آدمی باقی رہ گئی۔

۱۱۔ شرح : دوستو ! تم اب یہ فرماتے ہو کہ اسے دیوانے غائب کیا ہم تجھے منع نہیں کرتے تھے کہ اس کے گھر نہ جاؤ ؛ جان کی امان پاؤں۔ جو کچھ کہتے ہیں۔ سب ، سچ ہے ، مگر میں ، کیا کروں اسے تقریر ساری خرابی دل کی ہے۔ وہی مجھے لے گیا اور یہ صبح ہے کہ وہاں جانے میں میری عزت آدمی رہ گئی۔

سلام

سلام اسے کہ اگر بادشاہ کہیں اس کو
تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اس کو
نہ بادشاہ ، نہ سلطان ، یہ کیا تاش ہے
کہو کہ خامس آلِ عبا کہیں اس کو
خدا کی راہ میں شاہی و خسروی کیسی
کہو کہ رہبر راوِ خدا کہیں اس کو
خدا کا بندہ ، خداوند گار بندوں کا
اگر کہیں نہ خداوند ، کیا کہیں اس کو
فروغِ جوہرِ ایماں ، حسینِ ابنِ علیؑ
کہ شیعہ انجمنِ کبریا کہیں اس کو

۱۔ شرح :

اُس مقدس وجود کو سلام
جسے بادشاہ کہیں تو خود

ہی خیال آتا ہے کہ کچھ

اس سے سوا کہنا ہا ہے

۲۔ لغات :

آلِ عبا : وہ بزرگ

ہستیاں ، جنہیں عام روایت

کے مطابق رسول اللہ

(صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی جانے

مبارک میں لے کر گئے

تفسیر بڑھی یعنی انہیں

مجاہدوں سے بالکل پاک

قرار دیا۔ مراد ہے حضرت

ظاہر، حضرت علیؑ :

حضرت علیؑ حضرت حسینؑ
جو کمر اس مقدس بھارت
کی لگتی ہیں رسول اللہ
اصم، سب سے پہلے
گتے ہیں، اس سے حضرت
امام حسینؑ کو غامض ہوا
کہتے ہیں، یسین آل عباس
سے پانچویں۔

شرح :

وہ بادشاہ ہیں، نہ
وہ سلطان ہیں۔ انہیں
ایسے القاب سے یاد
کرے متاثر ہو کر کوئی سافلیق
ہے؛ یہ کہنا چاہیے کہ
وہ آل عباس سے پانچویں
بزرگ ہیں۔

۳۔ شرح :

بھلا اللہ تعالیٰ کے راستے
میں بادشاہ ہیں اور خدای
کی کیا حیثیت ہے کہ
حضرت امام حسینؑ کے
بچے یہ لقب ہائے

کفیل بخشش امت ہے، بن نہیں پڑتی
اگر نہ شافع روز جزا کہیں اس کو
میخ جس سے کرے اخذ فیض جاں بخشی
ستم ہے کشتہ تیغ جفا کہیں اس کو
وہ جس کے ماتمیوں پر ہے سلسبیل بسبیل
شہید تیشہ لب کر بلا کہیں اس کو
صدو کے سمج رضا میں جگہ نہ پائے وہ بات
کہ جن و انس و ملک سب بجا کہیں اس کو
بہت ہے پایہ گردِ رحیم بلند
بقدر فہم ہے بگر کیمیا کہیں اس کو
نظارہ سوز ہے یاں تک ہر ایک ذرہ خاک
کہ ایک جو ہر تیغ قضا کہیں اس کو
ہمارے درد کی یارب کہیں دوا نہ ملے
اگر نہ درد کی اپنے دوا کہیں اس کو
ہمارا امن ہے کہ دیں اس کے حسن صبر کی دوا
مگر نبی و علیؑ مرحبا کہیں اس کو

زمام ناقہ کف اس کے ہیں ہے کہ اہل یقین
 پس از حسینؑ علیؑ پیشوا کہیں اس کو
 وہ ریگِ تفتہ وادی پہ گام فرسا ہے
 کہ طالبانِ خدا رہنا کہیں اس کو
 امامِ وقت کی یہ قدر ہے کہ اہل عناد
 پیادہ لے چلیں اور ناسزا کہیں اُس کو
 یہ اجتہادِ عجب ہے کہ ایک دشمن دیں
 صؑ سے آکے لڑے اور عطا کہیں اُس کو
 یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ
 بُرانہ مانیے گر ہم بُرا کہیں اس کو
 علیؑ کے بعد حسنؑ اور حسنؑ کے بعد حسینؑ
 کرے جو ان سے براٹی بھلا کہیں اس کو؟
 نبی کا ہونا جسے اعتقاد کا فر ہے
 رکھے امام سے جو بغض کیا کہیں اس کو؟
 بھرا ہے غالبِ دل خستہ کے کلام میں درد
 غلط نہیں ہے کہ خونیں نوا کہیں اُس کو۔

مجھ جائیں؟ یوں
 کہنا چاہیے کہ آپ راہِ خدا
 کے رہیں ہیں مجھ کی
 بیرونی میں لوگ یہ دلتے
 طے کرتے ہیں

۴۔ شرح :
 وہ خدا کے بندے
 ہیں اور بندہ گوی خدا
 کے آقا ہیں۔ پھر اگر
 انہیں خداوند نہ کہیں
 تو کیا کہیں۔ یعنی انہیں
 خداوند و آقا ہی کہنا
 مناسب ہے۔

۵۔ شرح :
 حسینؑ ابوالحسنؑ علیؑ کی
 بھلا ہیں۔ مناسب ہے
 ہے کہ انہیں انہیں کہیں
 کی شیعہ قرار دیں، یعنی
 خاصانِ خدا کی جوا انہیں
 ہے اس میں حضرت
 امام حسینؑ کو شیعہ کی
 حیثیت حاصل ہے

۷۔ لغات : کفیل : کفالت کرنے والا، ضامن، ذمہ دار۔

شرح : انھوں نے بخشش امت کی ذمہ داری اٹھائی ہے۔ لہذا یہی کہنا چاہیے کہ انھیں جیامت کے دن شفاعت کرنے والا قرار دیا۔

۸۔ شرح : جس سے میں بھی جان بچنے کا فیض حاصل کرے، غضب ہے کہ اسے ظلم کی سوار کا گتھہ کہا جائے، مطلب یہ کہ ایسے بلند منزلت وجود نے ظلم کی سوار سے غصت شہادت پایا۔ شہید ہونے کے اعتبار سے زمرہ ہادیہ ہیں انھیں مکشور نہیں کہا جاسکتا۔

۸۔ لغات : سبیل : بہشت کی ایک نہر۔

شرح : وہ پاک ذات، جس کے امتیوں کے لیے سبیل، سبیل کی حیثیت رکھتی ہے یا سبیل سبیل بنی ہوئی ہے۔ اسے کہلا میں تشذاب شہید قرار دینا چاہیے، یعنی ایسا شہید جسے بہشت کو پانی ملا ہو۔

۹۔ شرح : دیکھو کتنا غضب ہے کہ جس بات کو بہت، انسان اور فرشتے سب بجا اور دوست کہتے ہیں، وہ دشمن کی رحمت میں کے کان میں جگڑا پا سکی۔ دشمن کے کان اسے سن نہ سکے۔

۱۰۔ شرح : حضرت امام حسینؑ کے راستے کی گرد کا پاؤں بہت بلند ہے۔ اگر ہم اسے کیا کہیں تو یہ تو ہمارے فہم کا ایک اندازہ ہے، اصل حقیقت اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔

۱۱۔ شرح : کہلا کی خاک کا ذرہ ذرہ اس درجہ پختائی کو پہنچا دینے والا ہے کہ اسے تین قضا کو ہر کہنا پڑے۔ جس طرح سوار کے جوہروں کی درخشانی لگا ہوں میں نیوگی پیرا کو چنی ہے۔ وہی کیفیت کہلا کی خاک کے ایک ایک ذرے کی چھچھکیوں پر لے کر تین قضا کا جوہر ہے۔

۱۲۔ شرح : اگر ہم اس خاک کو اپنے درد کی دوا نہ کہیں تو خدا کرے ہمارے درد کی دوا کہیں نہ ملے۔

۱۳۔ شرح : حضرت امام حسینؑ نے صبر کی جو شان دکھائی ہمارا کیا مذہب ہے کہ اس کی داد دے سکیں۔ یعنی ہم کیوں کہ اس کی حقیقت کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ البتہ رسول اکرمؐ

صلح، اور حضرت علیؑ اس پر مدد کیا کہیں تو بالکل مناسب ہے۔

۱۴- لغات : زمام ناظر : اوشنی کی بہار، نکلیں۔

شرح : اب اوشنی کی بہار اس بزرگ کے دست مبارک میں ہے، جسے

اہل ایمان حضرت امام حسینؑ کے بعد پیشوا کہیں۔ لہذا ہر اس سے مراد ہیں امام زین العابدینؑ، کیونکہ ان کے شعروں میں بڑا شہادہ انہیں کی طرف ہے۔

۱۵- لغات : رنگب لغت : چیتی ہوئی ریت۔

شرح : وہ دلوں کی چیتی ہوئی ریت پر پل رہے تھے، جنہیں راو خدا کے

طالبوں کے لیے زیبا تھا کر اپنا رہنا قرار دیں۔

۱۶- شرح : جن بزرگ کو امام وقت ہونے کا شرف حاصل تھا، کیا یہ اس کی قدر و

مزا ہے کہ دشمنی رکھنے والے لوگ انہیں پیادہ ساتھ لے کر چلیں اور ان کے لیے مناسب باتیں زبان پر لائیں؟

۱۷- شرح : یہ عجیب اجتہاد ہے کہ ایک شخص دین کا دشمن ہو کر حضرت علیؑ سے

جنگ کرے اور کہا جائے کہ ایک اجتہادی خطا تھی!

یہ اشارہ امیر معاویہ کی طرف ہے۔

۱۸- شرح : یزید کو تو اجتہاد کا مقام حاصل نہ تھا، وہ تو مجتہد نہ تھا۔ اگر اُسے

برا کہیں تو بڑا ذلیل ہے۔

۱۹- شرح : حضرت علیؑ کے بعد حضرت امام حسینؑ اور ان کے بعد حضرت امام

حسینؑ، امام و پیشوا ہیں۔ جو ان جینوں سے بڑا فی کرے، اُسے بھلا کیونکر کہیں؟

۲۰- شرح : جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے، وہ کافر ہے۔ جو امام

سے دشمنی کرے، اسے کہا کہیں؟

۲۱- شرح : غالب کا دل زخمی ہے۔ اس کے کلام میں درد بھرا ہوا ہے۔

اگر کہیں کہ اس کی زبان پر ہو بھرے قرآنے جاری ہیں تو یہ غلط نہیں۔

(مرثیہ)

خواجہ حاکم فرماتے ہیں
 کہ گھوڑے کے جھنڈ
 سید فتح مرگم نے میرزا
 سے میدان شہداد کا مرثیہ
 اردو میں لکھنے کی فرمائش
 کی تھی۔ میرزا مجتہد
 کی بہت تعظیم کرتے
 تھے۔ ان کے حکم کی
 تعمیل میں لکھنے بیٹھے
 اور شکل سے مستحسن
 کے تین بند لکھے۔ پھر
 مجتہد کو لکھ بھیجا :
 "یہ تین بند صرف اشکال
 امر کے لیے لکھے ہیں،
 ورنہ میں اس میدان کا
 مرد نہیں ہوں۔ یہ آقا،
 لوگوں کا معترف ہے، جنہوں
 نے اس دادی میں لکریں
 بسر کی ہیں۔ مجھ کو انہی
 کے درجے تک پہنچنے
 کے لیے ایک دوسری

ہاں ! اے نفسِ باورِ سحر شعلہ فشاں ہو
 اے وجہِ نوحوں چشمِ ملائک سے رواں ہو
 اے زمزمہ قلم ! لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو
 اے تمہیں شہِ مظلوم ! کہاں ہو؟
 بگڑی ہے بہت بات، بنائے نہیں بنتی
 اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی
 تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو
 ماتم میں شہر دیں گے ہیں، سودا نہیں ہم کو
 گھر چھوکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو
 گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو
 یہ خرگاہِ نثرِ پایہ جو مدت سے سجا ہے
 کیا خیمہٴ شبیر سے رُتبے میں سوا ہے
 کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا
 کچھ اور ہی نقشہ ہے دل و چشم و زباں کا
 کیسا فلک اور مہر جہاں تابِ کمال کا
 ہو گا دلِ بیتاب کسی سوختہ جاں کا

اب حمر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے
 عمر درکار ہے، پس مجھے
 اس خدمت سے معذور
 معاف رکھا جائے ؟
 ان تین بندوں کی
 شرح ذیل میں درج ہے:

بند۱۔ لغات : لالک : لک کی جج، فرشتے۔
 قلم : اکٹھ۔ مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بیمار یا مردے سے قلم کر کے تندرست
 یا زخمہ کر دیتے تھے۔

شرح : اسے جج کی ہوا کے سانس؛ توجہ نگاریاں برسانی شروع کر۔ اسے
 خون کے دریا یا تو فرشتوں کی آنکھوں سے جاری ہو جا۔ اسے قلم کے نئے، تو حضرت عیسیٰؑ
 کے لبوں پر نقاش ہو جا۔ اسے قلم مظلوم یعنی حضرت امام حسینؑ کے ماتھیو اکباں ہو ؟
 آؤ۔ بابت اس درجہ بگڑ گئی ہے کہ اسے جانتے اور درست کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں
 آتی۔ اب گھر کو آگ لگے بغیر کوئی پارہ نہیں رہا۔

بند۲۔ لغات : عیال : باک، پروا۔
 خرگرجہ پائے : ٹوپیوں کا بڑا خیر، یعنی ٹو آسمان۔

شرح : ہمیں بابت کرنے کا یا مان نہیں۔ شور مچانے کی طاقت سے محروم ہیں
 ہم دین کے بادشاہ حضرت امام حسینؑ کے ماتم میں بیٹھے ہیں۔ سوائی اور دیوانے نہیں۔
 ہماری حالت ایسی ہے کہ گھر پھونک دینے میں بھی کوئی باک محسوس نہیں کرتے۔ اگر ہماری
 چنگاریاں پر سانسے والی آہ و فغاں سے آسمان بھی مل جائے تو جیس کیا پروا ہے ؟ یہ تو
 درجوں والا بڑا خیر، جو مدت سے اپنی بگڑ تالم ہے، یعنی یہ تو آسمان رہے ہیں حضرت خیرؑ کے
 نیچے سے جڑے ہوئے نہیں۔

بند۳۔ شرح : اب دنیا کا آؤر ہیں عالم نظر آ رہا ہے۔ دل، آنکھ اور زبان کا

نفس ہے اور ہو گیا ہے۔ کیا آسمان اور دنیا کو روشن کرنے والا کہاں کا سورج ! اُسے کسی جگہ
 ہوئے گا دلی ہنسا کہیں تو کہا ہے۔ اب سورج اور بجلی میں کوئی فرق نہیں، البتہ یہ ہم جانتے
 ہیں کہ بجلی گرتی ہے اور سورج نہیں گرتا، اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ سورج بجلی نہیں۔
 ان تینوں بندوں میں سے پہلا بند خواجہ خانی نے ”یا دگار غالب“ میں درج کیا پھر سے
 تینوں بند ”بلوہ خضر“ میں درج ہوئے۔

رباعیات

لغات : اے منشی خیرہ سر سخن ساز نہ ہو
 خیرہ سر : سرکش
 بے سروا۔ عصفور ہے تو مقابل باز نہ ہو
 عصفور :
 آواز تری نکلی اور آواز کے ساتھ
 پڑا۔
 شرح : لالٹھی وہ لگی کہ جس میں آواز نہ ہو

اے بے سرو یا منشی ! باتیں مذا، تو پڑا ہے۔ میرے جیسے باز سے خطاب نہ کرنا نہیں۔
 اور میرے منہ سے آواز نکلی، ساتھ ہی وہ لالٹھی لگی، جس میں کوئی صدا نہیں

یہ رباعی ”لطائف فیض“ سے لی گئی ہے جو میرزا کی تعریف ہے، لیکن سیف الحق بیچ
 کے نام سے بھی بھٹی۔ منشی سے مراد منشی امیر الدین پشیا لومی ہیں، جنہوں نے میرزا کی
 کتاب ”طالع برہان“ کے جواب میں ”طالع القاطع“ لکھی تھی۔ باز سے مراد خود میرزا غالب
 ہیں۔ ”بے صدا لالٹھی“ اسکا مطلب یہ ہے کہ ادھر ”طالع القاطع“، جیسی اور سیاح نے معاً
 اس کا رد کیا کہ چھاپ دیا۔

رتقے کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے
 ثاقبِ احوت یہ کی بھیجا تم نے
 حاجی کھو کو دے کے بے وجہ جواب
 غالب کا پکا دیا کلیجہ تم نے
 میں نے مائی کھو کو تمہارے پاس بھیجا تھا۔ تم نے بغیر کسی سبب کے اسے صاف بھاب
 دے دیا۔ اس طرح غالب کا کلیجہ پکا دیا۔

شرح :
 اسے ثاقبِ احوت نے
 میرے رتقے کا جواب
 کیوں نہ دیا؟ ثاقبِ احوت
 یہ حرکت نہایت بجا
 اور غیر مناسب ہے
 یہ رباعی شہاب الدین احمد خاں ثاقب کے لیے ہے، جس طرح اگلی رباعی بھی نہیں
 کے لیے ہے۔

اے روشنی دیدہ، شہاب الدین خاں
 کتنا ہے بتاؤ کس طرح سے رمضان؟
 ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک
 سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآن؟
 تراویح کی نماز پڑھنے سے کب تک فرصت ہوتی ہے اور تراویح میں روزانہ قرآن
 کتنا سنتے ہو؟

شرح :
 اے شہاب الدین خاں!
 تم میری آنکھوں کا نور
 ہو۔ یہ تو بتاؤ کہ رمضان
 کا مہینہ کس طرح بسر ہو
 رہا ہے؟ رات کو،
 تراویح کی نماز پڑھنے سے کب تک فرصت ہوتی ہے اور تراویح میں روزانہ قرآن

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
 کہتے ہیں مجھے دُہِ رافضی و دھیری
 دھیری کیونکر ہو، جو کہ ہودے صوفی؟
 تیسی کیوں کر ہو ماوراء النہری

لغات :
 رافضی :
 شیوہ۔

دھیری :
 دہرے، لافظ سب

ماوراءالنہر : ماوراءالنہر کے نقلی ضمن ہیں دریا کے پار کا علاقہ۔ اجتایہیں
اسلامی فتوحات دریا سے سمجھوں تک پہنچ گئی تھیں اور جموں سے پار کے علاقے کو ماوراءالنہر
کہتے تھے۔ چنانچہ جموں اور سمجھوں کا درمیانی علاقہ درجے ہم ترکستان کہتے ہیں، ماوراءالنہر
ہی مشہور تھا۔ یہاں کے لوگ بڑے کچے سُتی اور شیوں کے سنت مخالف مانے جاتے
تھے۔ چونکہ میرزا کے آباؤ اجداد ترکستان سے آئے تھے، اس لیے انھوں نے اپنے
آپ کو ماوراءالنہری کہا۔

شرح : جن لوگوں کو جہ سے شدید دشمنی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں شیعہ اور،
وہ یہ ہوں۔ سوچنے کی بات یہ ہے، جو موافق ہو اور جس کا مسلک تصوف ہو، وہ دہرے کچے کچے
سکتا ہے۔ اجماع ماوراءالنہر کا رہنے والا ہو، وہ شیعہ نہیں ہو سکتا، لہذا کچے کچے ہو گا۔
یہ بعض لطیف باتیں ہیں، میرزا غالب کے شیعہ ہونے میں کسی کو کلام نہیں، البتہ
وہ خاص وضع کے شیعہ تھے، یعنی ائمہ کرام سے انتہائی محبت تھی۔ حضرت علیؑ کو دامن
مانتے تھے۔ ساتھ ہی تمام فرقوں اور طبقوں سے گرامیل جولی تھا۔ تعصب سے بالکل پاک
تھے اور بڑے بڑے صوفیوں سے بھی عقیدت مندانہ تعلق تھا، مثلاً غوث علی شاہ غزنویؒ کی بھی
لے تو اس تعلق کا ذکر جسی محبت سے کیا ہے۔

متفرق اشعار

۱۔ شرح : جگر میں ٹوٹ کے سوئی ہوئی سناں پیدا
جگر کا دم سینے کیے
دہان زخم میں آخر ہوتی زباں پیدا
سوئی اشغال کی گئی۔

وہ زخم ہی میں ٹوٹ کر رہ گئی، اور اس کی جگر سناں دھیرا بھالے کی ٹوک، نے سناں
۲۔ شاعر کہتا ہے کہ اچھا ہی ہوا۔ زخم کی صورت تو مزی کی سی تھی۔ مگر اس نے زباں نہ تھی۔
پھر بھالے کی ٹوک اس مضمون میں زباں بھی گئی۔

خوشی جینے کی کیا، مرنے کا غم کیا ۲۔ شرح :
 جینے کی خوشی اور مرنے
 کا غم وہ کرے جسے

پایدار و استوار زندگی حاصل ہو۔ ہماری زندگی تو سراسر ناپائیدار ہے، بقول ذوقی یہ
 برق کی چمک یا خرد سے کی سکاوٹ ہے۔ یعنی یک لمحے میں غم ہو جائے تو اتنی اس زندگی اور
 اس بے ثباتی وجہ اعتبار ہی پر نہ جینے کی خوشی کوئی معنی رکھتی ہے اور نہ مرنے کا غم کھانا کسی
 بھی اعتبار سے مناسب ہے۔

ان دلفریبیوں سے نہ کیوں اس پر پیار آئے ۳۔ شرح :
 خوشا جو بے گناہ تو بے عذر من گیا
 کیوں نہ پیار نہ آئے نہ

دیکھیے پہلے بلا دہر گزا بھی اور غما ہو گیا۔ مگر مجھ سے کوئی گناہ اور جرم سرزد نہیں ہوا
 تھا۔ یہ بھی بہر حال ایک دلفریب اور ادا تھی جس پر بے اختیار پیار آیا۔ پھر خود ہی راضی ہو گیا
 نہ میری طرف سے کوئی عذر پیش ہونے کا انتظار کیا۔ اور نہ مجھے منت و مہجت باغوشاد کی ضرورت
 پیش آئی۔

دورنگیاں یہ زمانے کی جیتے جی تک ہیں ۴۔ شرح :
 دورنگی کا مطلب ہے۔
 منافقت، مفاہرت،
 کہ مردوں کو نہ بدلتے ہوئے کفن دیکھا
 دورنگی، ظاہر کچھ باطن کچھ۔

شاعر کہتا ہے کہ زمانے کے دورنگیاں اسی وقت تک ہیں، جب تک ہم جیتے ہیں۔
 جب مر جائیں گے تو یہ دورنگیاں ہم پر کچھ افراغ و خوار نہ ہو سکیں گی۔ کیا مردوں کو کسی نے کفن
 بدلتے دیکھا ہے! ہرگز نہیں۔ وہ جس حالت میں قبر کے اندر رکھ دیے گئے اسی حالت
 پر برابر قائم رہتے ہیں۔

۵۔ شرح : سات جلدوں کا پارسل پہنچا
میرزا غالب نے کھٹکے
وہ کیا خوب بر محل پہنچا
متعلق اپنی فارسی کتاب

دستجو اگر کہ مطلع مفید الحاق میں چھوٹی تھی، جس کے ایک شیروانی کلام تھے۔ غرض
نہی بخش میرزا عاتم علی بیگ۔ میرزا برگرہ پاں تندر کا بیاباں دیکھنے اور نصیح کرنے کے نومدار
تھے۔ ان میں سے کچھ کتابیں جو حاکموں کو بھیجی منظور تھیں۔ مجدد کرائی تھیں۔ اور یہ کام میرزا
عاتم علی بیگ تہر کے حواسے ہو گیا تھا۔ یہ سات کتابیں تھیں۔ جب میرزا کے پاس ان
کتابوں کا پارسل پہنچا تو جلد درجہ خوش ہو کر عاتم علی بیگ بہتر کو خط لکھا۔ اس میں کتابوں کا
ذکر اس شعر سے شروع کیا۔ یعنی سات کتابوں کا پارسل بر محل پہنچ گیا۔ آگے فرماتے
ہیں !

والہذا اگر تصور بھی میں گزرتا ہو کر کتابیں اس رقم کی ہوں گی، جب تک
جہاں سے تم جہاں میں رہو ملاحظہ علیہم السلام کی اماں میں رہو۔

میرزا نے جلدوں کی لگاتار کے سلسلے میں بارہ روپے بیسے سنے۔ انہیں یقین نہیں
آتا کہ اتنی رقم میں ایسی خوبصورت جلدیں بن گئیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

اب میں حیران ہوں کہ آیا شمارائے اطلبار نے ان بارہ روپے میں برکت دی،
یا کچھ شہارہ روپیہ صرف ہوا؟ نقد پارسلوں کا حصول وہ رجسٹریوں کا محمولہ تین
کتابوں کی لوح طلائی، یہ سادہی بات اس روپے میں کس طرح ہو آئی!

۶۔ شرح : ملے دو مرشدوں کو قدرت حق سے ہیں دو طالب
خدا نے دو مرشد پیدا
کیے، جو حقوق کو پیدا
نظام الدین کو خسرو، سراج الدین کو غالب

راستہ دکھاتے تھے اور سب کی حسیّت فرماتے تھے۔ ساختہ دونوں مرشدوں کو دو
عقیدت کیش طلبہ گاران فیض بھی دے دیئے۔ حضرت خواجہ نظام الدین نظام اللہ علیہ السلام
کو امیر خسرو بھی طالب ۷ اور سراج الدین ابوالفضل بہادر شاہ غازی بھی مرشد کے لیے

غالب جیسا طالب پیدا کروا۔

میرزا دقا فرشتا ایسے شعر ابو ظفر بہادر شاہ کی خدمت میں پیش کرتے رہتے تھے۔

خواجه حالی یاد رکھیں فرماتے ہیں کہ ایک روز خواجہ نظام الدین قدس سترہ اور امیر خسرو کی خصوصیت کا ذکر وہاں ہو رہا تھا میرزا نے اس وقت یہ شعر لٹا کر کے پڑھا۔

نیارِ عشقِ خرمین سوزِ اسبابِ جو کس بہتر ۷۔ - شرح :

عشق کی آگ غرمینوں

جو ہو جائے نثارِ برقِ مشیتِ خدا و کس بہتر کو بلا دیتی ہے بہتر

یہی ہے کہ خرمین و جو کس کے تمام اسباب اس آگ کی نذر کر دیے جائیں۔ کس و عار اور

جھاڑ جھنکار کا بھی پر نہ چار ہو جانا ہی اچھا ہے۔

خدا سے میں بھی چاہوں اذ رہ مہر ۸۔ - شرح :

یہ شعر میرزا غالب

فروغِ میرزا حاتم علی مہر نے حاتم علی بیگ مہر

کو ان کی ایک مشنوی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا۔

مطلب یہ کہ میں محبت کی بنا پر خدا سے حاتم علی بیگ مہر کی ترقی و سر بلندی کے

لیجے و عاکرتا ہوں۔

یاد آ یا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ ! غلط ۹۔ - شرح :

جب محبوب کا یہ

کہنا یاد آ یا کہ سنیں،

کی تصور نے بہ صحرا سے ہوس راہ ! غلط

واہ ! غلط۔ تو تصور ہوس کے صحرا میں راستہ بھول گیا۔

سنینِ عمر کے ستر ہوئے شمار برس ۱۰۔ - شرح :

یہ شعر میرزا غالب

نے اپنے شاگرد رشید

ہمت جیوں توجیوں اور تین چار برس

ہرزند احمد حقیر گزلی کو ایک مکتوب مرقوم ۲۸ نومبر ۱۸۹۳ء میں لکھا تھا یعنی سرے

عمر کے ستر برس پورے ہو گئے اب اگر زندگی جوگی تو یہاں سے زیادہ تین چار برس کی ہوگی۔
یہ چیلنگی دوست ثابت ہوئی اور میرزا نے جینتر برس کچھ بیٹنے کی عمر میں انتقال کیا۔
شاگرد نے جواب میں لکھا :

شامقیرا یہ کہتے ہیں حضرت غلبہ ! تمہیں چوں تو جیوں اور تین چار برس
مگر یہ پہلے سے اعداد نہیں کی ہے دعا خدا کے میل : غلبہ مجھے ہزار برس

۱۱- شرح : پیر و مرشد معاف کیجئے گا

یہ شعر میرزا نے برسات

کا ذکر کرتے ہوئے ، میں نے جتنا کا کچھ نہ لکھا حال

نواب ، انوار اور بہادر ضلع ریش کدورالہ کو ۱۹ - جولائی سنہ ۱۸۶۷ء کے ایک مکتوب میں
لکھا تھا ۔

مطلب یہ کہ پیر و مرشد ، معاف فرمائیے گا ۔ میں نے آپ کو دریا سے جتنا کہے بار
میں کچھ نہ لکھا ۔

۱۲- شرح : ولی عہدی میں شاہی ہو مبارک

یہ شعر میرزا نے خواجہ

احمد خاں علاقائی کے نام عنایات الہی ہو مبارک

۱۸۶۷ء کے ایک مکتوب میں لکھا تھا ۔ اس کا پس منظر یہ کہ علاقائی چونکہ امین الدین احمد خاں ولی
نواب رو کے فرزند اگبر سکتے لہذا ولی عہد ریاست وہی تھے اور ان کے بارے میں ولی عہدی
کا اعلان بھی ہو چکا تھا ۔ جب امین الدین احمد خاں کی طبیعت تریا دہ خراب ہو گئی اور معاملات
اور امور ریاست کی دیکھ بھال میں انھیں وقت نہیں آنے لگی تو حکومت کی منظور سے
علاقائی کو والد کی جگہ نیا بندہ کاروبار ریاست سنبھالنے کا حکم ہو گیا ۔ اسی کو میرزا نے ولی عہد
تین شاہی "قبور دیا ہے ۔ یعنی ہو تو ولی عہد مگر ریاست کے اختیارات نہ گئے ، اگرچہ
بعد میں سہی اس کی مبارک باد دی اور اس صورت کو عنایات الہی کا کرشمہ قرار دیا ۔

واقعی یہ اسی ذات پاک کی خدایت سے ہوا۔

۱۳۔ شرح :

مولانا آزاد نے آپ

حیات میں لکھا ہے کہ

درم و دہم اپنے پاس کہاں

چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

میرزا کا فرزند حسین علی خاں مجھے میرزا اور ان کی بیگم نے بیٹا بنا لیا تھا۔ ایک دن کھیلتا کھیلتا آیا کہ دادا ہاں ملٹائی منگا دو۔ وہ منہ دے کر اُدھر اُدھر ٹھٹھٹھٹھ لگا۔ میرزا نے ارجحان فرمایا،

ہمارے پاس درم و دہم کیوں کر ہو سکتے ہیں کہیں چیل کے گھونسلے میں بھی ماس ملا ہے، یعنی چیل کو گوشت کا جو ٹکڑا مل جائے فوراً کھا جاتی ہے اور باقی نہیں بچوڑتی۔ وہی حالت ہماری ہے کہ پیسا آتا ہے اور فوراً خرچ ہو جاتا ہے۔ باقی بچنا ہی نہیں کہ محفوظ رکھا جائے۔

۱۴۔ شرح :

اے غالب! شراب

نوشی کو بے حاصل اور

میکشی کو نہ سمجھ بے حاصل

بادہ غالب عرق بید نہیں

یہ فائدہ نہ سمجھ۔ شراب بید کا عرق نہیں۔ بید کا درخت بے ثمر ہوتا ہے اور اس کے عرق کو بھی میرزا نے غالباً اسی وجہ سے بے اثر قرار دیا۔

۱۵۔ شرح :

آپ قیامت تک سلامت

ریں۔ اور آپ کا دلست

تم سلامت رہو قیامت تک

دولت و عزت و جاہ روز افزوں

عزت اور جاہ و مرتبہ روز بروز رو بہ اضافہ رہیں۔

۱۶۔ شرح :

آپ قیامت تک

سلامت رہیں، آپ

تم سلامت رہو قیامت تک

صحت و لطف طبع روز افزوں

کی صحت اور لطیف طبع برابر بڑھتے جائیں

یہ دونوں ضرر میرزا غالب عموماً ان خطوں میں لکھتے ہیں جو فردوسِ اقبال کے نام سے بھیجے جاتے۔

۱۷- شرح : نہیں بھولا میں تجھے کو اسے میری جاں

یہ شعر میرزا نے
جہوج کے نام
کروں کیا کہ یاں گر رہے ہیں مکان

ایک مکتوب (مرقومہ ۲۶ - ستمبر ۱۹۹۹ء) میں لکھا ہے۔ اس زمانے میں بارش کی کثرت کے باعث دہلی میں مکان گر رہے تھے۔ میرزا کا مطلب یہ ہے کہ اسے میرزا میری جان میں تجھ کو بھولا نہیں۔ مگر کیا کروں؟ یہاں مکان گر رہے ہیں فرماتے ہیں۔

برسات کا حال خیر و خوار کا قبر ہے — غم غاں کی لگی مسافتِ حلال کی خبر ہے

۱۸- شرح : ابرو دتا ہے کہ بزمِ طرب آمادہ کرو

بادل اس لیے روتا ہے
کہ عیش و نشاط کی بھین
برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو

آراستہ کی جائے لیکن بجلی اس پر ہنستی ہے اور کہتی ہے کہ ہمیں تو صرف کوئی دم کی فرصت ہے۔ اس میں عیش و نشاط کی گے سامان کیوں کر مل سکتے ہیں۔ اور مہیا کر بھی لیے جائیں۔ تو ان سے کتنا غم و کام لیا ہاں کے گا۔

ابر کے رونے سے اس کا ترسنا۔ اور بجلی کے چمکنے سے اس کا پشیمان ہونا ہے۔

میرزا غالب کے نزدیک شراب نوشی اور اس سلسلے میں عیش و نشاط کا موسم ہمارے ملک میں صرف برسات کا ہے۔ ایک خارجی غزل کا مقطع ہے۔

بہارِ ہند بود برشکالِ بابلِ غالب ۔ دیریں غزاں کردہ ہم کو کم شراب ہے بہت

ہندوستان درجے اب پاک و ہند کہتے ہیں۔ بھارت کا موسم برسات ہے۔ گویا اس

ملک میں ہمیں بھی غزائیں کی سہی ہے۔ شراب نوشی کا ایک موسم ہے۔

دیکھتا ہوں اسے تھی جس کی تمت مجھ کو
 ۱۹- شرح : مجھے جس کی تمت تھی،
 اسے پہنے سامنے دیکھ
 آج بیداری میں ہے خواب زینجا مجھ کو
 رات ہوں۔ گویا میرے لیے بیداری میں زینجا کے خواب کا سماں پیدا ہو گیا۔

ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے
 ۲۰- شرح : اس شعر کی مضمونیت کا
 انحصار صرف اس کیفیت
 پر ہے کہ مشہور ہے زعفران زرد دیکھ کر انسان کو بے اختیار ہنسی کا دورہ پڑ جاتا ہے اور غفلان
 کے پھولوں کا رنگ زرد ہوتا ہے۔

کہتے ہیں: مجھے ضیعت و کمزور دیکھ کر سب ہنستے ہیں۔ ضیعت و کمزور آدمی کا رنگ،
 عموماً زرد ہوتا ہے۔ اس لیے کہ کمزوری خون کی قلت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ میرزا کہتے ہیں کہ
 پہلا رنگ ہمارے لیے چمن زعفران ہے۔ جسے دیکھ کر سب ہنسنے لگتے ہیں۔

راہ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے
 ۲۱- شرح : میں نیا پاند ہوں یعنی
 بال بال اور آسمان مجھے عجز
 عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سلاتا ہے مجھے
 کا درس دیتا ہے اور عمر بھر ایک ہی پہلو پر سلاتا ہے۔

صبا انگا وہ طمانچہ طرف سے بلبیل کی
 ۲۲- شرح : اسے صبا بلبیل کی طرف
 سے پھول کے مز پر
 کہ دے غنچہ گل سوے آشیاں ہو جائے
 ایسا طمانچہ لگا کہ اس کا مزہ بلبیل کے گھونسنے کی طرف پھر جائے۔

زخم دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانتا ہے
 ۲۳- شرح : جی جانتا ہے،
 مطلب ہے۔ بخشتی
 ایسے ہنستے کو رلایا ہے کہ جی جانتا ہے

کیفیت دل ہی کو معلوم ہے۔ زخم کا ہنسا یا مسکرانا اٹانگے ٹوٹ جانے سے زخم کا بڑھ جانا۔

کہتے ہیں۔ تم نے دل کا زخم دکھایا۔ اس کی کیفیت دل ہی کو معلوم ہے، ہنسنے کو رانا یا مسکرانی دل ہی بہتر جانتا ہے۔

۲۴- شرح : ہم کیا کہیں کسی سے، اپنا طریق کیا ہے ہم کسی سے کیا کہیں کہ اپنا ملک اور طریقہ مذہب نہیں ہے کوئی، امت نہیں ہے کوئی

کیا ہے! ہمارا کوئی مذہب ہے اور کوئی امت۔ یہ انسان سے بلا امتیاز امت و مذہب اور بظاہر اختلاف رنگ و نسل محبت و شفقت کے برتاؤ کی دعوت ہے۔ ایک جگہ میرزا کہتے ہیں!

ہم مومریں، ہمارا کیش ہے ترکہ دم مہتیں جب مٹ گئیں، اجڑا دیلا گئیں

۲۵- شرح : گلشن دہر بھی ہے کوئی سرائے ماتم کیا دانے کا پھن تار ماتم و سو گولہ بازی کا ماتم شبنم اس باغ میں جب آئے تو گولہ آئے ہے! دیکھیے شبنم اس باغ میں آتی ہے۔ تو روٹی ہوئی آتی ہے۔ شبنم کا روٹنا اور آنسوؤں کی شکل میں ہرزہ دکن پر کرنا محتاج تشریح نہیں۔

۲۶- شرح : پھر مرتبہ بڑھایا مرا نفی غیر نے میں غم شد کے سوا

ہر غم کی نفی کر دی آیا ہر اک مکان نظر، لامکان مجھے اسے بے وجود اور بے بود مان لیا۔ اس کا تجربہ ہوا کہ ہر مکان مجھے لامکان نظر آئے گا۔

شعر میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ ماسوائے اللہ سے قطع نظر کر کے وجود حقیقی صرف اللہ سے ملایا جائے گا۔ تو تعصبات ختم ہو جائیں گے اور مکان یقیناً لامکان بن جائے گا۔

آج مجھ سا نہیں بدنام زمانے میں کوئی ۲۷- شرح :

آج زانہیں میرے

برابر بدنام کوئی نہیں۔

پھر بھی دل چاہتا ہے اور ہوں بدنام ابھی

لیکن دیکھیے دل چاہتا ہے کہ ابھی بدنامی کا مزہ سرد سمانی جو ناپا ہے۔

زرد افشاں ہانگ ہے اور سبز اس پر اک دوشالا ہے ۲۸- شرح :

ہانگ دوسرے بانوں

کے درمیان میری

غضب یہ ہے پر طافس میں کالے کو پالا ہے

کھیرا پد سونے کا بڑا دھڑک رکھا ہے۔ اور اس پر سبز دوشالا اوڑھ دیا ہے۔ غضب کی بات ہے کہ مور کے پر میں کالے سانپ کو پالا ہے۔

بتو تو یہ کرو، تم کیا ہو جب ادا بار آتا ہے ۲۹- شرح :

اے بتو۔ تو یہ کرو

اپنے حسن پر زیادہ نہ

تو یوسفؑ کا حسین بکنے سیر بازار آتا ہے

اتراؤ۔ جب زوال کا دور آتا ہے تو یوسفؑ جیسا میں سراٹھا کر بکنے کے لیے آجاتا ہے۔

بجھا ہے شیریں اگر چھوڑ دتی جج کو چلی ۳۰- شرح :

شری طوائف تھی میں،

اگر شری دہی کو

مثل ہے نو سوچو ہے کھا کے بتی جج کو چلی

پھر ڈاکر جج کے لیے لگی ہے تو اس پر وہی مثل صادق آتی ہے کہ بتی نو سوچو ہے کھا کے جج کے لیے روانہ ہوتی ہے۔

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے ۳۱- شرح :

یہ شہر میرا ہے

میرا مہدی مجروح

کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

کے نام ایک خط میں لکھا ہے۔ یہ فروری ۱۸۵۵ء کا خط تھا۔ اس وقت تک دہلی کے حالات منظرِ مذہب میں تھے۔ روزانہ کوئی د کوئی نیا حکم اہل شہر کے لیے جاری ہوتا تھا

مقا۔ مرزا کہتے ہیں اس شعر میں رونما نہ کیا حکم جاری ہو جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

۳۲- شرح : مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ شعر میرزا نے اپنے مکان کے متعلق کہا ہے
جو عین مسجد کے زیر سایہ تھا۔ فرماتے ہیں،

میں نے مسجد کے زیر سایہ مکان بنے لیا ہے گویا ایک بندہ جو نہایت حقیر اور
قریبیہ ہے، خدا کا ہمسایہ بن گیا ہے۔ یہ اس لیے کہ مسجد کو سب لوگ خدا کا گھر کہتے
ہیں اور خدا کے گھر کے ساتھ جس کا گھر ہو گا۔ وہ اپنے آپ کو ہمسایہ خدا کہلانے
کا حقدار ہو جائے گا۔

خواب عالی یادگار غالب میں فرماتے ہیں کہ سب سے آخر مکان جس میں ان کا
انتقال ہوا حکیم محمود خاں مرحوم کے جوان خادم نے متصل مسجد کے عقب میں تھا۔ اس کی
نسبت یہ شعر کہا

۳۳- شرح : ہو کر شہید عشق میں پائے ہزار جسم
راہ عشق میں شہادت
ہر موج گردِ راہ مرے سر کو پیش ہے
پا کر مجھے ہزار جسم
گئے۔ راستے میں ہو کر دلاشتی ہے اس کی ہر ہر میرے سر کے لیے کندھے کا لام
دے رہی ہے۔

۳۴- شرح : دم واپس بر سرِ راہ ہے
آخری سانس اس
عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے
راستے پر بولیا ہے۔

جو اسے اختیار کرنا تھا۔ اسے عزیزو! اب اللہ کے سوا کچھ نہیں۔
یہ شعر زندگی کے آخری دور میں میرزا غلاماں پڑھتے رہتے تھے۔

مثنوی

۲۱- لغات :

کنیا : پنگ کا
کٹی کھانا، شرم و حجاب
کرتا، ٹال مٹول کرتا۔

شرح :

ایک دیو میرے دل
نے کاندھی چنگ کی
طرح آزاد می کا سر رشتہ
سنبھال لیا اور مجھ سے
کٹی کھائی۔ بہت بگڑا
اور میرا سر کھانے لگا۔

۲۲- شرح :

میں نے کہا : اے دل !
حمینوں کا عشق تیرے
بے نقصان کا باعث

ایک دن مثلِ پنگ کا غدی

لے کے دل سر رشتہ آزاد گی

خود بخود کچھ ہم سے کنیا نے لگا

اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا

میں کہا، اے دل ! ہو اے دلبراں

بسکہ تیرے حق میں رکھتی ہے زیاں

بیچ میں اُن کے نہ آنا زینہار

یہ نہیں ہیں گے کسی کے یار غار

گودے پنڈے پر نہ کر اُن کے نظر

کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر

اب تو بل جلتے گی تیری اُن سے سانٹھ

لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گمانٹھ

سخت مشکل ہو گا سلجھانا تجھے

قہر ہے دل ان میں اُبھانا تجھے

یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے

بھول مت اس پر اڑاتے ہیں تجھے

ایک دن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں

مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں

دل نے سن کر کانپ کر، کھاپچ و تاب

غوطے میں جا کر، دیا کٹ کر جواب

رشتہ در گردنم انگندہ دوست

مے بردہر جا کہ خاطر خواہ اوست

اُگھیل کر ایسی گمانٹھ پڑے گی کو تیرے لیے اس کا کھونا مشکل ہو جائے گا۔ مرن

حصیوں میں دل اُبھانا قہر ہے۔

یہ تجھے محفل میں اونچا دے دیتے ہیں اس پر بھول دیا،

حقیقت میں تیرا مذاق اڑاتے ہیں۔

۴۔ شرح :

کہیں ان کھیچ اور

بل فریج پانڈا - یہ

کہیں کسی کے وقار

دوست نہیں ہوئے۔

۵۔ شرح :

ان کے گورے بدن

مزدیکہ، یہ ڈورے ٹال

کر لوگوں کو کھینچتے ہیں۔

۱۶۔ نصارت :

سانٹھ : رسی یا

دھاکا جس میں گرو پڑی

ہوئی ہو گشتی۔

شرح :

اب تو ان سے تیری

سانٹھ مل جائے گی لیکن

اُگھیل کر ایسی گمانٹھ پڑے گی کو تیرے لیے اس کا کھونا مشکل ہو جائے گا۔ مرن

حصیوں میں دل اُبھانا قہر ہے۔

۸۔ شرح :

یہ تجھے محفل میں اونچا دے دیتے ہیں اس پر بھول دیا،

حقیقت میں تیرا مذاق اڑاتے ہیں۔

- ۹- شرح : کسی دکھی دل تجھے کیسے ٹھادیں گے اور محنت میں کٹا دیں گے۔
- ۱۰- شرح : دل نے میری باتیں سنیں، کاتیا، بچہ قاتل کھایا، میرے سچے بھائی کے بعد کٹ کر یہ جہاں دیا، میری گردن میں دوست نے دھا کا ڈال رکھا ہے اور جس طرف اٹس کا دل چاہتا ہے، ایسے پھرتا ہے۔



ضمیمہ دوم

اس ضمیمے میں نرسوز محمدیہ کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔ کوشش یہی رہی کہ صرف وہ شعر ہیے ہائیں جو ذرا سہل اور واضح ہوں، نیز ان میں گھر و خیال یا اسلوب بیان کی کوئی غریبی موجود ہو۔ ساتھ ساتھ یہ مقصد بھی پیش نظر رہا کہ غالب کے ارتقائی طرز کا اندازہ کرنے والوں کے لیے اچھا سرمایہ فراہم ہو جائے اور نرسوز محمدیہ کی اشاعت سے اصل غرض یہی تھی چنانچہ اس انتخاب میں متعدد ایسے شعرا لے لیے گئے ہیں جن سے غریبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ابتدائی دور میں، جسے مشق و ورزش کا دور کہنا چاہیے، غالب کس انداز میں سوچتے تھے اور کس رنگ میں اپنے افکار پیش کرتے تھے۔ ان کا طریق اجتہاد ہی سے نزاع تھا، لیکن جس مقام بلند کی طرف ان کی پرواز کا رخ تھا، اس تک پہنچنے کے لیے بقدر ضرورت قوت موجود تھی۔ جب قوت بہم نہ پہنچی تو وہی شاعر۔ جسے شروع میں بعض دماغ سوئنگ یا تقلید سن کو سمجھ رہے تھے شاعری میں اس درجہ کمال پہنچ گیا، جو اس سے بیشتر شاید کسی کو حاصل نہ تھا اور جو کچھ وہ کر گیا ہے، اسے اردو زبان میں ہمیشہ روشنی کے ایک بلند مینار کی حیثیت حاصل رہے گی۔



ضمیمہ دوم نسخہ حمیدیہ کا انتخاب

اسد! ہر جاسن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے لغات :
مجھے رنگ بہار ایجادِ بیدل پسند آیا
بہار آفرینی۔

شرح : اے اسد! بیدل نے ہر مقام پر نئے انداز سے شعر و منی کہا
ہر اسد باغ لگا دیا ہے۔ یہی وہ ہے کہ مجھے اس کی بہار آفرینی کا رنگ بہت پسند
آیا ہے۔

تنگی رفیق رہ تھی، عدم یا وجود تھا
میرا سفر بہ ظاہر چشمِ حصور تھا
بازی خورِ فریب ہے اہلِ نظر کا ذوق
ہنگامہ گرمِ حیرت بود و نہ بود تھا
پوچھا تھا گرچہ یار نے احوالِ دل، مگر
کس کو دماغِ منتِ گفت و شنود تھا
خورشیدِ شبنم آشنا نہ ہوا، ورنہ میں، اسد!
سحرِ قدمِ گزارشِ ذوقِ سجود تھا

۱۔ شرح :
میں عدم کی حالت میں
تھا یا وجود کی حالت میں
آیا۔ دونوں بزرگی میرے
راستے کی ساتھی بنی
رہی۔ یعنی عدم میں بھی
میرے لیے کشائش کہ
کوئی سامان نہ تھا وہاں
سے سفر کر کے عالمِ وجود
میں آیا تو یہاں بھی وہی
حالت رہی، معلوم ہوتا
ہے کہ میرے سفر کی

قسمت میں حامدوں کی آنکھ کھلے دی گئی تھی، جس کی تنگی دنیا بھر میں مشہور ہے۔

۲- **شرح :** اس دنیا میں ہستی اور نیستی کا جگہ جہت افزا صورت میں گرم تھا۔ یعنی یہ سوچا جاتا تھا کہ ہم ہیں یا نہیں؟ ہمارا وجود کوئی حقیقت رکھتا ہے یا بعض ایک دھوکا ہے؟ جو لوگ اہل نظر ہونے کے دسی تھے، وہ بھی اسی دھوکے سے بازی کھا گئے۔

مطلب یہ کہ وہ اہل نظر تھے، جن سے امید تھی کہ حقیقت جس طرح لگے ہوں گے اور گزریں گے کہ ہماری ہستی کی حقیقت نہیں رکھتی، لیکن حوت و حیات کا جو ہنگامہ یہاں گرم تھا، اسی لئے انہیں ایک فریب میں مبتلا کر دیا۔

۳- **شرح :** میں، انسا ہوں کہ محبوب نے میرے دل کا حال پوچھ لیا تھا، مگر مہر میں اتنا صبر و سکون ہی کہاں تھا کہ بات چیت کا احسان اٹھاتا، یعنی میں حال سناتا اور محبوب سنا۔

۴- **شرح :** اے استاد! میں تو سر سے پاؤں تک سجدے کا ذوق نہیں کر رہا تھا۔ یعنی میں تو ہر حق سجدہ ہی کیا تھا، لیکن افسوس کہ آفتاب نے میری شہنشاہی پھیلانے کی۔

اوس کے قطرے واقعی جہت ہی سجدہ ہوتے ہیں، مگر انہیں جذب کرنے کے لیے سویرا کی شعاعیں درکار ہیں، میرزا کہتے ہیں، میں سراپا عشق تھا اور محبوب حقیقی کی ماہ میں نما ہو جانے کی کام متولیں ملے کر چکا تھا۔ صرف اتنی کسر رہ گئی تھی کہ محبوب کی توجہ ہو اور میں اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دوں۔ پس اب تک توجہ نہ ہو سکی۔

۱- **شرح :** جہے کہاں تمنا کا، دوسرا قدم، یارب اے خدا! یہ دنیا جو

ایک وسیع صحرائی حقیقت رکھتی ہے، یہ ہم نے دشتِ اسکان کو ایک نقشِ پاپا یا

بے داغ خجالت ہوں، رشکِ امتحانِ تا کے تو ہمارے نزدیک تملو

ایک بیکیسی تجھ کو، عالم آشنا پاپا آرزو کا ایک نقشِ قدم ہے۔ اب فرما مجھے کہ

کیوں نہ وحشت غالب باج خواہ تسکین ہو اس کا دوسرا قدم

کہاں پڑا !

گشتہ تغافل کو خصمِ خوں بہا پایا دنیا کوشتِ تکرار دینا ہے جلد

سے درست ہے کہ اس کا وجود صوفیہ کے نزدیک محبوبِ حق سے فرار کا نتیجہ ہے۔ پھر اس

شعر میں یہ اشارہ بھی ہے کہ محبوبِ حقیقی نے جس کی تلاش کے لیے یہ چرکار اٹھایا۔ گویا یہ

سب کچھ تشاکل ایک لفظِ قدم ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دوسرا لفظی قدم کہاں

ڈھونڈیں ؟

۲۔ شرح : میں شرمندگی برداشت نہیں کر سکتا۔ احمقوں کا رھک کب تک گولہ
کرتار ہوں ؟ نہ میرا کوئی نمونہ ہے، نہ ہمدرد، میں اپنی ذات کے لیے کسی کا احسان قبول
نہیں کر سکتا۔ اے بیکھی ! جس طرح تُو دنیا بھر کی ساتھی ہے، اسی طرح میری بھی ساتھی
تجہا تُو ہے۔

۳۔ لغات : باج : خراج۔

شرح : غالب کی دیوانگی کس لیے تسکین کا خراج وصول نہ کرے ؟ جس عاشق
کو محبوب کے تغافل نے مار ڈالا، وہ اپنا خون بہا تو لے ہی نہیں سکتا، کیونکہ تغافل میں دانا
جانا خون بہا کا مستحق ہی نہیں۔ صرف اتنی آرزو ہے کہ دیوانگی کی حالت میں کچھ تسکین ہو جائے۔

۱۔ لغات : جس قدر جگر خوں ہو، کو چہ دادِ بنِ دل ہے

زخمِ تیغِ قاتل کو، طہِ رُفہِ دل کشا پایا

نکھنے کے لیے ماست سے دیتا۔

شرح : جس قدر جگر بھری ہو کر

تجھ کو جس قدر ڈھونڈا، الفت آشنا پایا

بھننا جائے، دل راستہ

دیتا جاتا ہے۔ فانی کے زخم تین کوئیں نے صدمہ ہر دل کھول دیئے والو پایا۔

مطلب یہ کہ فانی کی تمنا جگر پر چڑھی اور وہ خون ہو کر بہ گیا۔ ساتھ ہی دل کا راستہ کٹ گیا۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ فانی کی تمنا جڑی دکن ہے۔

۲۔ شرح : استاد کا سوال یہ ہے کہ اس پر ظلم جو ہر منور کیا جائے۔ نہ محبوب کی سنگری کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ اس میں دلچسپی کی غفلت ہے۔ یعنی وہ اندھا دھند ستم کئے جا رہا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ ہم نے محبوب کو جس قدر صدمہ دیا، یہی معلوم ہوا کہ جاری محبت والہ کی آزمائش جو رہی ہے، اس کے بغیر محبوب دل نہیں سکتا۔

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہم جو ظلم و ستم اٹھا رہے ہیں، ان میں نہ ہماری خواہش و آرزو کو دخل ہے، نہ محبوب سنگری ہے۔ یہ سب محبت کی طبعی آزمائشیں ہیں ان سے گزرنے سے بغیر کوئی کیونکر منزل مراد پہنچ سکتا ہے؟ جس طرح کھانا اصرینا، جاگنا اور سونا زمر کی خصوصیتیں ہیں، اسی طرح آزمائش محبت کے راستے کی طبعی منزلیں ہیں۔ پھر ان سے گھبرانے کا کیا مطلب؟ محبت ہے تو اس راستے کی ہر اقد و قبول کرنی پڑے گی۔ جیسے کوئی شخص پھول پھنے گا تو لائنوں کی غفلت سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

۱۔ شرح : کچھ کھٹکتا تھا مرے سینے میں، لیکن آخر
میرے سینے میں کوئی
چیز کھٹک رہی تھی، روک
کھٹکتے تھے، یہ دل ہے،
جس میں محبت کی غفلت
ہے۔ دیکھا تو جیر کی نوک
نکلے، جو دل میں بیست
ہو گئی تھی اور ہر ایر
کھٹکتی رہی۔

جس کو دل کہتے تھے، سوتیر کا پکیا نکلا
کس قدر خاک ہو ا ہے دل مجھوں، یارب
نقش ہر فذہ سویدا سے بیا باں نکلا
شورِ سوائی دل دیکھ کہ یک نالہ شوق
لاکھ پردے میں چھپا، پر وہی عریاں نکلا

شوخی رنگِ حنا خونِ وفا سے کب تک
آخر اے عہد شکن! تو بھی پشیمان نکلا
۲۔ شرح :
اے حنا! مجھوں کا
دل کس قدر خاک چھ

کیا ہے، یعنی خاک میں مل گیا ہے کہ ہر ذرہ رویا باں کے لیے سویا ہی گیا ہے۔

۳۔ شرح : دل کی رسوائی کا مجھوں کا غلط کر کر شوق کی ایک فریاد لاکھوں پردوں
میں چھپی، پھر بھی وہ میریاں بھی نکل۔

مطلب یہ کہ مالہ شوق کو کتنا بھی چھپایا، مگر چھپ نہ سکا۔ سبب یہ تھا کہ دل کو رسوا
ہونے کا شوق تھا اور وہ اپنا شوق پورا کر کے رہا۔

۴۔ شرح : اے عہدِ محبت توڑ دینے والے محبوب! تو کب تک وفا کے خون
سے اپنے لیے منہدی کا سامان فراہم کرنا رہتا۔ آخر تجھے بھی اپنے اس فعل پر پشیمانی ہوئی۔

۱۔ شرح
ضعف و ناتوانی گوری
ہوئی عمر کا تماشہ کر رہی
ہے جو گونا گوں رنگ
ہم زور و قوت اور جلال
کے زمانے میں دیکھ چکے
وہ آنکھوں کے سامنے
آجئے کی طرح آگئے اور
ان سے پوری گزشتہ
کیضت ہم پر آشکارا
ہو گئی۔
ناتوانی ہے تماشا ئی عمر رفتہ
رنگ نے آئینہ آنکھوں کے مقابل باندھا
اصطلاحاتِ اسیرانِ تغافل مت پوچھ
جو گرہ آپ نے کھولی، اُسے مشکل باندھا
پار نے تشنگی شوق کے مضمون چاہے
ہم نے دل کھول کے دیا کو بھی ساحل باندھا
مطرب دل نے مرے تارِ نفس سے غالب
ساز پر رشتہ پے نغمہ بہیدل باندھا

عمر گزر گئی، آخری منزل پر پہنچ گئے۔ اس پیری کے ضعف میں مبتلا ہیں۔ گزری ہوئی عمر پر غمناک ہیں اور جو بہاریں ہم گوارہ کچے ہیں، وہ آئینہ عبرت کی طرح ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔

۲۔ شرح : جو لوگ غفلت کے قیدی ہیں یعنی غفلت کا فکا روہ کچے ہیں، انہوں نے اپنے ایسے جو عجیب و غریب اصطلاحیں وضع کر لی ہیں، ان کی کیفیت کیا پوچھتے ہو؛ سلامت یہ ہے کہ جس نگاہ کو انہوں نے خود دکھولا، کرایا کہ اس کا کھول مشکل تھا۔

ظاہر ہے کہ جو ہم غفلت کے باعث وہ خود نہ کر سکے، اسے مشکل بنا کر دل کی تسکین کرنی اور اپنے خیال کے مطابق دنیا کے سامنے سرخرو ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انہیں ہمت ہوتی اور وہ خود تو میرے کام لیتے تو یہاں کوئی گروہ ایسی نہ ملتی، جو کھل نہ سکتی۔ کوئی کام ایسا نہ تھا، جو انجام نہ پاسکتا۔

۳۔ شرح : محبوب ہم سے اس بات کا طلبگار تھا کہ ہم شوق کی پیاس کا مال بیان کریں۔ ہم نے انتہائی ہمت و کشادہ دلی سے کام لیتے ہوئے دریا کو بھی ساحل باندھ دیا۔ یعنی ساحل، جو دریا سے وابستہ ہوتا ہے، مسلسل تم کو دور رہنے کے باوجود پیاسا ہی رہتا ہے۔ دریا بھی پی جاتے تو اس کی پیاس نہیں بجھتی لیکن حق یہ ہے کہ اتنی ہمت اور وسعتِ عمل کے باوجود شوق کی پیاس کے مضمون ہمارے قابو میں نہ آئے۔ ہم اس کی کھلی کھینچنا چاہتے تھے۔ اس شکر کا دوسرا معراج میرزا نے مطبوعہ دیوان کے لیے رکھ لیا اور اس پر یہ معراج لگایا :

نہ بندے تشنگیِ ذوق کے مضمونِ غلاب ہم نے دل کھول کے یا کو بھی ساحل باندھا

۴۔ شرح : اسے غلاب ! دل کے مفتی نے میرے سانس کا تار لیا اور ساڑ پر ڈورا بٹا کر باندھ دیا، مگر میں میرزا بیدل کے لئے گاؤں۔

یہ امن دور کی غزل ہے، جب میرزا بیدل پر مٹے ہوئے تھے، اس لیے تاہم نفس کو ساڑ کا رشتہ بنا کر بیدل کے رنگ میں شعر کہنے کے آرزو مند ہیں۔

زمیں آتش نے فصل رنگ میں رنگ دگر پایا : شرح :
 فصل بہار آئی اور باغ
 میں پھولوں کے رنگ
 نے آگ کی صورت اختیار کر لی۔ شمع نے اپنا غار ڈھونڈنے کے لیے پھول کے چراغ
 سے لگایا۔

شمع کا غار وہ دھماکا ہوتا ہے، جو جلتا ہے۔ پھول رنگ کی فراہمی سے آگ بن
 گئے تو شمع نے پھول کا چراغ لے کر اپنا غار ڈھونڈنے کا سامان کر لیا۔

ہم نے وحشت کدۂ بزم جہاں میں، بھول شمع : شرح :
 اس جہاں کی محفل ایک
 شعلہ عشق کو اپنا سرو سامان سمجھا
 وحشت کدے کے سوا
 کیا ہے ! ہر شے دیوار اپنی دھن میں لگی ہے۔ ہر محفل کے لیے شمع ضرور ہے۔
 ہم نے بھی دنیا میں شمع کی طرح صرف عشق کی جگہاری کو اپنا سرو سامان قرار دے دیا۔

نہ پائی وسعت جولاں یک جنوں ہم نے : شرح :
 ہمیں اس دنیا میں اتنی
 فراخی اور کشادگی بھی
 عدم کو لے گئے دل میں غبار صحرا کا
 نہ مل سکی کہ ہمارے ایک دیوانگی حسب وخواہ ہنگامہ آرائی کر لیتی۔ اس پر دل اتنا کدہ بھرا اور
 کدورت کا غبار اس کثرت سے جمع ہوتا رہا کہ ایک صحرا بن گیا اور یہ غبار ہم اپنے ساتھ
 عدم کو لے گئے۔

مطلب یہ کہ یہ دنیا وسعت کے باوجود ایک جنوں کی بھی ہنگامہ آرائی پروا نہشت
 نہیں کر سکتی۔

۱۔ شرح : شرر فرصت نگہ، سامان یک عالم چراغوں ہے
 ہیں جو مہلت ملے، وہ تو صرف اتنی جگہ
 بہ قدر رنگ یاں گردش میں پیمانہ ہے محفل کا
 مجھے راہ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں، غالب !
 عصائے خضر صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا
 مقام ہے میں نظر کی یہ حالت ہے کہ دنیا کو چراغاں بنا دینے کا سامان ہے پیش ہے۔

ظاہر ہے کہ اس محفل کو پیمانہ صرف اپنے رنگ کے مطابق گردش کر سکتا ہے۔
 مطلب یہ کہ زندگی محدود جزئیل ہے اور انسانی اپنے ساتھ ہزاروں اور زوئیں
 لیے پیش ہے۔ اتنا نہیں سمجھتا کہ کسی محفل میں پیمانہ اتنی دیر تک گردش کرے گا جتنی دیر
 تک شراب ہوگی۔ شراب ختم ہوگی تو پیمانے کی گردش بھی ٹک جائے گی۔ گویا اس زندگی میں
 تمام آدھائیں پوری نہیں ہو سکتیں۔

۲۔ شرح : اسے غالب ! مجھے شعر گوئی کے راستے میں گمراہی کا کوئی ڈر نہیں
 اس صحرائے میزنا بیدل کا قلم میرے لیے خضر کے عصا کی حیثیت رکھتا ہے جو شخص ایسے
 خضر کی رہنمائی میں جا رہا ہو، اسے راستے سے ہٹک جانے کا کیا ڈر ہو سکتا ہے ؟

شرح : یہ صورت تکلف، بہ معنی تناصف

اسے اسد ! میں ان لوگوں کی سکراہٹ
 اسد ! میں تبسم ہوں پڑ مردگاں کا
 ہوں، جن کے دل افسردہ و پڑ مرزدہ ہوں۔ اگر میری صورت دیکھیں ہائے تو میری سکراہٹ
 سراسر تکلف کا نتیجہ نظر آئے گی۔ میری اصل حالت پر خود کیا ہائے تو وہ سکراہٹ سراسر
 اسوس معلوم ہوگی۔

مطلب یہ کہ جن لوگوں کے دل مڑھاپکے ہوں، وہ چننے بھی ہیں تو بعض تکلف سے،

حقیقت میں اس کے دلوں کو جہنم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور غور سے دیکھا جائے تو وہ حرکت و
حالت ہی کے واسطے ہوئے نظر آئیں گے۔

۱۔ شرح :
دلِ لگی پر ضعف کی کیفیت
ظاہری تھی۔ سخت گرمی
کا موسم تھا۔ ایسی حالت
میں میرے پیٹھ کے
دور وازنے تکسہ پہننا بھی
مشکل تھا۔ اس حال میں
جنونی کے پیٹھ کیسے
صورت اس کے سوا
کیا تھی کہ ایک پھٹا سا
پیرا بان گھر میں بھی
لیتے تاکر جب ضعف
ضعفِ جنوں کو وقتِ تپش در بھی دُور تھا
اک گھر میں مختصر سا بایاں ضرور تھا
اے وائے غفلتِ نگہ شوقِ ورنہ یاں
ہر پارہ سنگِ لختِ دلِ کوہِ طور تھا
شاید کہ مر گیا ترے رخسار دیکھ کر
پیمانہ راتِ ماہ کا لبریز نور تھا
ہر رنگ میں جلا اس قدر فتنہ انتظار
پروانہ تجلی شمعِ ظہور تھا
کے واسطے اصل ضرورتِ پہنچنے کے لئے تو گھر ہی میں صوفی لٹکی کر لیتے۔

۲۔ شرح : نگاہِ شوق کی غفلت پر افسوس ہونا چاہیے کہ اس نے حقیقت کا شیک
مشیک اندازہ نہ کیا، اور نہ اس دنیا میں پتھر کا کوئی سا ٹکڑا ہے، جسے کوہِ طور کے لغتِ جگر
کی حیثیت حاصل نہیں؛ یعنی اس میں وہ حقیقی نظر نہیں آتی، جو کوہِ طور کی درشت ہی تھی۔
نثار کا مقصد یہ کہ ہے کہ جس جلی کا ظہور کوہِ طور پر ہوا تھا، وہ بلاشبہ ایک خاص
ظہور تھا۔ لیکن کوئی سا پارہ سنگ ہے، جس میں صانعِ خدائی کی شانِ نظر نہیں آتی اور جمائے
کی یا دمازدہ نہیں کرویتا؛ البتہ انسان تو تیرہ ذکر سے اور غفلت سے کام لے تو بات دوسرہ
ہے۔ اس صورت میں حقیقی طور بھی اس کے لیے ہرگز بعیرِ شہادہ نہیں۔

۲۔ **شرح :** راست چاند کا بیاد نور سے بھر گیا اور بیاد لبریز ہونے کے معنی مر جانے کے بھی ہیں۔ اسے محبوب معلوم ہوتا ہے، تیرا چہرا دیکھ کر اسے موت آگئی۔
مطلب یہ کہ چہرہ صوفیوں کے چاند سے بیاد خوب نور سے بھر گیا، لیکن تیرا چہرہ دیکھا تو اپنی جیسے آگاہی کی شرم میں ڈوب مرا۔

۳۔ **شرح :** جو استاد انتظار کی آزمائش کا شکار ہو چکا تھا، وہ ہر رنگ میں جل کر خاک ہو گیا۔ حقیقت یہ کہ وہ شیعہ ظہور کی تجلی کا پردہ تھا۔ یعنی جہاں اسے محبوب حقیقی کے ظہور کی شمع روشن نظر آئی، وہیں جل مرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ محبوب سے فراق برداشت نہیں کر سکتا تھا اور انتظار کی کڑیاں نہیں جھیل سکتا تھا۔

شرح : بوقت سرنگونی ہے تصور انتظار ستاں
جب ہم مجھ کا محبوب کا تصور کر لیتے ہیں تو
نگہ کو آبلوں سے شغل ہے اختر شماری کا
کا منظر پیدا ہو جاتا ہے۔ ہماری نگاہ جا بجا اسے ڈھونڈ رہی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے پاؤں میں پھاسے پڑ گئے ہیں۔ بس انہیں چھالوں کو بار بار دیکھتا دراصل تار سے گنتا ہے، جو راست گنارنے کا ایک بہانہ سمجھا جاتا ہے، خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو اپنے محبوبوں سے جدا ہوں۔

شرح : ہر گام آبلے سے ہے دل، در تہ قدم
جو بھی قدم اٹھاتا ہوں، اس کا ہر آبلہ دراصل دل
کیا بیم اہل درد کو سختی راہ کا
ہے جو پاؤں کے نیچے رکھ دیا گیا ہے۔ اس حال میں درد مندوں کو راستے کے کٹھن اور دشوار ہونے کا ڈر کیوں؟ یعنی جو لوگ آبلوں کی جگہ دل رکھ دیتے ہیں، انہیں کٹھن ہی سختی نہیں آئے، آسانی سے جھیل میں گئے، لہذا کوئی ڈر نہیں ہو سکتا۔

خود پرستی سے رہے باہمد گرتا آشنا

۱۔ شرح :

ہم خاص مذہب کے

یہ ایک دوسرے

سے ناواقف رہتے۔

اس کا سبب یہ تھا کہ

ہم دونوں خود پرست

تھے۔ دونوں اپنے عمل

میں مست تھے۔ ہیں

ہیکسی کو اپنے لیے

باعث فخر سمجھتا تھا۔ اے محبوب! تو نے مجھے سے دوستی پیدا کر رکھی تھی، یعنی ہر وقت

اے سامنے رکھ کر ناؤ سنگار میں معروف رہتا تھا۔

۷۔ شرح : بے دماغی اس امر کی روادار نہیں کہ ہم ایک دوسرے کے خلاف رشک

کی بنا پر شکوہ شکایت کریں۔ مان لینا چاہیے کہ تجھے جام پر جام بیٹا پسند ہے اور میں برابر نئے

کے آثار میں مبتلا ہوں۔

کہتا یہ چاہتے ہیں کہ اے محبوب! تو نے درپے شراب کمر باندھ چڑھا رہا ہے،

میرا جم غمار کھینچ و تاب میں مبتلا ہے۔ اب بتا کہ ایک دوسرے کی حالت پر رشک

کرنے یا شکایت کے دفتر کھولنے کا کیا ناز ہے؟ لطف یہ کہ ہم دونوں بے دماغ بھی

ہیں اور بے دماغی شکوہ و شکایت کی روادار ہی نہیں ہو سکتی۔

۸۔ شرح : بہار کے بخشنے بھی اجزاء ہیں، وہ سب بے انسی بکر نفرت کے

شیراز سے ہیں بندھے ہوئے ہیں، یعنی ان کی فطرت ہی یہ ہے کہ ایک دوسرے سے

بھاگیں گے، کسی سے افس پیدا نہ کریں۔ جموت کا غلط فہمائیے : اجزاء بہار ہیں سے

ایک بہرہ ہے۔ ساری دنیا اسے بیگا دکھتی ہے۔ دوسرا جزو صبا ہے۔ جو سراسر آوارہ

ہے، بدھرمز اٹھتا ہے، پس نکلتی ہے۔ تیسرا جزو پھول ہے، وہ کسی سے آشنا ہی پہیلا

خود پرستی سے رہے باہم دگر نا آشنا
 ۱۔ شرح : ہم خاص ذات کے لیے ایک دوسرے سے ناواقف رہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ہم دونوں خود پرست تھے۔ دونوں اپنے عمل میں مست تھے۔ ہیں بیکسی کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتا تھا، اسے محبوب اٹھنے سے دوستی پیدا کر رکھتی تھی، ایسی ہر وقت اسے سامنے رکھ کر ناؤ سنگار میں مصروف رہتا تھا۔

۲۔ شرح : بے دماغی اس امر کی دعاوار نہیں کہ ہم ایک دوسرے کے خلاف رشک کی بنا پر شکوہ شکایت کریں۔ مان لینا چاہیے کہ جبے جام پر غلام بنا پسند ہے اور میں برابر نشے کے آثار میں مبتلا ہوں۔

کہتا ہے چاہتے ہیں کہ اسے محبوب اٹھنے اور اپنے شراب سکھریا لے چڑھا رہا ہے۔ میرا جم غفار کھینچ و تاب میں مبتلا ہے۔ اب بتا کہ ایک دوسرے کی حالت پر رشک کرنے یا شکایت کے دفتر کھولنے کا کیا فائدہ ہے؟ اسطرح یہ کہ ہم دونوں بے دماغ ہیں اور بے دماغی شکوہ و شکایت کی دعاوار بھی نہیں ہو سکتی۔

۳۔ شرح : بہار کے جتنے بھی اجزاء ہیں، وہ سب بے انہی بلکہ نفرت کے شیرازے میں بندھے ہوئے ہیں، یعنی ان کی فطرت ہی یہ ہے کہ ایک دوسرے سے بھاگیں گے، کسی سے اُنس پیدا کریں۔ ثبوت غلط فرمائیے، اجوائے بہار میں سے ایک ہنرہ ہے۔ سادھی دنیا اسے بیگا دکھتی ہے۔ دوسرا ہنرہ صبا ہے۔ جو سرا سرا آوارہ ہے، بعد مرزا اٹھتا ہے، یہی لکھتی ہے۔ تیسرا ہنرہ پھول ہے، وہ کسی سے آشنا ہی نہیں ہوتا۔

منہیں کرتا ۔

دیکھیے : تین جزو پیش کیے اور تینوں میں ہے آتش، گریز اور نفرت کی خصوصیت
نمایاں کر دی ۔ بیگانہ وہی ہے ، جسے کسی سے آفتابی دہو ، سب سے الگ تھلک رہے ۔
آوارہ وہی ہے ، جو کسی سے رابطہ مضبوط رکھے ۔ نا آشنا وہی ہے ، جو کسی سے انس پیدا
نہ کر سکے ۔

شرح : قود میرا سنبستان کی کرے ہے ہمیری
بسکہ شوق آتش گل سے سراپا جل گیا
میں سر سے پاؤں تک بھول کی آگ
کے عشق میں جل گیا ہوں ۔ مجھ میں سے جو دھواں اٹھتا ہے ، وہ سنبل کا ہمیری
گیا ہے ۔

۱۔ شرح : ہوں قطرہ زن بہر وادی حسرت شبانہ روز
بجز نارِ اشک جاوہ منزل نہیں رہا
میں حسرت کی وادی
میں رات دن قطرہ
قطرہ ہو کر گر رہا ہوں ۔
میری منزل کا راستہ
آنسوؤں کے مار کے
سوا کچھ نہیں رہا ۔ یعنی جس طرح آنسو مسلسل قطرہ قطرہ ہو کر گرتے ہیں اور ایک نہار
باندھ دیتے ہیں ۔ یہی کیفیت میری ہے اور اسی کو میری منزل کا راستہ سمجھنا چاہیے ۔

۲۔ شرح : میرے بندھے ہوئے دل کے سوا دنیا میں کوئی ایسی گرو
منہیں رہی ، جسے کھون خشک ہو ۔ اے آہ ! تو ہی مہربانی کر کر یہ کسی طرح کھل جائے ۔

بہ ہوس درو سر اہل سلامت ، تا چند
 شرح : جو لوگ امن و اطمینان
 مشکل عشق ہوں ، مطلب نہیں آساں میرا
 سے بیٹھے ہیں۔ دو کب
 تک درو سر میں مبتلا رہیں گے کہ میرا مطلب پالیں ؟ میں عشق کی مشکل میں اور میرا
 مطلب پالنا سہل نہیں۔ یعنی میں لوگوں کو سلامتی سے محبت ہے ، وہ اس شکل کا عمل کیونکر
 تلاش کر سکتے ہیں ، لہذا ان کا درو سر بالکل بے سود ہے۔

رکھا غفلت نے دُور افتادۂ ذوقِ فنا و رنہ
 اشارتِ فہم کو ہر ناخنِ بُردیہ ابرو مٹھا
 ۱۔ شرح : ہم غفلت کئے باعث
 ذوقِ فنا سے دُور دُور
 سندھ ، و درجن لوگوں
 کو حقیقت کے اشاروں
 کی بھر تھی ، اُسی کے ہے
 تو ہر کج ہوا ناخن بھی ابرو کی حیثیت رکھتا تھا ، یعنی وہ تو کئے ہوئے ناخن ہی کو ابرو سمجھ کر اس
 کے اشارے پر جان دے سکتے تھے غفلت نے ہم سے فہم و بصیرت کی یہ دولت بھی چھین لی۔
 ۲۔ شرح : اسے استدعا یہی پٹھان کی خاکہ اڑا اڑا کر سر پر ڈالتا ہوں۔ ایک زمانہ
 ایسا بھی گزرا ہے ، جب شراب نوشی کر تھوڑی سی زمین پر اڑیل دیتے تھے اور اس طرح
 شراب پینے کے صحن میں گشتوں تک آتا ہی نہیں۔

پریشانی سے مغز سر ہٹا ہے پنہ بالش
 لغات :
 پنہ بالش :
 خیالِ شوخیِ خواب کو راحت آفریں
 عکس کی روئی
 ۱۔ پریشانی کی حالت میں سر کے مغز کی یہ کیفیت ہو گئی جیسے نیچے کی دھوا

ہے۔ حیدروں کی شوقی کا تصور بھی جرمی راحت پیدا کرنے والا ہے۔

مطلب یہ کہ میں شوقی کے تصور میں پریشانی تھا۔ مگر کی یہ حالت ہو گئی۔ جیسے ٹھکنے ہوئی روئی ہوا اسی کے ٹھیکے میں بھر دیا جائے۔ ٹھیکہ باعث راحت ہے۔ لہذا اس پریشانی کا اہتمام راحت پر ہوا۔

بہ رہیں شرم ہے، باوصف شوقی اہتمام اُس کا

نگین میں جوں شرارِ سنگ ناپیدا ہے نام اُس کا

مسی آلودہ ہے مہرِ نوازش نامہ، پیدا ہے

کہ داغِ آرزوئے بوسہ لایا ہے پیام اُس کا

بہ اُمید نگاہِ خاص ہوں محلِ کشِ حسرت

مُساوا ہو عناں گیرِ تغافلِ لطفِ عام اُس کا

لیکن اس کا نام پتھر کے شرار سے کی طرح اندر بھی اندر بند ہے۔

غایاں نہیں۔

بعض فنون میں شوقی کی جگہ شہرت کا لفظ ہے۔ اس صورت میں مفہوم یہ ہو گا کہ اگرچہ

اس کی شہرت بہت ہے، لیکن وہ شرم کے تمام آداب کا پابند ہے۔ ٹھیکہ بنایا تاکہ جا بجا مہرِ نوازش کرنے لے۔ مگر نام چھکارنے کی طرح ٹھیکے کے اندر رہا۔

۲۔ شرح : محبوب کے خط پر جو مٹرگی ہوئی ہے، اس میں مسی کی آمیزش

ہے۔ اس سے نتیجہ نکلا کہ ہم نے بوسے کی ہوا آرزو کی تھی، اس کے جواب میں انکار ہی

پیغام آگیا۔ گویا وہ پیغام آرزو سے بوسہ کا دلخ ہے۔ داغ اس لیے کہ میں کے رنگ کا ہوتا

ہے۔ آرزو سے بوسہ کے لیے داغ اس بنا پر کہ میں ہونٹوں کو سیاہی مائل کرنے کے لیے

لگائی جاتی ہے۔

۳۔ لغات : محلِ کش : کبادہ اٹھانے والا۔

شرح : میں نگاہِ خاص کی اُمیدِ حسرت کا کبادہ اٹھانے پھرتا ہوں۔

مجھے رنگ و خام کی حسرت ہے اورے سب کچھ اس سے کر رہا ہوں کہ کہیں اس کا لطف عام
تغافل کا حنا گیر نہ بن جائے۔

مطلب یہ کہ سب پر اس کا لطف و کرم ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس لطف و کرم میں مجھے
بھی شامل کر لیا جائے اور رنگ و خام کی حسرت دل میں رہ جائے۔

۱- شرح :
ایک جہیں تھے، جو عشق
میں خدا اور امرا سے،
الگ تھلک رہے، اور نہ
حقانے تمام اسباب موجود
تھے، اور ہم امرا کہ
عشق میں ہم نے ہی ابرام سے پرہیز کیا
ورنہ جو چاہیے، اسباب تمنا، سب تھا
آخر کار گرفتارِ سر زلف ہوا
دل دیوانہ کہ وارستہ بہر مذہب تھا
کھٹے تھے۔

۲- شرح : ہمارا دیوانہ دل ہر ملک اور ہر مذہب سے آزاد تھا۔ آخر ذلیف
کے پہنچے میں گرفتار ہو گیا۔

۱- شرح :
میرا بھتا بھتا دل ماتم
غلے کی شمع بنا ہوا تھا
آج وہ شمع گل ہو گئی اور
دھوئیں اس کے ماتم ہیں
سیاہ لباس پہنے ہوئے
۲- لغات :
برخاقتن : اللہ۔
قد کو آج اُس کے ماتم میں سیر پوشی ہوئی
وہ دل سوزاں کہ کل تک شمع ماتم خانہ تھا
ساتھ جنبش کے بریک یہ خاستن طے ہو گیا
گو کہے، صحر اغبار دامن دیوانہ تھا
دیکھ اُس کے ساعدِ سپین و دستِ پُر نگار
شاخِ گل جلتی جلتی مثل شمع، گل پر دانہ تھا

شرح :

نیں امٹا۔ ذرا جیش

ہوئی اوپر پورا سہرا لے

کر لیا۔ اٹن کا کوئی حصہ باقی ہی نہ رہا۔ گویا سہرا سحرانہ تھا، دیوانے کے دامن کا غبار تھا کھڑا
جھٹکا اور جھڑکیا۔

اس شعر میں بھی میر نے اپنے اپنا وہی مضمون پیش کیا ہے کہ یہ پوری کائنات ہمارے
جنون عشق کی انکسین کے لیے کافی نہیں۔ یہ تو ایک ہی جنبش میں ختم ہو گئی۔

۳۔ شرح : میرے محبوب کی چاندی بھی کھائی اور رنگے ہوئے ہاتھ دیکھ کر پھول
کی شاخ شمع کی مانند جلنے لگی اور پھول اس کا پرواز ہوا نہ ہوا گیا۔

اس شعر میں ”ساعیہ“ میں ”ما کو تشارخ گل“ اور ”دست پر نگار کو گل“ سے تشبیہ دی
گئی ہے۔

شرح : اسے آبلہ کرم کر، یاں رنجبر یک قدم کر

سے پچھے آؤ گئیں

ابے نو حیر چشم وحشت اسے یادگار سحر

امٹا کر آ۔ ٹو دیا گئی

کی آنکھ کا ندہ ہے، تو سحرانہ روی کی یادگار ہے۔

شرح :

دیکھیے، اس کے ہاتھ کاغذ
تواری کے جھکاؤ ہیں

اسے خوشا ذوق تمنائے شہادت کہ اسد

نہ بے تکلف بہ سجود چشم شمشیر آیا

سجدہ کرنے کے لیے آیا ہے۔ واہ! اُس کی آرزو سے شہادت کا کیا عالم ہے اور کس قدر ذوق و شوق ہے !

پھر وہ سوئے چین آتا ہے خدا خیر کرے
 ۱۔ شرح :
 میرا محبوب پھر باغ
 کی طرف چلا کر ہے۔
 اسدا اے ہرزہ درا! نالہ بہ غوغا تا چند
 خدا طیر کرے، خدا جانے
 حوصلہ تنگ نہ کرے بے سبب آزاروں کا
 کیا لگی کیڑے۔ بس جم
 یہ دیکھ رہے ہیں کہ
 باغ میں جو بھی سوا کھار ہے ہیں، ان کے چہرے کا رنگ اڑا جا رہا ہے۔ یعنی وہ بھی پریشان
 ہیں، دیکھیں، انجام کیا ہو!

۲۔ لغات : ہرزہ درا : بیہودہ گو۔

شرح : بیہودہ گو اسدا! تو جند آواز سے نلے کر کر کے خور کیوں چلا۔
 ہے یہ دیکھ جو محبوب بغیر کسی سبب کے عاشقوں کو ٹوک دینے کے عادی ہیں، کہیں وہ
 تیری آہ و لہناں سے گھبرا کر حوصلہ نہ ہار بیٹھیں اور شیوہ آزار ترک نہ کر دیں۔

اسدا! اراب فطرت قدر دان لفظ و معنی ہیں
 ۱۔ شرح :
 اسے اسدا! جنہیں
 سخن کا بندہ ہوں لیکن نہیں مشتاق تھیں کا
 اللہ تعالیٰ نے فطرت
 صہر عطا کی ہے، وہ لفظ اور معنی دونوں کے قدر دان ہیں۔ میں شعر گوئی کے لیے وقف

ہوں، گو یا اسی کا غلام ہوں، لیکن تمہیں وافر حق کا مجھے کوئی شوق نہیں۔

اس مطلق سے ظاہر ہے کہ ابتدائی دور میں میرزا جو شعر کہتے تھے، عام لوگ ناہمی کے باعث ان کی کچھ قدر نہیں کرتے تھے۔ پھر ذرا بہتر شعر کہنے لگے تو اس دور میں کچھ زیادہ قدر نہ ہوئی، اس لیے کہا :

زنتائش کی تہا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں میرے اشعار میں سنی یہی

شرح : عیب کا دریافت کرنا ہے ہنرمندی، استاد!

اے استاد! اپنا عیب دریافت کر لینا بڑی ہنرمندی اور عقل و دانش کی دلیل ہے۔ جس شخص کو اپنی نامی کا علم ہو گیا، مجھ جیسے کہ اس کے کان ہوتے کا راستہ کھنک گیا۔

اس سلسلے میں مرقی کیا خوب کر گیا ہے۔

خواہی کہ عیب اسے تو روشنی خود ترا یکدم منافقا نہ نشیں درکیمی خویش
اگر تو چاہتا ہے کہ تیرے عیب تجھ پر آشکارا ہو جائیں تو سنوڑی دیر کے لیے بیستہ بدل کر اپنی گھات میں بیٹھ جاؤ، اپنے عیب تلاش کرنے کا اس سے بہتر ہی نہیں، بلکہ اس کے سوا بھی کوئی طریقہ نہیں۔

۱۔ شرح : سر منزلِ مستی سے ہے صحرا کے طالبِ دُور

ہم جس صحرا میں پہنچنا چاہتے ہیں، وہ اس

توہم کی منزل سے بہت دُور ہے۔ ہمارے

لوگ سرِ مژگاں سے رقم ہو گلہ پا باؤں سے ہونقل جنتے

جا رہے ہیں۔ وہ خفیہ طور پر پاؤں کے لیے ایک زنجیر ہیں۔ جو اگلے بڑھنے سے روکتی ہے۔
 ۲۔ شرح : ہمارا تنہا ہوا اور نیچے رہا بڑا دل محبوب کے دیدار کا طلبگار ہے۔ چاہیے کہ پاؤں کا شکوہ قلم کے بجائے نوک سرخز گاہ سے لکھا جائے، یعنی ہمیں کر محبوب کی بارگاہ میں پہنچنا چاہتے ہیں تاکہ اس کے دیدار سے شاد کام ہوں۔ مگر پاؤں ساتھ نہیں دیتے۔ اس کی ناکایت لکھنے کے لیے نوک سرخز گاہ سے بہتر قلم کیا ہو سکتا ہے۔

بہتر نامہ جو پوسہ گل پیام رہا
 ۱۔ شرح : آپ نے خط پر مقرر کئے
 ہمارا کام ہوا اور تمہارا نام رہا
 دل و جگر تعزیرِ فرقت سے جل کے خاک ہوئے
 دلے ہنوز خیال وصال خام رہا
 شکستِ رنگ کی لاقی سحر، شبِ سنبھل
 چہ زلفِ یار کا افسانہ نا تمام رہا
 نہ پوچھ حالِ شب و روزِ ہجر کا، غالب !
 نخیالِ زلف و ریح دوستِ صبح و شام رہا
 مطلب یہ کہ ہم جل کر راکھ ہو گئے اور ابھی تک وصل کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی۔

۳۔ شرح : سنبھل کی رات کا رنگ فنی ہو گیا اور صبح صحت ہوئی، یعنی محبوب کی زلف کا افسانہ پورا نہ ہو سکا۔

سنبلی کا رنگ سیاہی آگے جوتا ہے، اس لیے اسے شب کہا۔ پھر اس کا رنگ ٹوٹ گیا اور وہ سفید ہو گئی۔ گویا رات صبح کی شکل اختیار کر گئی، لیکن زلف کا افسانہ پورا نہ ہوا۔

۴۔ شرح : اسے غالب اجدائی کے شب و روز کا حال کچھ نہ پڑیہ۔ محبوب کے رفتار اور زلف کا خیال صبح اور شام بدل رہا۔
شب اور روز۔ صبح اور شام، زلف اور رخ کی مناسبت نکال کر بیان نہیں۔

شرح : استاد! یوں مت ہو، گرچہ رونے میں اثر کم ہے
اے استاد! تاقتید
کہ غالب ہے کہ بعد از زاری بسیار ہو پیدا
نہ ہو۔ میں نے مانا
کہ رونے میں کچھ زیادہ اثر نہیں، مگر غالب ہے کہ زیادہ سے زیادہ رونا جائے تو
کچھ اثر پیدا ہو جائے۔

شرح : عمر میری ہو گئی صرف بہارِ حسنِ یار
ایک میں ہوں، جس
گرویشِ رنگ چمن ہے ماہ و سالِ عنلیب
کی نہ جس محبوب کی

بہار۔ میں صرف ہو گئی۔ ایک طرف بہل ہے، جس کے ماہ و سال رنگِ بلخ میں اول بدل پر
موقوف ہیں۔ یسین چمن میں کہیں بہار آتی ہے، کبھی خزاں ہوتی ہے۔ بہار و خزاں کے اجتماع
ہی سے بہل کے ماہ و سال بنتے ہیں۔ میرے لیے ہر وقت حسنِ یار کی بہار ہے اور میں اس
کی خاطر سب کچھ قربان کیے بیٹھا ہوں۔

۱۔ لغات : جاتا ہوں جدھر سب کی اٹھتے ہے اُور انگشت
ایک دست :
یک تم، سارے کا

سارا۔

شرح :

میں میری عمر میں جاتا ہوں
اور میری لوگوں کی
انگلیاں اٹھتی ہیں، سارا
بہاں مجھ سے پیر گیا
جے، مگر انگلی نہیں
پیری۔

دوست، ہوا علی

کی مناسبت، حنائی
تشریح جیسے۔

شاعر کا مطلب

یہ ہے کہ لوگ میری طرف انگلیاں اٹھاتے ہیں۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ سب مجھ سے برگشتہ
ہوئے، البتہ انگلی برگشتہ نہیں ہوئی، جو برابر میری ہی طرف اٹھتی رہتی ہے۔

۲۔ شرح : جب سے محبوب کے حنائی ہاتھ کی پور دیکھ لی ہے، اب اس کی سوجھ
ایک قطرے کی صورت میں نظر آ رہی ہے

۳۔ شرح : میرے دل میں خون بالکل باقی نہیں رہا۔ وہ پورے پورے محبوب
کے ہاتھ رنگین رکھنے میں صرف ہو گیا، اب اس کی انگلیاں اسی طرح تڑپ رہی ہیں جس
طرح پھل پانی سے باہر نکال لینے پر تڑپتی ہے۔

مطلب یہ کہ میرا خون دل محبوب کی انگلیوں کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے، جو پانی
کو پھل کے تعلق میں حاصل ہے۔

۴۔ شرح : تیری شوخی ہمارا پورا حال کھول کر رکھ رہی ہے۔ دل شوخلو سے ہرچکا
ہے، اس کے بازو پورہ انگلی چمک کر دیتی ہے۔

مقصود یہ ہے کہ تو ہماری طرف انگلی اٹھاتا ہے اور شوخی سے کام لیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم بے تاب و بیخود ہو جاتے ہیں اور ہمارے عشق کا سجدہ کھل جاتا ہے۔

۵۔ لغات : انگشت نما : جس کی طرف انگلیاں اٹھیں۔

شرح : ہیں مڑگاں کی محبت کا شکار ہوں اور لوگ میری طرف انگلیاں اٹھاتے ہیں۔ ہر انگلی مجھے تیر کی طرح گنتی ہے۔
مڑگاں کو نیز سے بھی تشبیہ دیتے ہیں۔

۱۔ شرح : ہے سوانیزے پہ اس کے قامتِ نوخیز سے

محبوب ابھی جوان ہوا ہے اور اس کے قد نے

آفتاب صبحِ محشر ہے گلِ دستارِ دوست

ابھی بلندی کی نشان دہی کر رہا ہے۔ سر پہ دستار

اے عدوئے مصلحت پندے پر ضبطِ افسردہ

کو دنی ہے جمعِ تابِ شوخی دیدارِ دوست

دستار پر مہول لگا ہوا ہے۔ شاعر کہتا ہے،

لغزشِ متانہ و جوشِ تماشا ہے اسد

آتشِ مے ہے بہارِ گرمی بازارِ دوست

یہ محبوب کے قامتِ نوخیز پر گلِ دستار لیا معلوم ہوتا ہے، جیسے صبحِ قیامت کا آفتاب سواخیزے پر لگایا ہے۔

۲۔ شرح : اے مصلحت کے دشمن! جلدی نہ کر۔ اپنے آپ پر ضبطِ قائم رکھ اور افسردہ و پشیمان نہ رہا۔ تو ابھی دوست کی شوخی دیدار کے قابل نہیں ہوا۔ اس عرض سے رفتہ رفتہ طاقت و توانائی فراہم کرنا ضروری ہے۔

۳۔ شرح : اے اسد! دوست کے حسن کی گرم بازار ہی پہلے ہی کچھ کم دھن صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی بہارِ فروغ پر ہے۔ پھر اس نے شراب پی لی۔ اس شب

نے گرم بازار کی کو تیز تر کر دیا۔ اب یہ صورت ہے کہ وہ قدم قدم پر لو کھڑا رہا ہے اور ہر طرف

سے نظارے کا جوش کھولاؤ گے ورنہ پر پتیا ہوا ہے۔

دو عالم کی ہستی پہ غلط وفا کھینچ

دل دوستِ اربابِ ہمت، سلامت

نہ اوروں کی سُننا، نہ کہتا ہوں اپنی

سرخِ خستہ و شورِ وحشت، سلامت

دُورِ بلا ہے، ہجومِ وفا ہے

سلامت، ملامت، ملامت، سلامت

نہ فکرِ سلامت، نہ بیمِ ملامت

ز غمِ خوشی ہائے حیرت سلامت

رہے غالبِ خستہ مغلوبِ گروں

یہ کیا بے نیازی ہے حضرت سلامت

۱- شرح :

اربابِ ہمت کے ہمتہ

اور دل سلامت رہیں۔

پھر دونوں جہانوں کے

وجود پر وفا کا خط کھینچ

دینا چاہیے۔ یعنی جب

تک دونوں جہاں سلامت

ہیں، ہمت والے بزرگ

دلوں اور ہمتوں سے

سب کچھ ٹاٹتے رہیں

گئے۔ ان کے ہمتہ

نہیں گئے، ان کے

دلوں میں تلخی پیدا ہوگی۔

۲- شرح :

نہ میں دوسروں کی

سُننا ہوں، نہ اپنی کہتا ہوں۔ خدا کرے، میرا زخمی سراور دیوانگی کا شور سلامت رہے۔

مطلب یہ کہ سر کی خشکی کے باعث اپنی کڑ نہیں سکتا اور دیوانگی کے شور کی بنا پر

دوسروں کی سُن نہیں سکتا۔

۳- شرح : وفا بدرِ کمال موجود ہے اور بلاؤں کا ہجوم ہے۔ ایسی

حالت میں سلامتی کو ملامت سمجھنا چاہیے۔ یعنی سلامتی نصیب نہیں ہو سکتی

اور ملامت بدستور قائم رہے گی۔

- ۴۔ **شرح :** سلامتی کی نگر ہے، نہ سلامت کا ڈر ہے۔ ہم حیرت میں اپنا آپ کو بچے ہیں اور وہی سلامت یعنی قائم علی جا رہی ہے۔
- ۵۔ **شرح :** غالبِ خستہ آسمان کے ہاتھوں جبر و ظلم کا شکار بنا رہے۔ اسے حضرت سلامت ! اسے باری تعالیٰ ! یہ آپ کی عجیب بے نیازی ہے۔

شرح : آہنگِ اسد میں نہیں تجزِ نغمہ بیدل
اسد کی نئی میں بیدل کے نغمے کے سوا کچھ نہیں

ساری دنیا جیسا افسانہ ہے بیٹھی ہے اور ہم کچھ بھی نہیں۔

آخری مصرع بیدل کا ہے، جسے میرزا نے مطلق میں تعبیر کر دیا ہے۔ یہ بھی اسی درد کی غزل ہے، جب میرزا پر بیدل کا بہت زیادہ اثر تھا۔

۱۔ لغات

نقاب : نقاب
نہ نہ دلا۔

شرح : میری نگاہ دو کے
منہاں خانے میں منت

نگہ یعنی تھی اور جو بائیں انسان دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رکھتا ہے، اُنہیں بھی معلوم کر دیتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میرے ہوتے ہوئے ریاکاروں کے لیے اپنا پردہ قائم رکھنا بالکل ممکن نہ تھا۔ میں سرگیا اور دل کے مجید معلوم کرنے والا کوئی نہ رہا۔ اب ریاکار لوگ بے خوف زندگی بسر کر رہے ہیں۔

بالکل یہی معنوں میں مرزا نے اپنے ایک مشہور نادرسی قصیدے میں بھی پیش کیا ہے۔

مکرم نقیب پر گھنیزہ و دلہا می زد مرثوہ با حوالی ریا مگر زبیراں رفت

۲- شرح : میں گھاس کا وہ تنکا تھا جس سے گلدستہ احباب بندھا تھا میں مر گیا تو میرے تمام رفیق اور دوست بکھر گئے۔

بھوڑوں کو اکٹھا کر کے گھاس کے تھکے بانڈ کر گلدستہ بنایئے ہیں۔ میرزا کہتے ہیں کہ میں اپنے احباب کے گلدستے کے لیے گھاس بن گیا تھا۔ جس سے وہ بندھے ہوئے تھے۔ میں نہ ہا، گلدستہ کھٹ گیا اور رفیق اُسی طرح الگ الگ ہو گئے، جس طرح گلدستے کی بندش کھٹ جانے سے پھول الگ الگ ہو جاتے ہیں۔

ہاتھ آیا زخم تیغ یارب پہلو نشیں

۱- شرح :

آج کے دن بیکسی کی روح کیوں نہ شاد ہو ؟
اُسے تیغ یارب کا زخم ہاتھ
آگیا، جو پہلو میں آ بیٹھا۔
مطلب یہ بیکسی
تھے، کوئی ہمارا رفیق اور
ساتھی نہ تھا۔ آ غم زخم
تیغ یارب پہلو میں آ کر بیٹھ

کیوں نہ ہو دے آج کے دن بیکسی کی روح شاد

ہم نے سوز خیم جگر پر بھی زباں پیدا نہ کی

گل ہوا ہے ایک زخم سینہ پر خواہاں داو

تیغ درگفت، کف ہر لب آ آ ہے قاتل اس در

مرثوہ ابو! اے آرزوئے مرگ غالب مرثوہ باو

گیا۔ پھر بیکسی کی روح کیوں غرض نہ ہو ؟

۲- شرح : ہم نے جگر پر سیکڑوں زخم کھائے، پھر بھی حرف شکایت

زبان پر نہ لائے۔ پھول کو دیکھو، ایک زخم سینے پر لگا اور داو خواہ ہو گیا۔

۳- شرح : آج قاتل تیار ہاتھ میں لیے آ رہا ہے اور غصے سے لوہوں

پر جھاگ آیا ہوا ہے۔ خوشخبری ہو، اے غالب کی آرزو سے موت آجی
خوشخبری ہو !

۱۔ شرح : منزل شادمانی کا دارغ
ہے اور بارغ میں رنگ
کے ہلال پر کھل رہا ہے
ہیں۔ یعنی بزم، جو
شادمانی کے لیے
قائم ہوئی تھی، ختم ہو
گئی اور شادمانی کا دارغ
باقی رہ گیا، کیونکہ آندو

بزم، دارغ، طرب و باغ، کشادہ پر رنگ
شمع و گل تا کے درپوشانہ و بابل، تا چند
نالہ، دام ہوس و درد، اسیری، مسکوم
شرح، بر خود غلطیہا سے تھکل، تا چند
استدیش، تہ گرفتار، دو عالم، اوہام
مشکل، آسماں کن، یک غلطی، تغافل، تا چند

کے مطابق شادمانی کی بزم قائم نہ رہ سکی۔ بارغ گوناگوں رنگوں سے پُر رونق تھا، اب سب
رنگ اُڑے جا رہے ہیں۔ شمع اور پھول، پروانہ اور بیل کب تک رہ سکتے ہیں؟ بزم کی
برہمی کے ساتھ شمع گئی اور پروانے بھی پھلتے چلتے۔ بارغ کی رونق رخصت اور پھول بھی ذہبت
ساتھ ہی پہلوں نے رخصت سفر باندھ لیا۔

۲۔ لغات : بر خود غلطیہا : اپنے متعلق غلط انداز سے کرنا،
بے درجہ بینیاں مارنا۔

تھکل : برداشت، ضبط۔

شرح : آہ و فریاد ایک جہاں ہے، جو ہوس نے بہار کھلیا۔ قید میں جو
ڈکھ اور رنج پہنچتے ہیں، ان کے بارے میں کیا کہا جائے؟ میں تو یہ کہتا ہوں کہ کب تک
ضبط و برداشت کے جھوٹے وعدوں کی شرح کرتے رہیں!

مطلب یہ کہ قید کا ڈکھ اور غم ناقابل برداشت ہے۔ اگر کوئی شخص برداشت کرے
تو سمجھ لےنا چاہیے کہ اس کے دلو سے غلط ہیں اور گاہ و فریاد کرنا حقیقتہً درد کا اظہار
نہیں بلکہ یہ جھوٹس کا ایک جہاں ہے۔

۳۔ شرح : خستہ حال غریب و درد مند اسد و وہانوں کے دھبوں میں

ابھٹا ہوا ہے۔ اسے وہ پاک فرات، جو مخلوق کی شکلیں آسانی کر رہی ہے اس سے کہے کہ کب تک تغافل بڑتا جائے گا۔

کمالِ بندگی نکل ہے رہیں آزادی

۱۔ شرح :

پھول کے عشق میں

بجز دنیا و کوکال پر

پہنچنا، اس امر پر غور

ہے کہ تمام دوسرے

تغافل متا سے آزادی

حاصل کرتی جائے۔ آہ !

پروں کی ایک شہی اور

پندرہ تھکے، جنہیں انہیں

کہا جاتا ہے۔ ان کے

بارے میں فریاد و نال

کرتی چاہیے۔

زودستِ مشیت، پرو خوارِ اُشیں فریاد

نوازشِ نفسِ آشنا کہاں، مدد

ہر رنگِ نئے ہے نہاں، در ہر استخوانِ فریاد

تغافلِ اُسنہ دارِ غموشی دل ہے

نبوئی ہے محو بہ تقریبِ امتحان فریاد

ہزار آفت و یکِ بابل، بے نواسے اسد

خدا کے واسطے اسے شاہِ بے کساں فریاد

مطلب یہ کہ اگر بیل پھول کی بندگی کوکال پر پہنچنا چاہتی ہے تو لازم ہے کہ اُشیانے

سے کوئی تعلق نہ رکھے۔ یہی اُشیانے کا تعلق پھول سے عشق کا حق واداکر لے ہیں حاصل ہو۔

ہے، لہذا اس کے خلاف فریاد کرنی چاہیے۔

میرزا نے چند لفظوں میں ایک بہت بڑا مضمون پیش کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

انسان خدا کی بندگی کا مدعی ہے تو اسے اس کی کسی چیز سے کسی بھی نوع کا سروکار نہ ہونا چاہیے۔

اگر اس میں ابھٹا ہے گا تو ظاہر ہے کہ خدا کی بندگی کا حق ہوا نہ کر سکے گا۔

۲۔ لغات : نوازش : بہانا۔

شرح : انوس ا بھے کوئی ایسا سانس نہ لا، جو خدا کی حیثیت میں

بھانسنے پر آمادہ ہو، ورنہ نئے کی طرح میری ہڈی ہڈی میں فریاد مہمری ہوتی ہے۔

نئے کو سانس کے زور سے بھایا جاتا ہے۔ ہڈیاں اُٹھ کر خالی ہوتی ہیں، اس لیے وہ کسے سے متاثر ہیں۔ مگر انہیں بھی کوئی آخرا یعنی حقیقت خناس بھانسنے کے لیے سانس سے کام لے تو ہر ہڈی سے فریاد کے نوحے نکلنے لگیں۔

۳۔ **شرح :** محبوب کے تغافل نے میرے دل کو غاموشی کا آئینہ دار بنا دیا ہے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ میرا امتحان ہو رہا ہے اور اس سلسلے میں فریاد بھی منظور نہیں دیر کے لیے رک گئی ہے۔

۴۔ **شرح :** ہزاروں آفتیں ہیں اور ایک بے نوا اسد کی جان ہے۔ اسے بیکسوں کے بادشاہِ اخلا کے لیے میری فریاد کو پہنچے۔

۱۔ **شرح :** ظلم کرنا گدا سے عاشق پر
جو عاشقِ فقیر میں چکا ہو
نہیں شاہانِ حسن کا دستور
اس پر ظلم و ستم کرنا خوش
دوستو! مجھے ستم رسیدہ پر
کے بادشاہوں کا دستور
دشمنی ہے وصال کا مذکور
نہیں۔

۲۔ **شرح :** اے دوستو! میں ستم
کا مٹا ہوا ہوں۔ اب
زندگانی پر اعتمادِ غلط
سے وصال کا ذکر سراسر
ہے کہاں قیصر اور کہاں فقیر
دشمن ہے۔
کچھ جوں اشک اور قطرہ زنی
کے اسد ہے ہنوز دلی قہر

۳۔ **شرح :** زندگی پر بھروسہ کرنا
یا نکل غلط ہے۔ بھلا تباہی، قیصر اور فقیر، جو جلیل القدر بادشاہ تھے، آج کہاں ہیں؟

۴۔ شرح : اسے اسد! آنسو کی طرح آپ بھی قطرہ زلی کرتے ہیں۔ مجھے یعنی ابھی آپ کو ہنسٹ مشقت کاٹنی ہے اور دلی جبر آپ کی منزل مقصود ہے۔ قریب نہیں آتی۔
بہشت روز ہے۔

۱۔ شرح : ہر گرد باد، حلقہ فتر اک بے خودی
مجنون دشت عشق تحیر شکار تر
اے چرخ! خاک بر سر تعمیر کائنات
لیکن بنائے عمدہ وفا استوار تر
آئینہ داغ حیرت و حیرت شکست یاس
سیماب بقرار داسد بے قرار تر
جو بگولہ اٹھتا ہے وہ
بہ خودی کے شکار ہند
کا ایک علت ہے۔ عشق
کے صحرایہ مجنون پہلے
سے زیادہ تحیر کا شکار
ہو گیا ہے۔
مطلب یہ کہ ہر
بگولہ بہ خودی کو بڑھا

را ہے اور مجنون کی وحشت بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

۲۔ شرح : اے آسمان! کائنات کی بناوٹ کے سر پر خاک ڈال۔ یعنی کائنات
کا انجام خواہ کچھ بھی ہو، ہرگز پر دا نہیں، لیکن وفا و دلی کی بنیاد زیادہ پختہ ہوا ہے۔
۳۔ شرح : آئینہ حیرت کا داغ ہے اور حیرت کا امید کی کا شکستہ ہے۔ پارا
غیب ہے اور اسد پاس سے بدرجہا بڑھ کر قیاب ہے۔

۱۔ شرح : فریبِ صنعتِ ایجاد کا تماشا دیکھ
نگاہِ عکس فروش و خیال آئینہ ساز
نئی چیزیں پیدا کرنے
کی صنعت کا فریب
قابلِ غور ہے۔ دیکھو

جہڑی نظر کس پہنچتی زبکہ جلوہ مہیاو حیرت آرا - ہے
ہے اور خیال آئینہ آڑی ہے صفحہ تار سے صحت پرواز
سازی کرتا ہے -

شعر میں ایک ہجوم فائر سے دل، مثل موج لرز - ہے
خوبی یہ ہے کہ تک کے کہ شیشہ نازک و صہا ہے اُگیڑ گداز
خوبی میں ہر دم پر جس

مئے کا عکس پڑتا ہے، وہی دل تک پہنچتا ہے اور انسان ایک لمحے سے بھی کم وقت میں ہمارے
قیما ہے کہ وہ کیا چیز دیکھ رہا ہے - یہ قدرت نے چیزیں بنانے کا ایک کارخانہ قائم کر رکھا
ہے - میرزا کہتے ہیں کہ یہ صنعت بھی ایک دھوکا ہے، لیکن دیکھنے کے لائق ہے -

۲- شرح : مہیاو کا جلوہ دیکھتے ہی ایسی حیرت طاری ہوئی کہ دل میں آؤٹے
کی صورت ہی باقی نہ رہی -

۳- شرح : انگار کی کثرت سے دل موج کی طرح لرزنا مٹا ہے یہ نشو و
ہست نازک ہے اور اس میں شراب ایسی پڑ گئی ہے، جو شیشے کو گھٹا دینے والی ہے
ہجوم فکر کو شیشہ گھٹا دینے والی خراب اور دل کو نازک شیشہ قرار دیا -

۱- شرح : صد تبتی کہہ ہے حزب جبین غربت

میں غریب اولی ہوں، پیرزن میں، ہے غالبہ شہرہ ملور ہنوز
لیکن میری پیشانی میں پا پُرازا آ بار راہ طلب مے میں، ہوا
سیکڑوں تخیل کہ سے مج ہاتھ آیا نہیں یک دائرہ انگور ہنوز
برگئے ہیں۔ یوں سمجھنا گل لکھ، غنچے چلنے لگے اور ہمع ہونے
چاہیے کہ میرے پاس میں سرخوش خواب ہے وہ نرگس، محمور ہنوز
کہہ خود کی ہنگامی کاغذ اسی آتی ہے -

سرخوش خواب ہے وہ نرگس، محمور ہنوز

۲- شرح : اسے استاد تیرگی بخت سے ظاہر ہے
 میں نے شراب کی
 طلب کے ساتھ

جو بھاگ دوڑ کی، اس کے باعث پاؤں پھاٹوں سے بھر گئے، شراب تو کیا مٹی، اس میں
 کھٹا لگوڑا کا ایک دانہ بھی اس میں نہیں آیا

”پاؤں کے ساتھ“ (خطۂ ۲۰) آج کے ساتھ انگو کی مناسبت ظاہر ہے اور یہ سب
 کچھ شراب کے لئے تنگ دود میں پیش آیا۔

۳- شرح : پھول کھل گئے کیاں پھلنے لگیں، صبح ہو گئی، لیکن میرے محبوب
 کی مدد بھری آنکھیں ابھی تک نیند میں مست ہیں۔

۴- شرح : اسے استاد، کھنڈ سیاہ کی تار کی بالکل ظاہر ہے۔ جس توڑ میری
 رات کی صبح ابھی تک نظر نہیں آتی۔

۱- شرح : کون آیا؟ جو چین بے تاب انتظار ہے۔ ہے
 جنبشِ موجِ مہا ہے شوخیِ روتا بہارِ باغ
 آتشِ زارِ بارِ گل کو بجھے ہے فروغ
 ہے دمِ سروِ مہا سے گرمیِ بازارِ بارِ غ
 کون گل، سے ضائع و خاوشیِ بلبلِ آرزو
 نے زبانِ غنچہ گویا، نے زبانِ خارِ بارِ غ

۲- شرح : مہا کے شمسے سانس
 سے ہر پھول کے رنگِ رخ کی آگ بھڑک رہی ہے۔ اس سے معلوم ہو کہ بارِ غنچہ کی گرمی
 بازارِ مہا بھی گرم سرد کی برکت ہے۔

۳۔ شرح : ببل کے ضعف اور خاموشی کو کون مچول تک پہنچا سکے نہ لہنے کی زبان بولتی ہے ، نہ بان کے کانٹے کی زبان میں قوس لگاتی ہے ۔

۱۔ شرح : متی میرے ہی بلانے کو لے آؤ شہار ریڑ !
اے چنگاریاں بھلنے والی آہ ! کیا تیرا ہی
گھر پر پڑا نہ غیر کے کوئی شرار ، حیف
ہی گھر بلانے کیلئے
گل چہرہ ہے کسی خفقانی مزاج کا
متی ! افسوس کو تیری
گھبراہی ہے بیم خزاں سے بہار حیف
کوئی چنگاری خیر یعنی
ہیں میری مشتبہ خاک سے اس کو کدورتیں
رجب کے گھر پر نہ
پڑی۔

۲۔ شرح : پاٹی جگہ بھی داں ہیں تو ہو کر غبار حیف
پھول کسی ایسے شخص
بنتا ، استہ ! میں سرمہ چشم رکاب یار
کہ جہرہ معلوم ہوتا ہے
آیا نہ میری خاک پہ وہ شہسوار حیف
میں کے مزاج پر خفا
غالب ہو۔ آہ ! بہار خزاں کے خوف سے گھبراہی ہے۔ خفقانی کی خصوصیت ہی یہ ہے
کہ وہ ہر شے سے ڈرتا اور گھبراتا ہے۔ یہی کیفیت پھول پر طاری ہے۔ اس سے نتیجہ
یہ نکلا کہ بہار خزاں کے خوف سے ڈر رہی ہے۔

۳۔ شرح : میری مشتبہ خاک یعنی میری ذات سے محبوب مکتدر ہے۔ افسوس !
بچھاس کے دل میں جگہ بھی لی تو غبار بن کر لی۔

۴۔ شرح : اے استہ ! میں محبوب کی رکاب کی آنکھیں سرمہ میں جتا۔ افسوس !
کہ وہ شہسوار میری خاک پر نہ آیا !

”خاک“ سے تم بھی مراد لی جاسکتی ہے اور قبر بھی۔

تاقیامت شبِ فرقت میں گزر جائے گی عمر

شرح :

قیامت تک ہماری عمر
جودائی کی مامت ہیں ہیں

سات دن ہم پر بھی بیماری ہیں سحر ہوئے تگ

ہیت جائے گی۔ ہم پر موت سات دن بیماری ہیں، پھر صبح ہو جائے گی۔

سات دن سے بظاہر مراد ایک ہفتہ ہے اور زندگی کا دوں ہفتوں میں ہی پورا ہو جائے گا

آنکھ میں پارہ لائے جگر درمیانِ اشک

۱- شرح :

آنسوؤں کے ساتھ جگر

کے ٹکڑے بھی آگئے

ہیں۔ کہنا چاہیے گناہوں

کا معاملہ بیش قیمت اصل

لے کر آیا ہے۔

لایا ہے اصل بیش بہا کاروانِ اشک

روئے نے طلاق تہی نہ چھوڑی کہ ایک بار

شرکاء کو دوں فشار، پٹے امتحانِ اشک

خضر میں جگر کے ٹکڑوں کو بیش بہا غلوں سے نشیور دی ہے۔

۲- شرح : میں روتے روتے اس قدر کمزور و ناتواں ہو گیا ہوں کہ اتنی طاقت

میں نہیں رہی، آنسوؤں کی بجائے پڑتال کے لیے پلکیں ایک مرتبہ جھپکوں۔

مطلب یہ کہ جھپکا کر دیکھ لوں، آنسو آتے ہیں یا نہیں؟

اے آرزو شہیدِ رونا بخوں بہانہ مانگ

۱- شرح :

اے آرزو! تجھے

وفا کی شہادت نصیب

ہوئی ہے، اس لیے

خون کی قیمت نہ مانگنا

چاہیے۔ حیرانِ مروت

جز ہر دست و بازو سے قاتل و عائد مانگ

برجم ہے بزمِ غنچہ، ہر یک جنبشِ نشاط

کا شائد بیکہ تنگ ہے، غافل؛ ہوا نہ مانگ

ہیں دور گردِ عرضِ رسومِ نیاز ہوں

دشمنِ سحر، دے نگاہ آشنا نہ مانگ

یہ ہے، قاتل کے ہاتھوں اور بازوؤں کے لیے دعا مانگ کر وہ سلامت رہیں اور مجھے
نومرتہ ترقی کریں۔

۲۔ شرح : کل کی فصل خوشی کی ایک ہی جنبش سے درہم برہم ہو جاتی ہے۔ یہ
گھر بہت تنگ ہے۔ اسے غافل ! اس کے لیے ہوا کی طلب نہ کر۔

کل کی خوشی میں اگر کبھی ہے اور اس کی ہنکڑیاں تھوڑی ہی دیر میں درہم برہم ہو جاتی
ہیں۔ وہ ہوا کی آرزو مند ہوئی اور اپنی ہستی ختم کر دیتی ہے۔ اسے غافل ! تو اس سے سبق
لے، میرا گھر نہایت تنگ ہے، اس لیے ہوا کا طلب گار نہ ہو اس کے آتے ہی تیرا گھر بھی
سلامت نہ رہے گا۔

شرح : مڑگاں تنگ رسائی محبت جگر کہاں
جگر کے ٹکڑے ہوں
اے داسے گر نگاہ نہ ہو آشنا سے گل
تنگ نہیں پہنچ سکتے۔

جب یہ ممکن نہیں تو افسوس ! اگر تیری نگاہ پھول کی آشنا نہ ہو۔
مطلب یہ کہ اگر ٹو جگر کے ٹکڑوں کو مڑگاں تنگ نہیں لاسکتا تو کم از کم پھول کی خفقت
سے تو آشنا ہو جا، جو کہتے ہی سراپا خون بن جاتا ہے۔

۱۔ شرح : بد ہے آشیہ طاقی ہلال
ہلال کا طاقی، وہ کالی کا
آئینہ ہے۔ یعنی ہلال
ہر حال میں بد رہتے
کا۔ نالوہ ! ہر نقصان
میں کمال نمایاں ہے۔
ہلال یعنی نیا چاند نقصان
بد ہے آشیہ طاقی ہلال
غافل ! نقصان سے پیدا ہے کمال
فد سے تیرے ہے اس کی روشنی
ورنہ ہے خود شید یک دست سوال
شورِ حشر اس فتنہ قامت کے حضور
سایہ آسا ہو گیا ہے پائمال

ہو جو تباہی پیر و فکر اسد
کی علامت ہے، وہی بال بڑھتے بڑھتے
اپنا نقصان پورا کر کے
ماہِ کامل بن جاتا ہے، گویا نقصان ہی سے کمال پیدا کرتا ہے۔

۲۔ شرح : اے خدا ! سورج کو دشمنی صرف تیرے نور سے ملتی ہے، مگر
یہ تو اس کے لیے فیاض بخش نہ ہو تو اس کی حیثیت ایک دوست سوال کے سوا کیا ہے ؟
یعنی ایک ہاتھ ہے، اگر مانگنے کے لیے پھیلا ہوا ہے۔

۳۔ شرح : میرے محبوب کا قامت فتنے پیدا کرتا ہے۔ اس کے سامنے
قیامت کا خوف نامی سایہ کی طرح پامال ہے۔

۴۔ شرح : اگر تباہی اسد کے من گھر کی پیروی کرے تو اس کی پیروی کی کلی
پیروں کے نیچے خود بخود پھول بن جائے۔

بہر عضو غم سے ہے شکن آسا شکستہ دل
شرح : میرا جوڑ جوڑ غم کے
ہاتھوں شکن کی مانند
ہوں زلفِ یار ہوں میں سرا پا شکستہ دل
دل شکستہ ہے۔ میں سر سے پاؤں تک زلفِ محبوب کی طرح ایک ٹوٹا ہوا دل ہوں۔

۱۔ شرح : ہم غلط سمجھے تھے، لیکن زخمِ دل پر رحم کر
اے صبحِ وصال !
اپنی غلط فہمی سے
آگاہ ہو گئے۔ جس
معلوم ہوا کہ غم کے
پیروں میں تو ہی جنت
آخر اس پردے میں تو ہستی تھی اے صبحِ وصال
شکوہ درد و دردِ داغ اے بے وفا معذور دکھ
خوں بہائے یک جہاں آمید ہے تیرا خیال

مثنوی، اب اس پر دم کر۔ اُس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسد
مطلب یہ کہ صبیح وصال اُس کو نصیب ہوتی ہے،
مالِ سخی کو مباح اور خونِ صوفی کو حلال
جس کا دل زخمی ہو۔

۲۔ شرح : میرا شکوہ درد بنا، درد نے داغ کی صورت اختیار کر لی۔ اسے
بے وفا ! جگے معذور سمجھ۔ تیرا خیال امید کی پور بھی دنیا کا خون بہا ہے۔
۳۔ شرح : اسے اسد ! میں اُس تم پیر محبوب پر عاشق ہوں، جس کے
نزدیک شئی کا مال جائز اور صوفی کا خون حلال ہے۔

اس شعر سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ میرزا اپنے آپ کو شئی اور صوفی دونوں
قرار دے رہے ہیں۔

۱۔ شرح : گر کرے انجام کو آغاز ہی میں یاد، گل
اگر پھول آغاز ہی میں
غنجے سے، منقارِ بلبل وار ہو، فریاد، گل
انجام کو یاد کرے تو کی
سچی عاشق ہے فردغ افزائے آپ رشے کار
کی حالت میں ہی بلبل کی
ہے شرارِ تیشہ بہر تربت فریاد، گل
چو گل کی طرح سراپا فریاد
ہی بائے۔

۲۔ شرح : عاشق کی سس و کجش ہی سے اس کے کام میں رونق اور
نوب و زنجبٹ زیادہ ہوتی ہے۔ دیکھیے، فریاد نے پتھر پر تیشہ پلایا۔ اس سے جو شے
لگے، وہی اس عاشق کی قبر کے لیے پھول بن گئے۔

شرح : شوق بے پردا کے ہاتھوں مثلِ سائر نادار دست
دلِ شوق بے پردا
کی پیچھا ہے آج نالے خارجِ آہنگ ہول
میں مبتلا ہے اور کچھ

ہوئے سادگی طرح بے سُرے تاسے کھنچ رہا ہے۔

”شوقی بے پروا“ کا مطلب ہے وہ عشق جو ہر شے سے بے پروا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسے بے سُری فریاد و فغاں میں کبھی کوئی جگہ نہیں۔ ایسی فریاد و فغاں کو گڑسے ہوئے سادگی صدا قرار دینا بے محذور و ناجائز ہے۔

۱- شرح :
عشق کی جست کے
مطابق انوار کی بارش
بر قدر حوصلہ عشق جلوہ ریزی ہے
وگر نہ خانہ آئینہ کی فضا، معدوم

ہوتی ہے، ورنہ آئینہ غلنے کی فضا میں کیا رکھا ہے؟
مراد یہ ہے کہ انسان عشق میں جو درجہ حاصل کرے، اسی کے مطابق دل میں شوق
پیدا ہوگی، ورنہ دل میں بجائے خود کیا رکھا ہے؟

۱- شرح :
محبوب سے جدائی کی
رائوں میں ہم سونگے
اور زباں شمع کی طرح
گرمی افادہ کا ملغہ بنے
فرط بے خوابی سے ہیں شبہاتے ہجر یار میں
جوں زباں شمع، دواغ گرمی افادہ ، ہم
بسکہ وہ چشم و چراغ محفل اغیار ہے
چپکے چپکے جلتے ہیں جوں شمع ماتم خانہ ہم
رہے۔

مطلب یہ کہ جدائی میں امتنا یا درد سنا تے رہے، جس طرح شمع جل جل کر سوز کی داستان
سنا تے ہے۔ آخر اس جلن کے باعث ہم نے فارغ کی صورت اختیار کر لی۔

۲- شرح : ہمارا محبوب غیروں کی محفل کا چشم و چراغ بنا ہوا ہے اور ہم ماتم خانے
کی شمع کی طرح چپکے چپکے جل رہے ہیں۔

۱۔ لغات :
شعلہ درودن :
شعلہ کاٹنا، بین شعلہ
حاصل کرنا۔

نفس ہونہ معزول شعلہ درودن
کہ غبطہ پیش سے سرور میں ہم
تماشاے گلشن، تمنائے چمیدن

شرح :
ہم دل کی پیش کو ضبط
کر کے چنگاریاں بوسے
ہیں۔ اس سے شعلوں
کی فصل تیار ہو رہی ہے
ہمارے سانس کو چلیجیے
کہ شعلوں کی فصل کاٹنے
سے باز نہ رہے اور
بدستور یہ پیداوار جمع کرتا جائے۔

بہار آفرینا، گنہگار ہیں ہم
نہ فوق گریباں نہ پمدائے داماں
نگہ آشنا سے گل و خار ہیں ہم
استد! شکوہ کفر و دمانا سپاسی
ہجوم تمنائے ناچار ہیں ہم

۲۔ شرح : ہم نے کائنات کا باغ دیکھا اور اس سے بھول چھٹنے کی تمنا پیدا
ہوئی۔ اسے بہار پیدا کرنے والی فاسد پاک! ہمیں اپنے گناہوں کا اقرار ہے۔
مطلب یہ کہ اس دنیا کی کسی چیز سے ہمیں سرور کار نہ ہونا چاہیے تھا اور لازم تھا
کہ تیرے سوا کسی کی تمنا نہ رکھتے، لیکن تیری بہار آفرینی کی بدولت ہمیں مختلف چیزیں پیار سی
لگیں اور ان کی طرف مائل ہو گئے یہ گناہ تھا اور ہیں اس کا اقرار ہے۔

۳۔ شرح : ہمیں نہ گریباں کا ذوق ہے اور نہ دامن کی پروا ہے۔ ہم بھول اور
کائناتوں سے آشنا ہو چکے ہیں۔ یعنی بھول گریباں چاک کر لیتے ہیں، کائناتے دامن الجھا لیتے ہیں۔
جب ہم نے ان چیزوں سے آشنائی پیدا کر لی تو گریباں و دامن کو ہٹائے رکھنے کی کیا صورت
باقی رہی !

۴۔ شرح : اسے استد! شکایت کرنا کفر ہے اور دمانا شکر گزاری کی دلیل

ہے۔ آہ اتنا نہیں اتنی پیدا ہو گئیں کہ ہم بالکل بے بس رہ گئے۔

مضبب یہ کہ تمناؤں کی فراوانی نے ہم سے شکایت بھی کرائی اور دعا بھی۔ پہلے دعا کرتے رہے کہ یہ تمنا پوری ہو جائے پوری نہ ہوئی تو شکایت شروع کر دی، حالانکہ دونوں چیزیں غلط تھیں دعا کا مضبب یہ تھا کہ جو کچھ اس نے دیا، اس پر ہم نے قناعت نہ کی، اس طرح کفر کے مرکب ہوئے۔ شکایت اس لیے کی کہ جو کچھ اس نے عطا کیا تھا، اسے کافی نہ سمجھا۔ یہ مزید ناخوگر گوارا ہی تھی۔ ہم ایسا نہ کرتے، اگر آرزوؤں کی فراوانی ہمیں بے بس نہ کر دیتی۔

صبر اور یہ ادا کہ دل آدے اسیر چاک
درد اور یہ کمیں کہ روئے نالہ وا کروں
۱۔ شرح :
دعویٰ صبر کا کر رہا ہوں
اور حال یہ ہے کہ چاہتا ہوں، دل چاک گریبان میں قید ہو کر آئے۔ یعنی گریبان چاک کروں تو دل بھی ساتھ نکل آئے۔ درد ہو رہا ہے اور اس گھات میں بیٹھا ہوں کہ آہ و فریاد کا کوئی راستہ نکل جائے تاکہ دل کی بھڑاس نکل جائے۔

وہ التماس لذت بیداد ہوں کہ میں
تیغِ ستم کو پشتِ خمِ التخب کروں
۱۔ شرح :
مجھے ظلم و جور کی لذت
کا اتنا شوق ہے کہ
اس کے لیے باقاعدہ
التماس کرتا رہتا ہوں
اور التماس بھی عام طریقے
وحشتِ بدواغِ سائے بالِ ہما کروں

پر نہیں، بلکہ ظلم و جور کی تنوار کے خم کو اپنی پیشہ کا خم بنا کر اٹھا کرتا ہوں۔

۲۔ شرح : اقبال کی احسان مندی سے میں اتنا گھبراتا ہوں اور پریشاں ہوتا

ہوں کہ اگر ہمارے ہر دن کا سایہ مجھ پر پڑے گا تو اس کا داغ دیکھ کر دُور جنگ جہاؤں۔
 چنا کا سایہ بہت باہر کھتا مانا جاتا ہے اور اسے اقبال مندرجی کی دلیل سمجھا جاتا ہے،
 لیکن غائب اس سے اتنا گھبراتے ہیں کہ سایے کا داغ بھی کہیں دیکھ لیں تو دُور
 بھاگ جائیں۔

۱۔ لغات : فلکِ سفلی بے محابا ہے
 بے محابا، اچھے تر ہے۔
 شرح : اس ستم گر کو انفعالی کہاں
 کینہ آسان بالکل ہے
 بوسے میں وہ مضائقہ نہ کرے
 ترس اور بے رحم ہے۔
 پر مجھے طاقتِ سوال کہاں
 اس ظالم کو پہننے کسی
 نظم پر شرمندگی کہاں ہوگی !

۲۔ شرح : میں سمجھتا ہوں کہ محبوب بوسہ دینے میں تامل نہ کرے گا، لیکن
 مجھ میں ایسا سوال کرنے کی قوت ہی کہاں رہی ہے، ضعف کا یہ عالم ہے کہ کوئی سوالِ باہن
 پر آہی نہیں سکتا۔

لغات : آنسو کھوں، کہ آہ ! سوار ہوا کہوں ؟
 عنانِ گسیختہ : ایسا عنانِ گسیختہ آیا کہ کیا کہوں ؟
 بگ ٹٹ، چہرہ
 تیز رفتار۔

شرح : محبوب اتنی تیز رفتار سی سے آیا کہ سمجھ میں نہیں آتا، اس آمد کو
 کس چیز سے تشبیہ دوں ؟ آنسو کھوں، جو پہلے اختیار آنکھوں سے ٹپک رہا تھا ہے یا یہ
 کہوں کہ ہوا کے دوش پر سوار آیا۔

میتر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب

شرح :

اے غالب! میر تقی

کے شعر و سخن کی کیفیت

جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

کہا بیان کروں؟ اس کا دیوان تو رونق، اور غنائی اور بہار میں باغِ کشمیر سے کم نہیں۔

یعنی اس میں نہایت دلکشا اور دلکش مضامین کی فراوانی ہے۔

کسی کو زخود رستہ کم دیکھتے ہیں

شرح :

ہم نے کسی کو اپنے تالیف

سے باہر نہ نکالا ہوا اور

کہ آہو کو پا بندِ رم دیکھتے ہیں

یہ خود نہایت کم دیکھا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہرن بیوزد ہو کر بھاگتے ہیں ہم نے تو انہیں

بھی دوڑ کے پابند دیکھا ہے یعنی انہیں بھی اد خود رفتہ نہیں کہا جاسکتا۔

ناگوارا ہے ہمیں احسانِ صاحبِ دولت

شرح :

ہمیں دولت والوں کا

احسان ہرگز گوارا نہیں

ہے زِرِ گل بھی نظر میں جو ہر فولادیاں

اور کیوں گوارا ہوا ہم تو پھول کے زیرے کو بھی فولاد کے جوہر سمجھتے ہیں۔

پھول میں زورِ زبرد ہوتا ہے اسے زِرِ گل کہتے ہیں۔ وہ حقیقت میں زرنہیں ہوتا،

لیکن میرزا کو دولت مندوں کے احسان سے اتنی وحشت ہے کہ زِرِ گل کو بھی جو بعض بولے ہم

زرد ہے، فولاد کے جوہر کی طرح کاٹ ڈالنے والی چیز سمجھتے ہیں۔

ہے نزاکت بسکہ فصلِ گل میں معمارِ چین

۱۔ شرح :

بہار کا موسم آگیا، اب

نزاکتِ باغ کی تعمیر میں

قالبِ گل میں ڈھلی ہے خشکِ دیوارِ چین

معروف ہے کہ کیفیت
 یہ ہے کہ باغ کی دیوار
 کو جو اینٹیں لگی ہوئی ہیں
 وہ بھی پھول کے قالب میں ڈھالی گئی ہیں۔

مقصود یہ ہے، فصل بہار میں باغ اس درجہ تروتازہ اور شاداب ہو گیا ہے
 کہ وہاں کی کوئی بھی چیز سخت نہیں رہی، بلکہ ہر درجہ نرم، ملائم اور نازک بن گئی،
 یہاں تک کہ دیوار چین میں بے شمار پھول اُگ آئے ہیں۔ دیکھیں تو کہہ سکتے ہیں کہ
 پوری دیوار کی اینٹیں قالب گل میں ڈھالی ہیں۔

۲- شرح : وقت آگیا ہے کہ بیل مسکین زلیخا کا منصب اختیار کرے،
 کیونکہ پھول کے بوسے نے باغ کے بازار میں جلوہ دکھانا شروع کر دیا ہے۔

۱- شرح : کس دل پہ ہے عزم صفت مرگانِ خود آرا
 آئینے کی پایاب سے اتری ہیں سپاہیں
 دیر و حرم آئینہ تکرارِ تمتا
 و اماندگی شوق ترا شے ہے پناہیں
 اے محبوب اتیری
 پلوں کی صف اپنے
 آپ کو آراستہ کر کے
 نکلی ہے۔ ذرا بتا کر اس
 صفت نے کس کے

دل کا قصیدہ کیا ہے اور کس پر حملہ مقصود ہے؟ آئینہ سامنے رکھ کر تو نے جو بیرون
 تیار کی ہے، گویا یہ آئینہ کا دریا پیدل عبور کر کے آئی ہے۔ یہ کہیں پرورش کرے گی؟

۲- شرح : بختانہ اور کعبہ کیا ہیں؟ محبوبِ بختی کی آرزو دل میں تازہ کرنے
 کے آئینے ہیں۔ یہی دونوں جگہ اُس محبوب کی آرزو و سہرائی جا رہی ہے۔ ہم سے پوچھو
 تو کہیں کہ بختی چلتے چلتے خشک گیا تو اس نے کچھ دیر سستانے کی غرض سے پناہ گاہیں
 خواہش لی ہیں۔

۱۔ لغات :
متصل : لگا ہوا
مسل۔

شرح :
میں ان آنسوؤں کی
تبیح ہوں جو شرک
سے چمکے۔ گویا میری
ساری عمر مسلسل تلمسے
گننے میں بسر ہو گئی۔

انکھوں سے
مسل آنسو چمکنے کو
اختر شامی قرار دیا۔

۲۔ شرح :
میری شکل ہی سے
انسوؤں کی غلاتیں

نمایاں ہیں۔ میری شکل
کنگھی کی ہے جو پائپ
دست کو دانتوں سے
چھانٹنے والا ہے۔

۳۔ شرح :
سمجھ لینا چاہیے کہ میں اس

کی متصل ستارہ شناسی میں عمر صرف
تبیح اشکبارے زمزگاں چکیدیہ ہوں
ظاہر ہیں میری شکل میں انسوؤں کے نشان
جو شانہ پشت دست بردن داں گزیدیہ ہوں
ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدیہ ہوں
پیدا نہیں ہے اصل تنگ و تازہ جستجو
مانند موج آب، زبان بریدیہ ہوں
سر پرے دابل ہزار آردو رہا
یارب! میں کس غریب کا بخت رمیدیہ ہوں
میں بے ہنر کہ جو ہر آئینہ تنہا عیث
پائے نگاہ خالق میں خار غلبیدیہ ہوں
میرا نیاز و عجز ہے مفت بتان، اسد
یعنی کہ بندہ یہ قدم نا خریدہ ہوں
میں تصور ہی میں پیش و نشاط کے جوش سے لہنے گارہ ہوں۔ سمجھ لینا چاہیے کہ میں اس
بارخ کی بلبل ہوں، جو ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔

۴۔ شرح : کچھ معلوم نہیں کہ میں جستجو میں جو دوڑ دھوپ کر رہا ہوں،

اس کا مقصد اور عزم و غایت کیا ہے؟ میں پانی لڑکی کی طرح کٹی ہوئی زبان ہوں۔

”موج آب“ کو تڑپاؤ بڑیہ و گما، جو نہایت سوزوں تظہیر ہے۔ ساتھ ہی یہ

واضح ہو گیا کہ موج آب ہر وقت تک وہ دو میں لگی رہتی ہے، لیکن اس کی رنگ و دو کو مقصد واضح نہیں۔ چند افظوں میں ایسے عجیب و غریب معانی اس خوبی و دلآویزی سے جمع کر دینا واقعی ادبی معجزہ ہے۔

۵۔ لغات : بختِ رمیدہ : بھاگا ہوا نصیب، ناسازگار بخت، پھوٹی ہوئی قسمت۔

شرح : میری گردن پر ہزاروں آرزوؤں کا وبال موجود ہے، یعنی جتنی آرزوئیں ہیں ان میں سے کوئی بھی پوری نہ ہوئی اور ان کا وبال سر پر رہ گیا۔ اسے خدا! میں کس غریب کی پھوٹی ہوئی قسمت ہوں!

آرزو پوری ہو جائے تو وہ خوش نصیب کی دلیل ہے، پوری نہ ہو تو اسے نصیب کے سر پر وبال بھنا چاہیے۔

۶۔ لغات : خارِ غلیبہ : چبھا ہوا کاٹا، کھٹکا ہوا کاٹا۔

شرح : آپ مجھے بے ہنر سمجھیں، لیکن میں آئیے کا جو ہر خطا، یعنی فساد کی آئینہ کی ساری قدر و قیمت میری دہ سے ملتی۔ اسوس کو کسی نے قدر و قیمت نہ پہچانی اور دنیا نے مجھے اسے نگاہ میں کھٹکا ہوا کاٹا سمجھ لیا۔
کانٹھے اور جوہر کی مناسبت نتائج تشریح نہیں۔

۷۔ لغات : مفتِ بیتاں : بتوں کے لیے بلا قیمت۔ کچھ خرچ کیے بغیر بتوں کے لیے حاضر۔

شرح : اے استاد! میری نیاز مندی اور عاجزی حینوں کے لیے مفتِ حاضر ہے۔ انہیں کچھ خرچ نہ کرنا پڑے گا۔ گویا میں غلام ہوں، جو دام و دم دے دے بغیر خرید لیا گیا۔

نہ افشا، معنی مصنفوں، نہ املا، صورتِ موزوں
 لغات : ہر زہ عنوان : یہی
 عنایت نامہ ہائے اہل دنیا ہر زہ عنوان ہیں
 کہتے ہیں بے معنی ہوں۔
 یعنی یہی مخط، جس سے کسی کو کوئی فائدہ نہ پہنچے۔

شرح : اہل دنیا جو عنایت نامے لکھتے ہیں، وہ سب سے ہیں، جس سے کسی کو
 کوئی فائدہ نہ پہنچے، کیونکہ ان کی عبادت سے کوئی مفسد نہ نکالا جاسکتا ہے اور ان
 کی لکھائی کی صورت درست ہوتی ہے۔

جس خط کا املا نادرست اور عبارت بے معنی ہو، اس سے کسی کو کیا فائدہ پہنچ
 سکتا ہے؟

۱- لغات : اے نواساز تماشا، سر پر کف جلتا ہوں میں
 نواساز تماشا :
 نظارہ دیکھ کر خوش
 سے گیت گانے والا،
 یعنی خوش ہونے والا۔
 شرح :
 اے مجھے دیکھ کر خوش
 ہونے والے : میں سر
 بخیل پر رکھ کر گل رہا
 ہوں۔ ایک طرف میرا
 دل بل رہا ہے اور
 ایک طرف میں خود آگ
 اے نواساز تماشا، سر پر کف جلتا ہوں میں
 اک طرف جلتا ہے دل اور اک طرف جلتا ہوں میں،
 شمع ہوں لیکن ہر پاؤں رفتہ خارِ جستجو
 مدعا گم کردہ ہر سو، ہر طرف جلتا ہوں میں
 ہے تماشا گاہِ سوزِ تازہ ہر یک عضو تن
 جوں چراغِ خانِ دہلی صاف بر صفت جلتا ہوں میں
 شمع ہوں تو بزم میں جا پاؤں، غالب کی طرح
 بے محل، اے مجلسِ آراے نجف، جلتا ہوں میں
 مکی نذر ہو رہا ہوں۔

۲- شرح : میں شمع ہوں، لیکن ایسی شمع، جس کے پاؤں میں جھنجھوکا کاشا چھو گیا ہو۔ میرا اصل مقصد گم ہو گیا، اب ہر طرف ہٹتا پھرتا ہوں۔ اسی حال میں کاشا چھو گیا۔ غلغلہ کر مقصد کو تلاش کر رہا ہوں، وہ نہیں ملتا۔

۳- شرح : میرے جسم کا جوڑ جوڑ نئی بنی کی تھانگہ ہے۔ میری کیفیت دو بالوں کے چراغوں کی ہے، جو نظاروں میں جھلا کرتے ہیں۔

۴- شرح : اگر میں شمع ہوں تو مجھے غالب کی طرح کسی محفل میں جگہ مل جانی چاہیے۔ اسے بختِ اشرف میں مجلسِ آراستہ کرنے والے بزرگ ۱۱ سے حضرت علیؑ! اب تو میں بے موقع دسے عمل بل رہا ہوں۔

۱- شرح :
 آنکھوں میں آنسوؤں کا
 آنے ہیں، لیکن دل کے
 مست ہونے کا موقع
 اور عمل ان آنسوؤں
 سے آگے نہیں یوں
 بھیجے کہ ہمارا ایک خراب
 غامد دریا کے پار بھی
 ہے۔

طلسمِ مستی دل آں سوئے هجومِ سرشک
 ہم ایک میکدہ دریا کے پار رکھتے ہیں،
 جہاں ہے گریخ بے باک، ضبط سے تسبیح،
 ہزار دل پہ ہم اک اختیار رکھتے ہیں
 بساطِ ہچکچی میں بربنگِ ریگ رواں
 ہزار دل بہ وداعِ قرار رکھتے ہیں
 جنونِ فرقتِ یارانِ رفتہ ہے غالب!
 بسانِ دشتِ دلِ پُر غنبار رکھتے ہیں

مطلب یہ کہ
 خوب روئیں گے نودل
 مست و بیخود ہو جائے

۵- گویا آنسوؤں کا دریا جو رگِ رگ میں گے تو خراتِ فلانے میں پہنچے نہیں گے۔

۲- شرح : ہمارا رونا اسے خوف و خطر جاری تھا۔ ہم نے ضبط سے کہا

لیا اور وہ تسبیح پڑھ گیا۔ دیکھیے، آنسوؤں کے ہزاروں قطرے دلوں کی خشیت رکھتے ہیں، لیکن ہمیں ان سب پر قابو حاصل ہے۔

۳۔ **شرح :** ہم بالکل بے مایہ ہیں۔ ہماری خشیت کچھ نہیں، لیکن ہر لحظہ جلتی ہوئی ریت کی طرح ہمارے پاس ہزاروں دل ہیں، جو برابر ضبط و صبر کو رخصت کرتے رہتے ہیں۔

ریگب رواں صرا کی وہ ریت، جو ہوا سے ہر لحظہ جگہ بدلتی رہتی ہے اور دُکھ سے دیکھیں تو پانی کی طرح بہتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے ذرے کہیں ٹکرتے نہیں، بلکہ آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ شاعر نے ان ذروں کو دل قرار دے لیا، جو ضبط و صبر کے یکدم خالی ہوں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ریگب رواں بالکل بے مایہ ہوتی ہے اور کسی کام نہیں آسکتی، لہذا اسے بیکس کہا۔

۴۔ **شرح :** اے غالب! ہمیں کچھ بڑے ہوئے دوستوں کی جہائی نے دیوانہ بنا رکھا ہے۔ ہمارا دل بھی صرا کی طرح غبار سے بھرا ہوا ہے۔

ہوئی ہیں آبِ شرم کو شش بے جا سے تدبیریں **شرح :**
عرق ریز پیش ہیں موج کی مانند زنجیریں تمام تدبیریں بے سود
کوشش کی شرم سے
پانی پانی ہو گئیں۔ دیوانوں کو جو زنجیریں پہنائی گئیں، پیش کے باعث ان سے لہروں کی طرح پسینہ چھلنے لگا۔

تدبیریں یہ بتائیں کہ دیوانوں کو زنجیریں پہنا دی گئیں تاکہ وہ دیوانگی کا مظاہرہ نہ کرنے پائیں، لیکن یہ کوششیں بے سود بتائیں، لہذا ناکام ثابت ہوئیں۔ دیوانگی کے جوش سے زنجیروں کو پسینہ آگیا اور لہروں کی طرح نیچے گرنے لگا، گویا بیکار ہو گئیں۔

شرح : کس کو دُور یارب! حساب سوزِ ناکہا سے دل

اے میرے اشد! میں اپنے دل کی جان
آمد و رفتِ نفسِ جزوِ شعلہ پیمائی نہیں
کاحساب کے دُور؟ میں یہ نہیں لیتا چاہیے کہ سانس کا آنا جانا شعلے ناچنے کے سوا
کچھ نہیں۔

مطلب یہ کہ سانس آمد و رفت میں شعلوں ہی پر چلتا رہتا ہے۔ اس کا حساب
کون کر سکتا ہے۔

۱۔ لغات : ہو سکے کب کلفتِ دل، مانعِ سیلانِ اشک

کلفت : تکلیف۔
سختی، بے پیمانی۔

شرح : ہے طلسمِ دہر میں صدِ حشرِ پاداشِ عمل

دل کی تکلیف، آنسوؤں
آگہی غافل کہ یکِ امروز بے فردا نہیں
کا جوش نہیں روک
سکتی۔ مثال یوں بھیجیے کہ ساحلِ دریا کی مٹی دریا کے بہاؤ میں نہکاؤ پیدا نہیں کر سکتی۔

۲۔ شرح : زمانے کا علم ایسا تیار کیا گیا ہے کہ اس میں ہر عمل کے بدلے
کے لیے نیکو وں محشر موجود ہیں۔ لیکن انسانی طورِ غافل ہے اور نہیں جانتا کہ یہاں آج
نیک کوئی امروز پیدا نہیں ہوا، جس کے ساتھ قرضہ لگا ہو۔ یعنی انسان آج جو کچھ
کرتا ہے، کل اس کا بدلہ مل جاتا ہے۔ پھر کیوں نہ ہم سمجھیں کہ یہاں ہر وقت حشر پاتا ہے،
انسانی اعمال کا جائزہ لیا جا رہا ہے، ساتھ ساتھ بدلہ دیا جا رہا ہے!

۱۔ لغات : ہے وطن سے باہر اہلِ دل کی قدر و منزلت

عزالت : اگر شہر گری
عزالت آبادِ صدف میں قیمتِ گوہر نہیں
منہائی۔

شرح :

دیکھیے، موتی جب تک

سیپی کے گوشہ میں رہتا

ہے، اس کی کوئی قیمت

نہیں ہوتی سیپی سے

نکل کر باہر آتا ہے تو

باعثِ ایذا ہے برہم خوردہ بنی بزمِ سرور

لحنتِ لہنتِ شیشہ بشکتہ جز نشتر نہیں

کب تک پھیرے اسد بہانے تختہ پر زبان

حلاقت لب تشنگی، اسے سابق کوثر نہیں

کبھی تاج و تخت کی قیمت بتاتا ہے، کبھی بارہن کر حسینوں کے گلے میں پہناتا ہے۔ یہو کہایت

اہل دل کی ہے۔ وہ جب تک وطن میں رہیں، ناقہ قدمی کا شکار نہ ہوتے ہیں۔ دھست باہر نہیں

تو قدر و منزلت پاتے ہیں۔

۲۔ شرح : بیش و سرور کی محفل و بزم برہم ہو جائے تو ڈکھ کا باعث ہوتا

ہے۔ شیشہ فوت کر دینا و ریزہ ریزہ ہو جائے تو ہر کچھ نشتر کا حکم رکھتی ہے اور نشتر کا چبنا

باعثِ ایذا ہے

۳۔ شرح : اسے سابق کوثر ! اب پیاس برداشت کرنے کی طاقت نہیں۔

آخر آپ کا اسد کب تک اپنے جھٹے ہوئے لبوں پر زبان پھیر پھیر کر گزارہ کر رہے؟ اس

پر دم فرمائیے اور لطف و کرم سے اس عاجز کی پیاس بجائیے۔

۱۔ شرح :

اگر محبوب کے قدم کی یاد

میں تم کی آگ کے شعلے

بلند ہوں تو بگر کا ایک

ایک داغ صبحِ حجاب

کا سورج بھی مائل۔

بہ یادِ قیامت اگر ہو بلند آتشِ غم

بہر ایک داغِ جگر، آفتابِ محشر ہو

ستمشکی کا کیا دل نے حوصلہ پیدا

اب اس سے ربط کروں جو بہت شکر ہو

۲۔ شرح : دل نے غم و جور پہنے کا حوصلہ پیدا کر لیا۔ اب میں اسی خوب سے

ربط مضطرب پیدا کروں گا، جو بعد درجہ ظالم ہوتا کہ وہ ستائے اور دل لطف اٹھائے۔

۱- شرح : بے درد سر پر سجدۂ اُفت نذر نہ ہو
 درد عشق کے بغیر سر کو محبت کے سجدے
 جوں شمع غوطہ داغ میں کھا، اگر وضو نہ ہو
 بے ہنگام چاہیے۔
 زلف خیال نازک و اظہار بے متحرار
 اگر تجھے وضو نہیں تو شمع کی اہند داغ میں غوطہ
 یارب! بیان شانہ کشی گفتگو نہ ہو
 لگا لے۔
 تمثال ناز جلوہ شیرنگ اعتبار
 شمع جلتی ہے تو پگھل پگھل کر اس میں سے قطرے نکلتے دہکتے ہیں یہی اس کا وضو ہے۔
 یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ محبت درد کی متقاضی ہے

۲- شرح : خیال کی زلف نازک ہے اور قوتِ اظہار بختاب ہو رہی ہے۔ اسے
 میرے خدا! بیان کہیں! حدِ حیات کی لگھی نہ چکا لے گئے
 بانوں میں لگھی کی جائے تو کچھ نہ کچھ تکلیف ضرور ہوتی ہے۔ جو بال نازک ہیں، وہ شانہ
 کشی کی نہ محبت برداشت نہیں کر سکتے۔

۳- لغات : تمثال : مجسمہ، پیکر۔
 شرح : ہم نے ناز کا جو پیکر تیار کر رکھا ہے، یہ صرف اعتبار کی بزرگی کا کرشمہ
 ہے۔ یعنی محض ایک اعتبار ہی شے ہے۔ اگر ہم اعتبار کا آئینہ سامنے رکھیں تو ہوشی کا شہیت
 رکھتی ہے، وہ تو عدم ہے؟
 مطلب یہ کہ اس دنیا کی ہر شے محض اعتبار کا کرشمہ ہے۔ اس کی حقیقت کچھ نہیں۔

شرح : بہر حال پردوں یعقوب الٰہی خاک سے
 حضرت یعقوب کی روح کو آدمِ راحت
 وام ایسے ہیں بد پر داز، پیراہن کا، بُو

پہنچانے کی طرف سے حضرت یوسفؑ کے پیراں کی خوشبو خاک کے بازوؤں سے پر پرواز
قرن لیتی ہے۔

مطلب یہ کہ اڑنا خاک کی طہرت میں داخل ہے۔ حضرت یوسفؑ مصر میں تھے۔ بخون
نے والہ راہ کے جیسے اپنا پیراں نشان کے طور پر بھیجتا تھا، حضرت یعقوبؑ کو کنعان میں
پہنچے ہی پیراں کی خوشبو آگئی جسے قرآن مجید نے حضرت یوسفؑ کی خوشبو قرار دیا، کیونکہ حضرت
یعقوبؑ کی زبان سے ارشاد ہوتا ہے: (اقبل لأجدد یحییٰ یوسف) ”تحقیقاً میرے یوسفؑ کی
خوشبو آ رہی ہے۔“ میرا فرماتے ہیں کہ پیراں کی خوشبو نے خاک سے پر پرواز اور عار و انگ
ایا تاکہ حضرت یعقوبؑ نگہبان پر درمی کی جا سکے۔

کہتا تھا اکلا، وہ نام رساں سے بہ سوزِ دل
دردِ جدائی اسدا شد خاں نہ کوچھ
اگر اسدا شد خاں کا جو حال جدائی نے کر دیا ہے، وہ جو پچھنے یا بیان کرنے کے لائق نہیں۔

خلق ہے صفہٴ عبرت سے سبقِ ناخواندہ
درد نہ ہے چرخِ دزد میں یک ورقِ گردانہ
خلق نے عبرت کے
صننے سے سبق نہیں
پڑھا یعنی عبرت حاصل
نہیں کی، ورنہ آسمان
اور زمین اٹھ جوتے
ورق کے سوا کیا ہیں؟
ورق اس لیے کہا کہ اس
کے دو صنفے ہوتے ہیں

ایک آسان دوسرا نہیں
 دونوں اُٹھتے ہوئے
 ورق ہیں، یعنی گردش
 میں اُٹھتے جا رہے ہیں
 اور انہیں کوئی خاص قدر
 نہیں، لیکن دنیا جبریت
 حاصل نہیں کرتی۔

کوئی آگاہ نہیں باطن ہمدیگر سے
 ہے ہر اک فرد، جہاں میں، ورق ناخواندہ
 حیف بے حاصلی اہل ریا پر غالب
 یعنی ہیں مانند اڑاں سوہ اڑیں سوراندہ

۲۔ شرح : شراب خانے میں شراب نوشوں کی افسردگی کا یہ عالم ہے کہ
 شراب کی موج بھی پیاسے کے غلطی طرح اپنی جگہ شکر کر رہ گئی ہے۔
 اس شعر کی ایک صورت یہ بھی ہے۔

دیکھ کر بارہ پرستوں کی دل افسردگیاں
 موج نے خلی خطبام صبر جانہ
 ۳۔ شرح : دل میں کوئی بات پیدا ہوتی ہے تو زبان کے لیے کچھ کہنے اور بیان کرنے
 کا موقع ملتا ہے۔ گویا جو کچھ ہم کہتے ہیں، وہ ضمیر کے دامن سے جھٹکی ہوئی گڑھوتی ہے۔
 مطلب یہ کہ جب تک ضمیر میں کوئی بات پیدا نہ ہو، اسے بیان کرنے کا موقع کیونکر آئے
 گا؟ اس بنا پر بات کو دامن ضمیر سے جھٹکی ہوئی گڑھ قرار دیا۔

۴۔ شرح : کوئی بھی ایک دوسرے کے دل ہمدیگر سے واقف نہیں۔ گویا اس دنیا
 کا ہر فرد کتاب کا ایسا ورق ہے، جو کہیں مطالعے میں نہیں آیا۔

۵۔ شرح : اسے غالب! ریاکاروں کی نامرادی پر دلی افسوس ہے۔ انہیں لوگوں
 پر یہ مثل صادق آتی ہے اڑاں شوراندہ و اڑیں سوراندہ (دش طرف سے پیچھے رہا ہوا اور اس طرف
 سے دھتکارا ہوا، نہ اُدھر کا، نہ اُدھر کا، نہ دنیا کا نہ دجی کا)۔

۶۔ شرح :
 اے غالب! بہتر
 مضامین سوچنے کے

واسطے فکر مضامین متین کے 'غالب' !
 چاہیے خاطر جمع و دل آرمیدہ

یہے مزدوری ہے کہ خاطر جمع اور دل آسودہ ہو۔

تا تخلص جامہ شکر فی ارزانی اسد ! لغات :

جامہ شکر فی :

شاعری جز ساز و روشی نہیں، حاصل ہر چھپے شکر فی کے رنگ کا ہاں۔

یہ اس لیے کہا کہ جب شاعروں کے دیوان نظم سے لکھے جاتے تھے تو تخلص کو نمایاں اور واضح رکھنے کے لیے رنگیں روٹانی سے لکھتے تھے۔

شرح : اسے اسد تخلص کے لیے رنگیں جامہ تجھے مبارک ہو۔ اس سے ظاہر

ہے کہ شاعری و روشی کے سروسلان کے سوا کچھ نہیں۔ اس سے حاصل کچھ نہیں ہوتا۔

درویش بھی مومن! ایسے رنگ کا جامہ پہن پتے ہیں جن میں لباس جلد ٹپلا نہ ہو، خدا تخلص کو رنگیں رکھنے کا مطلب یہ ہوا کہ شاعر نے و روشی کا جامہ پہن لیا۔ اس سے فائدہ کچھ نہیں ہو سکتا۔

شکوہ و شکر کو شمر بیم و امید کا سمجھ

۱۔ شرح :

ہمارا شکوہ اور شکر امید

بیم کا پیل ہے۔ امید

بدی ہو جاتی ہے تو شکر

کرتے ہیں بدی نہیں

ہوئی تو شکایتیں شروع

کرتے ہیں۔ عقل کا تاند

خراب ہو۔ ہمارا دل کیا

ہے۔ ایک بد اور مصیبت

خانہ آگہی خراب، دل نہ سمجھ، بلا سمجھ

گاہ بہ غلہ امیدوار، گہ بہ جحیم بیم ناک

گرچہ خدا کی یاد ہے، کلفت ماسوا، سمجھ

نے سرو برگ آرزو، نے رہ در رسم گفتگو

اسے دل و جان خلاق تو، ہم کو بھی آشنا سمجھ

ہے و بول ہمارے لیے ہے کرنا چاہا۔ چہرہ خفا کہ ہم ہر وقت شکر پر کار بند رہتے۔

۲۔ لغات : بحیم : دودخ، بہیم۔

ہیم ناک : غوراً اور خوفِ مذہب۔

شرح : ہم خدا کی عبادت کرتے ہیں، مگر اس لیے کہ ہمیں جہنم کی امید ہوئی ہے اور دوزخ سے ڈرتے ہیں۔ سوچنا چاہیے کہ یہ کس اختیار سے خدا کی عبادت ہے؟ یہ تو خدا کے براہِ کچر ہے، اس کے لیے زحمت اور کلفت میں مبتلا ہیں۔

کئی مرتبہ یہاں کیا گیا کہ میرزا غالب کا فلسفہ بجا و سزا سب سے الگ ہے۔ وہ جہنم کی امید اور دوزخ کے خوف سے خدا کی عبادت کو خدا نہیں، ماسوا کی عبادت سمجھتے ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں :

طاقت میں تامل ہے نہ دیر گیس کا گ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر جہنم کو
یہی مضمون اس شعر کا ہے۔

۳۔ شرح : نہ ہمارے لیے آرزو کا کوئی سامان ٹوٹے جیسا کہ ہے، نہ باتِ حیات کی راہ، ہم پیدا ہوئی ہے۔ اسے خلق کی جان اور دل، آخر میں کیوں جیگانے سمجھ رہا ہے؟ ہم سے ہیں آفتاؤں کا سا سلوک، رفتار کو۔

شرح : گو تم کو رضا ہوئی اغیار ہے، لیکن
اے محبوب! اگرچہ تم
جاتی ہے ملاقات کب ایسے سببوں سے
غیروں کی رضا ہوئی ہیں
سرگرم رہتے ہو اور انہیں کی خوشی کا تمہیں خیال رہتا ہے، لیکن کیا ایسے باتوں سے ہم ملاقات
چھوڑ دیں گے؟ یہ ممکن نہیں۔

شرح : مجھے معلوم ہے جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے
اے کئے آسان کی دلش
کہیں ہو جائے جلد اسے گردشِ گردوں دوں نہ بھی
تو نے جو کچھ میرے متعلق
سوچ رکھا ہے، اچھے معلوم ہے۔ تو جو کہہ کرنا چاہتی ہے، جلد کر گزار تاکہ میں امید و ہیم کی

کشاکش سے نجات پاؤں ۔

کرتے ہو شکوہ کس کا؟ تم اور بے وفائی
سرپٹتے ہیں اپنا ہم اور نیک نامی

۱۔ شرح :
اے محبوب ! تم کس
کی شکایت کرتے ہو؟
مہم تو ہے بے وفائی جسکی
سہم ! ہم اپنا سرپیٹ
رہتے ہیں ۔

ہمارے نصیب میں کب نیک نامی ہوئی :

۲۔ شرح : بلوچس اور ناہیدی میں آئندہ کو ساقی کی بھی ضرورت نہ رہے گی۔ ہم نے
اناکر ساقی دریدہ سے لطف و کرم سہہ، لیکن ہم سہہ، ایسے ہیں کہ دریا سے بھی پیاس نہیں بجھاتے

گر مصیبت تھی تو غربت میں اٹھالیتے آئندہ
میری دہلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری لٹے لٹے

۱۔ شرح :
اے آئندہ ! اگر مصیبت
ہم پر آئے دلی تھی تو

کاش ! ہم پر ایسے وقت آتی، جب وطن سے باہر ہونے اور کس کو اس مصیبت کا پتہ نہ
جاتا، لیکن اسے کیا کیجیے کہ یہ وقت، و خوار رہیں ہیں دہلی میں میں اٹھانی تھی اور اٹھانی ۔

کیا غم ہے اُس کو جس کا علیؑ سا امام ہو؟
اتنا بھی اُسے فلک زدہ کیوں بے حواس ہے؟

۱۔ شرح :
جس شخصہ کو حضرت علیؑ کا
سا امام نصیب ہوا ہے

کیا غم ہو سکتا ہے ! اے آسمان کے ماوے ہوئے ! تو اتنا جا بے حواس کیوں ہے؟
مطلب یہ کہ بیشک آسمان سے ہیں نسلِ چہنیچہ، مگر ہم تو حضرت علیؑ کی پناہ میں بیٹھے ہیں

پھر یہ اسی کے کیوں کام لیں؟ ہیں کوئی غم نہیں ہو سکتا۔

شرح :- امام ظاہر و باطن، امیر صودت و معنی

ظاہر و باطن کے امام
علی دلی، اسد اللہ، جانشین نبیؐ ہے
اور صورت و معنی

کے امیر حضرت علیؑ ہیں، جو ولی ہیں، اللہ کے شیر ہیں، نبی اکرم و صلعمؐ کے جانشین ہیں

شرح :- بے چشم دل نہ کہ ہوس سیر لالہ زار

مگر تو لار زار کی نیز کو
یعنی یہ ہر ورق، ورقِ انتخاب ہے
نیکے تو دل کی آنکھ کھولے

بغیر نہ نکل۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں کی ایک ایک پلکسری چمکوتی کر رکھی گئی ہے۔ یعنی
لار زار کا کوئی پتہ، کوئی پہول، کوئی پلکسری ایسی نہیں جس سے دل کی آنکھ سیکڑوں عجز میں
اور بعیرتیں حاصل نہ کرے۔

۱۔ شرح :- تا چند پست فطرتی طبع آرزو؟

اے خدا! میں کب
یا رب! ملے بلندی دست و عما مجھے
یک طبع آرزو کپست

یک بار امتحان ہوس بھی ضرور ہے
اے جوشِ عشق بادۂ مرد آزما مجھے
یعنی کب مجھ کو چھوٹے چھوٹے

آرزوؤں میں میری

زندگی گزرسے گی؟ تو فطرت و کرم سے میرے دست و دعا کو ہندی مطاہرہ۔ یعنی میں ایسی
دعائیں مانگوں، جو انسان جیسے اشرف المخلوقات کے لیے نرباہوں۔

۲۔ شرح :- اے جوشِ عشق! واقعی تجھ کی آزمائش جو بانی چاہیے۔ مہربانی

فرما کر مجھے ایسی شراب دے، جس سے مردوں کی آزمائش کی جاتی ہے اس طرح تجھے اندازہ ہو جائے گا کہ میں محض بوائسوس ہوں یا حقیقت میں مرد میدان ہوں جو ہر قسم کی کڑیاں جھیل سکتا ہے۔

بہا یاں تک ہے اشکوں میں غبارِ کلفتِ خاطر
 شرح
 آنسوؤں کے ساتھ
 دل کی کدورت کا غبار
 کہ چشمِ ترمیں ہر اک پارہٴ دل، پائے دو گل ہے
 بھی اس قدر بہ گیا کہ کچڑ کی صورت پیدا ہو گئی اور اشکیارِ آنکھوں میں دل کا جو کھڑا پہنچا، اس کا پاؤں کچڑ میں دھنس گیا۔

ہم مشقِ فکرِ وصل و غم بھرے، اسدا
 شرح :
 اے استادِ ہمِ وصل
 لائق نہیں رہے ہیں غمِ روزِ گار کے
 کے سوچ بچار اور جوانی
 کے غم کا خونہٴ مشق بنے ہوئے ہیں۔ ہم دنیا کا غم کمانے کے لائق نہیں رہے۔

پیدا کریں دماغِ تماشاے سرودِ گل
 ۱۔ شرح :
 جو لوگ حسرت کا شکار
 حسرت کشوں کو ساغرِ دینا نہ چاہیے
 ہیں، انھیں شراب
 دیوانگیاں ہیں حاملِ رازِ نہانِ عشق
 کی صراحی اور پیالہ
 اے بے تمیز گنج کو ویرانہ چاہیے
 درکار نہیں، انھیں تو
 ساقی: بہارِ موسمِ گل ہے سرورِ بخشش
 یہ خود پیدا کرنا چاہیے
 چمیاں سے ہم گزر گئے پیمانہ چاہیے
 کو سرور اور پھول کا
 نظارہ کریں۔

سرود کو پتا اور سائز کو گل سے تشبیہ دی گئی ہے۔

- ۲۔ شرح : دیوانے حلق کے چھپے ہوئے بھید دل میں لیے بیٹھے ہیں۔ ایسا کیوں نہ ہو، غزانہ دہنی کرنے کے لیے ویران ہیں بہتر ہے۔
- ۳۔ شرح : اسے ساقی! فصل بہار سرود چو اگر رہی ہے۔ ہم نے ترک شراب کا جو عہد کیا تھا، وہ چھوڑ دیا، ہمیں اب شراب کے پیالے کی ضرورت ہے۔

شرح : وقت اس افتادہ کا خوش، جو قناعت اسد
 اسے اسد! دعا ہے
 نقش پائے مور کو تخت سلیمانی کرے
 کہ اس شخص کا وقت
 خوش خوش گزرے، جو قناعت کر کے بیٹھا ہے، یہاں تک کہ چیونٹی کے پاؤں کا نقش بھی دیکھے تو اسے میلان کا تخت سمجھے۔

شرح : اسے سر شوریدہ! ذوقِ عشق و پاس آبرو
 اسے سرا جھیں ہیں
 جوش سودا کب حریفِ منت دستار ہے
 جوش جنوں بھرا ہوا
 ہے، تجھے صرف عشق کے ذوق اور آبرو کی پاسداری سے واسطہ ہے، بھلا جوش جنوں دستار کا احسان کیونکر گوارا کر سکتا ہے؟

مطلب یہ ہے کہ دیوانے کا سر تو برہنہ ہی رہنا چاہیے، اسے دستار کی آرائش سے کیا واسطہ؟ وہ تو صرف عشق کے ذوق اور دیوانگی کی آبرو قائم رکھنے کے لیے وقف ہے۔

شرح : ترے نوکر ترے در پر اسد کو ذبح کرتے ہیں
 اسے تم ڈھانے والے
 سنگتراشا تراں آشنا کش، ماجرا کیا ہے؟
 خدا سے بے خوف

اور دوستوں کو فنا کے گھاٹ اتارنے والے محبوب! تو کرتیرے دروازے پر اسے کوئی بج کر رہے ہیں، بھلا یہ تو بتا، ہوا کیا؟ اس نے کون سا گناہ کیا ہے؟

واکیا ہرگز نہ میرا عقدہ تارِ نفس
تاخنِ بریدہ ہے تیغِ صفا لانی مجھے
میرے سانس کے
تار میں جو گرہ چڑھ گئی
مٹی، اسے کھولا دیا۔ اصفافی تلوار بھی میرے لیے کٹا ہوا ناخن ہی گئی۔
ظاہر ہے کہ کئے ہوئے ناخن سے کوئی گرہ کٹ نہیں سکتی، اس لیے کہا کہ اصفہاں کی
تلوار ناخن بریدہ ہی گئی، گویا بالکل بیکار رہ گئی۔

۱- شرح :
اے حسن! تو مجھ موت
میں جبرہ بھی دیکھا۔ آخر
عاشق کب تک چیشا ہوا
خیال کا آئینہ دیکھتا ہے؟
یہی محض تصور رکب
تک قناعت کی جگہ ہے؟
حسن کو آنکھوں کے سامنے
بھی تو جلوہ افروز ہوا تھا؟

تمثالِ جلوہ عرض کر اے حسن! کب تک
آئینہ خیال کو دیکھا کرے کوئی؟
عرضِ سرشک پر ہے فضا نے زمانہ تنگ
صحرا کہاں جو دعوتِ دریا کرے کوئی
وہ شوخ اپنے حسن پر مغرور ہے، اسدا
دکھلا کے اس کو آئینہ توڑا کرے کوئی

۲- شرح : آنکھوں میں آنسوؤں کے فرش کا یہ عالم ہے کہ معلوم ہوتا ہے، وہ فضا نے
کی فضا میں سنا دیکیں گے۔ ظاہر ہے کہ جب تک کوئی صحرا پاس نہ ہو، جس کے کنارے تلپید ہوں،
دریا کو بھاؤ کی دعوت کیونکر دی جاسکتی ہے؟

مطلب یہ کہ جس طرح دریا کے بہنے کے لیے بہت وسیع میدان درکار ہے، اسی

طرح میرے آنسوؤں کے لیے بہت لمبی ج جی فضا ہونی چاہیے۔

۱۴۔ شرح : اسے استاد میرا شوخ محبوب جس پر بہت مغرور ہے۔ آپ اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ اسے آئینہ دکھا کر توڑتے رہیں !

دکھا کر آئینہ توڑنے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اس کا مغرور غم ہو جائے، کیونکہ مغرور کو ہوا دینے کا ذریعہ آئینہ ہے، یعنی وہ آئینہ دیکھتا ہے تو دل میں غرور پیدا ہوتا ہے۔ اسے توڑ دیا جائے تو غرور کا سبب ختم ہو جائے گا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ آئینہ دکھا کر توڑیں گے تو اس کے جس کی نمائش کے لیے ایک آئینے کی جگہ بیسویں ٹکڑے بنایا ہو جائیں گے کیونکہ ہر ٹکڑا ایک مستقل آئینہ ہو گا۔ یو اس کے غرور کی تکلیف کے لیے خاصا سامان فراہم ہو جائے گا۔

شرح : یارب! ہمیں تو خواب میں بھی مت دکھائیو

اسے پروردگار! ہمیں
تو خیال کا وہ عشر خواب
میں بھی نہ دکھاتا، جسے دنیا کہتے ہیں۔

اس شعر میں دنیا کو خیال کا ایک جنگامہ قرار دیا گیا ہے، یعنی اس کی حقیقت کچھ نہیں۔ پھر اس سے بیزار آدمی کا یہ عالم ہے کہ شراب میں بھی اس کی صورت دیکھنا منظور نہیں،

شرح : مقررہ اور پردہ، یعنی جو کہوں باطل سمجھو

میرا محبوب فرنگی زادہ
وہ فرنگی زادہ، کھاتا ہے قسم انجیل کی
ہے اور وہ جو وعدہ کرتا

ہے اسے پتا ظاہر کرنے کے لیے انجیل کی قسم کھاتا۔ پھر اسے ان کا اصل مقصد سمجھ کر
میں جو وعدہ کرتا ہوں، اسے سراہ کر جھوٹا سمجھ۔

انجیل کی قسم کھانے کے وعدے کو جھوٹا سمجھنے کی دلیل اس لیے قرار دیا کہ انجیل بیشک

خدا کا کلام ہے، لیکن قرآن مجید کے نزول سے منسوخ ہو چکی ہے اور منسوخ کلام الہی کی قسط چل رہی تھا۔
نہ ہوتی چاہیے۔

کیا ہے ترک دنیا کا مصلیٰ سے
ہمیں حاصل نہیں ہے ماصلیٰ سے
خارج دیر، دیراں، یک کف خاک
بیاباں! خوش ہوں تیری عالمی سے
اسد! قربان لطف جو رہ بیدل
خبر لیتے ہیں، لیکن بیدلی سے

۱۔ شرح :
ہم نے دنیا کو تناصت
یا علی ہستی کی بنا پر نہیں،
بلکہ شفق اور کالی کی بنا پر
چھوڑا ہے ایسا ترک
سراسر بے سود ہے،
اس سے ہیں کیا فائدہ
ہو سکتا ہے۔

بھی مضمون

دوسرے مقام پر یوں کہا:

ضعف سے ہے، نے تناصت سے یہ ترک جستجو

ہیں وبالِ نگہِ گور جستجو مراد ہم

۲۔ شرح : جو گاؤں بے چراغ ہو، اس سے لایہ خاک کی چٹکی کے سوا کیا وصول ہو
سکتا ہے؟ لیکن جب کوئی دیں آباد ہی نہیں تو چراغ کہاں سے آئے گا؟ اسے بیاباں! میں خوش
ہوں کہ میرے سپرد تیری عکاسی ہوئی جس میں کسی کو کچھ لینا دینا نہیں پڑے۔
شیخ سعدی فرماتے ہیں:

کہ سلطان نہ خواہد غمِ دل از خراب

نظیری نے کہا ہے:

بہتان گنج بردی تسکین نہادہ اند

وردِ خراج بردو دیراں نہ بودہ شرط

۳- شرح : اسے استدائیں میرزا بیدل کے لطفِ مجدد پر قربان ہو جاتیں ،
 مجھ پر تو مجھ کو فرماتے ہیں ، مگر ذرا بیدل سے ۔
 یہ بھی اسی زمانے کی غزل ہے ، جب میرزا بیدل کا اثر بہت زیادہ تھا ۔

شرح : خرابات جنوں میں ہے ، استد ! وقتِ قدح نوشی
 اسے استد ! دیوانگی کے
 بہ عشقِ ساقی کوثر ، بہارِ بادہ پیمانی
 پھانے میں شراب بھو
 پیالہ پیئے کا وقت آگیا ۔ ساقی کوثر کے عشق میں شراب نوشی کی بہار کا لطف ہے ۔

شرح : رشک ہے آسائشِ اربابِ غفلت پر ، استد !
 اسے استد ! غفلت
 بیچِ دُناپِ دل ، نصیبِ خاطر آگاہ ہے
 کے تو گر جس آرام اور
 آسائش سے رہتے ہیں ، اس پر رشک آتا ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ ان میں کیوں کوئی احساس
 پیدا نہیں ہوا ۔ سچ ہے ، وہی دل بیچِ دُناپ کا مرکز بن سکتا ہے ، غمناک بھی ۔ صبر و برد
 ہو ، جس نے غفلت سے کام لیا ، اس میں احساس کیونکر پیدا ہو سکتا ہے ؟

شرح : ہم نشینیِ رقیبیاں گرچہ ہے سامانِ رشک
 اسے محبوب ! کو
 لیکن اس سے ناگوار اترے بدنامی تری
 رقیبوں کے پاس بیٹھتا
 ہے ، اس پر یقیناً مجھے رشک ہونا چاہیے ، یعنی یہ کہ میرے پاس کیوں نہیں بیٹھتا ؟ یہ سب
 کچھ اپنی جگہ درست ہے ، لیکن میرے لیے اس سے بھی زیادہ ناگوار امر ہے کہ رقیبوں
 کے پاس بیٹھنے سے تیری بدنامی ہوتی ہے ۔

شعر سے صاف واضح ہوتا ہے کہ عاشق نے رقیبوں کی ہم نشینی پر محبوب سے شکایت

کی۔ اس نے جواب دیا کہ شکایت تیرے دلک کا نتیجہ ہے۔ عاشق جواب دیتا ہے کہ دلک
دلک بھی ہے، لیکن اس سے زیادہ بڑی چیز یہ ہے کہ تو بدنام ہوتا ہے۔

کیا کروں، غم ہائے پنہاں لے گئے صبر و قرار : شرح :
کیا کروں، میرے بچے
ہوئے غم صبر و قرار چھین
دزدگر ہو خانگی تو پاسباں معذور ہے
کرنے کئے۔ ظاہر ہے کہ اگر چوری کرنے والا گھر کا آدمی ہو تو چکیدار کو معذور سمجھنا چاہیے
کیونکہ وہ تو باہر سے آنے والوں کے سلسلے میں روک ٹوک کرے گا، گھر کے ہر آدمی پر پہرا
نہ دے گا۔ غمبائے پنہاں اندر کچھ ہرکتے۔

نہ حسرت تسلیٰ نے ذوقِ بے قراری : شرح :
ذوق کی حسرت ہے نہ
بے قراری کا ذوق ہے ایک
درد کے ساتھ سیکڑوں
دوا میں اور ایک دوا کے
ساتھ سیکڑوں دوائیں ہیں
ایک درد و صدمہ دوا ہے ایک ست و صدمہ دوا ہے
جنت خانے میں اسد بھی بندہ تھا، گاہ گاہے
حضرت چلے حرم کو، اب آپ کا خدا ہے
جب درد کے ساتھ دوا اور ضرورت کے وقت دوا موجود ہو تو ذوق کی حسرت رہ سکتی ہے، نہ
جنتانی کی کوئی وجہ باقی رہتی ہے۔

۲۔ شرح : اسد بھی کہیں کہیں تنہا نہیں زندگی کے لیے پہنچ جاتا تھا۔ اب آپ
حرم کو جا رہے ہیں، آپ کا خدا حافظ۔

آب ہو جاتے ہیں ننگِ تہمتِ باطل سے مرد : شرح :
طہرت داسے دنگ
جھوٹی ہمت کا حرم
اشک پیدا کر اسدا اگر آہ بے تاثیر ہے

سے پانی پانی ہو جاتے ہیں۔ اسے اسد اگر تیری آہ میں تاثیر نہیں رہی تو اسو جانا شوق کرے
 آہ کا بے تاثیر ہونا واقعی اس امر کا ثبوت ہے کہ اس میں کوئی قوت نہیں اور اس وجہ سے
 وہ با عین تنگ ہے۔ جو اسرو ایسی حالت دیکھ کر پانی پانی ہو جاتے ہیں کہ کیا وجہ ہے تو آنسو
 پیدا نہیں کرتا؟

شرح : اسد نے کثرتِ دلہا سے خلق سے جانا
 اسد نے بے شاد لگیں کہ زلف یار ہے مجموعہ پریشانی
 کے دل محبوب کی زلف میں پھنسے ہوئے دیکھ کر جاں دیا کہ یہ زلف پریشانی کا مجموعہ ہے۔

زلف محبوب میں عاشقوں کے دل پھنسے ہیں اور عاشقوں کے دل بے شر پریشانی جوتے
 ہیں۔ جب بہت سے دل زلف میں پھنس گئے تو وہ پریشانی کا مجموعہ بن گئی اور بجائے
 خود بھی پریشانی کا مجموعہ ہے۔

۱۔ شرح : رخسارِ یار کی جو ہوتی جلوہ گسری
 زلفِ سیاہ بھی شبِ مہتاب ہو گئی
 موجِ تبسم لبِ آلودہ رمی
 میرے لیے تو تیغِ سیہ تاب ہو گئی
 بیدارِ انتظار کی طاقت نہ لاسکی
 اسے جانِ برباد آئندہ ابے تاب ہو گئی
 غالبِ زبکہ سوکھ گئے چشم میں سرشک
 آنسو کی بوند گو سہرنا لب ہو گئی

زلف کو شبِ مہتاب اس
 لیے کہا کہ سختی تو وہ تھکی
 بھیجے رات تاریک ہوئی
 مگر تنگ نہ چاندنی کی
 بہار پیدا کر دی۔
 جب محبوب
 کے رخسار جلوہ افروز
 ہوئے تو زلفِ سیاہ
 کی یہ کیفیت ہوئی کہ
 وہ چاندنی رات بن گئی۔

مطلب یہ کہ جوہر افروز کی فراوانی کے باعث زلفت میں ایسی چمک پیدا ہوئی کہ اس کی سیاہی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی

۲۔ لغات : تنع سیر تاب : یعنی بھٹی ہوئی کوہر پر بیوا طراقی ڈال کر لگ گیا ہے لکھو دیتے ہیں تو اس کا رنگ بغض ہوتا ہے ۔ اسے تنع سیر تاب کہتے ہیں ۔

شرح : محبوب کے سس کے ہونے لب پر سکھ ہٹ کی لہرائی تو وہ میرے لیے بغض ہو گیا ۔

۳۔ شرح : اے بیوں پر آتی ہوئی ہاں : تو انتظار کا نظم و جور برداشت نہ کر سکی اور نگ جانے کے لیے یقیناً ہو گئی ۔

۴۔ شرح : اے غالب ! آنکھوں میں آئینہ خشک ہو گئے ۔ کہنا چاہیے کہ لگ کی بوند ایسا سوتی ہو گئی جو اتھ نہیں آتا

شرح :

استاد وار سنگاں باد صنفِ ساماں بے تعلق ہیں

اے استاد ! آزادوں

کے ساتھ سرو ساماں ہیں

ہو تو اس کے باہر وہ

صنوبر گلستاں میں بادلِ آزادہ آتا ہے

بے تعلق رہتے ہیں اور کسی سے کچھ غارت نہیں رکھتے ۔ دیکھیے صنوبر باغ میں آزادوں کے

آتا ہے اور سب سے بے تعلق رہ کر اوپر نکل جاتا ۔

سودہ صنوبر کو شاعر اس لیے آزاد ہونے میں کوہست بندھ جاتے ہیں اور ارد گرد کے

کسی پودے سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ۔

غبنز گم کو، نگہ چشم کو عدو جانے :

وہ جلوہ کر کہ نہ میں جالتوں اور نہ تو جانے

نہ ہووے کیونکہ اُسے فرضِ قتلِ اہلِ وفا

لو سے ہاتھ کے بھرنے کو جو دضو جانے

۱۔ شرح :

پتلا گاہ کو اور نگاہ آنکھ

کو دشمن سمجھتا ہے ۔ کوئی

ایسا مجھ دکھا کر میں جان کھوں، نہ تو جاں سکے۔

مطلب یہ کہ میری حالت ایسی ہے، نگاہِ اشتیاق سے تو کچھ بتا نہیں جاتی اور آنکھ دکھ کر دشمن بن ہوئی ہے۔

۲۔ **شرح :** جو محبوب ہو میں ہاتھ بھر لینے کو ضرورت ہے، بھلا اس کے نزدیک اہل و عا کو قتل کرنا کیوں فرما رہا ہو؟

جب اس کے نزدیک دشمن ہے کہ ہوسے ہاتھ بھرے تو وہ یقیناً اہل و عا کو قتل کرے گا کیونکہ ان کے سوا اور کوئی اپنے آپ کو قتل کے سہمہ میں نہیں کر سکتا۔

شرح : بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو غالب! تو پھر
کیوں نہ دیتی میں ہر اک ناچیز تو ابی کرے
اے غالب! تمہاں بادشاہی کا وہ حال ہو،
جو ہمیں نظر آ رہا ہے، یعنی کوئی نظام اور کوئی ترتیب نہ ہو تو وہی کا سرخ و زنجیر فرد کیوں تو ابی نہ کرے؟

۱۔ **شرح :** صبح سے معلوم آثارِ ظہورِ شام ہے
غافلان! آغازِ کار، آئینہٴ انجمِ شام ہے
کیا کمالِ عشقِ نقص آباد گیتی میں ملے
نمایاں ہو گئے۔ غفلت
کے اتوار ہر کام کا آغاز
اس کے انجام کا آئینہ ہے۔

۲۔ **شرح :** یہ دنیا اتنی عیبوں سے بھری ہوئی ہے کہ اسے نقص آباد نقصوں اور غایبوں سے بھری ہوئی، قرار دینا مناسب ہے۔ یہاں عشق کا کمال کیونکر مل سکتا ہے؟

جہاں سب کچھ نالغ ہو، وہاں کامل کی تلاش محض ہے، لہذا تصور کی پہلی سرسبز نام خیالی ہے۔

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبوا پھر ہم کو کیا
آسمان سے بادۂ گلفام گو برسا کرے
شرح : ہم تو اپنے گلے اور پیالے توڑ کر بیٹھ گئے۔

اگر آسمان سے پھول کے رنگ کی شراب برسات کی طرح بھی برسے، تو ہمیں کیا فائدہ؟ جہاں سے پاس گلے ہوتے تو بھر جیتے رہا ہے ہوتے تو تھوڑی تھوڑی کر کے پیتے رہتے۔ اب تو کچھ نہیں۔

مقصود یہ ہے کہ اگر انسان کے پاس کائنات کی برکات سے فائدہ اٹھانے کا سامان یا صلاحیت نہ ہو تو وہ برکات کتنی ہی زیادہ ہو جائیں، ان سے کوئی نفع نہیں اٹھایا جاسکتا۔

۱۔ شرح :
فغاں کہ بہر شفا سے حصول ناشد فی
دماغ نازکش، منتِ طیبیاں ہے
اسد جہاں کہ علی بر سر نوازش ہو
کشاد عقدہ دشوار، کایہ آساں ہے
رہے ہیں۔

۲۔ شرح : اے اسد جہاں حضرت علیؑ مہربانیوں کے لیے موجود ہوں، وہاں مشکل گریزوں کا کھنڈ اور عقیدوں کا حل جو ناہیست آساں ہے۔

شرح :
اے اسد میرے
ہی دم سے شاعری
اے اسد آباد ہے منہج سے جہاں شاعری
خامد میرا تختِ سلطانِ سخن کا پایہ ہے

کی دنیا آباد ہے۔ اگر شاعری کو بادشاہ فرض کر لیا جائے تو سیراظم اس کے تحت کا ایک یا یہ ہے۔

۱۔ لغات : کچھ نہیں حاصل تعلق میں بغیر از کش
تجربہ : سب سے
اگ ٹھک رہتا۔
شرح : کثرتِ اندوہ سے حیران و مضطرب ہے اسدا
اس دنیا کی کسی چیز سے
رابطہ ضبط قائم کر لینے کا
نتیجہ کچھ تان کے سوا کچھ نہیں۔ ہم تو اس رند کو خوش نصیب سمجھتے ہیں، جو تجربہ کے ہٹا کاٹا ہے
یعنی جو دنیوی تعلقات سے اگ ٹھک رہتا ہے۔

۲۔ شرح : اسد غلوں کی کثرت کے باعث حیران و مضطرب ہو گیا ہے۔ اسے عزت
علیٰ ! یہ وقت ہے کہ اس پر غایات ہوں اور اس کی مدد فرمائی جائے۔

شرح : اسدا بے تکلف، خاک گردین
اگرچہ اسدا بے تکلف
غضب ہے گر غبارِ خاطر احباب ہو جاوے
خاک ہو جانے کی مشق
میں لگا رہا، لیکن کیا غضب ہے کہ اس کے باوجود وہ دوستوں کے دل کا غبار بن جائے۔

۱۔ شرح : تاچند نازِ مسجد و بُت خانہ کیپٹھیے !
کب تک مسجد اور بت خانے
جوں شمع، دل بہ خلوتِ جاتا نہ کیپٹھیے
کے نازا نکالتے ہیں !
دامانِ دل بہ وہم تماشا نہ کیپٹھیے
کیوں نہ دل کو ٹھیک طریق
اسے ادھی اُتھات ہے جا نہ کیپٹھیے
عجب کے ٹھکانے

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
 دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچے
 حیرت، حجابِ جلوہ و درشتِ غبارِ راہ
 پائے نظر بہ دامنِ صحرا نہ کھینچے
 گلِ سر بہ سراشارۂ جیبِ دریدہ ہے
 نازِ بہارِ جز بہ تقاضا نہ کھینچے
 خود نامہ بن کے چاہئے اُس آشنا کے پاس
 کیا فائدہ کہ منتِ بیگانہ کھینچے
 ہے بے شمار نشہِ خوابِ جگر، اسدا
 دستِ ہوس بہ گردِ مینا نہ کھینچے

میں نے جانیں؟
 مسجد اور
 بتلانے کے باز خانے
 کا مطلب یہ ہے کہ
 کھروان کی کشش
 میں الجھے رہیں۔ محبوب
 کے غلوں کو سے میں پہنچا
 جاتیں گے تو یک نگاہ اور
 یک سوتی نصیب ہو
 جانے گی اور کشش ختم
 ہو جائے گی۔ آخر مسجد
 اور بتلانے کا مقصد یہی
 یہی ہے کہ محبوب کے
 غلوں کو سے میں پہنچیں۔
 ۲۔ شرح :

نظارہ ایک وہم ہے اس کے لیے کیوں دلی کا دامن کھینچیں اور خواہ مخواہ شرمناک
 اٹھانے سے کیا حاصل ہوگا؟

۳۔ شرح : محبوب کی خدمت میں عاجزی اور نیاز مندی کرتے کرتے تنگ آئے،
 وہ کسی طرح راہ پر آیا اور ہم سے تعلق پیدا کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اب جی چاہتا ہے کہ
 عجز و نیاز اور غلوں کا طریقہ چھوڑ کر اس کا دامن حریفانہ اعلان میں کھینچیں۔

۴۔ شرح : حیرت جوۂ محبوب کے لیے پردہ بن رہی ہے اور دیوانگی
 نے راستے کے گرد غبار کی صورت اختیار کر لی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ نگاہ کا پاؤں صبر کے
 دامن کی طرف نہ لے جائیں۔

مطلب یہ کہ صحرا نوردی اور دولت گردی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس طرح محبوب کا جہو نصیب ہونے کے بجائے اس سے محرومی کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

۵۔ **شرح :** پھول سراپا پھٹے ہوئے گریبان کا اظہار کر رہا ہے، یعنی جیسے دھت و سر رہا ہے کہ گریبان چاک کیے بغیر ہمارے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ جس میں چاہیے کہ بہار کا ناز اٹھائیں تو آٹھانے کی بنا پر اٹھائیں۔

۶۔ **شرح :** دوست کے پاس خود مکتوب ہی کر جانا چاہیے۔ اس مسئلے میں بیگانے اور نا آشنا کا احسان اٹھانے سے کیا حاصل ہے ؟

مطلب یہ کہ محبوب کے پاس پہنچنے کے لیے وسیلہ ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں جب تک خود کوشش کر کے وہاں نہ پہنچیں گے، ویدار نصیب نہ ہوگا۔

۷۔ **شرح :** اے استاد! جس شخص نے خوب بگڑ گیا، سمجھ لے کہ اسے ایسی شراب ملی گئی، جس کا نشہ ہمیشہ قائم رہتا ہے اور اس میں انار کی تکیوت نہیں ہوتی۔ پھر بنا لگا گدن کی طرف دست چوس لیکن کر رہا تھیں رین وہ شراب کیوں نہیں، جس کا نشہ متوڑی دیر میں اتر جائے گا اور دوبارہ پینے کی ضرورت پیش آئے گی۔

خوب بگڑ کر شراب پینے کا مطلب یہ ہے کہ دل میں حقیقی عشق کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ جو ہمیشہ مست رکھے گا اور خمار کی فوجت کسی نہ آئے گی۔

شرح : نہ حیرت چشم ساقی کی نہ صحبت دور ساغر کی

میری محفل میں غالب ! گردش افلاک باقی ہے

کی حیرت ہے اور نہ پیالے کا دور پہل رہا ہے۔ یہاں صرف ایک گردش باقی رہ گئی ہے اور وہ آسمانوں کی گردش ہے۔ یعنی گردش روزگار نے میری محفل کو اس طرح تکیوت کر دیا ہے کہ اس میں شراب پلانے والا موجود ہے، نہ شراب بانٹی

جاتی ہے۔

لغات :
سنگ آمد و سخت آمد و دیر خود داری
مغذوب سبکداری، خمبور گراں جانی
نظمی معنی، تقدیر کے ہنر

میں گرا تو بھاری اور پوچھ کر اٹھائے دے اٹھے۔ یہ مثل اس وقت یوں تھے ہیں، جب کوئی کام چار دنا چار کرنا ہی پڑے۔ یعنی کوئی بہت بڑی ذمہ داری آپڑے اور گریز ممکن نہ ہو۔

شرح : بھاری کام سر پر آ پڑا ہے اور اسے پورا کرنے کی کوشش کیے بغیر چارہ نہیں۔ خود داری کے لیے درد سر پیدا ہو گیا۔ ایک طرف ہلکا پن ہے، جس نے بے بس کر رکھا ہے۔ دوسری طرف گراں جانی ہے جس نے بالکل خمبور بنا دیا ہے۔ ان حالات میں خود داری کا مقصد کیونکر پورا ہو؟

بظاہر کہنا یہ چاہئے ہیں کہ انسان کے لیے دہری آزمائش ہے۔ ایک طرف وہ ہر چھوٹی بڑی مصیبت پر گھبرا جاتا ہے، دوسری طرف جان دے دینا اختیار میں نہیں۔ یہ اس ہمد انسان کے لیے لازم ہے کہ خود داری کی زندگی بسر کرے۔ یہ کام بڑا کمشن ہے، لیکن اسے پورا کرنے ہی میں انسان کی شان ہے۔

شرح :

۱۔ اسد جوش

جنوں کا عالم ہے

جوش جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد
صحرا بھاری آنکھ میں اک ٹھٹھٹ خاک ہے

کر ہیں کچھ نظر نہیں آتا ، یہاں تک کہ یہاں بھی ہمارے نگاہ میں خاک کی ایک
نقطہ ہے۔

 و